دُنیا کی سو عظیم کتابیں

ستّار طاہر

دُنیا کی سَو عظیم کتابیں

ستّار طاہر

کاروانِ ادب ٭ مُلتان صدر

بار اوّل ۱۹۸۶ء

تعداد .. .. ایک ہزار

مطبع .. .. آر۔آر پرنٹرز لاہور

ناشر .. .. کاروان ادب ملتان صدر

قیمت .. .. [illegible] روپے

اپنی شریک حیات،

نکہت کے نام

عمل سے تہی دامن آدمی کی زندگی کو آپ نے اپنی
سچی، حوصلہ بخش رفاقت سے مسرتوں اور آسودگیوں
سے بھر دیا۔ آپ کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو یہ
کام کبھی مکمل نہ ہو پاتا۔

دُنیا کی سو عظیم کتابیں

چند باتیں

اس ایک کتاب میں شامل — ہر کتاب پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور بلا شبہ ان کتابوں پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے، جس کا شمار ممکن نہیں۔

میں نے اس کتاب کا منصوبہ بنایا تو چند اہم نکات اور امور کو سامنے رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ غیر ملکی زبانوں میں کتنی ہی ایسی کتابیں ملتی ہیں جن میں ان کتابوں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ جن کا شمار دنیا کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے اور جنہوں نے انسانی افکار اور تہذیب، تمدن اور معاشرت کو تبدیل کرنے میں انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ایسے تمام مجموعوں اور تعارفی کتابوں میں دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو ہمیشہ سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ بڑی کتابیں، جنہوں نے انسانی ذہن اور فکر کو تبدیل کیا، صرف یورپ اور سفید فام دنیا میں ہی نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ میں بھی ایسی کتابوں کی تخلیق ہوئی جنہوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو ہر زمانے میں متاثر کیا ہے۔ اس اعتبار سے جن کتابوں کو میں نے دنیا کی سو بہترین کتابوں میں شامل کیا۔ ان میں انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی کتابوں کے علاوہ فارسی، عربی اور پنجابی کی کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کتابوں کے انتخاب کے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔ بعض ذہین قاری اعتراض کر سکتے ہیں کہ فلاں کتاب جو اس اہمیت کی حامل تھی اس کو اس کتاب میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔؟

اس ضمن میں میں نے یہ اصول سامنے رکھا کہ ان کتابوں کو شامل کیا جائے جو اپنے موضوع اور اسلوب اور پھر اپنے ہمہ گیر اثرات کی وجہ سے بنیادی اہمیت کی حامل

ہوں۔ بعض کتابیں جنہوں نے ایک دور میں انسانوں کی کئی نسلوں کے ذہنوں پر حکمرانی کی۔ آج ان کے اثرات ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے صرف ان کتابوں کو شریک کیا گیا۔ جو عام معنوں میں — سدا بہار کہلاتی ہیں۔

یہ سو کتابیں وہ ہیں جنہوں نے انسانی فکر کو بدلا ہے۔ اختلافات اور دائمی مباحث کا سرچشمہ ٹھہری ہیں۔ لیکن ان کی ہمہ گیری اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

"دنیا کی سو عظیم کتابیں" کا سلسلہ روزنامہ 'امروز' لاہور میں شائع ہوتا رہا۔ اس دوران میں مجھے بہت سے خطوط ملتے رہے۔ بعض قیمتی مشوروں سے بھی نوازا گیا۔ جن سے میں نے بہت استفادہ کیا۔ اب ان مضامین کو کتابی صورت میں یکجا کرتے ہوئے۔ ایک بار پھر نظرِ ثانی کی گئی ہے بعض ترامیم کی گئیں اور اضافے بھی......

ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری یہ کتاب ایک تعارفی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے حوالے سے یہ آرزو رہی ہے کہ اردو کے قارئین بھی اصل کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب سے پڑھنے والوں کو ترغیب دینے اور تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صدیوں سے انسانوں کے بہترین اور نابغہ ذہنوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے اور انسانی شعور اور فکر کو عام کیا جا سکے۔

یہ ایک بڑا کام تھا۔ جو بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا۔ میری محنت اور شوق کے علاوہ طالب علمانہ لگن نے اس کتاب کی تکمیل میں میرا بہت ساتھ دیا۔

اور آج جب یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تو یہ عاجزانہ سی مسرت ضرور محسوس ہوتی ہے کہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور واحد کتاب ہے.....!!

ستار طاہر

لاہور

۱۸ مارچ ۱۹۸۵ء

القرآن الحکیم

القرآن الحکیم دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا ہر دعویٰ سچا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے پہلی اور سب سے آخری الہامی کتاب ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں آج تک کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا نہ ترمیم نہ کمی۔ قرآنِ پاک وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود مالک ارض و سما اور کتاب کے اتارنے والے نے لی ہے۔ آج بھی اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اسی طرح محفوظ اور موجود ہے، جس طرح اسے آج سے چودہ سو برس پہلے اتارا گیا اور صدیوں پہلے نامعلوم وقت میں، کائنات کی تخلیق سے پہلے لوحِ محفوظ پر تحریر کیا گیا تھا۔

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے۔

"ہم نے ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"، (القرآن)

تاریخ القرآن میں مولانا عبدالقیوم ندوی لکھتے ہیں:

"روایتوں میں آیا ہے کہ اللہ رب العزت نے پورے قرآن شریف کو رمضان کی ایک شب قدر میں کائنات کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے آسمانِ دنیا پر نازل فرمایا اور وہاں سے حضرت جبریل امینؑ آہستہ آہستہ حسبِ ضرورت اور حسبِ الحکم رب تعالیٰ، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۰ یا ۲۳ سال میں نازل فرماتے رہے۔ یہی قول مشہور مفسر صحابی عبداللہ بن عباسؓ کا ہے۔ اس کی طرف اکثر اہلِ علم صحابہؓ و تابعینؒ گئے ہیں اور یہی زیادہ صحیح اور واضح ہے۔"

(تاریخ القرآن، عبدالقیوم ندوی صـ۳۴)

قرآن پاک خدا کی آخری کتاب ہے جو نبی آخرالزماں حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کے ساتھ ہی جہاں نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہوا۔ وہاں دنیا پر اب کوئی الہامی کتاب نازل نہ ہوگی۔ جب تک یہ دنیا قائم رہے یہ کتاب ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ قرآن پاک کے کئی دوسرے اسمائے مبارک بھی ہیں۔ جن میں الفرقان (حق وباطل میں تمیز کرنے والا) النور الکتاب، الہدیٰ، کتاب مبین زیادہ مشہور ہیں۔

لفظ قرآن ایک رائے کے مطابق قرأت سے مشتق ہے۔ یہ مبالغہ اور فضیلت کا صیغہ ہے۔ جس کا مطلب ہے بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتاب، حقیقت بھی یہی ہے اور ایک تازہ ترین تحقیق کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ جس کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ وہ قرآن پاک ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے قرآن کو قرآن سے ہی مشتق قرار دیا ہے جس کا مفہوم مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے یہ متعین کیا ہے کہ قرآن پاک تمام دنیا کی اقوام کے درمیان یگانگت اور محبت قائم کرنے کے لیے نازل ہوا اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ تمام اقوام عالم ایک رشتۂ وحدت میں منسلک ہو جائیں۔

قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔ یہ وہ دعویٰ ہے کہ جس پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی کوئی الہامی یا غیر الہامی کتاب نہ تو یہ دعویٰ کر سکتی اور نہ ہی اس کا دعویٰ سچا ہو سکتا ہے۔ لاریب۔ یہ صفت خاص قرآن پاک سے ہی مخصوص ہے کہ اس کو دنیا کی آخری الہامی اور مکمل ترین کتاب کا رتبۂ بلند حاصل ہے جو اس کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔

جب قرآنِ پاک کا نزول ہوا تو اس وقت اس سے پہلے کی دوسری مذہبی اور الہامی کتابیں توریت، زبور، انجیل اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ تھیں۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

"یہودی الفاظ کو ان کے اصلی معنوں سے پھیر دیتے ہیں اور انہوں نے ان

ہدایتوں کا ایک بڑا حصہ بھلا دیا جوان کو دی گئی تھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں ان سے ہم نے عہد لیا تھا مگر انہوں نے ہدایات کا ایک حصہ بھلا دیا جو ان کو دی گئی تھیں" (المائدہ-۳)

متی کی اصل انجیل دُنیا سے غائب ہے۔ صرف اس کا ترجمہ باقی ہے۔ اصل عبارت سرے سے موجود نہیں۔ زبور و تورات بھی اصل حالت میں موجود نہیں۔ لوقا اور مرقس کی

قرآنی حروف کی تفصیل

الف	۴۸۸۷۲	ب	۱۱۴۲۸	ت	۱۰۹۹
ث	۱۲۷۶	ج	۳۳۷۳	ح	۳۷۹۳
خ	۲۴۱۶	د	۵۶۰۲	ذ	۴۶۷۷
ر	۱۱۷۹۳	ز	۱۵۹۰	س	۵۸۹۱
ش	۲۲۵۳	ص	۲۰۱۳	ض	۱۶۰۷
ط	۱۲۷۷	ظ	۸۴۲	ع	۹۲۲
غ	۲۲۰۸	ف	۸۴۹۹	ق	۶۸۱۲
ک	۹۵۰۰	ل	۳۰۴۳۳	م	۲۶۵۰
ن	۴۵۱۹۰	و	۲۵۵۳۶	ہ	۱۹۰۷۰
ء	۴۷۲۰	ی	۴۵۹۱۹		

(مندرجہ بالا حروف قرآن پاک میں جتنی بار استعمال ہوئے ہیں ان کی تفصیل دی گئی ہے)

اناجیل کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات حضرت عیسٰے علیہ السلام کے زمانے میں تھے۔ ہی نہیں۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے تین سو برس بعد ہی عیسائی علماء اور کلیسا میں اناجیل کے اسناد پر بحث کا آغاز ہو گیا تھا جو آج تک جاری ہے۔ برناباس کی انجیل جو پاپائے روم کے کتب خانے میں موجود ہے اسے بیشتر عیسائی مستند نہیں مانتے اور یہ انجیل بھی اصل نہیں ہے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں اناجیل کی تعداد کا فرق پایا جاتا

ہے۔ ہندوؤں کے وید اور دیگر کتابیں۔ دیو مالا سے تعلق رکھتی ہیں ان کا مذہب اور الہام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا میں سوائے قرآنِ پاک کے کوئی ایسی مقدس اور الہامی کتاب نہیں جو اپنی اصلی حالت میں موجود ہو۔ قرآنِ پاک اپنے سے پہلے کی تمام الہامی کتابوں کی تائید کرتا ہے۔ لیکن ان کی اصلی حالت میں قرآنِ پاک تمام الہامی کتابوں کا تتمہ ہے، اختتام ہے، تکمیل ہے۔ اس کے بعد بنی نوع انسان کو کسی الہامی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیو ٹالسٹائی نے اپنے کتابچے "مذہب کی روشنی" میں لکھا تھا۔

"اگر یہی ایک کتاب القرآن دنیا کے سامنے موجود ہو اور کوئی مصلح یا پیغمبر نہ آیا ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک کتاب انسانی ہدایت و فلاح کے لئے کافی تھی"

قرآنِ پاک صحائفِ آسمانی اور الہامی کتابوں کا تسلسل بھی ہے اور تکمیلی نقطہ بھی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"قرآن اس تعلیم خداوندی کو پیش کرتا ہے جس کو تورات اور انجیل پیش کرتی تھیں۔ بلکہ یہ اس وجہ سے بھی ناگزیر ہے کہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کا جدید ترین (LATEST) بلکہ آخری ایڈیشن (LAST EDITION) ہے۔ اس میں بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھیں اور بہت سی وہ چیزیں حذف کر دی گئی ہیں جن کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا جو شخص اس ایڈیشن کو قبول نہ کرے گا۔ وہ صرف خدا کی نافرمانی ہی کا مرتکب نہ ہوگا۔ بلکہ ان فوائد سے بھی محروم رہ جائے گا جو آخری اور جدید ترین ایڈیشن میں انسان کو عطا کئے گئے ہیں" (تفہیمات حصہ اول ص۲۱۱)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ یہ سورۃ علق ہے جو قرآنِ پاک کے تیسویں پارہ میں ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۔۔۔۔

"پڑھ اپنے رب کا نام لے کر جس نے کائنات کی تخلیق فرمائی۔ جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور اس احساس کے ساتھ

کہ تیرا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم عطا کیا اور انسان کو وہ
کچھ سکھا دیا۔ جس کا اسے علم نہ تھا۔"

نزولِ قرآن کی تاریخ میں علماء کا اختلاف ہے، امام طبری کے مطابق ۱۷ رمضان المبارک (بمطابق ۶ راگست ۶۱۰ئ) ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ ۲۷ رمضان المبارک پر اصرار کرتے ہیں اور اسی پر بیشتر آئمہ اور محدثینؒ متفق ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت تفسیر ابن کثیر میں منقول ہے۔ جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی شب نازل کئے گئے۔ توراۃ کا نزول چھ رمضان کو ہوا۔ زبور بارہ رمضان کو نازل ہوئی اور انجیل اٹھارہ رمضان کو اتری قرآن پاک رمضان کی چوبیسویں شب نازل ہوا"

قرآن پاک کی آخری آیت، آخری وحی کے ذریعے جمعتہ الوداع کے موقع پر دس ہجری کے اواخر میں نازل ہوئی یہ سورۂ مائدہ کی آیت ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ......

"آج کے دن، ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا"

دیگر مذاہب اور اسلام میں وحی اور الہام کے تصور میں بہت فرق ہے۔ قرآن پاک کا ایک ایک لفظ خداوندی ہے۔ جو براہِ راست لوحِ محفوظ سے حضور نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن کی جو آیت حضور صلعم پر نازل ہوتی آپ اسے خود یاد کر کے صحابہ کرام کو یاد کرا دیتے پھر صحابہ کرام اسے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں لکڑی کے تختوں اونٹ کے کجاووں، پتھر کے ٹکڑوں، چمڑے کے غلافوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ صحابہ کرام کاتبانِ وحی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ انہیں حضور نبی کریم صلعم نے خود وحی لکھنے کے لئے مامور فرمایا تھا۔ ان میں حضرت ابو بکرؓ، عبداللہ بن سلامؓ ابوالدرداؓ معاذ بن جبلؓ اور معاویہؓ شامل ہیں۔

کاتبانِ وحی کے علاوہ ایسے صحابۂ کرام بھی تھے جو قرآن پاک حفظ کرتے جاتے تھے۔

حفاظِ قرآن میں ان صحابۂ کرام کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوالدرداؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ

خواتین حفاظ قرآن میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام ورقہؓ بن نوفل کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔

قرآنِ پاک لوحِ محفوظ پر بالکل اسی طرح موجود ہے جس طرح آج مصاحف میں موجود ہے۔ جس طرح حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے۔ قرآنِ پاک تھوڑا تھوڑا نازل ہوا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسی طرح لکھوانا شروع کیا جس طرح لوحِ محفوظ میں موجود ہے اور جس طرح آج محفوظ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں پورا قرآن جمع کر لیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے جمع القرآن میں صرف یہ فرق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تمام اجزائے قرآن پاک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے قرآن کے مطابق لکھوایا اور جمع کرایا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے سورتوں کو مرتب کرایا اور مختلف قرأتوں کو چھوڑ کر قریش کی قرأت پر قرآن جمع کیا۔ کیونکہ اسی پر قرآن نازل ہوا تھا۔ یوں قرأتوں میں جو اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔

یہودی مستشرقین نے اپنی طرف سے قرآن پاک کے بارے میں مختلف النوع الزام تراشیوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی انہوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کی ذہنی اختراعات اور تحقیقات کو پیش کیا کہ (توبہ نعوذ باللہ) قرآن پاک کے چالیس سیپارے تھے اور دس سیپارے غائب ہو چکے ہیں۔ لیکن ان یہودی اور غیر مسلم مستشرقین کے جھوٹ کا پول خود ہی کھل جاتا رہا ہے۔

دُنیا کی تاریخ کسی بھی کتاب کے بارے میں اتنی مستند معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ قرآنِ پاک کا ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ روزِ ازل سے حضور نبی کریم صلعم

پر نزول سے لے کر آج تک محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار خود خالقِ دو جہاں ہے۔

قرآن پاک پر ایک نظر

۳۰	سپارے	۱۱۴	سورتیں
۹۳	مکی سورتیں	۲۱	مدنی سورتیں
۶۶۶۶	آیات	۳۲۲۶۷۱	حروف
۸۶۴۳۰	کلمات	۵۳۲۴۳	زبر
۱۰۵۶۸۲	نقطے	۱۷۷۱	مدّیں
۱۲۵۳	تشدیدیں	۵۴۰	رکوع
		۱۴	حروفِ مُقطّعات

قرآن پاک رشد و ہدایت کی سب سے بڑی اور مکمل کتاب ہے۔ یہ علوم کا خزینہ ہے۔ انسان کی دینوی اور دنیاوی رہنمائی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں یہ فرمودۂ خداوندی ہے اور تمام ادیان کی تکمیل کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کی فلاح اور نجات صرف اور صرف قرآن پاک پر عمل کرنے سے ہی ہوسکتی ہے۔ چودہ صدیوں سے قرآن پاک کی وجہ سے دنیا میں جو نُور پھیلا ہے اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ گمراہی تاریکی اور ضلالت کے ہر دور میں قرآن نے انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور تا ابد رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا رہے گا کیونکہ کسی کتاب کو یہ رتبہ اور یہ فرض نہیں سونپا گیا جو قرآنِ پاک کو حاصل ہے۔

گوئٹے نے کہا تھا:

"قرآن پاک کی تعلیم کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کر سکتی اپنے تمام نظام ہائے تعلیم کے ساتھ اگر ہم چاہیں بھی تو قرآن کی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور نہ کسی

انسان میں یہ طاقت ہے کہ وہ قرآن سے بہتر نظام پیش کر سکے ''

قرآن پاک ایک اساسی دستور ہے، منبع رشد وہدایات ہے۔ انسان کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ انسان کی اس زندگی اور حیات بعد الممات کے لئے اس میں دائمی سچائی اور رہنمائی موجود ہے۔ قرآن پاک کے بارے میں نہ صرف آئمہ اسلام اور علمائے اسلام بلکہ دنیا کے تمام بڑے دانشور اور فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن پاک کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''الفوز الکبیر'' میں قرآن پاک کے جملہ مضامین کو پانچ اصناف میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ علم عقائد: اسلامی عقائد و افکار کی تعلیم پر مشتمل آیات الٰہیہ

۲۔ علم الاحکام: جن میں حلال حرام، جائز ناجائز نیک و بد کی تفصیلات ہیں۔

۳۔ تذکیر بآلاء اللہ: اللہ کی نعمتوں کا تفصیلی تذکرہ انسانوں پر خدا کی عنایات۔

۴۔ تذکیر بایام اللہ: وہ آیات جن میں اللہ نے اپنے بندوں اور معصیت کیش قوموں کے ساتھ اپنے سلوک کا ذکر فرمایا ہے۔ تابع فرمان بندوں اور امتوں سے جو معاملہ طے کیا ہے اس کی وضاحت موجود ہے۔

۵۔ تذکیر بالموت وما بعدہ: موت اور اس کے بعد زندگی کے متعلق مسائل۔ ...

قرآن پاک دنیا کی واحد کتاب ہے جس کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں ۲۵۲ھ میں موحدین کے دور میں تراجم قرآن کی اہمیت کا احساس ہوا اور پہلی بار اس کا ترجمہ ہوا۔ فارسی زبان میں شیخ سعدی نے ۶۹۱ھ میں قرآن پاک کا پہلی بار فارسی ترجمہ کیا۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے ترجمہ کیا ان کے نامور صاحبزادوں شاہ عبد القادرؒ شاہ رفیع الدین نے اردو میں پہلی بار لفظی ترجمے کئے دنیا کی ہر زبان میں قرآن پاک کے کئی تراجم موجود ہیں اور رہتی دنیا تک ہوتے رہیں گے، عبرانی، یونانی، ارمنی، جاوی، پرتگالی، ڈنمارک، رومانوی ترکی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، مرہٹی تیلگو، پشتو، سندھی لاطینی، اطالوی، ہسپانوی جرمن، فرانسیسی۔ انگریزی، روسی، ڈچ، چینی، الغرض دنیا کی ہر زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ

ہو چکا ہے اور قرآن پاک کے بارے میں ان گنت کتب شائع ہو چکی ہیں۔

قرآنِ پاک رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا منبع ہے۔ قرآن پاک کے ساتھ ہی علم التفسیر نے جنم لیا عالمِ اسلام نے ایسے ایسے مفسرانِ کرام پیدا کئے۔ جنہوں نے تعلیمات قرآن کو عام کیا مفسرین میں صحابۂ کرام میں سے خلفائے راشدہؓ عبداللہ بن مسعودؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، ابوموسے اشعریؓ امام حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، مکعدلؒ، علقمہؒ، عطا ابن ابی ریاحؒ مشہور ہیں علمائے کرام میں سے ابن جریر، ابن ماجہ کی تفاسیر بے حد مشہور ہیں اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت احمد رضا خان کی تفاسیر قرآنی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کا حال رقم کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور پھر بھی تذکرہ مکمل نہ ہو قرآنِ پاک کے ساتھ مسلمان سلاطین کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود کتابت قرآن کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔ دنیا کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ پر قرآنی اثرات بے حد گہرے ہیں۔

علم التفسیر کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں حفظِ قرآن کا جذبہ پیدا ہوا ہر دور میں مسلمانوں میں ان گنت مسلمان بڑی عقیدت سے قرآن پاک حفظ کرتے ہیں۔ حفاظ قرآن کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس میں ایک نوجوان لاموریل نے لاطینی میں اناجیل ازبر کی تھی تو سارے یورپ میں اس کارنامے پر تہلکہ بپا ہو گیا تھا جب کہ مسلمان پندرہ صدیوں سے ہر دور میں ہر ملک میں ان گنت تعداد میں حفظ قرآن کرتے آرہے ہیں۔ یہ بھی ایک اعجاز القرآن ہے۔

قرآنِ پاک کی کتابت کو ایک اعلیٰ ہنر اور باعث رحمت و برکت سمجھا گیا۔ ابن مقلہ بیضاوی شیرازی (سن پیدائش ۲۷۲ھ) بغداد کے رہنے والے تھے وہ بڑے نامور خطاط تھے۔ نسخ، رقاع اور ریحان خطِ تحریر کے وہی موجد و بانی تھے ابن مقلہ نے خط نسخ کا نام خطِ بدیع رکھا تھا۔ یہ خط نسخ قرآن پاک کی کتابت کے لئے مخصوص ہوا آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں قرآنِ پاک کو اسی خط نسخ میں کتابت کیا جاتا ہے۔ ابن مقلہ کا سنِ ولادت

۳۲۸ھ (مطابق ۶۹۴۰) ہے۔

قرآن پاک نے انسانوں کو ایک رب، ایک رسول، ایک کتاب پر عقیدے اور ایمان کی تعلیم دی قرآنِ پاک پوری انسانیت کے لئے ہمیشہ کے لئے ہے قرآن دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور جو اس معجزے سے انکار کرتا ہے وہ روشنی سے محروم رہے گا۔ قرآن پاک دنیا کی سب سے بڑی سب سے پہلی اور سب سے آخری اور سب سے مکمل کتاب ہے۔

۲

صحیح بخاری

قرآن پاک کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور مقدس کتاب صحیح بخاری ہے۔ صحیح بخاری، کئی حوالوں اور پہلوؤں سے دنیا کی عظیم اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کے حوالے سے ہی مسلمانوں کی فقہ کے بارے میں بنیادی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ صحیح بخاری، اسلامی تمدن کی بنیاد ہے۔ رسول آخرالزمان صلعم سے مسلمانوں کو جو عقیدت ہے اس کی ایک روشن ترین مثال صحیح بخاری ہے

مسلمانوں نے علوم و فنون میں جو اختراعات کیں جو انقلاب پیدا کیے ان کی تفصیل کے لیے ایک عہد چاہیے۔ کچھ علوم ایسے ہیں جو صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص ہیں لیکن ان سے ساری دنیا فیض یاب ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ہی علوم میں ایک علم۔ علم الحدیث ہے۔ وحی الٰہی کے بعد حدیث کی قدریں اس طرح متعین کی گئی ہیں کہ جو احکامات آنحضرت ؐ نے اپنی طرف سے ہماری خارجی اور داخلی زندگی جن میں ہمارا مکمل معاشرہ شامل ہے۔ کے لیے عنایت فرمائے۔ وہ تمام احادیث میں شامل ہیں۔ نبی آخری الزمان اور انسان کامل ؐ کی زندگی کا ایک ایک نقش احادیث میں موجود ہے۔ بعض علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ ثقافتِ اسلام میں احادیث کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اگر حدیث کو نظرانداز کر دیا جائے تو مسلمانوں کا کلچر تباہ ہوکر رہ جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد احادیث جمع کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ اگرچہ بعثت سے رحلت تک زمانے میں صحابہ کرام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد، کلیے طرز زیست کے ہر اطوار کو عقیدت و محبت کے ساتھ ذہن نشین کر لینے کی کوشش کرتے تھے۔

حدیث رسولؐ کے بارے میں ایک خاص وضاحت ابتدا میں ہو جائے تو بہتر ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کا کلام قرآن پاک ہے۔ رسول اللہ صلعم کا کلام۔ حدیث ہے۔ کلام الٰہی تو وحی کے ذریعے حضور نبیؐ پر نازل ہوا۔ احادیث کے بارے میں قرآن پاک کی یہ آیت مبارکہ خاص طور پر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

"ہمارا رسولؐ کوئی بات نفس کی خاطر نہیں کہتا۔ یہ تو وہ کہتا ہے جو ہم کہلواتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا فرمان بھی دھیان میں رکھیے کہ حضور نبی کریم صلعم چلتا پھرتا قرآن تھے۔"

تدوین حدیث کی ابتدائی منزل تو یہ تھی کہ کچھ صحابہ نے کچھ ارشادات نبوی لکھ لیے تھے، کچھ زبانی یاد کر لیے تھے، جو ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں کسی لفظی اشتباہ تک کی گنجائش کو برداشت نہ کیا جاتا تھا۔ صحت اور سند کا پورا خیال اور احترام کیا جاتا تھا۔ کسی لفظ پر کوئی ہلکا سا شبہہ بھی ہوتا تو مستند راویان سے رجوع کیا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے تدوین حدیث کو خاص اہمیت دینی شروع کی۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور تھا۔ اس وقت علمائے کرام کثرت سے موجود تھے۔ اور خود عوام میں بھی احادیث کا ذوق عام ہو چکا تھا۔ متعدد علمائے کرام ذاتی طور پر جمع احادیث میں مصروف تھے۔ خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی علمائے کرام کو اس عظیم کام کے لیے تیار کیا۔ اس زمانے میں احادیث کی سینکڑوں کتابیں مرتب ہو گئیں۔ مرتبین کی صف اول میں سعید بن عروبہؒ زہری اور ربیعؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ بتانا کہ عالم اسلام میں سب سے پہلا مرتب کون تھا۔ جس نے احادیث کو مدوّن اور مرتب کیا۔ اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ علمائے کرام جنہوں نے جمع و تدوین حدیث کا آغاز کیا۔ ایک ہی دور اور عمر کے تھے۔ اس دور میں جمع حدیث کا ذوق و شوق اور بڑھا اور اس زمانے میں ایک موضوع کے تحت ہی احادیث جمع کی جاتی تھیں۔ یعنی اس زمانے میں محدثین کرام ایک ہی موضوع پر انفرادی طور سے احادیث جمع کیا کرتے تھے۔ کسی ایک مرتب کے ہاں مختلف موضوع کی احادیث نہیں ملتی ہیں۔

دوسرے دور میں امام مالک، امام اوزاعی حمادؒ، ابن جریجؒ اور سفیان قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں تدوین احادیث کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ امام مالکؒ کی "موطا" مدینہ منورہ میں لکھی گئی۔ امام مالکؒ کی موطا۔ فنِ حدیث کی پہلی بنیادی کتاب ہے۔ اسے نقشِ اولیں کی حیثیت حاصل ہے۔ امام مالکؒ کی موطا کے کچھ عرصہ کے بعد صحیح بخاری مرتب ہوئی جو سب سے بہتر، اکمل اور مکمل کتابِ احادیث ہے اور امام بخاری کا زمانہ وہی دورِ زریں ہے جب صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابوداؤد اور نسائی مرتب ہوئیں۔ ان کی اہمیت اور فضیلت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو اعلیٰ قدریں، صحیح بخاری کو حاصل ہوئیں کسی دوسری کتاب کو حاصل نہ ہو پائیں۔ اس کے بعد کے دور میں تو فنِ حدیث کو وہ کمال حاصل ہوا کہ درسِ حدیث اور فنِ حدیث کے حوالے سے ان گنت علمائے عظام سامنے آئے۔ جنھوں نے اپنی زندگیاں اسی نیک کام کے لیے وقف کر دیں۔

قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ دار خود خالقِ قرآن خدائے تعالےٰ ہے۔ احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری صحابہ کرام پر تھی جس کا انھوں نے حق ادا کر دیا۔

اس میں کچھ کلام نہیں نہ ہی اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں اور بعد میں ہی احادیث میں رطب و یابس اور من گھڑت احادیث کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی مختلف وجوہات سامنے آتی ہیں جن کا یہاں تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ٹھوس علمی حقیقت ہے کہ علمائے کرام نے ان امور کی طرف پوری توجہ دی۔ صحت و اسناد کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی صحیح اور غریب و غیر ثقہ احادیث کی پرکھ کا نازک کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ جس کے لیے ان بزرگوں نے کچھ اصول وضع کیے۔ چنانچہ جو حدیث ان وضع کردہ اصولوں پر پورا نہ اُترتی تھی اسے شامل نہ کیا جاتا تھا۔ "اصول حدیث" کے علم و فن نے بھی وقت کے ساتھ ترقی کی اور اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے۔

اسی فن کی ایک شاخ "اسماء الرجال" ہے جس پر دنیا بھر کے علماء اور محقق داد دیے بغیر نہیں رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اس کے پاس اس کی اپنی کوئی ایسی مکمل تاریخ موجود ہو، جیسی مسلمانوں کی ہے۔ جس میں مسلمانوں

کا قانون، فقہ، تمدن، معاشرہ اور کلچر سب کچھ موجود ہے۔

امام بخاری نے جو اصول وضع کیے۔ ان میں ان کا بنیادی اصول تو یہ ہے کہ انہیں ہر طرح کی احادیث جمع کرنے کا شوق نہیں۔ وہ ثقہ اور مستند احادیث کو سب سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلے راوی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ راوی کے سلسلے کو جانچتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ راوی کے خاندانی حالات، اس کے افکار و خیالات، اخلاق و عادات، صدق و وفا، ضروریات، وطن مالوف خاندان، امانت دیانت، نیکی اور ایمانداری ان تمام پہلوؤں پر تحقیق کر کے یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کن درجات پر فائز ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بھی سامنے رکھتے ہیں کہ اس راوی کا تعلق۔ راوی اول سے حقیقی ہے یا سنی سنائی کہی جا رہی ہے۔ امام بخاریؒ راوی کی زندگی کو پرکھتے ہیں۔ اس کے اعمال کو سامنے رکھتے ہیں راوی کی نیک طینتی کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ وہ بہک سکتا ہے۔ ترغیب میں آسکتا ہے۔ امام بخاری یہ بھی پیش منظر رکھتے کہ راوی نے انصاف سے گریز تو نہیں کیا؟ وہ کوئی غیر فطری بات تو نہیں کہہ رہا؟ اس کڑی جانچ پڑتال۔ تحقیق و تدقیق کے بعد امام بخاریؒ کے پاس ایک اور کسوٹی بھی تھی۔ تمام احادیث کو آیاتِ وحی سے مطابقت کی کسوٹی، یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ مسائل شرع اور اجرائے فتاوے کے باب میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ امام بخاریؒ کی محنت، تحقیق اور ایمان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اس ڈر سے کہ کوئی حدیث کلام الٰہی یا کلمۂ الٰہی کے منافی نہ ہو جائے۔ استخارہ بھی کیا کرتے تھے۔

امام بخاریؒ کا عقیدہ اور اصول تھا کہ حضور نبی کریمؐ کا ہر ارشاد۔ ارشاد ربانی کی تائید میں ہوگا۔

امام بخاری ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام ابوعبداللہ محمدؒ بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بروزبہ لجعفی بخاری ہے۔ امام بخاری کے والدِ محترم کا انتقال ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ اس لیے والدہ ماجدہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائی۔ کچھ ہوش سنبھالا تو محلے کے مدرسے میں پڑھنے جانے لگے۔ امام بخاریؒ کی عمر

نو برس تھی کہ انھوں نے قرآن پاک کو حفظ کر لیا۔ دس برس کی عمر میں وہ فنِ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۶ برس کی عمر میں اس میں خاص قابلیت پیدا کر چکے تھے۔

امام بخاریؒ کے دور میں فنِ حدیث سے منسلک علمائے کرام کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی انہیں اعلیٰ سرکاری عہدوں سے نوازا جاتا تھا۔ مگر امام بخاری کو ایسے عہدوں اور اعزازات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ عابد اور متقی پرہیزگار تھے۔ آپ کسی لالچ اور خواہش کے بغیر خدمت حدیث میں مصروف رہے۔ دربار اور دنیاوی عز و جاہ کے کبھی قریب تک نہ پھٹکے۔

امام بخاریؒ ۲۱۰ھ میں اپنی والدہ محترمہ اور بھائی کے ساتھ حج کے لیے حرمین شریف کے سفر پر روانہ ہوئے۔ حج کے فریضہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ان کی والدہ ماجدہ اور بھائی تو واپس وطن چلے گئے۔ لیکن امام بخاریؒ کو یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ وہیں قیام کا ارادہ کر لیا۔ امام بخاریؒ نے ایک عرصے تک ارضِ حجاز، یمن، شام، عراق اور دوسرے اسلامی مراکز سے علم حدیث حاصل کیا اور ایسا کمال پایا کہ سب سے بڑے محدث کے رتبے پر پہنچے،۔

امام ترمذیؒ جیسے ایک لاکھ کے قریب طلبا نے امام بخاریؒ سے علم حدیث کا فیض اٹھایا۔

آپ اپنے وطن آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وطن آئے تو حاکم صوبہ نے ان کو بلا کر درخواست کی کہ اس کے بیٹوں کو بھی وہ علم حدیث پڑھا دیں۔ ساتھ ہی حاکم صوبہ نے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ جس وقت میرے بیٹے پڑھیں تو دوسرے لڑکے پڑھنے نہ آئیں یا آپ ہمارے مکان پر آ کر ان کو تعلیم دیں۔

امام بخاریؒ نے اس کے جواب میں فرمایا یہ علم پیغمبر کی میراث ہے۔ میں اسے کسی ایک کے لیے مخصوص کرنا نہیں چاہتا۔ ساری امت اس میں شریک ہے۔ یہ سب کے لیے ہے جس کو غرض ہے میرے درس میں شریک ہو جائے۔

امام بخاریؒ کی سب سے مشہور تصنیف "الجامع الصحیح" ہے۔ جسے آج ہم صحیح بخاریؒ کے نام سے جانتے ہیں۔ صحیح بخاری سولہ برس کی تحقیق و تدوین اور محنت سے مرتب ہوئی امام

بخاریؒ کی یہ وہی کتاب ہے جسے کلام اللہ کے بعد مسلمانوں میں افضل ترین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے کہ یہ حدیث نبوی ہے۔ امام بخاری کی دیگر تصانیف میں ایک "تاریخ الکبیر" ہے جس میں علمائے حدیث کا تذکرہ ہے۔

"الادب المفرد" بھی امام بخاری کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اخلاق و معاشرت کے موضوع مسائل پر یہ احادیث کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ امام بخاری کے نام سے کئی چھوٹی بڑی کتابیں بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ جنکی حیثیت متنازعہ رہی ہے۔

امام بخاری نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

"صحیح بخاری" کو امام بخاری نے تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے کو تقدس و تبرک کے طور پر پارے کے نام سے موسوم فرمایا۔ احادیث کی تحقیق و موضوعات کے مختلف عنوانات کو ابواب سے موسوم کر کے اس کی تدوین کی۔ امام بخاریؒ نے لاکھوں احادیث کی چھان بین کی اور مستند و ثقہ احادیث کو صحیح بخاری میں شریک کیا۔ آٹھ ہزار احادیث کے اس مجموعے میں کسی ایک حدیث سے تکرار کا وجود نہیں ملتا۔

صحیح بخاری۔ رسول کریمؐ کے ارشادات کا ہی مجموعہ نہیں۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم و بے مثل کردار، عادات واطوار، شخصیت کا بھی آئینہ ہے۔ یہ اسلامی کلچر کا نقشہ بھی ہے کہ زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے اور مسلمانوں کا معاشرہ اور کلچر کیسا ہونا چاہیے۔ شرعی مسائل کے علاوہ انسان کی زندگی کے داخلی اور خارجی مسائل اور روز مرّہ کے آداب کے بارے میں بھی اس کتاب سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

صدیوں سے امام بخاریؒ کی مرتبہ "صحیح بخاری" ان گنت مسلمانوں اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ پورے عالم اسلام کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک اور اقوام میں اس کتاب کو اہمیت حاصل ہے۔

"صحیح بخاری" کی متعدد زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں اور ہمیشہ اس پر کام ہوتا رہے گا۔ اس کے کئی غیر مطبوعہ قلمی نسخے دنیا بھر کی اہم لائبریریوں میں موجود ہیں۔ شارح بخاری کی حیثیت سے کئی علماء نے بڑا نام اور احترام حاصل کیا ہے۔ جن میں ابن حجر عسقلانی سر فہرست ہیں۔

صحیح بخاری کے تراجم بھی دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ صحیح بخاری اور امام بخاری پر ان گنت کتابیں، مضامین شرحیں اور احوال دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔
فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور یورپ کی کئی دیگر معتبر زبانوں میں صحیح بخاری کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے صحیح بخاری کی شرح مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں ترتیب دے کر شائع کی۔
اُردو میں مرزا حیرت دہلوی نے صحیح بخاری کا ترجمہ کیا جو زبان و محاورہ کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے۔

صحیح بخاری، دنیا کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ایک ہے جنہیں سب سے زیادہ پڑھا گیا اور پڑھایا جاتا رہے گا اور ہر دور کا انسان اس سے رہنمائی حاصل کرتا رہے گا۔

۳

عہد نامہ عتیق

بنی اسرائیل کے نبیوں اور پیغمبروں پر جو صحائف نازل ہوئے یا الہام کے ذریعے انہوں نے ان کو دوبارہ مرتب کیا یا اپنی یادداشتوں کے حوالے سے لکھا یا نبیوں کے علاوہ ان کے ماننے والوں نے جو کچھ تحریر کیا اسے "عہد نامہ قدیم" یا عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کا نام دیا گیا ہے۔

صدیوں سے یہ کتاب ان گنت انسانوں کے مطالعے میں رہی ہے۔ اس کتاب کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ عہد نامہ عتیق کو اس لیے بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ عیسائی اسے اپنی اناجیل اور مقدس کتب کے مجموعے "عہد نامہ جدید" کے ساتھ منسلک رکھتے ہیں اور ان پر ایمان بھی اس اعتبار سے یہ کتاب جہاں یہودیوں میں ایک طویل عرصے سے زیر مطالعہ رہی ہے۔ اس طرح عیسائی بھی اس کا مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں یوں اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عہد نامہ عتیق۔ کیا ایک الہامی کتاب ہے؟ اس کے بارے میں اب کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہی کہ عہد نامہ عتیق کے حوالے سے یہودیوں کے ہاں الہام کا تصور بے حد ناقص اور ناکمل ہے۔ قرآن پاک نے تورات، زبور کی تصدیق کردہ الہامی کتابیں تھیں لیکن یہودیوں نے ان میں تحریف کر دی۔

مسیحی آج بھی عہد نامہ عتیق کو ایک مقدس کتاب کی حیثیت دیتے ہیں۔ جب کہ مسیحی علماء اور محققین نے جو کام طویل عرصے سے کیا ہے۔ اس سے یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ بھلے۔ اپنی اصلی صورت میں عہد نامہ عتیق ایک الہامی کتاب ہو۔ لیکن اپنی موجودہ صورت میں اسے کسی

طرح بھی الہامی کلام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عہد نامہ عتیق کی پہلی پانچ کتابوں۔ پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثناء کو یہودی تورات کہتے ہیں۔ اور ان پانچ کتابوں کا خالق حضرت موسیٰؑ کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن قدیم اور جدید تحقیق نے اس دعوے کو باطل قرار دیا ہے یہ کتابیں دراصل عظیم انسانی دانش فہم اور تجسس اور یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ عہد نامہ عتیق کے خالق ان گنت ذہین اور غیر معمولی انسان ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور کی یادداشتوں حکمت اور تاریخ کو صدیوں تک لکھا۔ یاد رہے کہ یہ اصول اس عہد نامہ عتیق پر اطلاق کرتا ہے جو آج دنیا میں موجود ہے اور جسے ان گنت انسان پڑھتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں عہد نامہ عتیق کے صرف تین نسخے محفوظ ہیں۔

۱۔ یونانی نسخہ ۔ ۲۔ عبرانی نسخہ ۔ ۳۔ سامری نسخہ

یونانی نسخے کو ساتویں صدی عیسوی تک عیسائی معتبر تسلیم کرتے رہے۔ تب عبرانی نسخہ کو تحریف شدہ کہا جاتا تھا۔ بہرحال عہد نامہ عتیق کا یہ یونانی نسخہ آج بھی یونانی اور مشرقی کلیساؤں میں معتبر مانا جاتا ہے۔

۲۔ عبرانی نسخہ وہ ہے جس کو یہودی بھی معتبر مانتے ہیں اور عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ بھی۔

عبرانی اور یونانی نسخے ہی وہ نسخے ہیں جن میں عہد نامہ عتیق کی تمام کتابیں شامل ہیں۔ سامری نسخہ صرف سات کتابوں پر مشتمل ہے اور اسے یہودیوں کا سامری فرقہ معتبر و مقدس تسلیم کرتا ہے۔

ان تینوں نسخوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عہد نامہ قدیم۔ الہامی نہیں ہے۔

عبرانی نسخہ میں حضرت آدمؑ سے لے کر طوفان نوحؑ کا زمانہ ۱۶۵۶ سال بتایا جاتا ہے جبکہ یونانی نسخے میں حضرت آدم سے طوفانِ نوحؑ کا زمانہ ۲۲۶۲ برس بتایا گیا ہے جبکہ سامری نسخہ یہ زمانہ ۱۳۰۷ برسوں پر مشتمل ہے۔

ہنری واسکاٹ نے COMMENTRY (جلد اول) میں اس حوالے سے لکھا ہے کہ

"یہودی تحریف کرنے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ عیسائی دشمنی میں بھی انہوں نے اپنی ہی مقدس کتابوں کی تحریف کر ڈالی۔ کہا جاتا ہے کہ تورات میں یہودیوں نے تحریف ۱۴۰ء میں کی ہے۔"

جدید محققین اور علماء نے تاریخی شواہد، اسناد اور آثار قدیمہ کے حوالے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد نامہ قدیم ایک تاریخ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ کتب پر مصری تہذیب اور عقائد کی گہری چھاپ ہے۔ قدیم ترین دور کے علماء دانشور اور فہم رکھنے والے ان گنت انسانوں نے اس کی تصنیف میں حصہ لیا ہے۔ اس اعتبار سے عہد نامہ عتیق ایک بے مثل اور منفرد کتاب ہے جس کی تخلیق ان گنت دانشوروں، علماء اور حکماء کی مرہون منت ہے۔ عظیم مورخین۔ جن میں لیکی، براؤننگ جیسے محقق شامل ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے حوالے سے عہد نامہ عتیق کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ خود یہودیوں کی اپنی تاریخ اور ان کی بداعمالیاں اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مقدس کتابوں میں تحریف کی بلکہ اصل کتابیں ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکی نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں لکھا ہے:

"یہود اپنی عملی زندگی میں سے زیادہ تر اور سب سے زیادہ فتنہ ساز تھے۔"

عہد نامہ عتیق میں ایک کتاب "قضاۃ" (JUDGES) کے نام سے ہے۔ اگر عہد نامہ عتیق کے حوالے سے اور اس کے بعد کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ "قاضیوں" کے عہد کے بعد یہودیوں میں سلاطین (KINGS) کے دور کی ابتدا ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے زیادہ شہرت حضرت داؤدؑ نے پائی۔ ان کے بعد حضرت سلیمانؑ آئے اور حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ یہود میں نفاق پیدا ہوا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ۵۸۶ ق۔م میں بابل کے شاہ بخت نصر نے یہود کی جنوبی حکومت کو تباہ کر دیا۔ اس حکومت کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ جس کی تباہی کا نوحہ عہد نامہ عتیق میں شامل ہے اور جسے یرمیاہ نبی کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ یروشلم میں ہیکل سلیمانی میں حضرت سلیمانؑ نے تورات اور دیگر تبرکات کی الواح کو محفوظ کیا تھا۔ بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو بھی آگ لگا دی۔ اس نے تمام مذہبی کتابیں جلا دیں جو یہودی زندہ بچے ان کو اپنے ساتھ بابل لے گیا۔

ہیکل سلیمانی کی تباہی، تورات اور مقدس تبرکات کے ضیاع کی شہادت خود عہد نامہ عتیق (کتاب سلاطین باب ۲۴، ۱۱ - ۱۷) میں ملتی ہے۔ تقریباً نصف صدی کے بعد شاہ ایران خورش نے بابلیوں کو شکست دی تو اس نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ یہود کے نبیوں عذرا اور نحمیاہ کی کوششوں سے اس کی تعمیر ۵۱۵ ق۔م میں ہوئی۔ لیکن تورات اور مقدس تبرکات کا سراغ نہیں ملتا۔ سکندر اعظم کے زمانے میں یہودی ایرانی اقتدار کے زیر سایہ زندہ رہے۔ ایرانیوں کے بعد وہ یونانیوں کے زیر حکومت رہے۔

۱۶۸ ق۔م میں انطاکیہ کا واقعہ پیش آتا ہے۔ جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں موجود ہے کہ شاہ انتوکس نے یروشلم فتح کیا اور اسے وہاں عہد نامہ عتیق کے جتنے نسخے ملے سب پھاڑ دیے یا جلا دیے۔ اور حکم دیا کہ جس سے عہد نامہ عتیق کا کوئی نسخہ برآمد ہوگا وہ مار ڈالا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر مہینے یہود کی تلاشی لی جاتی اور جس سے عہد نامہ عتیق کا کوئی نسخہ ملتا۔ اسے جان سے مار دیا جاتا اور نسخہ تلف کر دیا جاتا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک یہودی حکومت پھر قائم ہوئی۔ لیکن ۷۰ء میں رومی حکمران ٹیٹس (TETHS) نے یروشلم کو پھر برباد کیا۔ ہیکل سلیمانی ایک بار پھر تاراج ہوا۔ اس کے بعد یہودیوں کی طویل غلامی اور ذلت کا دور شروع ہوتا ہے۔

مورخین اور محققین نے اس تاریخی پس منظر کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سلیمان کے بعد یہود کی تخریب اور بربادی اور بداعمالیوں کی سزا کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کسی طور پر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دینی صحیفے اپنی اصلی حالت میں برقرار رہے ہوں گے۔

یہودیوں کے ایک مذہبی رہنما ربی (RABBI) یہودا نے حضرت عیسیٰؑ کے سو برس کے بعد احبار اور دوسری کتب کے احوال کو جمع کیا۔ جس کا نام (MISHNA) یعنی زبانی تعلیم ہے۔ یہ گویا تورات کی تفسیر ہے۔ اصل تورات ناپید ہے اور جن کتب کو یہود تورات کہتے ہیں۔ وہ الہامی کلام نہیں۔ بلکہ انسانوں کا جمع کردہ اور عقل و فہم اور یادداشتوں پر مبنی ہے۔ "مشنا" کی بھی ایک تفسیر کی گئی۔ یعنی تفسیر کی بھی تفسیر ہوئی اور اس کا نام گومرا (GOMRA) رکھا گیا۔ ان

دولوں ضخیم مجموعہ کو تالمود کا نام دیا گیا۔

'تالمود' بھی ایک نہیں ہے۔ ایک لاطینی اور دوسری بابلی 'تالمود' کو یہود عہد نامہ عتیق کے بعد دوسرا درجہ دیتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور جیوش انسائیکلوپیڈیا، میں یہ تفصیل موجود ہے جس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ تورات کا اصل نسخہ غائب اور ناپید ہو گیا ہے۔

عہد نامہ عتیق میں شامل کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثنا، یسوع، قضاۃ، روت، سموئیل (۱) سموئیل (۲)۔ سلاطین (۱)۔ سلاطین (۲) تواریخ (۱) تواریخ (۲) عزرا، نحمیاہ، آستر، ایوب، زبور، امثال (سلیمان) واعظ غزل الغزلات، یسعیاہ، یرمیاہ، نوحہ، حزقیل، دانیال، ہوسیع، یوایل عاموس، عبدیاہ، یوناہ، میکاہ، ناحوم، حبقوق، صفنیاہ، حجی، ذکریا، ملاکیا۔

عہد نامہ عتیق کی یہ کل ۳۹ کتابیں جو یہودیوں کے علاوہ عیسائی پروٹسٹنٹ فرقے کے نزدیک بھی معتبر و مسلم ہیں لیکن رومن کیتھولک فرقے کے عہد نامہ عتیق میں کتابوں کی تعداد ۳۹ نہیں بلکہ ۴۶ ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی جس عہد نامہ عتیق کو معتبر مانتے ہیں ان میں یہ کتابیں بھی شامل ہیں۔

طوبیاہ، یہودیت، حکمت، یسوع بن سیراخ، باروک مکابین (۱) مکابین (۲)

یہود اور عیسائی ان متذکرہ بالا کتابوں کے بارے میں یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ کتابیں اپنی اصلی زبانوں یعنی عبرانی اور کالدی میں جھوٹی ہیں۔ اور نہ ہی یہ کتابیں اپنے اصل زمانے میں کبھی موجود تھیں۔ ربی شمعون ایلیا جو یہودیوں کے بڑے نامور مذہبی عالم اور محقق ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جھوٹی کتابیں ہیں۔

عہد نامہ عتیق، صدیوں سے ساری دنیا میں، مختلف زبانوں میں پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کتاب کی حیثیت ایک تاریخ کی ہے۔ اور ایک طویل رزمیے اور حکایت کی بھی۔ اس کتاب کے حوالے سے دنیا میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ دنیا کے ان گنت انسان اپنے عقیدے کی وجہ سے عہد نامہ عتیق کو ایک خدائی کتاب مانتے ہیں۔

عہد نامہ عتیق۔ انسانی جستجو، تجسس، فہم اور دانش کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال

نہیں ملتی۔ عہد نامہ عتیق کے حوالے سے انسانی تاریخ کا قدیم ترین دور سامنے آتا ہے۔ اس کا آغاز تو کائنات کی تخلیق کی داستان سے ہوتا ہے کہ یہ دنیا کس طرح بنی اور کس طرح بڑھی پھولی۔
اس میں خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کے حالات ہیں۔ ان کے بارے میں حکایات ہیں۔ قدیم ترین دور کا تہذیبی منظر بھی موجود ہے۔ انسانوں کی عادات اور ان کے رسم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عہد نامہ عتیق میں تنوع ہے انسانی تجربے کا ایک جہان آباد ہے۔ عہد نامہ عتیق نے دنیا بھر کے علوم و فنون کو متاثر کیا ہے اس کے اقوال اور تمثیلیں، اس کی حکایات نے ہر دور کو متاثر کیا ہے۔ علوم و فنون کے لیے عہد نامہ عتیق ایک لازوال سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'عہد نامہ عتیق' میں اجتماعی انسانی، دانش اور حکمت کے وہ بے مثل شہہ پارے بھی ملتے ہیں جن کی مثال کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔ مذہبی اعتبار سے آج اس کی جو حیثیت ہے۔ اس پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے۔ لیکن ایک اہم انسانی دستاویز کے حوالے سے عہد نامہ عتیق۔ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہر دور کا ہر انسان بہت کچھ حاصل کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ 'عہد نامہ عتیق' کی زبان اس کا شکوہ، اس کا حسن تراجم میں بھی وہ تاثیر رکھتے ہیں کہ جو دلوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ "عہد نامہ عتیق" میں جہاں تاریخ ہے پیغمبروں کے قصے اور حکایات ہیں وہاں سلیمانؑ کے نام سے منسوب 'امثال' بھی ہیں جو حکمت و دانش کا بے مثل خزانہ ہیں۔ اس میں غزل الغزلات جیسی بے مثل شاعری بھی ہے۔ یرمیاہ نبی کا نوحہ بھی ہے اور روت، ایک عام عورت کی وفا شعاری، انسانیت دوستی اور بے مثل خدمت گزاری کی دلگداز داستان بھی۔ اس میں انسانی زندگی کا وہ سارا کرب بھی موجود ہے جو انسان اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ مصائب کا شکار ہوتا ہے۔

عہد نامہ عتیق کی کتاب "ایوب" انسان اور خدا کا ایک ایسا مکالمہ ہے۔ انسانی آلام و مصائب میں مبتلا انسان کا ایسا نقشہ ہے جو تخلیق اور تاثیر کے اعتبار سے شاید ہی اپنی مثال رکھتا ہو۔ 'عہد نامہ عتیق، دنیا کے قدیم ترین دانشوروں، شاعروں، حکیموں، علما اور انسانوں کا ایک عظیم اور بے مثل ورثہ ہے۔ یہ انسانی تاریخ کے آغاز سے بھی پہلے کائنات

کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور ہزاروں برسوں تک پھیلا ہوا ہے۔ عہد نامہ عتیق کو اس اعتبار سے بھی دنیا کی عظیم کتاب کا درجہ حاصل ہے کہ جہاں ان گنت لوگ اپنے عقیدے کے تحت اسے ایک الہامی اور مقدس کتاب کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ وہاں ایسا عقیدہ نہ رکھنے والوں کے لیے بھی یہ تاریخ اور عقل و دانش کا ایک بے مثل خزینہ ہے۔ ان گنت انسانوں کے فہم و دانش کا مجموعہ

عہد نامہ عتیق نے صدیوں سے انسانی اذہان کو محظوظ کیا ہے۔ وہاں ہر دور میں یہ کتاب کسی نہ کسی پہلو سے انسانوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

۴

عہدنامہ جدید

عہدنامہ جدید جسے عرف عام میں انجیل مقدس کا نام دیا گیا ہے۔ وہ کتاب ہے جسے دنیا بھر کے کروڑوں عیسائی اپنی مذہبی اور رہنما مقدس کتاب تسلیم کرتے ہوئے اپنے عقیدے کے مطابق اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یقینی امر ہے کہ وہ لوگ جو اس کتاب پر مذہبی عقیدہ استوار نہیں کرتے اور نہ ہی اسے الہامی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ کتاب حکمت و دانش کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے ہر مذہب اور ہر نقطہ خیال کا پڑھنے والا اپنے اپنے انداز میں کسب فیض کر سکتا ہے۔

عہدنامہ جدید ستائیس (۲۷) کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں چار اناجیل ہیں۔ متیؔ کی انجیل، مرقس کی انجیل، لوقا کی انجیل، یوحنا کی انجیل، ان چار اناجیل کے علاوہ ایک کتاب "رسولوں کے اعمال" ہے جس کا مصنف لوقا کو بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پولوس رسول کے چودہ خطوط ہیں۔ جو رومیوں (ایک) کرنتھیوں (۲) گلتیوں (ایک) افسیوں (ایک) فلپیوں (ایک) کلسیوں (ایک) تھسلنیکیوں (۲) تیمتھیس (۲) ططس (ایک) فلیمون (ایک) اور عبرانیوں (ایک) کے نام خطوط ہیں۔ پولوس رسول (سینٹ پال) کے ان چودہ خطوط کے علاوہ ایک۔ یعقوب کا عام خط ہے۔ پطرس کے دو عام خط، یوحنا کے تین خطوط اور ایک یہوداہ کا عام خط ہے۔ آخری کتاب یوحناؔ عارف کا مکاشفہ ہے جس میں پیشگوئیاں کی گئی ہیں اور عیسائیوں کا ایک بڑا طبقہ۔ یوحناؔ عارف کے مکاشفے کو الہام قرار دیتا ہے۔

عہدنامہ جدید میں برناباس کی انجیل شامل نہیں کی گئی ہے۔ جس کا ذکر قدرے تفصیل سے آئے گا۔ عہدنامہ جدید کا پس منظر اور صحیح مقام سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ

پولوس رسول کا کچھ ذکر کیا جائے جسے مسیحی محققین، مورخین اور مذہبی علماء ایک طرح سے مسیحیت کا بانی قرار دیتے ہیں جو آج مختلف شکلوں میں رائج ہے اور پولوس رسول کو اس کا سب سے بڑا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ پولوس رسول کا اصلی نام شاؤل تھا۔ وہ ایک یونانی یہودی تھے۔ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ پر بھی عبور رکھتے تھے۔ پولوس رسول نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیکھا وہ مسیحیوں کا جانی دشمن تھا۔ ان پر شدید ترین ظلم وتشدد روا رکھنا اسے بے حد مرغوب تھا۔ مسیحیوں کے دلوں پر اس کی دہشت سوار تھی۔ وہ اس کے نام تک سے لرزتے تھے ایک دن حالتِ سفر میں شاؤل نے سورج کی روشنی سے بھی زیادہ روشن نور دیکھا اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آواز سنی کہ تو مجھے کیوں ستاتا ہے۔ شاؤل تائب ہوا اور اس نے مسیح کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے حواری اور ماننے والے اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک تو وہ اس سے خائف تھے دوسرے وہ اسے نیک نیت تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے برگزیدہ حواری برناباس نے اس کا تعارف حواریوں اور معتقدین سے کروایا اور برناباس کی سعی سے ہی اسے قبول کیا گیا۔ مسیح کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لینے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ کم وبیش تین برس تک پولوس رسول کی سرگرمیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ان تین برسوں میں پولوس رسول نے گہرا غور و خوض کیا کہ اسے مسیحیت کو کن بنیادوں پر استوار کرنا ہے پولوس کو جدید مسیحیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کی تعلیمات مسیحؑ میں اس کی وجہ سے تحریف کا آغاز ہوا۔ پولوس رسول کے حوالے سے چند اہم حقائق خاص طور پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں ایک زمانے میں وہ اور برناباس دونوں تبلیغ کے لیے ایک ساتھ جاتے تھے وہ دونوں انطاکیہ اور ایشیائے کوچک کے کئی علاقوں میں ایک ساتھ خلوص اور جوش کے ساتھ نئے مذہب کی تبلیغ میں مصروف اور صعوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن بعد میں ایسے گہرے مراسم کے باوجود ان دونوں کے مابین ایک معمولی سی وجہ سے اختلافات کا ایسا آغاز ہوا کہ پولوس رسول نے برناباس کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کا کامیاب آغاز کیا۔

اب ذرا یہ دیکھیے کہ یہ عہد نامہ جدید کس ترتیب سے لکھا گیا اور مکمل ہوا۔ اناجیل اربعہ

کو دراصل "خدا کا کلام" کہا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولوس رسول کے خطوط پہلے لکھے گئے اور اناجیل بعد میں۔ برٹینن نے سولائزیشن آف دی ویسٹ میں لکھا ہے۔

سینٹ پال (پولوس رسول) کا خط کرنتھیوں کے نام ۵۵ء میں لکھا گیا۔ رسولوں کے اعمال کا زمانہ تحریر ۶۰ء سے ۶۲ء ہے۔ مرقس کی انجیل کا سن تصنیف ۶۵ء ہے۔ متی اور لوقا کی اناجیل ۸۰ء اور ۸۲ء کے درمیان لکھی گئیں۔ جبکہ یوحنا کی انجیل ۱۰۰ء میں لکھی گئی

ایک اور عیسائی عالم اور محقق جیمس ڈینیل کا بیان بھی دیکھیے۔

"مسیحیت میں فرقے پیدا ہوئے ہر فرقہ خود کو مسیح کا صحیح مقلد بتاتا ہے اور اپنی تائید میں پیش گوئیاں، رسالے، اناجیل اور مکتوبات پیش کیا کرتا تھا ایسی اناجیل کی تعداد ۲۷۰ تک پہنچ گئی جن میں سے چار کو منتخب کیا گیا۔"

قرآن پاک میں ذکر آیا ہے اور شہادت ملتی ہے کہ اناجیل میں تحریف کی گئی جس سے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم مسخ کر دی گئی اگر عیسائیت کے بارے میں ایک عام سوال پوچھا جائے کہ عیسائیت کیا ہے تو اس کا سادہ جواب یہ جائے گا کہ عیسائیت کی بنیاد تثلیث، حلول، تجسیم اور کفارے پر رکھی گئی ہے جبکہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں یہ تینوں عنصر موجود نہیں نہ ہی ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے۔ دراصل یہ پولوس رسول تھا۔ جس نے عیسائیت کو اپنے انداز و فکر کے مطابق اپنے سانچے میں ڈھال کر ایک مذہب بنا دیا۔ اناجیل اور عہد نامہ جدید کے مشمولات کے بارے میں خود عیسائیوں میں ہی اختلافات و شکوک کا سلسلہ ابتدائی زمانوں میں ہی شروع ہو گیا تھا سب سے زیادہ بحث یوحنا کی انجیل پر ہوتی ہے۔ جس کا کچھ خلاصہ پیش خدمت ہے۔

دوسری صدی عیسوی میں ہی عیسائیوں کے ایک بڑے طبقے نے یوحنا رسول کی انجیل کو ان کی تصنیف ماننے سے انکار کر دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۳) میں اس پر طویل بحث و حقائق موجود ہیں۔ اصل یوحنا جو عیسیٰؑ کے حواری تھے وہ ان پڑھ اور ماہی گیر تھے جبکہ یوحنا کی انجیل تعلیم یافتہ اور اثر و رسوخ رکھنے والے کسی بلند رتبے کی لکھی ہوئی ہے فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا میں تو یہ صاف نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یوحنا کی انجیل دراصل خود لوقا کی

رسول کی تصنیف ہے۔ جس نے اسے یوحنا کے نام سے منسوب کر دیا۔ کیونکہ یوحنا پولوس رسول کا چہیتا تھا۔ مسیحی علماء اور محققین میں سے ہلمین سٹریٹر، بشپ گور اور ویسکاٹ جیسے عالمی شہرت یافتہ محقق۔ یوحنا کی انجیل کو یوحنا کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ پورے عہد نامہ جدید میں تحریف کے قائل ہیں۔

اناجیل کی تعداد چار نہ تھی۔ اس کی شہادت تو خود لوقا کی انجیل سے بھی ملتی ہے خود لوقا نے اعتراف کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اناجیل لکھی تھیں۔ خود لوقا کا یہ حال ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تک نہ تھا۔ اس نے یہ انجیل پولس رسول کے زیر اثر لکھی۔ لوقا کی انجیل میں متی اور مرقس کی اناجیل کے مقابلے میں مواد بھی کہیں زیادہ ہے یوحنا کی انجیل کا ذکر پہلے آچکا ہے اس کے بارے میں پادری برکت اللہ کہتے ہیں :۔

"ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ روایت کہ انجیل چہارم مقدس یوحنا ابن زبدی کی تصنیف ہے۔ صحیح نہیں ہو سکتی۔"

(قدامت و اصلیت اناجیل جلد دوم صفحہ ۱۴۱)

بیشتر عیسائی علماء اور محقق اس بات پر متفق ہیں۔ یوحنا کی انجیل دراصل حضرت عیسیٰؑ کے حواری یوحنا ابن زبدی کی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے فرد یوحنا بزرگ (ELDER) کی تصنیف ہے اور عہد نامہ جدید میں جو خطوط یوحنا کے نام سے شامل ہیں دراصل وہ بھی اسی یوحنا بزرگ کے ہیں جس نے حضرت عیسیٰؑ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ رسولوں کے اعمال کا مصنف لوقا کو بتایا جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا فیصلہ ہے ان میں سے صرف دس خطوط پولس رسول کے ہیں۔ چار خطوط کسی اور کے لکھے ہیں۔ دریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ :۔

"پال (پولوس رسول) کے خطوط ۵۱ء میں لکھے گئے۔ جب ابھی اناجیل نہ لکھی گئی تھیں۔ عہد نامہ جدید میں جو خطوط پطرس کے ہیں ان کی اصلیت بھی سامنے آچکی ہے۔ ایک تو یہ کہ پطرس ان پڑھ تھے اور پھر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱، مقالہ "پیٹر") کے مطابق۔

پطرس کا پہلا خط اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب پطرس خود زندہ نہ تھے۔ گویا خط ان کے نام سے ان کی موت کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔

تحریف و ترمیم کی بحث اور اس کے متعلق حقائق کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ کے اب اس انجیل کی طرف آئیے جو برناباس کی انجیل کے نام سے مشہور ہے لیکن وہ عہدنامہ جدید میں شامل نہیں۔ یہ انجیل برناباس سولہویں صدی میں پوپ اسکٹس پنجم کے خفیہ کتب خانے سے ملی تھی۔ ایک زمانے سے اس انجیل کو مٹانے کی کوشش جاری تھی۔ پوپ جیلاشش اول نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی کئی برس پہلے برناباس کی انجیل کے بارے میں یہ حکم صادر کیا تھا کہ اس کو پاس رکھنے والا اور اس کو پڑھنے والا مجرم سمجھا جائے گا۔ اور اس کی نجات کبھی نہ ہوگی۔ برناباس کی انجیل کی مخالفت بلا وجہ نہ تھی۔ جب پولوس رسول نے اصلی اور حقیقی مسیحی تعلیمات کو مسخ کرنا شروع کیا تو پولوس رسول اور برناباس کے کے درمیان اختلافات نے جنم لیا۔ برناباس۔ حضرت عیسیٰؑ کا حواری تھا۔ راب اسے کیا کہیئے کہ اناجیل میں بارہ اسماء کے بارے میں ساری اناجیل متفق نہیں بلکہ ان میں اختلاف ہے۔ اعمال اور متی کے تضادات اس کے سوا ہیں، برناباس اپنی انجیل میں ان عقائد سے انکار کرتا ہے جو دیگر اناجیل اور پولوس رسول کی تعلیمات میں ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تسلیم نہیں کرتا۔ عہدنامہ قدیم کے صحیفوں میں جس مسیح کی آمد کی نوید دی گئی تھی برناباس کی انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں میں وہ نہیں بلکہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں انجیل برناباس میں حضور کا اسم مبارک محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہے۔ برناباس کی انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب ہوتے ہوئے بھی نہیں دکھایا جاتا۔ بلکہ برناباس کہتا ہے کہ وہ غدار یہودا اسکریوتی کی صورت بدل دی گئی تھی اور اسے عیسیٰؑ سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح برناباس یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ نہیں تھے، بلکہ حضرت اسماعیلؑ تھے جن کو رضائے خداوندی کے لیے قربانی کے لیے لے جایا گیا تھا جب کہ عہدنامہ قدیم میں حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح اللہ کا مرتبہ دیا گیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ برناباس کی انجیل کی تعلیمات دیگر اناجیل سے مختلف ہیں۔ نیز لوس

رسول کی تعلیم کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لیے برناباس کی انجیل کو چھپانے اور مٹانے کی کوشش کی گئی اور یہاں تک کہا گیا کہ برناباس کی انجیل کسی مسلمان کی تصنیف ہے جو عیسائیوں میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرنے کے لیے "گھڑ ی" گئی ہے۔

یہ بحث اپنی جگہ۔ اب آئیے عہد نامہ جدید کی طرف اناجیل میں دراصل حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات قلم بند کی گئی ہے اور تحریف اور ترمیم کے باوجود اس میں حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ اگرچہ اس پر بھی بعض مسیحی علماء کو خاصے اعتراضات ہیں۔ برنٹین کی کتاب "تہذیب یورپ" کو ایک مسلمہ حقیقی اور تاریخی مطالعہ اور کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اردو میں مولانا غلام رسول مہر نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس دیکھیے جو فرانس کے عظیم ناول نگار ادیب اور نوبل انعام یافتہ مصنف اناطول فرانس کے حوالے سے ہے۔ اناطول فرانس کا قول یوں ہے۔

"یہودی عہد نامہ قدیم کو لفظاً لفظاً درست سمجھتے ہیں۔ یہی کیفیت عہد نامہ جدید کے متعلق عیسائیوں کی ہے۔ اگر یہ کتابیں خدا کی طرف سے ایسا ہی الفاظ کا مجموعہ ہیں تو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر عہد نامہ جدید کو اس کی موجودہ صورت میں دور حاضر کے اسی طور طریق پر پرکھا جائے جن کے متعلق اور مذہبی رسائل سے حاصل کردہ دستاویزوں کو پرکھا جاتا ہے تو ماہرین فن کی متفقہ رائے یہ ہے کہ متفق علیہ اناجیل کو حضرت مسیح کی زندگی کے متعلق معاصر دستاویز قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

(تہذیب یورپ برنٹن۔ ترجمہ مولانا غلام رسول مہر)

اناجیل یقیناً خدا کا کلام نہیں ہیں۔ اگر یہ خدا کا کلام ہیں تو پھر اس کے بار بار REVISED AUTHORISED VERASION کیوں شائع ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء تک مکمل عہد نامہ عتیق و جدید کے جو انگریزی کے تراجم ہوئے ان کو پچاس سے زائد مرتبہ REVISE کیا گیا اور عہد نامہ جدید کا صرف انگریزی ترجمہ ۱۱۰ مرتبہ REVISE ہو چکا ہے۔ اب رہی سہی کسر ریڈرز ڈائجسٹ والوں نے نکال دی ہے کہ وہ عہد نامہ عتیق و جدید کی ایک تلخیص شائع کر رہے ہیں۔

تحریف کی دو نمایاں صورتیں ہیں۔ تحریف معنوی کہ اصل معانی کو مسخ کیا جائے اور تحریف لفظی

کے الفاظ بدل دیے جائیں۔ جرمن محقق ڈاکٹر سیسل نے عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر لیے ان موازنہ اور مقابلہ کیا تو اس نے تیس ہزار اختلافات عبارت شمار کیے۔

بائیبل مقدس کا جو نیا ترجمہ چند برس پہلے امریکہ سے شائع ہوا اور پاکستان کے متعدد کلیساؤں کو اس کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اور وہاں اسے پڑھا جاتا ہے اس کے بارے میں پادری عنایت ایس مل لکھتے ہیں

"اس ترجمہ کے ذریعے کلیسا میں بدعتی تعلیم رائج کی جارہی ہے۔ کلام مقدس کی بیشتر آیات خداوند مسیح کی الوہیت، کفارہ اور خداوند کے آسمان پر اٹھائے جانے کے متعلق ہیں۔ اس نئے امریکی بائبل آر۔ ایس۔ وی سے کسی وجہ اور تشریح کے بغیر نکال دی گئی ہیں۔

اپنے اس پس منظر کے باوجود ان گنت عیسائی جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس کتاب کو اپنی مذہبی اور الہامی کتاب کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ تاہم اصل انجیل مفقود ہو چکی ہے۔ عہد نامہ جدید میں جو کچھ موجود ہے۔ اس میں حکمت و دانائی اور ہدایت کا خزانہ موجود ہے۔ بھلا پہاڑی کے وعظ کی تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ عہد نامہ جدید دنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے والی عظیم کتاب ہے لیکن سب سے زیادہ پڑھی جانے والی نہیں۔

جے۔ ڈبلیو۔ سی وانڈ (WAND) نے اپنی تازہ کتاب "دی چرچ ٹوڈے" (THE CHURCH TO DAY) میں لکھا ہے۔

کیا یہ افسوسناک صورتِ حال نہیں کہ ہمارے کیتھولک علماء کی ایک کثیر تعداد جو ہمارے پادری بھی ہیں انہوں نے بائیبل کو کبھی پورا نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ عہد نامہ جدید کو بھی۔

۵

گیتا

بھگوت گیتا ــ سنسکرت کے عظیم اور قدیم رزمیے "مہابھارت" کے چھٹے باب کا ایک حصہ ہے۔ جس کا اجمالی ذکر آگے چل کر آئے گا۔

گیتا ــ نغمۂ جاوید ہے۔ اس میں بھگوان کا "راز" گایا گیا ہے۔ سب شاستروں اور ویدوں کی روح اس میں موجود ہے۔ یہ ویدانت کی تفسیر ہے۔

گیتا ــ میں سات سو اشلوک، اٹھارہ ادھیائے ہیں جو تین برابر حصوں "کرم" بھگتی" اور "گیان" پر مشتمل ہیں۔ ہندوؤں میں اپنے عقیدے اور دوسرے پُرانوں کے حوالے سے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں۔ لیکن گیتا پر وہ سب متفق ہیں اور اس پہ مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں۔

گیتا کے حوالے سے چند اہم باتیں

ہندوؤں نے اپنی تاریخ مدوّن نہیں کی لیکن ان کی زبان سنسکرت ان کی تاریخی قدامت پر دلالت کرتی ہے۔ ہندومت کے بارے میں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے اور اسے میکس ملر کے ایک جملے کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ میکس ملر نے یونانی فلسفے پر ہندو فلسفے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا۔

"فلسفہ اور مذہب ــ ہندوؤں میں ناقابل تقسیم ہیں۔"

شلیگل نے اس موضوع پر خاص کام کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس وقت اس موضوع کو چھیڑنا گیتا کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیتا کا

کا قاری اس حقیقت کا اعتراف کرے گا جسے میکس مِلّر نے بیان کیا ہے۔

ویدوں کا زمانہ۔ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں کے پُران جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مہابھارت کے زمانے سے لے کر سولہویں صدی ق۔م تک لکھے گئے۔

گیتا کے بارے میں محققین کا قیاس ہے کہ یہ ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں لکھی گئی۔

میکڈانل اس کا زمانہ ۵۰۰ برس ق۔م بتاتا ہے۔ گیتا کی شہادت یونانی مورخوں اور یونانی کتبوں سے بھی ملتی ہے۔ ۴۰۰ ق۔م میں گیتا کا وجود ثابت ہو چکا ہے۔

"گیتا" کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو سماج جو ذات پات کی لعنت میں جکڑا ہوا ہے۔ گیتا میں موروثی ذات پات کا ذکر نہیں ملتا۔ گویا ذات پات کی تفریق اور تقسیم گیتا کے بعد ہوئی۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مہابھارت میں آنے والے ادوار میں اضافے کیے جاتے رہے۔

گیتا کے زمانے تک ہندومت کی جو شکل سامنے آتی ہے۔ وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

سب کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ یہ ایک تین میں متشکل اور تقسیم ہوا۔ یعنی برہما (خالق)، وشنو (محافظ) شیو (کائنات کو پیدا اور فنا کرنے والا) شیو کی تین بیویاں سرسوتی، لکشمی اور پاربتی ہیں جنہیں قابل پرستش تسلیم کیا۔

وشنو کے دس اوتار ہیں جو مختلف زمانوں میں ظالموں کو ختم کرنے کے لیے دنیا میں آئے ان کی شکلیں مختلف ہیں۔ انہی میں سے ایک اوتار وہ تھا جو مچھلی کی شکل میں دنیا میں آیا اور ویدوں کو طوفانِ نوح سے بچایا۔ رام بھی وشنو کے اوتار تھے۔ رامائن کو اس لیے مذہبی کتاب کا درجہ دیا گیا۔ لیکن ہندوؤں کے نزدیک رام سے بھی بڑا اور مقبول اوتار کرشن ہے۔

کرشن متھرا کے شاہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ظالم راجہ کنس کے خوف سے گوالوں کے ہاں پرورش پائی (حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ بھی ذہن میں رکھیے۔) کرشن۔ نٹ کھٹ شریر ہے۔ زندہ دل اور عشق و مستی میں سرشار۔ کرشن جوان ہو کر کنس کا خاتمہ کرتے ہیں

اپنی حکومت اور راجدھانی پر قبضہ کیا۔

یہی کرشن۔ مہابھارت کی جنگ میں ارجن کو جو اپدیش دیتے ہیں۔ وہ گیتا ہے۔ یہی کرشن کی تعلیمات ہیں۔ کرشن کے ماننے والے ویشنو کہلاتے ہیں۔

گیتا کے تراجم

دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں گیتا کے تراجم بار بار نہ ہوئے ہوں۔ مسلمانوں میں البیرونی، عبدالقادر بدایونی، نقیب خاں، شیخ سلطان تھانیسری اور فیضی وغیرہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے گیتا کو پڑھا اور اس سے فیض اٹھایا تھا۔ داراشکوہ بھی سنسکرت کا عالم تھا۔ جس نے اپنی نگرانی میں اپنشدوں کا ترجمہ کروایا۔ یوں اپنشد فارسی میں منتقل ہوئے۔ فیضی نے گیتا کا ترجمہ منظوم فارسی میں کیا۔ یہ ترجمہ ہر شعر کا نہیں ہے بلکہ ایک باب کے مفہوم کو فارسی میں منظوم کر دیا گیا ہے۔

شوپنہار گیتا اور ویدوں کا بے حد مداح تھا۔ اس کے فلسفے پر بھی بہت حد تک اس کے تاثرات ملتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ایذرا پونڈ بھی گیتا کے قاری تھے۔

برصغیر کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں گیتا کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ مہاتما گاندھی نے اسے گجراتی میں منتقل کیا تھا جس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ اردو میں کئی شاعروں نے اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جن میں اثر لکھنوی کا آزاد اور منظوم ترجمہ "نغمۂ جاوید" کے نام سے شائع ہوا۔ خواجہ دل محمد نے بھی اس کا منظوم ترجمہ کیا۔ منور لکھنوی کا اردو منظوم ترجمہ بھی خاصا اہم ہے۔

گیتا کا ایک خاص ترجمہ اور مطالعہ۔ محمد اجمل خاں کی تصنیف و تالیف ہے۔ یہ وہی محمد اجمل خاں ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکریٹری رہے۔ محمد اجمل خاں نے گیتا کے ترجمے کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا اس طرح سے موازنہ کیا ہے کہ گیتا اور اسلام کی مشترک اقدار اور تعلیمات سامنے آ گئی ہیں۔ محمد اجمل خاں کا یہ کام۔ ایک اہم کام ہے۔

انگریزی میں مختلف ادوار میں گیتا کے تراجم ہوئے۔ ان میں آرنلڈ میور کا ترجمہ

اہم اور منفرد ہے۔

مہابھارت

گیتا کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے مہابھارت کی جنگ کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے
مہابھارت کے بارے میں جدید تحقیق کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ بارہ سو قبل
مسیح سے ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں لڑی گئی۔ ہندوؤں کی اصطلاح میں یہ
یوگ (دوحصال) کا دور ہے۔

مہابھارت کی اس جنگ کو سنسکرت، شاعری ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کی رزمیہ شاعری
میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مہابھارت ایک ایسی رزمیہ نظم ہے جسے سنسکرت کی
"ایلیڈ" کہا جا سکتا ہے۔

مہابھارت کا قصہ یوں ہے۔!

آریاؤں کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ ہندوستان آئے تو یہاں پر آباد اقوام سے
لڑتے رہے۔ لیکن مہابھارت وہ جنگ ہے جو ان کے درمیان لڑی گئی۔

آریا پنجاب سے گنگ وجمن کے علاقے میں پہنچے تو انہوں نے شہر آباد کیا۔ اور اسے اپنی
راجدھانی بنایا۔ ہستناپور سے ۷۰ میل کے فاصلے پر پانڈوؤں نے اندر پرستھ کی بنیادیں رکھیں
جسے آج ہم دہلی کہتے ہیں۔

مہابھارت کی جنگ خاندانی جنگ تھی۔ یہ ایسے راجاؤں کے درمیان لڑی گئی جو ایک
ہی دادا کی اولاد تھے۔ جس کا نام کرو تھا۔ اس کا بیٹا دیاس تھا۔ جس کے دو بیٹے دھرت راشٹر اور
پانڈو تھے۔ دیاس کی موت کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا بھشیم نے کی۔ جب سن بلوغت
کو پہنچے تو راج پاٹ پانڈو کو دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ دھرت راشٹر سے چھوٹا تھا۔ اسے راج پاٹ
اس لیے سونپا گیا کہ دھرت راشٹر پیدائشی نابینا تھا۔

مہابھارت میں لڑنے والے دونوں فریقوں کا شجرہ نسب یہ ہے۔

ویاس

پانڈو	دھرت راشٹر
(کنتی اور ماردی سے شادی کی)	(گندھارا کے راجہ کی بیٹی گندھاری سے شادی کی)
یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل، سہدیو (پانچ بھائی — جو پانڈو کہلائے)	دریودھن اور ۹۹ بیٹے۔ (کل سو۔ جو کورو کہلائے۔)
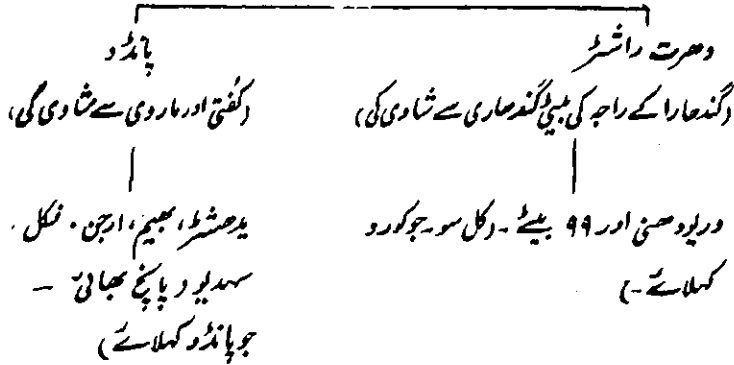
پانڈو کی موت کے بعد دھرت راشٹر نے اپنے بیٹوں کی مدد سے ہستناپور کی گدی پر قبضہ کرلیا۔ یدھشٹر کے محل کو آگ لگا دی گئی۔ لیکن پانچوں پانڈو بھائی کسی طرح بچ نکلے اور مدتوں آوارہ بھٹکتے رہے۔

پانچال قوم کے راجہ دروپد نے اپنی بیٹی دروپدی کے سوئمبر کا اعلان کیا۔ تیراندازی کا مقابلہ ہوا۔ ارجن نے جیت لیا۔ اور اس کے ساتھ دروپدی بھی۔ جو پانچوں پانڈو بھائیوں کی بیوی بنی۔ اب دربدر بھٹکنے والے پانڈوؤں کو راجہ دروپد کا سہارا مل گیا۔ دھرت راشٹر کے دل میں بھی کچھ نیکی آئی اور اس نے اپنے بھتیجوں کو بلاکر آدھا راج پاٹ اور حکومت ان کو دے دی۔ پانڈوؤں نے اندر پرستھ (دہلی) کی بنیاد رکھی اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔

کوروؤں کو پانڈوؤں کا راج پاٹ اور حکومت پسند نہ آئی۔ وہ ہوس ملک گیری میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ایک منصوبے کے ساتھ پانڈوؤں کو بلایا۔ ایک سبھا سجائی گئی اور جوا کھیلنا شروع کیا۔ کورو جوئے میں پانڈوؤں کا راج پاٹ، حتیٰ کہ دروپدی بھی جیت گئے۔ ان کو بارہ برس کا بن باس دیا گیا۔ بارہ برس کے بعد جب پانڈو لوٹے اور اپنی حکومت مانگی تو کورو اپنے وعدے سے مکر گئے۔

اب کرشن کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کوروؤں کے ظلم کے خلاف تھے۔ چاہتے تھے کہ امن امان سے معاملہ طے پاجائے۔ وہ دھرت راشٹر کے دربار بھی گئے۔ اور اتنا مطالبہ کیا کہ

پانڈوؤں کو صرف پانچ گاؤں دے دیے جائیں لیکن کورووں نے اتنا سا مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ کرشن کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کرشن بچ نکلے۔

اب مہابھارت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریقوں کے حلیف راجے مدد کے لیے آپہنچے۔ دریودھن (کورو) اور ارجن (پانڈو) دونوں نے کرشن سے مدد مانگی۔ کرشن دونوں کے رشتے دار تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس جنگ میں ہتھیار نہ اٹھائیں گے۔ دونوں سے کہا کہ وہ خود ان کا اور ان کی فوج میں سے جس کا انتخاب چاہیں کرلیں۔ دریودھن نے کرشن کی فوج کو پسند کیا۔ کیونکہ کرشن نے تو لڑائی میں حصہ نہ لینا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لیے فوج کو مفید اور کارآمد سمجھا۔ ارجن نے کرشن کا انتخاب کیا۔

ارجن نے جب اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا پایا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ کرشن جو اس جنگ میں ارجن کے رتھ بان بنے۔ انہوں نے ارجن کو اپدیش کیا۔ جنگ لڑنے پر اکسایا۔ یہی وہ اپدیش ہے جو گیتا کہلاتا ہے۔

مہابھارت کی جنگ میں سارے کورو مارے گئے۔ پانڈوؤں کے سارے ساتھی بھی ہلاک ہو گئے۔ دھرت راشٹر کے سارے بیٹے جنگ میں کام آچکے تھے۔ اس نے بیوی کو ساتھ لیا، سلطنت چھوڑی اور سنیاس کی راہ لی۔ پانڈو حکومت کرتے رہے۔ ۲۶ برس بعد جب انہیں خبر ملی کہ کرشن دنیا سے سدھار گئے ہیں تو انہوں نے بھی راج پاٹ چھوڑا اور ہمالیہ کی راہ لی۔ راہ میں ایک ایک کرکے سب مرگئے۔ صرف یدھشٹر اور اس کا کتا زندہ بچے جو جنت کی تلاش میں نکلے۔ یدھشٹر نے اور اس کا کتا جنت کی تلاش میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یدھشٹر نے اس وقت تک جنت میں جانے سے انکار کر دیا جب تک اس کے بھائی اور بیوی دروپدی بھی جنت میں داخل نہ ہو جائیں اس کی یہ دعا قبول ہوئی لیکن کتے کو جنت میں لے جانے کی اجازت نہ ملی۔ یدھشٹر نے ایسی جنت قبول کرنے سے انکار کر دیا جہاں اس کا وفادار ساتھی کتا نہ جاسکتا تھا۔ دوزخ میں وہ اکٹھے ہو گئے۔ یہاں یہ بتلانا مقصود تھا کہ یہ سب مایا ہے۔ ہر چیز مایا ہے ...

مہاتما گاندھی نے "گیتا" کا جو ترجمہ کیا تھا اس کے دیباچے میں لکھا تھا۔

"گیتا مختصر کتاب نہیں ہے۔ گیتا ایک بڑی مذہبی منظوم کتاب ہے۔ اس میں جتنے گہرے اتریے اتنے ہی اس میں سے نئے اور خوب صورت معانی ملیں گے۔ گیتا مختلف انسانی جماعتوں کے لیے ہے اس میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہہ دی ہے۔ اس لیے گیتا کے مشہور الفاظ کے معانی ہر زمانے میں بدلتے اور وسیع ہوتے رہیں گے۔ گیتا کا بنیادی اصول (مول منتر) کبھی نہیں بدل سکتا۔ وہ منتر جس طریقے سے ثابت کیا جا سکتا ہے اس طریقے سے متلاشی حق چاہیے جو معانی نکال سکتا ہے۔

گیتا میں گیان کی بزرگی مانی گئی ہے۔ پھر بھی گیتا کو عقل سے پانا ممکن نہیں۔ یہ دل سے پہنچنے کے لائق ہے۔ اس لیے وہ کمزور یقین والوں کے لیے نہیں ہے۔ گیتا بنانے والے نے بھی کہا ہے ؛

"جو تپسوی نہیں ہے وہ بھگت نہیں ہے۔ جو سننا نہیں چاہتا اور جو مجھ سے نفرت کرتا ہے اس لیے گیانی بھی مت کہنا۔"

(گاندھی۔ ترجمہ بھگوت گیتا۔ (اردو) صفحہ۲۱-۲۲)

گیتا کی تلخیص

یہ تلخیص اس ترجمے سے کی گئی ہے جو مہاتما گاندھی نے گجراتی میں کیا ہے۔ اور پھر اس کا اردو ترجمہ ہوا ہے۔

"تلاش کے بغیر گیان نہیں ہوتا۔ دکھ کے بغیر سکھ نہیں ہوتا۔ دھرم بگڑنے کی چنتا اور من کا خیالات میں الجھنا سب جگیا سوؤں (متلاشیوں) کو ایک بار ہوتا ہی ہے

ہر ایک جسم میں اچھی اور بری ترغیبوں میں لڑائی لگی ہی رہتی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا۔ وہاں دونوں فوجوں میں موجود بڑے بوڑھے پتامہ، آچارج ماما، بھائی بیٹوں، پوتوں، دوستوں، سسروں اور پیاروں کو ارجن نے دیکھا۔ ان سب بھائی بندھوں کو اس طرح

کھڑا دیکھ کر دکھی ہونے کے کارن بہتے ہوئے کُنتی کے پُتر ارجن نے اس طرح کہا۔

"یہ کرشن یدھ کرنے کی خواہش سے اکٹھے ہوئے۔ ان اپنے آدمیوں کو دیکھ کر میرے انگ

ڈھیلے پڑ گئے۔۔۔۔ لڑائی میں اپنے آدمیوں کو مارنے میں مجھے کوئی بھلائی نظر نہیں آتی۔"

"یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے یا مجھے تینوں لوگ کا راج بھی ملے تو بھی، میں مدھو سودن،

میں انہیں مارنا نہیں چاہتا تو پھر زمین کے ایک ٹکڑے کے لیے انہیں کیوں ماروں"۔۔۔۔

اپنوں کو مار کر کیسے خوشی حاصل کی جا سکتی ہے۔۔۔۔

"اوہو۔ کیسی دکھ کی بات ہے کہ ہم لوگ بڑے بھاری پاپ کمانے کے لیے تیار

ہو گئے۔ یعنی راج سکھ کے لالچ میں پڑ کر اپنوں کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔

موہ کے وش آدمی ادھرم کو دھرم مان لیتا ہے۔ موہ کے کارن اپنے اور پرائے کا بھید

ارجن نے کہا۔ یہ بھید جھوٹا ہے۔ یہ بتلاتے ہوئے شری کرشن شریر اور آتما کے الگ الگ

ہونے کا ورنن کرتے ہیں۔ اس میں جسم کا فنا اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا اور آتما کا غیر فانی ہونا اور

اس کا ایک دمعزو، ہونا بتلاتے ہیں۔

آدمی اپنا فرض ادا کر سکتا ہے۔ نتیجہ اس کے اختیار میں نہیں ہے اس لیے اسے اپنے فرض

کا فیصلہ کر کے بے فکری سے اس میں لگے رہنا چاہیئے۔

شری بھگوان بولے۔

ناقابل افسوس بات کا تو افسوس کرتا ہے اور عالموں کی سی باتیں کرتا ہے لیکن عام لوگ

مردہ زندوں کا افسوس نہیں کرتے۔

ہے کنتی کے پُتر ارجن احواس خمسہ کے احساسات۔ اس آدمی دکھ اور سکھ دینے والے

ہوتے ہیں۔ وہ کافی ہوتے ہیں۔ وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں برداشت کر۔۔۔۔

نیستی کی ہستی نہیں ہے اور ہستی کی نیستی نہیں ہے۔۔۔۔ یہ تمام دنیا جس سے بھری ہوئی

ہے اسے لافانی سمجھ۔ اس لافانی کو فنا کرنا کسی کی طاقت میں نہیں ہے۔

"جو اسے مارنے والا مانتے ہیں اور جو اسے مرا ہوا مانتے ہیں وہ دونوں کچھ نہیں جانتے

یہ روح نہ کسی کو مارتی ہے اور نہ کسی سے ماری جاتی ہے۔

روح نہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ جو تھا اور مستقبل میں نہیں ہوگا۔ یہ بھی نہیں ہے۔
اس لیے یہ نہ پیدا ہونے والی ہے نہ مرنے والی۔ سدا رہنے والی ہے۔ قدیمی ہے۔ جسم کے ناش
ہونے پر اس کا ناش نہیں ہوتا۔

جیسے آدمی پرانے کپڑوں کو اُتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ویسے ہی روح کمزور
اور پُرانے جسم کو چھوڑ کر نئے جسم کو حاصل کر لیتی ہے۔

اس روح یا آتما کو اوزار کاٹ نہیں سکتے۔ آگ جلا نہیں سکتی۔ پانی گلا نہیں سکتا اور
ہوا سکھا نہیں سکتی۔ پیدا ہونے والوں کو موت اور مرنے والوں کے لیے پیدائش لازم و
ملزوم ہے۔ اس لیے جو لازمی ہے اس کا افسوس کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے تجھے فلاسفی کے اصولوں کے مطابق تیرا یہ فرض بتلایا ہے۔ اب کرم یوگ
سمجھاتا ہوں۔ وہ سن اس کا سہارا لینے سے تو کرم کی پھانسی کو توڑ سکے گا۔

تیرا اپنے کرموں کے کرنے کا ہی اختیار ہے اس سے پیدا ہونے والے بے شمار نتائج
پر تیرا کوئی اختیار نہیں۔ کرم کے پھل کی کوئے کر کام نہ کر۔ ہے ارجن۔ پھنساوٹ کو چھوڑ کر
یوگ میں لگا رہ کامیابی میں یکساں رہ کر کرم کر۔

غصہ سے دور رکھتا رہے وقوفی پیدا ہوتی ہے۔ بیوقوفی سے ہوش ٹھکانے نہیں
رہتا۔ ہوش ٹھکانے نہ رہنے سے علم کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اور جس میں علم ہی نہ رہا وہ
مردہ کی مانند ہے۔

لیکن جس کا من اپنے قابو میں ہے اور جس کے حواس پھنساوٹ یا دشمنی سے خالی ہو
کر اس کے قابو میں رہتے ہیں۔ وہ آدمی حواس سے کام لیتا ہوا بھی راحت قلب حاصل
کر لیتا ہے۔

اطمینان قلب سے اس کے سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں جسے اطمینان حاصل ہو جاتا
ہے اس کی عقل فوراً ہی برقرار ہو جاتی ہے۔

جسے اطمینان نہیں اسے تمیز نہیں ہے۔ اسے بھگتی نہیں ہے اور جسے بھگتی نہیں ہے
اسے شانتی نہیں ملتی ہے اور جہاں شانتی نہیں وہاں سکھ کہاں سے آ سکتا ہے۔

جب سب جاندار سوتے رہتے ہیں۔ تب نفس مطمئنہ والا انسان جاگتا رہتا ہے جب لوگ جاگتے رہتے ہیں تب عارف سوتا رہتا ہے۔

اناج سے سب جاندار پیدا ہوتے ہیں اناج بارش سے پیدا ہوتا ہے۔ بارش یگیہ سے ہوتی ہے۔ یگیہ کرم سے ہوتا ہے۔ تو جان لے کہ کرم قدرت سے پیدا ہوتے ہیں قدرت کی ہستی لافانی خالق سے ظہور میں آتی ہے۔ اس لیے ہر جا حاضر و ناظر خالق ہمیشہ یگیہ میں موجود ہے۔

پاپیوں کا ناش ہی ہے کیونکہ جھوٹ کی ہستی نہیں ہے۔ یہ جان کر انسان کو اپنی قابلیت کے غرور سے کسی کو ایذا نہیں پہنچانی چاہیئے۔ بُرے کام نہیں کرنے چاہئیں ایشور کی گہری قدرت اپنا کام کرتی ہی جاتی ہے۔ اصل میں ایشور کے لیے پیدائش ہوتی ہی نہیں ہے۔

جو امیدیں نہیں باندھتا جس کا من اپنے قابو میں ہے جس نے جمع کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے اور جس کا صرف جسم ہی کام کرتے ہوئے اس کے اثرات سے مبرا ہے۔

"ہے ارجن روپے پیسے سے کیے گئے یگیہ کی نسبت گیان کا یگیہ زیادہ اچھا ہے۔"

"ہے ارجن۔ جس طرح جلتی ہوئی آگ ایندھن کو خاک کر دیتی ہے۔ ایسے ہی گیان کی آگ سب کرموں کو بھسم کر دیتی ہے۔"

جو اگیانی (لاعلم) اور یقین سے خالی ہو کر تشکیہ حالت میں رہتا ہے اس کا ناش ہو جاتا ہے۔ تشکیہ مزاج کے لیے نہ تو یہ لوک ہے اور نہ پرلوک۔ اسے کہیں سکھ نہیں ہے۔

"جو آدمی کسی سے دشمنی نہیں کرتا اور خواہش نہیں کرتا اسے ہمیشہ سنیاسی سمجھنا چاہیئے۔ جو رنج و راحت کے جھمیلوں سے آزاد ہے۔ وہ بڑی آسانی سے زنجیروں سے چھوٹ جاتا ہے۔"

"ایشور کسی کے گناہ ثواب کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ لاعلمی کے ذریعے علم (گیان) ڈھک جاتا ہے اور اس سے لوگ وہم و گمان میں پھنس جاتے ہیں۔"

"آتما ہی آتما کا مددگار ہے اور آتما ہی آتما کا دشمن اس کا آتما مددگار ہے۔ جس نے

اپنی طاقت سے من کو جیت لیا ہے جس نے آتما کو جیتا نہیں وہ اپنے آپ سے ہی دشمن کی طرح برتاؤ کرتا ہے۔"

ہے کنتی کے پتر۔ جس میں رس میں ہوں۔ سورج چاند میں چمک میں ہوں۔ سب ویدوں میں اونکار (ادم شبد) میں ہوں۔ آکاش میں آواز میں ہوں۔ اور انسانوں میں کام کی طاقت میں ہوں۔ مٹی میں خوشبو میں ہوں۔ آگ میں حرارت میں ہوں اور سب جانداروں میں زندگی میں ہوں۔ تپ کرنے والوں کا تپ میں ہوں۔ ہے ارجن سب جانداروں کا تخم اولین میں ہوں۔ عقل مند کی عقل میں ہوں۔ تیج والوں کا تیج میں ہوں۔ بلوان کا خواہش اور محبت کے بغیر بل (طاقت) میں ہوں۔

بدچلن، جاہل نیچ آدمی میرا سہارا نہیں لیتے بدی کے خیالات والے ہوتے ہیں۔ اور مایا کے ذریعے ان کا گیان دور ہوا ہوتا ہے۔

ہے ارجن، چار قسم کے نیک چلن آدمی مجھے یاد کرتے ہیں۔ دکھی، متلاشی، کچھ حاصل کرنے کی خواہش والے، اور گیانی۔" ہے ارجن، ماضی حال اور مستقبل کے سبھی جانداروں کو میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔" پیدائش اور فنا کا جوڑا ساتھ ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔"

دنیا میں گیان اور اگیان یہ دونوں قدیم و مسلسل راستے مانے گئے ہیں ایک یعنی گیان کے راستے سے انسان نجات حاصل کرتا ہے اور دوسرے یعنی اگیان کے راستے سے اسے دوسرا جنم حاصل ہوتا ہے۔ ہے پارتھ ان ہر دو راستوں کو جاننے والا کوئی بھی ہو کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔

"میری نظر نہ آنے والی شکل سے ساری دنیا بھری ہوئی ہے۔ مجھ میں میرے سہارے پر سب جاندار ہیں۔ میں ان کے سہارے پر ہوں۔ پھر بھی میں ان میں نہیں ہوں لیکن میں ان کی وجہ پیدائش ہوں۔ ہے کنتی کے پتر، میں جاندار کلپ کے آخر میں میری قدرت میں سما جاتے ہیں اور کلپ کے آغاز میں ایک بار انہیں پھر پیدا کرتا ہوں۔" میرے اختیار میں رہ کر قدرت متحرک دنیا کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس وجہ سے کنتی کے پتر، دنیا کنوئیں کی ٹنڈوں

کی طرح گھوما کرتی ہے۔

" اس جگت کا باپ میں ہوں، ماں میں ہوں، سہارا دینے والا میں۔ پاک ردم لفظ میں۔ رگ وید یجروید اور سام وید بھی میں ہوں۔ حرکت میں پرورش کرنے والا میں مالک میں شاید میں مقام میں سہارے کی جگہ میں۔ خیرخواہ میں۔ پیدائش میں فنا میں، قیام میں، خزانہ میں لافانی بیج بھی میں ہوں۔"

" جو لوگ مجھے لاشریک مان کر میری یاد کرتے ہیں۔ میری عبادت کرتے ہیں۔ ان کو ہمیشہ ہی مجھ میں محو رہنے والوں کی خیروعافیت کا بوجھ میں اٹھاتا ہوں۔"

" سب جانداروں میں یکساں رہتا ہوں۔ میرے لیے نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن، جو مجھے یکسوئی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ مجھ میں ہیں۔ میں بھی ان میں ہوں۔ یاد کرتے ہیں، وہ مجھ میں ہیں۔ میں بھی ان میں ہوں۔

" سخت بدچلن آدمی بھی اگر یک دل ہو کر مجھے یاد کرے تو اسے نیک ہوا ہی ماننا چاہیے۔ کیونکہ اب اس کا اچھا ارادہ ہے۔

" ہے ارجن، مخلوقات میں آغاز، آخر اور بیچ میں ہوں۔ علموں میں برہم ودیا میں ہوں اور بحث میں مباحثہ کرنے والوں میں محبت میں ہوں۔"

" سب کو فنا کرنے والی حدت میں ہوں۔ مستقبل میں پیدا ہونے والے کا موجب پیدائش میں ہوں اور مونث قسم کے ناموں میں کیرتی (شہرت)، لکشمی (دھن، دولت) بانی (زبان)، سمرتی (مذہبی کتب) میدھا (عقل)، دھرتی (استقلال)، کھشما (صفائی) میں ہوں۔"

" دھوکا کرنے والے کا جوا میں ہوں۔ بارعب آدمی کا رعب میں ہوں۔ فتح میں ہوں۔ یقین میں ہوں۔ نیک خیالات والوں کی نیکی میں ہوں۔

شری بھگوان نے کہا۔

" ہے پارتھ میری ہزاروں صورتیں دیکھو وہ مختلف قسم کی عجیب ہیں۔ علیحدہ علیحدہ رنگ اور شکل کی ہیں۔ ان اپنی چہرے کی آنکھوں سے تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ تجھے میں عجیب آنکھیں دیتا ہوں تو میری قدرت کا تماشا دیکھ۔

ہے راجن، یوگیشور کرشن نے اسپا نیہ کہ پارتھ کو اپنی خدائی شکل دکھائی۔ وہ بے شمار منہ اور آنکھوں والی بے شمار اور عجیب نظر آنے والی۔ بے شمار زیورات پہنے اور بے شمار اٹھائے ہوئے ہتھیاروں والی تھی۔ اس نے بے شمار عجیب و غریب ہار اور کپڑے پہنے ہوئے تھے اور عجیب خوشبودار لیپ کیا ہوا تھا۔ ایسے وہ سب سے حیران کن بے حد اور سب جگہ حاضر ناظر دیوتا تھا۔

ارجن نے کہا:-

"آپ کو میں بے شمار ہاتھ، پیٹ منہ اور آنکھوں والا بے شمار شکلوں والا دیکھتا ہوں۔ آپ کی کوئی حد ہیش ہے۔ وسط نہیں ہے اور نہ آپ کی ابتدا ہے.... سورج اور چاند کی شکل میں جس کی آنکھیں ہیں جس کی منہ جلتی ہوئی آگ کی طرح ہے اور جو اپنے تیج سے اس دنیا کو حرارت پہنچا رہا ہے ایسے آپ کو میں دیکھ رہا ہوں آسمان اور زمین کے بیچ کے اس فاصلے میں اور سب اطراف میں آپ ہی اکیلے پھیل رہے ہیں۔

"سب راجاؤں کے گروہ کے ساتھ دھرت راشٹر کے یہ لڑکے... اور ہمارے بڑے بڑے سپاہی ڈراؤ سارے آپ کے ڈراؤنے منہ میں تیزی سے داخل ہو رہے ہیں۔ کتنے ہی کے سر چورے جا کر آپ کے دانتوں میں لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سب لوگوں کو سب اطراف سے نگل کر آپ اپنے جلتے ہوئے منہ سے چاٹ رہے ہیں۔

شری بھگوان نے کہا:-

"لوگوں کو فنا کرنے والا بڑھا ہوا میں کال ہوں۔ دنیاؤں کو فنا کرنے کیلئے یہاں آیا ہوں ہر ایک فوج میں جو یہ سب سپاہی آئے ہوئے ہیں ان میں سے تیرے لڑنے سے انکار کرنے پر بھی بچ کر نہیں جا سکتے اسلیے تو کھڑی ہو، شہرت حاصل کر، دشمن کو جیت کر روپے پیسے اور اناج سے بھرا ہوا راج بھوگ، انہیں میں نے پہلے سے مار ڈالا ہے تو تو محض ایک ذریعہ بن جا۔

قدرت اور انسان دونوں کو ازلی سمجھ تبدیلیاں اور صفات قدرت سے پیدا ہوتے ہیں آتما کا ناش کرنیوالا دوزخ کا یہ تین قسم کا دروازہ ہے، شہوت، غصہ اور لالچ اسلیے انسان کو ان تینوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔

ادم۔ تت۔ ست!

اقوال

اس سلسلے میں بہت تحقیق ہوئی ہے کہ کنفیوشس کے اقوال اور تعلیمات کو کب اور کس نے جمع کر کے مرتب کیا۔ محققین اور مورخوں کی آرا میں بہت تضاد اور فرق پایا جاتا ہے تاہم کسی خاص سال و سن کے تعین میں اختلاف کے باوجود محققین اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ کنفیوشس کی موت ۴۷۹ ق م کے کچھ عرصے کے بعد اس کے شاگردوں اور پیروکاروں نے اس کے اقوال کو جمع کر کے کتابی شکل دے دی۔ کنفیوشس کی تعلیمات پر مبنی ان اقوال کو جو قدیم چینی زبان میں مرتب ہوئے، صدیوں سے دنیا کی ہر زبان میں منتقل کرنے کا عمل جاری ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جو ان اقوال کو اپنے اپنے بولنے والوں تک نہ پہنچا سکی ہو۔ صدیوں سے کنفیوشس ساری دنیا کے لیے ایک جانا پہچانا نام ہے صدیوں سے اس کے اقوال و تعلیمات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ ایک ہی زبان میں اس کے کئی کئی تراجم ملتے ہیں اور نئے تراجم ہوتے رہتے ہیں۔

کنفیوشس کا شمار دنیا کے عظیم ترین اخلاقی معلمین میں ہوتا ہے۔ اسے مذہبی رہنما ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ اگرچہ بعض لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر تھا، نہ ہی وہ کسی مذہب کی تبلیغ کرتا اور تعلیم دیتا تھا۔ اس کے ہاں خدا کا تصور بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس وہ والدین کی اطاعت، آبا و اجداد کی تقدیس و احترام کی تعلیم دیتا ہوا ملتا ہے۔ وہ پانچ دفعات پر زور دیتا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ پانچ اوصاف یہ ہیں۔

نرمی اور تحمل، صداقت، وقار، شفقت اور عاجزی۔

اپنے انداز میں یہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو کسی مذہب کو دنیا میں پھیلانے یا لانے کا دعوے دار نہ تھا جو خود کو مذہبی رہنما اور پیغمبر نہ گردانتا تھا اس کی تعلیمات کو مذہب کا درجہ دیا گیا۔ کنفیوشس مت ایک مذہب بن گیا۔ صدیوں تک ان گنت لوگ جو زرد رنگ سے تعلق رکھتے تھے نسلاً بعد نسلاً اس مذہب کے پیروکار رہے کنفیوشس اور اس کی تعلیمات کو ماننے والوں نے اپنی زندگی کو ایک نیا انداز دیا۔ ان کا ذہن طرز عمل دوسرے لوگوں سے بہت مختلف اور منفرد ٹھہرا۔

کنفیوشس کی عظمت و اعزاز کو قائم رکھنے اور خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک معبد تعمیر کیا گیا۔ اس سلسلے میں مزے کی بات یہ ہے کہ یہ معبد ایک ایسے چینی حکمران نے تعمیر کیا جو کنفیوشس کا پیروکار نہ تھا۔ جانے کتنی نسلوں کے لوگ اس معبد میں کنفیوشس کے نام پر نذر پیش کرتے رہے ہیں۔ موجودہ چین کا مذہب اب کنفیوشس مت نہیں ہے۔ اس کے باوجود کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کے چینیوں کی اخلاقی بنیادیں کنفیوشس کی ہی استوار کردہ ہیں۔

دنیا کے ان گنت لوگ آج بھی پہلے کی طرح کنفیوشس کے اقوال سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے اقوال پر مبنی کتاب کو عالمگیر شہرت حاصل ہے اور یہ شہرت صرف موجودہ دور کی ہی نہیں بلکہ اسے یہ شہرت صدیوں سے حاصل ہے۔ زمانے میں ان گنت تبدیلیاں آئیں، انسانوں کے مزاج اور عقائد تبدیل ہوئے۔ کنفیوشس کے بعد کتنے ہی خدا کے فرستادہ نبی اور پیغمبر اس دنیا میں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے آئے لیکن کنفیوشس کی تعلیمات ان گنت لوگوں کی اخلاقی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

کنفیوشس کا سن پیدائش ۵۵۱ ق م ہے۔ کنفیوشس ایک گاؤں میں پیدا ہوا جو موجودہ چین کے صوبے شان تنگ میں واقع ہے۔ کنفیوشس کا والد ایک بہادر اور ممتاز سپاہی تھا۔ کنفیوشس کی عمر تین برس تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کنفیوشس کا حسب نسب قدیم چینی شاہی خاندان سے جا ملتا ہے۔ کنفیوشس کی عمر ۱۹ برس کی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کے نتیجے میں وہ ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ بنا۔ اپنی شادی کے

زمانے میں کنفیوشسس غلّے اور اناج کے سرکاری گوداموں اور مویشیوں کا انچارج تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی کہ جب اس نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا۔ پھر بھی اس کی عمر کا سب سے اہم مصروفیت ٹھہری۔ اس کی دانش کی شہرت جلد ہی پورے چین میں پھیل گئی۔ اس کے شاگردوں اور ماننے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم ہوگیا۔ ہر شخص اس کا احترام کرنے لگا۔ نہ صرف اس کے اپنے صوبے کے حکمران اور بادشاہ بلکہ دوسرے صوبوں کے حکمران بھی مشوروں کے لیے اس کی طرف رجوع کرنے لگے۔

۵۰۱ ق۔م میں ڈیوک لو نے کنفیوشسس کو چینگ تو شہر کا گورنر مقرر کر دیا یہاں اس کی تعلیمات نے عملی جامہ پہنا تو اس صوبے کی ترقی میں معجزانہ تبدیلیاں ہوئیں ایک برس کے بعد اسے وزیر تعلیمات مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد اسے جرائم کے شعبے کا وزیر بنا یا گیا۔ تین برسوں تک وہ اپنی تعلیمات اور اصلاحات کی وجہ سے عوام کی آنکھوں کا تارہ بنا رہا وہ جس صوبے میں بھی ہوتا وہ صوبہ انقلابی تبدیلیوں کے بعد خوش حال ہو جاتا۔ اس کی ان کامیابیوں نے حاسدوں کو پیدا کیا جو دوسرے صوبوں کے حکمران تھے اور کنفیوشسس کی بے مثل خدمات اور ان کے نتائج سے جلنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے صوبوں میں ایسی تبدیلیاں اور خوش حالی لانے میں ناکام رہے تھے۔ حاسدوں نے ڈیوک لو کے کان بھرنے شروع کیے جس کے نتیجے میں کنفیوشسس اور ڈیوک لو کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے۔ ۴۹۷ ق۔م میں کنفیوشسس اپنی سرکاری اور انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگیا۔ اس زمانے میں جو سرکاری ذمہ داریوں سے آزادی کا زمانہ تھا۔ کنفیوشسس نے اپنے صوبے کی تاریخ نظم بند کی جو ۷۲۲ ق۔م سے ۴۸۱ ق۔م کا احاطہ کرتی ہے۔ اس زمانے میں کنفیوشسس نے چین کا دورہ کیا۔ وہ ہر جگہ اپنی تعلیمات کا درس دیتا رہا۔ یوں ایک طرح سے پورا چین ہی اس کی زندگی میں اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ نئے ڈیوک نے اس کو پھر سے انتظامی ذمہ داریاں سونپنے کی کوشش کی لیکن کنفیوشسس کو اب ان سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برس اپنی تعلیمات کے درس اور چینی موسیقی کی تشکیل نو پر صرف کیے۔ کنفیوشسس کا انتقال ۴۷۸ ق۔م میں ہوا۔

کنفیوشس ایک نئے نظام فلسفہ کا بھی داعی تھا لیکن اس کی تعلیمات کو مذہب کی صورت دے دی گئی۔ کنفیوشس کے اقوال اس کی موت کے بعد اس کے شاگردوں نے جمع اور مرتب کیے اور یہ ایک مذہب کا صحیفہ بن گئے۔

کنفیوشس کو سمجھنے کے لیے اگر چین کے اس عہد کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو خاصی مدد ملتی ہے۔ کنفیوشس جس زمانے میں پیدا ہوا اور اس نے زندگی بسر کی۔ اس عہد میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا۔ ملک میں کئی جاگیردار حکمراں بن بیٹھے تھے۔ اس دور میں استادوں کی بے حد تکریم کی جاتی تھی۔ یہ استاد زیادہ تر زبانی ہی درس دیتے تھے۔ کتابیں نہیں لکھتے تھے اس کے باوجود بعض ایسی کتابیں اس دور میں پڑھی جاتی تھیں جن کو اس زمانے میں بھی کلاسیک کا درجہ حاصل تھا ان میں قدیم تحریریں جو قدیم بزرگوں نے لکھیں اور نظمیں۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چین میں شاعری کی روایت بہت قدیم اور پختہ ہے۔ شاعری صرف ایک وسیلہ نہ تھا کہ جس کے ذریعے شاعر اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کرتے تھے بلکہ چینی شاعری کی روایت یہ ہے کہ وہ فطرت سے بے حد قریب ہوتی ہے۔ اور فطرت کے حسن کو اپنے اندر سمونے کی خلاقانہ کامیاب کاوش ہے۔ شاعری کا اثر اس معاشرے پر ہمہ گیر تھا۔

کنفیوشس کے زمانے کا چین۔ مذہب اور دیوتاؤں کے تصور سے خالی نہ تھا۔ آسمان کو سب سے بڑی حیثیت حاصل تھی۔ روحوں، بھوتوں، پریوں، آسیبوں اور اشیاء کی تجسیم کو مانا اور پوجا جاتا تھا۔ عناصر فطرت کی بھی عبادت کی جاتی تھی۔ لیکن کنفیوشس کی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کنفیوشس کو اپنے عہد کے ان عقائد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کنفیوشس کی تعلیمات کی روح۔ اخلاقی اعمال اور تربیت سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ تعلیم دیتا ہوا ملتا ہے کہ اخلاقی اقدار کو کس طرح اپنایا جا سکتا ہے۔ اخلاق سے کس طرح انسانی بلندی حاصل کر سکتا ہے۔ اخلاقی اصولوں اور آداب کو اپنا کر انسان بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے اس اعتبار سے دیکھیں تو کنفیوشس کی تعلیمات اور نظریات اس کے اپنے عہد کے مذہبی نظریات سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھے۔ کنفیوشس کے ایک شارح اور مفسر جیمز آر۔ ویر نے لکھا ہے:۔

"اس دور کے مذہبی عقائد اتنے کمزور گنجلک اور ناقابل تشفی ہو چکے تھے کہ جب کنفیوشس اخلاقی تعلیمات کا درس دینے لگا تو اس کی تعلیمات کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور پھر لوگوں نے قدیم مذہبی عقائد کو چھوڑ کر کنفیوشس کی تعلیمات پر مبنی ایک نئے مذہب کی بنیاد ہی کھڑی کر دی۔"

یہ کنفیوشس ہی تھا جس کی تعلیمات کے اثر سے دنیا کی ایک بڑی تہذیب نے جنم لیا، جسے چینی تہذیب کہا جاتا ہے۔ زمانہ بہت بدلا ہے اور کئی انقلاب آ چکے ہیں اس کے باوجود چینیوں کے مزاج اور ان کی تہذیب میں کنفیوشس کی تعلیمات کے اثرات ختم نہیں ہو سکے اور نہ ہو سکیں گے۔

صدیوں پہلے چین کے اس عظیم اخلاقی معلم نے کہا تھا۔ "جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسرے کے لیے ہی پسند کرو۔ جو چیز تمہیں ناپسند ہو وہ کبھی دوسرے کے لیے موزوں نہ سمجھو" ذرا غور کیجیے تو آپ کو کنفیوشس کا یہ قول اس کے بعد کے آنے والے کتنے ہی برگزیدہ انسانوں کے اقوال اور تعلیمات میں اپنے آپ کو دہراتا ہوا ملے گا۔

کنفیوشس کے اقوال

ذیل میں کنفیوشس کے کچھ اقوال پیش کیے جا رہے ہیں۔ انہیں چینی زبان سے انگریزی میں جیمز آر ویر نے ترجمہ کیا اور کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

٭۔ تیز طرار گفتگو، دوسروں کو جان بوجھ کر متاثر کرنے والے آداب سے کوئی شخص بڑا آدمی نہیں بنتا۔ تین بار میں اپنا محاسبہ کرتا ہوں، اور یہ جائزہ لیتا ہوں کہ کیا میں دوسرے لوگوں کے کاموں سے جی تو نہیں چرا رہا۔؟ کیا میں اپنے دوستوں سے فریب تو نہیں کر رہا۔؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو کچھ مجھے سکھایا گیا ہے، میں اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام تو نہیں رہا۔

٭۔ جب کسی شخص کا باپ زندہ ہو تو اس شخص کے مقاصد کا مشاہدہ کرو۔ جب اس کا باپ مر جائے تو اس کے اعمال کا جائزہ لو وہ اپنے باپ کی موت کے تین برس بعد بھی اپنے

اندر کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔ تو پھر وہ سچا مرد ہے۔ آپ اس آدمی کو کیا نام دیں گے جو اگرچہ غریب ہے۔ لیکن خوشامد نہیں کرتا اور اس آدمی کو کیا کہیں گے جو اگرچہ امیر ہے لیکن متکبّر نہیں۔

لیکن نہیں۔ ایک تیسرا آدمی بھی ہے۔ یہ وہ ہے جو غریب ہے اور مسرور رہتا ہے، اور جو امیر ہے، لیکن اپنی انسانی اور اخلاقی روایات کو فراموش نہیں کرتا۔

٭۔ میرا اس بات سے کچھ علاقہ نہیں کہ کوئی شخص مجھے کیوں نہیں جانتا۔ مجھے تو اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں اسے کیوں نہیں جانتا۔

٭۔ جب آپ کسی اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز ہوں تو آپ کو شمالی ستارے کی طرح بن جانا چاہیے۔ یہ ستارہ ہمیشہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے۔ حرکت نہیں کرتا اور دوسرے ستارے اس کے گرد جھرمٹ ڈال دیتے ہیں۔

٭۔ نظمیں "(چین کی کلاسیک) کی تین سو نظموں کا خلاصہ ایک جملے میں یوں ہے۔
"ہمارے خیالات راستی پر مبنی ہونے چاہئیں۔

٭۔ اگر کسی انتظامی قانون کے تحت سب لوگوں کو سزا دینے کے معاملے میں یکساں سلوک کا مستحق سمجھا جائے تو وہ آئندہ کے لیے جرم نہ کرنے میں کامیابی حاصل کریں گے لیکن وہ احساسِ ندامت سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم کسی اخلاقی نظام کے تحت سب انسانوں کو یکساں سمجھیں اور ان کو جرم کے ضمن میں سزا بھی یکساں دیں تو وہ احساس ندامت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اپنی اصلاح کر لیں گے۔

٭۔ جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں۔ اخلاقی آداب و رسوم کے تحت ان کی خدمت کریں۔ جب وہ فوت ہو جائیں تو اخلاقی رسوم کے تحت ان کو دفن کریں اور اس کے بعد ان کی یاد میں اخلاقی روایات کے تحت نذرانے پیش کرتے رہیں۔

٭۔ آج کے دور میں فرماں بردار ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے والدین کی کفالت کر رہا ہو۔ لیکن یہی شخص اپنے کتوں اور گھوڑوں کی خوراک، غذا اور دیکھ بھال کا بھی تو کفیل ہوتا ہے۔ اصل چیز تو وہ فرق ہے جو وہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان روا رکھتا ہے۔

٭۔ عظیم انسان کی تعریف یہ ہے کہ پہلے وہ خود دوسروں کے لیے مثال بنتا ہے۔ پھر

دوسروں کو تقلید کی دعوت دیتا ہے۔

٭۔ بڑا آدمی آفاقی نقطۂ نگاہ رکھنے کی وجہ سے غیر جانبدار ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی جانبدار ہوتا ہے اور اس کا نقطۂ نظر آفاقی نہیں ہوتا۔

٭۔ کیا میں آپ کو بتا دوں کہ علم کیا ہے؟ علم ان دونوں باتوں کے جاننے کا نام ہے کہ آپ کیا جانتے ہیں اور آپ کیا نہیں جانتے۔

٭ جس حد تک ممکن ہو، علم حاصل کریں، سیکھیں، اس کے بعد جو کچھ فاضل اور مشکوک ہے اس کو ایک طرف ڈھیر کر دیں۔ تب آپ کو غلطی کرنے سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ جس حد تک ممکن ہو، دنیا کا مشاہدہ کریں اور سیکھیں۔ اس کے بعد جو کچھ غیر موزوں ہے اسے ایک طرف رکھ دیں یوں آپ کو کبھی اپنے اعمال کی وجہ سے معذرت نہ کرنی پڑے گی۔ اپنی زبان کو کوتاہی اور غلطی سے، اپنے اعمال کو معذرت سے آزادی دلائیں۔ یہی کارِ خیر ہے جو کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

٭۔ اگر آپ بے ایمان اور بے انصاف حکام کی جگہ منصف اور ایماندار لوگوں کو لائیں گے تو لوگ آپ کی عزت کریں گے اور مطیع ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایماندار اور منصف حکام کی جگہ بے ایمان اور بے انصاف حکام کو لا کھڑا کریں گے تو پھر لوگ نہ آپ سے خوش ہوں گے نہ مطیع رہیں گے۔

٭۔ بزدلی اصل میں یہ ہے کہ آپ حق کے لیے آواز نہ اٹھا سکیں۔

٭۔ آپ کو بھیڑ سے محبت ہے اور مجھے قربانی سے۔

٭۔ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ مذاکرات پسند نہیں کرتا جو اپنے بھدے اور پھٹے ہوئے لباس پر شرمندہ ہو۔

٭۔ بڑا آدمی وہ ہے کہ جو دنیا کے بارے میں یہ رویہ اپناتا ہے کہ کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتا لیکن انصاف کے لیے وہ متعصب اور سخت گیر بن جاتا ہے۔

٭۔ چھوٹے آدمی کو مراعات اور مفادات سے غرض ہوتی ہے۔ بڑے آدمی کو اصولوں اور ضوابط کا پاس ہوتا ہے۔

٭۔ وہ شخص جو اپنے تمام اعمال کو صرف اپنے مقاصد اور مفاد کے لیے وقف کر دیتا ہے

اس کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے ۔

٭ ۔ اس بات پر کبھی نہ کڑھیے کہ آپ اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں۔ ہمیشہ اس بات پر دھیان دیں کہ آپ کو جو فرض سونپا گیا ہے وہ بخوبی انجام پائے ۔ آپ کو کوئی نہیں جانتا تو پریشان نہ ہوں اپنے آپ کو اس قابل بنانے پر توجہ دیجیے کہ لوگ آپ کو جاننے لگیں ۔

٭ ۔ جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں ، آپ کو مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے جانے کی ضرورت نہیں ۔

٭ ۔ وہ جو اپنے ساتھ محکم اور سخت رویہ رکھتا ہو وہ کبھی نہیں گرتا ۔

٭ ۔ بڑے آدمی گفتگو میں دھیمے اور عمل میں تیز ہوتے ہیں ۔

٭ ۔ میں ابھی تک ایسے شخص سے نہیں ملا جو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ملزم بھی سمجھتا ہو ۔

٭ ۔ ہمارے استاد کنفیوشس نے ایک دن اپنے شاگردوں سے سوال کیا مجھے بتاؤ کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش اور آرزو کیا ہے ؟

چانگ یو نے جواب دیا میں شاندار گاڑیوں ، گھوڑوں اور شاندار ملبوسات کی خواہش رکھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اتنی افراط سے ہوں کہ میں انہیں اپنے دوستوں میں تقسیم کرسکوں اور اگر وہ ان کو ضائع بھی کر دیں تو مجھے اپنے دوستوں پر غصہ نہ آئے ۔

٭ ۔ ین ہوئی نے کہا میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اپنی قابلیت کی بڑ نہ ہانکوں ۔ میرے اچھے اعمال کبھی لوگوں پر ظاہر نہ ہوں ۔

استاد نے کہا میری خواہش کوئی پوچھے تو یہ ہے کہ میں بوڑھوں کو ہمیشہ تحفظ دے سکوں اپنے دوستوں کا ہمیشہ وفادار رہوں اور اپنے چھوٹوں سے ہمیشہ شفقت برتوں ۔

٭ ۔ جب یوآن شیس کو ایک بڑا عہدہ سونپا گیا تو اس کے معاوضے میں ملنے والے اناج کو اس نے لینے سے انکار کر دیا ۔ وہ اپنے فرائض تنخواہ لیے بغیر ادا کرنا چاہتا تھا ۔ کنفیوشس نے اسے مشورہ دیا ۔

" تمہارا یہ عذر بھی غلط ہے اپنی تنخواہ ضرور وصول کرو اور اپنے غریب پڑوسی کو دیدو ۔

٭ ۔ وہ شخص جو رامتی سے زندگی بسر نہیں کرتا ۔ اگر وہ تباہ نہیں ہوتا تو غیر معمولی طور پر خوش قسمت واقع ہوا ہے ۔

٭ ۔ چیزوں کا خاموشی سے مشاہدہ اور مطالعہ کرو ۔ اور کتنا ہی پڑھ جاؤ اشتیاق اور لگن کو برقرار رکھو ۔ دوسروں کو تعلیم دینے سے کبھی نہ تھکنا چاہیئے ۔

٭ ۔ جس روز استاد (کنفیوشس) کسی کی تدفین میں شرکت کرتا تھا ۔ اس روز وہ موسیقی نہ سنتا تھا ۔

٭ ۔ دولت کے حصول کے لیے لوگ حقیر اور نیچ کام تک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ اس کے باوجود دولت نہیں ملتی ۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان اپنے قدیم دانشوروں کی تعلیم کو سامنے رکھے اور دولت سے مستغنی ہو جائے ۔

٭ ۔ گوشت کے بغیر سبزی کھانا پڑے ، پینے کے لیے صرف پانی ملے ۔ سونے کے لیے تکیہ نہ ہو بلکہ اپنے بازو کو ہی تکیہ بنانا پڑے ۔ یہ حالت بہتر ہے اس دولت سے جو بے انصافی سے حاصل کی گئی ہو ۔

٭ ۔ میں پیدا ہوا تو مجھے یہ علم نہ تھا کہ مجھے تمہیں کیا تعلیم دینی ہے ۔ میں نے ماضی کے علم کو دریافت کیا اور جان لیا کہ مجھے کیا درس دینا ہے ۔

٭ ۔ تم سب شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے کچھ چھپا رہا ہوں ۔ میرا کوئی راز نہیں ہے ۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس میں دوسروں کو شریک نہ کر سکوں ۔

٭ ۔ ہمارے استاد کنفیوشس کی تعلیم کے چار بنیادی نکات ہیں ۔

ادب (لٹریچر) اخلاقی رویہ ، اعمال ، وفاداری اور ذمہ داری ۔

٭ ۔ ہمارے استاد (کنفیوشس) نے کبھی کسی بیٹھے ہوئے پرندے پر تیر نہیں چلایا ۔

٭ ۔ بڑا آدمی ہمیشہ مطمئن رہتا ہے ۔ چھوٹا آدمی ہمیشہ ڈانواں ڈول ۔

٭ ۔ لوگوں کو کسی کی اطاعت کرنا تو سکھایا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں سکھایا جا سکتا کہ وہ اس نظام کو سمجھ بھی سکیں ۔

٭ ۔ وہ جو کہ شجاعت کا رسیا ہے لیکن غربت کی شکایت کرتا رہتا ہے ایسا شخص بدامنی

کا سبب بنتا ہے ایسے آدمی کا ملنا محال اور ناممکن ہے جو تین برس تک مسلسل علم حاصل کرے اور سرکاری نوکری کا خواہاں نہ ہو۔"

⁂ ۔ دوسرے شخص کو کسی مداخلت کے بغیر کام کرنے دو۔

⁂ ۔ مطالعہ اس طرح کرو کہ تم علم پر کبھی حاوی نہ ہو سکو گے اور ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہو کہ تم نے جو پڑھا ہے وہ کہیں ضائع نہ کر دو۔

⁂ ۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ بعض بیج پودا نہیں بنتے اور ضائع ہو جاتے ہیں اور کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ بعض پودوں کو پھول نہیں لگتے۔

⁂ ۔ مجھے باتونی آدمی اچھا نہیں لگتا۔

⁂ ۔ بڑا آدمی نہ پریشان ہوتا ہے نہ خوفزدہ۔

⁂ ۔ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنی خوبیاں دوسروں میں منتقل کرتا ہے۔ اور اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کو دوسروں سے دور رکھتا ہے۔

⁂ ۔ اگر آپ کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہیں تو بڑی چیز آپ کو کبھی نہ ملے گی۔

⁂ ۔ وہ جو صرف اپنی آسودگی اور آرام کا خیال رکھتا ہے۔ آدمی نہیں ہے۔

⁂ ۔ بڑا آدمی تھوڑے الفاظ اور زیادہ کارناموں کا مالک ہوتا ہے۔

⁂ ۔ وہ جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، اگر وہ اخلاقیات کے پابند ہیں تو وہ آسانی سے لوگوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

⁂ ۔ بڑا آدمی ہمیشہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی شکایت کرتا رہتا ہے۔

⁂ ۔ بڑے آدمی کا ہر مطالبہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی دوسروں سے مطالبہ کرتا ہے۔

⁂ ۔ وہ آدمی جو مختلف راستوں پر چل رہے ہوں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کیسے کر سکتے ہیں؟

⁂ ۔ ہم دوسروں کے بارے میں اندازہ لگاتے رہتے ہیں کہ وہ کس قدر قیمت کے مالک ہیں۔

⁂ ۔ ہماری عادات ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جاتی ہیں۔ وہ جن میں کبھی کوئی

تبدیلی نہیں آتی ، ولی ہوتے ہیں یا احمق ۔

۵ ۔ وہ جو انسان کے مقدر کی پہچان نہیں رکھتا وہ بڑا آدمی نہیں ہو سکتا ۔ وہ جو اخلاقی روایات اور رسوم کا خیال نہیں کرتا وہ زندگی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتا ۔ وہ جسے الفاظ کی قدر و قیمت کا علم نہیں ۔ وہ انسانوں کو کبھی نہیں جان سکتا ۔ ۔

۷

دھماپد

"دھماپد" مہاتما بدھ کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔

دھماپد۔ پالی زبان میں ہے جو سنسکرت سے بے حد قریب ہے۔ سنسکرت کا ایک لفظ "دھرم" جو معنی رکھتا ہے وہی معنی "دھما" کے ہیں اور اس کے معنی ہیں صداقت۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل جو مقدس کتابیں لکھی ہیں وہ پالی زبان میں ہیں اور پالی زبان سے ہی ان کا ترجمہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہوا ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل یہ مقدس کتابیں پالی زبان میں سری لنکا، برما اور انڈوچائنا میں لکھی گئیں۔ بعض ماہرین لسانیات کا فیصلہ ہے کہ پالی اور سنسکرت دونوں زبانیں اسی طرح ایک دوسرے سے متعلق اور مربوط ہیں جس طرح اطالوی اور لاطینی زبانیں صوتیات کا فرق ہے۔ "دھرما" پالی میں 'دھما' بن جاتا ہے اور 'نروان' پالی زبان میں 'نبانا'۔

"دھماپد" کا مفہوم یوں ہوا۔ دھرم کا راستہ، صداقت کا راستہ.... مہاتما بدھ کی تعلیمات میں پد (PATH) کے معنی بہت وسیع ہیں۔ پد۔ یہاں وہ راستہ ہے جو نیکوکاری، سچائی، صداقت اور خیر کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو دراصل خود انسان بناتا ہے۔ جو چلتا ہے۔ قدم رکھتا ہے اور راستہ بنتا چلا جاتا ہے۔ یہ انسان کے اعلیٰ اعمال سے بننے والا راستہ ہے۔ روشنی کا راستہ، صداقت مطلق کا راستہ، اور بدھ کی تعلیمات کے حوالے سے "نروان" کا راستہ.... عرفان کا راستہ۔ اس راستے پر چلنے والے کو 'نروان' یا عرفان حاصل ہوتا ہے وہ "دھیلہ پیسہ" خرچ کیے بغیر ملتا ہے۔

مہاتما بدھ کی زندگی کے بارے میں میں یہاں تفصیل سے نہیں لکھوں گا۔ گوتم جس کا زمانہ ۴۸۳ - ۵۶۳ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ شہزادہ تھا اور اپنی تلاش میں اپنے محل، اپنے راج، اپنی بیوی، اپنا بیٹا اور ساری آسودگیاں اور آسائشیں چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ مطلق سچائی کی تلاش میں تھا۔ اپنی اس تلاش میں اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کی یہ لافانی کش مکش، جد و جہد اور جستجو چھ برس تک جاری رہی۔ بالآخر چھ برسوں کی جد و جہد کے بعد مایوس ہو کر "گیا" میں برگد کے درخت کے نیچے اس عزم کے ساتھ بیٹھ گیا کہ یا تو وہ مر جائے گا یا پھر ابدی زندگی حاصل کر کے رہے گا۔ اس کی تپسیا، سپھل ہونے کا لمحہ آ چکا تھا اور پھر تاریکی چھٹ گئی۔ اور گوتم نے بہت دیکھا۔ چار عظیم سچائیاں اس پر منکشف ہوئیں اور تکمیل کرنے والی آٹھ آٹھ خوبیوں کا راستہ دیکھا۔ توازن کا راستہ پایا۔ اسے نروان حاصل ہوا اور وہ گوتم سدھارتھ سے مہاتما بدھ۔ جاگی ہوئی روح، نروان پانے والا بن گیا۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات کا ایک مجموعہ "دھاپد" کے نام سے مرتب ہوا۔ یہ بدھ کی تعلیمات کی بنیادی مقدس کتاب ہے۔ "دھماپد" کی ترتیب و تدوین کا زمانہ تین سو سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ جب بدھ نے نروان حاصل کیا تو ہمیں بتایا جاتا ہے۔ اس نے اپنے نروان پانے کی مسرت کا اظہار جن الفاظ میں کیا۔ وہ دھماپد میں موجود ہیں۔ مہاتما بدھ نے کہا تھا:-

"میں نے یونہی بے کار میں زندگی اور موت کے خالق کو تلاش کرنے کے لیے کئی جنم لیے اور مسلسل گردش میں رہا۔ زندگی کا الم کتنا بے بہا ہے کہ بالآخر ہمیں مرنا ہے لیکن اب میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ اے معمار، اے خالق اب تم اس گھر کو مزید تعمیر نہ کر سکو گے۔ گناہ کے شہتیر ٹوٹ چکے ہیں۔ جہالت کا ستون تباہ ہو گیا ہے۔ ترغیب کا بخار اتر چکا۔ کیونکہ میرے ذہن نے نروان کی ابدی مسرت کو پا لیا ہے۔"

"دھماپد" کا جو ترجمہ میرے سامنے ہے اس کو پالی زبان سے جوآن ماسکرو نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ جوآن ماسکرو نے اس ترجمے کے ساتھ ایک دیباچہ اور "دھماپد" کا تعارف بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ قارئین جو "دھماپد" پڑھنے کے

خواہاں ہوں وہ جوآن ماسکرو کا ترجمہ پڑھیں۔

دنیا کے تمام بڑے مذاہب اور خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی تعلیم کا جوہر اور ماحصل ایک ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات بھی صرف بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر انسان ان تعلیمات پر عمل کر کے اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔ جوآن ماسکرو اسی حوالے سے اس دیباچے میں لکھتا ہے:

"ہم جانتے ہیں کہ کتنی ہی مقدس کتابیں ہیں۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ مذاہب بھی مختلف ہیں۔ لیکن اگر ہم ان مقدس کتابوں کا مطالعہ احتیاط، دقتِ نظری اور روحانی صفائی سے کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ ان سب کا اخلاق اور روحانی جوہر ایک ہے۔ کائنات کی سچائی لا بدی طور پہ ایک ہے۔ جس طرح سائنس، شاعری، مذہب اور انسانیت کی روح بھی ایک ہے اور بدھ نے بھی اسی ایک سچائی کو دریافت کیا۔ اس کا نروان حاصل کیا۔"

'دھماپد' نثر میں نہیں ہے۔ اس کا اظہار شعری ہے۔ اس حوالے سے جوآن ماسکرو نے خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"سائنس زمین پر چلتی ہے۔ جبکہ شاعری زمین کے اوپر اُڑتی ہے۔ انسان کی ترقی کے لیے دونوں ناگزیر ہیں۔ لیکن ہم خوب صورتی، جمال، محبت، خیر اور صداقت کو مائیکرو سکوپ سے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کو تو ہم شاعری کے حوالے سے ہی جان سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی سائنس پرانی ہو جاتی ہے۔ جب کہ ماضی کی شاعری کبھی پرانی نہیں ہوتی۔"

جب ہم 'دھماپد' پڑھتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات سے متعارف ہوتے ہیں تو ہمارے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو ہمیں دوسرے بڑے مذاہب اور پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ یہ درست ہے کہ مہاتما بدھ کے ہاں مابعد الطبیعاتی مسائل کو سرے سے ہی چھوا نہیں گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بدھ ہمیں جو راستہ دکھاتا ہے، اگر ہم اس پر چل نکلیں تو ہمیں خود ہی ان سوالوں کا جواب مل سکتا ہے کیونکہ ان تعلیمات پر عمل کرنے کے بعد جو 'نروان' یا عرفان حاصل ہوتا ہے اس میں سب

کچھ موجود ہے۔ ہر سوال کا جواب۔

چھوٹا منہ بڑی بات، والی بات ہے۔ لیکن میں یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ "دھما پد" کا مطالعہ کرنے کے بعد بدھ کی تعلیمات کے ڈانڈے ہمارے اسلامی تصوّف کے "مسلکِ وحدت الوجود" سے ہم آہنگ اور یک جان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ 'دھما پد' کا مطالعہ اس نظریے سے بھی کرنا چاہیے۔

'دھما پد' کے حوالے سے مہاتما بدھ کی تعلیمات کا جوہر یہ سامنے آتا ہے کہ" وہ نہ کرو جو شر ہے وہ کرو جو خیر ہے۔ اپنا ذہن پاک رکھو۔ یہی بدھ کی تعلیم ہے۔" (دھما پد)

اس سلسلے میں ایک کہانی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مسلح شخص نے ایک بار طویل سفر اس مقصد کے تحت کیا کہ وہ بدھ کے کسی پیروکار سے ملے گا اور اس سے استفسار کرے گا کہ کیا اسے مہاتما بدھ کی تعلیمات سے نوازا جا سکتا ہے۔ طویل سفر کے بعد وہ بدھ کے ایک نامور بھکشو اور پیروکار سے ملا۔ اس نے مسافر سے کہا بدھ کی تعلیم یہ ہے کہ جو بُرا ہے وہ نہ کرو۔ جو خیر ہے اس پر عمل کرو۔ اپنا ذہن ہمیشہ پاک رکھو۔ اس مسلح شخص نے جو لمبا سفر کر کے آیا تھا کہا "بس یہی اس کی تعلیم ہے؟ یہ تو ہر پانچ برس کا بچہ بھی جانتا ہے۔" اس بھکشو نے جواب دیا۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسّی برس کے بھی چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو اس پر عمل کر سکتے ہوں۔"

"دھما پد" کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ دھما پد کی تعلیمات کی بازگشت موثر انداز میں دنیا کی ہر مذہبی کتاب اور پیغمبروں کی تعلیمات میں سنائی دیتی ہے۔ کیونکہ 'دھما پد' کی تعلیمات ہر مقدس کتاب اور ہر پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ مربوط ہیں۔ ایک ہیں ....

'دھما پد' دانش کا بے مثل مجموعہ ہے۔ 'دھما پد' میں مردِ دانش کی تعریف یوں ملتی ہے۔ "جس طرح جھیل کا پانی پاک ہوتا ہے، پُرسکون اور گہرا، اسی طرح مردِ دانا کی روح ہوتی ہے۔"

"دھما پد" کے الفاظ صداقت ہیں۔ 'دھما پد' تاریکیوں میں فروزاں ایک کبھی نہ

بجھنے والی مشعل ہے۔ 'دھماپد' میں بدھ کی آواز سنتے ہیں جو روشنی اور محبت سے معمور ہے جولافانی ہے۔ ہر عہد پر چھائی ہوئی ہے۔ گونج رہی ہے۔

ذیل میں 'دھماپد' کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ 'دھماپد' جس کی ہر سطر ایک ستارے کی طرح ہے۔ جو کل کی حیثیت میں ابدیت کی مانند ہے۔!!

٭ ۔ ہم آج جو ہیں۔ وہ اپنے کل کے خیالات کی پیداوار ہیں۔ اور ہمارے آج کے خیالات ہمارے کل کو تعمیر کریں گے۔ ہماری زندگی ہمارے ذہن کی تخلیق ہے۔

٭ ۔ "اس نے میری اہانت کی۔ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ اس نے مجھے شکست دی۔ اس نے مجھے لوٹ لیا۔" وہ لوگ جو ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کبھی نفرت سے نجات نہ پا سکیں گے۔

٭ ۔ اگر کوئی شخص پاک زرد لبادہ اوڑھتا ہے اور اس کی روح ناپاک ہے، اپنے آپ سے اور سچائی سے ہم آہنگ نہیں تو وہ اس لبادے کا حق دار نہیں ہے۔

٭ ۔ ایک دشمن دوسرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور ایک آدمی جو نفرت کرتا ہے وہ دوسرے کو دکھ پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا اپنا ذہن گمراہ ہو چکا ہے تو وہ اپنے آپ کو ناقابل بیان نقصان پہنچائے گا۔

٭ ۔ ایک باپ، ایک ماں، یا رشتے دار کسی انسان کا بھلا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ خود راست رو ہے تو وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ بھلائی دے سکتا ہے۔

٭ ۔ جس طرح شہد کی مکھی پھول کا رس اور خوشبو چوس کر پھول کے حسن کو مجروح کیے بغیر اڑ جاتی ہے، اسی طرح نیک آدمی دنیا میں گھومتا رہتا ہے۔

٭ ۔ دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو۔ یہ نہ دیکھو کہ دوسروں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا اپنے گناہوں کے بارے میں سوچو اور ان کاموں کا خیال کرو جو تم نے کیے ہیں یا نہیں کیے ہیں۔

٭ ۔ وہ جو نیکیوں اور خوبیوں سے متصف راستے پر چلتے ہیں۔ جو محتاط ہیں، جن کی سچی روشنی ان کو آزادی بخشتی ہے۔ ان کا راستہ "مارا" (موت) کبھی نہ کاٹ سکے گی۔

٭ ۔ یہ میرے بیٹے ہیں ۔ یہ میری دولت ہے ۔ یوں احمق اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں ۔ وہ جو اپنے آپ کا مالک نہیں ہے ۔ وہ بھلا اپنے بیٹوں اور دولت کا مالک کس طرح بن سکتا ہے ۔

٭ ۔ ایسے بھی احمق ہوتے ہیں جو ساری عمر کسی مرد دانا کی رفاقت اور صحبت میں رہتے ہیں لیکن وہ دانائی کا راستہ اختیار نہیں کر پاتے ۔ ایسے لوگوں کی مثال اس چمچے کی طرح ہے جو کبھی شراب کا ذائقہ نہیں جان پاتا ۔

٭ ۔ وہ احمق جسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے وہ اس اعتبار سے دانا ہوا ۔ لیکن وہ احمق جو اپنے آپ کو دانا سمجھے وہ دراصل احمق ہے ۔

٭ ۔ ایک برے عمل کا ردعمل کبھی فوری طور پہ سامنے نہیں آتا جس طرح تازہ دودھ کبھی یک دم نہیں پھٹتا ۔ راکھ کے نیچے چھپی ہوئی آگ بھی تو ہوتی ہے ۔

٭ ۔ اس آدمی کی قدر کرو جو تمہاری خامیوں سے تمہیں اس طرح آگاہ کرتا ہے جیسے وہ چھپے ہوئے خزانے کا پتہ بتا رہا ہو ۔ وہ مرد دانا تمہیں زندگی کے خطرات سے آگاہ کرتا ہے اس کی تقلید کرو اور جو کوئی اس کا مقلد بنے گا وہ خیر تک پہنچے گا ۔ شر سے بچا رہے گا ۔

٭ ۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو وقت کا دریا پار کر کے نروان حاصل کر سکیں ۔ بیشتر تو بھاگتے ہوئے دریا کے اس پار ہی گر پڑتے ہیں ۔

٭ ۔ لیکن جو قانون اور اصول جانتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں ۔ وہ دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں اور موت کی سلطنت سے نکل جاتے ہیں ۔

٭ ۔ مسافر اپنے سفر کے اختتام تک پہنچ گیا ۔ مطلق آزادی حاصل کر کے وہ رنج و غم سے نجات پا گیا ۔ وہ زنجیریں جنہوں نے اسے جکڑا ہوا تھا وہ سب ٹوٹ پھوٹ گئیں اور زندگی کا جلتا ہوا بخار اب باقی نہیں رہا ۔

٭ ۔ عقل مند اپنے حواس پر اس طرح غالب آتا ہے جس طرح ایک شہسوار اپنے گھوڑوں پر قابو پا لیتا ہے اور وہ جو گھٹیا خدمات اور تکبر میں آزاد ہو جاتا ہے ، دیوتا بھی اس کا احترام کرتے ہیں ۔

٭ - ایک نیک مقدس آدمی جہاں قیام کرتا ہے وہی حقیقت میں قیام مسرت ہے۔ خواہ وہ گاؤں ہو، جنگل، وادی یا پہاڑیاں ....

٭ - ہزاروں بے کار اور بے معنی الفاظ کے مقابلے میں وہ ایک لفظ بہتر ہے جو سکون بخشتا ہے۔

٭ - ایک شخص ایک جنگ یا ہزاروں جنگیں جیت لے وہ اس آدمی سے بڑا اور بہتر نہیں ہو سکتا جس نے اپنے آپ پر فتح پائی ہو۔ ہزاروں بڑی فتوحات سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح پانا ہے۔ اور جس نے ایسی فتح پائی ہو اُسے آسمانوں پر رہنے والے دیوتا اور زمین کے نیچے رہنے والے شیطان بھی شکست نہیں دے سکتے۔

٭ - محبت سے کام لو، اور وہ کرو جو اچھا ہے۔ اپنے ذہن کو شر سے دور رکھو۔ اگر کوئی شخص عمل خیر میں سست رو ہے تو پھر اس کا ذہن شر میں خوشی حاصل کرنے لگتا ہے۔

٭ - آسمان کی بلندیوں پر، سمندروں کی پہنائیوں میں، نہ ہی پہاڑوں کی اندھی غاروں میں نہ ہی کہیں اور۔ آدمی موت سے بچ سکتا ہے۔

٭ - جب تک برائی اپنا پھل نہیں لاتی، انسان اس برائی میں خوش رہ سکتا ہے۔ جب برائی بھی پھل لاتی ہے تو پھر آدمی برائی کو سمجھ لیتا ہے۔

٭ - سارے وجود خطرے کے سامنے کانپتے ہیں، سب موت سے ہراساں رہتے ہیں جب ایک آدمی اس حقیقت کو پالیتا ہے تو وہ نہ کسی کو ہلاک کرتا ہے نہ کسی کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔

٭ - کبھی درشت اور سخت الفاظ نہ بولو۔ کیونکہ اگر ایک بار یہ زبان سے نکلے تو خود تمہاری طرف پلٹ آئیں گے۔ غضیلے الفاظ درد اور دُکھ دیتے ہیں۔

٭ - جب ایک احمق بُرا کام کرتا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ ایسی آگ جلا رہا ہے جس میں وہ خود ایک دن جل مرے گا

٭ - یہاں کوئی کس طرح قہقہہ لگا سکتا ہے؟ یہاں کس طرح محبت کا دور دورہ ہو سکتا ہے جبکہ ساری دنیا جل رہی ہو۔ اور جب تم گھُپ اندھیرے میں ہو گے تو تم چراغ حاصل کرنا نہ چاہو گے۔

٭ ۔ یہ جسم ہڈیوں کا گھر ہے ۔ ہڈیاں جن پر گوشت چڑھا اور جن میں خون ہے ۔ تکبر او ر منافقت اس گھر میں رہتے ہیں اور بڑھاپا اور موت بھی ۔

٭ ۔ بادشاہوں کے شاندار رتھ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں ۔ جسم بوڑھا ہو جاتا ہے ۔ لیکن خیر کی خوبی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی ۔ !

٭ ۔ ہر غلطی یا برائی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے اس کے اندر جنم لیتی اور وہی اس کا سبب ہے اور یہ بُرائی احمق آدمی کو اسی طرح کچل کر رکھ دیتی ہے ۔ جس طرح بھاری پتھر ۔ سنگریزے کو ۔ !

٭ ۔ اپنی ذات کے لیے بُرائی کرنا ، جو اپنے لیے بُرا ہو وہ بھی بے حد آسان ہوتا ہے ۔ لیکن اچھائی کرنا اور جو اپنے لیے اچھا ہو ۔ یہ عمل بہت مشکل ہے ۔

٭ ۔ جاگو ، اُٹھو ، دیکھو ، سچے راستے پر چلو ۔ وہ جو سیدھے راستے پر چلتا ہے ۔ اس کے لیے اس دنیا اور اگلی دنیا میں بھی مسرت ہے ۔ !

٭ ۔ وہ جس کی زندگی کے ابتدائی دن جہالت میں بسر ہوئے اور جس نے بعد میں دانش کو پالیا ۔ وہ دنیا کو اسی طرح روشن کرتا ہے جس طرح چاند جو بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو ۔

٭ ۔ کنجوس کبھی دیوتاؤں کے بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا اور احمق کبھی سخاوت کی تعریف نہیں کر سکے ۔ لیکن اچھے لوگ فیاضی میں مسرت حاصل کرتے ہیں ۔

٭ ۔ اپنے اعمال اور گفتار سے کسی کو آزار نہ پہنچاؤ ۔ کھانے پینے میں اعتدال سے کام لو ۔

٭ ۔ آدمی اپنے خوف سے بچنے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں ۔ مقدس درختوں اور خانقاہوں میں پناہ کی تلاش میں جاتے ہیں ۔ لیکن کہیں پناہ نہیں ملتی ۔ کیونکہ رنج سے مفر نہیں ۔ پناہ ہے تو صداقت میں ، بدھ کی تعلیمات میں ۔

٭ ۔ سنو ، مسرت اور شادمانی کی زندگی بسر کرو ۔ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوئے جو نفرت کرتے ہیں ۔ نفرت کرنے والے لوگوں میں محبت کے ساتھ رہو ۔

٭ ۔ حرص سے بُری کوئی آگ نہیں ۔ نفرت سے بڑی کوئی بُرائی نہیں ۔ ہم آہنگی کے فقدان سے بڑا کوئی درد اور رنج نہیں ۔ اور جو ان کو شکست دیتا ہے وہی آدمی مسرت حاصل کرتا ہے ۔

٭ ۔ غصہ ترک کردو ۔ تکبر چھوڑ دو ۔ دُکھ اور رنج اس شخص کو چھُو بھی نہیں سکتے ۔ جو ایسے بندھنوں سے آزاد ہو

٭ ۔ غصے پر امن سے غلبہ حاصل کرو ۔ شر پر خیر سے برتری حاصل کرو ۔ کمینگی پر فیاضی سے غلبہ پاؤ اور جو جھوٹ بولتا ہے وہ سچ اپنائے ۔

٭ ۔ سچ بولو ۔ غصے سے مغلوب نہ ہو ۔ جو مانگتا ہے اُسے جو کچھ دے سکتے ہو ، دو ۔ یہ تین اقدام تمہیں دیوتاؤں کے قریب لے جائیں گے ۔

٭ ۔ تمہاری زندگی کے درخت پر زرد پتے لٹک رہے ہیں ۔ موت کا قاصد انتظار میں ہے ۔ تمہیں دُور دراز کا سفر طے کرنا ہے ۔ کیا اس طویل مسافت کے لیے تمہارے پاس زادِ راہ ہے ؟

٭ ۔ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ جہالت ہے ۔ اے انسان ! اس گناہ کو دھو ڈالو اور اس گناہ سے پاک ہو جاؤ ۔

٭ ۔ ایک آدمی اس لیے عظیم اور بڑا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ہلاک کرتا چلا جاتا ہے ۔ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ کسی ذی روح کو ہلاک نہ کرے ۔

٭ ۔ ” سب کچھ عارضی اور فانی ہے ۔ “ جب انسان یہ جان لیتا ہے تو وہ رنج سے ماورا ہو جاتا ہے ۔ اور یہی سیدھا راستہ ہے ۔

٭ ۔ وہ لوگ جو اس وقت ندامت محسوس کرتے ہیں جب انہیں نادم ہونا چاہیئے اور وہ جو اس وقت ندامت کا اظہار نہیں کرتے ، جب انہیں نادم ہونا چاہیئے ۔ وہ لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے اور نشیب کو جانے والے راستے پر چل رہے ہیں ۔

٭ ۔ زندگی کے راستے میں اکیلے سفر کرنا اس سے بہتر ہے کہ ہم سفر احمق ہو ۔ !

۸

گرنتھ صاحب

"بانگ درا" میں علامہ اقبال کی ایک نظم ہے "نانک" علامہ اقبال گورو بابا نانک کے بارے میں اس نظم میں فرماتے ہیں:۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یکدانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اسی طرح علامہ اقبال، بانگ درا، کی نظم "ہندوستانی بچوں کا "قومی گیت میں بابا نانک کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ع

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا!

سکھوں کی مذہبی کتاب 'گرنتھ صاحب' کے ذکر کے ساتھ گورو بابا نانک جی کا ذکر لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کی بابا نانک جی کے بارے میں نظم کا حوالہ اس لیے ضروری بنتا ہے کہ اقبال کے علاوہ برصغیر کے تمام مفکر اور دانشور بابا نانک جی کو موحد سمجھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا جوہر وحدانیت میں ہے۔ جبکہ ہندو فلسفی، سیاست دان اور عالم ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ سکھ پنتھ کو ہندو مت کا ہی ایک حصہ ثابت کیا جائے اور اس طرح جس حد تک ممکن ہو بحیثیت قوم سکھوں کا استحصال کیا جائے۔ جس کا ثبوت واضح طور پر سکھ قوم کو برصغیر کی تقسیم کے بعد ہو چکا ہے۔

ہندو عقیدے (علما اسے مذہب نہیں مانتے) اور سکھ مذہب اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور سکھوں کے گرنتھ صاحب کی تعلیمات میں بدیہی فرق اور تضاد ہے۔ ہندو ان گنت دیوی دیوتاؤں کو مانتے، ان کی مورتیاں بناتے اور ان کی مندروں میں پوجا کرتے ہیں وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کی تجسیم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سکھ بت پرستی، مورتیوں اور گروؤں کی تجسیم کو کفر سمجھتے ہیں۔ گوردواروں میں کسی مورتی کی پوجا نہیں کی جاتی۔ جبکہ ہندوؤں کے کسی مندر کا تصور بھی مورتی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

بابا نانک، ان کی شخصیت، گرنتھ صاحب اور اُن کی تعلیمات کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات کے اثرات بابا نانک جی اور گرنتھ صاحب اور اس کی تعلیمات سے صاف عیاں ہیں۔ ہندو علمائے نے ہمیشہ انہیں جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ گوکل چند نارنگ اپنی کتاب ٹرانسفارمیشن آف "سکھ ازم" میں لکھتے ہیں:۔

ALTHOUGH PRECIPITATED BY ISLAM SIKHISM OWS NOTHING TO THAT RELIGION. IT IS, ON THE OTHER SIDE A PHASE OF HINDU RELIGIOUS REVIVAL AND HAS IN CONSEQUENCE RETAINED ALL ESSENTIAL FEATUR-ES OF REAL HINDUISM. (P.P.254)

بابا نانک کی اور گرنتھ صاحب کی تعلیمات کی اتنی غلط اور گمراہ کن تفسیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن بیشتر ہندو علماء کا یہی رویہ ہے ۔ بابا نانک موحد اور گرنتھ صاحب ۔ وحدانیت کا پرچار کرتے ہیں ۔ اصنام پرستی کے علاوہ ذات پات کی مکمل نفی سکھ مذہب کا جوہر ہے جن کے بغیر ہندو مت کا تصور محال ہے ۔ لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود بعض روشن خیال سکھ دانشوروں کا بھی یہی خیال ہے ۔ خوشونت سنگھ جیسا دانشور بھی اسی خیال اور نظریے کا موید ہے ۔ خوشونت سنگھ اپنی کتاب "THE SIKHS" میں لکھتے ہیں :۔

THERE IS LITTLE EVIDENCE TO SUPPORT THE BELIEF THAT GURU NANAK PLANNED THE FOUNDING OF A NEW COMMUNITY SYNTHESIZING HINDUISM AND ISLAM HE SIMPLY REFORM HINDUISM. (P.P.45)

میں بڑے عجز سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو گورو بابا نانک اور گرنتھ صاحب کی تعلیمات کا مطالعہ کرے گا وہ خوشونت سنگھ کی اس 'عالمانہ' رائے سے انکار کرے گا ۔ ہر وہ شخص جو ہندو مت اور سکھ مذہب کی بنیادی تعلیمات کو جانتا ہے وہ اس فرق کو سمجھتا ہے کہ بابا نانک پر اسلامی تعلیمات کا اثر بے حد شدید اور گہرا تھا ۔ وہ ہندو مت کی اصلاح نہیں چاہتے تھے ۔ بلکہ ایک نئے مذہب اور قوم کی بنیاد رکھ رہے تھے جس پر اسلام کے گہرے اثرات ہیں ۔ لیکن وہ ہندو مت کی مکمل نفی کرتا ہے ۔

خود بابا نانک جی کی زندگی کے متعدد ایسے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں اور پھر گرنتھ صاحب کی تعلیمات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

سکھ مذہب اور ہندو مت کا فرق سمجھنا ہو تو پھر سکھ مذہب کی مابعد الطبیعات کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

گرنتھ صاحب۔ دنیا کی مذہبی کتابوں میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب ایک خاص پہلو کے اعتبار سے اس کتاب کی مثال نہیں دے سکتی۔ دنیا کی ہر مذہبی کتاب کا ایک خاص مزاج ہے۔ وہ الہامی ہے یا نہیں، یہ مسائل اس وقت بحث طلب نہیں ہیں لیکن ہر کتاب اپنے پیغمبر اور اپنے مذہب کا خالص مظہر بنتی ہے۔ جبکہ سکھوں کی مذہبی کتاب "گرنتھ صاحب" میں یہ بات نہیں ہے۔!

سکھوں کے پانچویں گورو گورو ارجن نے گرنتھ صاحب کی تدوین و ترتیب کا ایک عظیم فریضہ ادا کیا۔ اپنے سے پہلے چار گوروؤں کے مرتبہ کاموں کا بھی گورو ارجن نے جائزہ لیا۔ گورو بابا نانک جہاں جہاں گئے تھے وہاں گورو ارجن نے اپنے نمائندے بھیجے۔ تاکہ ان کے کلام، ان کے فرمودات کو جمع کیا جائے۔ حتیٰ کہ ایک نمائندہ سری لنکا بھی گیا جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ گورو نانک جی نے جو چار اہم سفر کیے تھے۔ ان میں سے ایک کے درمیان میں وہ سری لنکا بھی تشریف لے گئے۔ گورو ارجن نے اس مقدس کام کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی بھی لی اور خود تیسرے گورو بابا موہن کے پاس گئے اور ان کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے قبضے میں گوروؤں کی جو تحریریں ہیں وہ انہیں سونپ دی جائیں۔ لیکن گورو ارجن نے گرنتھ صاحب کی ترتیب و تدوین اور یکجائی کے سلسلے میں ایک ایسا کام بھی کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی مذہبی کتاب پیش نہیں کر سکی۔ گرنتھ صاحب میں ہندو بھگتوں اور مسلمان صوفیائے کرام کا کلام بھی شامل کر لیا۔

گرنتھ کا یہ نسخہ جو گورو ارجن نے تیار کیا اور جس کی ترتیب میں بھائی گورداس نے نیابت کی۔ اسے "آدھی گرنتھ" کا نام دیا گیا۔ ۱۶۰۴ء میں اسے امرتسر کے ہری مندر میں رکھا گیا اور جو پہلا گرنتھی مقرر ہوا اس کا نام بھائی بڈھا تھا۔

بعد میں گورو گوبند سنگھ نے اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کروایا۔ جس میں نویں گورو تیغ بہادر کے شبد بھی شامل کر لیے گئے۔ لیکن گورو گوبند سنگھ نے اس میں اپنے اشلوک شامل نہ

کیے۔ (تاہم ان کا ایک اشلوک کسی طرح گرنتھ صاحب میں باقی رہ گیا۔) گرنتھ صاحب کے پورے نسخے کی املا خود گورو گوبند سنگھ نے ڈمڈمہ (تلونڈی سابو) میں خود کروائی ہے۔!

گرنتھ صاحب میں گوروؤں کے شبدوں اور اشلوکوں کے علاوہ ۳۶ ایسے افراد کا کلام بھی شامل ہے جو سکھ نہ تھے۔ سکھ مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے گرنتھ صاحب دنیا کی عجیب اور بے مثل مذہبی کتاب ہے کہ اس میں ان لوگوں کا کلام بھی شامل ہے جو اس مذہب سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ جن کے اپنے عقائد اور مذاہب تھے۔ لیکن ان کے کلام اور فرمودات کو اب سکھ "گرنتھ صاحب" کے حوالے سے اپنے عقیدے میں شامل کر چکے ہیں۔ اس سے سکھ مذہب کی وسیع المشربی کا ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر جسبیر سنگھ اہلووالیہ نے اپنی کتاب THE SOVEREIGNTY OF SIKH DOCTRINE میں تفصیل سے حوالہ دیا ہے کہ برصغیر کے کس کس علاقے کے کس کس بزرگ کا کلام گرنتھ صاحب میں شامل ہے جس کا اجمالاً یہاں ذکر کرتا ہوں۔

بنگال سے نجے دیو کا کلام گرنتھ صاحب میں شامل کیا گیا۔ ملتان سے بابا فرید کا کلام گرنتھ میں شامل ہوا۔ مہاراشٹر سے نام دیو، ترلوچن اور پرمانند، یوپی (موجودہ اتر پردیش) سے بیسی، راماند سائیں، بھگت کبیر، روی داس اور بھیکن، راجستھان سے دھنا اور دادھ سے سورداس وغیرہ کے کلام کو گرنتھ صاحب میں شامل کیا گیا (یہاں میں نے کلام کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے۔)

گرو یا گرنتھ صاحب میں ۳۶۔ ایسے بزرگوں کا کلام بھی شامل ہے جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے اور مختلف اقوام اور ذاتوں سے منسلک ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ سکھ مذہب وسیع المشربی میں یقین رکھتا ہے اور گرنتھ صاحب دراصل ایک خزانہ ہے جس میں برصغیر کے تمام فرقوں اور مذاہب کے نادر و حسین افکار اور تہذیبی عناصر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

بعض محققوں اور مذہبی عالموں نے اس سلسلے میں کچھ اور تشریحات بھی کی ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بابا نانک ایک موحد تھے۔

اور وہ وحدانیت کا پیغام لے کر آئے۔ ہندو مت دیوی دیوتاؤں، اصنام پرستی اور ذات پات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ بابا نانک نے توحید کے حوالے سے انسانیت کو سچی راہ دکھائی بعد میں آنے والے گوروؤں نے اس کو باقاعدہ ایک مذہب کی صورت دی۔ یہ ان کی وسیع المشربی کہیے یا سیاسی ضرورت کہ انہوں نے اپنے مذہب کی طرف دوسروں کو راغب کرنے کے لیے دوسرے مذاہب اور بزرگوں کے کلام کو بھی گرنتھ صاحب میں شامل کر لیا۔ اور اس کے بعد سکھوں نے ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے جنگیں لڑیں خواہ ان کی نوعیت سیاسی تھی یا مذہبی۔ ان کی بنا پر وہ مزید منظم ہوئے اور آج ایک "مارشل ریس" بن چکے ہیں۔

گرنتھ صاحب کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سکھ مذہب نے پنجاب میں جنم لیا۔ گورو بابا نانک اور سکھ مذہب کے حوالے سے بیشتر مقدس مقامات اور زیارتیں پاکستان میں ہیں۔ امرتسر میں سکھوں کا سب سے بڑا گوردوارہ ہے اور اس کی بنیاد حضرت میاں میر صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے رکھوائی تھی۔

سکھوں نے برصغیر کی تقسیم اور ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جو کردار ادا کیا، وہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ پچھلے چند برسوں سے گرنتھ صاحب کو ساری دنیا میں بطور خاص متعارف کرایا گیا ہے۔ سکھوں نے اپنے آپ کو شناخت اور دریافت کیا ہے اور اپنے تشخص کو بحال اور قائم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور گرنتھ صاحب کی تعلیمات عام ہو رہی ہیں۔

ہومر

ایلیڈ

"ایلیڈ" اور "اوڈیسی" دنیائے ادب کے دو قدیم ترین رزمیے ہومر کے نام منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہومر کون تھا؟

اس کے بارے میں حتمی طور پر کہیں معلومات نہیں ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہومر کا زمانہ ۷۵۰ برس ق۔م ہے۔ موجودہ عہد کے ایک محقق نے اسے دس صدی ق۔م کا زمانہ قرار دیا ہے۔

ہومر نے کتنی عمر پائی۔ وہ کہاں کہاں رہا، ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ قدیم یونان کے پانچ قدیم شہر یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہومر ان شہروں میں پیدا ہوا تھا۔

ہومر کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اندھا تھا۔

ہومر ایک رومانی اور داستانی کردار لگتا ہے۔ پورے وثوق سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایلیڈ اور اوڈیسی کا خالق ہومر ہی تھا۔ ایک عرصے تک تو یہ بھی بحث چلتی رہی کہ کیا رزمیہ شاعری کے ان عظیم لافانی شہپاروں کو کسی ایک شاعر نے لکھا تھا یا دو نے یا زیادہ نے۔ پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہومر نے پہلے ایلیڈ لکھی تھی یا اوڈیسی۔

ان تمام پراسرار باتوں کے باوجود۔ ایلیڈ اور اوڈیسی دنیائے ادب کے دو لافانی شاہکار ہیں۔ صدیوں سے پوری دنیا میں انھیں پڑھا جا رہا ہے۔ متعدد بار ان کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ایلیڈ۔ اوڈیسی اور ہومر۔ ساری دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ان دونوں رزمیہ شہپاروں میں سے زیادہ کون رزمیہ پڑھا جاتا ہے اس کے بارے میں

بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا ۔ تاہم 'ایلیڈ' کو بعض پہلوؤں سے 'اوڈیسی' پر فوقیت حاصل ہے ۔ 'ایلیڈ' میرے نزدیک ایک ٹریجڈی ہے اور 'اوڈیسی' ایک طربیہ'

دونوں کے تقابلی مطالعے سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ 'ایلیڈ' میں متاثر کرنے کی صلاحیت 'اوڈیسی' سے کہیں زیادہ ہے۔

اردو زبان اس اعتبار سے بدقسمت ہے کہ ایلیڈ کا اس میں ترجمہ نہیں ہوا ۔ البتہ اوڈیسی کا ایک بہت اچھا، بہت خوب صورت، بہت سُچا ترجمہ، جہاں گرد کی واپسی کے نام سے محمد سلیم الرحمٰن نے کیا ہے اور یہ ترجمہ ان کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے ۔ !

سکندر اعظم کے بارے میں یہ شہادت بڑے وثوق سے ملتی ہے کہ وہ ایلیڈ کے ایک پرانے قلمی نسخے کو اپنی اوائل عمری سے ہی بڑا عزیز رکھتا تھا ۔ وہ اسے اپنی سب سے قیمتی متاع سمجھتا تھا ۔ ایران کی فتح کے بعد کسی نے اس کی خدمت میں لوٹ مار میں ہاتھ لگنے والا ایک بے حد قیمتی اور خوب صورت ڈبہ پیش کیا جو ہنر مندی کا شاہکار تھا ۔ سکندر اعظم نے کہا ایسے خوب صورت، بے مثل ڈبے میں کیا رکھوں گا ' یہ میرے کس کام آئے گا، پھر خود ہی بولا ، " ہاں میرے پاس ایلیڈ کا نسخہ ہے اسی کو اس میں رکھتا ہوں کہ وہی ایک ایسی چیز میرے پاس ہے جو اس ڈبے میں رکھی جا سکتی ہے ۔"

صدیوں سے ان گنت انسانوں نے " ایلیڈ " کو عزیز جان بنائے رکھا ۔ اسے محبت اور عقیدت سے پڑھا ہے ۔ صدیوں سے انسان اس کو پڑھتے اور پسند کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ حالانکہ یہ مذہبی کتابیں نہیں ۔ اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قبل مسیح کے زمانے کے یونانی ہومر کو اپنی " دینیات " کا خالق سمجھتے تھے کہ اس نے اولمپس پر رہنے والے خداؤں اور دیوتاؤں کے بارے میں ان کو بتایا اور دیوتاؤں کو زمین پر لے آیا ۔

" ایلیڈ " ایک ڈرامائی کہانی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار ایکلیز ہے ۔ ایکلیز جو سورما ہے اور انسان بھی اور دیوی دیوتاؤں کی اولاد بھی ۔

ایک محقق نے ایلیڈ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایلیڈ میں جو کہانی سنائی گئی ہے وہ چالیس پچاس دنوں کے واقعات کے حوالے سے ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کیا کچھ ہو چکا ہے اور کیا

کچھ ہونے والا ہے۔

ایلیڈ کا آغاز ایکلیز کی ناراضنی اور اس کے اس شدید ردِ عمل سے ہوتا ہے کہ وہ جنگ میں حصہ لینے پر انکار کر کے اپنے خیمے میں ہتھیار کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس کہانی کا ایک پس منظر ہے۔

متحدہ یونانی افواج کے کمانڈر اور شاہ اگممان کے بھائی مینیلیوس کی بیوی ہیلن کو ایلیم کے شہنشاہ پرائم کا بیٹا پیرس اغوا کر لیتا ہے۔ ایلیڈ میں ہمیں ہیلن کی زبانی بتایا جاتا ہے کہ وہ انیس برس تک پیرس کی جائز بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہی ان ۱۹ برسوں میں دس برس کا طویل عرصہ وہ ہے جو جنگ کا ہے۔

ہیلن کی واپسی کے لیے شہنشاہ ایگممان یونانی تاجداروں اور سرداروں کی فوج جمع کرتا ہے اور ایلیم پر لشکر کشی کرتا ہے شہنشاہ اگممان اور اس کے حلیف ایکیین کہلاتے ہیں۔ اور اہل ٹرائے، رڑوجن ایکی سن کا پلہ اس طویل جنگ میں بھاری رہتا ہے وہ ایلیم کے بہت بڑے علاقے کو فتح کر چکے ہیں۔ کئی قصبوں، شہروں اور بستیوں کو تاراج کر چکے ہیں۔ ایلیم کا محاصرہ ہو چکا ہے۔ ایکیین کو جو برتری حاصل ہے اس کا اعزاز ایکلیز کی بے مثل شجاعت کے سر بندھتا ہے اور یہی ایکلیز اس لیے ناراض ہو جاتا ہے کہ اس کی ایک کنیز کو اس سے زبردستی واپس لے لیا جاتا ہے۔

یہ لونڈی دراصل اپالو دیوتا کے ایک پجاری کی بیٹی ہے جو شاہ اگممان سے اس کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ بددعا بھی دیتا ہے۔ اپالو دیوتا کو خوش کرنے اور تباہی سے بچنے کے لیے اگممان ایکلیز کو ناراض کر کے پجاری کی بیٹی جو اس کی لونڈی بن چکی ہے اس کے باپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایکلیز ناراض ہو کر جنگ سے دست کش ہو جاتا ہے۔ اب اہل ٹرائے کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ ایکیین فوجوں کو بھاری نقصان پہنچنے لگتا ہے۔ ایکلیز ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیمے میں جا پڑا ہے اور جنگ میں حصہ لینے سے انکاری ہے۔

ایکلیز کا بہادر دوست اور ساتھی پیٹروکلس اس صورت حال میں ایکلیز کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اب ضد کو چھوڑ دے۔ لیکن ایکلیز کا غصہ بدستور قائم ہے۔ وہ پیٹروکلس کو جنگ میں حصہ

لینے سے نہیں روکتا۔ بلکہ اسے خود تیار کر کے بھیجتا ہے۔ پیٹروکلس شجاعت کے جوش میں لڑتا ہوا دشمن کی فوجوں میں دور تک گھس جاتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس کی موت ایکلیز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ وہ غیض و غضب اور انتقام کا پیکر بن جاتا ہے۔ ایکلیز کو یقین ہے کہ وہ فتح حاصل کرے گا۔ اہل ٹرائے کو تباہ کر دے گا۔ اور پھر فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹ جائے گا لیکن اس کا مقدر ایسا نہیں ہے۔

پیٹروکلس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ایکلیز پھر سے میدان جنگ کا رُخ کرتا ہے۔ ایک بار پھر اکیین کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے۔ ٹروجن کو بھاری نقصان پہنچتا ہے۔

ٹرائے کا بادشاہ پرام بہت بوڑھا ہے۔ اس کا بیٹا اور پیرس کا بھائی ہیکٹر فوجوں کا سپہ سالار ہے۔ وہ ایک بہادر ہے۔ صحیح معنوں میں سورما، شریف النفس، ایکلیز اور ہیکٹر دونوں سورما ہیں۔ لیکن دونوں کے کردار اور مزاج میں ایک نمایاں تضاد ہے۔ ایکلیز اور ہیکٹر مقابلے میں ہیکٹر کے لیے موت کے سوا کچھ نہیں۔

انتقام، جوش اور غیض و غضب میں اندھا ہو کر ایکلیز ایک ایسی مذموم حرکت کرتا ہے۔ جسے یونان کے رسم و رواج کی صریح خلاف ورزی اور توہین قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ہیکٹر کی لاش کی تذلیل کرتا ہے۔ اس کے مردہ جسم کو میدان جنگ اور ایلیم کی فصیلوں کے قریب رگیدتا اور روندتا پھرتا ہے۔

یونانی اپنے مردوں کے بارے میں بہت ذکی الحس، واقع ہوئے تھے۔ ہمارے زمانے کے رسم و رواج سے کہیں زیادہ ہی اپنے مردوں کا احترام کرتے تھے۔ سفوکلیز کے ڈرامے "انٹی گونی" کا بھی یہی موضوع ہے۔ انٹی گونی بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بے سہارا اور بے گور و کفن بھائی کی لاش کو دفنا کر۔ المیہ کا عظیم کردار بن جاتی ہے۔

ایکلیز اپنے دشمن ہیکٹر کی لاش واپس کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

بڈھا بادشاہ پرام دل شکستہ ہے۔ وہ خود ایکلیز کے پاس جاتا ہے اور اپنے بیٹے کی لاش واپس کرنے کے لیے درخواست کرتا ہے۔ کچھ تکبر اور ہچکچاہٹ کے بعد ایکلیز لاش واپس کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ہیکٹر کی لاش کی تدفین کی رسومات پر " ایلیڈ " کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔!

کیا یونان کی تاریخ میں ایسی لڑائی لڑی گئی تھی ۔ کیا ٹرائے کو تاخت و تاراج کیا گیا تھا کیا وہ کردار جو " ایلیڈ " میں سامنے آتے ہیں ، حقیقی ہیں ؟ ہومر نے تاریخ کو بیان کیا ہے یا کسی سنی سنائی کہانی کو بیان کر دیا ہے ؟

صدیوں سے " ایلیڈ " اور ہومر پر بہت کام ہوا ہے ۔ سکالروں ، عالموں ، مورخوں محققوں اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے بہت مغز پچی کی ہے ۔ ان عالموں میں لائنز ، پروفیسر ویبسٹر اور مائیکل وینٹرس کو خاص شہرت اور مقام حاصل ہے ۔ ان لوگوں نے ہومر اور " ایلیڈ " کے دور کو کھوجنے کی سعی کی ہے ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا ۔ آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ٹرائے کبھی موجود تھا ۔ لیکن وہ ایک بار کی بجائے تین بار فوجی یلغار کا شکار بن کر تاخت و تاراج ہوا ۔

یہ یقینی بات ہے کہ یہ واقعہ ہومر کے عہد سے بہت پہلے رونما ہو چکا تھا اور یقینی طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہومر سے پہلے کے شاعر اور عوامی مغنی اور لوک فنکاروں نے اسے نہ صرف نظم کیا بلکہ اسے لوگوں کو سناتے بھی پھرتے تھے ۔ خود ہومر بھی ایک ایسا ہی مغنی تھا ، جو عوام کو " ایلیڈ " سنایا کرتا تھا ۔

" ایلیڈ " کے حوالے سے جو ذخیرہ الفاظ سامنے آتا ہے ۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت یعنی ہومر تک یونانی زبان بہت وسیع ہو چکی تھی اور ہومر نے اپنے پیشروؤں کی کاوشوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا ۔

ایک مثال کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہیر رانجھا کے قصہ کو سب سے خوب صورت انداز اور بھرپور شعری اسلوب میں وارث شاہ نے لکھا ۔ اسی طرح ہومر نے " ایلیڈ " کو شاعری کا روپ دیا ۔ جبکہ وارث شاہ سے پہلے بھی ہیر رانجھا کا قصہ لکھا جا چکا تھا ۔ اور ہومر سے پہلے بھی ایلیڈ کا قصہ رقم ہو چکا تھا ۔

ہومر کی عظیم فطانت اور تخلیقی عظمت یہ ہے کہ وہ خود کردار تخلیق کرتا ہے ۔ ان کو اپنے انداز سے سراپا اور شخصیت بخشتا ہے ۔ ہومر کے ایک مترجم E. V. RIEU نے اسے " حقیقت

نگار" قرار دیا ہے۔ ہومر اپنے سامنے کے دیکھے بھالے انسانوں کو اپنا ماڈل بنا کر ان سے اپنے سورما تراشتا ہے۔ وہ ایک بڑا شاعر ہے۔ اس کی قوت متخیلہ اور شعری اظہار کا جواب نہیں۔ وہ خوب صورت انداز میں گلابی انگلیوں والی صبحوں اور تاریک شاموں کا بیان کرتا ہے۔ وہ اتنا قادر الکلام ہے۔ اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ ہم ایلیڈ میں ایک گھوڑے کی موت کا واقعہ پڑھ کر اداس ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو یکساں سطح پر رکھتا ہے۔ اس کا ہر سورما، بہادر شریف اور یکتا ہے۔ وہ جن عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ سب خوب صورت ہیں۔ انہیں لباس پہننے اور بال سنوارنے کا خاص سلیقہ ہے۔

ہومر کی "ایلیڈ" ایک خاص واقعہ خاص عہد کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے کردار آج کی دنیا میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن کیا حقیقت میں ایسا ہے۔

"ایلیڈ" اور ہومر کی عظمت یہ ہے کہ اس کے تراشے ہوئے کردار۔ آفاقی ہیں۔ وہ انسان ہیں اور انسانوں کے دائمی ازلی، فطری جذبات واحساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسے ناموں ایسے لباسوں ایسے قد کاٹھ کے ایسے کارنامے انجام دینے والے لوگ آج نہیں ملتے لیکن اس طرح محسوس کرنے والے، جذبات رکھنے والے، ردّعمل ظاہر کرنے والے انسان آج بھی موجود ہیں۔ یہ کردار آفاقی سچائیوں کے امین ہیں۔ ان میں انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ ہنستے بھی ہیں روتے ہیں، روٹھ جاتے ہیں، غیض وغضب کا شکار ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ وہ سب اپنی تقدیر سے ناواقف ہیں۔

یہ ایک عجیب داستان ہے۔ ایک ایسی لڑائی کا طویل قصہ ہے جو ایک خوب صورت ترین چہرہ رکھنے والی عورت کی بازیابی کے لیے لڑی گئی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے کہ ہومر جنگ کا پرستار نہیں وہ اگر جنگ سے نفرت کرتا ہوا نہیں ملتا تو بھی جنگ اسے پسند نہیں۔ جنگ تو ایک وسیلہ اور حوالہ ہے۔ جس کے ذریعے وہ بتاتا ہے کہ کیسے کیسے انسان کس طرح اپنی ذات اور شخصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ انسان کی نفسیات کو بیان کرتا ہے۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان بہت طاقتور ہونے کے باوجود کتنا حقیر اور کمزور ہے اور یہی حقیر اور کمزور انسان دراصل دیوتاؤں سے بھی برتر ہے۔

"ایلیڈ" کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ یونانی، دیومالا کو منضبط صورت میں پیش کرتی ہے

قدیم یونانی ایک اعتبار سے اسے اپنی "دینی" کتاب بھی سمجھتے تھے۔ اولمپس پر رہنے والے خداؤں اور دیوتاؤں کی دنیا کو ہومر نے پیش کیا ہے بلکہ RIEU - U - E کے الفاظ ہیں۔ تو ہومر ایسا خلاق ہے اس کی ایسی شاندار قوتِ متخیلہ ہے کہ اولمپس کی بلندیوں پر رہنے والے دیوتاؤں اور خداؤں کو وہ زمین پر لے آیا ہے۔!

ایک زیرک اور ذہین قاری کے لیے "ایلیڈ" کے یہ دیوتا اور خدا۔ خاص کشش رکھتے ہیں جب ہومر ان دیوتاؤں کی دنیا میں ہمیں لے جاتا ہے جب وہ ان کے اعمال اور واقعات کو بیان کرتا ہے۔ تو اس وقت اس کا اندازِ بیان تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دیوتاؤں کو مضحکہ خیز انداز میں بیان کرتا ہے۔ انہیں مقدس سمجھنے کے باوجود وہ ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کرتا ہے ایک پرلطف انداز میں وہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہ دیوتا بھی انسانوں کی طرح ہے۔ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ جلتے ہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا میں پرلطف مضحکہ خیز اور پرمذاق واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود مضحک ہیں۔ ہومر کا مزاج اس کی خاص خوبی ہے اور اس کا مزاج، اس وقت چوکھا ہو جاتا ہے جب وہ دیوتاؤں کا ذکر کرتا ہے۔

"ایلیڈ" کا وہ حصہ تو ذرا پڑھ کر دیکھیے۔ جہاں وہ ایک لنگڑے دیوتا کا ذکر کرتا ہے۔ یا جہاں وہ دیوتاؤں کے خاندان کی کانفرنس کا احوال بیان کرتا ہے تب یہ لوگ کتنے پرلطف، مضحکہ خیز اور دلچسپ بن جاتے ہیں۔

"ایلیڈ" فکشن اور تاریخ کا امتزاج ہے۔

ایلیڈ کو کئی امور میں اولیت حاصل ہے۔ محققوں اور عالموں نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ فنِ تنقید کا پہلا اور جامع نمونہ۔ "ایلیڈ" کا ایک ٹکڑا ہے جو جدید تنقید کے معیار پر اترتا ہے جو تنقید کے اصولوں کو پہلی بار واضح کرتا ہے۔ یہ وہ ٹکڑا ہے جہاں ہومر ایک ڈھال کا ذکر کرتا ہے۔

افلاطون نے اپنی "ریاست" سے شاعروں کو خارج کر دیا تھا لیکن ہومر کو وہ اپنی ریاست سے نکالنے پر قادر نہیں۔ بلکہ وہ ہومر کو مثالی شاعر بتاتا ہے۔ دوسروں کو اس کی تقلید پہ مجبور کرتا ہے

میں نہیں جانتا، اپنی اصل زبان میں اس کتاب کی زبان کی تاثیر کیا ہے لیکن اس کے مختلف تراجم کا مطالعہ کرنے سے ہی میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ جس کا ترجمہ اتنا پُر اثر ہے وہ اصل زبان میں کتنی بے مثل شاعری ہوگی۔

"ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کسی ہومر نام کے اندھے مغنی اور شاعر نے لکھی تھیں یا نہیں لیکن آج وہ ہومر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ عظیم رزمیے اس کی تخلیق قرار دیئے جاتے اور اس کے ساتھ منسوب ہیں۔

صدیوں سے اس کتاب کو ان گنت انسانوں نے پڑھا اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ "ایلیڈ" بلاشک شبہ دنیا کی عظیم اور بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔

کلیلہ دمنہ

ملک الشعرا بہار نے لکھا ہے۔

"دنیائے ادب میں کوئی کتاب ایسی نہیں کہ اتنی مدت تک مقبول اور محبوب و مرغوب رہی ہو۔ اور جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ رہتی دنیا تک اس کی ہر دل عزیزی کا یہی عالم رہے گا۔ کسی قوم کی تخصیص نہیں، کسی زمانے کی قید نہیں کسی عہد کی شرط نہیں۔ ہر جگہ ہر وقت مختلف معاشرتی اداروں میں اور ثقافتی مرکزوں میں یہ تالیف دلپذیر اور مقبول رہی ہے بادشاہوں نے اسے سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ رات کو خوش رو اور خوش گلا غلاموں اور کنیزوں نے اس کی کہانیاں سنی ہیں۔ امراء نے حل مشکلات میں اس کو پیش نظر رکھا اور عام لوگوں نے اسے دستور حیات سمجھا ہے۔ صوفیوں نے اور نجات کے طالبوں نے اس کے مندرجات میں عالمگیر صداقتوں کی جھلک دیکھی ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کا مؤلف یا مؤلفین علم حیات اور علم نفس کے ماہر تھے۔ زندگی کے تجربات سے بہرہ یاب تھے۔ زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ تھے۔ مردم شناس تھے۔ اور مشکلات میں پریشان نہیں ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ تالیف ہندوستان کی فکری اور ذہنی تاریخ کا نقطۂ عروج ہے۔ وہاں کے دانشوروں اور مفکروں کے تجربات کا ماحصل ہے۔"

یقیناً یہ اقتباس پڑھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ وہ کون سی ایسی کتاب ہے جو ہر زمانے پر حاوی رہی ہے۔ اور جسے آنے والی نسلیں بھی ہمیشہ پڑھتی رہیں گی۔ ملک الشعرا بہار نے یہ کلماتِ تحسین جس کتاب کے لیے لکھے۔ وہ کتاب ہے۔

کلیلہ دمنہ :-

کلیلہ دمنہ کا شمار دنیا کے عظیم کلاسیک میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کبھی دو رائیں پیش نہیں ہوئیں۔ اس کی مقبولیت افادیت اور تخلیقی صداقت کا ہمیشہ ہر دور معترف رہا ہے۔

"کلیلہ دمنہ" میں جانوروں کی زبان سے معاشرتی آداب، تدبیر و تقدیر اور آئین جہانداری کے اصول داستانوں کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ "کلیلہ دمنہ" دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہر زمانے میں ادب کے ہر شعبے اور ادبی تحریکوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ داستان در داستان کی تکنیک سے دنیائے ادب پہلی بار اس کتاب کے حوالے سے متعارف ہوئی ہے۔ اور "الف لیلیٰ" اور "ہزار داستان" پر اس کے اثرات صاف اور واضح دکھائی دیتے ہیں۔

"کتھا سرت ساگر" جیسا افسانوی مجموعہ بھی "کلیلہ دمنہ" کا ہی مرہون منت ہے۔ پھر اپنے اثرات کے اعتبار سے "کلیلہ دمنہ" اتنی ہی ہمہ گیر کتاب ہے کہ اس کے واضح اثرات نظام الملک کے سیاست نامہ سے لے کر "قابوس نامہ" "چہار مقالہ" "گلستان" "بہارستان" اور "خارستان" پر صاف نظر آتے ہیں۔

فرانسیسی زبان میں جو مصنف FABLES کے نام سے مشہور و منفرد ہے۔ اس پر "کلیلہ دمنہ" کے اثرات کا فرانسیسی محققوں اور عالموں نے خود اعتراف کیا ہے۔ انگریزی ادب کی کئی ایسی کتابیں ہیں جن پر اس کے اثرات بے حد واضح ہیں۔

"کلیلہ دمنہ" ایک ایسی عالمی کلاسیک ہے جس کے ماخذ، مطالب، تکنیک اور اسلوب نگارش پر ساری دنیا کے اہم محققوں اور ادیبوں نے بحث کی ہے۔ عالمی سطح پر جتنی اہمیت اس کتاب کو حاصل رہی ہے۔ شاید ہی کسی کتاب کو حاصل رہی ہو۔ "کلیلہ دمنہ" کے بارے میں برسہا برس کی تحقیق کے بعد جو امور سامنے آئے ہیں ان کی تفصیل یوں بنتی ہے۔!

کلیلہ دمنہ۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی۔

نوشیروان ساسانی کے حکم پر حکیم برزیہ کو اس کا نسخہ حاصل کرنے کے لیے بطور خاص ہندوستان بھیجا گیا۔

ایک روایت کے مطابق نوشیروان کے وزیر بزرجمہر نے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا۔ پہلوی زبان سے ابن المقفع نے اسے عربی میں منتقل کیا۔ ساسانیوں ہی کے عہد میں اس کا ایک اور نثری ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا۔ اس کے بعد رودکی نے اسے تلخیص اور قطع و برید کے بعد منظوم ترجمے کی صورت دی۔

اس کے بعد نصر اللہ مستوفی نے 'کلیلہ دمنہ' کے نام سے جتنے نسخے موجود تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر اس کا ایک فارسی نسخہ تدوین و مرتب کیا۔ نصر اللہ مستوفی نے اسے زبان پہلوی کے بجائے عام طور پر رائج جدید فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔

حسین واعظ کاشفی نے 'کلیلہ دمنہ' نصر اللہ کو بنیاد بنا کر اس میں پر شکوہ اور پر تکلف اضافے کیے اور نام اس کا "انوار سہیلی" رکھا۔ یہی کتاب "انوار سہیلی" سنسکرت 'کلیلہ دمنہ' کی معروف ترین شکل ہے۔

اکبر اعظم کے عہد میں کلیلہ دمنہ کے جو نسخے دستیاب ہو سکتے تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر ابوالفضل نے ان کو سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا۔ اس کی ترتیب نو کا فریضہ انجام دیا اور نام اس کا "عیار دانش" رکھا۔

'کلیلہ دمنہ' کی اس شکل یعنی "عیار دانش" کا ترجمہ حفیظ الدین احمد نے 'خرد افروز' کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

گویا نے 'انوار سہیلی' کا ترجمہ 'بستان حکمت' کے نام سے کیا۔ دکھنی میں بھی اس کے کئی تراجم ہوئے۔

اصل کتاب 'کلیلہ دمنہ' ہے۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس نے کئی دوسرے چراغوں کو روشن کیا۔ 'کلیلہ دمنہ' کو مختلف ادوار میں مختلف زبانوں میں مختلف ادیبوں اور مترجموں نے اپنے انداز میں پیش کیا۔ جس میں "انوار سہیلی" کو بطور خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اصل کتاب تو کلیلہ دمنہ ہے جو کتاب کے دو کرداروں کا مرکب ہے یعنی کلیلہ اور دمنہ۔

کلیلہ دمنہ۔ ہندوستان میں اس زمانے میں لکھی گئی جو ہندوستان کے زرعی نظام کا سنہری دور ہے۔ دن کو تھوڑی بہت محنت کرنے کے بعد، زرخیز زمینوں اور لہلہاتے کھیتوں کے مالک کسان شام کو محفل جماتے اور گپ شپ لگاتے اور یوں داستانوں اور قصوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

'کلیلہ دمنہ' کی کہانیاں ازلی اور ابدی ہیں۔ اسی لیے محققوں کو ان کا ماخذ تلاش کرنے میں ہمیشہ دقت محسوس ہوتی ہے۔ اصل میں ان کہانیوں کی جڑیں کسی ایک شخص کے ذہن اور دماغ میں نہیں، بلکہ قدیم ہندوستان کی معاشرت میں پیوست ہیں۔

"البرامکہ" کے خالق عبدالرزاق طوسی کا بیان ہے کہ کلیلہ دمنہ بیدپا پنڈت کی تصنیف و تالیف ہے۔ جو اس نے راجہ رائے دابشلیم کے لیے لکھی تھی۔ رائے دابشلیم۔ گجرات کے چاوڑہ خاندان کا بادشاہ تھا۔ ہندوستانی تاریخ کے مورخ بتاتے ہیں کہ یہ خاندان محمود غزنوی کے حملوں تک سریر آرائے تخت تھا۔

ابوریحان بیرونی 'کلیلہ دمنہ کا ماخذ 'پنچ تنتر' کو قرار دیتا ہے۔

ایک خاص تحقیق تو یہ ہے کہ یونان کو چھوڑ کر تمام دنیا کی زبانوں میں حکایات کے جو مجموعے مقبول و معروف ہیں ان سب کا ماخذ' جاتک' ہے یعنی وہ ۵۵۰ کہانیاں جو مہاتما بدھ کی پیدائش کے حوالے سے معرض وجود میں آئیں۔

پروفیسر لی بان (تمدن ہند۔ مترجم سید علی بلگرامی) بھی بیرونی کی تائید کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:-

"کلیلہ دمنہ" کا ماخذ "پنچ تنتر" نامی کتاب ہے جو حکایات و امثال کا مجموعہ ہے۔"

پروفیسر لی بان حکایاتِ لقمان کا ماخذ اسی کتاب کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر کرسٹین سین نے بھی "کلیلہ دمنہ" کو پنچ تنتر سے ماخوذ قرار دیا ہے۔

"اس کی پہلوی صورت "کلیگ ودمنگ" ہے۔ جس کا مترجم حکیم برزویہ ہے۔ فلپ کے حتی نے "تاریخ عرب" میں لکھا ہے۔

"ہم تک عربی کی جو قدیم ترین ادبی کتب پہنچی ہے۔ وہ کلیلہ دمنہ (حکایات بیدپا)

ہے۔ یہ کتاب اصلاً سنسکرت میں تھی۔ پھر پہلوی میں ترجمہ کیا گیا اور عربی ترجمہ اس پہلوی ترجمے سے کیا گیا۔ خسرو نوشیروان کے عہد حکومت میں ۵۳۱ ۔ ۵۷۸ء جہاں ہندوستان سے شطرنج آلی۔ وہاں اصل سنسکرت کتاب بھی آئی کلیلہ دمنہ کا عربی ایڈیشن اس لیے اہم ہو گیا کہ نہ تو پہلوی نسخہ ملتا ہے نہ اصل سنسکرت کتاب "پنچ تنتر" میں یہی مطالب اور معانی زیادہ مفصل صورت میں پائے جاتے ہیں۔ عربی سے ہی قریباً چالیس زبانوں میں اُس کتاب کا ترجمہ ہوا۔ یورپی زبانوں سے قطع نظر عبرانی، ترکی، حبشی اور ملایا کی زبان میں بھی تراجم ہوئے۔ آئس لینڈ میں بھی اس کا ترجمہ ملتا ہے۔ (صد ۳۰۸)

کلیلہ دمنہ۔ جو سنسکرت زبان میں تھی۔ اس کا پہلا پہلوی ترجمہ مفقود ہے۔ اس کا عربی ترجمہ جو ابن المقفع نے کیا۔ اس سے ساری دنیا نے فیض اٹھایا۔ سریانی میں کلیلہ دمنہ کا ترجمہ ۵۷۰ء میں ہوا۔ پھر گیارہویں صدی میں یونانی میں سے اسے ۱۰۸۰ء میں مترجم کیا گیا۔ نصر اللہ نے ۱۱۲۰ھ میں اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں اس کا عبرانی ترجمہ ہوا۔ لاطینی میں اسے منظوم مترجم کیا گیا۔ ہسپانوی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ۱۲۱۲ء میں لاطینی میں اس کا ایک نثری ترجمہ ہوا۔ اطالوی میں کلیلہ دمنہ کو ۱۵۸۲ء میں منتقل کیا گیا۔ جرمنی میں ۱۴۸۰ء، ڈچ زبان میں ۱۸۲۳ء اور فرانسیسی میں ۱۶۰۹ء میں اس کے تراجم ہوئے۔

اُردو میں کلیلہ دمنہ کے مختلف روپ پائے جاتے ہیں۔ بہادر علی حسینی نے اس کا ترجمہ انیسویں صدی کے اوائل میں "اخلاق ہندی" کے نام سے کیا۔ پھر شیخ حفیظ الدین احمد نے "خرد افروز" کے نام سے اس کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے ایما پر کیا۔ یہ ترجمہ موجود ہے۔

کلیلہ دمنہ کی کہانیاں انسانی تجربات کا نچوڑ ہیں۔ یہ ایک ایسا جہانِ طلسم ہے کہ جسے پڑھنے والا اس میں ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ جاتا ہے۔ کلیلہ دمنہ میں جانوروں کی زبان سے دانائی اور صداقت کی ایسی تعلیم دی گئی ہے کہ اس کی مثال پوری دنیائے ادب میں نہیں ملتی۔

کلیلہ دمنہ کی دو مختصر حکایات پیش خدمت ہیں۔!

حکایت نمبر ۱

ایک شخص سرمایہ دانش و تجربے کا نہ رکھتا تھا اور دعوئے طبابت کا کرتا تھا۔ شہر میں دکان لگائے بیٹھا تھا اور اس کی مردم کشی کا بازار گرم تھا۔ ایک طبیب دانا کہ جو دست شناسا رکھتا تھا اس کی حکمت و طبابت اس نقلی طبیب کے سامنے نہ چل سکی۔ دانا طبیب ایسے ابتر حالوں کو پہنچا کہ رفتہ رفتہ اندھا ہو گیا۔ جبکہ اس کا مد مقابل نقلی حکیم دولت میں کھیلتا اور اس کی شہرت میں ہر روز اضافہ ہوتا تھا۔

اس ملک کے بادشاہ کی ایک صاحبزادی تھی، نہایت حسین، شادی اس کی بادشاہ کے بھتیجے سے ہوئی تھی۔ وہ حاملہ ہوئی اور شدید درد میں مبتلا رہنے لگی۔ بادشاہ نے دانا طبیب کو بلا کر کہا کہ وہ شہزادی کا علاج کرے تاکہ اُسے درد سے چھٹکارا ملے۔ دانا طبیب نے تشخیص مرض کی اور کہا کہ علاج اس کا مہران سے ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ دوا کہاں ہے؟ کہاں سے ملے گی؟ دانا نابینا طبیب نے کہا کہ دوائی میں نے ایک بار بادشاہ کے ہی دوا خانے میں دیکھی تھی۔ نایاب و کمیاب ہے لیکن شاہی دواخانے میں موجود ہے۔ ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند ہے جس کو سونے کا تالا لگا ہے۔ اب مجھے آنکھوں سے تو سوجھتا نہیں اسلیے تلاش سے عاجز ہوں۔

بادشاہ کے درباریوں نے ذکر اس حکیم کا کیا جو نقلی تھا لیکن شہرت رکھتا تھا۔ بادشاہ کے حکم پر اس کو دربار میں لا کھڑا کیا۔ طبیب نقلی نے بادشاہ سے عرض کی کہ یہ نابینا حکیم کیا جانتا ہے۔ جس دوا کا ذکر اس نے کیا۔ یہ بھی مجھ سے سنا ہوا تھا۔ میں دراصل دوا کو پہچانتا اور اس کے استعمال کی ترکیب بھی جانتا ہوں۔ اس نقلی طبیب کو شاہی دواخانے بھجوا دیا گیا۔ بہت سر مارا مگر وہ چھوٹی سی ڈبیا نہ ملی کہ جس پر سونے کا تالا لگا ہوا تھا۔ اس سے ملتی جلتی ایک ڈبیا اٹھائی اور اس کا تالا کھول دیا۔ اس میں ایک شیشی تھی جس میں زہر تھا۔ شیشی کھول کر اس کے چند قطرے پانی میں ڈال کر شہزادی کو پلا دیے۔ ادہر وہ پانی شہزادی کی زبان سے چھوا اور وہ اسی لمحے مر گئی۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا تو حکم صادر کیا کہ باقی دوائی طبیب نادان کو پلا دیں پیتے ہی وہ بھی سرد ہو گیا اور سزا اپنی جہالت کی پائی . . .

دمنہ نے کہا میں نے یہ قصہ اس لیے بیان کیا تاکہ تم جان سکو کہ لوگ نادانی سے جو کام کرتے

ہیں نااہل کار اس کا یہ ہے کہ صرف گمان پر ہو اس میں خطرے بہت ہیں۔"

حکایت نمبر ۲

ایک مینڈک کسی سانپ کی بانبی کے پاس رہتا تھا۔ جب اس کے بچے ہوتے، سانپ کھا جاتا۔ مینڈک بے چارے کے دل پر اولاد کی موت کا گہرا زخم لگتا۔ مینڈک کی دوستی ایک کیکڑے سے ہو گئی۔ اس نے کیکڑے سے ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا "یار اس قوی دشمن سے جان چھوٹنی چاہیے۔ کوئی ترکیب بتا۔" کیکڑے نے کچھ دیر غور کیا۔ پھر بولا "فکر نہ کر۔ تیرا قوی دشمن فریب کے دام میں پھنس سکتا ہے۔ ایک جگہ ایک نیولا رہتا ہے لڑاکا، بہادر اور تندخو۔ تو ایسا کر کہ کچھ مچھلیاں پکڑ کر ان کو سانپ کی بانبی کے پاس لا کر رکھ دے۔ نیولا ان مچھلیوں کو ایک ایک کر کے کھاتا ہوا سانپ کی بانبی تک جا پہنچے گا اور پھر سانپ کو بھی کھا جائے گا۔ بس اسی فریب کے جال میں تو اپنے قوی دشمن کو پھانس سکتا ہے۔"

مینڈک نے اسی تدبیر پر عمل کیا۔ جب دو تین دن گزرے نیولے کو مچھلی کھانے کی چاٹ لگ گئی۔ جہاں کھانے کا مزہ ملا، وہاں پہنچ گیا۔ جب مچھلیاں نہ پائیں، مینڈک کو تمام بچوں سمیت کھا گیا۔"

"یہ قصہ اس لیے میں نے کہا کہ نااہل کار حیلہ سازوں کا انجام گرفتاری اور ہلاکت ہے۔"

کہانیاں

معلوم دنیا کی کوئی ایسی زبان اور خطہ نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی صورت میں ایسوپ کی حکائتیں نہ پہنچی ہوں۔ دنیا کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی زبان میں ان حکایتوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان حکایتوں نے دنیا بھر کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ اس سر چشمے سے کئی سوتے پھوٹے ہیں صدیوں پرانی ہونے کے باوجود یہ حکائتیں آج بھی تازہ، معنی خیز اور نئی ہیں۔ گہری معنویت اور بنیادی صداقت کی وجہ سے ان حکایتوں کی دل کشی ہر دور میں بڑھتی رہی۔ ان میں ایسی صلاحیت اور سکت موجود ہے کہ بدلے ہوئے زمانوں میں یہ حکائتیں نئے معنی سے روشناس کراتی ہیں جو اس دور کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ ان حکایتوں کے حوالے سے جو اخلاقی درس ہمیں دیا جاتا ہے بلاشبہ اس سے انسانی زندگیوں کو بہتر انداز میں بسر کرنے کے لیے رہنمائی ملتی ہے۔

انسانی تاریخ کا ایک دور وہ تھا جب انسان اور حیوان ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ جب پرندوں اور جانوروں کے ساتھ انسان کا بہت قریبی اور گہرا رشتہ تھا۔ دنیا کے ادب میں مختلف زبانوں میں ایسی حکایتوں کا ذخیرہ بہت فراواں ہے جن میں جانوروں، حیوانوں اور پرندوں کے حوالے سے کہانیاں بیان کر کے انسانی صورت حال تقدیر اور روزمرہ زندگی کے اطوار اور اخلاق کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ایسی روایتی کہانیوں کے بارے میں لکھنا، ایک ایسا موضوع ہے جو علیحدہ مضمون یا کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم معلوم انسانی ذرائع اور دیومالا کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے اس انداز کی تمام حکایات کا بنیادی سرچشمہ ایسوپ کی کہانیاں ہیں۔

یہ ایسوپ کون تھا؟ کہاں پیدا ہوا، کیسے زندگی بسر کی۔ اس نے کب یہ حکایات تخلیق کیں ایسے بنیادی سوالوں کے جواب میں دنیا کی مختلف کتابوں اور شخصیات کے حوالے سے مل جاتے جاتے ہیں مگر یقینی اور حتمی طور پر ایسوپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ وہ ایک دیو مالائی کردار بن گیا ہے۔ ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ جو لازوال حکایتیں منسوب کی گئی ہیں۔ ان کی طرح وہ خود بھی ایک حکایت بن چکا ہے بعض علماء اور محقق نے ایسوپ (AESOP) اور حضرت لقمانؑ کو ایک ہی شخصیت قرار دیا ہے۔ میں تمام تر مماثلت اور دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کوئی حتمی اور دو ٹوک رائے نہیں دے سکتا۔ حضرت لقمانؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ قرآن پاک میں ان کا ذکر آتا ہے ان کی حکمت اور دانائی ضرب المثل بن چکی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کئی حکایات منسوب ہیں اور مستند اور غیر مستند انداز میں ان کے حوالے سے کئی مجموعے بھی مختلف زبانوں شائع ہوئے ہیں۔ جن کے بارے میں دعوے کیا گیا ہے کہ یہ حضرت لقمانؑ کی حکایات ہیں۔

تاہم۔ ایسوپ اور حضرت لقمانؑ ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ اس کا کوئی یقینی اور حتمی ثبوت اور جواب نہیں ملتا۔

ایسوپ کا تعلق یونان سے بیان کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ علاقہ جسے ایشیائے کوچک کہا جاتا ہے۔ یونان کے قدیم اور قبل از مسیح دور کی بعض تحریروں میں حکایات کا سراغ ملتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہسیوڈ کی ایک حکایت ملتی ہے بعد میں یہ حکایت ایسوپ کے نام منسوب کر دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا خالق ہسیوڈ تھا جو ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھا۔

بعض محققوں نے ایک زمانے میں اپنی تحقیق کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ حکایات کی جنم بھومی یونان نہیں بلکہ قدیم ہندوستان ہے لیکن جدید تحقیق نے ایسے شواہد پیش کر دیے ہیں کہ جس سے یہ تحقیق غلط ثابت ہوئی ہے۔ قدیم ہندوستان میں پرانی حکایت کا سراغ چوتھی صدی ق۔م سے پہلے نہیں ملتا۔ جبکہ یونان میں حکایت کا سراغ ساتویں اور آٹھویں صدی میں پورے اسناد کے ساتھ مل چکا ہے۔ محققین اور علماء نے اس سلسلے میں

یہ فیصلہ بھی دیا ہے کہ یونانی حکایت کا براہِ راست اثر قدیم ہندوستانی حکایتوں پر واضح انداز میں ملتا ہے اور دنیا بھر میں اس ابتدائی انسانی اختراع اور تخلیق ۔ حکایت پر یونان کا ہی اثر ملتا ہے۔

بریان روب (BRIAN ROBB) نے لکھا ہے:

"جہاں تک حقائق کی روشنی میں دیکھا گیا ہے اس کے حوالے سے ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونانی تھے جنھوں نے حکایت کو تخلیق کیا۔"

اور حکایت ۔ جس نے پوری انسانیت کو متاثر کیا ۔ اسے ایسوپ کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔

اور یہ ایسوپ کون تھا؟

پانچویں صدی قبل مسیح میں ایسوپ یونان میں ایک جانا پہچانا نام تھا ۔ اسے ایک عظیم المرتبت مصنف کا درجہ دیا گیا تھا ۔ اس کی یہ عام شہرت تھی کہ وہ حکایات کا خالق ہے ۔ اس شہرت اور بعض دوسرے شواہد کے باوجود حتمی طور پر پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نام کا کوئی شخص موجود بھی تھا یا نہیں۔

یونانیوں کے مجموعی مزاج کو سامنے رکھا جائے تو "ایسوپ" کا معاملہ کچھ اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے ۔ یونانیوں کو جہاں حکایت سے دلچسپی تھی ۔ وہاں وہ ایسے فرضی انسانوں کو بھی تخلیق کرنے کا شوق رکھتے تھے جو بذاتِ خود ایک حکایت کا درجہ حاصل کر لیں۔

بہرحال ایسوپ کے وجود کے بارے میں پہلی گواہی ہیروڈوٹس سے ملتی ہے ۔ جسے تاریخ کا بابا آدم کہا جاتا ہے ۔ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں ایسوپ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی تفاصیل یوں ہے۔

ایسوپ چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں مصر کے فرعون رعمیس کے زمانے میں زندہ تھا اور اسے حکایات کے مصنف اور خالق کی شہرت حاصل تھی۔

- ۔ ایسوپ کا تعلق جزیرہ ساموس سے تھا۔
- ۔ ہیروڈوٹس بتاتا ہے کہ ایسوپ ساموس جزیرے کے ایک باسی آئیڈمن کا غلام تھا۔
- ۔ ہیروڈوٹس یہ بھی بتاتا ہے کہ ایسوپ کی موت ڈیلفی کے پجاریوں کے ہاتھوں ہوئی۔

ہیروڈوٹس کے حوالے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسوپ بہت مشہور تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہیروڈوٹس ایسوپ کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا وسط بتاتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ پانچویں صدی ق۔م کے آداخر میں لکھی گئی تھی۔

حضرت لقمانؑ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی کے غلام تھے۔ ایسوپ کے ساتھ بھی یہ منسوب ہے کہ وہ غلام تھا مگر ایسوپ کے غلام ہونے کے بارے میں پورے شواہد نہیں ملتے ہیں۔ نہ ہی ہیروڈوٹس یا بعد کا کوئی مؤرخ یا عالم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایسوپ کن وجوہات کی بنا پر غلام تھا۔ بہر حال ایسوپ ہو یا حضرت لقمانؑ ان کے بارے ساری دنیا میں "بہ یقین" کر لیا گیا ہے کہ وہ غلام تھے۔ ایک دوسری صفت جس کو شہرت حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ ایسوپ بدصورت انسان تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس کے خدوخال بڑے مضحکہ خیز تھے۔ حضرت لقمانؑ کے بارے میں بھی بعض ایسی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔

ہیروڈوٹس کے بعد۔ یونان کے بعض عالمگیر شہرت رکھنے والے ڈرامہ نگاروں، فلسفیوں اور عالموں کے ہاں ایسوپ کا حوالہ ملتا ہے۔ ان میں ارسٹوفینز، زینو، افلاطون اور ارسٹوفینز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ایسوپ کی حکایات اور ان سے وابستہ دانائی اور حکمت کی تعریف کرتے ہیں۔

ارسٹوفینز نے ایسوپ کی موت کے بارے میں لکھا ہے کہ ایسوپ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے ڈیلفی کے مقدس مندر سے ایک پیالہ چرایا تھا جس کی سزا اسے یوں ملی کہ ڈیلفی کے پجاریوں اور لوگوں نے اسے ہلاک کر دیا۔

پلوٹارک نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ ڈیلفی کے مندر کے پجاری اور لوگ اس کی حکایات کو بعض پہلوؤں کو اپنے لیے اہانت اور طنز کا باعث سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسوپ کو مار ڈالا۔ ارسٹوفینز کے ایک شارح نے لکھا ہے کہ اصل وجہ یہ تھی کہ ڈیلفی کے لوگ اس کی حکایات کو اپنے لیے اہانت اور حقارت کا سبب قرار دیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسوپ کے سامان میں خود ہی مندر کا ایک قیمتی پیالہ چھپا کر ایسوپ پر چوری کا الزام لگا دیا۔

اصل واقعہ خواہ کچھ ہو، ایسوپ کی زندگی کے واقعات میں یہ بات بھی شامل کر لی گئی کہ اس کی موت بے انصافی اور ظلم کے نتیجے میں واقع ہوئی۔

پانچویں صدی ق۔م میں ایسوپ کی حکایتیں اور ایسوپ کا نام یونان کے مختلف علاقوں بالخصوص ایتھنز میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ پانچویں صدی ق۔م کے بعد اس کا ذکر کئی حوالوں سے سامنے آتا ہے اور اس کے نام سے منسوب حکایات بھی تیزی سے پورے یونان میں گردش کرنے لگی تھیں۔ ارسٹوفینز، زینو، افلاطون اور ارسطو اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ایسوپ نے اپنی حکایتیں خود قلم بند کی تھیں یا اس کے بعد کسی اور نے ان کو مرتب کیا تھا۔ بہر حال اس وقت یعنی پانچویں صدی ق۔م میں ایسوپ کی حکایتوں کے کئی قلمی نسخے موجود تھے۔

ایسوپ اور اس کی حکایات کو اس کے بعد اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ رواج چل نکلا کہ ہر حکایت کو اسی نام سے منسوب کر دیا جاتا۔ حالانکہ بعض ایسی حکایات کا واضح طور پر سراغ ملتا ہے جو ایسوپ کے زمانے سے بہت پہلے کہی اور لکھی گئی تھی۔ مگر بعد میں ان کو بھی ایسوپ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔

ایسوپ، ایک فرضی انسان تھا یا حقیقی، وہ اور حضرت لقمانؑ ایک ہی شخصیت تھے یا نہیں۔ ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایسوپ کے نام سے منسوب جو حکایات ہمیں آج پڑھنے کے لیے ملتی ہیں ان کے بارے میں یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کتنی ہی ایسی حکایات ہیں جن کا خالق، اصلی یا فرضی ایسوپ نہ تھا بلکہ ان کہانیوں کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا اس لیے پورے وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسی کہانی ایسوپ کی ہے۔

تین سو برس قبل مسیح میں ایسوپ کی حکایتوں کا ایک جامع نسخہ مرتب ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس کا مرتب دمطیریس تھا جو ایتھنز کا ایک نامور شہری تھا۔ بعد میں ایسوپ کی حکایات کے متراجم دیگر زبانوں میں ہونے لگے جن میں لاطینی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہوریس نے بھی کچھ کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ مقدونیہ کے ایک غلام فیدرس کے نام سے بھی ایسوپ کی

حکایتوں کا ایک مرتب کردہ مجموعہ منسوب ہے۔ یہ غلام اپنی زندگی کا بیشتر حصہ روم میں مقیم رہا تھا اور بعد میں رومی شہنشاہ ایگلڈس کے حکم سے اسے آزاد کردیا گیا تھا۔

اب تک ایسوپ کی حکایات کا ترجمہ متعدد بار دنیا کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی زبان میں ہوچکا ہے۔ ان حکایات نے دنیا کے ادب پر گہرے اور انمٹ اثرات چھوڑے اور پوری انسانیت کو صدیوں سے متاثر کیا ہے۔

ایسوپ کی حکایات کا تین چوتھائی حصہ جانوروں، حیوانوں اور پرندوں کے حوالے سے کہانی کو بیان کرتا ہے ایک چوتھائی کہانیاں انسانوں اور دیوتاؤں کے حوالے سے کہانی کو بیان کرتی ہیں۔

ہمارے ہاں اردو میں لقمان کے نام سے منسوب حکایات بھی ملتی ہیں۔ اور ایسوپ کی حکایات کو بھی بعض لوگوں نے ترجمہ کیا ہے اگرچہ کتابی صورت میں ایسوپ کی حکایات کو ابھی تک شائع نہیں کیا گیا۔

ایسوپ کی حکایات کا وہ مجموعہ جسے ایس اے، ہینڈفورڈ نے ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اس مجموعے میں ۲۰۷ حکایات شامل ہیں۔ ان میں سے چند حکایات کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ان حکایات میں سے چند حکایات ایسی ہیں جو ساری دنیا میں ایسوپ کے نام سے منسوب اور مقبول ہیں۔

ایک سبق احمقوں کے لیے

ایک کوا اپنی چونچ میں گوشت کا ایک ٹکڑا دبائے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا ایک لومڑی کا ادھر سے گزر ہوا اس نے گوشت کے ٹکڑے کو ہتھیانے کا فیصلہ کرلیا لومڑی کوے کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگی "تم کتنے خوب صورت اور دل کش پرندے ہو تمہیں تو تمام پرندوں کا بادشاہ ہونا چاہیے میں سچ کہتی ہوں اگر تمہاری آواز میں بھی دبدبہ اور رعب موجود ہے تم یقیناً" پرندوں کے بادشاہ بنادیے جاؤ گے۔ کوا خوشامد کے جال میں پھنس چکا تھا اس نے اپنی آواز کو بھی بادشاہوں کی آواز ثابت کرنے کے لیے منہ کھولا۔ اور کائیں کائیں کرنے لگا۔ گوشت کا ٹکڑا زمین پر گرا جسے لومڑی نے جلدی سے جھپٹ لیا اور جاتے جاتے بولی!

"اگر تم اپنی خوبیوں میں تھوڑی سی عقل بھی شامل کر لیتے تو تم یقیناً بادشاہ بن جاتے۔"

طاقت

خرگوشوں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مقرر خرگوش نے ایک ہی بات پر زور دیا کہ سب کو شکار سے مساوی حصہ ملنا چاہیئے۔ شیر جو وہاں موجود تھا۔ بولا۔ "خرگوشو! تم نے خطابت کے جوہر تو خوب دکھائے۔ لیکن ان میں ان پنجوں اور دانتوں کی کمی تھی جو صرف ہمارے پاس ہیں۔"

طاقت کی زبان

ایک بھیڑیا ایک بھیڑ کو شکار کرکے اُٹھائے چلا آ رہا تھا کہ اس کی شیر سے مڈبھیڑ ہو گئی شیر نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا۔ اس نے وہ بھیڑ، بھیڑیے سے چھین لی۔ بھیڑیا مجبور تھا، شیر سے کچھ دور کھڑا ہو کر بولا۔

"تمہیں میری بھیڑ ہتھیانے کا کوئی حق نہیں تھا۔"

"اچھا اگر تمہیں یہ طریقہ پسند نہیں آیا تو میں اسے ایک دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔"

پورا بوجھ

گھوڑا اور گدھا دونوں اپنے مالک کا سامان اُٹھائے جا رہے تھے۔ گدھے نے دردناک آواز میں کہا:

"بھائی گھوڑے میرا کچھ بوجھ بٹالو۔ ورنہ میں اس بوجھ تلے دب کر مر جاؤں گا۔ گھوڑے نے حقارت اور نفرت سے گدھے کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی سے چلتا رہا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد گدھا واقعی زمین پر گرا اور مر گیا مالک نے جب دیکھا کہ گدھا مر گیا ہے تو اس نے وہ سارا بوجھ گھوڑے پر لاد دیا اب گھوڑے کو پچھتاوا ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ میں گدھے کی بات مان لیتا تو نہ گدھا مرتا اور مجھے سارا بوجھ اٹھانا پڑتا۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ طاقتور کمزور کا بوجھ اُٹھائے تو دونوں کو فائدہ پہنچتا

ایک ہی کافی ہے

تمام جانور پرندے اور حیوان جشن منا رہے تھے کہ سورج شادی کرنے والا ہے اور خوشیاں منانے والوں میں مینڈک بھی شامل تھے۔ ایک بوڑھے مینڈک نے کہا، احمقو، جاہلو تم کیوں خوشیاں منا رہے ہو کیا تمہارے تالابوں کو خشک کرنے کے لیے کیا ایک ہی سورج کافی نہیں ذرا سوچو تو اگر اس نے شادی کر لی تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا۔ وہ اس کی بیوی اور پھر اس کے بچے مل کر تو ساری دنیا کا پانی خشک کر دیں گے۔ واقعی دنیا کے ان گنت احمق لوگ ان باتوں پر ہی خوشیاں مناتے ہیں جو خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔"

۱۲

الف لیلیٰ

ہر بڑی کتاب کے پیچھے ایک بڑا ذہن اور ایک بڑا تجربہ ہوتا ہے۔

ایک بڑا مصنف بہت سے۔ ان گنت چھوٹے گمنام اور عام مصنفوں کی ہل چلائی ہوئی زمین میں اپنی ذہانت، تجربے اور روایت کا بیج بوتا ہے۔

ہر بڑی کتاب ایک خاص معاشرے اور تہذیب کی عکاسی ہی نہیں کرتی۔ بلکہ اس بڑی تہذیب اور معاشرے کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔

بعض کتابوں کو ایک پوری انسانی تہذیب اور ان گنت انسانوں اور نسلوں کا اجتماعی تجربہ تحریر کرتا ہے۔ ماہیے کی ایک کلی، ایک ٹپّے۔ ایک بولی ان گنت، لوک گیتوں اور کتھاؤں کی طرح بعض کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں بھی کبھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کون تھے.....

ہر دور میں انسان ایک تہذیب ایک معاشرے کو جنم دیتا رہا اور پھر یہ تہذیب اور یہ معاشرہ اپنا اظہار بھی کرتا رہا۔ ایلورا اور اجنتا اور افریقی ممالک کی غاروں میں کی گئی تصویر کشی سنگتراشی دراصل انسانوں کے اجتماعی تہذیبی اور تخلیقی جذبوں کا ہی اظہار تھا۔

" الف لیلیٰ " بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کو ایک تہذیب نے جنم دیا۔ انتظار حسین نے لکھا ہے

" الف لیلیٰ کو جس تخلیق نے جنم دیا ہے۔ آج ہم اس کے خالق یا خالقوں کے نام بھی صحیح طور پر نہیں بتا سکتے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ سارے عربوں نے یا ایک پوری تہذیب نے اسے تصنیف کیا ہے "

(اجتماعی تہذیب اور افسانہ۔ انتظار حسین)

ایک پوری تہذیب کی یہ تصنیف ـــــ الف لیلیٰ۔ دنیا کی اُن معدودے چند کتابوں میں

سے ہے۔ جس نے ایک وطن میں بھی اس طرح جنم لیا کہ اس کا عالمگیریت اور بین الاقوامیت سے خمیر اٹھا تھا اور مکمل ہونے کے بعد بھی اس کا گھر اور وطن ساری دنیا ہے۔

الف لیلیٰ کے ایک ہزار ایک روپ ہیں۔ یہ عربوں کی اس تہذیب کی پیداوار ہے۔ جب عرب تاجر کی حیثیت سے دنیا دنیا گھومتے تھے۔ رنگ رنگ کے لوگوں کو ملتے اور طرح طرح کے عجائبات سے متعارف ہوتے تھے۔ خاص قبائلی طرزِ احساس رکھنے والے ان جہانیاں جہاں گشت عربوں نے دنیا بھر میں جو دیکھا جو سنا۔ وہ اپنے خاص انداز میں، قصے اور حکایت کے روپ میں الف لیلےٰ کی کہانیوں میں یک جان کر دیا۔

محققین نے "الف لیلےٰ" پر جو کام کیا ہے۔ وہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ صدیوں سے الف لیلےٰ انسانوں کے مطالعے میں رہی ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک زبان سے دوسری زبان تک الف لیلےٰ کا سفر، چہار اکناف عالم کا احاطہ کرتا ہے۔ دیس دیس کے لوگوں اور محققوں نے اپنے اپنے زمانے میں جادو کے اس پٹارے کے طلسم کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور کچھ نتائج برآمد کئے ہیں۔

الف لیلےٰ میں بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جو دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً الہ دین اور جادوئی چراغ کو ہی لیجیے تو اس کا قدیم ترین سراغ قدیم چین میں بھی ملتا ہے۔

سند باد کے ڈانڈے یولیسس سے جا ملتے ہیں۔ اس طرح بہت سی کہانیوں کے واقعات دراصل عناصر ایسے ہیں جو عربوں کی سیاحت اور تجارتی سفر کے تجربے کے حوالے سے عربوں تک پہنچے۔ اور انہوں نے ان کو اپنا رنگ دے کر الف لیلےٰ میں شامل کر لیا ہے۔

یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کتابی اور تحریری صورت میں آنے سے پہلے یہ کہانیاں عرب ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ حتیٰ کہ عربوں کے معاشرے میں جو بڑے میلے لگتے ہیں۔ وہاں شاعری کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ کہانیاں سنانے کا بھی مقابلہ ہوتا تھا۔ بازاروں اور قہوہ خانوں اور سراؤں میں بھی داستان گو یہ کہانیاں سناتے تھے۔ سفر کے مراحل طے کرنے والے قافلے کہیں پڑاؤ کرتے تو کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ تھکن بھی اتر جاتی اور ذہن بھی تازہ ہو جاتا۔

"الف لیلےٰ" کو کس نے پہلی اور کتابی اور تحریری صورت دی۔ اس سلسلے میں کسی ایک

کا نام نہیں لیا جاتا۔ محققوں نے بھی جو تحقیق کی ہے۔ وہ بھی کسی دو ٹوک فیصلے تک نہیں پہنچتی۔
الف لیلیٰ کو ایک پورے معاشرے۔ ایک پوری جیتی جاگتی دنیا اور ایک بھرپور تہذیب نے تخلیق کیا ہے۔ تاہم ہمیں محققوں کے حوالے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ الف لیلیٰ کو تحریر کرنے کا زمانہ عباسی دور کے خلفاء کے بعد کا ہے۔

الف لیلیٰ کے جادو اور طلسم کا اندازہ تو اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عباسی دورِ خلافت کے بعد جب یہ تحریری صورت میں آئی تو ساری دنیا میں اس طرح مقبول ہوئی۔ جیسے واقعی جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ جن سے اب تک اس کا جادو قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔
دنیا کی کون سی زبان ہے جس میں الف لیلیٰ کا ترجمہ نہیں ہوئی اور ایک بار نہیں بار بار اس کا ترجمہ ہوا۔ کتنے ہی لکھنے والوں نے الف لیلیٰ کی کہانیوں کو اپنے اپنے انداز میں لکھا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی کہانیاں ہر نسل اور ہر ملک کے انسانوں میں مقبول ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جن سے بچے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔
الف لیلیٰ کی کہانیوں پر مبنی بننے والی فلموں کو بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کون سا ملک ہے جہاں الف لیلیٰ پر مبنی کئی کہانیوں پر کتنی ہی فلمیں مختلف ادوار میں نہ بنی ہوں۔
الف لیلیٰ میں سحر ہے۔ وہ کشش ہے ایسا جادو ہے جو سب کو اسیر کر لیتا ہے۔ عالمی ادب میں شاید چند ہی ایسی کتابیں ہوں گی جن کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور لافانی ہوں گے جتنے الف لیلیٰ کے۔ الف لیلیٰ کے کرداروں نے عالمی ادب کو نئی معنویت نئی علامتیں اور نئے استعاروں کی دولت سے ہر دور میں مالا مال کیا ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو نہ صرف ایک تہذیب کی پیداوار ہیں بلکہ ہر انسان کے جذبات، امنگوں، حسرتوں، خوشیوں، غموں، جذبۂ سیاحت، نفرت محبت اور ان گنت احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔
صدیوں سے یہ کردار زندہ ہیں۔ زبان زد عام ہیں۔ روزمرہ گفتگو میں اپنا اظہار کرتے ہیں ہر ذہنی سطح کا انسان ان کے حوالے سے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتا ہے۔
ہر انسان کے اندر دوسری دنیاؤں کو دیکھنے اور برتنے کا ایک بیکراں جذبہ ہوتا ہے۔ الف لیلیٰ کے کردار اسی جذبے کی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ کردار اور وہ دنیا ہے جس میں

انسان کا تعلق فطرت اور فطرت کے تمام مظاہر سے پوری طرح قائم ہے وہ نئی نئی مخلوقات اور عجائبات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ الف لیلیٰ ایسی ہی پُراسرار سرزمینوں میں اپنے قارئین کو لے جاتی ہے جو ان دیکھی ہیں جو انسانوں کے وسیع اور بیکراں تخیلات میں ازل سے آباد ہیں۔

اس دور کا انسان توہم پرست نہیں تھا۔ بلکہ جادو، ٹونا، طلسم، جن، بھوت، پریاں اور جادو کے کرشمے اس کے لئے بڑی حقیقتیں ہیں۔ ان انسانوں کا تخیل وسیع اور بے پایاں ہے اور یہ تخیل یقین میں اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے کہ اڑن کھٹولا، جادو کا گھوڑا۔ الٰہ دین کا جادوئی چراغ ایسے ان گنت کرشمے اس کے لئے حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔

الف لیلیٰ میں لافانی کرداروں کی ایک دنیا آباد ہے شہزادے، شہزادیاں، غلام، کنیزیں وزیر مصاحب، خواجہ سرا جادوگر۔ بزرگ، چڑیلیں، آسیب، سیاح، مزدور، فقیر، حجام، نابینائی، ملاح اور طرح طرح کے جانور اور پرند، جن کا دنیا کے ان باسیوں کے ساتھ گہرا اور سچا رشتہ ہے۔

ان کرداروں کی اس دنیا میں شراب و کباب کی دعوتیں اور محفلیں جمتی ہیں اور ان دعوتوں میں طرح طرح کے فریب دیئے جاتے ہیں۔ جہاں ایک آن میں انسان کی قسمت بدل جاتی ہے۔ گدا بادشاہ بن جاتا ہے اور بادشاہ گدا۔ زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانے ان انسانوں پر اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی ایک دنیا اور سطح تو ظاہری ہے لیکن ان کی اصل سطح باطنی ہے اور یہی وہ باطنی سطح ہے۔ جو ہر دور کے انسانوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتی اور ہم آہنگ ہوتی ہے۔

یہ کردار مختلف انسانی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف طبقوں سے ان کا واسطہ ہے۔ مگر اس میں انسان ہے کیا؟ یہ الف لیلیٰ کی کہانیوں کا موضوع ہے۔

الف لیلیٰ کا آغاز — جس انداز میں ہوتا ہے وہ اپنی جگہ بے حد معنی خیز ہے۔ ایک بادشاہ ہے شہریار، اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ملکہ ایک بدکار عورت ہے۔ شہریار کو اپنی ملکہ کی بدکاری سے اتنا صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ عورت ذات سے ہی بدظن ہو جاتا ہے۔ وہ ہر روز ایک عورت سے نکاح کرتا ہے اور دوسری صبح اُسے ہلاک کر دیتا ہے۔

کیا وہ عورت ذات سے انتقام لے رہا ہے؟

کیا وہ ہر رات عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا؟

یہ سوال اپنی جگہ۔ لیکن شہریار یہ سمجھتا ہے کہ اب عورت کے ساتھ بس ایک رات ہی بسر کرنی چاہیئے تاکہ وہ زندہ رہے۔ نہ بے وفائی کر سکے۔ وزیر زادی شہرزاد بھی ایک رات کی بیوی بننے کے لئے شہریار کی حرم سرا میں داخل ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بہن دنیازاد کو بھی لے آتی ہے جو شادی کی رات کہانی سننے کا تقاضا کرتی ہے۔ شہرزاد کہانی سناتی ہے۔ کہانی سے کہانی نکلتی ہے۔ شہریار بھی کہانی کے جادو کا گھائل ہو گیا ہے۔

عالمی ادب میں شہرزاد ـــ ایک لافانی کردار ہے۔ اس کردار کو ہر دور میں نئے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔

WOMENS LIB کے اس دور میں بھی شہرزاد کے نئے معنی سامنے آئے ہیں۔ شہرزاد ـــ دانا ہے وہ اپنی کہانیوں کے حوالے سے انسانی فطرت سے پردے اٹھاتی چلی جاتی ہے وہ ان کہانیوں کے ذریعے بتاتی ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کی فطرت کیا ہے اس کی اصل کیا ہے۔ شہرزاد کے کردار کا ایک خاص پہلو ان کہانیوں کے حوالے سے سامنے آتا ہے جن میں وہ اپنی ہم جنسوں کے بارے میں بڑی سفاکی کا اظہار کرتی ہے۔ وہ عورت کے ساتھ انصاف کرنے کی قائل ہی نہیں دکھائی دیتی۔

ایک ہزار ایک راتوں کے بعد ان کہانیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو شہریار ـــ شہرزاد کو قتل نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ایک دانا اور صاحب بصیرت عورت کے حوالے سے اپنی ملکہ قبول کر لیتا ہے۔ اصل میں شہریار۔ شہرزاد کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے اس انسانی فطرت کا شعور اور ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ جو اسے پہلے حاصل نہیں تھا۔

"الف لیلےٰ" میں جو کہانیاں شامل ہیں۔ ان کی ایک خاص خوبی ہے جسے دنیا بھر کے اہل علم نے سراہا ہے۔ وہ خاص خوبی یہ ہے کہ مشرقی ممالک کی حکایات اور قصوں کے ساتھ اخلاقی پند و نصائح اور وعظ کی جو تخ لگی ہوئی ہے وہ الف لیلےٰ کی کہانیوں میں سرے سے موجود نہیں۔ کسی طرح کا کوئی اخلاقی معیار۔ انسانی فطرت کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ آدمی کو معروضی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی جو کوشش الف لیلےٰ میں ملتی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ بیسویں صدی کے مغربی فکشن کا بڑا وصف یہی ہے جو الف لیلےٰ کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

الف لیلیٰ کی کہانیوں کے کردار بھی خاص طرح کے کردار ہیں۔ یہ بڑے بڑے انقلابات کی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جانگسل مراحل طے کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مافوق الفطرت کردار نہیں بنتے۔ اس سلسلے میں انتظار حسین نے ان کرداروں کا تجزیہ بہت صحیح کیا ہے انتظار حسین کہتے ہیں:

"الف لیلیٰ میں قد آور کردار نہیں ملتے اس کے مختلف کردار اعلیٰ انسانی صفات رکھتے مافوق الفطرت طاقتوں سے بھی انہیں کمک حاصل ہو جاتی ہے لیکن وہ اتنے قد آور نہیں بنتے۔ کہ پوری الف لیلیٰ پہ چھا جائیں۔ سندباد جہازی نے بھی بہت سفر کئے ہیں اور بہت کشٹ کھینچے ہیں اور اپنی ذہانت و فطانت کے زور پہ خطروں سے نجات حاصل کی ہے مگر وہ یولیسس نہیں بنتا۔ اس حیثیت سے الف لیلیٰ شاید پرانے زمانے کی داستانوں اور رزمیہ قصوں سے قدرے الگ ہے۔ رزمیہ قصوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ کسی برگزیدہ خاندان کا ایک فرد یا چند افراد ساری انسانی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہوکر اتنے قد آور بن گئے ہوں کہ خلقت کے مرجع و مرکز بنے ہوئے ہیں۔ الف لیلیٰ میں مثالی ہیرو کے اس تصور کی نفی ملتی ہے۔ اس کی کہانیوں کے ہیرو محض خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہیں ان میں بہت سی اچھائیاں بھی جن کے زور پہ وہ ترقی کرتے ہیں مگر پھر انسان ہیں۔ ان میں کمزوریاں بھی تو ہیں اس لئے کسی منزل پر وہ فوق الانسان دیوتا نہیں بنتے۔"

اردو انگریزی اور فارسی میں جانے الف لیلیٰ کے کتنے طرح طرح کے ایڈیشن ملتے ہیں لکھنے والے نے اپنے اپنے انداز میں الف لیلیٰ کی کہانیوں کو لکھا ہے میرے مطالعہ سے الف لیلیٰ کے انہی تینوں زبانوں کے نسخے گزرے ہیں۔ رچرڈ برٹن نے جو الف لیلیٰ مرتب کی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے اس کا شہرہ بھی بہت ہے الف لیلیٰ کے متعدد ایڈیشنوں کی بھی ایک زمانے میں دھوم رہی۔ ہمارے ہاں رتن ناتھ سرشار نے جو الف لیلیٰ مرتب کی۔ اس کا ذائقہ مختلف ہے اردو میں جانے کتنے ناشروں نے اسے کس کس انداز میں شائع کیا ہے اور یہی حال ساری دنیا کی دوسری زبانوں کا ہے!

الف لیلہ کی تلخیص ممکن نہیں۔

کسی ایک کہانی کا انتخاب بے حد مشکل ہے ایک مضمون میں کون سی کہانی شامل کی جائے؟ کسے رد کیا جائے؟ الف لیلہ کی کہانیاں بچپن سے سنتے چلے آنے والے لوگ بھی جب اسے دوبارہ سنتے اور پڑھتے ہیں تو اس میں ایک نیا لطف اور حظ محسوس کرتے ہیں۔ میں کون سی کہانی کا ذکر کروں؟

"علی بابا چالیس چور"، کاسہ الہ دین اور جادوئی چراغ"، کا سندباد جہازی کا، سونے جاگتے۔ ابوالحسن کے قصے کا کانے مزدور اور قلندروں کا قصہ، کہانی کاشغر کے درزی اور کبڑے کی کہانی، حجام کبک کے بھائیوں کے قصے، میمون پری اور شہزادہ قمرالزماں کی کہانی۔۔۔۔۔ غانم کی حکایت۔ نقمان اور اس کی گھوڑی کی کہانی۔۔۔ کس کس کہانی کو بیان کردں کسے رکھوں کسے چھوڑوں؟ چلیں، آپ اس حجام سے ہی مل لیں۔ جس کے بھائی بھی اس کی طرح بے مثل تھے۔

الف لیلہ کا کردار

بغداد کا ایک جوان۔ معزز تاجروں کے خاندان کا چشم و چراغ، باپ کی موت کے بعد جائداد کا وارث مالک بنا۔ سچا کاروباری، عورتوں سے متنفر، لیکن ایک دن ایک مکان کے دریچے میں ایک حسین مہ جبیں کو دیکھ کر دل آگیا۔ جو قاضی شہر کی دختر نیک اختر تھی ایک بڑھیا کے توسط سے ملاقات کی سبیل بنی جمعے کو اسے اپنی محبوبہ کے ہاں جانے کا پیغام ملا۔ وہ جمعے کے دن محبوبہ سے ملاقات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ حجامت بنانے کے لئے ایک ملازم سے کہا وہ ایک حجام کو لے آیا۔ اب سنئے۔ وہ نوجوان کیا سناتا ہے۔

"حجام نے آتے ہی مجھے سلام کیا دعائیں دے کر پوچھا آپ بال کٹوانا چاہتے ہیں یا فصد کھلوانے کا ارادہ ہے پھر بولا جمعہ کے دن بال کٹوانا ستر بیماریوں کو دور کرتا ہے اور فصد کھلوانا بیماریوں کو دعوت دیتا ہے میں نے کہا کہ تم اس وعظ و نصیحت کو رہنے دو جلدی سے میری حجامت بنا دو۔ یہ حجام نافرجام بات سنتے ہی آلات نجوم نکال کر عین صحن میں سورج کے سامنے کھڑا ہو گیا چند منٹ سوچ کر بولا: اشارہ مریخ

اس وقت سات درجے اور چھ دقیقے پر ہے یہ ساعت حجامت کے لئے موزوں نہیں ستارے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کسی نیک آدمی کے پاس جا رہے ہیں۔ مگر گفتگو کے بعد مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "بکواس نہ کرو جس کام کے لئے بلائے گئے ہو وہ کام کرو"

یہ بدبخت بولا "آپ کو کونسا کام درپیش ہے تفصیل سے بیان کریں۔ صحیح اور اچھا مشورہ دوں گا۔ میں نے اسے بکواس سے روکا تو بولا صاحب آپ مجھے بکواسی کہتے ہیں بکواسی اور بے ہودہ تو میرے بھائی ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں نے میرا نام ہی ساعت رکھ دیا ہوا ہے" یہ بدبخت مجھے اپنے بھائیوں کے نام سنانے لگا۔ عجیب و غریب نام ہے بقبوق، بکبک، اکلوز وغیرہ، میں اس سے تنگ آگیا۔ غلام سے کہا اسے ادھار دینار دے کر رخصت کرو میرا وقت ضائع کر رہا ہے وہ بدبخت بولا۔ حضرت خدمت کئے بغیر تو میں نہ جاؤں گا۔ آپ نے مجھے پہچانا۔ میری قدر کی۔ میں کچھ نہیں مانگتا مفت خدمت کروں گا آپ کے والد محترم کے بھی مجھ پر بڑے احسان ہیں" میں اس کی اور بھی بکواس سے تنگ آکر مشتعل ہوا تو بولا "آپ ناراض نہ ہوں آپ کے والد تو میرے مشورے کے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالتے تھے یاد رکھیں اس وقت تمام دنیا میں مجھ سے بڑھ کر آپ کسی کو اپنا ہمدرد اور مخلص نہ پائیں گے" میں اس کی بکواس سے تنگ آگیا۔ لیکن وہ تو مجھے یہ بتا کر شرمندہ کرنے لگا کہ بچپن میں وہ مجھے کندھوں پر سوار کر کے مکتب پہنچایا کرتا تھا خدا جانتا ہے وہ جھوٹ بولتا تھا میری اس کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں نے اسے سختی سے ڈانٹا کہ حجامت بنانا ہے تو بناؤ۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ بالآخر اس نامراد نے استرا نکالا اور پتھر پر تیز کرنے لگا۔ ایک گھنٹہ اور بکواس میں ضائع کر کے حجامت بنانے لگا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بلا سے نجات ملنے والی ہے ابھی آدھی حجامت کرنے پایا تھا کہ میں نے کہا "جلدی کرو" بس یہ الفاظ سنتے ہی اس نے ہاتھ روک لیا اور بولا صاحب بزرگوں کا قول نہیں سنا۔ تعجیل کار سے شیاطین بود۔

بس اسے موقع مل گیا، یوں گھنٹے تک وہ ہاتھ روک کے زبان چلاتا رہا۔ جب میں نے پھر اسے غصہ سے ڈانٹا تو مجھے سمجھانے لگا کہ ابھی چھوٹے ہیں اور ناتجربہ کار ہیں مجھے بتایئں کہاں جانا ہے حجامت آدھی چھوڑ پھر نجوم کے آلات لے کر بیٹھ گیا بولا کہ جمعہ میں ابھی تین گھنٹے پڑے ہیں کیا جلدی ہے۔ میں جھنجلا اٹھا۔ ڈانٹا۔ غصہ نکالا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا آخر میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ دعوت کا نام سنا تو وہ بے حیا اچھل پڑا استرے کو پھر پتھری پر تیز کرتے ہوئے بولا۔ ایک بات بتانا بھول گیا، میں نے بھی کل اپنے کچھ دوستوں کو دعوت پر اپنے گھر بلایا ہے مگر ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی۔ میں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو جلدی سے حجامت بنا دو۔ دعوت کا انتظام میں کر دوں گا۔ وہ کم بخت اب یہ پوچھنے لگا کہ دعوت کے لئے اسے کیا کیا چیزیں ملیں گی، میں نے کئی چیزوں اور کھانوں کے نام لے کر اپنی جان چھڑانا چاہی بولا مجھے بھی چیزیں دکھا دی جائیں،، مرتا کیا نا کرتا نوکروں کو بلوا کر اسے بھی کچھ دکھایا تو وہ بدبخت بولا بس اک شراب کی کمی ہے۔ میں نے جب شراب بھی منگوا دی تو وہ لگا میرا قصیدہ پڑھنے۔ مگر حجامت کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھایا۔ پتھری پر استرا رگڑتا چلا گیا پھر بولا آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن تھوڑی سی خوشبو بھی منگوا دیں،، قہر درویش بر جان درویش یہ حکم بھی پورا کیا اور پھر منت سماجت کرنے لگا کہ وہ حجامت بنا دے اس پر کچھ اعترا ہلا، تھوڑی سی حجامت بنا کر باقی ادھوری چھوڑا اپنی کم گوئی، خاموشی، کم زبانی اور میری سخاوت کے متعلق اشعار بکنے لگا پھر اپنے دوستوں کے قصے لے بیٹھا۔ خدا خدا کرکے کسی طرح حجامت مکمل کرنے پر رضامند کیا۔ خدا خدا کرکے کئی گھنٹوں میں حجامت ختم ہوئی تو بولا کہ آپ غسل کر لیں۔ میں سامانِ دعوت اپنے احباب کو دے کر ابھی حاضر ہوتا ہوں آج میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ خدا نہ کرے دعوت میں کوئی مصیبت پیش آجائے مشورے کے لئے میرا ہونا بے حد ضروری ہے،،

خدا خدا کرکے وہ سامان اٹھا کر چلا گیا۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ جی میں خوش تھا کہ عذاب سے جان چھوٹی مگر وہ بدبخت تو ایک کائیاں نکلا۔ سامان مزدوروں کے ہاتھ گھر بھجوا کر

وہ گلی میں چھپ رہا۔ میں نے محبوب کے مکان کا رستہ لیا تو میرے پیچھے پیچھے چھپ کر چلتا رہا۔ میں محبوب کے مکان کے اندر پہنچا، وہ بھی چھپ کر اندر آ پہنچا ادھر شومیٔ قسمت سے قاضی صاحب گھر میں تھے۔ کسی لونڈی پر خفا ہوتے اور اسے مارنے لگے۔ لونڈی کو بچانے کو ئی غلام بیچ میں آ گیا تو قاضی صاحب نے غصے میں اسے بھی دھر لیا۔ غلام کے چلّانے کی آواز سے یہ نافرجام حجام سمجھا کہ شاید اندر میری درگت بن رہی ہے۔ اس نے کپڑے پھاڑ چلانا شروع کر دیا محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ یہ انہیں کہنے لگا:

"قاضی صاحب میرے آقا کو پیٹ رہے ہیں"

پھر میرے گھر دوڑا، میرے غلاموں کو بلا لایا جو لاٹھیوں سے مسلح ہو کر قاضی صاحب کے مکان پر گئے اور دروازہ توڑنے لگے۔ قاضی حیران کہ الٰہی کیا ماجرا ہے؟ دروازے پر لوگوں کا ہجوم دیکھا تو پوچھا سب نے کہا:

"ہمارے آقا کو بے گناہ کیوں مار رہے ہو"

قاضی صاحب نے پوچھا:

"تمہارا آقا کون ہے؟ کب اور کیوں آیا اور بھلا اس نے میرا کیا بگاڑا تھا کہ میں اسے مارنے لگا؟"

اس ظالم حجام نے جواب دیا:

"قاضی تو بڑا مزدار ہے۔ اب مکرتا ہے۔ میرا آقا تمہاری بیٹی پر عاشق ہے، تمہاری بیٹی نے موقع پا کر آج اسے دعوت پر بلایا تمہیں کسی طرح خبر ہو گئی، تم نے اپنے غلاموں سے میرے آقا کو قتل کرا دیا۔"

میری گھبراہٹ اور پریشانی کا اندازہ لگائیے اس نافرجام حجام نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ قاضی صاحب شرمسار ہو رہے تھے، اپنا بھرم رکھنے کو بولے:

"تمہارا آقا اندر ہے تو جا کر خود ہی لے آؤ"

منحوس حجام اندر داخل ہوا۔ اپنی محبوبہ کی بدنامی کے خوف سے میں ایک صندوق میں چھپ گیا۔ ظالم حجام اس صندوق کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ میں جلدی سے صندوق سے نکلا اور بھاگا۔ لوگ میرے

پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے آرہے تھے۔ میں نے اشرفیاں جیب سے نکال کر پھینک دیں کہ لوگ پیچھا نہ کریں۔ لیکن لوگ اشرفیاں اُٹھا کر پھر میرے پیچھے بھاگے اس بھاگ دوڑ میں میری ٹانگ پر سخت چوٹ آگئی اور میں لنگڑا ہو گیا، ایک کوچے میں گھس کر چھپنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ یہ حجام میرے پیچھے بھاگتا چلا آرہا ہے اور کہہ رہا ہے:

"دیکھا صاحب، میں نہ کہتا تھا کہ جلدی شیطان کا کام ہوتا ہے خدا کا شکر ہے۔ آقا کہ آپ کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اگر میں موقع پر نہ پہنچتا تو نصیب دشمناں آپ کی جان جانے میں کیا کسر تھی۔"

اس بدبخت نے میری محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کر دیا تھا:

"میں نے اسے ڈانٹا کہ خدا کے لئے اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو مگر یہ کم بخت اپنی بکواس نے باز آیا۔ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر ایک دوست سوداگر کے ہاں پناہ لی اور عہد کیا کہ جس شہر میں یہ حجام رہے گا میں وہاں نہ رہوں گا۔ اپنی جائیداد اونے پونے بیچ بغداد چھوڑ دیا آج یہ پھر دکھائی دیا ہے اس کی موجودگی میرے لئے کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ میں یہ شہر بھی چھوڑ دوں گا۔"

کنٹربری ٹیلز

وہ شخص جسے انگریزی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ جیوفری چاسر ایک اندازے کے مطابق ۱۳۴۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی جس کتاب کو عالمگیر شہرت ملی اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے وہ "کنٹربری ٹیلز" ہیں۔ پچھلی پانچ صدیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ "کنٹربری ٹیلز" کو نہ صرف ساری دنیا میں پڑھا گیا ہے بلکہ اس کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔ "کنٹربری ٹیلز" نے اپنے محاسن اور شاعری کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ دنیا کی عظیم کتابوں میں سے ایک ہے۔

چاسر وہ شاعر ہے جس کی زبان آج بہت حد تک متروک ہو چکی، لہجے اور املا میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔ اس کے باوجود چاسر ہی وہ شاعر ہے جس نے انگریزی شاعری کے وسیع تر امکانات کو نمایاں کیا اظہار کو وسعت سے آشکار کیا اور انگریزی نظم و شعر کو نئی جہتیں بخشیں جو بعد میں عظیم انگریزی شاعری کے لیے بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

کنٹربری ٹیلز ایک خاص وجہ سے حوالے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ کنٹربری ٹیلز میں ایک کہانی ہے "WIFF OF BATH" اس منظوم کہانی میں بعض ایسے الفاظ ایسے پیرائے میں استعمال ہوئے ہیں جب بھی کسی کتاب پر فحاشی یا عریانی کا الزام لگایا اس پر مقدمہ چلایا گیا تو اس کہانی کا ذکر ضرور ہوا۔

کنٹربری ٹیلز، بائیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ دو کہانیاں نامکمل بھی ہیں اس پر ایک طویل THE GENERAL PROLEGUE بھی شامل ہے۔ جو اعلیٰ ترین شاعری کا مظہر ہے۔ چاسر اپنی اس کتاب کو کس طرح ترتیب دینا چاہتا تھا اور اس کے ذہن میں اس کی تکمیل کا کیا

نقشہ تھا۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چاسر اپنا یہ کام مکمل نہ کر سکا کینیٹ ہیپاٹ نے لکھا ہے کہ کنٹر بری ٹیلز کے اسی قلمی مسودے موجود ہیں جن میں خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔

جیوفری چاسر کا باپ لنڈن کی ایک سرائے کا مالک تھا۔ چاسر کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اور انہیں بھی مستند نہیں کہا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے آکسفورڈ یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کی ہوگی تاہم یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ بادشاہ ایڈورڈ سوم کا ملازم و معتمد خاص تھا۔ جب ۱۳۵۹ء میں ایڈورڈ سوم نے فرانس پر حملہ کیا تو چاسر اس کے ساتھ تھا۔ اس لڑائی میں چاسر کو جنگی قیدی بنا لیا گیا تھا۔ خود بادشاہ نے اس کے فدیے کی رقم ادا کر کے اسے رہائی دلوائی۔

پرنس لائینل ڈیوک آف کلیرنس اس کا مربی تھا۔ ۱۳۶۸ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی خدمات پرنس لائینل کے بھائی پرنس ڈیوک آف لنکاسٹر نے حاصل کر لیں۔ ۱۳۷۰ء سے ۱۳۸۶ء تک چاسر کا تعلق دربار سے رہا۔ اسے کئی بار اہم سفارتوں پر بھیجا گیا اسے متعدد بار اہم عہدوں پر فائز رہنے کا موقع ملا۔ سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ عہدے اکثر عارضی ثابت ہوتے رہے۔ ۱۳۸۶ء میں وہ ویسٹ منسٹر میں منعقد ہونے والی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوا۔

۱۳۸۷ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہوا اس کا ادھورا نام ہی معلوم ہو سکا ہے جو فلپا ہے۔ چاسر کا ایک بیٹا لیوس بھی تھا۔ اس کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں کہ بعد میں وہ کیا بنا۔ ۱۳۹۴ء میں بادشاہ نے چاسر کے لیے تاحیات بیس پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جب ہنری چہارم بادشاہ بنا تو چاسر نے اس کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی کہ اس پنشن میں اس کا گزارہ نہیں ہوتا اور وہ انتہائی ناداری سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ بادشاہ ہنری چہارم نے اس کی پنشن دگنی کر دی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۴۰۰ء کو چاسر کا انتقال ہوا اسے ویسٹ منسٹر ایبے کے اس گوشے میں دفن کیا گیا جسے آج گوشۂ شعرا کے نام سے شہرت حاصل کی۔

چاسر کی شاعری کی ابتداء کے بارے میں ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ جب اس کے مربی اور آقا ڈیوک آف لنکاسٹر کی بیگم فوت ہوئی تو چاسر نے انگلیا۔ ۱۳۶۹ء میں ایک نظم اس کی موت پر لکھی اس کے بعد اس نے کئی دوسری نظمیں بھی لکھیں۔ ۱۳۸۷ء میں وہ اپنے شہرۂ آفاق تخلیقی فن پارے کنٹر بری ٹیلز پر خاصا کام کر چکا تھا۔

چاسر کئی بار اٹلی گیا وہ ڈانٹے اور بوکیچیو سے بے حد متاثر تھا۔ کنٹربری ٹیلز میں بعض ایسی حکایات موجود ہیں جو چاسر نے بوکیچیو کی 'ڈیکمرون' سے لی ہیں، اس نے ان کہانیوں کے مواد کو اپنے انداز میں استعمال کیا ہے۔

پہلے پہل اس نے سات مصرعوں پر مشتمل بند STANZA پر مبنی نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک پورا پورا باوزن شعر لکھ کر نظم کی ہیئت میں تجربے کرتا رہا۔

'کنٹربری ٹیلز' انگریزی ادب کے عظیم ترین شاہکاروں میں ایک ہے۔ عمر اور زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہ کی کہ وہ 'کنٹربری ٹیلز' کو اس طرح پورا کر سکتا۔ جس طرح کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ اس کے باوجود موجودہ شکل میں بھی یہ ایک عظیم فن پارہ ہے۔

"کنٹربری ٹیلز" میں طویل ابتدائیے کا ذکر ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی شاعری میں یہ نظم (ابتدائیہ) ایک بڑا شعری کارنامہ ہے اس میں ایسی شگفتگی، ایسی سچائی اور جامعیت ملتی ہے جو دنیا کے بہت کم شعری فن پاروں کو حاصل ہوئی ہے۔

"کنٹربری ٹیلز" کی فارم کچھ یوں ہے کہ کچھ زائرین ہیں جو لندن سے سینٹ تھامس بیکٹ کے مزار کی زیارت کے لیے کنٹربری روانہ ہوتے ہیں۔ کنٹربری ٹیلز کے ابتدائیے سے پتہ چلتا ہے کہ زائرین کی تعداد انتیس ہے وہ راستے میں دو دو کہانیاں سناتے ہیں۔ واپسی میں دو کہانیاں پوری ہوتی ہیں۔

چاسر کا زمانہ عہد وسطیٰ کا آخری دور ہے۔ یہ تیس زائرین اس دور کے انسانوں اور ہر ٹائپ کی نمائندگی کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ چاسر کا مشاہدہ ہمیں ان کرداروں سے اس طرح متعارف کراتا ہے کہ ہم ان کرداروں کی شباہت حلیے اور نفسیات تک سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کی شعری تاریخ میں ایسا انداز اور تجربہ کہیں نہیں ملتا بلاشبہ چاسر بوکیچیو کی ڈیکمرون سے متاثر تھا لیکن کنٹربری ٹیلز میں وہ اپنے لیے بالکل نئی اور منفرد راہ نکالتا ہے۔

چاسر عہد وسطیٰ کے آخری دور کے انسانوں کے حوالے سے جو کہانیاں ہمیں سناتا ہے، یہ کہانیاں اپنے اسلوب اور بیان کے اعتبار سے بے حد منفرد ہیں یہ ہمیں آج کی حکایتیں محسوس ہوتی ہیں اسے چاسر کی خلاقی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ایک زائر جو کہانی سناتا ہے وہ اس

کے اپنے مزاج، کردار اور نفسیات کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ کہانی اپنے سنانے والے زائر کے نظریات بھی ہم تک منتقل کرتی ہے۔

"کنٹربری ٹیلز" میں چاسر نے جو ادبی اور تخلیقی سانچہ تیار کیا ہے وہ اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر کے نقادوں نے ان کہانیوں کی تاثیر اور قوت کو سراہا ہے۔ یہ کہانیاں صرف نیکی بدی اور انسانی اعمال پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ کہانیاں ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ انسان کیسا ہوتا ہے اور کیا ہے! ان کہانیوں کے حوالے سے ہم انسان کی توانا شخصیت کو سمجھتے ہیں۔

چاسر ایک ایسا شاعر ہے جو ایک خاص انداز فکر بھی رکھتا ہے وہ اپنی کہانیوں میں جب عورت کو موضوع بناتا ہے کسی عورت کے حوالے سے بات کرتا ہے تو ہمیں بہت جلد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ چاسر اپنی خاص توجہ اور تخلیقی عمل سے عورت کو صرف عورت ہی نہیں رہنے دیتا بلکہ وہ عورت کو "خاص عورت" بنانے کا فن جانتا ہے۔ یہ اس کی ذاتی توجہ، فکری اور مشاہداتی گہرائی ہے وہ جب کسی پرندے مثلاً مرغ کا ذکر کرتا ہے تو وہ ہوتا تو عام مرغ ہے لیکن اسے وہ اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ مرغ پڑھنے والوں کے لیے ایک "خاص مرغ" بن جاتا ہے۔

چاسر ایک انسان دوست اور شگفتہ مزاج شاعر ہے۔ حس لطافت اس کی شاعری کی جان ہے وہ انسانوں اور ان کے اعمال سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو انسان ہی دکھاتا ہے۔ ان کو غیر معمولی توانا، خوب صورت، بدصورت یا احمق بنا کر نہیں دکھاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانوں میں تمام انسانی عناصر موجود ہوتے ہیں اس کے ہاں مزاح کا اظہار بھی بڑے خوب صورت رمزیہ انداز میں ہوتا ہے جو باطن کو متاثر کرتا ہے۔

KNIGHT 'S TALE ایک طویل منظوم کہانی ہے۔ یہ عہد وسطیٰ کا ایک رومانس ہے۔ محبت اور محبت میں رومانی ذہن رکھنے والوں کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ اس کہانی کا خاص پہلو ہے۔ اس کہانی میں مسرت اور درد دونوں اس طرح سے گندھے ہوتے ہیں جس سے ان کا تاثر اور بھرپور بنتا ہے۔

چاسر کیسی انگریزی لکھتا تھا۔ اس دور میں انگریزی املا اور لہجہ کیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے میں چاسر کی "کنٹربری ٹیلز" کے ابتدائیے کے چار مصرعے دے رہا ہوں۔ یہ وہ انداز تحریر ہے جو

چاسر کا ہے ان چار مصرعوں کو آج کی زبان میں کس طرح لکھا جائے گا۔ اسے بھی تقابلی موازنے کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔

چاسر کے چار مصرعے

WHAN THAT APRILL WITH HIS SHOURS SOTE.
THE DROUGHTE OF MARCHE HAS PERCED TO THE ROTE,
AND BATHED EVERY VEYNE SWICH LICOUR OF WHICH
VERTU ENGENDRED IS THE FLOUR.

اب چاسر کی ان چار سطروں کا موجودہ انگریزی ورشن دیکھیے۔

WHEN APRIL WITH HIS SWEET SHOWERS HAS.
PIERCED THE DROUGHT OF MARCH TO THE ROOT,
AND BATHED EVERY VEIN IN SUCH MOISTURE,
AS HAS POWER TO BRING FORTH THE FLOWER.

یہ ترمیمی اور جدید ورشن جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے مرتب کینٹ اور کانیش ہباٹ ہیں۔ جنھوں نے کنٹربری ٹیلز نئی شکل میں ترجمہ کر کے مرتب کیا ہے۔

کنٹربری ٹیلز کے ابتدائیے کے کچھ ٹکڑے۔

ذیل میں کنٹربری ٹیلز کے طویل ابتدائیے سے کچھ حصے دیے جا رہے ہیں جس سے اردو کے قارئین چاسر کی شعری صلاحیتوں اور مشاہدے سے کسی حد تک متعارف ہو سکتے ہیں۔

اس طویل ابتدائیے میں چاسر کنٹربری ٹیلز کی وجہ تصنیف بتاتا اور زائروں کا تعارف کراتا ہے اور ان میں ایک راہبہ (نن) بھی تھی۔

خانقاہ کی نگران
اس کی مسکراہٹ بڑی متوازن اور شیریں تھی
وہ بڑی سے بڑی قسم یہ کھاتی "سینٹ لوئی کی قسم"
ان کا نام مادام الگلنٹائن تھا

وہ حمد کے نغمے بہت موثر انداز میں گاتی تھیں
وہ فرانسیسی زبان بہت عمدہ بولتی اور جانتی تھی
کھانے کی میز پر ان کے آداب و اطوار قابلِ تعریف تھے
ان کے ہونٹوں سے کبھی ایک بھی لقمہ نیچے نہ آتا تھا
وہ اپنی انگلیاں طشتری میں اس طرح لے جاتی تھی کہ
ان کی انگلیاں سالن سے کبھی آلودہ نہ ہوتی تھیں
بڑی نفاست سے وہ لقمہ بنا کر اپنے ہونٹوں تک لے جاتی
اور بڑی احتیاط سے کام لیتی تھی کہ
ان کے سینے پر سالن کا کوئی قطرہ نہ گرے
وہ اپنے بالائی لب کو اس احتیاط سے پونچھتی تھیں کہ
ان کے گلاس پر چکنائی کا کبھی دھبہ یا داغ نہ لگتا تھا
وہ بڑے نازک احساسات اور جذبات کی مالک تھیں
ان کا دل فیاضی اور ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔
کسی چوہے تک کو زخمی یا مردہ دیکھ کر
وہ آنسو بہانے لگتی تھیں
ان کے ساتھ کچھ کتے بھی تھے۔
جنہیں وہ بھنا ہوا گوشت اور عمدہ روٹی کھلاتی اور دودھ پلاتی تھیں
اگر ان میں کوئی تکلیف میں ہوتا یا مر جاتا
تو وہ رونے لگتی تھیں
ان کے سر کے بال مینڈھیوں میں گندھے ہوئے تھے
ان کا ناک خوش وضع تھا اور آنکھیں
شیشے کی طرح چمک دار اور شفاف
ان کا دہانا بہت چھوٹا، نرم اور سرخ تھا

اور بلا شبہ ان کی پیشانی بہت خوب صورت تھی

ان میں آکسفورڈ کا ایک کلرک بھی تھا۔
جو ایک مدت سے اپنے آپ کو منطق کی راہ پر لگا چکا تھا
آپ کا گھوڑا، واہ سبحان اللہ، اپنی مثال آپ تھا۔
مریل، مرلاتڑا، خم کھایا ہوا
اور آنجناب بھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں
فربہ یا صحت مند نہ تھے
بڑے کھوکھلے سے اور سنجیدہ دکھائی دیتے تھے
ان کا لبادہ تار تار ہو رہا تھا
جس سے ان کی حالت ظاہر تھی کہ
دنیاوی اور مادی اعتبار سے وہ کامیاب نہیں ہیں
نہ ہی وہ کسی اچھے سماجی رتبے کے حامل تھے
لیکن اسے کیا کہیئے کہ آنجناب کے پاس
بیس مجلد۔ سرخ و سیاہ جلد والی
ارسطو کی تصانیف اور فلسفے اور منطق کی۔
کتابیں تھیں جنکو وہ اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔
اسی لیے نہ تو ان کے پاس عمدہ لباس تھے۔
نہ شیریں سروں والی بانسری،
وہ تو ایک فلسفی اور منطقی تھے۔
اس لیے ان کے ہاں سونا کہاں دکھائی دیتا
اپنے دوستوں اور احباب سے وہ جو کچھ حاصل کرتے
سب اپنی تعلیم اور کتابوں پر خرچ کرکے

ان کے لیے سچے دل سے دعا کرتے تھے
جو ان کی تعلیم اور شوق کو جاری رکھنے میں ان کے ممد و معاون ثابت ہو رہے تھے
آنجناب اپنا زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرتے تھے
ضرورت کے بغیر ان کے منہ سے کبھی ایک لفظ نہ نکلا تھا۔
اور وہ جو بات کہتے 'نپی تلی' برمحل اور دوٹوک ہوتی

اور ان میں ایک طبیب بھی تھے
میں کہہ سکتا ہوں کہ ان جیسا
اس پوری دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔
طب اور جراحی میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھے۔
وہ علم سیارگان کے تحت اپنے مریضوں کا
علاج کرتے تھے۔
ان کو بتاتے تھے کہ اس وقت کونسا ستارہ کہاں ہے
اور کس حال میں ہے اور اس کا اثر مریض پر کیا پڑ رہا ہے
وہ مریض کو بتاتے تھے کہ جب اس کا ستارہ فلاں مقام پر
فلاں وقت پہنچے گا تو اس وقت مریض کے لیے دوائی کا استعمال مفید اور کارگر ثابت ہوگا
ان کا علم ان کا اپنا تھا، ان کا طریق علاج اپنا تھا۔
قدما میں سے وہ بقراط کو جانتے تھے نہ گیلن کو
نہ ابن رشد کو، نہ ابن سینا کو
وہ سُرخ اور نیلا لباس پسند کرتے تھے اور اکثر انہی رنگوں کے ملبوسات میں دکھائی دیتے۔
عمدہ ریشمی لباس دھاری دار
وہ بہت کماتے تھے لیکن خرچ کرنے میں بخیل تھے۔
وہ جو روپیہ کماتے تھے بُرے دنوں کے لیے جمع کر رہے تھے۔

چونکہ دوائیوں اور کشتوں میں سونا استعمال ہوتا ہے۔
اس لیے وہ سونے سے خاص محبت کرتے تھے۔

ان میں ایک اچھی خانہ دار بیوی بھی تھی۔ جو باتھ کے قریب کی رہنے والی تھی
یہ شرم اور افسوس کی بات ہے کہ وہ کچھ اونچی سنتی تھی۔
کپڑا بننے میں اسے وہ مہارت حاصل تھی کہ اس نے
پیرس اور گھنٹ کے جولاہوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا
اس کا چہرہ کھلا ڈھلا، خوب صورت اور سرخ و گلابی تھا
ساری عمر اس نے بڑے ٹھاٹھ سے بھی عورت کی طرح بسر کی تھی۔
پانچ مردوں سے تو اس نے گرجے میں شادیاں کی تھیں
اور جوانی میں کتنے ہی تھے جن کے ساتھ رفاقت رہی تھی
لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔
تین بار وہ بی بی یروشلم جا چکی تھی
اس نے کتنے ہی مہیب اور انجانے دریا عبور کیے تھے
وہ روم، کولون، بولگونہ میں کتنی زیارتوں
کا دیدار حاصل کر چکی تھی
وہ دوسروں کی موجودگی میں کھل کر ہنسنے اور جی بھر کر
گپ شپ لگانے کی عادی تھی۔
وہ محبت کے دکھوں کا مداوا جانتی تھی۔
اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ محبت کرنے کے قدیم فن کو جانتی تھی۔ محبت میں کس طرح
رقص کیا جاتا ہے،
وہ اس پر بھی مہارت رکھتی تھی....

اور ان میں سے ایک کسان بھی تو تھا۔ ایک سچا محنت کش
اس نے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے گوبر سے کتنے چھکڑے بھرے تھے
وہ ایک سچی بے ریا اور ایماندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔
خدا کو وہ سچے دل سے پیار کرتا تھا
خواہ وہ مسرور ہوتا یا رنجور۔ اس کا دل ذکر خدا سے خالی نہ ہوتا
اور پھر خدا کے بعد سب سے زیادہ وہ اپنے پڑوسی سے پیار کرتا تھا
وہ ہر محتاج اور غریب کے لیے یسوع کے نام پر
ہر طرح کی خدمت انجام دینے کے لیے آمادہ رہتا
اس کا بس چلتا تو کبھی کسی سے معاوضہ نہ لیتا۔

اور پھر وہاں ایک چکی والا بھی تھا۔
وہ بھاری مضبوط اور بڑی ہڈیوں سے بنا ہوا آدمی تھا؟
اس کے کندھے چوڑے اور سینہ چوڑا تھا
اور ہر دروازے کو اکھاڑ کر رکھ سکتا تھا۔ ہر دروازہ توڑ سکتا تھا
اس کی داڑھی سرخ رنگ کی تھی جیسے لومڑی سرخ ہوتی ہے
اور وہ داڑھی چھاج کی طرح چوڑی اور بڑی تھی۔
اس کے نتھنے سیاہ اور چوڑے تھے۔
اُس کا منہ کسی بھٹی کی طرح کھلا اور فراخ تھا
وہ باتونی تھا اور ایسی کہانیاں سناتا تھا جو سرائے کے لوگ سنایا کرتے ہیں
کہانیاں جو گناہوں کی ترغیبات پر مبنی ہوتی ہیں۔
وہ اناج چرانا اور اس کی تین گنا قیمت وصول کرنا بھی جانتا تھا
وہ سفید کوٹ اور نیلا ہڈ پہنتا تھا۔

ایڈی پس

سفوکلیز اور اس کے ڈرامے 'ایڈی پس' کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں چند مختصر سی باتیں یونانی سٹیج اور سفوکلیز کے پیش رو ایسکائی لس کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ جن کا ذکر سفوکلیز اور اس کے ڈرامے کے حوالے سے ناگزیر ہے۔

قدیم یونان نے تہذیب و فن، فن تعمیر اور فلسفہ میں جو بڑے لوگ اور بڑے کام پیدا کیے، ان کے اثرات آج تک پوری دنیا پر پائے جاتے ہیں۔ ایتھنز جو یونانی فکر و فن اور فلسفے کا مرکز ہے اس کے بارے میں بلا شبہہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا تہذیبی مرکز پھر شاید روئے زمین پر قائم نہیں ہوسکا۔ ڈرامے میں، شاعری میں، دیو مالا میں، فن تعمیر میں فلسفہ میں، جمہوریت میں، سیاست میں، ریاضی میں جو اولیت یونان کو حاصل رہی ہے اور ان شعبوں میں جو نقوش اس تہذیب نے چھوڑے وہ انمٹ اور لازوال ہیں۔ یہاں مختصر سی بات صرف ڈرامے کے حوالے سے ہوگی۔

ڈرامے کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ڈرامے پر جو تحقیق ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کی ابتدائی صورت معبدوں اور عبادت گاہوں میں رقص اور گیت کی ملتی ہے۔ جس میں دیوتاؤں کی برتری کو خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا۔ ناچنے اور گانے والے جانوروں کے چہروں سے ملتے جلتے نقاب (MASK) اپنے چہروں پر اوڑھ لیتے تھے اس طرح وہ گا ناچ کر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ بعد میں جب یہی رقص اور گیت عوامی سٹیج پر پیش ہوئے تو ڈرا کہلایا۔ بارہ افراد پر مشتمل ایک گانے والوں کا طائفہ ہوتا تھا۔ جسے کورس کہتے تھے، جو مختلف وقتوں میں گاتے ناچتے تھے اور اصل کردار صرف

ایک ہوتا تھا۔ جو دیوتاؤں سے مکالمہ کرتا تھا۔

ایسکائی لس (۵۲۵ ق م - ۴۵۶ ق م) کو (یونانی) المیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے پہلی بار یونانی سٹیج پر اپنے شہری ڈراموں میں دوسرے اور تیسرے کردار کو بھی متعارف کرایا۔ جبکہ ایسکائی لس سے پہلے کورس کے ساتھ صرف ایک ہی کردار ہوتا تھا۔ ایس کائی لس نے سٹیج کی ہئیت میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ بلاشبہ وہ دنیا کے عظیم ترین خلاق ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ ایتھنز میں ہر برس تین یوم کے لیے "ڈرامہ فیسٹیول" کا انعقاد ہوتا تھا۔ جس میں ڈرامہ نگاروں کے درمیان بہترین ڈرامے پیش کرنے کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ سال بھر اس تقریب کا انتظار کرتے اور بڑے اہتمام سے ڈرامے دیکھنے جاتے تھے۔ ہزاروں افراد ایتھنز میں ڈرامہ دیکھتے ان کو سٹیج سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر بٹھایا جاتا۔ جب انھیں کوئی منظر کوئی مکالمہ پسند آتا تو وہ داد کے لیے تالیاں بجاتے اور اگر کوئی کھیل یا اس کا حصہ ناپسند ہوتا تو لکڑی کے بینچ بجانے لگتے۔ جن پر وہ بیٹھے تھے۔

ایسکائی لس نے ان مقابلوں میں مسلسل تیرہ برس تک پہلا انعام حاصل کیا۔ کوئی اس کو چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ بعد میں نوجوان نسل میں سفوکلیز سامنے آیا۔ جس نے ایسکائی لس کی برتری کو ختم کیا اور ایک مقابلے میں پہلا انعام حاصل کر کے اسکائی لس کو شکست دی۔

کہا جاتا ہے کہ ایسکائی لس کم از کم نوے ڈراموں کا خالق تھا۔ مگر اب اس کے صرف سات ڈرامے زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے ہیں۔ جن میں اس کا شہکار "پرومتھیس" بھی ہے۔ جس کا شمار نہ صرف ایسکائی لس کے بلکہ دنیا کے عظیم ڈراموں میں ہوتا ہے۔

یہ امر بے حد اہم ہے کہ ایسکائی لس، سفوکلیز اور اس کے بعد یوریپڈیز نے جو المیے لکھے وہ تمام کے تمام دیومالائی اور اساطیری داستانوں پر مبنی تھے۔ ڈرامہ دیکھنے والے ہزاروں ناظرین کو پہلے سے ڈرامے کی کہانی کا علم ہوتا تھا۔ یہ صرف ان عظیم اور لافانی المیہ نگاروں کا کمال فن تھا کہ وہ سب کو معلوم کہانیوں پر ایسے ڈرامے لکھتے اور پیش کرتے تھے کہ جو ناظرین کی توجہ کو مطلق بھٹکنے نہ دیتے تھے۔

اس پس منظر اور روایت نے سفوکلیز کو جنم دیا۔ جس کے سن پیدائش کے بارے میں حتمی طور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم محققوں نے یہ پتا لگایا ہے کہ وہ اغلباً ۴۹۲ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ ایتھنز کے قریب کرلونس قصبے میں وہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام سوفیلس تھا۔ وہ ایک مشہور اور خوشحال صناع تھا جس کے پاس غلام بھی تھے۔ جن کی مدد سے وہ کام کرتا تھا۔ سفوکلیز نے اسی خوشحال ماحول میں پرورش پائی۔ موسیقی اور کھیلوں سے اُسے خصوصی لگاؤ تھا۔ لاپرس نامی موسیقار سے اُس نے بہت عرصے تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور جب سلامیز کی جنگ میں یونانیوں نے فتح حاصل کی تو فتح کے جشن میں لڑکوں کی ایک ٹولی نے گیت سنائے جن میں سفوکلیز بھی شامل تھا۔

سفوکلیز کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ جب اس نے المیہ ڈرامے کے باوا آدم ایسکائی لس کو اس میدان میں شکست دے کر پہلا انعام حاصل کیا۔ اس وقت ایسکائی لس کی عمر ۵۸ برس تھی۔ سفوکلیز مستقل ایتھنز میں رہنے لگا۔ وہ اہم المیہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک سفارت کار اور فوجی جرنیل بھی تھا۔ وہ انکسار اور خدا ترسی کی وجہ سے بھی خاصی شہرت رکھتا اور اس نے رفاہ عام کے سلسلے میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔

سفوکلیز کے بارے میں جو بنیادی معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ذریعہ۔ عظیم یونانی طربیہ نگار ارسٹوفینز کا کھیل "مینڈک" ہے۔ یہی وہ کھیل ہے۔ جس میں ارسٹوفینز نے سقراط کا بھی خاکہ اڑایا تھا۔ سفوکلیز کا خاکہ اُڑاتے ہوئے ارسٹوفینز ہمیں بتاتا ہے کہ سفوکلیز نے المیے کو اپنے اوپر اتنا حاوی اور مسلط کر لیا تھا کہ وہ بوڑھاپے کی عمر کے آلام مصائب کو بخوشی گلے سے لگانے پر تیار تھا۔ ارسٹوفینز اس کا خاکہ اُڑاتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ خود سفوکلیز کا اپنا بیٹا لوفون اس پر الزام لگاتا تھا۔ سفوکلیز اس قابل بھی نہیں رہا کہ اپنے ذاتی معاملات کو ہی سلجھا سکے۔ گویا وہ اپنے باپ پر نااہلی کا الزام لگا رہا تھا۔ اصل میں یہ الزام اور اس کی کہانی سچی نہیں۔ یہ تو ارسٹوفینز کا مخصوص انداز تھا کہ وہ ایسی کہانی گھڑ کر لوگوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ سسرو نے اسے سچ جان لیا اور سسرو کے بعد آنے والے اس کہانی کو سچا سمجھتے تھے۔

سفوکلیز نے کئی وجوہات کی بنا پر کئی پرانی روایات کو توڑا۔ سفوکلیز سے پہلے ڈراما نگار خود بھی اپنے ڈرامے میں اداکاری کرتا تھا۔ اس زمانے میں (بلکہ آج بھی) اور اونچی گرجدار آواز کو ڈراما کے فنکار کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ سفوکلیز کی آواز باریک اور کمزور تھی اس لیے اس نے ایک تو اس روایت کو ختم کیا کہ لکھنے والا بھی اداکاری کرے۔ پھر اس نے ڈرامے کے کورس کے ساتھ ڈرامے کے کرداروں میں بھی مزید اضافہ کیا۔ جس کا آغاز ایسکائی لس نے کیا تھا۔ اس نے اسٹیج کی آرائش اور بناوٹ میں بھی کئی تبدیلیاں کی تھیں۔ سفوکلیز کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا یونانی المیہ نگار تھا جو بعض اداکاروں کو ذہن میں رکھ کر ان کے لیے کردار تخلیق کرتا اور المیے لکھتا تھا

سو کے لگ بھگ ڈرامے سفوکلیز کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مگر اب اس کے صرف سات ڈرامے ہی مکمل صورت میں ملتے ہیں۔ اس کے مشہور زمانہ ڈراموں میں "اینٹگونی"، "ایڈی پس"، "اجاکس" اور "الیکٹرا" ہیں۔

"اینٹگونی"، "ایڈی پس" اور "الیکٹرا" نے پوری نسل انسانی کو متاثر کیا ہے۔ یہاں یہ ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ ہمارے عہد کے عظیم فرانسیسی ڈرامہ نگار ژاں انوئی نے "اینٹگونی" پر ایک کھیل لکھا۔ اسے نئی معنویت سے آشکار کیا۔ یوجین اونیل نے "الیکٹرا" کی تعلیم کو جدید کرداروں اور نئی معنویت کے ساتھ اپنے شہکار کھیل (MOURNING BECOME ELECTRA) میں برتا۔ مگر جو شہرت اس کے کھیل "ایڈی پس" کو نصیب ہوئی وہ لافانی ہے۔ اسی کھیل کے حوالے سے فرائڈ نے سفوکلیز کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور "ایڈی پس الجھاؤ" کا نظریہ بھی اسی کھیل سے اخذ کیا۔

دُنیا کی ہر زبان میں "ایڈی پس" کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کا ایک ترجمہ میری نظر سے گزرا ہے۔ مترجم شاہدہ حمید خان ہیں۔ سفوکلیز کے زمانے میں یہ کھیل خاص لوگوں کے لیے کھیلا جاتا تھا۔ عوامی سطح پر یہ کھیل پہلی بار اس کی موت (۴۰۶ ق م) کے بعد اس کے پوتے نے ۴۰۲ ق م میں پیش کیا۔

"ایڈی پس" کا ترجمہ مختلف ادوار میں کتنی بار ہوا۔ اس کو آج تک کتنی بار سٹیج پر کھیلا

گیا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو ہر زبان میں منتقل ہوا اور ہر زبان کے قاری نے اسے پڑھا۔ اسی طرح مختلف شکلوں اور زبانوں میں یہ کھیل دنیا بھر میں کھیلا گیا اور سٹیج کیا جاتا رہے گا۔

ایڈی پس پر اس کی زندگی اور تقدیر کا سب سے بڑا اور ہولناک اسرار کھل چکا ہے وہ جس نے سفنکس کی پہیلی کو بوجھ لیا تھا۔ وہی ایڈی پس اپنے مقدر کے اسرار سے پردہ اُٹھتے دیکھتا ہے تو اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے پھوڑ کر المیہ کا عظیم ترین کردار بن جاتا ہے وہ دنیا کا عجیب و غریب انسان بن چکا ہے۔ دیوتاؤں نے اس کے ساتھ بڑا ہولناک مذاق کیا ہے۔ "ایڈی پس" کے آخری منظر میں اندھا ایڈی پس کہتا ہے:

"میری بچو! کہاں ہو تم، میرے پاس آؤ۔ اپنے بھائی کے پاس جو تمہارا باپ بھی ہے۔ میرے اپنے ان ہاتھوں نے تمہارے باپ کی ان آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے جو کبھی دیکھتی تھیں، روشن تھیں۔ ہاں میں اندھا اور بے عقل تھا۔ مگر اب نہیں۔ میں تمہارا باپ بنا اور تمہاری ماں میری بھی ماں تھی۔ اگرچہ اب میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ مگر تمہارے مستقبل کو دیکھ کر میں رو رہا ہوں...... آہ تمہارے باپ نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ اس نے اس زمین میں بیج بویا جس سے خود اس نے جنم لیا تھا۔ اور پھر تمہیں جنم دیا۔ اپنے بچوں کو اپنی ماں کی ہی کوکھ سے جنم دیا...."

سفوکلیز کا المیہ ایڈی پس۔ کورس اور ہجوم کے علاوہ دس کرداروں پر مشتمل ہے۔ المیے کا مرکزی کردار ایڈی پس ہے، جوکاسٹا ہے۔ جو ایڈی پس کی ماں تھی مگر تقدیر نے اُسے اپنے ہی بیٹے کی اولاد کی بھی ماں بنا دیا۔ یادن ہے جو ملکہ جوکاسٹا کا بھائی ہے۔ امفگنی اور ازمین ہیں جو ایڈی پس اور ملکہ جوکاسٹا کی بیٹیاں ہیں۔ زیوس دیوتا کا پجاری۔ ٹائرسیاس۔ ایک اندھا الہام گو کورنتھ کا ایک قاصد۔ ایک بوڑھا چرواہا۔ ایک پیغامبر یہ کل کردار ہیں۔

جب ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے تو تھیبز تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے۔ ایک نامعلوم عذاب تھیبز کے شہریوں پر ٹوٹ پڑی ہے۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ مویشی مر رہے ہیں ہر گھر میں موت داخل ہو چکی ہے۔ لوگ دیوتاؤں کے حضور نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ گڑگڑا

رہے ہیں۔ اڈی پس تھیبز کا حکمراں تھا۔ وہ اس شہر میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کبھی داخل ہوا تھا۔ اس وقت بھی شہر مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس نے ظالم سفنکس سے تھیبز کے شہریوں کو رہائی دلائی تھی اور چونکہ اس شہر کا بادشاہ لیوس انجانے میں انہی کے ہاتھوں سے قتل ہو چکا تھا۔ لوگ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اسے دیوتا اور انسانوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ رواج کے مطابق اڈی پس۔ شاہ کی بیوی سے شادی کر لیتا ہے اور اس کی اولاد بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا دورِ حکومت خوش حالی اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ مگر اچانک یہ وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ اڈی پس کو اپنی رعایا سے اپنے بچوں کی طرح محبت ہے۔ وہ خود اس وبا کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ دیوتا اور تقدیر اس کے مقابل کھڑے ہو چکے ہیں۔

اپالو دیوتا کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ جب تک شاہ لیوس کے قاتل کو سزا نہ دی جائے گی اس وقت تک وبا نہ ٹلے گی۔ اور قاتل تھیبز میں ہی موجود ہے۔

پورے ڈرامائی عمل، تدبیر کاری، انسانی احساسات کی کش مکش اور تجسس کے عناصر کے ساتھ یہ عظیم المیہ تکمیل پاتا ہے۔ انسانی تقدیر کے اسرار کھلتے ہیں۔ یہ شاہ لیوس ہی تھا جس کا بیٹا خود اڈی پس تھا۔ یہ ملکہ جوکاسٹا ہی تھی جو اڈی پس کی ماں تھی جسے اس کی ولادت پر معلوم ہوا کہ یہ نومولود اپنے باپ کو قتل کرے گا۔ اپنی ماں سے شادی کرے گا۔ ملکہ جوکاسٹا اسے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے محل سے باہر بھجوا دیتی ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ مگر ملازم اُسے زندہ چھوڑ آتے ہیں۔ اور اڈی پس ایک چرواہے کے پاس پرورش پاتا ہے۔ پھر وہ ایک رات جوان ہو کر تھیبز آتا ہے۔ راستے میں اس کی جھڑپ گھڑسواروں سے ہو جاتی ہے۔ اس کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کا باپ شاہ لیوس اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔

تقدیر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

وہ تھیبز کے شہریوں کو سفنکس کے مظالم سے نجات دلاتا ہے۔ وہ اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنی ماں سے انجانے میں شادی کر لیتا ہے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو رہا ہے اور اب دیوتا اور تقدیر بھی یہ چاہتے ہیں کہ اس گندے اور ناپاک وجود سے تھیبز کو پاک کیا جائے اور اس کو سزا دی جائے۔ جس نے نہ اپنی تقدیر لکھی ہے نہ جان بوجھ کر ارادی طور پر کوئی گناہ

کیا ہے۔ انتہائی تجسس کے مراحل سے گزرتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے کہ جب ایڈی پس کو اپنی اصلیت اور حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ المیے کے ہیرو اور بالخصوص قدیم یونانی المیے کے ہیرو کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ارسطو نے المیے اور المیے کے کردار پر جو بحث کی ہے وہ ادبی تنقید اور انسانی نفسیات کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ المیہ کا ہیرو ایک ایسا انسان ہے جو دیوتاؤں اور تقدیر کے ہاتھوں بندھا اور جکڑا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے سے سب کچھ بتا دیا جاتا ہے کہ وہ سب کچھ کرے گا اور تقدیر ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ تقدیر کا لکھا پورا ہو سکے اور ایسا ہو کر رہتا ہے۔

المیے کے حوالے سے انسانی تقدیر کی جبریت کا اظہار ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کی مطلق العنانی سامنے آتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان تقدیر کے سامنے مجبور محض ہے۔ وہ جکڑا ہوا ہے۔ وقت اور تقدیر اس کو آن لیتے ہیں۔ وہ ان سے بچ نہیں سکتا۔ ایڈی پس میں کورس گاتا ہے

"مقیبس کے شہریو! دیکھو اس ایڈی پس کو جو دنیا کا مسرور ترین آدمی تھا۔ ہمارا بادشاہ جس کی خوش قسمتی پر سب کو رشک آتا ہے۔ مگر اسے وقت اور تقدیر نے آن لیا اور اب وہ غموں کے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔

جب المیے کا ہیرو اتنا ہی بے بس ہے۔ ان دیکھی طاقتوں اور تقدیر کا کھلونا ہے تو پھر وہ کس طرح اتنا بلند اور قدآور سمجھا جاتا ہے؟ اس کے اندر کونسی ایسی خوبی اور نیکی چھپی ہوئی ہے کہ جو اس کو عظیم بنا دیتی ہے؟

اس کے جواب کے لیے پہلے تو سفوکلیز کے ایڈی پس کا ایک ٹکڑا پڑھیے۔ ایڈی پس اپنی آنکھوں کو پھوڑ چکا ہے۔ کورس اس سے پوچھتا ہے:

"آپ نے بہت ہی بھیانک کام کیا ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو کس طرح اپنی ہی آنکھوں کی روشنی چھین لینے پر تیار کر لیا۔ کیا آپ کو کسی غیبی طاقت نے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔؟"

ایڈی پس جواب دیتا ہے۔

"میرے دوستو! وہ اپالو کی قوت تھی جس نے میرے دکھوں کو انجام تک پہنچایا۔ مگر وہ ہاتھ جنہوں نے میری آنکھوں کو اندھا کیا، میرے اپنے تھے۔"

المیے کا ہیرو میرے نزدیک ایک ایسا کردار ہے جو اپنا انجام اپنی قوتِ ارادی اور اپنے ردِ عمل سے خود انتخاب کرتا ہے۔ وہ یوں انسانی ارادے، جبر اور برتری کی علامت بن جاتا ہے بلکہ جوکاسٹا کی تقدیر میں اپنے بیٹے اور اپنے ہی شوہر کے قاتل کے بچوں کی ماں بننا لکھا تھا مگر اسے یہ کسی دیوتا نے نہ بتایا تھا کہ جب وہ انسانی رشتوں کے اس ہولناک اسرار سے واقف ہوگی تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے کر اپنی انسانیت کو چار چاند لگا دے گی ایڈی پس پر اپنی اصلیت کھل چکی ہے۔ وہ اب نہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے نہ انسانوں کو، دیوتاؤں اور تقدیر کی جبریت نے اسے جس ندامت سے دوچار کیا ہے۔ اس پر اس کا جو ردِ عمل ہے وہ ایک شریف ترین انسان اور المیے کے عظیم ہیرو کا ردِ عمل ہے۔ اور یہی وہ جوہر ہے جو المیے کے ہیرو کو ایسی قدر و قامت، برتری اور عظمت عطا کرتا ہے کہ جس کی مثال ادب کی دوسری اصناف میں نہیں ملتی۔ اور اس کا یہی ردِ عمل اور اپنی انسانیت کا اظہار ہے جو المیے کے ناظر اور قاری کی کیتھارسس کرتا ہے۔

"ایڈی پس" دنیا کے عظیم فن پاروں میں سے ایک ہے۔ ایک لافانی المیہ جو ہمیشہ ہر دور میں پڑھا اور کھیلا گیا۔ اور دنیائے ادب کا ایک لافانی اور عظیم فن پارہ۔

الیکٹرا

یوریپیڈیز کا عرصۂ حیات (اغلباً) ۴۸۵ ق م سے ۴۰۶ ق م پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب یونان کے عظیم المیہ نگاروں نے اپنے شاہکار لکھے اور پیش کیے۔ جس وقت ایسکلیز اپنے عظیم شاہکار پیش کر رہا تھا تو یوریپیڈیز جوان ہو چکا تھا۔ سفوکلیز نے اپنے عظیم شاہکار بھی اسی دور میں پیش کیے۔ یوریپیڈیز ان دونوں سے چھوٹا ہونے کے باوجود ان کا ہم عصر تھا۔ اس کے بغیر یونانی المیہ بلکہ عالمی ڈرامہ کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسکلیز، سفوکلیز اور یوریپیڈیز کے المیہ ڈراموں کا مطالعہ بے حد دلچسپی کا حامل ہے۔ ان تینوں عظیم ترین المیہ نگاروں کا زمانہ ہی ایک نہیں بلکہ ان کے موضوعات بھی ایک ہیں۔ ان کے المیہ ڈراموں کا سرچشمہ یونانی دیو مالا ہے۔ ان کے کردار بھی ایک ہیں۔ اس کے باوجود ان تینوں کا مزاج مختلف ہے، ایک ہی واقعہ، ایک جیسے کرداروں کو وہ اپنے اپنے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان تینوں کی عظمت اور فنی صلاحیتوں کا انفرادی اظہار سامنے آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سٹیج کے پردے، مناظر، کردار ادا کرنے والے اداکار تک ایک تھے۔ اس کے باوجود جب ان میں سے کسی ایک کا کھیل کھیلا گیا تو وہ دوسرے کے کھیل سے بہرحال مختلف تاثر کا حامل ثابت ہوا۔

ان نمایاں مشابہتوں اور واضح عناصر کے باوجود جب ہم یوریپیڈیز کو پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں سفوکلیز اور ایسکلیز سے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

میرے لیے یوریپیڈیز کے چند اہم ڈراموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا خاصا

مشکل تھا۔ کیونکہ میرے علم کے مطابق اس کے پانچ ایسے کھیل ہیں جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین المیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے نام ہیں۔ الیکٹرا، میڈیا، ہپولی ٹیس، آندرو ماشے اور ٹروجن ویمن یہ پانچ کھیل ایسے ہیں جو اپنی پہلی پیش کش سے اب تک صدیوں سے ہر ملک میں کھیلے جا رہے ہیں۔ یوریپیڈیز کے ان کھیلوں کا دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے میں نے "الیکٹرا" کو چند خاص وجوہات کی بنا پر چنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں جو بڑی، لازوال اور ناقابل فراموش تخلیقات لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک 'الیکٹرا' ہے۔

'الیکٹرا' کے انتخاب اور اس کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ وہ قارئین بہتر انداز میں کر سکتے ہیں جنہوں نے قدیم یونانی المیوں کے ان تینوں 'ماسٹرز' کا مطالعہ کیا ہے۔ یوں تو یوریپیڈیز کی یہ انفرادی اور امتیازی حیثیت ہے۔ اس کے عظیم پیشرو ایسکلیز اور سفوکلیز کلاسیکیت کی شان و شوکت پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ ہمیں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ بیشتر صورتوں میں عام آدمی کا تجربہ نہیں بنتا۔ بلکہ اسے میں یوں کہوں گا کہ ایسکلیز اور سفوکلیز اپنی تمام فنی عظمتوں اور بے مثل فن پاروں کے خالق کی حیثیت کے باوجود۔ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ عام آدمی کی ان تک رسائی ذرا مشکل ہے۔ پھر تراجم کے حوالے سے بھی ان دونوں 'ماسٹرز' اور یوریپیڈیز کی زبان میں جو فرق ہے وہ بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات والی جسارت ہی سمجھیے۔ لیکن کیا حقیقت نہیں کہ ایسکلیز اور سفوکلیز کی زبان بڑی شاہانہ کروفر رکھتی ہے اور اس میں جو نغمگی اور شعریت ملتی ہے وہ آج کل بہت حد تک 'باسی' لگتی ہے۔ اس کے برعکس یوریپیڈیز کی زبان عام انسانوں کی زبان کے بہت قریب ہے۔ وہ قدیم یونانی تھیٹر کے تمام تقاضوں اور پابندیوں میں گھرا ہوا اپنے المیوں کے ذریعے ہمیں یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کی اپنی بھی حدود ہیں۔ وہ اپنا خاص نقطہ نگاہ رکھتا ہے۔ ہمیں اس کے المیہ کھیلوں سے حیران کن انکشاف بھی ہوتا ہے کہ وہ ایسکلیز اور سفوکلیز کے برعکس دیومالائی کرداروں کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ ان کی زندگی میں جو المیہ جنم لیتا ہے۔ اس کی وجوہات "مذہبی" نہیں ہوتیں۔ بلکہ انسانی ہوتی ہیں

صرف یہی ایک ایسی امتیازی خوبی ہے جو یوریپیڈیز کو اس کے ہم عصروں سے الگ کردیتی ہے MOSES HADAS نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ یوریپیڈیز ایسا المیہ نگار ہے جو ہمارے بے حد قریب ہے۔ زمانہ قبل مسیح میں اپنے ہم عصروں ایسکلیز اور سفوکلیز کے ساتھ نہیں بلکہ ابسن اور برنارڈ شا کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

یوریپیڈیز کے ہاں تنقید حیات ملتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے بہت آزاد خیال اور عقلیت پسند تھا۔ وہ پہلا المیہ نگار ہے جس کے ہاں جمہوریت کے عناصر ملتے ہیں۔ وہ جمہوریت کے مفہوم کو سمجھتا ہے اور اس کو فنکارانہ انداز میں پیش بھی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سقراط کے ساتھ اس کے بہت گہرے تعلقات تھے اور سقراط کی تعلیمات کا اس کی زندگی اور اس کے فن پر بہت گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

یوریپیڈیز کے عظیم المیوں میں سے "الیکٹرا" کا انتخاب اس لیے کیا گیا اور اسے اس لیے دنیا کی سو بڑی تخلیقی کاوشوں میں شمار کیا گیا ہے کہ "الیکٹرا" وہ المیہ ہے جو نہ صرف یہ کہ یوریپیڈیز کی انفرادیت کا عظیم مظہر ہے بلکہ اس کی معنویت اور تاثیر کی وجہ سے اسے صدیوں کھیلا، پڑھا اور ان گنت ادوار میں دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ تقابلی موازنے کے حوالے سے جو بات میں نے ابتدا میں ادھوری چھوڑی تھی اب اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

'الیکٹرا' بھی اسی موضوع اور کرداروں پر لکھا گیا المیہ ہے جن پر ایسکلیز اور سفوکلیز نے بھی ڈرامے لکھے۔ ایسکلیز اور سفوکلیز کے برعکس یوریپیڈیز نے کھیل کا آغاز محل سے نہیں بلکہ ایک کسان کے جھونپڑے سے کیا ہے جو اپنی جگہ یوریپیڈیز کی ذہنی اختراع اور مخصوص زاویۂ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایسکلیز اور سفوکلیز کے ہاں یہی موضوع جب ڈرامہ بنا تو اس کے کردار بھرپور انداز کے ہیرو تھے۔ ان ہیروز میں پرانی اور طے شدہ صفات موجود تھیں۔ لیکن یوریپیڈیز کے اس کھیل میں یہ کردار محض برائے نام ہیرو بن کر جاتے ہیں۔ سفوکلیز اور ایسکلیز کے ہاں یہ کردار تجریدیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اصطلاحاً انہیں ABS TRACT TYPE کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ یہی کردار یوریپیڈیز کے ہاں اپنی پیش کش کے اعتبار سے موجودہ دور کے معیار کے قریب تر آجاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یوریپیڈیز نے ان کو خود سوچا

ہے ان کو تراشا ہے۔ ان کو ایک ایسا وجود بخشا ہے جو اس کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ پھر اس میں "الیکٹرا" کی زبان بے حد منفرد اور اہم ہے جو دوسرے دونوں 'ماسٹرز' کے بس کی بات نہیں تھی یا یسکلیز اور سفوکلیز کے ہاں الیکٹرا جس جذبے اور ردِ عمل سے تحریک لیتی ہے۔ وہ اس کی اپنے باپ کے ساتھ محبت تھی۔ جبکہ یوریپیڈیز کے ہاں وہ اپنی ماں سے حسد کرتی ہے۔ اور اس جذبے سے تحریک اور قوت حاصل کرتی ہے اور سیٹس کو بھی یوریپیڈیز نے یکسر بدل کر ایک خوفزدہ آوارہ گرد بنا دیا ہے اور پھر اس میں زیادہ واضح انداز میں یوریپیڈیز کا اپنا طرزِ فکر ملتا ہے وہ طرزِ فکر جو ایسکلیز اور سفوکلیز اور اس دور کے عام عقائد سے انحراف کا درجہ رکھتا ہے یوریپیڈیز ہمیں یہ بتاتا ہے کہ المیہ۔ اپالو کے حوالے سے رونما نہیں ہوا۔ بلکہ ان پُرفریب معتقدات کی وجہ سے ہوا جن میں یہ کردار اُلجھے ہوئے تھے!

وہ "الیکٹرا" کا کردار نہیں تھا جس سے متاثر ہو کر یوجین اونیل نے اپنا عظیم شاہکار MOURNING BECOMES ELECTRA لکھا تھا۔ بلکہ یہ یوریپیڈیز کا ہی شاہکار تھا۔ جس نے یوجین اونیل کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے اپنا عظیم ڈرامہ لکھا۔

یوریپیڈیز کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے معلومات نہیں ملتی ہیں۔ وہ سلامیز میں پیدا ہوا کہا جاتا ہے کہ وہ ٹھیک اس روز پیدا ہوا جس دن یونانیوں نے اہلِ ایران پر عظیم فتح حاصل کی تھی۔ یوریپیڈیز کا والد ایک معمولی تاجر تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے بیٹے کو معقول تعلیم دلوائی۔ ایک کاہن نے بچپن میں اس کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ اس کے سر پر سنہری تاج پہنایا جائے گا۔ یوریپیڈیز نے پہلے تو جمناسٹک میں بڑی دلچسپی لی پھر ڈرامہ نگاری کی طرف راغب ہوا۔ اغلباً اس کا پہلا کھیل ۴۵۶ ق م میں کھیلا گیا۔ اس کے کئی برس بعد اس کو اس کے کھیل پر پہلا انعام ملا۔ یوں وہ ایسکلیز اور سفوکلیز کی صف میں آ کھڑا ہوا۔

یوریپیڈیز کے ڈراموں کا طرۂ امتیاز اس کا غیر مذہبی طرزِ فکر، فلسفیانہ تفکر اور تعقل پسندی ہے۔ جس کی وجہ سے اس زمانے میں اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی کیونکہ وہ لوگوں کے اعتقادات کو سامنے نہ رکھتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دربار شاہی

کی اور دونوں بار اس کی بیویاں اسے دھوکا دے کر چلی گئیں۔

ایتھنز میں اس کے لیے ماحول ناساز گار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سقراط تو تھا نہیں کہ زہر کا جام پی لیتا۔ لیکن اس نے بھی اپنے طرزِ فکر بدلنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں جب مقدونیہ کے بادشاہ نے اسے اپنے ہاں بلوا بھیجا تو اس نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور ایتھنز چھوڑ دیا۔ مقدونیہ میں اس کی موت اس کا انتظار کر رہی تھی وہاں بھی اس کے مخالف موجود تھے۔ اور پھر اس کے کھیل "ٹروجن ودمین" کی وجہ سے مخالفت میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا۔ یوریپیڈیز طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

اس کی موت کی خبر جب ایتھنز میں پہنچی تو سفوکلیز نے اپنے انداز میں اس کی موت کا سوگ منایا اپنے ڈرامے کے کورس کے کرداروں کو ماتمی اور سیاہ لباس پہنا کر اس نے ان سے ایسے جملے کہلوائے جو ماتم اور سوگ کا اظہار کرتے تھے۔

یوریپیڈیز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نوّے یا سو کے لگ بھگ ڈرامے لکھے۔ لیکن آج دنیا میں اس کے صرف اٹھارہ ڈرامے موجود اور محفوظ ہیں۔

یوریپیڈیز۔ اپنے زمانے سے آگے کا فنکار رہے۔ اس کا ذاتی المیہ یہ تھا کہ المیہ نگاری میں اعلیٰ ترین انعام حاصل کرنے اور بے حد انفرادیت کے باوجود وہ سفوکلیز کی شہرت کے سائے تلے دبا رہا۔ حالانکہ وہ سفوکلیز جتنا بڑا المیہ نگار تھا۔ اُسے اپنے دور میں اپنے طرزِ فکر اور مذہبی آزاد خیالی کی وجہ سے بھی مخالفت کا کرنا پڑا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں اس کی عظمت اور رتبے کا استحکام ہوا وہاں یوریپیڈیز کو بھی اصلی مقام مل گیا۔ آج کی دنیا میں ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود وہ ہمارے قریب ہے جدید ہے اور ڈرامے کے بہت سے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

جرمنی میں جب شیلگل جیسے نقاد اور مفکر نے یوریپیڈیز کو جرمنی زبان میں منتقل کیا تو یوریپیڈیز کی صحیح شناخت ہوئی اور اسے اس کا صحیح مقام مل گیا۔ شیلگل نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"بہت کم مصنفوں میں یہ صلاحیت رہی ہے کہ وہ بدی اور نیکی کو یکساں سطح پر پیش کر

سکیں۔ یوریپیڈیز ایسا ہی باصلاحیت فنکار تھا۔ یہ خوبی صرف اور صرف یوریپیڈیز کے ہاں ہی ملتی ہے کہ اس کے ہاں بے انتہا خوب صورتی اور مثبت ابتذال ایک سطح پہ ملتے ہیں۔"

"الیکٹرا" کی تلخیص۔

پہلا منظر ایک مکان کے جھونپڑے کا ہے۔ یہ مکان سارے المیے کے پس منظر اور اس کے کرداروں سے متعارف کراتا ہے وہ بتاتا ہے کہ کس طرح ٹرائے کی جنگ شروع ہوئی شاہ اگیممنان ساری یونانی فوجوں کا کمانڈر چنا گیا۔ ہیلن جسے پیرس اغوا کر کے ٹرائے لے گیا تھا۔ اگیممنان کے بھائی کی بیوی اور اس کی اپنی بیوی کلائیٹمنسٹرا کی بہن تھی۔ جب وہ جنگ میں مصروف تھا تو اس کا اپنا گھر اس کی بیوی کی بے وفائی اور ایجس تھیس کی غداری نے تباہ کر دیا۔ جب فاتح اگیممنان واپس آیا تو اس کی بیوی کلائیٹمنسٹرا نے اس کو قتل کر کے اپنے عاشق کو بادشاہ بنا دیا۔ اگیممنان کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اورسٹیس اور لڑکی الیکٹرا۔ جب اورسٹیس کی جان کو خطرہ لاحق ہوا تو ان کا قدیم معلم اسے بھگا لے گیا۔ تاکہ ایجس تھیس اسے قتل نہ کرا دے۔ الیکٹرا اپنے باپ کے محل میں رہی جہاں اس کی ماں نے اس کے باپ کو ایجس تھیس کے ساتھ مل کر ہلاک کر دیا تھا۔ الیکٹرا کی جوانی کے دنوں میں ہی اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ لیکن ایجس تھیس خوف زدہ تھا کہ اگر الیکٹرا کی شادی کسی نامور شخص سے ہو گئی تو وہ اس سے انتقام لے گی۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ اچھے خاندان کے فرد کے بچوں کی ماں بنی تو وہ ان کو بھی یہ تربیت دے گی کہ ایجس تھیس سے انتقام لیا جائے۔ اس لیے اس نے اس کی کہیں شادی نہ ہونے دی۔ الیکٹرا کی ماں کلائیٹمنسٹرا شفیق القلب اور نادم تھی کہ اس کے ہاتھ اپنے خاوند کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کو قتل کرنے سے ہچکچاتی تھی۔ اورسٹیس تو اس کے نزدیک گم ہو چکا تھا۔ الیکٹرا کو قتل کر کے وہ اپنے لیے مزید رسوائی کا سامان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ایجس تھیس نے اس شخص کے لیے بھاری انعام مقرر کر رکھا تھا جو اورسٹیس کو قتل کر دے اور اس نے الیکٹرا کو میرے سپرد کر دیا کہ وہ میری بیوی بن جائے۔ اگرچہ میرا بھی خاندان حسب نسب کے اعتبار سے اچھا ہے لیکن میں غریب ہوں۔ غربت ہو تو پھر صحیح النسبی بھی برقرار

نہیں رہتی۔

ایجس تھیس نے تو الیکٹرا کو زبردستی میری بیوی اس لیے بنایا کہ میں کمزور اور نادار ہوں میرے دست و بازو کمزور ہیں۔ میں اور مجھ سے پیدا ہونے والی اولاد اس سے بدلہ نہ چکا سکے گی۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے الیکٹرا کے بستر کو کبھی شرمندہ نہ کیا۔ مقدس دیوتا میرے گواہ ہیں کہ الیکٹرا ابھی تک کنواری ہے۔ میں اسے ایک باعث ندامت فعل سمجھتا ہوں کہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں تو اپنے نام کے رشتے دار اورسٹیس کا خیال کر کے ہی غمزدہ ہو جاتا ہوں کہ جب وہ کبھی زندہ سلامت آرگوس واپس آئے گا تو اپنی بہن کو اس ناداری اور غربت کے عالم میں دیکھ کر کتنا ناخوش و رنجور ہوگا۔

الیکٹرا اسٹیج پر آتی ہے اس کا سر اس دور کی غلام عورتوں کی طرح منڈا ہوا ہے۔ اس نے پانی کا ایک برتن اٹھا رکھا ہے۔ پورے کھیل میں وہ خود کلامی کرتی ہوئی رہتی ہے۔ جب وہ اس منظر میں داخل ہوتی ہے تو اس وقت بھی اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

"جب رات کالی ہو جاتی ہے تو میں یہ بھاری برتن اٹھا کر چشمے سے پانی لینے جاتی ہوں اگرچہ مجھے اس پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لیکن میں دیوتاؤں کے سامنے فریاد کرتی رہوں گی۔ جس نے میرے باپ کو قتل کیا اس نے مجھے میرے باپ کے محل سے نکال دیا۔ اس نے ایجس تھیس کے بچے جنے ہیں اور مجھے اور میرے بھائی کو تو ایک بھول جانے والا حادثہ سمجھتی ہے۔۔۔۔"

کسان اسے کہتا ہے کہ وہ آخر اتنی مشقت کیوں کرتی ہے۔ الیکٹرا بتاتی ہے کہ وہ کسان کو اپنا دوست سمجھتی ہے جو ایک شفیق اور مہربان دل رکھتا ہے۔ اس نے اس کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ "تمہیں گھر کے باہر بہت محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔ میں تمہارا بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ جب ایک کسان کھیتوں سے واپس آتا ہے تو اسے اس سے بڑا آرام ملتا ہے کہ گھر میں ہر چیز موجود ہے اور گھر میں سارا کام ہو چکا ہے۔" کسان اسے کہتا ہے کہ اب وہ گھر کے اندر جائے۔ رات کا آخری پہر ہے۔ وہ مویشیوں کو لے کر کھیتوں کو جا رہا ہے۔ "کوئی بھی سست آدمی اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتا خواہ اس پہ دیوتا کتنے ہی مہربان کیوں نہ ہوں روزی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

اورلیسٹس اور پیلاڈ یا سٹیج پر آتے ہیں۔ پیلاڈیس اورلیسٹس کا سچا دوست ہے۔ جس نے جلاوطنی میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ اب وہ چوری چھپے اس علاقے میں داخل ہوا ہے تاکہ اپنی بہن کو تلاش کرے۔ آرگوس کے اندرونی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو کر اپنے باپ شاہ اگیممنان کے قتل کا بدلہ لے سکے۔

الیکٹرا خود کلامی میں خود جھونپڑے کی طرف جا رہی ہے کہ دوسری غلام لڑکیاں اسے ایک جشن میں رقص کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ الیکٹرا ان سے کہتی ہے "میں آرگوس کی لڑکیوں کے ساتھ کیسے ناچ سکتی ہوں۔ میں آنسو بہا کر رات گزارتی ہوں اور دن بھی آنسو بہاتے گزرتے ہیں۔ میرے لباس کو دیکھو جو چیتھڑوں سے بدتر ہے۔ کیا یہ لباس اس شاہ اگیممنان کی بیٹی کا ہو سکتا ہے جس نے ٹرائے پر چڑھائی کی اور اُسے فتح کیا..."

اورلیسٹس اور الیکٹرا۔ بھائی بہنوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ چونکہ مدتوں سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے۔ الیکٹرا اسے اپنی بپتا سناتی ہے کیونکہ اورلیسٹس اسے یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ اس کے بھائی کا قاصد اور پیغامبر ہے۔ اسے یہاں کے حالات جاننے اور تمہاری تلاش میں بھیجا گیا ہے۔

الیکٹرا ہرا پنے بھائی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ اور اس کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ یہ خبر سن کر نہال ہو جاتی ہے کہ اس کا بھائی اورلیسٹس زندہ ہے۔ وہ تفصیل سے اپنے مصائب کا اظہار کرتی ہے۔ وہ کسان کے بارے میں بھی آگاہ کرتی ہے اور اورلیسٹس کسان کی نیکی سے بے حد خوش ہوتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے۔

اورلیسٹس اس سے پوچھتا ہے "تم جن مصیبتوں اور آلام سے گزر رہی ہو" کیا اس سے تمہاری ماں دکھی نہیں ہے؟" الیکٹرا جواب دیتی ہے۔

"بیویاں اپنے شوہروں کی دوست ہوتی ہیں اپنے بچوں کی نہیں۔" اورلیسٹس پوچھتا ہے کیا تمہاری ماں کا خاوند اور تمہارے باپ کا قاتل جانتا ہے کہ تم ابھی کنواری ہو۔ الیکٹرا جواب دیتی ہے "اسے اس کی کچھ خبر نہیں۔ میں نے یہ راز اُس سے چھپا رکھا ہے سب سے...." اورلیسٹس پوچھتا ہے اگر تمہارا بھائی واپس آجائے تو وہ کس طرح اپنے باپ کے

قاتل کو ہلاک کر سکتا ہے۔ الیکٹرا کے پاس اس کا جواب موجود ہے۔
"جرأت اور بہادری سے" ایسی جرأت سے کام لے کر جس سے ہمارے دشمنوں نے کام لے کر میرے باپ کو قتل کر دیا۔"
اوریسٹس اس سے سوال کرتا ہے "کیا تم بھی یہ جرأت کرو گی کہ اپنے بھائی کے ساتھ اپنی ماں کو قتل کر سکو۔" الیکٹرا جواب دیتی ہے "ہاں بلکہ میں اس کلہاڑے سے اپنی ماں کو ہلاک کروں گی جس سے اس نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔"
اوریسٹس:- کیا تم واقعی یہ فیصلہ کر چکی ہو۔ کیا میں تمہارے بھائی کو یہ بھی بتا دوں؟
الیکٹرا:- میں تو زندہ ہی اس لیے ہوں کہ اپنی ماں کا خون بہاؤں پھر بے شک مر جاؤں۔"
الیکٹرا اپنے بھائی کو بلانا چاہتی ہے۔ اُسے ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کے سامنے اس کا بھائی ہے وہ اُسے کہتی ہے "میرے بھائی کو میری بدنصیبی کی داستان سنا دینا۔ اسے بتانا کہ ہم دونوں کو کس طرح ذلیل کیا گیا۔ اسے بتانا کہ میں نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُسے اس غلاظت کے بارے میں بتانا جس میں میں کھڑی ہوں۔ جس طرح کے گھر میں میں رہتی ہوں اُسے بتا دینا۔ میں جو محلوں میں پلی تھی، خاک اور گندگی میں رُل رہی ہوں اور ہر میری ماں ہے جس نے میرے باپ سے بے وفائی کی اُسے قتل کیا۔ وہ محل میں تخت پر بیٹھتی ہے۔ اس کے ارد گرد کنیزوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ وہ کنیزیں ہیں جنہیں میرے باپ نے ملک فتح کر کے کنیزیں بنایا تھا۔ وہ مجھ سے کہیں بہتر لباس پہنتی ہیں۔ اسے بتانا کہ ہمارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کس طرح کی جاتی ہے۔ شراب اور اقتدار کے نشے میں چور راتوں کو وہ ہمارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کرنے جاتا ہے۔ وہ اس کی قبر کو لتاڑتا ہے۔ پھر وہ چیختا ہے "کہاں ہے وہ لونڈا اوریسٹس اسے اپنے باپ کی قبر کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے آنا چاہیے۔ تاکہ میں بھی دیکھوں کہ وہ کتنا بہادر ہے۔"
کسان بھی آجاتا ہے وہ غریب ہے لیکن عظیم انسان ہے۔ مہمان نواز، غربت و ناداری کے باوجود وہ اوریسٹس اور پلاڈیز کو اپنے گھر کے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔

الیکٹرا اُسے ملامت بھی کرتی ہے کہ وہ کس برتے پر ان معززین کو اپنے جھونپڑے میں بلا رہا ہے اور ان کے سامنے خاطر تواضع کے لیے کیا رکھے گا! لیکن وہ اصرار سے مہمانوں کو اپنے گھر لے جاتا ہے اور یسٹس اس غریب کی عظمت کو سراہتا ہے

یہ ہے وہ آدمی جو اس لیے بڑا نہیں کہ وہ دولت مند ہے اور محل میں رہتا ہے یہ تو ایک عام آدمی ہے۔ عام آدمیوں میں سے ایک لیکن یہی آدمی صحیح معنوں میں ایک مہذب اور شریف آدمی ہے کیا تم اس شخص سے دانائی کی بات نہ سیکھو گے۔ آدمیوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے ان کے حسب نسب اور دولت کو نہ دیکھو بلکہ اس کے کردار کو سامنے رکھو۔"

الیکٹرا مہمانوں کو چھوڑ کر گاؤں کے ایک آدمی کے ذریعے اپنے پرانے معلم کو بلوا بھیجتی ہے۔ وہ اسے یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہے کہ اوریسٹس زندہ ہے اور اس کا قاصد آیا ہے۔ معلم آتا ہے۔ دونوں میں بات چیت ہوتی ہے۔ پھر معلم اوریسٹس کو پہچان لیتا ہے کہ یہ قاصد نہیں خود اوریسٹس ہے۔ یوں دونوں بھائی بہنوں کا ملاپ ہو جاتا ہے۔

اب وہ اپنی ماں کلائٹمنسٹرا اور اس کے نئے خاوند ایجس تھیس کے قتل کا منصوبہ بناتے ہیں معلم انہیں بتاتا ہے کہ یہ موقع بہت اچھا ہے ایجس تھیس ایک خاص قربانی دینے کے لیے ادھر آیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ صرف غلام ہیں جو مزاحمت نہیں کریں گے اوریسٹس اور پیلاڈیس اس کے قتل کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ادھر الیکٹرا بھی ایک چال چلتی ہے وہ معلم سے کہتی ہے کہ وہ محل میں جا کر اس کی ماں کو اطلاع دے کہ اس کی بیٹی نے ایک بچے کو جنم دیا ہے وہ بچہ دیکھنے ضرور آئے گی اور اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

اوریسٹس اور پیلاڈیس اپنی مہم پر نکل جاتے ہیں۔ معلم ملکہ کو اطلاع دینے روانہ ہو جاتا ہے اوریسٹس قربانی دیتے ہوئے ایجس تھیس کو قتل کر دیتا ہے۔ غلام کچھ حرکت کرتے ہیں تو وہ انہیں بتاتا ہے کہ وہ ان کے اصل مالک اور بادشاہ اگیممنان کا بیٹا اوریسٹس ہے غلام مزاحمت ترک کر دیتے ہیں۔

الیکٹرا کو خیال گزرتا ہے کہ اس کا بھائی مارا گیا ہے۔ ایجس تھیس نے اسے ہلاک کر دیا ہے لیکن جب وہ مایوسی کے لمحے میں خود کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والی ہوتی ہے تو قاصد آجاتا ہے وہ پوری تفصیل سے خبر دیتا ہے کہ اوریسٹس کامران رہا ہے۔ ایجس تھیس مارا گیا۔ پیلاڈیس اور اوریسٹس واپس آرہے ہیں۔ اوریسٹس واپس آتا ہے وہ اپنے ساتھ ایجس تھیس کی لاش بھی لے آیا ہے الیکٹرا اس لاش کو مخاطب کر کے ایک طویل تقریر کرتی ہے وہ کہتی ہے:۔

"تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ میرے باپ سے محروم کر کے مجھے یتیم بنا دیا۔ ہم نے تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑا تھا تم نے شرمناک طریقے سے میری ماں سے شادی کی اور اس کے خاوند کو قتل کر دیا۔ تم اس فوج میں شامل نہ ہوئے جس نے ٹرائے کو فتح کیا اور جس کا سربراہ میرا عظیم باپ تھا۔ تم نے میرے باپ کی بیوی کو ورغلایا پھر جبراً اس سے شادی کی۔ کاش تمہیں کوئی بتا سکتا کہ جس عورت نے پہلے اپنے شوہر سے بے وفائی کی وہ تمہارے ساتھ بھی وفا نہ کرتی تھی۔ تم جانتے تھے کہ تم نے ایک ناپاک شادی کی ہے اور میری ماں جانتی تھی کہ اس کا خاوند ایک بدمعاش ہے۔ تم دونوں برائی کے پتلے اور ایک دوسرے کے شر کے زیر اثر تھے۔ تم نے اس کا شر اپنایا اور اس نے تمہارا گناہ سارے ملک میں لوگ تمہیں کلائٹمنسٹرا کا خاوند کہہ کر پکارتے تھے۔ اسے کوئی ایجس تھیس کی بیوی نہ کہتا تھا اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے گھر پر مرد کی بجائے عورت کا راج ہے۔

تم نے دھوکا کھایا اور کبھی اس دھوکے کا تمہیں احساس نہ ہوا تم اپنی دولت کی وجہ سمجھتے تھے کہ تم بھی کچھ ہو لیکن دولت تو عارضی رفاقت کی طرح ہوتی ہے۔ دولت نہیں کردار پائیدار ہوتا ہے۔ کردار شر کو رفع کرتا ہے۔ دولت بے انصافی پیدا کرتی ہے۔"

ایجس تھیس کی لاش کو وہ اپنے جھونپڑے کے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں۔ اب وہ اپنی ماں کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ اوریسٹس جو ابھی ابھی ایجس تھیس کو قتل کر کے آیا ہے وہ اپنی ماں کو قتل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ الیکٹرا اسے کہتی ہے کہ وہ بزدل نہ بنے اور اس کے ساتھ مل کر اس عورت کو قتل کر دے جو ان کی ماں اور ان کے باپ

کی قاتل ہے۔

جب کلائٹمنسٹرا کی سواری آتی ہے تو الیکٹرا جھونپڑے کے اندر جا کر چھپ جاتا ہے ماں بیٹی کے درمیان بڑی تلخ اور طنزیہ گفتگو ہوتی ہے۔ الیکٹرا اپنی ماں سے کہتی ہے کہ وہ بھی تو ایک غلام ہے۔ کیا وہ اس کا ہاتھ کنیز کی طرح تھام کر اسے اندر لے جاسکتی ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی باندیاں یہ فرض ادا کریں گی۔ الیکٹرا کہتی ہے۔ "لیکن کیوں؟ کیا میں بھی ایک غلام نہیں ہوں جسے اس کے گھر سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ جب میرے گھر پر غیروں نے قبضہ کیا تو مجھے بھی باندی بنا دیا گیا ایسا کیوں ہوا!

کلائٹمنسٹرا ایک طویل وضاحت پیش کرتی ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے باپ کی وجہ سے ہوا جس نے اس سے اس کی بڑی بیٹی کو اس لیے چھین لیا کہ وہ اس کی شادی ایکلیز سے کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے اسے قربان کر دیا۔ جس سے نہ اس کے گھرانے کو فائدہ پہنچتا تھا نہ کسی اور کو۔ اس نے میری بیٹی کو ہلاک کر دیا۔

صرف ایک شہر فتح کرنے کے لیے ایک مرتبان نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ وہ لڑائی کی فتح کے بعد ہیلن کو بھی اپنے ساتھ میری سوکن بنا کرلے آیا۔" بے شک عورتیں احمق ہوتی ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتی لیکن جب ایک شوہر اپنی بیوی سے بے وفائی کرے تو پھر بیوی بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اس سے بے وفائی کرتی ہے لوگ عورتوں کو مجرم قرار دیتے ہیں لیکن اصل مجرم تو مرد ہے جو عورتوں کو بے وفائی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اپنی ماں کے دلائل اور وضاحتوں سے الیکٹرا کی تشفی نہیں ہوتی۔ وہ اس کا جواب دیتی ہے۔

" اے میری ماں کاش تیرا دل اچھا ہوتا۔ تم اتنی حسین ہو کہ تمہاری تعریف کرنی پڑتی ہے۔ تم اور ہیلن دونوں بہنیں حسن میں یکتا ہو۔ دونوں کے کتنے ہی طلب گار ہوں گے لیکن تم دونوں بدکار نکلیں۔ وہ اپنی مرضی سے اغوا ہوئی اور اپنی رضامندی سے اپنی عفت لٹا بیٹھی پھر تم نے اپنا ڈھونگ رچایا اور بہانہ کیا کہ چونکہ میرے باپ نے اپنی بیٹی کو فتح کے لیے قربان کیا تھا اس لیے تم نے بیٹی کے دکھ میں اسے قتل کرایا تم کیوں بھول جاتی

ہو کر ابھی میرے باپ کو جنگ پر گئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ تم نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مینڈھیاں سنوارنا شروع کر دی تھیں۔ وہ عورت جو اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں بناؤ سنگھار کرتی ہے وہ اپنی ہوس کا اظہار کرتی ہے۔ اور یہی تم نے کیا جب ٹرائے والوں کے بارے میں خبریں آئی تھیں کہ وہ میرے باپ کی فوجوں کو پچھاڑ رہے ہیں تو تم خوش ہوئی تھیں تم نے ایجس تھیس کو اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ تم یہ چاہتی ہی نہیں تھیں کہ تمہارا خاوند اور میرا باپ لڑائی سے زندہ واپس آئے۔ حالانکہ وہ ایجس تھیس سے کہیں اچھا شوہر اور مرد تھا۔ اچھا اگر تم کہتی ہو کہ ہمارے باپ نے تمہاری ایک بچی کو قتل کرایا تو میں نے یا اورسیٹس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ ؟ تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا۔ ایک اجنبی کو اپنے گھر میں لے آئیں۔ تم نے ہماری قیمت ادا کر کے اپنے عاشق کو حاصل کیا جلا وطن تمہارا عاشق نہیں بلکہ تمہارا بیٹا ہوا تمہارا عاشق قتل نہیں ہوا بلکہ میں قتل کر دی گئی ہوں اگرچہ زندہ ہوں لیکن ہلاک ہو چکی ہوں اگر خون کا بدلہ خون ہے تو پھر مجھے اور اورسیٹس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہیں قتل کر کے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لیں اگر تمہارا رویہ درست تھا تو پھر یہ بھی درست ہے

کلائٹمنسٹرا اسے کہتی ہے کہ تم ہمیشہ سے اپنے باپ کی طرف دار رہی ہو میں تمہیں معاف کرتی ہوں جو کچھ ہوا میں بھی اس پر خوش نہیں ہوں " وہ موضوع بدلتی ہے۔ اس کے بچے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ الیکٹرا جھوٹ بولتی ہے کہ بچہ اندر ہے اور اس کی پیدائش کی رسمیں ادا نہ ہو سکیں اس لیے اس نے بلایا تھا ۔ یوں وہ حیلے بہانے سے اپنی ماں کو جھونپڑے کے اندر لے جاتی ہے۔ پھر کلائٹمنسٹرا چیختی ہے۔ اس کی آواز باہر تک آتی ہے ۔

"میرے بچو! مجھے قتل نہ کرو۔

اورسیٹس اور الیکٹرا اس کی ایک نہیں سنتے اسے قتل کر دیتے ہیں جب وہ سٹیج پر سامنے آتے ہیں تو دونوں پشیمان ہیں۔ الیکٹرا کہتی ہے۔" میرا غصہ اتنا بھڑکا کہ میں نے اسے قتل کر دیا جو میری ماں تھی اور میں جس کی بیٹی ہوں۔ اورسیٹس کہتا ہے میں

ہچکچا رہا تھا۔ میں اپنی ماں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن تم نے مجھے دغلایا طیش دلایا مجبور کردیا آہ میری ماں کے وہ نرم و نازک اعضا۔ وہ اس کا کٹا ہوا جسم اور تم۔

اورلیسٹس چیخ اٹھتا ہے "میری ماں کے اعضا اور اس کے جسم کو ڈھانپ دو تم نے جن بچوں کو جنا تھا وہی تیرے قاتل بن گئے۔

جب وہ پشیمانی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں آسمان پر کاسٹر اور پولیکس نمودار ہوتے ہیں جو دونوں دیوتا ہیں۔ اور ان کی ماں کے رشتے دار تھے۔ کاسٹر اپنا اور پولیکس کا تعارف کراتا ہے پھر کہتا ہے۔

"اب قسمت اور زیوس نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا ہے وہ تمہیں قبول کرنا ہے۔ پیلاڈس الیکٹرا کو اپنی بیوی بنا کر اپنے وطن اپنے گھر لے جائے۔ الیکٹرا تم کبھی اپنے وطن واپس نہ آسکوگی۔ اپنی ماں کے خون کے دھبے لے کر اس شہر کی گلیوں میں تم نہیں نکل سکتی ہو۔ ایجس تھیس کی لاش کو آرگوس کے لوگ دفنا دیں گے۔

تمہاری ماں کی تدفین ہیلن اور اس کا خاوند مینلیوس کریں گے۔ ٹرائے میں جو کچھ ہوا اور تم نے جو کچھ کیا وہ سب دیوتاؤں کی مرضی پر ہوا۔ الیکٹرا اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"نہیں نہ تو اپالو نے نہ ہی کسی دیوتا نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی ماں کو ہلاک کر دوں اورلیسٹس کو دکھ ہوا کہ اپنی جس بہن سے وہ اتنی مدت کے بعد ملا وہ اتنی جلد ہی اس سے جدا ہو رہی ہے۔ کبھی نہ ملنے کو الیکٹرا کو وطن چھوڑنے کا غم ہے۔

یوں وہ بہن بھائی بچھڑ جاتے ہیں اور لیسٹس کو ایک غیر جانبدار عدالت کے سامنے اپنی ماں کے قتل کے جرم میں پیش ہونا ہے۔ دیوتا اسے نوید دیتے ہیں کہ وہ مقدس شہر میں بلوایا جائے گا۔

الیکٹرا کہتی ہے۔ الوداع۔ میرے شہر۔ الوداع میرے شہر کی عورتو۔ میں جا رہی ہوں۔ میری نرم پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہیں۔

کالی داس

16

شکنتلا

ڈرامے کا فن بہت قدیم ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے کہ مختلف ممالک میں ڈرامے اور تھیٹر کا آغاز کس طرح ہوا اور کون سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آج کہاں پہنچ گیا ہے قدیم عہد کے جن ڈراموں کا شہرہ ساری دنیا میں ہے ان میں ایک کھیل کالی داس کا ہے اور اس کا نام شکنتلا ہے۔ کالی داس کی "شکنتلا" کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو سنسکرت میں لکھا گیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کی ساری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کھیل کا موازنہ یورپی زبانوں کے قدیم اور مشہور المیوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کھیل کا ایک اپنا مزاج ہے اور اپنا ماحول اس کے باوجود شکنتلا میں ایک ایسی آفاقیت اور انسانیت ہے جس نے اس ڈرامے کو قدیم یورپی زبانوں کے ڈراموں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

کالی داس کے بارے میں جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ بہت مختصر اور ناکافی ہیں۔ بعض بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے دراصل اپنے کام کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کرتے ہیں اور کالی داس بھی انہی میں سے ایک ہے۔ کالی داس کا شمار دنیا کے چند بڑے شاعروں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دونوں شاہکار "شکنتلا" اور "میگھ دوت" عظیم شاعری کے بے مثل فن پارے شامل ہیں۔

"میگھ دوت" ہجر و فراق کی وہ شاعری ہے جو صرف ایشیا اور مشرق سے ہی مخصوص ہے اس میں شاعر بادلوں کو اپنا قاصد بناتا ہے اور ان کے ذریعے اپنے محبوب تک اپنے ہجر کا

احوال بیان کرکے سرخرہ ہوتا ہے۔ میگھ دوت کی شاعری میں ایسا سوز ہے۔ ایسا درد ہے جو دنیا کی بڑی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ کالی داس کے میگھ دوت کو پڑھتے ہوئے اگر مولوی غلام رسول کی چھٹیاں یاد آجائیں تو جان لیجیے کہ دنیا کی ہر زبان میں صدیوں کے فاصلوں کے باوجود بڑے شاعر ہجر و فراق کے ایسے تجربوں سے گذرتے رہے ہیں جنہوں نے پوری دنیا کے ان انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے جنہوں نے ہجر و فراق کے دکھ سہے ہیں۔

...ــــ...

شکنتلا کالی داس کا وہ شاہکار ہے جس کے بارے میں گوئٹے نے کہا تھا،

"کیا تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا نام ہو جس میں سال کے اولین پھول اور آخری اثمار اور وہ تمام چیزیں جن سے روح مسحور، محفوظ اور سیراب ہوتی ہے اور آسمان اور زمین سبھی سما جائیں۔ تو پھر شکنتلا تیرا نام لینا کافی ہے۔"

"ابھگیان شکنتلا" کا انگریزی میں جو مستند ترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے وہ رائیڈر کا ہے اردو میں سب سے اچھا ترجمہ قدسیہ زیدی نے کیا ہے اور اس کے لیے وہ خصوصی داد کی مستحق ہیں۔ شکنتلا کے تعارف کے لیے میں نے جو ٹکڑے لیے ہیں وہ قدسیہ زیدی کے ہی ترجمہ کا حصہ ہیں۔

شکنتلا میں بھی یونانی المیوں کی طرح دیوتا بھرپور اور فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تقدیر بنانے والے ہیں۔ ان کے "شراپ" اور ان کی دعا سے انسانوں کی قسمتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ شکنتلا کے ہاتھ کی انگوٹھی کھو جاتی ہے تو اس کے محبوب راجہ دشینت کا حافظہ بھی کھو جاتا ہے۔ یوں ایک ایسا المیہ جنم لیتا ہے جس کے خالق دیوتا ہیں لیکن جیسا کہ یونانی المیوں کے کردار دیوتاؤں کے غیظ و غضب اور تقدیر سازی کا شکار ہونے کے باوجود کٹھ پتلی نہیں بنتے بلکہ اپنی انسانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح شکنتلا کے کردار بھی اپنے انسان ہونے کا بیّن ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہ شکنتلا جو بن کٹیا میں پلی اور رہتی ہے ان معدودے چند کرداروں میں سے ایک ہے جن کے بارے میں بڑے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی ذہن نے اتنے نرم و نازک

اور حسین کردار بہت کم تخلیق کیے ہیں۔ شکنتلا کا حسن اس کی معصومیت اس کی سادگی و پرکاری غالب کے اس شعر میں ملتی ہے۔ ؎

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شکنتلا کا حسن معصومیت میں بھی ایسی جرأت آزمائی کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی مثال دنیائے ادب میں خال خال ہی ملتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج تک جتنی اداکاراؤں نے سٹیج پر یا فلم میں (دی شانتا رام کی فلم شکنتلا میں جے شری) شکنتلا کا روپ دھارنے کی کوشش کی ہے اپنی شاندار خلاقانہ ذہانت کے باوجود اس شکنتلا کا عکس نہیں بن سکتی جس کا خالق کالی داس ہے کالی داس نے اپنے بے پناہ تخیل سے الفاظ میں جو چتر کاری کی ہے وہ دنیا کی مخلوق ہونے کے باوجود دنیائے ماورا سے نظر آتی ہے۔

راجہ دشینت جب پہلی بار شکنتلا کو بن میں دیکھتا ہے تو وہ ایک ایسا منظر ہے جو کبھی بھلائے نہیں بھول سکتا۔ راجہ دشینت شکنتلا کو ایک خاص حالت میں دیکھنے کے بعد اپنے آپ سے یوں کہتا ہے۔

"اس کے سینے پر بندھی ہوئی چھال اس کے جوبن کو اس طرح چھپا رہی ہے جیسے کوئی کسی حسین غنچے کو پیلے پیلے پتوں میں چھپا کر اس کے حسن کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ یہ بل کل کی چولی تو اس کے قابل نہیں پھر بھی اس کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔ بھلا بے کس کھلی ہوئی رکھلتی کا اپنی سطح سے باہر نکلا ہوا ڈنٹھل بھی برا لگتا ہے اور کائی کے گھر جانے پر بے کس کنول کا حسن کم ہوا ہے کیا چاند کا داغ چاند کی خوب صورتی کو دوچند نہیں کر دیتا۔ اس طرح یہ بل کے کپڑوں میں اور بھی حسین معلوم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن والے کچھ بھی پہنیں ہیں۔ ان پر پھبنے لگتا ہے۔"

کالی داس کی یہ شکنتلا جو بن کٹیا میں پلتی ہے جو دیوی ہے۔ دشینت اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یہ عشق یک طرفہ نہیں ہے محبت کی یہی آگ شکنتلا کے دل کو بھی گرماتی ہے۔

دشنیت اس سے اپنا آپ چھپاتا ہے وہ تو شکنتلا کے روپ کو ہی دیکھ کر اس کو اپنا نے پتنی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

شکنتلا میں وہ منظر بھی تو ایک ایسا منظر ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ منظر ہے جس میں دشنیت دیکھتا ہے کہ ایک کالا بھونرا کس ڈھٹائی سے شکنتلا کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ شکنتلا اس بھونرے سے تنگ آ چکی اپنی سکھیوں سے کہتی ہے۔

"یہ بدتمیز بھونرا نہیں ٹلے گا۔ میں ہی یہاں سے ہٹ جاؤں۔ ارے ارے یہ تو یہاں بھی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اب کیا کروں۔ ہائے سکھیو۔ مجھے اس دشٹ بھونرے سے بچاؤ۔"

اس منظر کے دُہرے معنی ہیں۔ دنیا کا حسین پھول اور اس پر منڈلانے والا بھونرا اور پھر دشنیت بھی تو اس وقت شکنتلا کے لیے بھونرا بن کر ہی وہاں چھپا کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔

نرم و نازک جذبات بہت ہی عام خیالات اور احساسات اعمال اور ردعمل پر مبنی یہ کھیل انسانی جذبات کا ایک بے مثال مرقع ہے۔ تقدیر اور دیوتا اپنا دار کرتے ہیں۔ دیومالا اور مذہب کے حوالے سے بھی اس میں جو بعض دیگر شہرہ آفاق واقعات کے ساتھ مشابہت ہے۔ وہ اپنی جگہ خاص معنویت رکھتی ہے۔

شکنتلا کی وہ انگوٹھی گم ہو جاتی ہے جو اسے راجہ دشنیت نے دی تھی جو اس کے اور راجہ دشنیت کی شادی اور بندھن کا ثبوت ہے۔ اس کے کھو جانے اور راجہ کی یادداشت مٹ جانے کے درمیان دیوتاؤں کی مرضی شامل ہے اور یوں ہجر کا دور شروع ہو جاتا ہے حضرت سلیمانؑ کے حوالے سے بھی ایک روایت ہے کہ ان کی خاص انگوٹھی گم ہو جاتی ہے اور پھر انہیں بادشاہت سے محروم ہو کر بارہ برس بھاڑ جھونکنا پڑتا ہے اور پھر یہ انگوٹھی جو حضرت سلیمانؑ کی ہے۔ وہ بھی مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوتی ہے اور جو انگوٹھی شکنتلا کی انگلی سے نکل کر گرتی ہے وہ بھی مچھلی کے پیٹ سے ہی نکلتی ہے انسانی تصورات اور خیالات میں جو عالمگیر اشتراک اور مساوات پائی جاتی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے کہ جس پر جتنا زیادہ کام ہو

سکے اتنا ہی انسانوں کے لیے انسانی زندگی اور اس دنیا کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے اور انسان انسان کے زیادہ قریب آ سکتا ہے۔

...—...

سنسکرت اور ہندی ڈرامے اور شاعری کا ایک خاص دوڑ ایسا ہے جو اسے دوسری زبانوں کے ادب میں خاص مقام دلاتا ہے۔ یہاں صرف مرد ہی عورت کے حسن کی تعریف نہیں کرتا بلکہ عورت بھی مرد کے حسن کی تعریف کرتی ہے۔ شکنتلا میں کنچکی کا بیان دیکھیے جو راجہ دشینت کے بارے میں ہے۔

راجہ اندر آتا ہے غمگین اور سوگوار ہے۔ کنچکی اسے دیکھ کر کہتی ہے۔

"حسین کسی حال میں ہی ہوں حسین ہیں۔ سوگوار ہونے پر بھی ہمیں سندر لگتے ہیں۔ آہوں سے نچلے ہونٹ کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ فراق میں جاگتے ہوئے آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں مگر اس پر بھی جمال کا یہ عالم ہے کہ کانٹا سا جسم نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہیرا سان پر چڑھ کر چھوٹا ہو جائے پر اپنی جوت نہیں کھوتا۔"

شکنتلا کا ایک اپنا ماحول ہے، اتنا خوب صورت دلکش اور شاعرانہ ماحول شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے ڈرامے میں پیش کیا گیا ہو۔ پھر اس کے کردار بھی اپنے انداز سے دنیا کے دوسرے بڑے ڈراموں سے بے حد مختلف ہیں۔ ان کے لباس بھی مختلف ہیں ان کے اعمال اور مزاج بھی دوسرے عظیم فن پاروں کے کرداروں سے مختلف ہیں شکنتلا ایک ایسا کھیل ہے جو منفرد اور یکتا ہے۔

ڈیسمینڈ منیلے نے شکنتلا پر خاص انداز کی تنقید لکھی ہے ڈیسمینڈ منیلے کا وہ طویل مضمون شکنتلا کے محاسن پر ہی نہیں بلکہ سنسکرت ڈرامے پر بھی ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ ڈیسمینڈ منیلے لکھتا ہے۔

کالی داس نے شکنتلا میں جو دنیا بسائی ہے۔ وہ ہر بڑے ڈرامہ نگار کی تخلیق کردہ دنیا سے مختلف انوکھی اور خوب صورت ہے۔ برلن میں ایک بار جس نے اس ڈرامے کو دیکھا وہ

اس کا شیدائی ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دیکھنے والے بیشتر لوگ اس تہذیب کلچر اور دلومالا سے بالکل نابلد تھے۔ جس نے اس عظیم کھیل کو تخلیق کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اس کھیل میں جو ماحول، جو مناظر پیش کیے گئے تھے جس ماحول میں شکنتلا کے کردار زندہ رہتے ہیں۔ وہ ان کے لیے اتنا انوکھا، جاذب اور خوشگوار تھا کہ میرے خیال میں اس کو دیکھنا ان ناظرین کے لیے ایک بڑے تجربے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پھر سنسکرت میں اس ڈرامے کی شاعری ہے جو ایسا نور ہے کہ آنکھوں کو بصیرت بخشتا اور ہمیشہ کے لیے دل میں سما جاتا ہے۔

عالمی ادب میں کتنے ایسے شہپارے ہیں کہ ہیروئیں شکنتلا کی طرح خوب صورت ہیں، شاید بہت کم، شاید ایک بھی نہیں، شکنتلا اپنی طرز کی واحد ہیروئن اور تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے ہر زبان کے لوگ اسے پڑھتے چلے آرہے ہیں اور پڑھتے رہیں گے۔

فیدرا

فرانسیسی نقاد اور ادب کے مورخ راسین کو فرانسیسی ڈرامے کا امام اور جدید فرانسیسی ڈرامے کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے ہاں کلاسیکی عناصر واضح نظر آتے ہیں اور اس کے ہاں کلاسیکیت کا تتبع اس حد تک پایا جاتا ہے کہ فرانسیسی نقاد اُسے "لا کلاسیک پار ایکسیلنس" کا بھی طرۂ امتیاز بخشتے ہیں۔ اس نے جو المیے لکھے ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہیں اس کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے لیکن "فیدرا" اس کا عظیم شاہکار ہے اور اسے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

"فیدرا" کی تھیم کے کردار اور واقعات نئے نہیں۔ فیدرا اور اس کا المیہ قدیم یونانی المیہ نگاروں کا موضوع بن چکا ہے۔ لیکن اس پرانے المیے کو راسین نے ایسے انداز میں لکھا ہے کہ یہ المیہ نئی معنویت اور گہرائی کا حامل بن گیا ہے اور پورے کلاسیکی عناصر کے باوجود ایک جدید المیہ ہے۔

فیدرا کا یہ خالق - ژاں راسین دسمبر ۱۶۳۹ء میں فرانس کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر میں ہی وہ یتیم ہو گیا۔ اور اس کی پرورش اس کی دادی نے کی۔ جو ژنیسٹ عیسائی عقیدے پر ایمان رکھتی تھی۔ جس کا اثر ہمیں راسین کی زندگی اور شخصیت پر بہت گہرا ملتا ہے۔ راسین کی زندگی ایسے معموں سے پُر ہے جو تضادات سے جنم لیتے ہیں۔ اپنے مذہبی عقیدے کے حوالے سے وہ بڑا شکی اور توہم پرست انسان تھا وہ بہت نرم خو اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ لیکن جہاں اس کے مذہبی عقائد کا مسئلہ

آجاتا تھا وہاں وہ مشتعل مزاج بن جاتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کی دادی نے اسے پورٹ رائل میں ایک سکول میں داخل کرا دیا۔ جو ژنیسٹ عقیدے کے لوگوں کا تھا۔ راسین نے یہاں عبرانی اور فرانسیسی میں شاعری لکھنی شروع کی اور قدیم یونانی ادبیات میں گہری دلچسپی لینے لگا۔ اس ضمن میں اس نے خاص شہرت حاصل کی۔ وہ یونانی ادب کا بے حد پُرخلوص اور سنجیدہ طالب علم تھا۔ اس کالج میں وہ زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکا۔ اس کے ہم سبق دنیاوی امور میں اُلجھے رہتے۔ ان کے اشغال سے راسین کو نفرت تھی۔ مذہبی عقیدے میں اس کی غلو پسندی اسے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن ہارکوٹ کالج سے اس کی شہرت باہر بھی پھیل چکی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے وہ اپنی شناخت کرا چکا تھا۔ اور پھر جب بادشاہ لوئی چہاردہم کی شادی پر اس نے ایک نظم لکھی تو نہ صرف اس کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ بادشاہ نے اسے انعام سے بھی نوازا۔

راسین ۱۶۶۲ء میں پیرس میں پہنچا۔ جہاں اسے بطور شاعر سماجی اور اعلیٰ حلقوں میں تسلیم کر لیا گیا۔ لوئی پانزدہم جب بیماری سے صحت یاب ہوا تو راسین نے ایک نظم لکھی۔ جس سے اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اور اسی زمانے میں اس کا تعلق اپنے عہد کے بڑے لکھنے والوں، مولئیر، فونتین اور بویلیو سے پیدا ہوا۔ مولئیر نے بطور خاص اس کی ہمت افزائی کی۔ مولئیر کی اپنی تھیٹریکل کمپنی تھی۔ اور راسین کا پہلا ڈرامہ مولئیر نے ہی پروڈیوس کیا۔ راسین کا دوسرا ڈرامہ بھی مولئیر کی ہی کمپنی نے کھیلا لیکن اس کھیل کے دو ہفتوں کے بعد تھیٹر کے اداکاروں کی وجہ سے مولئیر اور راسین میں شدید ناچاقی پیدا ہوگئی۔ تاہم ان دونوں ڈراموں کی وجہ سے راسین بطور ڈرامہ نگار اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور فرانس کے بزرگ ڈرامہ نگار کورنیل کا حریف سمجھا جانے لگا۔

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے راسین کی شہرت میں خاصا اضافہ کیا۔ پورٹ رائل کے ژنیسٹ عقیدے کے لوگ ڈرامہ اور سٹیج کے شدید مخالف تھے اور

ایک خاص طرح کے محدود ڈرامے کے قائل تھے۔ اس گروہ کے سربراہ ایک مصنف نکول نے ڈرامے کے خلاف ایک بہت تیز مضمون شائع کرایا۔ جس میں ڈرامہ نگاروں کو عوام کا قیدی" قرار دیا کہ یہ لوگ محض عوام کو خوش کرنے کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔ راسین کا فنِ ڈرامہ کے بارے میں اپنا ایک عقیدہ اور فلسفہ تھا۔ راسین نے نکول کے مضمون کا بڑا تیکھا جواب دیا۔ اور یوں ایک لمبی بحث چھڑ گئی۔ ڈرامے کی عالمی تاریخ اور بالخصوص فرانسیسی ڈرامے کی تاریخ میں یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر راسین ہتھیار ڈال دیتا۔ ڈرامے اور ڈرامہ نگاروں کا دفاع نہ کرتا تو فرانس میں ڈرامے کی تاریخ اور روایت قدرے مختلف ہوتی۔ بہرحال اس طویل مباحثے کے نتیجے میں راسین کے مزاج میں بڑی تلخی پیدا ہوئی۔ اس نے بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں وہ جس پر خود بھی پچھتایا۔

بہرحال اس واقعہ کے بعد وہ پورٹ رائل سے چلا اور اس کی زندگی کے دس برسوں کے بارے میں ہمیں خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ بہرحال ۱۶۷۲ء میں اسے اکادمی فرانس کا رکن بنایا گیا۔ ۱۶۶۷ء میں سٹیج اور ڈرامے کی دنیا میں اس کی فتوحات کا آغاز ہوا اور انہی میں "فیدرا" بھی شامل ہے۔ راسین نے صرف المیہ ڈرامے ہی نہیں لکھے بلکہ طربیہ کھیل بھی لکھے۔ ایک طنزیہ کھیل "قانون" پر بھی لکھا۔

ڈرامے اور سٹیج کے لیے راسین نے کئی لڑائیاں اور مخالفتیں مول لی تھیں۔ وہ فرانس میں سٹیج کے معاملات کے بارے میں بڑا سنجیدہ تھا۔ اور تبدیلیوں کا خواہاں تھا۔ لیکن یہ تبدیلیاں ٹرینسٹ گروہ کے ساتھ لڑ جھگڑ کر نہ کی جا سکتی تھیں۔ اس لیے اس نے سٹیج اور ڈرامے کی بہتری کے لیے ٹرینسٹ گروہ سے مصالحت بھی کر لی اور یوں وہ فرانسیسی سٹیج کی دنیا میں بعض ناگزیر اور انقلابی تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو گیا۔ سٹیج اور ڈرامے کی دنیا میں یہ اس کی بڑی عطا ہے۔ انتہائی عروج اور کامیابی کے بعد ایک دور پھر ایسا آتا ہے جب وہ ڈرامے اور سٹیج کی دنیا سے نکل جاتا ہے۔ اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا کیونکہ اس کا تعلق اس کے شہکار "فیدرا" سے ہے۔ راسین نے اس زمانے میں شادی کر لی۔ گھریلو زندگی بسر کرنے لگا اور اپنے مذہبی اشغال میں

زیادہ انہماک کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ۱۶۷۷ء میں اس نے ایک سادہ اور عام عورت سے شادی کی تھی۔ وہ سات بیٹوں کا باپ بنا۔ شاہ فرانس نے اسے شاہی مورخ کا عہدہ دے دیا تھا۔ جس کا اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ بادشاہ اسے تحائف بھی بھیجا کرتا تھا۔ اپنی آخری عمر میں راسین نے پھر دو ڈرامے لکھے۔ جن میں مذہبی رنگ اور ایک عجیب طرح کا اضمحلال بڑا نمایاں ہے۔ ان میں ایک ڈرامہ بائبل کے مشہور کردار "ایستھر" پر مبنی ہے۔

راسین کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۶۹۹ء کو پیرس میں ہوا اور اس کو پورٹ رائل میں دفن کر دیا گیا۔

"فیدرا" اور راسین کا فن

نقادوں نے راسین کا موازنہ دنیا کے بڑے بڑے المیہ نگاروں سے کیا ہے۔ عام سطح کے نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ واقعات اور حادثات پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ حالانکہ یہی راسین کی سب سے بڑی خصوصیت اور جدیدیت ہے۔ ایک بات پر تمام نقاد متفق ہیں کہ راسین ڈرامے کے آرٹ کو سب سے بہتر انداز میں سمجھتا اور برتتا تھا۔ وہ کلاسیکیت کا علمبردار تھا۔ اور اس کے فن پر کلاسیکیت کی چھاپ بہت گہری اور نمایاں ہے۔ اس کے ڈراموں میں قوت اظہار اور قوتِ متخیلہ دونوں بے پایاں اور انتہائی موثر ہیں۔

راسین کے قاری ہی جانتے ہیں کہ "فیدرا" اور اس کے دوسرے ڈرامے کن خصوصیات کے حامل ہیں۔ راسین کلاسیکی طرز اسلوب کا المیہ نگار ہونے کے باوجود جدید المیہ نگار ہے۔ وہ اپنے المیے میں حادثات اور واقعات کو بہت معمولی وقعت دیتا ہے۔ انہیں محض اضافی قوت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے ڈراموں کی مرکزی روح اور بنیاد جذباتی کشمکش اور جذباتی بحران ہے۔ جذبات کا تصادم اور تضاد ہے جس سے المیہ جنم لیتا ہے۔ "فیدرا" کو اسی لیے اس کا شہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس میں

جذبات کا تصادم، تضاد اور کش مکش انتہائی نرم و نازک اور پیچیدہ بلندیوں پر ہے۔

راسین انسانی نفسیات کو سمجھتا ہے۔ وہ انسانی جذبات کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ اسی لیے بعض نقادوں نے اس کے المیوں کو "نفسیاتی المیے" قرار دیا ہے۔ اور پھر جہاں بھی نفسیاتی اور جذباتی "کش مکش تیز ہوتی ہے۔ وہاں راسین کا شعری اظہار بھی بلند تر ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کو جس انداز میں نفسیاتی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اس کا اندازہ "فیدرا" کے مطالعے سے ہی ہو سکتا ہے۔

ایم ایچ بائیبل نے ایک کتاب "راسین اور شیکسپیئر" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں بائبل نے راسین کی شاعری کو شیکسپیئر کے ڈراموں کی شاعری سے بہتر ثابت کیا ہے۔

"فیدرا" راسین کا وہ المیہ کھیل ہے جو اس نے اس دور میں لکھا جو اس کے فن کی بلندیوں اور پختگی کا دور ہے۔ "فیدرا" پہلی دفعہ جنوری ۱۶۷۷ء میں ہوٹل ڈی بورگون میں کھیلا گیا۔ اور بہت کامیاب رہا۔ لیکن راسین کے مخالف جلد ہی میدان میں آ گئے۔ ایک دوسرے تھیٹر میں نکولس پرادون کا لکھا ہوا "فیدرا" بھی سٹیج کیا جانے لگا۔ "فیدرا" ایک ہی موضوع پر دو ڈرامے پیرس میں بیک وقت دکھائے جا رہے تھے۔ ان میں راسین کا کھیل فن کا شہکار تھا۔ اس میں نفسیاتی گہرائی اور تخیلی حسن اور آرٹ کا گہرا شعور موجود تھا۔ جبکہ نکولس پرادون کا کھیل عامیانہ تھا۔ اور عامیانہ انداز میں ہی لکھا اور کھیلا گیا اور پھر جیسے کہ ایم ایچ بائبل نے لکھا ہے:۔

"راسین عام آدمیوں کا ڈرامہ نگار نہیں، وہ خاص طبقے اور باذوق المیہ پسند کرنے والوں کا المیہ نگار ہے۔"

نتیجہ وہی نکلا جو اکثر ہر دور میں سامنے آتا ہے کہ مبتذل، عامیانہ کام کو اکثریت پسند کرتی ہے۔ گہری سچائی، رمزیت اور انسانی نفسیات کے تجزیہ کو اچھے ذوق کے لوگ ہی پسند کر سکتے ہیں۔ یوں اس وقت عامیانہ کھیل نے شہکار فیدرا کو پچھاڑ دیا۔ جس کا راسین کو بے حد قلق ہوا۔ اور وہ ایک عرصہ تک ڈرامہ نگاری سے ہی اکتا گیا۔ لیکن آج یہی ڈرامہ ہے جو عالمی شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔

"فیدرا" ایک عالمی اور عوامی تھیم کے علاوہ ایک دیو مالائی موضوع بھی ہے۔ تین کردار باپ، بیٹا اور عورت۔ جو باپ کی دوسری بیوی بنتی ہے۔ دولت، جوانی اور حسن، ان تینوں کا تصادم، جذبات ہی جذبات، محبت ہی محبت اور پھر جذبات کا ٹکراؤ۔ تصادم جو عظیم المیے کو جنم دیتا ہے۔ "فیدرا" جوانی، حسن اور جذبات سے بھری ہوئی عورت ہے۔ جس کی شادی ایک بوڑھے دولت مند سے ہوتی ہے۔ جس کا جوان بیٹا ہے۔ اس بیٹے کی نئی ماں حسین ہے تو بیٹا جذبات اور جوانی اور یوں وہ اس جوان کی محبوبہ بن جاتی ہے۔ جذبات کی آگ دہک اٹھتی ہے۔ الاؤ۔ جو باپ کی نفرت کو جنم دیتا ہے۔ جذبات کا طوفان .... جس میں تینوں انسان بہہ جاتے ہیں۔ فیدرا خودکشی کرتی ہے جوان بیٹا مارا جاتا ہے اور باپ زندہ رہتا ہے۔ المیے کا تاثر گہرا اور انمٹ کرنے کے لیے "فیدرا" میں ایسی نرمی ایسی رمزیت، ایسی جذباتی "کش مکش" اور ایسا جذباتی پھیلاؤ ہے جس نے اسے دنیا کا عظیم شہکار بنا دیا ہے۔ اس پورے کھیل میں راسین کا انداز اور اسلوب بے حد سادہ لیکن پرکار ہے۔ اس میں محسوسات اور نفسیاتی تجربے کا ایک نادر امتزاج ملتا ہے اور پھر محبت کے جذباتی چہرے اور SHADES اس المیے کو ایسی معنویت سے آشکار کرتے ہیں جو دنیا کے بڑے تخلیقی فن پاروں کا ہی خاص حسن ہوتا ہے۔

"فیدرا" کے حوالے سے میں ایک فلم کا ذکر کروں گا جس کے ہدایت کار جارج ڈاسن تھے اس میں یونان کی عظیم اداکارہ جیلینا مرکوری نے "فیدرا" کا کردار ادا کیا تھا۔ اب یہی اداکارہ اپنے ملک کی وزیر ثقافت ہے۔ میں سمجھتا ہوں جن لوگوں نے راسین کے کھیل "فیدرا" پر مبنی فلم کا نیا درشن دیکھا ہے وہ اس فلم اور جیلینا مرکوری کی اداکاری سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے راسین کے المیے "فیدرا" کو خواہ میری طرح انگریزی ترجمے کے حوالے سے ہی پڑھا ہے۔ وہ یقیناً اس عظیم عالمی فن پارے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ہیملٹ

چرچل نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے برطانوی مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ولیم شیکسپیئر کے حوالے سے برطانیہ کو جو فخر اور اعزاز حاصل ہے اس کے حوالے سے شیکسپیئر کو "غیر" بنانے سے انکار کر دیا تھا......

واشنگٹن اورنگ نے اس کی موت اور اس کے مقبرے کو حوالہ بناتے ہوئے لکھا تھا۔

A beacon towering amidst the gentle landscape to guide us

the literary priam of every nation to his Tomb.

میتھیو آرنلڈ نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

Others abide our questions we ask and ask. Thou smilest

and art still out topping knowledge.

کونسا لکھنے والا ہے جس نے ولیم شیکسپیئر کو نہیں پڑھا۔ کونسا سنجیدہ قاری ہے جس نے شیکسپیئر کے مطالعے کے بغیر اپنے مطالعے کو مکمل سمجھا ہو۔ شیکسپیئر، واحد لکھنے والا ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ جتنا کچھ اس کے بارے میں لکھا گیا۔ کسی دوسرے کے بارے میں نہیں۔ جتنی قوموں نے اسے اپنایا پڑھا اور اس کے ڈراموں کو کھیلا۔ کسی دوسرے ڈرامہ نگار کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ ولیم شیکسپیئر ایک واحد ایسا لکھنے والا ہے جس نے اتنے انسانوں اور انسانوں کے تخلیق کردہ ادب

کو متاثر کیا۔ وہ ایک ایسا نام ہے جو ساری دنیا میں صدیوں سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کے ڈراموں کے کردار۔ زندہ اور لازوال کردار بن چکے ہیں۔ اس کے بارے میں جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے بارے میں جتنا لکھا گیا کم ٹھہرا۔۔۔

۱۹۸۳ء کے ابتدائی مہینوں میں ہٹلر کی جعلی "ڈائریوں" کا جو ڈرامہ دنیا کے سامنے آیا۔ اس کے حوالے سے "نیوز ویک" کے ایک کالم نگار نے لکھا کہ دو ایسے افراد ہیں جن سے پوری دنیا اثر لیتی ہے۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جائے۔ کہا جائے اسے لوگ گہری بلکہ ممنونانہ دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ایک شیکسپیئر۔ دوسرا ہٹلر۔ شیکسپیئر کو سمجھے بغیر انسان کو سمجھنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے اور ہٹلر کو سمجھے بغیر موجودہ دنیا کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکتی۔

شیکسپیئر پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود بھی آج تک اس کے پورے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ شیکسپیئر جو بلاشبہ چارلس لیمب کے الفاظ میں۔

Outstanding Literary Glory of the World.

ہے۔ وارو کشائر کے ایک گاؤں سٹرا ٹفورڈ، اون، ایوان میں اغلباً ۲۳ اپریل ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوا اس کے والدین کورے ان پڑھ تھے۔ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ شیکسپیئر جس کمرے میں پیدا ہوا آج بھی وہ اس کی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ اس گاؤں کے دیہاتی اور بے علم ماحول میں شیکسپیئر کا بچپن اور جوانی کے ایام بسر ہوئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے مفت ملنے والی گرامر سکول کی تعلیم ضرور حاصل کی۔ تعلیمی اعتبار سے وہ اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس کے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے قصاب کا پیشہ سیکھنے کے لیے کچھ عرصہ تربیت بھی حاصل کی تھی۔

وہ بڑا ڈرامہ نگار اور شاعر کیسے بنا؟ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ تھیٹر میں کام کرنے والے فنکاروں کو بڑی دلچسپی سے بچپن ہی میں دیکھا کرتا تھا۔ ان میں وہ ایک خاص کشش محسوس کرتا تھا۔ یہی وہ عمر تھی جس میں اس دلچسپی کی بنا پر اس کی حس مشاہدہ تیز ہوئی۔ اسی عمر میں اس نے اپنے ذہن میں مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس عمر میں وہ بنی نوع انسان میں دلچسپی لینے لگا تھا جو بعد میں اس کے ڈراموں کا طرۂ امتیاز بنی۔

شیکسپیئر کے بارے میں جو ریکارڈ ملتا ہے وہ اس کے گاؤں کی میونسپل کمیٹی میں موجود ہے۔

اس کی شادی اس کے تین بچوں سوزانا اور جڑواں ہمینٹ اور جوڈیتھ کی پیدائش کا ریکارڈ اور خود اس کی موت کا اندراج موجود ہیں۔

جب منظر بدلتا ہے اور وہ سٹراٹفورڈ سے لنڈن پہنچتا ہے تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ مستند کوائف معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے ہم عصر جن میں بین جانسن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ شیکسپیئر متحمل، نرم مزاج، دوستانہ خو رکھنے والا آدمی تھا جسے لوگ Sweet will Shakespeare کہا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ درمیانے قد کا متناسب اور گٹھے ہوئے جسم والا تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری اور بال سُرخ رنگ کے تھے۔

شیکسپیئر اٹھارہ برس کا تھا کہ اس کی شادی این ہیتھاوے سے ہوئی۔ اسی زمانے میں، شیکسپیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے ایک جاگیردار کے کچھ ہرنوں کو چرالیا تھا جس سے خاصا ہنگامہ پیدا ہوا تھا۔ اس کی حقیقت کیا ہے اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد پھر ایک عرصہ اس کی زندگی میں آتا ہے۔ جس کے بارے میں بہت قیاس آرائیاں کی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کا آج تک علم نہیں ہو سکا جن کے حوالے سے کہا جا سکے کہ شیکسپیئر ایک لمبی مدت تک اپنے خاندان اور گاؤں سے کیوں غائب اور غیر حاضر رہا۔ بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ اسے اپنی بیوی سے محبت نہ تھی۔ وہ اچھا شوہر اور باپ بھی نہ تھا۔ لیکن اسے اپنے غریب اور تباہ حال والد کا بے حد خیال رہتا تھا۔ ولیم شیکسپیئر ایک اچھا بیٹا ضرور تھا۔

وہ بیس برس کے لگ بھگ تھا جب وہ لندن پہنچا۔ لندن پہنچ کر وہ پہلے پہل کیا کرتا رہا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ۱۵۹۲ء میں گمنامی کی دھند سے نمودار ہوتا ہے۔ ایک اداکار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے .... اور وہ ایسے انداز میں سامنے آتا ہے کہ اپنی ذہانت، مقبولیت اور فطانت کے حوالے سے اپنے کئی حاسد پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے ایک ہم عصر رابرٹ گرین نے اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس کی اہانت کرتے ہوئے اسے The only shake - scene in a countrie. لکھتا ہے۔ گرین کی موت کے بعد جب اس کا کام جمع ہوا تو اس کے مرتب نے معذرت کی۔ گرین نے حسد کی وجہ سے شیکسپیئر کی اہانت کی تھی اور جو رائے دی تھی وہ سرتاپا غلط تھی۔

شیکسپیر کی مشہور زمانہ نظمیں "وینس اینڈ اڈونس" (غالباً ۱۵۹۳ء) اور "ریپ آف لیوکریٹس" (۱۵۹۴ء) میں شائع ہوئیں۔ اس کے سانیٹ ۱۶۰۹ء میں شائع ہوئے۔

۱۵۹۴ء میں ولیم شیکسپیئر اداکاروں کی چیمبرلین کمپنی کا ممتاز رکن بن چکا تھا۔ اس کے نام ان اداکاروں کی فہرست میں ملتا ہے جنہوں نے شاہی دربار کے ڈراموں میں حصہ لیا اور ان کو معاوضہ ادا کیا گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ہیملٹ میں اس نے ہیملٹ کے والد یعنی GHOST کا کردار ادا کیا تھا۔ ASYOULIKEIT میں بھی اس نے آدم کا کردار کیا لیکن بحیثیت اداکار وہ زیادہ انفرادیت یا کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے حاصل کر لی تھی۔ لیکن وہ اپنے بارے میں کبھی لاف نہ مارتا تھا اور کہا کرتا تھا۔

My nature is subdued towhat it works in.

اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ گلوب تھیٹر میں اسے حصہ دار بنا لیا گیا۔ وہ سٹراٹفورڈ آتا جاتا رہتا تھا ۱۵۹۶ء میں اس کے بیٹے ہیمینٹ کا انتقال ہوا۔ ۱۵۹۷ء میں شیکسپیئر نے سٹراٹفورڈ میں کچھ باغات اور ایک مکان خریدا۔ ۶۰ میں وہ یہاں مستقل طور پر رہنے کے لیے آ گیا۔ اب وہ ایک تھکا ماندہ آدمی تھا۔ جو باقیماندہ زندگی آسودگی سے گزارنا چاہتا تھا۔ جیمز رسل لوویل نے لکھا ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنے مکان کے دروازے کے باہر کھڑا اکثر اپنے ہمسایوں سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتا تھا: لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کو محترم گردانتے تھے۔ ڈرائیڈن اور بین جانسن اسے وہاں ملنے آتے تھے۔ مارچ ۱۶۱۶ء میں اس نے اپنا وصیت نامہ مرتب کیا جس کی عالمگیر شہرت ہے۔ اپنی بیوی کے لیے اس نے Second best bed. ترکے میں چھوڑا۔ اپریل ۱۶۱۶ء میں شیکسپیئر بخار کے عارضے میں مبتلا ہوا۔ اور اپنی پیدائش کی تاریخ یعنی ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء کو وہ اس جہان فانی سے اٹھ گیا۔ دو دن بعد اس کو اس کے قصبے کے حسب صورت قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

شیکسپیئر کے ڈرامے

شیکسپیئر کے ڈراموں کی فہرست اس ترتیب سے دی جا رہی ہے جس کے بارے میں یہ قیاس اغلب ہے کہ انہیں اس ترتیب سے لکھا گیا تھا۔

کامیڈی آف ایررز	ٹو جنٹل مین آف ویرونا	ہنری ششم (تین حصے)
لوز لیبر لاسٹ	رچرڈ سوم	رچرڈ دوئم
رومیو اینڈ جولیٹ	اے مڈسمر نائٹس ڈریم	مرچنٹ آف وینس
ہنری چہارم (دو حصے)	ٹیمنگ آف دی شریو	کنگ جان
مچ اڈو، اباوٹ نتھنگ	ایز یو لائیک اٹ	ہنری پنجم
سرلولیوس اینڈ کریسیڈا	میری وائوز آف ونڈسر	ہیملٹ
اوتھیلو	ہنری ہشتم	میژر فار میژر
میبکتھ	آل از ویل دیٹ اینڈز ویل	کنگ لیئر
انٹونی اینڈ قلوپطرہ	ٹویلفتھ نائٹ	جولیس سیزر
کوریولونیس	ٹائمن آف ایتھنز	گمبلین
	دی ٹیمپسٹ	ونٹرز ٹیل

ہیری کلیز اور ٹیلس اینڈ ونیلکس دو ایسے کھیل ہیں جن کے بارے میں اس شک و شبہے کا شدید اظہار کیا جاتا ہے کہ شیکسپیئر کی تصانیف نہیں ہیں۔

شیکسپیئر کے تراجم

شیکسپیئر ایک ایسا ڈرامہ نگار ہے جس کے ڈراموں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں صدیوں سے وہ دنیا کی سٹیج پر اپنی عظیم اور لازوال تصانیف کے حوالے سے زندہ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں سٹیج ہے شیکسپیئر موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ڈرامے کو جانے کتنی بار دنیا کے ہر ملک میں کھیلا گیا اور کتنی بار کھیلا جائے گا۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے ذریعے اس کے ڈرامے بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا میں اس فنکار کو خاص قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس نے شیکسپیئر کے کسی کھیل میں کوئی اہم کردار ادا کیا ہو۔ "شیکسپیئرین ایکٹر" کی ایک اپنی ہی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

شیکسپیئر کے کھیلوں کو ہر ملک میں کھیلا گیا اور کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا ریکارڈ رکھنا بھی دشوار ہے

دنیا کی ہر زبان میں اس کے تراجم ہوئے۔ اُردو زبان میں اس کے سب سے بڑے مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی ہیں جنہوں نے اس کے متعدد ڈرامے اردو میں منتقل کیے۔ مرحوم صوفی تبسم نے شیکسپیر کے ایک کھیل اے مڈسمر نائٹس ڈریم کو ' ساون رین کا سپنا ' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ سید قاسم محمود اور سید تسخیر رضوی کے "میکبتھ" کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سید قاسم محمود نے "میکبتھ" کا نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ جبکہ سید تسخیر رضوی نے اسے مثنوی کی بحر میں منظوم ترجمہ کر کے ایک نیا اور خوشگوار تجربہ کیا ہے۔ رومیو جولیٹ کے دو تراجم ہیں۔ ایک مرحوم عزیز احمد کا ترجمہ ہے جو بے حد دقیع ہے اور ستار طاہر کا جو آزاد نظم کے قالب میں کیا گیا ہے۔

برصغیر ہندو پاک کی علاقائی زبانوں میں بھی شیکسپیر کے تراجم موجود ہیں۔ ہمارے ہاں شیکسپیر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور انگریزی کے نصاب میں شیکسپیر صدیوں سے پڑھا جا رہا ہے۔

"ہیملٹ" کیوں

میر کے کلام میں بہتر نشتر ہی تو نہیں۔ ان نشتروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شیکسپیر کا صرف ایک ایسا ڈرامہ ہی تو نہیں کہ جس کو بقائے دوام حاصل ہوا اس کے کتنے ہی ایسے شاہکار ہیں جنہیں لوگ صدیوں سے پسند کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاریخی اور کامیڈی کھیلوں میں بھی ایسے کتنے کھیل ہیں جنہیں لوگ صدیوں سے پسند کرتے چلے آرہے ہیں۔ المیوں میں بھی رومیو اینڈ جولیٹ ہے اور جولیٹ تو وہ کردار ہے کہ جس سے زیادہ خوب صورت، وفا شعار نرم و نازک کردار بعض نقادوں کے خیال میں پوری دنیائے ادب میں موجود نہیں۔

اوتھیلو میں تو آج کا تجربہ بھی شامل ہے اور پھر حسد کا نیلی آنکھوں والا اژدھا تو ہر دور میں انسانوں کو ڈستا چلا آیا ہے۔ پھر بھی حاسد اوتھیلو سے ہمیں شیکسپیر محبت کرنا سکھاتا ہے۔ کیونکہ اوتھیلو درندہ نہیں۔ انسان ہے جولیس سیزر کے کردار کتنے عظیم ہیں اور اس کے حوالے سے جو شیکسپیر نے کہا ہے اس کی معنویت کب دھندلا سکتی ہے۔ کنگ لیئر کا المیہ انسانی رشتوں کی ایسی تفسیر سامنے لاتا ہے جو اس سے پہلے اس موثر انداز میں شاید ہی پیش کی گئی ہو اور پھر میکبتھ۔ جس میں لیڈی میکبتھ اپنے ہاتھوں سے خون کے چھینٹے دھونے کے لیے سارے سمندروں کے پانی کو بھی کم سمجھتی ہے۔ یہی

لیڈی میکبتھ ہے جسے محمد حسن عسکری مرحوم نے جدید عورت کی پرنائی قرار دیا ہے اور پھر مرچنٹ آف وینس اور اس کا شائی لاک۔

کاش یہاں گنجائش ہوتی اور میں تفصیل سے لکھ سکتا کہ صیہونیت کے دباؤ کی وجہ سے آج یورپ کے بعض ممالک اور امریکہ میں، مرچنٹ آف وینس کو اسٹیج پر پیش کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اس پر کوئی فلم نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس میں شائی لاک کے حوالے سے شیکسپیر نے یہودیوں کی اس ذہنیت کو آشکار کیا ہے۔ جو حقیقی، دائمی اور سچی ہے) لارڈ میو جولیٹ، میکبتھ کنگ لیئر، اوتھیلو، جولیس سیزر، انٹونی اینڈ قلوپطرہ، وغیرہ کیسے کیسے کردار ہیں جو شیکسپیر کے حوالے سے لازوال ہو چکے ہیں۔ ان کرداروں کے ادا کرنے والے بعض فن کاروں نے عالمی شہرت اور اعزاز حاصل کیے ہیں۔ لیکن ہیملٹ۔ ہیملٹ پرنس آف ڈنمارک ہی ایک کیوں المیہ ہے جس کو شیکسپیر کا سب سے بڑا شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لازوال ڈراموں میں اسے کونسی خصوصیت حاصل ہے کہ لازوال ڈراموں میں بھی اسے سب سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

"ہیملٹ" ہی کیوں دنیا کی سو عظیم تخلیقی کتابوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔

مجھے ابتدا ہی میں اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ شیکسپیر اور پھر اس کے عظیم المیے ہیملٹ پر مختلف مستند حوالوں کے باوجود میں اس کی عظمتوں کو پوری طرح اُجاگر نہ کر سکوں گا۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ.... ایک مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ "ہیملٹ کو پوری گہرائیوں کو سمجھنا اور پھر اس کو تحریر کرنا میرے جیسے طالب علم کے لیے ناممکن ہے بہر حال ایک مخلصانہ کاوش ضرور کروں گا کہ ہیملٹ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ اور یہ واضح ہو سکے کہ شیکسپیر کے کھیلوں میں سب سے اہم کھیل "ہیملٹ" ہی کیوں ہے۔!

شیکسپیر کے بیشتر ڈراموں کی طرح "ہیملٹ" کے کردار اور واقعات کو بھی مختلف ڈراموں کے حوالے سے حاصل کر کے شیکسپیر نے المیہ لکھا ہے۔

بارہویں صدی کے آواخر میں ایک ڈینش وقائع نگار اپنے ملک کے ماضی پر تحقیق کر رہا تھا کہ اس نے ایملتھ پرنس آف جٹ لینڈ کے واقعات کو دریافت کیا۔ اور وقائع نگار اور محقق کا نام۔ ساکسو گرامٹیکس تھا۔ ساکسو بتاتا ہے کہ پرنس ایملتھ نے اپنے چچا فنسینگ کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا

بدلہ چکا ما تھا جسے فسینگ نے بڑی عیاری سے قتل کرا دیا تھا۔ اور اس کی بیوی شہزادہ ایملیتھ کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ ساکسو بتاتا ہے کہ ڈنمارک کی تاریخ میں یہ واقعہ لیجنڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیجنڈ میں شہزادہ ایملیتھ ہیملٹ کی طرح ہلاک نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بڑی ہوشیاری سے انتقام لے کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لیجنڈ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پرنس ایملیتھ نے اپنے آپ کو جنونی اور پاگل بنا دیا تھا۔ یہ اس کی ایک چال تھی تاکہ وہ انتقام لے سکے اور اس کی تکمیل کر سکے اور اس کی تکمیل کے بعد زندہ رہ سکے۔

یہ لیجنڈ مختلف انداز سے سفر کرتا ہوا شیکسپیئر تک پہنچتا ہے۔ شیکسپیئر وہ مسیحا فن کار ہے جو مردہ ہڈیوں جیسے مواد کو اپنے فن سے زندہ کر دکھاتا ہے۔ اس نے یہ جادو اپنے اکثر ڈراموں میں جگایا ہے۔ ساکسو ہمیں جو کہانی پرنس ایملیتھ سناتا ہے۔ وہ ہمیں بے حد بچگانہ لگتی ہے لیکن اسی کہانی کو انہی کرداروں سے شیکسپیئر نے انسانی زندگی اور تقدیر کی تفسیر بنا دیا ہے۔

ساکسو کے حوالے سے یہ کہانی دوسرے تاریخ دانوں کے ہاں بھی ملتی ہے فرانکو بیلے فورسٹ جیسے فرانسیسی مورخ کی کتاب کے حوالے سے یہ کہانی انگریزی میں منتقل ہوئی۔ انگریزی میں اسے History of the hamblet. کے نام سے شائع کیا گیا۔

ساکسو نے جو کہانی بیان کی تھی اس میں اس نے ایملیتھ کی ماں اور مقتول بادشاہ کی بیوی کو مظلوم بے خطا اور سازش کا شکار بتایا تھا لیکن فرانکو بیلے فورسٹ نے اسے مجرم زانیہ اور اپنے شوہر کے قتل کی شریک گردانا۔ پرنس ہیملٹ کا قصہ شیکسپیئر کے ہمعصروں کے لیے بھی دل چسپی کا باعث رہا اور شیکسپیئر سے پہلے بھی اسے ڈرامے کا موضوع بنایا تھا۔

اگر ہم بہت پیچھے ماضی میں چلیں اور اس فساد کا سراغ لگانے کی کوشش کریں تو ہم پر ایک خوشگوار لیکن حیران کن انکشاف ہوگا۔ شیکسپیئر اور قدیم یونانی ڈرامے میں زمین آسمان کا فرق ہے یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن اسکلیس کے شاہکار المیے اوریسٹیا کا ذکر ناگزیر ہے ہیملٹ کی طرح اوریسٹیا بھی ایک ایسا کھیل ہے جس کو انتقام کا کھیل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ شیکسپیئر کسی طرح بھی ایسکلیس کے اس عظیم المیے سے متعارف نہ تھا۔ ایسکلیس شیکسپیئر کی رسائی سے دور تھا لیکن وہ اوریسٹیا اور یونانی دیو مالا سے اچھا خاصا تعارف رکھتا تھا۔ اوریسٹیا دراصل ایک ایسا المیہ ہے جو تین حصوں میں

منقسم ہے۔ اس کا پہلا کھیل " اگیممنان " ہے جس میں ہیملٹ کے والد کی طرح اگیممنان جیسے بڑے بادشاہ
کو اس کی بیوی اپنے چاہنے والے کے لیے قتل کرتی ہے۔ ہیملٹ کی طرح یہ اورسٹیس کا بھی مقدر ہے کہ
وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ چکائے یہ مشابہت بہت سے سوالوں کو جنم دیتی ہے لیکن یہاں اس مشابہت
کا ذکر ہی کافی ہے۔

انتقام۔ جسے بیکن نے Wild justice کا نام دیا ہے۔ ایک ایسا موضوع ہے جو ہمیشہ
سے تخلیق کاروں کو مرغوب رہا ہے۔ ایسکلیس کے بعد یوریپیڈیز بھی اس موضوع کو المیے کی شکل دیتا
ہے اور اس کا المیہ " اورسیٹس " ۵۰۴ ق م میں کھیلا جاتا ہے۔ شیکسپیر براہ راست یونانی ڈرامے اور یونانی
کے ان ڈراموں سے متعارف نہ تھا جن کو تھیم کے اعتبار سے ARRANGE PLAYS کہا جاتا ہے
لیکن وہ اس ضمن میں سینیکا کے ڈراموں سے براہ راست متعارف تھا۔

۱۶۰۰ء میں برطانیہ میں ایسے کھیل لکھنے کا خاصا رواج تھا۔ جن میں اس انتقامی جذبے اور انتقام
کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ پیکرنگ (۱۵۶۷ء) اور نورٹن (۱۵۶۲ء) کے ایسے کھیل مل چکے ہیں جو اس رجحان
کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شیکسپیر کے " ہیملٹ " کا سرچشمہ الزبتھ دور کا ایک ایسا ڈرامہ ہے جو گمشدہ کی ذیل میں آتا ہے
اس کا نام Ur Hamlet kyd تھا اور اس کا مصنف تھامس کڈ (T. K. D) بتایا جاتا ہے۔ ۱۵۸۹ء
میں یہ ڈرامہ موجود تھا۔ اور ۱۵۹۰ء تک اسے سٹیج کیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں شیکسپیر کے مورخوں، نقادوں
اور معتقدوں نے بہت تحقیق کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیکسپیر کے ہیملٹ کا ماخذ بنیادی طور پر یہی
ڈرامہ Ur Hamlet kyd تھا جسے اس نے زمین سے اٹھایا اور آسمانی رفعتوں سے ہمکنار کر دیا۔
اور شیکسپیر نے اسے وہ کچھ بنا دیا کہ جس کے بارے میں بڑے وثوق سے بتایا جا سکتا ہے کہ
قدیم یونانی المیہ نگاروں کے بعد ہیملٹ وہ المیہ ہے جو دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے
کے بعد لکھا گیا اور اس کا موازنہ یونانی المیہ کے شاہکاروں سے کیا جا سکتا ہے۔

" ہیملٹ " شیکسپیر کا سب سے طویل کھیل ہے۔ اس کے دو مستند مسودے دستیاب ہو
چکے ہیں۔ ان دونوں مسودوں میں بھی خاصا فرق ہے۔

ہیملٹ کے بارے میں نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ایک بالکل ذاتی کھیل ہے ایسا

المیہ جسے شیکسپیئر نے دراصل اپنی خوشنودی کے لیے تحریر کیا۔ دنیائے ادب میں ایسی کتنی ہی لازوال تخلیقات موجود ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہیں ان کے خالق نے صرف اپنی ذات کی خوشنودی اور مسرت کے لیے قلم بند کیا۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے تو یہاں تک حکم لگادیا ہے کہ اس میں شیکسپیئر نے اپنے لاشعور کو بیان کیا ہے۔ فرائڈ نے اپنی جگہ ہیملٹ کو خراج تحسین پیش کیا اور اس کی نفسیاتی توجیہہ کی ہے جو ایک فکر انگیز مطالعہ ہے۔

دنیا بھر کے لوگ جو شیکسپیئر کے صدیوں سے مداح چلے آرہے ہیں وہ کنگ لیئر، اوتھیلو، بروٹس، میکبتھ اور فالسٹاف کو بھی اپنے ذہنوں پر انمٹ نقش کی حیثیت دے چکے ہیں لیکن یہ ہیملٹ ہی ہے جس کے حوالے سے وہ صدیوں سے اپنی شناخت کرتے چلے آرہے ہیں۔

ہیملٹ جدید انسان ہے اور اس میں جدید انسان کی تمام صفات ملتی ہیں، متشکک، پیچیدہ، الجھا ہوا، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں غیر یقینی، فیصلہ کرنے کی قوت کے توازن سے محروم فرزانگی اور دیوانگی کا مجموعہ۔

"ہیملٹ، شیکسپیئر کے فن کا سب سے عظیم شاہکار ہے۔ اس کی اپنی روایت میں ہونے کے باوجود۔ یہ اس کے سب ڈراموں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔

پرنس ہیملٹ، شیکسپیئر کے ڈراموں کا واحد مرکزی کردار ہے جو غیر شادی شدہ ہے جو جسم سے آشنا نہیں۔ محمد حسن عسکری نے ہیملٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ ہیملٹ ایک ایسا المیہ ہے جس میں جنس کا ذکر تک نہیں مگر سارا المیہ جنس کے گرد گھومتا ہے۔

پرنس ہیملٹ سادہ، خوب صورت، نیک خو، نوجوان ہے وہ تعلیم یافتہ ہے۔ فن ڈرامہ سے اسے خاصا شغف ہے۔ یہ المیہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب قلعے کے کچھ محافظ سپاہی ایک بھوت (GHOST) کو دیکھتے ہیں۔ ہیملٹ تک اس کی خبر پہنچتی ہے۔ ہیملٹ پہلے ہی رنجور اور دل گرفتہ ہے۔ کیونکہ اس کا باپ شاہ ہیملٹ سانپ کے ڈسے جانے سے مرگیا ہے اور اس کی ماں نے اپنے دیور اور ہیملٹ کے چچا کلاڈیس سے شادی کرلی ہے۔ کلاڈیس کے بادشاہ بننے سے ہیملٹ کا حق مارا گیا ہے لیکن ہیملٹ کو اس کا رنج نہیں۔ اپنے باپ سے اسے جو محبت تھی اور ماں کے لیے اس کے دل میں جو تقدس بھرا پیار تھا وہ شدت سے مجروح ہوا ہے۔ ماں کی دوسری شادی اور

پھر کلاڈیس جیسے بدوضع اور بدخو کو اپنا شوہر بنا لینے سے ہیملٹ کو بہت زیادہ رنج ہوتا ہے۔ اس کے دل میں بہت سے شبہات ہیں، ماں کے طرز عمل کو وہ بالکل نہیں سمجھ سکا۔ اس کا دوست ہوریشو اسے سمجھاتا ہے لیکن وہ بھوت سے جو اس کے باپ کا ہے، ملنے کے لیے بضد ہے۔ رات کو وہ اس سے ملتا ہے باپ اسے بتاتا ہے کہ اسے ایک خاص زہر دے کر قتل کیا گیا ہے۔ سازش میں اس کی بیوی بھی شریک ہے اور وہ ہیملٹ سے کہتا ہے کہ وہ اس قتل کا انتقام لے۔ اپنی ماں کا معاملہ خدا پر چھوڑ دے لیکن چچا سے ضرور بدلہ چکائے۔

ہیملٹ گومگو اور تشکیک کا شکار ہے۔ کیا وہ بھوت بدروح تو نہیں۔ کیا واقعی اس کی ماں اتنے گھناونے گناہ میں شریک ہوئی۔؟ ہیملٹ اوفیلیا سے محبت کرتا ہے جو دربار شاہ کے سب سے باا ختر شخص پولونیس کی بیٹی ہے۔ وہ سوگ کا لباس نہیں اُتارتا۔ وہ ایسی حرکات کرتا ہے جو بادشاہ اور ملکہ کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہیملٹ ایسی کیفیت میں ہے جو دیوانگی اور فرزانگی کا عجیب سا امتزاج ہے۔ بعد میں اس کی حالت کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس حد تک دیوانہ ہے اور کس حد تک فرزانہ۔ وہ اگرچہ قدیم کردار ہے لیکن ایسا کردار جو شیکسپیر کے ہاتھوں میں آکر ایک ایسا نفسیاتی کردار بن جاتا ہے جو انسانی ذہن، تقدیر، اعمال کی پراسراریت کی نمائندگی کرتے ہوئے عہد جدید کے انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے وہ دربار میں ایک ڈرامے کا اہتمام کرتا ہے۔ ڈرامہ ایسا ہوتا ہے جو اس کے والد کی موت اور سازش کے قصے سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ اس کا جو اثر ملکہ اور بادشاہ پر ہوتا ہے اس سے ہیملٹ جان لیتا ہے کہ وہ بدروح نہ تھی بلکہ اس کے باپ کی بے چین روح تھی۔ ہیملٹ سے پولونیس اپنی محبوبہ کے باپ کا قتل ہو جاتا ہے۔ اوفیلیا کی موت کا بھی ایک طرح سے وہی ذمہ دار ہے۔ وہ ڈوب کر مرگئی ہے۔ اس کا ظالم چچا اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔ ایک نئی سازش جنم لیتی ہے۔ اختتام میں چچا کلاڈیس اور ماں کے ساتھ پرنس ہیملٹ بھی ہلاک ہو جاتا ہے کہ یہی اس کا مقصد ہے۔

یہ اس عظیم المیے کا ایک بہت ہی سرسری سا خاکہ ہے جس سے کسی طور پر بھی اس المیے کی حقیقی عظمتوں اور معنویت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس ڈرامے کے ہر کردار کا ایک اپنا مزاج ہے۔ اوفیلیا۔ ہیملٹ کی محبوبہ۔ اس کے ڈراموں کی تمام ہیروئنوں سے مختلف ہے۔ خود ہیملٹ یکتا ہے۔

اس کا کوئی مثیل نہ شیکسپیر کے ہاں ملتا ہے نہ کسی دوسرے ڈرامے میں۔

اس ڈرامے میں ہیملٹ کے جنون اور دیوانگی کا مسئلہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ پاگل پن اور بہروپ کے سرے ایک دوسرے سے اس طرح سے گتھ گئے ہیں کہ یہ شناخت کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کہاں ہیملٹ سچ مچ دیوانہ ہے اور کہاں وہ اس کا صرف بہروپ بھر رہا ہے۔

اوفیلیا کا کردار بے حد نازک ہے۔ وہ مطیع دوشیزہ ہے۔ اس کا باپ اسے اپنے انداز میں استعمال کرتا ہے اور ہیملٹ اسے کبھی محبت کا یقین دلاتا ہے کبھی بے اعتنائی کا۔ وہ جس انداز سے مرتی ہے۔ وہ خودکشی ہے۔ ایک مختصر سے عرصے کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہیملٹ کو اوفیلیا کی موت کا شدید صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اسے بالکل بھول جاتا ہے۔ اصل میں اپنی ماں کے طرزِ عمل نے ہیملٹ کو عورت ذات سے بدگمان کردیا ہے۔ وہ عورت اور کمزوری کو ایک ہی چیز سمجھنے لگا ہے۔ ملکہ گرٹروڈ کی بے وفائی کا عذاب۔ اوفیلیا کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہیملٹ کی فکر میں جو تبدیلی آئی ہے اس کی تمام تر ذمے داری اس کی ماں گرٹروڈ پر عائد ہوتی ہے۔

اس ڈرامے کا ہر کردار انسان ہے۔ حتیٰ کہ سازشی، ظالم اور اپنے بھائی کے قاتل ہیملٹ کا چچا بادشاہ۔ کلاڈیس بھی، وہ بھی تنہائی میں اپنے گناہ پر پچھتاتا ہے۔

نقادوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے کہ مسیحی تعلیمات میں ذاتی انتقام کی کیا حیثیت ہے اور ہیملٹ کا انتقام کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بڑی اہم ہے لیکن جب شیکسپیئر نے ہیملٹ کو تخلیق کیا تو وہ یقینی طور پر اس کے خالص مسیحی پہلو کو ذہن میں نہ رکھتا تھا۔ نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ وہ تو ایک ایسا انسان ایک ایسا کردار تخلیق کررہا تھا جو اس سے پہلے موجود تھا لیکن وہ اسے نئی اور ابدی زندگی دے کر ایک ایسا انسان بنا رہا تھا جو ہر دور کے انسان کے باطن کی پُراسراریت کی نمائندگی کرسکے اور پھر ایسا انسان جو بڑا فطری ہے۔ جو تشکیک کا شکار ہے۔ جو اپنی شناخت کے کرب سے بھی دوچار ہے۔ وہ انتقام لینے میں عجلت نہیں برتتا۔ بلکہ اپنے آپ کو مسلسل اذیت دیتا رہتا ہے۔ وہ بہت کچھ سمجھنا چاہتا ہے اور جو کچھ سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ بہت مشکل، بہت گہرا اور بہت پیچیدہ ہے اور انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ جس ذہنی عذاب خلفشار، پاگل پن اور فرزانگی سے ہیملٹ دوچار ہوتا ہے۔ اس کی مثال نہ عصری ڈراموں میں ملتی ہے نہ بعد کے ڈراموں میں اس کردار ہیملٹ کو انسانی

ذات کی پُراسراریت کا استعارہ بنا دیا ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتا بھٹکتا ہیملٹ اپنی ذات کی شناخت کی تفتیش کے عمل سے گزرتا ہے اور انسان کا اس معاشرے میں کیا مقام ہے، ایسے بنیادی سوال سے دوچار ہوتا ہے۔

ہیملٹ بے مثل کردار ہے۔ لاثانی۔ یکتا۔

وہ ایسے ایسے سوال اُٹھاتا ہے جو اس سے پہلے سٹیج پر کسی نے نہ کیے تھے۔ وہ گورکن سے پوچھتا ہے:

ایک آدمی کب تک زمین کے نیچے برقرار رہتا ہے اور پھر سڑنے لگتا ہے (۵۔ ایکٹ۔ سین ا۔۱۹۱)

وہ شخص جس کا دماغ گداگر کا ہو وہ کتنا عرصہ بادشاہت کر سکتا ہے! (چوتھا ایکٹ۔ تیسرا سین)

ہیملٹ ایک شاہکار ہے جس کی کتنی ہی لائنیں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

All the lives must die, passing through nature to eternity.

How weary stale, flat and unprofitable.

Seemed to me all the uses of this world.

Frailty thy name is Woman.

Give everyman the ear, but few thy voice.

Take each man's censure, but reserve thy judgement.

More greif to hide than hate to utter love.

Bervity is the soul of wit.

For there is nothing either good or bad but thinking made it so.

Whata piece of work is man, how noble in reason how infinite in
:ulties, in form and moving how express and admirable, in action
w like an angel in apprehension, how like a God, the beauty of the

world, the paragon of animals and yet to me what is this quintessenc of dust. To be or not to be that is the question.

Give me that man, that is not passions slave.

ہیملٹ دنیائے ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے اسکے بارے میں صدیوں سے لکھا جارہا ہے اور لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ انسانی ذات کو سمجھنے کی ایک ایسی تخلیقی کاوش ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

فاؤسٹ

گلشن ویمر میں ابدی نیند سونے والا۔ گوئٹے عالمی ادبی تاریخ کا وہ عظیم معمار اور نام ہے کہ جس کی تخلیقات نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ انگریز جو شیکسپیر کی محبت میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے وہ بھی اس کی عظمت کے معترف ہوئے۔ سی ڈبلیو فیلڈ نے گوئٹے پر اپنی کتاب میں لکھا تھا:

> وہ کسی طرح شیکسپیر سے کم نہ تھا جو شیکسپیر جانتا تھا وہ گوئٹے بھی جانتا تھا۔ اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات سے سیکھا اور یہ وہ بات ہے جو شیکسپیر کے سوانح نگار اس کی زندگی میں تلاش نہیں کر سکے۔

جوہان وولف گانگ فان گوئٹے۔ صرف جرمنی ادب کا ہی عظیم نام نہیں ہے۔ بلکہ آج وہ ساری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں اس کی تخلیقات کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اس کے عظیم المیے " فاؤسٹ " کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہے وہ دنیا کے بہت کم فن پاروں کے نصیب میں آسکی۔

گوئٹے فرینکفرٹ اون دی مین میں ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو پیدا ہوا۔ گوئٹے اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اس کا والد شاہی دربار سے تعلق رکھنے والا خوش حال لیکن سخت گیر انسان تھا۔ لیکن گوئٹے کی ماں ایک نرم خو، موسیقی اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھنے والی خاتون تھی۔ جس سے گوئٹے نے بہت فیض اُٹھایا اور اس کے کردار کی تشکیل میں سب سے نمایاں حصہ اس کی مہربان ماں کا تھا۔ گوئٹے نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی کہتے ہیں کہ

کہ وہ سولہ برس کا ہونے سے پہلے چھ زبانوں پر خاصا عبور حاصل کر چکا تھا۔

گوئٹے سولہ برس کی عمر میں لائپزگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس کا ارادہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ لیکن اس کا دل تو فنون لطیفہ اور شاعری میں اٹکا ہوا تھا۔ گوئٹے کی زندگی کا یہ دور بہت ہیجان انگیز اور طوفان بدوش تھا۔ جوانی کے اس خاص عرصے میں اس نے دل کے ارمان نکالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شراب اور خوبان شہر سے وابستگی جسم و جان کے کتنے ہی تذکرے اس دور میں اس کے نام سے منسوب ہوئے۔ اس بے اعتدالی نے اسے بیمار کر دیا۔ ۲۱ برس کا تھا کہ جب اس کی زندگی کا رُخ بدلا۔ اب وہ بے اعتدالیاں چھوڑ کر سنجیدگی سے علم و فن اور دیگر معاملات کی طرف راغب ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب اس نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے سنجیدگی اختیار کی۔ اس کی بعض نظمیں اور کچھ غنائی ڈرامے مشہور ہو چکے تھے۔ وہ اپنی شکل و صورت اور دانش کی وجہ سے اعلیٰ حلقوں میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔

۲۱۔ برس کی عمر میں وہ سٹراسبرگ پہنچا تاکہ قانون کی تعلیم مکمل کر سکے۔ لیکن قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ کیمسٹری، علم طب، فن تعمیر اور کلاسیکی ادب کے مطالعے میں بھی گہری دلچسپی لیتا رہا۔ اس زمانے میں اس نے پھر ایک زوردار عشق کیا، لیکن اس میں کامرانی نہ ہوئی۔

۲۲۔ برس کی عمر میں اس نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی لیکن قانون کے شعبے میں اس کی دلچسپی برائے نام تھی۔ ۱۷۷۴ء میں اس کا شاہکار ناولٹ "ورتھر کی داستان الم" SORROWS OF WERTHER شائع ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ورتھر کے نام سے یورپ اور جرمنی میں کئی کلبیں قائم ہوئیں۔ نوجوان اس المناک رومانی ناول سے اتنے متاثر ہوئے کہ خودکشی کرنے لگے۔ اس ناول نے پورے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۱۷۷۵ء میں اس کا دوسرا عظیم تخلیقی کارنامہ GOTZ VON BERLICHINGEN شائع ہوتا ہے۔ اس کے اس شہکار کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ والٹر سکاٹ نے کیا۔

یہی وہ دور ہے جب اس نے اپنا عظیم ترین تخلیقی شہکار فاؤسٹ، لکھنا شروع کیا جو مختلف وقفوں میں لکھا اور کئی برسوں کے بعد مکمل ہوا۔

۱۷۷۵ء میں وہ اپنے مربی گرینڈ ڈیوک آف سیکس ویمر کی دعوت پر ویمر میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک دانشور اور سیاسی مشیر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اور وزیر کا عہدہ بھی پایا۔ اس کی تخلیقی اور علمی سرگرمیاں جاری رہی۔ اس دور میں گوئٹے علم و شعر کی اقلیم کے بے تاج حکمران کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس کے دور کے لکھنے والے اسے خراج تحسین پیش کرنے آتے ہیں۔ ساری دنیا میں اس کی شہرت پھیل رہی ہے۔ اس کی زندگی میں کئی جذباتی طوفان آئے وہ ۱۸۱۵ء میں وزیر بنا۔ جب جرمن اور فرانس کی لڑائی ہوئی تو وہ اس سے پہلے یورپ کے کئی ممالک کا دورہ کر چکا تھا۔ اس جنگ کو اس نے اپنی یادداشتوں میں قلم بند کیا ہے۔

۱۸۲۸ء میں گوئٹے نے اپنے آپ کو دیگر مصروفیات سے آزاد کر لیا۔ اب وہ اپنے آپ کو علم و شعر کے لیے وقف کر چکا تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو چراسی برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا اور وہ ویمر میں دفن کیا گیا۔

جب وہ مر رہا تھا تو اس نے جو آخری الفاظ کہے وہ یہ تھے۔ روشنی۔۔۔ روشنی۔۔۔

وہ دلچسپ اور مزے دار آدمی تھا۔ جب اس نے بے اعتدالی کی زندگی ترک کی تو اس نے اس زمانے کے رواج کے مطابق وگ پہننا چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نے کافی پینے کی عادت بھی ترک کر دی اور پھر ساری عمر کافی کو منہ سے نہ لگایا۔

اس کی محبتوں کے قصے بھی عجیب تھے۔ ایک دور ایسا تھا کہ وہ بیک وقت دو عورتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک ایسی جو کھاتی پیتی عورت ہوتی اور دوسری بالکل ناتجربہ کار اسے نچلے طبقے کی عورتوں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔

۱۷۸۶ء میں اس کی ملاقات کرسٹین سے ہوئی جو پھول بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازم تھی۔ یہ عورت تھیٹر، شراب اور گوئٹے کی رسیا تھی وہ گوئٹے کے ساتھ مرتے دم تک

رہی گوئٹے اسے اپنی زندگی کی توانائی کہا کرتا تھا۔ پندرہ سولہ برس تک وہ اس کے ساتھ شادی کیے بغیر رہی ۱۸۰۶ء میں انہوں نے شادی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کرسٹین تھی جس نے فرانسیسی یلغار کے زمانے میں گوئٹے کی جان دو فرانسیسی سپاہیوں سے بچائی تھی جو اسے گولی کا نشانہ بنانے والے تھے۔ وہ ۱۸۱۶ء میں انتقال کر گئی اس کی موت کا صدمہ گوئٹے کے لیے بے حد شدید تھا۔ لیکن اس کے باوجود ۷۴ برس کی عمر میں گوئٹے نے پھر ایک عشق کیا اور اس میں ناکام رہا۔

گوئٹے کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ اُردو میں بھی اس کے کئی شاہکار منتقل ہو چکے ہیں۔ ہادی حسین کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ "ورتھر کی داستانِ الم" اور فاؤسٹ کے اُردو میں کئی تراجم ہوئے جن میں فضل حمید کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔

گوئٹے بہت بڑے ذہن کا مالک تھا۔ ایک عظیم عبقری مختلف علوم سے اسے گہرا شغف تھا۔ مذہب اور فلسفے سے بھی اسے خاص تعلق رہا۔ وہ حافظ سے بے حد متاثر تھا اور اس کا مداح بھی تھا۔ اپنے دیوان میں اس نے حافظ کی مدح کی ہے اور عقیدت کا بھرپور اظہار گوئٹے کو تصوف اور علم باطن سے بھی دل چسپی رہی جس کی جھلکیاں اس کے کلام میں ملتی ہیں ایسا ہلکا سا رنگ فاؤسٹ میں بھی موجود ہے۔

علامہ اقبال گوئٹے کے عظیم مداح تھے۔ انہوں نے پیام مشرق جیسی تصنیف گوئٹے سے بے حد متاثر تھے۔ جس کا ثبوت کلام اقبال سے ملتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر اسکے جواب میں کتاب لکھی۔ گوئٹے کا عظیم ترین شاہکار فاؤسٹ کا پہلا حصہ ہے۔ فاؤسٹ نے اسے لافانی بنا دیا یہ اس کا ایک عظیم فن پارہ ہے۔

فاؤسٹ

کونسی چیز ہے جو فاؤسٹ میں نہیں ملتی عظیم شعری تجربہ انسانی دانش اور شعریت کا عظیم ترین امتزاج حقیقت شناسی، طنز، تشبیہہ و تمثیل استعارہ و کنایہ، ہجو، رنج والم حسرت و یاس

منقبت و کرم سفاکی اور رقت اور پھر گوئٹے کا خاص اسلوب۔
انسانی لغزشوں اور خطاؤں کی ایسی تعبیر و تفسیر شاید ہی کسی تخلیقی فن پارے میں اس انداز میں ملتی ہو۔ گوئٹے انسانی خطاؤں اور لغزشوں کے حوالے سے انسانی فطرت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ ہمدردی اور خیر اندیشی کو سامنے رکھتا ہے۔ ان محرکات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے جن کی بدولت انسان لغزش کھاتا اور خطا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔
میفسٹوفلس۔ جرمن دیومالا کا ابلیس ہے۔ گوئٹے نے فاؤسٹ میں ارادی طور پر شیطان یا ابلیس کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ وہ اپنے شیطان میفسٹوفلس کو انجیل کے شیطان سے وابستہ تصورات سے آزاد رکھتے ہوئے ہمہ گیر معنویت کا حامل بنانا چاہتا تھا۔ میفسٹوفلس ایک ایسا کردار ہے جو شیطان یا شیطانی فطرت کی علامت بنتا ہے۔
گوئٹے کے فنی نظریات بھی بے حد فکر انگیز ہیں وہ فن کی کسوٹی خواص اور باذوق لوگوں کے حسن قبول کو قرار دیتا ہے۔ عام لوگ کسی فن پارے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ان کی اسے کچھ پرواہ نہیں گوئٹے کا عقیدہ تھا کہ لکھنے والے کو نفع و نقصان اور داد و بیداد سے بے نیاز ہو کر فن کی بے لوث خدمت کرنی چاہیئے۔
شاعری کے بارے میں گوئٹے کا نظریہ یہ ہے کہ شاعری کا نصب العین یہ ہونا ہے کہ وہ انسانی معاشرے اور اس کے افراد کی زندگی میں ہم آہنگی اور سازگاری کا وسیلہ بنے۔

میفسٹوفلس۔ شیطان کا تصور

گوئٹے فاؤسٹ کے حوالے سے شیطان کی ذات سے بحث نہیں کرتا۔ نہ ہی الٰہیات یا مابعد الطبیعات کے حوالے سے شیطان کی کوئی توجیہہ یا تفسیر پیش کرتا ہے۔ اسے شیطان کی فتنہ پردازیوں اور شر انگیزیوں سے زیادہ دل چسپی ہے۔
گوئٹے کا شیطان ناری ہونے کے باوجود ٹھٹھرے ہوئے جذبات کا مالک ہے۔ یہ شیطان خود کسی طرح کی بہائی یا جنسی معصیت کی استعداد سے محروم ہے۔ جنسی خواہشات اس میں سرے سے موجود نہیں۔ یہ شیطان انسان کی انا (EGO) کو بھڑکاتا ہے اور اس وسیلے سے اپنا کام نکالتا

ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان الجھنوں میں گھرا رہے ۔ اس میں وہ مسرت محسوس کرتا ہے ۔ انسان کی سربلندی اسے منظور نہیں ۔ وہ انسان کا سب سے بڑا حریف ہے ۔ وہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی اور جذبات کو نظر انداز کر کے حوذ لذت دنیاوی میں مصروف رہے ۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل میں کسی اخلاقی قدر کو رکاوٹ نہ بننے دے ۔

" فاؤسٹ " میں شیطان جب فاؤسٹ سے معاہدہ کرتا ہے تو اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے لیے دنیا کی ہر چیز فراہم کرے گا ۔ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی ذمہ داری اس پر ہوگی ۔ اس کے بدلے میں وہ فاؤسٹ سے نصیب آخرت طلب کرتا ہے

شیطان دردمندی اور لطیف جذبات سے عاری ہے ۔ انسانوں کے مصائب و آلام کا اس پر کچھ ردِ عمل نہیں ہوتا ۔ اس کی سرشت میں حیرت و استعجاب کا عنصر بھی غائب ہے نیکی ، بے ریا عمل سے اسے کوئی علاقہ نہیں جہاں لوگ انس و محبت اور یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ شیطان وہاں رخنہ اندازی کرتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خیر کے جذبات اور احساسات سے محروم ہو جائے ۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ انسانی ترقی کے امکانات کی تحریک بھی یہی شیطان دیتا ہے ۔ جب فاؤسٹ ایک جگہ میفسٹوفلس کو لعنت ملامت کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے :

" اے زمین کے لاچار اور بے بس بیٹے ذرا سوچ تو میرے بغیر تو زندگی کے دن کس طرح گزارتا ۔ زندگی کے سوز و ساز اور ذوق و شوق کا سامان کہاں سے لاتا ۔ یاد رکھ اگر میں نہ ہوتا تو اس کرۂ ارض پر تیرا وجود نہ ہوتا ۔ تو اسے چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا ۔ "

علامہ اقبال بھی اس تصور کو پیش کرتے ہیں ۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں ، دارد و شیطان ندارد
نہ دیدہ درد زندانِ یوسف او
زلیخائش دلِ نالاں ندارد
کجا آں لذتِ عقلِ غلط کار

اگر منزل رہ پیچاں ندارد

گوئٹے فاؤسٹ اور مذہب اور خدا

گوئٹے مذہب کے بارے میں منفرد خیالات رکھتا ہے۔ وہ مذہب کا منکر بھی نہیں لیکن کسی ایک مذہب کو حق و صداقت کا واحد اجارہ دار بھی نہیں سمجھتا۔ گوئٹے کے نزدیک مذہب وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ انسانی علم اتنا مکمل اور جاندار نہیں کہ وہ کسی دوسرے مذہب کی صداقت کی قطعی نفی کر سکے۔

فاؤسٹ میں مذہب اور خدا کے بارے جو مکالمہ مارگریٹ اور فاؤسٹ کے درمیان ہوتا ہے وہ گوئٹے کے عقیدے کی نشاندہی کرتا ہے۔

مارگریٹ: مذہب کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ میرے خیال میں آپ نیک طینت اور رحمدل ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو عبادت سے کوئی دلچسپی نہیں۔

فاؤسٹ:۔ ان باتوں کو رہنے دو۔ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔

مارگریٹ:۔ لیکن کیا آپ مائدہ مقدسہ کا احترام نہیں کرتے؟

فاؤسٹ:۔ احترام! ہاں کرتا ہوں۔

مارگریٹ:۔ لیکن آپ ایسا ایمان اور احتیاج کے تحت نہیں کرتے۔ آپ کلیسائی دعا میں شامل نہیں ہوتے۔ خدا سے غافل ہیں۔ اچھا کیا۔ آپ خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟

فاؤسٹ:۔ ڈارلنگ یہ کہنے کی بھلا کسے جرأت ہے کہ وہ یقین رکھتا ہے۔ کسی سے پوچھ کر دیکھ۔ کیا کوئی صاحب معرفت دانا ہو یا اللہ کا بھیجا ہوا بندہ۔ اس کے جواب میں تمہیں ایک خاص انداز کا مضحکہ پن دکھائی دے گا۔

مارگریٹ:۔ تو آپ ایمان رکھتے ہیں؟

فاؤسٹ:۔ میری پیاری اغلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایمان ایک ایسا لفظ ہے جسے زبان پر لانا آسان نہیں۔ کون ہے جو یہ دعوےٰ کر سکتا ہو کہ اس کا ایمان حق الیقین

کی حد تک پہنچ گیا اور کون ہے جسے وحی و الہام سے کچھ بھی وجدانی احساس ہوا اور وہ اسے ڈھونگ اور فریب سے تعبیر کر سکے۔ وہ جس کی وجہ سے تمام موجودات قائم ہیں اور جو تمام کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کیا وہ مجھے اور تمہیں اپنے دامن میں لیے ہوئے نہیں؟ تم اسے جو نام چاہے دو۔ اسے نور کہو، سرور کہو، محبت کہو، دل کہو، اپنا خدا کہو، میں تو اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ سب کچھ احساس ہے۔ ناموں کی حیثیت غل غپاڑے اور گرد و غبار سے زیادہ نہیں۔ یہ نورِ عرش اور ہمارے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔

فاؤسٹ کا انتساب

اپنے شہکار کا انتخاب گوئٹے نے اپنے مرحوم دوستوں کے نام کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "پیاری یادو اور محبوب سایو۔ اٹھو کہ ایام خوش تمہیں آئینہ دار ہو۔ وہ ہجوم و مجمع وہ جوش تمہیں آئینہ دار ہو۔ وہ ہجوم و مجمع جو جوش محبت کی گرمی رکھتا تھا، بکھرا اور رخصت ہوا اور ان کی تحسین قدر شناس ہی مرچکی ہے۔ میرے نغمے کے الم انگیز موضوع کا یہ مقدر ہے کہ اسے اجنبی سنیں اور اس طرح کی تحسین ناشناس کریں جو مجھے نیم جان کر دیتی ہے۔ اس انتساب میں گوئٹے معنوی اور جسمانی قرب کا فرق بھی واضح کرتا ہے۔ وہ قربِ معنوی کو جسمانی قرب سے زیادہ طاقتور اور موثر سمجھتا ہے۔

"میں آنسو بہاتا ہوں۔ میں لرزہ براندام ہوں۔ وہ سب جو میرے پاس ہے وہی مجھ سے دور ہے، وہ سب جو میں کھو چکا ہوں وہی میرے لیے صبر سے بڑی حقیقت ہے۔ وہی میرا رہنما ستارہ ہے۔"

عرش پر تمہیدی مکالمہ

آخر میں گوئٹے کے عظیم شہپارے فاؤسٹ کے ابتدائی حصے "عرش پر تمہیدی مکالمے" کے کچھ ٹکڑے پیش ہیں۔ اس منظر میں خداوند قدسیاں عرش اور شیطان کے علاوہ اسرافیل، جبرائیل اور میکائیل کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ شیطان (مفسٹوفلس) کہتا ہے۔

اس سے پہلے آپ کی نظر عنایت مجھ پر رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس کاروبار میں ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہو جاؤں۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اگر میری زبان متبذل ہو۔ اصل میں یہاں میری وضاحت و ملامت کا جواب حقارت سے دیا جائے گا۔ میرے سوز و گداز پر قہقہے لگائے جائیں گے۔

آپ کے سورج اور آپ کے عالم میری نظر و ادراک سے ماورا ہیں۔ میں تو انسانوں کی زبوں حالات کو بچشم غور دیکھتا ہوں۔

زمین کا یہ ناقص دیوتا وہی خبیث روح والا ہے۔

جو روز ازل یا نور کی تجلی اول میں تھا۔

اس بے چارے کی زندگی آپ کے فیض سماوی کی ضد فگی کے بغیر کم دشوار ہو سکتی تھی۔ وہ اسے عقل کا نام دیتا ہے اور اس فلکی روشنی کو صرف اس لیے استعمال کرتا ہے کہ بہمیت میں بہائم کو پس پشت ڈال دے۔

یہ مخلوق، یہ آدمی، مجھے ایسا لگتا ہے۔ میں حضور اقدس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ انسان جھینگر کی طرح ہے۔ اپنی جگہ پر پھلانگتا ہے اور اپنی لمبی ٹانگوں سے پرواز کے لیے جست لگاتا ہے۔ اور پھر گھاس پر گر کر پرانے راگ الاپنے لگتا ہے۔

مگر یہ گھاس کے میدانوں پر آرام کرنے پر ہی قناعت نہیں کرتا، بلکہ گندگی کے ڈھیر تلاش کرتا ہے تاکہ اس کے اندر اپنی ناک گھسیڑ سکے۔

خداوند:۔ ۔۔۔۔ کیا روئے زمین پر تمہیں کوئی چیز پسندیدہ دکھائی نہیں دیتی ۔۔۔۔

شیطان:۔ خداوند۔ آدمی ۔۔۔۔ قباحتوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یہ ناقص وجود مجھے تو اب انہیں ستانا ہی بار خاطر اور عذاب جان معلوم ہوتا ہے۔

خداوند:۔ کیا تم فاؤسٹ کو جانتے ہو۔

شیطان:۔ وہ صاحب علم، وہ علامہ

خداوند:۔ ہاں وہی میرا خدمت گار۔

شیطان:۔ واقعی خداوند۔ وہ ایک عجیب گرم جوش تہی دامن ہے۔ خور و نوش کے

کے ارضی سامان سے دست کش ہو گیا ہے جو بخار اسے لاحق ہے وہ اسے کسی اونچی سطح پر لیے جا رہا ہے۔ وہ زمین سے مسرت وفن کی طلب کرتا ہے۔ دور ونزدیک جو بھی باعث جذب و انبساط ہے۔ اس کے دل کی بے چینی کے لیے ناکافی ہے۔

خداوند:۔ وہ میرا خدمت گزار، سرگراں و پریشان ہے۔ لیکن جلد ہی میرا نور اس کی یاسیت کو ختم کر دے گا۔

شیطان:۔ کیا آپ شرط لگاتے ہیں کہ آپ اسے ضائع نہ ہونے دیں گے، اگر آپ معترض نہ ہوں تو میں اسے اپنی پسندیدہ راہوں پر چلانے کی ہدایت کروں گا۔

خداوند:۔ تمہیں یہ اجازت دی جائے گی کہ اپنی من مانی کرتے رہو۔ اور جب تک انسان زمین کا سکونتی رہے گا۔ انسان کے لیے سعی لازم ہے اور اس سعی میں خطا کا سرزد ہو جانا ناگزیر ہے۔ تمہیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر ہو سکے تو اس کی روح کو بہلا پھسلا کر اس کے خالق حقیقی سے الگ کر دو۔

کسی ہلاکت آفریں لمحے میں اگر تم اسے حتمی طور پر اپنی قوت کا تابع بنا سکتے ہو تو اسے اپنے ساتھ پستیوں میں گھسیٹ کر لے جاؤ لیکن شرم وندامت سے اس وقت کھڑے ہونا جب تمہیں اعتراف کے لیے بلایا جائے کہ ایک اچھا آدمی اپنے تیرہ سرگرداں سفر ہستی میں راست بازی اور نیک کرداروں کی راہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

شیطان

مجھے منظور ہے۔ میرا معاملہ تو بازی جیتنے والے گھوڑے کی طرح ہے۔ مجھے اپنی کامیابی پر کوئی شبہ نہیں پھر بھی میں جیت گیا تو میرے لیے زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا ہوگا۔ مناسب جشن فتح وکامرانی و رجنوں بگل جو بج رہے ہوں۔

خداوند

نفی وانکار کی جگہ جملہ قوتوں میں شیطان کا بار سب سے کم گراں ہے۔ آدمی کی سعی اس کے

کے مقام کی مناسب سطح سے کم تر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ غیر مشروط اور لامحدود راحت و عافیت کا طالب رہتا ہے۔

میں تجھ ایسی بدذات کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ تو آدمی کو ستائے اور اکسائے اور خدمت خلق کے لیے لعنت کرے۔ باوجودیکہ یہ شیطان ہے۔

لیکن تم عالم بالا کے فرزندان باوفا زندہ حسن کے نظارہ کی بھرپور دولت سے مسرور ہو جاؤ گے۔ تمہاری عقل مجروح کو عشق کی لافانی بتوں کے درمیان لپیٹ لیا جائے گا۔ اور ان تمام چیزوں کو جن کی بہتی ہوئی تمثیلی مشابہت حیات کی آئینہ دار ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والے خیال میں جاگیر کتا سے قائم و دائم رہے گی۔

عرش بند ہو جاتا ہے۔ ملائکہ مقربین رخصت ہوتے ہیں۔ شیطان اپنے آپ سے ہمکلام ہے) میں چاہتا ہوں کہ حاکم اعلیٰ سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی رہے۔ یوں باہمی تعلقات شائستہ و خوشگوار رہیں گے۔ یہ صدر اول کی مہربانی اور عنایت تھی کہ شیطان کے ساتھ بھی اس نے تکلف سے گفتگو کی۔

اے ڈالز ہاؤس

۱۸۷۹ء میں پہلی بار ابسن کا کھیل "اے ڈالز ہاؤس" (گڑیا گھر) سٹیج کیا گیا۔ یوں تو ابسن کے قریباً سبھی کھیل بحث کا موضوع بنے اور وہ جدید ڈرامے کا وہ آدمی ہے جس کے ڈراموں پر شاید سب سے زیادہ لکھا گیا اور بحث ہوئی لیکن "اے ڈالز ہاؤس" پر جتنی بحث ہوئی۔ اتنی شاید ابسن کے کسی دوسرے کھیل پر نہ ہوئی۔

ابسن کے مداحوں کی تعداد اس کے دور میں بھی بہت کثیر تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور فنی عظمت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ جارج برنارڈ شا جو شیکسپیئر کا حریف سمجھا جاتا ہے اور خود شا کا بھی دعوے تھا کہ وہ شیکسپیئر سے بہتر ڈرامہ نگار ہے۔ وہی شا ابسن کا پُرجوش مداح تھا۔ اس نے ابسن کے ڈراموں پر ایک کتاب بھی لکھی۔ اور ابسن کے کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کے بارے میں ایک جملہ ایسا کہا تھا جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ کیونکہ اس جملے میں شا نے جس رمزیہ اور فنکارانہ انداز میں ابسن بلحاظ اس کے کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ابسن کے اس کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کی ہیروئن کا نام نورا ہے۔ آخری سین کا اختتام یوں ہوتا ہے کہ نورا دروازہ کھول کر اپنے شوہر کے گھر سے نکل جاتی ہے اور جاتے وقت کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پردہ گر جاتا ہے۔ شا نے جو جملہ کہا تھا وہ اس پس منظر کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ شا نے کہا تھا،

"نورا جب اپنے دروازے کو بند کر کے نکلتی ہے، اس کے ساتھ ہی سٹیج کی دنیا میں کئی نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

ابسن نے ڈرامے کی دنیا میں کئی در وا کیے۔ ناروے کے اس ڈرامہ نگار کے ڈراموں نے ڈرامہ نگاری کی صنف کو عالمی سطح پر متاثر کیا اور ڈراموں میں ریئلزم REA-LISM کا ایک خاص عنصر ابسن کے فن کے حوالے سے عالمی ڈرامے میں نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔

ابسن ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء کو ناروے کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد بارسوخ اور کھاتا پیتا آدمی تھا۔ لیکن ابسن ابھی لڑکپن میں ہی تھا کہ اس کے والد کے حالات خراب ہو گئے۔ پورے کنبے کو قصبہ میں چھوڑ کر ایک گاؤں میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔ تاکہ نامساعد حالات میں زندہ رہا جا سکے۔ چند برسوں کے بعد یہ کنبہ واپس اپنے آبائی قصبے (SKIEN) آگیا۔

ابسن کی زندگی پر الم و مایوسی کے سائے بہت گہرے تھے۔ وہ افسردہ دل نوجوان تھا جو پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس زمانے میں اس نے مصوری کا شغل بھی اپنایا۔ وہ حالات کے ہاتھوں سکول میں بھی پوری تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ اسی زمانے میں ابسن نے شعر کہنے شروع کیے۔ اور اپنا ادبی مقام بنانے کے لیے طویل جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۲۲ برس کی عمر میں وہ اپنا گھر چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لیے کرسٹانیا چلا آیا اور پھر ۱۸۵۰ء میں اس نے ایک المیہ کھیل "کیٹلینا" شائع کرایا۔ جسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ پانچ برس تک ایک تھیٹر میں ادبی مشیر کی حیثیت سے ملازم رہا۔ اس زمانے میں اس نے کئی ڈرامے بھی پروڈیوس کیے۔ بعد میں وہ ایک نئے تھیٹر میں ہدایت کار بن گیا۔ لیکن یہ تھیٹر نہ چل سکا۔ تو وہ ایک دوسرے حریف تھیٹر میں ملازم ہو گیا۔ یہ زمانہ ابسن کی زندگی کا تاریک دور تھا۔ وہ اپنے لیے جو تخلیقی اور ادبی منصوبہ بندی کرتا تھا۔ اس میں اسے ناکامی ہو جاتی۔ وہ سرکاری مدد اور ملازمت کا خواہاں تھا۔ لیکن سرکاری مشینری اور اس کے نظام پر طنزیہ کھیل۔ اس کی راہ میں رکاوٹ

بن جاتے حکومت اس سے خوش نہ تھی اسکے موضوعات سے کسی طرح کی مفاہمت نہ کرتے تھے۔ اس کے بیشتر کھیلوں کا موضوع سماجی مسائل ہیں۔ ان سماجی مسائل کو کرداروں اور ڈرامائی کشمکش اور تدبیر کاری کے حوالے سے ابسن جس انداز سے پیش کرتا تھا۔ اس پر ہی لوگ سٹپٹا اُٹھتے تھے۔ کیونکہ انہیں ان میں اپنا عکس دکھائی دیتا تھا۔

ابسن کے ڈرامے اس دور کے سطحی ڈراموں کے خلاف ایک احتجاج بھی تھے۔ وہ بہت بڑا فنکار تھا۔ اپنے ڈراموں میں وہ جو کردار اور ڈرامائی واقعات پیش کرتا۔ وہ بحث کا گرماگرم اور نزاعی موضوع بن جاتے تھے۔ سماجی مسائل کو ایسے منفرد اور حقیقی انداز میں پیش کرتے ہوئے ابسن فن کی تمام نزاکتوں اور قدروں کا پورا خیال رکھتا تھا وہ ان ڈراموں کو "اصلاحی" کھیل نہیں بننے دیتا تھا۔ وہ مصلح نہیں۔ ایک سچا اور عظیم فنکار تھا وہ بہت حد تک قنوطی بھی تھا۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کے ڈراموں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ اس کے ہاں مایوسی اور قنوطیت کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً اس کی اپنی زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں تھیں۔ تاہم وہ اپنے عہد کی سوسائٹی کے بارے میں شک میں مبتلا تھا۔ وہ اس نظام کو ناپسند کرتا تھا۔ اسکے ہاں سوسائٹی کی جو تصویر بنتی ہے وہ قنوطیت اور مایوسی کا تاثر مرتب کرتی ہے۔ اس کے کھیلوں میں مزاح نہیں ملتا۔ لیکن طنز اتنی کاٹ دار اور گمبھیر ہے کہ جو انسان کے اندر تک کو کاٹ دیتی ہے۔ وہ اپنے ہر کھیل میں "حقیقت" کا پورا خیال رکھتا ہے۔ وہ سچائی اور حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کے بعض کھیل اپنے موضوعات کی وجہ سے اسی عہد میں مقید دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ابسن کے بیشتر کھیل آفاقی موضوعات پر مبنی ہیں۔

ابسن کو ایک خاص انفرادیت حاصل ہے۔ ابسن سے پہلے اور ابسن کے بعد شاید ہی ڈرامہ کی دنیا میں کوئی ایسا ڈرامہ نگار گزرا ہوگا جو خالص انفرادیت، تخلیقی صلاحیت اور ہنرمندی کا مالک ہو۔ اس نے سماجی مسائل، برائیوں اور سیاسی کرپشن کے موضوعات کو ایسی ہنرمندی اور صلاحیت سے برتا ہے کہ انہیں "اصلاح" کے قریب آنے دیا۔ نہ

پروپیگنڈے کے۔ ان سیاسی اور سماجی برائیوں اور کرپشن کو وہ تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے
ارتھر ملر جیسے عظیم ڈرامہ نگار نے اسے اس حوالے سے زبردست خراج تحسین پیش کرتے
ہوئے منفرد و یکتا ڈرامہ نگار کہا ہے۔

" اے ڈالز ہاؤس " ابسن کا سب سے اہم مقبول اور نزاعی کھیل سمجھا گیا ہے اس
کھیل کی ہیروئن نورا شادی شدہ ہے۔ وہ اپنے خاوند کے لیے ایثار کرتی ہے جو ایک
جرم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ قرض رقم لیتی ہے وہ اپنے شوہر سے اس بات کو چھپاتی ہے۔
اور اس کا شوہر اس کے ایثار کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ابسن کو جو ماحول ملا وہ ناخوشگوار اور ناساز گار تھا۔ اسے تبدیل کرنے کے لیے
اس نے بہت جتن کیے لیکن جب کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے ۳۸ برس کی عمر
میں اپنا وطن چھوڑ کر رضا کارانہ جلا وطنی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ۲۵ برس تک
اپنی مرضی سے جلا وطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کو جرمنی
اور اٹلی میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

نورا۔ کے اندر ایک ایسی انقلابی باغی تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو کسی ہیروئن کے
ہاں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ گھر بار اور شوہر کو چھوڑ کر اپنی انفرادیت اپنی آزادی اور اپنی
ثقافت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔

جب یہ کھیل سٹیج ہونے والا تھا تو اس وقت بھی اس پر بہت لے دے ہوئی۔
اور بعد میں بھی اس پر بہت بحث ہوئی۔ کیونکہ یورپی معاشرہ عورت کو آزادی دینے
کے حق میں نہ تھا۔ وہ عورت کو مخصوص حدود میں پابند دیکھنا چاہتا ہے خاندانی نظام کا
تقدس برقرار تھا۔ نورا اسے توڑتی ہے۔ وہ مرد کی برتری کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ نئے عہد
کی آزاد اور طاقتور عورت بن کر نمایاں ہوتی ہے۔

نورا۔ عالمی ڈرامے کا منفرد اور یکتا کردار ہے

" اے ڈالز ہاؤس " کی عظمتوں اور معنویت کا موقع ملا۔ وطن سے باہر جا کر اس کا ستارہ
چمکا۔ اٹلی میں اس نے "پیئر جنٹ" اور "برانڈ" جیسے کھیل لکھے۔ جنہوں نے اسے شہرت

سے ہمکنار کر دیا۔ ان کھیلوں کی شہرت اس کے ملک پہنچی اور اس کی قدر بھی ہوئی۔ اس کے لیے پنشن بھی حکومت کی طرف سے جاری کر دی۔ یوں مدتوں کے زخم مندمل ہو گئے۔

ابسن ۴۹ برس کا تھا۔ جب اس کا عظیم طربیہ شاہکار "دی لیگ آف یوتھ" منظر عام پر آیا۔ ۱۸۷۷ء میں اس کا ایک اور شاہکار "پلرز آف سوسائٹی" شائع ہوا اور کوپن ہیگن میں کھیلا گیا۔ اس کھیل کو ایسی بے مثال کامیابی حاصل ہوئی کہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کھیل یورپ کے کئی ملکوں کی سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔

اور پھر ۱۸۷۹ء میں "اے ڈالز ہاؤس" سامنے آیا۔ جس نے ایک ہنگامہ اور طوفان بپا کر دیا۔ بھوت (GHOST) ۱۸۸۱ء میں کھیلا گیا۔ اس کے بعد ابسن نے جو ڈرامے لکھے ان میں "عوام کا ایک دشمن" AN ENEMY OF THE PEOPLE وائیلڈ ڈک، ہیڈا گیبلر، معمار اعظم THE MASTER BUILDER وغیرہ شامل ہیں۔

۱۸۹۱ء میں ابسن وطن واپس آیا اور کرسٹانیا میں رہائش پذیر ہوا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اسے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اب تک ابسن کو عالمی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ملکوں ملکوں اس کے کھیل سٹیج ہو چکے تھے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتے تھے۔

ابسن کی سترویں سالگرہ ایک تہوار کی طرح منائی گئی۔ اب واقعی ابسن کے دل سے اپنے ہم وطنوں کی بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کا داغ مٹ چکا تھا۔ وہی تھیٹر جس میں ملازمت کرتے وہ مایوسی کا سامنا کرتا تھا اور اپنا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ کرسٹانیا کے اسی تھیٹر کے سامنے اس کی زندگی میں اس کا مجسمہ نصب کیا گیا۔

۲۳ مئی ۱۹۰۶ء کو ابسن کا انتقال ہوا، تو پورے ملک میں اس کی موت کا سوگ منایا گیا اور پوری دنیا نے رنج اور غم کا اظہار کیا۔

ابسن کا فن اور "اے ڈالز ہاؤس"

ابسن کا سارا کام انگریزی اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے اردو میں

اس کے کھیل ترجمہ ہوئے ہیں۔ وہ میری یادداشت کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں۔ "اے ڈالز ہاؤس" کا ترجمہ قدسیہ زیدی کر چکی ہیں اور برصغیر پاک و ہند میں یہ کھیل سٹیج بھی ہوا ہے۔ کنڑا اور تامل زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔ اور اس کو کھیلا بھی گیا ہے۔ وائیلڈ ڈک کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ "ادب لطیف" میں شائع ہوا تھا۔ غالباً کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ ابسن کے اہم ترین کھیلوں میں سے ایک کھیل "دی ماسٹر بلڈر" ہے۔ یہ ابسن کی زندگی کے آخری دور کا کھیل ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذہنی اور تخلیقی کشمکش کا بھی مظہر ہے۔ اردو میں اس کھیل کا ترجمہ ایک مبسوط دیباچے کے ساتھ مرحوم عزیز احمد نے کیا تھا جو شائع ہوا اور ان دنوں نایاب ہے۔

ہمارے عہد میں تو ابسن کے کھیل کو سمجھنا اور قبول کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن ابسن کے دور میں اس کے ہر کھیل پر اختلاف رائے کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ اس کا ہر کھیل لوگوں کو جھنجھوڑتا تھا۔ اس کے کھیل لوگوں میں اشتعال پیدا کرتے تھے۔ کیونکہ ابسن کا کھیل۔ جدید ہوتا تھا۔ وہ حقیقت پسندی کا مظہر ہوتا۔ اس میں ایسی بے باکی اور طنز ہوتی تھی کہ جو اپنے ہدف کو تلملانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے کھیل کے موضوعات کا صحیح ادراک تو کھیل پڑھ کر یا دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے لیکن اس کھیل کے حوالے سے کچھ باتیں کرنے سے پہلے میں اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے عہد میں یہ کھیل۔ ایک بڑی فلم کی صورت میں پیش ہو چکا ہے۔ اس فلم میں نورا کا کردار، ہمارے عہد کی انتہائی ذہین اور عورتوں کی آزادی کی علمبردار اداکارہ جین فونڈا نے ادا کیا تھا۔ میری طرح جن لوگوں نے اس فلم کو دیکھا ہو گا وہ یقیناً ابسن کے عظیم کھیل کی معنویت اور جین فونڈا کی پرفارمنس سے بے حد متاثر ہوئے ہوں گے۔

"اے ڈالز ہاؤس" کا موضوع اپنے عہد کے اور سماج کے تقاضوں اور پابندیوں کے بالکل برعکس اور متضاد تھا۔ بلکہ یہ اس دور کی سماجی اخلاقیات اور رشتوں کو للکارتا ہے۔ اس کھیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کھیل بیحد عظیم ہے۔ لیکن اس کا موضوع اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ "اے ڈالز ہاؤس" ساری

دنیا کی پسماندہ اور کچلی ہوئی عورتوں کے اندر کی توانائی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کھیل کا موضوع اور اس میں جو مسئلہ پیش کیا گیا ہے، وہ کھیل سے عظیم تر ہے۔

"اے ڈالز ہاؤس" دنیائے تمثیل کا بے مثل شاہکار ہے۔ ابسن کا فن پارہ عالمی ادب کا ناقابل فراموش اور لازوال شاہکار ہے۔

ڈیکمرون

دنیا کے کسی ملک کی ادبیات کا جائزہ لے کر دیکھیں۔ وہاں ہمیں حکایتوں اور داستانوں کی فراوانی ملے گی۔ ان حکایتوں اور داستانوں کی کئی صورتیں ہیں۔ اساطیری، تاریخی، دیومالائی اور پھر لوک داستانیں۔ ان میں بعض ایسی لوک داستانیں بھی ملتی ہیں۔ جن کا مطالعہ بے حد دلچسپی اور تعجب کا باعث بنتا ہے کہ ایسی بیشتر کہانیاں اور لوک داستانیں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں جو بہت سے ملکوں میں تقریباً ایک ہی طرح سے معمولی ترمیم و اضافے کے ساتھ صدیوں سے سنائی جا رہی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ بنتا ہے کہ ایک ہی لوک کہانی، جو ایک خاص خطے اور تہذیب کا ٹکڑا ہونے کے ساتھ اس خطے کے لوگوں اور تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسے دوسری انجان زبان اور دور دراز کے ملک تک کس طرح رسائی حاصل ہو گئی۔

تاریخی، دیومالائی، لوک اور اساطیری داستانوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ملکوں اور زبانوں میں ہمیں داستانی ادب بھی ملتا ہے۔ جو کہیں تو لوک یا تاریخی کہانیوں سے اخذ و استفادہ کر کے لکھا گیا ہے یا پھر خود طبع آزمائی کی گئی ہے۔

ایسی ہی داستانوں میں اٹلی کے مصنف گیووانی بوکیچیو کی کتاب "ڈیکمرون" ہے۔ جو داستانوں کا مجموعہ ہے اور اس مجموعے کی کہانیوں کو پوری دنیا میں شہرت حاصل ہے اور تقریباً ہر بدیسی زبان میں ان کا ترجمہ ہوا ہے۔ اور ان کہانیوں سے ان گنت مصنفوں نے فیض اٹھایا ہے۔ گیووانی بوکیچیو کی "ڈیکمرون" کے عالمی ادب پر اثرات بے حد گہرے ہیں۔ چاسر کی "کنٹربری ٹیلز" ہو یا شیکسپیئر کے ڈرامے۔ سب "ڈیکمرون" سے واضح طور پر متاثر اور فیض یاب ملتے ہیں۔

اٹلی اور اطالوی زبان کا یہ عظیم مصنف گیووانی بوکیچیو ۱۳۱۳ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ گیووانی بوکیچیو (GIOVANNI BOCCACCIO) کا والد فلورنس کا ایک خوشحال اور دولت مند تاجر تھا۔ اس کی والدہ کا تعلق فرانس کی اشرافیہ سے تھا۔

دنیا کے بیشتر خلاق اور طباع لوگوں کی طرح بوکیچیو بھی ابتدائی عمر میں ہی شاعری اور ادب میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگا تھا۔ اس کا یہ شوق اس کے والد کو مطلق پسند نہ تھا۔ اور وہ اکثر اس کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ والد کی خواہش یہ تھی کہ وہ تاجر بنے۔ اس لیے ابھی بوکیچیو کی عمر دس برس تھی کہ اس کے والد نے اسے اکاؤنٹنسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیپلز بھیج دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بیٹے کو حساب کتاب اور ہندسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو اس نے اسے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے دیا۔ بوکیچیو کا جی اس میں بھی نہ لگا۔ وہ تو ادب و شعر پر جان چھڑکتا تھا۔ جب وہ ذرا بڑی عمر کا ہوا تو اس نے والد کی ناراضی کی پرواہ کیے بغیر شعر لکھنے شروع کر دیے۔ لیکن اس کی کسی جانب سے حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ اس نے اطالوی اور لاطینی زبان میں شعر لکھنے کا آغاز کیا تھا۔

اس زمانے میں نیپلز کے بادشاہ ابرٹ کا دربار علم و فنون کا مرکز بن چکا تھا۔ بوکیچیو نے اس دور کے بڑے لکھنے والوں، دانشوروں سے اپنے تعلقات استوار کر لیے اور انہی لکھنے والوں اور دانشوروں میں سے کسی نے بوکیچیو کی نثر کی بڑی تعریف کی۔ اور اسے مشورہ دیا کہ وہ نثر لکھا کرے۔

اسی زمانے میں بوکیچیو نے دانتے کو پڑھا اور پھر وہ ساری عمر دانتے کا پرخلوص اور پرجوش قاری رہا۔

بوکیچیو کو ایک اور شوق بھی تھا۔ نادر اور کلاسیکی کتابوں کے مسودے جمع کرنے کا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بھاری قیمت پر "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کے اولیں نسخوں کو خریدا تھا۔ یونان کے ساتھ اسے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی تو اس نے دیوتاؤں کا شجرۂ نسب لکھنا شروع کیا جو پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اس کام کے بارے میں بعض محققوں اور نقادوں کا کہنا ہے کہ اب تک کسی نے دیومالا پر اتنا ضخیم اور تفصیلی کام نہیں کیا ہے۔

بوکیچیو بڑی تخلیقی صفات کا مالک، بڑا فاضل عالم اور آزاد خیال مفکر تھا۔ دنیا میں اس کی داستانوں کے مجموعے "ڈیکیمرون" کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کے دوسرے بڑے کام اور خوبیاں اس شہرت کے سائے میں دھندلا کر رہ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ جن دنوں وہ نیپلز میں تھا۔ اس کو ایک ایسی خاتون سے عشق ہو گیا جس کے بارے میں یہ افواہ یقین کی حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ خاتون نیپلز کے بادشاہ رابرٹ کی ناجائز بیٹی ہے۔ اس خاتون کے عشق میں بوکیچیو نے ایک رومان نثر میں لکھا اور پھر ایک رزمیہ نظم۔

۱۳۴۲ء میں بوکیچیو فلورنس چلا آیا۔ مگر وہاں اس کا جی نہ لگا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر نیپلز واپس آ گیا جہاں اس نے بعض اور کتابیں اور طویل نظمیں لکھیں۔ اور پھر اسی دور میں اس نے "ڈیکیمرون" کو لکھنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے اسے عالمگیر اور ابدی شہرت حاصل ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بوکیچیو نے "ڈیکیمرون" کی داستانیں بادشاہ رابرٹ کی بیٹی اور وارث جوآنا کی خوشنودیٔ طبع کے لیے تحریر کی تھیں۔

"ڈیکیمرون" میں جو داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے لیے بھی بوکیچیو نے ایک پس منظر تخلیق کیا ہے۔ یہ پس منظر یہ ہے کہ فلورنس میں طاعون پھیل جاتا ہے۔ سات خواتین اور تین مرد بھاگ کر ایک دیہاتی مکان میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں وقت کٹی کے لیے وہ ایک دوسرے کو ہر روز ایک نئی کہانی سناتے ہیں۔

۱۳۵۰ء کے لگ بھگ بوکیچیو دوبارہ فلورنس واپس آیا۔ جہاں اس کو کئی سفارتی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس کا شمار معزز ترین شہریوں میں ہونے لگا۔ نیپلز سے واپس آ کر اعلیٰ سفارتی عہدوں پر فائز ہونے والا بوکیچیو ایک عرصے تک ذہنی بحران کا شکار رہا۔ نیپلز میں اس نے جو زندگی گزاری تھی۔ اس پر وہ شدید ندامت کا اظہار کرتا تھا۔ نیپلز میں بے اعتدالی اور عیش و عشرت میں گزرنے والے دنوں کی تلافی کر کے اپنے ذہنی بحران کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحبِ ضمیر انسان تھا۔

۱۳۷۳ء میں اسے ایک اور اعزاز سے نوازا گیا اور اسے فلورنس میں دانتے پر سند سمجھتے

ہوئے دانتے پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ یہ منصب اس کو بہت عزیز تھا۔ وہ دانتے کو پڑھانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ دانتے کے شارح کی حیثیت سے اسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

اس کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بیماری کے باعث اس نے ایک گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ اور یہیں ۱۶ دسمبر ۱۳۷۵ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

ڈیکمرون ایک بڑا تخلیقی کارنامہ ہے۔ صدیوں سے پڑھنے والے اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اور بلاشبہ صدیوں سے دنیا کے بعض بڑے لکھنے والوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جس کے حوالے سے شیکسپیئر اور چاسر کا ذکر آ چکا ہے۔ نثر نگاروں، کہانی نویسوں اور ڈرامہ نگاروں نے ڈیکمرون سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

۱۳۴۸ء سے ۱۳۵۳ء تک مکمل ہونے والی ڈیکمرون کی تاثیر اور ادبیت کا اصل راز یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل عوام کی کتاب ہے۔ خواص نے تو اس سے جو استفادہ کیا۔ وہ اپنی جگہ، لیکن ان داستانوں میں ایک ایسی اپیل ہے کہ اسے دنیا بھر کے عوام نے سراہا اور پسند کیا۔ اس کتاب کی داستانوں نے اٹلی سے سفر کیا اور ساری دنیا کے لوگوں اور ملکوں میں پھیل گئیں۔

ڈیکمرون کی دلچسپی کا ایک بڑا باعث یہ بھی ہے کہ ان داستانوں کا موضوع عورت اور مرد کے تعلقات ہیں۔ اس کی بعض کہانیوں کا لہجہ اور تاثر قدرے درشت بھی بنتا ہے۔ ایک زمانے میں بعض قدامت پسند تنگ ظرف نقادوں نے ان پر فحاشی کا الزام بھی لگایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع کے حوالے سے یہ بنی نوع انسان کی داستانیں بنتی ہیں اور ان میں بہت نرمی اور گھلاوٹ ہے۔

مثلاً ڈیکمرون میں بیان کی جانے والی دسویں دن کی کہانی جو فلوسسٹرا لو کی کہانی ہے بے غرضی اور ایثار کی ایک بے مثل داستان ہے۔ جسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ پہلے دن بیان کی جانے والی فیلو مینا کی داستان۔ ایک دلچسپ اور ذکاوت سے پُر کہانی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کہانی جدید کہانی قرار دی جا سکتی ہے۔ مذہبی بردباری اور تحمل کو جس تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کہانی کی خاص قوت ہے۔

ڈیکمرون کی بیشتر داستانوں میں عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے بیان کے ساتھ ساتھ جو خوش ذوقی، بہجت اور مزاح پیدا ہوتا ہے۔ اس نے ان داستانوں کو خاص معنویت، تاثیر اور چمک دمک عطا کی ہے۔ کتاب کا مجموعی تاثر پُرمزاح اور شگفتہ ہے۔ اس سلسلے میں چھٹے روز بیان کی جانے والی نینفائل کی کہانی کو خاص طور پر بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

نقادوں نے خاص طور پر ڈیکمرون کی نثر کی تعریف کی ہے۔ ڈیکمرون کے تراجم دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں اس کا متعدد بار ترجمہ اور انتخاب شائع ہوا ہے ہربرٹ الیکسنڈر کا ترجمہ اور انتخاب خاص طور پر مشہور ہے۔

اردو زبان میں اگرچہ ڈیکمرون کی داستانیں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوسکیں۔ تاہم بعض داستانوں کا ترجمہ ہوا ہے اور وہ بعض رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔

ایک کہانی کی تلخیص پیش ہے۔

دسواں دن۔ فلورسٹراٹو کی کہانی

فلورسٹراٹو کی کہانی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ کہانی ہے جو دسویں دن فلورسٹراٹو نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو سنائی۔

ملک ختا میں ایک معزز خاندان اور حسب نسب کا معزز انسان رہتا تھا۔ وہ اتنا دولت مند تھا کہ کسی کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا نام ناتھن تھا۔ وہ سخی اور فیاض تھا۔ انسانوں کے کام آتا تھا۔ ناتھن نے شاہراہ عظیم پر جہاں سے لوگ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق جانے کے لیے گزرتے تھے۔ ماہر کاریگروں اور معماروں کی کثیر تعداد کی خدمات حاصل کرکے عالیشان محلات تعمیر کرلئے۔ ان محلات کی تعمیر کے بعد ان کو سجایا اور سنوارا گیا۔ ان محلات میں دنیا بھر کی چیزیں یکجا کردی گئیں۔ اور ہر چیز جسکی انسان کو کسی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی وہاں فراواں مقدار اور تعداد میں موجود تھی۔ دن رات وہاں مسافروں، ضرورت مندوں اور مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا، ناتھن کے دروازے سے کبھی کوئی شخص مایوس نہ لوٹتا تھا جو جس نے مانگا اس نے اسے دے دیا۔ جس نے جتنے دن

وہاں رہنا چاہا اسے وہاں قیام و طعام اور آرام کی سہولتیں فراہم کر دی گئیں۔ ناحتن کی شہرت پورے ملک اور، ملک سے باہر بھی پھیل گئی ۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کی داستانیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔

ناحتن کے محلات اور مہمان خانوں سے بہت دور ایک معزز خاندان کا ایک نوجوان رہتا تھا جس کا نام میتھر ڈینز تھا۔ جب اس کے کانوں تک ناحتن کی یہ شہرت پہنچی تو وہ اس شہرت سے حسد کرنے لگا۔ میتھر ڈینز بھی اپنے آپ کو ناحتن جتنا دولت مند سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب میں بھی اتنا دولت مند ہوں تو پھر یہ شہرت جو ناحتن کو حاصل ہے مجھے ملنی چاہیے۔ اس نے دولت کو پانی کی طرح بہانا شروع کیا۔ اس نے بھی ناحتن کی طرح محلات اور مہمان خانے تعمیر کرا دیے۔ وہ بھی لوگوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے لگا۔ بلاشبہ کچھ عرصے کے بعد اسے بھی غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ایک دن ایک گداگر عورت اس کے پاس آئی۔ اس نے اسے خیرات دی۔ وہ پھر دوبارہ آئی۔ میتھر ڈینز نے اسے دوبارہ خیرات دی وہ پھر آئی۔ بار بار آئی رہتی کہ جب وہ تیرہویں دفعہ پھر دامن پسارے بھیک مانگنے ایک ہی دن میں اس کے سامنے آئی۔ تو میتھر ڈینز نے اس سے کہا۔ "اے بوڑھی عورت تو تو میرے لیے دردِ سر بن گئی ہے گداگر عورت رُک گئی۔ اور بولی۔ "فیاضی اور سخاوت تو بس ناحتن پر ختم ہے۔ دنیا میں کوئی ناحتن کا مثیل نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایک دن میں بتیس بار اس سے خیرات حاصل کی اور اس کے ماتھے پر بل نہ آیا بلکہ ہر بار اس نے مجھے پہلے سے بڑھ کر خیرات دی ہر بار وہ پہلے سے زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے پیش آیا اور تمہارے پاس میں ابھی صرف تیرہویں بار آئی ہوں اور تمہارا جی مجھ سے اکتا گیا ہے۔ تمہاری فیاضی اور سخاوت تھک گئی ہے.... بس فیاضی میں تو ناحتن ہی بے مثل ہے۔

میتھر ڈینز جو اب تک یہ سمجھتا تھا کہ شہرت اور فیاضی میں وہ ناحتن سے آگے بڑھ چکا ہے اس بوڑھی گداگر عورت کی گفتگو سن کر جل بھن گیا۔ اس نے اپنے دل میں حسد کے شعلے کو بھڑکتے ہوئے محسوس کیا اور اس کی آنچ کو پوری شدت سے محسوس کر کے اپنے آپ سے

کہا۔ یہ ناقص میری شہرت کے راستے میں دیوار بن گیا ہے۔ وہ وقت کب آئے گا جب میرا مقابلہ ناقص سے نہ کیا جائے گا بلکہ میں اپنی مثال خود ہی قرار پاؤں گا۔ یہ تو ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے میں ناقص کا نام و نشان ہی مٹا دوں گا۔

میتھر ڈینز جوان تھا اور جلد باز وہ سچ مچ ناقص کو اپنی راہ کا پتھر سمجھنے لگا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ناقص کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دے گا۔ اور اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں بھی تاخیر نہ کرے گا۔

اس نے اپنے اس منصوبے کا کسی سے ذکر نہ کیا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا چند خادم اپنے ساتھ لیے اور ناقص کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے سفر پر روانہ ہوا۔ تیسرے دن ناقص کے علاقے میں جا نکلا۔ ناقص کے تعمیر کردہ محلات کو دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا کیونکہ اس کے بنائے ہوئے محلات کے مقابلے میں بہت خوب صورت اور پرکشش تھے۔ اس بات نے بھی اس کے ارادے کو پختہ کر دیا کہ وہ ناقص کو ختم کر کے ہی دم لے گا۔

جب وہ محلات کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ وہ جدا جدا ہو کر وہاں ٹھہر جائیں اور کسی کو علم نہ ہونے دیں کہ وہ میرے ساتھی ہیں۔ شام کا وقت تھا جب وہ ناقص کے ایک محل کے قریب پہنچا اتفاق سے اس وقت بوڑھا ناقص چھڑی کا سہارا لیے سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میتھر ڈینز نے کبھی ناقص کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے وہ پہچان نہ سکا اس نے اس بوڑھے سے کہا۔

"مجھے ناقص کے محل پہنچا دو۔"

بوڑھا جو خود ناقص تھا اس نے میتھر ڈینز کو خوش آمدید کہا اور بولا۔

"حضور تشریف لائیے۔ مجھے اپنا خادم سمجھیے۔ میں آپ کو ناقص کے محل تک پہنچا دوں گا۔ ناتجربہ کار اور نوجوان میتھر ڈینز نے کہا۔

"بڑے میاں اگر تم مجھے ناقص کے محل میں اس طرح سے لے چلو کہ ناقص مجھے دیکھ نہ سکے اور نہ ہی میری آمد کا اسے پتہ چلے تو میں تمہارا بہت احسان مند ہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے بات بنانے کے لیے کہا۔

"میں اس کی شہرت سُن کر آیا ہوں اور اس کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"
ناتھن نے میتھر ڈینیز سے کہا۔

"حضور جو حکم دیں گے میں وہ بجالاؤں گا۔ ناتھن کو آپ کی آمد کا بالکل علم نہ ہوگا۔"
میتھر ڈینیز بہت مسرور ہوا کہ اس کی قسمت بہت اچھی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی اسے اپنے ڈھب کا ایک آدمی مل گیا ہے۔ وہ ناتھن کے ساتھ چل دیا جو بڑے ادب اور احترام سے اپنے مہمان کے ساتھ پیش آرہا تھا۔ جب ناتھن کا محل سامنے آیا تو وہ چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے میتھر ڈینیز کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اپنے ایک ملازم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے محل میں جا کر سب کو مطلع کر دو کہ اس نوجوان مہمان کے سامنے کوئی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ میں ناتھن ہوں بلکہ اگر میرے بارے میں یہ نوجوان اور معزز مہمان سوال کرے تو اسے یہی جواب دیا جائے کہ میں یہاں کا ایک خدمت گزار ہوں۔"

ناتھن کے ملازم نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔

ناتھن اپنے دلچسپ مہمان میتھر ڈینیز کو لے کر محل کے اندر پہنچا۔ اس کو ایک شاندار اور خوبصورت کمرے میں ٹھہرایا۔ پھر اس کی خاطر مدارت اور آؤ بھگت میں دل وجان سے معروف ہوگیا۔ اس نے نوجوان میتھر ڈینیز کے ہر حکم کی تعمیل خود کی۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز خود اس کے سامنے پیش کی۔ خود اس کے لیے کھانا لایا۔ میتھر ڈینیز اس کے اخلاق اور خدمت سے بہت متاثر ہوا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

ناتھن نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"میں اپنے آقا ناتھن کا ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں۔ اس کی خدمت کرتے ہوئے بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میرے مالک نے مجھے پوری آزادی دے رکھی ہے۔ دوسرے ملازم بھی اس بڑھاپے کی وجہ سے میری عزت کرتے ہیں اور میں جو چاہے کروں۔ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔" پھر وہ توقف کر کے بولا۔

"مگر میں حضور کا بھی خادم ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے بلا خوف وخطر بجالاؤں گا۔"

اس کے بعد ناتھن نے نوجوان میتھر ڈینیز سے اس کے بارے میں غیر محسوس انداز میں

گفتگو شروع کردی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں میتھر ڈینزیہ محسوس کرنے لگا کہ بڈھا اس کا رازدار بن سکتا ہے۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بڈھے کو قسم دی کہ وہ راز کی بات کبھی افشا نہ کرے گا۔ پھر جھجکتے ہوئے، ہچکچاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس نے ناحقن ہی کو بتا دیا کہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور کیا لینے آیا ہے۔

ناحقن کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ نوجوان اسی کو قتل کرنے آیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے ردِّعمل چہرے پر کسی تاثر اور کسی حرکت سے یہ ثابت نہ ہونے دیا کہ وہ یہ منصوبہ سن کر بددل ہوا ہے یا اسے اس سے کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ اس نے اسی مودب لہجے میں کہا۔

"میرے محترم نوجوان ۔ آپ بہت معزز انسان ہیں۔ آپ نے بھی فیاضی کا راستہ چنا ہے۔ اور پھر اس عمر میں۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ آپ کی شہرت کی راہ میں ناحقن کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ نوجوان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کہ وہ فیاضی اور نیکی کی راہ میں آزادی سے بلا رکاوٹ چل سکیں۔ میں اس بات کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کر لوں گا اگر آپ کی خواہش ہے تو مجھے حکم دیں تو میں آپ کی مدد کے لیے بھی تیار ہوں۔"

میتھر ڈینز کا دل باغ باغ ہو گیا یہی تو وہ چاہتا تھا۔ بڈھے کی شکل اتنی معصوم اس کا اخلاق اس کے اطوار اتنے شائستہ تھے کہ وہ اس پر اعتماد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"محترم بزرگ! مجھے اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے بلاشبہ آپ کی اعانت کی ضرورت ہے۔"

ناحقن نے جواب دیا۔

"مشرق کی طرف یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ ہے جہاں ناحقن ہر روز صبح سیر کے لیے جاتا ہے اس وقت وہاں وہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے والا موجود نہ ہوگا۔ آپ صبح وہاں پہنچ جائیں اور اپنے ارادے پر عمل کر کے ناحقن کو ہلاک کر دیں۔ آپ وہیں سے سیدھے اپنے گھر کی راہ لیں۔ اس جھنڈ کے داہنے ہاتھ سے ایک راستہ نکلتا ہے وہ آپ کو کسی کی نگاہوں میں لائے بغیر سیدھا آپ کی منزل تک پہنچا دے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی کہ ناحقن کی موت کا

ذمہ دار کون ہے ؟

ناصحؔن کے اس مشورے کو میتھرڈینز نے مان لیا۔ اس کے بعد ناصحؔن دیر تک اپنے نوجوان مہمان کی خاطر مدارت اور خدمت میں لگا رہا۔ اور پھر اس کی اجازت سے شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے دن صبح صبح میتھرڈینز نے اُٹھ کر اپنے خادموں کو ہدایت کی کہ وہ فلاں راستے پر جا کر رُک کر اس کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ ناصحؔن کو ختم کرنے کی تیاری کر کے کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔

ناصحؔن صبح کاذب کے وقت ہی اُٹھ کر درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔ جہاں کا پتہ اس نے خود میتھرڈینز کو دیا تھا۔ اس کے ارادے یا فیصلے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہ اپنے معزز اور جوان مہمان کے ہاتھوں ہلاک ہونے کے لیے بخوشی تیار ہو چکا تھا۔

میتھرڈینز مقررہ مقام سے کچھ دور تھا کہ اس نے وہاں کسی کو موجود پایا۔ وہ سمجھ گیا کہ بڈھے نے اسے صحیح اطلاع دی تھی۔ یہ شخص ناصحؔن ہے۔ ناصحؔن نے اس وقت سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کے پلو سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ حسد کی آگ میں جلنے والے میتھرڈینز نے کہا۔" میں اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی صورت دیکھوں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ میں اسے کیوں قتل کر رہا ہوں۔ ناصحؔن کے پاس پہنچ کر اس نے تلوار نیام سے نکالی اور چیخ کر بولا :

" ناصحؔن چند منٹوں کے بعد تم ایک لاش ہوگے۔ اور یہ کہہ کر اس نے تلوار کی نوک سے اس کی پگڑی زمین پر اچھال دی۔

اس کے سامنے وہی بڈھا کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا :

" میرے معزز مہمان اگر تم میری موت سے خوش ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

" میتھرڈینز ششدر اور ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ تکبر، حسد پگھلنا شروع ہو گیا۔ ناصحؔن کی بے مثل عظمت اس پر عیاں ہونے لگی تو وہ ندامت کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں اور وہ ناصحؔن کے قدموں میں جھک کر کہنے لگا :

میرے محترم اور مقدس بزرگ ! میں تیری عظمتوں کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ تیرے

سامنے کتنا نیچ اور حقیر ہوں۔ تم بے مثل ہو۔ میں تم سے تمہاری جان لینے کے منصوبے پر باتیں کرتا رہا اور تم سچے دل سے میری خدمت کرتے رہے۔ تم نے مجھے مشورہ دیا اور پھر میرے ہاتھوں ہلاک ہونے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ حسد نے میرے باطن کی جن آنکھوں کو بند کر دیا تھا۔ تم نے ان کو اپنی عظمتوں سے کھول دیا۔ مجھ سے انتقام لو۔ میری روح کو شانتی دے دو۔ یہ تلوار اُٹھا کر مجھ جیسے نیچ اور کمینے کا سر کاٹ دو۔

ناتھن نے اسے اپنے قدموں سے اُٹھایا۔ اسے شفقت سے سینے سے لگا کر کہا "میرے عزیز، میرے فرزند! تمہارے منصوبے کو نہ میں بُرا کہوں گا، نہ تم سے انتقام لوں گا۔ یقیناً تم مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ مگر کیوں؟ اس لیے کہ تم نے بھی نیکی، فیاضی اور سخاوت کا راستہ اپنایا ہے اور تم چاہتے تھے کہ تمہیں ایسی شہرت اور نیک نامی ملے جو مجھ سے برتر اور بڑھ کر ہو۔ تمہارا بنیادی جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ میرے عزیز! اس عمر میں تم نے فیاضی کی راہ اپنائی ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے تکریم اور تحسین ہے۔ نفرت نہیں۔ دولت کو عزیزوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے کا حوصلہ کتنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرے عزیز، میرے فرزند! تم بہت عظیم ہو۔ اس دنیا میں لوگ دوسروں کے حقوق سلب کرتے ہیں۔ جنگ کرتے ہیں۔ دوسرے ملکوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ ان کی ہوس زر کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اس دنیا میں اس زمانے میں اگر کوئی اپنی دولت نیکی اور سخاوت کے کاموں میں لگا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی شہرت اور نیک نامی سب سے بڑھ جائے تو میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔"

اس نے میتھر ڈینز کو دلاسہ دیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ میتھر ڈینز نے پوچھا:

میرے محترم اور مقدس بزرگ! جان بہت قیمتی ہوتی ہے پھر تم اتنی جلدی اپنی زندگی کو میرے ہاتھوں ختم کرانے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔

ناتھن نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور بولا:

میرے محلات سے آج تک کوئی مایوس نہیں لوٹا۔ جس نے جو مانگا اسے دے دیا گیا۔ اگر تم سے پہلے کوئی میری جان مانگتا تو میں اسے دے چکا ہوتا۔ میرے فرزند! تم نے مجھ سے میری زندگی میری جان مانگی تھی۔ بھلا میں اپنی روایت سے کس طرح انحراف کر سکتا تھا۔

مَیں تمہیں کیسے خالی ہاتھ لوٹاتا ؟ اس لیے مَیں نے اپنی جان دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی ۔ مَیں تمہیں کیسے ناخوش کر سکتا تھا ۔ ؟ پھر ذرا سوچو تو مَیں اسّی برس کا ہو چکا ہوں اس عمر میں موت بہت قریب ہوتی ہے ۔ انسان کتنا جی سکتا ہے ؟ یہی نا کہ زیادہ سے زیادہ سو برس ۔ اسّی برس کا میں ہو چکا اور پانچ چھ برس میری عمر ہوگی ۔ اس عمر کی بھلا کیا وقعت ہو سکتی ہے ۔ میں تو دل ہی دل میں تمہارا احسان مان رہا تھا کہ تم نے اس بوڑھی اور بے وقعت جان کو طلب کر کے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا تھا ۔

میتھرڈینز پھر رونے لگا ۔ "کتنا عظیم تھا یہ شخص وہ بولا ۔

"آپ کی زندگی کتنی عزیز ہے ! یہ مَیں جانتا ہوں ۔ کاش میرے بس میں ہو تو میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ آپ کی عمر میں اضافے کے لیے دے دوں ۔ "

ناھتن شفقت سے مسکرایا اور بولا ۔

"میرے فرزند ! ایسا ہو سکتا ہے ۔ تم یہاں رہو میری جگہ ناھتن بن کر ۔ مَیں تمہاری جگہ چلا جاتا ہوں ۔ تم اس طرح ناھتن بن جاؤ گے ۔ اور ساری شہرتیں تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گی ۔ میں تمہاری جگہ جا کر اپنی عمر کے آخری برس کم شہرت میں بسر کر لوں گا ۔

میتھرڈینز کا قلب تبدیل ہو چکا تھا ۔ حسد کا اژدہا ناھتن کی عظمت نے قتل کر دیا تھا ۔ اس نے کہا :

"نہیں میرے بزرگ ! تم جیسا کوئی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن میں تم جیسا بننے کی کوشش کروں گا ۔"

ناھتن نے اسے دعا دی اور میتھرڈینز کو بڑے احترام سے رخصت کیا ۔

ڈیوائن کامیڈی

دانتے کی شہرہ آفاق، بے مثل تصنیف "ڈیوائن کامیڈی"، دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے جو بڑی شاعری کا عظیم تخلیقی اور شعری کارنامہ بھی ہیں اور فلسفۂ حیات بھی اپنے منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں بلاشبہ شعریت کی عظیم خوبیوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود "ڈیوائن کامیڈی" ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے پڑھنے والوں سے خاصا ذوق، علم، پس منظر اور تاریخ و دینیات کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننے کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب تک پڑھنے والا بہت سی معلومات کا مالک نہ ہو اور بہت اچھا شعری ذوق نہ رکھتا ہو۔ وہ اس عظیم فن پارے سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا بڑی شاعری کے مطالبے بھی یقیناً بڑے ہوتے ہیں۔

۱۷۶۴ء میں جب والتیئر کی کتاب "فلوسیفکل ڈکشنری" شائع ہوئی تو اس میں والتیئر نے دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" کے حوالے سے اپنے مخصوص انداز میں جو رائے دی تھی وہ قابلِ ذکر ہے۔

> "اطالوی اسے "مقدس" قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک چھپا ہوا مخفی تقدس ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کے معنوں کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اس کے شارعین کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا کیونکہ بمشکل ہی کوئی اسے پڑھتا ہے"

ٹی ایس ایلیٹ کی رائے والتیئر سے بے حد مختلف ہے ایلیٹ کا کہنا ہے کہ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" نے انسانی نسلوں اور ہر دور کے لکھنے والوں اور شاعروں کو متاثر کیا ہے

اور متاثر کرتی رہے گی۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" بلا شبہ دنیا کے عظیم ترین تخلیقی فن پاروں میں سے ایک ہے جن کی شہرت اس حوالے سے بہت ہے کہ اسے پڑھا کم گیا ہے۔ بڑی اور عظیم کتابوں کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا نام تو زبانوں پر ہوتا ہے۔ مگر پڑھنے کی زحمت کم لوگ ہی گوارا کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں اسے بہت کم پڑھا گیا۔ حتیٰ کہ بہت کم پڑھنے والوں کے علم میں یہ بات ہے کہ مرحوم عزیز احمد نے اس کا ایک مستند اور جامع ترجمہ بھی کیا تھا جو انجمن ترقی اردو نے قیام پاکستان سے پہلے شائع کیا تھا۔

علامہ اقبال کے "جاوید نامہ" میں اقبال کی رہنمائی کا فریضہ مولانا رومی ادا کرتے ہیں "ڈیوائن کامیڈی" میں یہ فرض ورجل نے نبھایا ہے۔

ورجل (۷۰ ق م تا ۱۹ ق م) لاطینی زبان کا عظیم شاعر گزرا ہے۔ اس کی عظیم ایپک "اینیڈ" بلا شبہ عظیم شاہکار ہے اور اس کا موازنہ ہومر سے بھی کیا جاتا ہے۔ ورجل بے پناہ شعری صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی قوتِ متخیلہ اور شعریت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ورجل نے رومن شہنشاہ آکٹوویس کی فرمائش پر "اینیڈ" تحریر کی تھی "اینیڈ" کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے۔ جب ٹرائے کی لڑائی ختم ہو چکی اور جنگجو سورما واپس لوٹ رہے ہیں انہی میں "اینیاس" بھی تھا جو اپنے بوڑھے والد کو اپنے کندھوں پر اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ گویا وہ ماضی کا عظیم ورثہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اینیاس اور اس کا خاندان ایک نئی دنیا ایک نئے ملک، ایک نئے تمدن اور تہذیب کی بنیادیں رکھتے ہیں "اینیڈ" ــــ اینیاس کا رزمیہ ہے جو روما الکبریٰ کی بنیادیں رکھتا ہے۔ "اینیڈ" میں ورجل نے ایسے کرداروں کی دنیا آباد کی ہے جو آج علامتوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ورجل نے جو PASTROR نظمیں لکھیں۔ ان کا شمار دنیا کی بہترین تخیلاتی اور غنائی شاعری میں ہوتا ہے۔ تاہم اسے لازوال شہرت "اینیڈ" سے ملی۔ جس کے لئے وہ ایک طویل سفر پر بھی نکلا اور واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ ورجل کی آرزو تھی کہ "اینیڈ" کو جلا دیا جائے۔ اگر اس کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو دنیا یقیناً ایک عظیم شعری فن پارے اور رزمیے سے محروم ہو جاتی "اینیڈ" نامکمل ہونے کے باوجود ایک طویل رزمیہ ہے۔

اس شاعر کو دانتے اپنا رہنما کیوں بناتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ مولانا تے روم کو اقبال اگر "جاوید نامہ" میں اپنا رہنما بناتے ہیں تو اس کی اپنی وجوہات ہیں جن کا ذکر "جاوید نامہ" کے حوالے سے تفصیل سے اس کتاب میں آئے گا۔ ورجل۔ ایک تو اطالوی زبان کا بے مثل شاعر تھا۔ اس وجہ سے بھی دانتے نے اس سے فیض اٹھایا تھا لیکن اس روحانی اور پراسرار سفر کے لئے اسے ورجل کے علاوہ زمانہ قدیم یا اپنے دور کا کوئی شاعر یا فن کار اس لئے پسند نہ آیا کہ ان میں ورجل کی سی خصوصیات تو تھیں مگر ایک خاص خوبی سے وہ دانتے کی نگاہوں میں نہ بچے۔

"ڈیوائن کامیڈی"، ایک ایسی نظم ہے۔ جس میں دینیات اور کیتھولک عیسائیت کے عناصر بے حد قوی ہیں۔ بعض نقادوں نے تو اسے خالص مذہبی نظم بھی قرار دیا ہے۔ جہنم، بہشت اور اعراف کے اس سفر میں ورجل اس لئے دانتے کا رہنما بنتا ہے کہ ورجل ــــ مسیح کی پیدائش سے پہلے کا شاعر ہونے کے باوجود ایک انتہائی شائستہ، متحمل مزاج، نیکوکار اور نیک نفس انسان تھا، ورجل کے بارے میں جو معلومات ہمیں ملتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ورجل بے حد نیک طینت انسان تھا اس کی یہ شخصی خوبی دانتے کو دیگر وجوہات کے علاوہ خاص طور پر اپنا رہنما بنانے پر مجبور کرتی ہے۔

دانتے کی زندگی کا بھی اس کی اس عظیم تصنیف سے گہرا تعلق ہے۔

دانتے عہد وسطیٰ کا شاعر ہے۔ وہ فلورنس میں ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ فلورنس کے معنی ہیں۔ پھولوں کا شہر مگر دانتے پھولوں کے شہر ـــ فلورنس میں ایسے دور میں پیدا ہوا اور اس نے وہاں ایسی زندگی گزاری جو بے حد کربناک اور جدوجہد رقابتوں اور مخالفتوں سے بھری ہوئی تھی۔ دانتے ایک تنہائی پسند روح تھی۔ لیکن خارجی عوامل کے میدان میں بھی وہ بڑا نمایاں تھا۔ دانتے کے اپنے بیان کے مطابق اس کا خاندان حسب نسب کے اعتبار سے بڑا معزز خاندان تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ دانتے ابھی کمسن ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ نے اسے بہترین تعلیم دلوائی اور اس دور کے ایک عظیم استاد برونتو لاٹی نی کی خدمات حاصل کیں۔ برونتو لاٹی نی، ایک سیاستدان اور بڑا شاعر تھا۔ دانتے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے فلسفہ کی تعلیم بولگونہ اور پاڈوا یونیورسٹی اور دینیات کی تعلیم پیرس سے حاصل کی۔ گیووانی بوکیچیو (ڈیکیمرون کا خالق اور دانتے کا شارح) بتاتا ہے کہ دانتے انگلینڈ بھی گیا۔ دانتے

نے ایک زمانے میں فلورنس کی فوج میں بھی اہم خدمات انجام دیں اور ۱۲۹۰ء میں جب کیمپرونا کا قلعہ فتح ہوا تو وہ اس معرکے میں موجود تھا۔ دانتے حکومت کے کئی اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہا۔

فلورنس اس وقت سیاسی رسہ کشی کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ سفید اور سیاہ گو بلیف دو فریق تھے۔ جن میں شدید حد تک اختلافات بڑھ چکے تھے اور گہری ٹھنی ہوئی تھی۔ آزادی اور خود مختاری یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو اس وقت اطالیہ کو درپیش تھا۔ دانتے سیاسی نظریات کے اعتبار سے پاپائیت کا شدید مخالف تھا۔ وہ شاہ پسند تھا اور بادشاہت کا حامی تھا۔ دانتے نے اپنے سیاسی خیالات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ بات اس کے بعض پڑھنے والوں کے لئے بڑی حیران کن ثابت ہو سکتی ہے کہ گہری مذہبیت میں ڈوبا ہوا یہ شخص پاپائیت کا مخالف تھا۔ حالات ایسے ہیں کہ دانتے کے مخالف طبقے کو عروج حاصل ہوا اور دانتے کو ۱۳۱۲ء میں فلورنس سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اس کے بعد دانتے کو پھر کبھی اپنے پیارے شہر۔ فلورنس میں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ سو وہ اس کی یاد میں تڑپتا اور آہیں بھرتا رہا۔ "ڈیوائن کامیڈی" میں بھی وہ جس سوز و گداز اور رغبت سے فلورنس کا ذکر کرتا ہے وہ دل کو بے حد متاثر کرتا ہے۔

کارلائل نے لکھا ہے کہ حکومت وقت دانتے کے بارے میں اتنی انتہا پسند ہو گئی تھی کہ یہ حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ دانتے پکڑا جائے تو اسے زندہ جلا دیا جائے۔

دنیا کا یہ عظیم شاعر اب ایک آوارہ گرد تھا۔ نہ گھر نہ وطن وہ کئی جگہ گیا۔ کئی لوگوں کا مہمان ہوا۔ جو ظاہر ہے کہ اس کی حالت پر ترس کھاتے تھے۔ دانتے اداس رہتا تھا۔ وطن کی یاد میں تڑپتا رہتا۔ اپنی اس جلاوطنی کے زمانے میں اس نے اپنا وہ شاہکار لکھا۔ جسے "ڈیوائن کامیڈی" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور ۱۳۲۱ء میں وہ جلاوطنی میں ہی انتقال کر گیا۔ اس کی تاریخ وفات ۱۴ ستمبر ۱۳۲۱ء ہے۔

دانتے کے انتقال کے نصف صدی بعد فلورنس میں سرکاری سطح پر اس کی عظیم تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" کو سراہا گیا اور اسے فلورنس کا عظیم شاعر اور سپوت تسلیم کر لیا گیا۔

دانتے کی زندگی صرف انہی واقعات، حالات اور اداس کن کیفیات سے عبارت نہیں۔ اس کی زندگی میں ایک ایسا کردار بھی آتا ہے جس کو دانتے کی طرح عالمی شہرت حاصل ہوئی اور یہ کہا جا

سکتا ہے کہ دانتے اور بیاترچے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

دانتے نے اپنی زندگی میں صرف ڈیوائن کامیڈی ہی نہیں لکھی بلکہ کئی دوسری تصانیف کا بھی وہ خالق ہے۔ ایک تو اس کی سیاسی کتاب تھی جس کا ذکر ہو چکا۔ اس کی ایک اہم ترین تصنیف VITA NUOVA LA یعنی THE NEW LIFE (حیات نو) ہے دانتے کی یہ تصنیف "حیاتِ نو" اس کی آپ بیتی ہے۔ جس کے بارے میں بلا شبہ پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دنیا کی عظیم آپ بیتیوں میں سے ایک ہے۔ اپنی اس آپ بیتی میں۔ دانتے بتاتا ہے کہ اس نے حیاتِ نو کس طرح پائی۔ اور اسے حیاتِ نو بخشنے والی بیاترچے ہے۔

بیاترچے اور دانتے کا عشق۔ دنیا کا ایک انوکھا عشق ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ بیاترچے کو وہ عظیم روح، تقدس اور حسن کامل کا نام دیتا ہے۔ بیاترچے نو برس کی تھی۔ جب دانتے نے اسے پہلی بار دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا (دانتے کا قاری یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نو کا ہندسہ دانتے کو بے حد پسند ہے۔ اس نو کے ہندسے کا ذکر بار بار اس کے ہاں آتا ہے) یہ محبت خاموش تھی لیکن بہت گہری، بہت عمیق اور ہمیشہ زندہ رہنے والی۔ ایک عرصے کے بعد (پھر نو برس بعد) بیاترچے سے اس کی ملاقات ایک تقریب میں ہوتی ہے، کچھ خواتین دانتے کی محبت کا مذاق اڑاتی ہیں۔ دانتے کو دکھ ہوتا ہے۔ جس کا اظہار وہ بعد میں اپنے کئی سانیٹ میں کرتا ہے۔ بیاترچے اور دانتے کی محبت میں۔ بیاترچے دانتے کو دیکھتی ہے اور اسے خاموشی سے سلام کر کے آگے بڑھ جاتی ہے یہ سلام کرنے کا انداز۔ دانتے کی زندگی کا حاصل ہے۔ دانتے کی محبت نے، دانتے کے اپنے اعتراف کے مطابق اس کی کائنات، زندگی اور دل کو بدل دیا۔ وہ حیات نو پا گیا۔ بیاترچے کی شادی ایک معزز اور دولت مند سائمن ڈی بارڈی سے ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد وہ جوانی کے عالم میں ہی فوت ہو گئی۔ دانتے نے بعد میں ایک خاتون سے شادی کی۔ جس سے اس کے چار بچے تھے۔ لیکن وہ دانتے کی طویل جلا وطنی کے زمانے میں اس کے ساتھ نہ تھی۔

دانتے نے اپنی محبت کو اپنی آپ بیتی LA VITA NOUVA اور "ڈیوائن کامیڈی" میں لازوال کر دیا ہے۔ اس محبت نے اسے شاعری میں وہ انداز بخشا۔ جسے وہ خود "طرز لطیف و نو" کا نام دیتا ہے۔ یہ بیاترچے ہی تھی کہ اس کے دیدار کی آرزو نے اس کے تخیل کو وہ وسعت بخشی کہ جس کی

مثال اس سے پہلے پوری دنیا کی شاعری میں نہیں ملتی اور شاعر جہنم اور بہشت کا سفر کرتا ہے اور ذوات اولیٰ کو بھی اپنی محبوبہ بیاترچے کے توسط سے دیکھتا ہے۔

دانتے کی اس تصنیف LAVI TANOUUA کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا قصۂ عشق ہے کہ جس کی مثال دنیائے ادب پیش کرنے سے قاصر ہے اپنے اسلوب، طرزِ احساس اور گہرے خیالات کی بنا پر یہ ایک عظیم احساساتی دستاویز ہے۔ بعض محققوں ناقدوں نے لکھا ہے کہ بیاترچے کا کوئی وجود نہیں یہ بھی دانتے کی عظیم و بے مثل قوتِ متخیلہ کا ایک شاہکار ہے یہ ایک فینٹسی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ بیاترچے۔ حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی۔ اس کا وجود حقیقی ہے اس کے ساتھ دانتے کی محبت سچا واقعہ ہے جسے اس نے فینٹسی کا انداز دے دیا ہے۔

ڈیوائن کامیڈی، دانتے اور اسلام

ہمارے ہاں کے محققوں اور عالموں کو تو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ دانتے اور اس کے لازوال شاہکار ہ ڈیوائن کامیڈی، پر اسلام کے گہرے اثرات کا سراغ لگاتے اور اس پر تحقیق کرتے۔ لیکن پچھلی آٹھ نو دہائیوں سے بعض یورپی مستشرقین نے اس پر شاندار اور قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم کتاب پروفیسر میگوئل آسین کی "اسلام اینڈ ڈیوائن کامیڈی" ہے۔ پروفیسر آسین کی تحقیق یہ ہے کہ دانتے نے ڈیوائن کامیڈی کے نفسِ مضمون اور اس کی بیشتر تفصیلات اسریٰ اور معراج نبویؐ کی روایتوں سے مستعار لی ہیں "جہنم" کا جو نقشہ دانتے نے کھینچا ہے۔ وہ ابنِ عربی سے بہت ملتا جلتا ہے۔

دانتے نے ڈیوائن کامیڈی میں جس شہر کا ذکر کیا ہے۔ عیسائی تصورات میں اس سے پہلے اس تصور کا کوئی سراغ نہیں ملتا جب کہ اسلامی روایات میں ایک شہر آتشیں کا ذکر موجود ہے۔ اور دانتے نے اسی تصور سے استفادہ کیا ہے۔

رسول کریم صلعم جب معراج پر گئے تو جبرئیلؑ ان کے ہم رکاب تھے۔ دانتے ورجل کو اپنا رہنما بناتا ہے لیکن جنت میں وہ بیاترچے کو اپنی رہنمائی کا فرض سونپتا ہے۔ معراج نبویؐ میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ جب جبرئیل ایک مقام پر رک کر مولانائے روم کی زبان میں کہتا ہے کہ

"اس سے آگے میں جاؤں تو میرے پر جل جائیں گے"

اور اس کے بعد حضور نبی کریم صلعم اکیلے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ڈیوائن کامیڈی میں بھی دانتے بیاترچے کے ساتھ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے۔ جس سے آگے بیاترچے نہیں جاتی۔ بلکہ دانتے کو اکیلے ہی جانا پڑتا ہے۔ پروفیسر آسین کی تحقیق ہے کہ یہ مماثلت اتفاقی نہیں بلکہ واقعہ معراج سے لی گئی ہے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی دو تصانیف کا بھی "ڈیوائن کامیڈی" پر گہرا اثر ہے۔ ایک تو "الاسرائی مقام الاسریٰ" ہے دوسری "فتوحات مکیہ"

ابن عربی اور دانتے کے درمیان صرف ۸۰ برس کا زمانہ حائل ہے۔ اس عرصے میں ابن عربی کی شہرت دُور تک پھیل چکی تھی اور دانتے اس سے بے خبر نہ تھا۔

نظریات کے اعتبار سے بھی بعض اہم امور پر ابن عربی اور دانتے کی ہم آہنگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ابن عربی اور دانتے دونوں جہنم اور فردوس کے سفر کو اس دنیا میں روح کے سفر کی تمثیل سمجھتے ہیں۔ دونوں کا عقیدہ ہے کہ خالق حقیقی نے اس دنیا میں روح کو اس لئے بھیجا کہ وہ اس مقصد اعلیٰ اور آخر کی تیاری کرے اور وہ مقصد۔ دیدار خداوندی ہے اور اس سے کامل مسرت کوئی اور نہیں ہے۔ ابن عربی اور دانتے میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ تائید غیبی اور شریعت کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ انسان اس مقصد کو حاصل کر سکے۔ عقل (جس کی علامت ڈیوائن کامیڈی میں ورجل ہے) دور تک ساتھ نہیں دے سکتی۔

ڈیوائن کامیڈی اور "فتوحات مکیہ" کا اسلوب بیان اور بیشتر تفصیلات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ خاص طور پر ڈیوائن کامیڈی کا حصہ بہشت تو فتوحات مکیہ سے بے حد متاثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ فتوحات مکیہ کی طرح ڈیوائن کامیڈی کا لب ولہجہ بھی بعض مقامات پر بڑا پُر اسرار ہو جاتا ہے۔

یقینی امر ہے کہ دانتے پر شیخ اکبر ابن عربی کا بے حد اثر ہے۔ دانتے کی ایک کتاب "CONVITO" پر ابن عربی کی "ترجمان الاشواق" کا اثر تو بہت واضح ہے (عربی سے ناواقف قارئین کے لئے اطلاع ہے کہ ابن عربی کی "ترجمان الاشواق" کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر نکلسن

کر چکے ہیں)

ابنِ عربی بتاتے ہیں کہ شیطان کو یہ سزا دی گئی ہے کہ وہ برف میں جما ہوا گل رہا ہے چونکہ وہ آتشی مخلوق ہے۔ اس لئے اس کے لئے اس سے سخت سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ڈیوائن کامیڈی کے جہنم میں دانتے بھی شیطان کو برف میں دھنسا اور گلتا ہوا دکھاتا ہے۔

پروفیسر آر۔ اے نکل (R.A. NYKL) کی تحقیق یہ ہے کہ دانتے پر ابنِ عربی کے علاوہ ابو العلا المعری کی تصنیف "رسالتہ الغفران" کا بھی گہرا اثر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دانتے جو عربی سے ناآشنا تھا اس کی رسائی ابنِ عربی کی تصانیف تک کیونکر ممکن ہو سکی۔ مستشرقین اور محققین نے اس سلسلے میں بتایا ہے کہ اس زمانے میں فلورنس ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ عرب تاجر اطالیہ تک پہنچ چکے تھے۔ عربی فتوحات اور علم و دانش کا شہرہ ساری دنیا میں تھا۔ فریڈرک نے نیپلز میں ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں عربی مسودات کا ترجمہ ہو رہا تھا۔ طلیطلہ کے شاہ الفانسو کے عہد میں تو خاص طور پر کئی اہم عربی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ اس زمانے میں یورپ بھر میں فارابی، امام غزالی اور ابن رشد کو وہی مقام توقیر حاصل تھا جو قدیم یونانی حکماء کو تھا معراجِ نبویؐ کی روایات اسپین کے عیسائیوں میں پھیل چکی تھیں۔

دانتے کا استاد برونتو لاٹی نی۔ بہت بڑا سفارت کار، سیاست دان اور عالم و شاعر تھا۔ ۱۲۶۰ء میں وہ فلورنس کا سفیر بن کر شاہِ طلیطلہ الفانسو کے دربار میں گیا جہاں یقینی طور پر وہ ابنِ عربی سے متعارف ہوا اور اس عظیم استاد کے توسط سے ابنِ عربی کے خیالات دانتے تک پہنچے۔

ڈیوائن کامیڈی شاعری اور فکر کے اعتبار سے بے مثل کارنامہ ہے۔ دانتے سے پہلے عموماً اطالوی شعراء لاطینی اور فرانسیسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور اطالوی میں بہت کم لکھا جاتا تھا۔ ڈیوائن کامیڈی میں دانتے نے اطالوی زبان کو جن وسعتوں سے آشکار کیا۔ یہ اس کا ایک الگ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک شعری زبان کے شعری امکانات کو ظاہر کیا جسے پہلے توجہ کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔ دانتے سے پہلے یقینی طور پر اس کے کچھ پیش روؤں نے اس کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ لیکن دانتے نے اسے عروج تک پہنچا دیا اور اپنے طرزِ لطیف و نو سے ڈیوائن کامیڈی کو تمثیل اور شعریت کا ایک ایسا فن پارہ بنا دیا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی شاعر ـــــ دانتے کی ہمسری کا

دعوے کر سکتا ہو۔ دانتے نے جلاوطنی کے پر صعوبت ایام میں ڈیوائن کامیڈی کو مکمل کیا۔ اس کی اداس روح نے ایک ایسے نغمے کو تخلیق کیا جسے حسن کا نام دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ ایک عظیم شعری تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ میں ذاتی طور پر ڈیوائن کامیڈی کے اس انگریزی ترجمے کو ترجیح دیتا ہوں جس کے مترجم لارنس بینن اور جس کے حواشی سی۔ ایچ گرانڈ جنٹ نے تحریر کئے ہیں۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اس کے سانیٹ کے علاوہ LA VITA NOAVA کو ایک طویل مقدمے کے ساتھ پاؤلو میلانو نے بھی مرتب کیا ہے۔ جس کی آج کے قارئین کے مطالعے کے لئے خصوصی سفارش کی جا سکتی ہے۔

ڈیوائن کامیڈی ایک طویل نظم ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جہنم، اعراف اور بہشت۔ جہنم میں ۳۴ کینٹوز، اعراف میں ۳۳ کینٹوز ہیں اور بہشت میں ۳۳ کینٹوز۔ یہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے ذیل میں ڈیوائن کامیڈی کے پہلے حصے "جہنم" کی ایک تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ ایک سرسری سا خلاصہ ہے۔ ایک جھلک جو اس کی روح اور عمق کو کسی طرح بھی پیش نہیں کر سکتا۔ تاہم اس سے ایک اندازہ اردو کے قارئین کو ہو سکتا ہے کہ دانتے کا "جہنم" کیا ہے؟

دانتے مایوسی کے گرداب میں پھنسا ہے کہ اسے ورجل دکھائی دیتا ہے جو دانتے کی محبوبہ بیاترچے کی آرزو پر دانتے کی راہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لئے دوسری دنیا سے آیا ہے۔۔۔ اور یوں سفر شروع ہوتا ہے۔

دانتے اور ورجل ایک بڑے دروازے کے سامنے پہنچے۔ دانتے نے اس دروازے پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔ مجھ سے گزر کر تم آہوں کے شہر میں داخل ہو گے مجھ سے گزر کر تم ابدی دکھوں کے قریے میں پہنچو گے۔ مجھ سے گزر کر لوگ ہمیشہ کے لئے اپنا آپ کھو بیٹھے۔

"اسے یہاں سے گزرنے والو! اپنی تمام امیدیں ترک کر دو"

" جہنم کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ دنیا تھی۔ یہاں انسان ابدی محبت کے خلاف اپنے گناہوں کی سخت ترین سزا بھگت رہا ہے۔

جہنم کا پہلا حصہ دریائے ایکرون کے نشیبی حصوں میں واقع تھا اس حصے میں وہ فرشتے تھے جنہوں نے زمین پر جا کر اپنا اصلی مقام گنوا دیا پھر یہاں وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں تشکیک کے عالم

میں گزار دیں۔ انہوں نے نہ خدا کا اقرار کیا نہ انکار۔ یہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھنے والے بے رنگ لوگ تھے۔ گناہ اور ثواب کی رمق سے محروم، وہ ہاتھ باندھے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ناقابلِ فہم آوازیں نکال رہے تھے۔ ان کی آوازیں گھری، دبیز تاریک ہوا کو داغدار کر رہی تھیں۔

دانتے نے ان بلکتی ہوئی روحوں کو دیکھا اور پھر ورجل کی معیت میں آگے بڑھا۔ اب ان کے سامنے دریائے ایکیرون کی پانچ ندیاں تھیں۔ سامنے شارون ملاح اپنی کشتی لئے کھڑا تھا۔ جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کی کشتی پر وہ روحیں لدی ہوئی تھیں، جنہیں شارون ملاح نے جہنم کے مختلف حصوں میں پہچانا تھا اور وہ انہیں اپنی انگارہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

ورجل نے شارون کو بتایا کہ وہ حکم اعلیٰ کے تحت ایک فانی انسان کی راہنمائی کے لئے مامور کیا گیا ہے تو شارون نے دانتے کو کشتی پر سوار کر لینے پر رضامندی کا اظہار کیا یوں وہ جہنم کے پہلے دائرے سے گزرے جہاں وہ روحیں نوحہ کناں تھیں جنہوں نے یسوع کو نہیں دیکھا تھا۔

یہاں سے گزر کر وہ جہنم کی ڈھلوانوں سے گزرنے لگے۔ یہاں وہ لوگ سزا بھگت رہے تھے جو شعوری طور پر گناہ کے مرتکب ہوئے تھے یہ ایک عجیب و غریب دنیا تھی ٹیڑھے میڑھے تنگ و تاریک راستے جو آہ و بکا سے گونج رہے تھے اس دنیا کے عین وسط میں شیطان کھڑا تھا۔ چہرے پر وہ غصہ آمیز کرب جو منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ رانوں تک جھیل میں ڈوبا ہوا تھا۔

اور یہاں وہ لوگ تھے جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے ان کے اندھے اور سیاہ شہوانی جذبوں نے انہیں اپنے غلبے میں لے لیا تھا۔ اب زانی اور زانیہ دونوں ہوا میں لٹکے ہوئے تھے ان کی اس سزا کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔ ایک جوڑا ہوا میں لٹکتا ہوا دانتے اور ورجل کے سامنے آیا۔ دانتے نے ان کا گناہ پوچھا۔ وہ پاؤلو اور فرانچسکا تھے۔

فرانچسکا کی شادی اس کے باپ کی رضامندی سے راوینا کے حاکم گائیڈو ڈا پولینٹا سے ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ پُرعزم اور بہادر انسان تھا لیکن جسمانی اعتبار سے اپنے چھوٹے بھائی پاؤلو سے کمزور تھا۔ اس کے علاوہ نئی دلہن فرانچسکا اور پاؤلو کا ذوق بھی مشترک تھا۔ رومان پڑھنا اور ان پر اظہار خیال کرنا انہیں بے حد پسند تھا یوں انہوں نے زنا کیا اور جب فرانچسکا کے شوہر کو بیوی اور بھائی کے گناہ کا علم ہوا تو اس نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اور اب یہ گناہگار جوڑا جہنم کے

اس دائرے میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ دانتے اور ورجل آگے بڑھتے ہیں یہاں گندے پانی اور پیپ کی بارش ہو رہی ہے۔ یہاں وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو بھلا کر شراب میں ڈبو دیا وہ دانت پیس رہے تھے اور جبڑے ہلا رہے تھے ان کے چہرے مسخ ہو رہے تھے۔ ان پر غلیظ پانی اور پیپ کی بارش ہو رہی تھی جسے وہ پی رہے تھے وہ پینا نہ چاہتے تھے مگر پئے بغیر چارہ نہ تھا۔

اور پھر ایک دائرے میں انہیں دولت کا دیوتا پلاٹو دکھائی دیا جہاں وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا میں دوسروں کا حق غصب کر کے دولت جمع کی۔ ان میں وہ بھی تھے جو صرف دولت کے ہی ہو کر رہ گئے یہاں وہ بھی سزا بھگت رہے تھے۔ جنھوں نے عیاشی اور فضول خرچی میں نام پیدا کیا دولت مندوں کو دولت کے انباروں نے جکڑ رکھا تھا وہ ان میں پس رہے تھے یہ چیخ رہے تھے اور ان کی سزا کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔

آگے جا کر دانتے نے دیکھا کہ ننگی مخلوق پانی کی سطح سے اوپر اٹھتی ہے ان کے جسم کیچڑ اور غلاظت سے لتھڑے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے پانی میں بڑے بڑے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ ورجل نے ان کی طرف اشارہ کر کے دانتے کو بتایا، یہ ان روحوں کی آہیں ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گناہوں کی دنیا میں مصروف رکھا کہ باہر کی دنیا اور فطرت کے حسن سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔

سامنے جہنم کا دارالحکومت۔ لوسی فر تھا۔ یہ شہر ان لوگوں کی روحوں سے آباد تھا کہ جنھوں نے درندوں کی طرح خلاف فطرت گناہ کئے تھے تین خوفناک بلائیں کہ جن کے سر میڈوسا کی طرح تھے کہ جو انہیں دیکھے پتھر کا بن جائے ان کی طرف جائیں مگر اس سے پہلے کہ وہ دانتے اور ورجل پر وار کریں ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر ان کو روک دیا۔

جہنم کے دارالحکومت کے دروازے بند تھے اور یہ بند ہی رہے۔ کیونکہ یہی خداوند کی رضا ہے۔ کہ یہ دروازے ہر اس شخص پر بند رہیں گے جس کے جسم پر گوشت ہے دھرتی کی مٹی جس کے جسم پر موجود ہے۔ لوسی فر کے دروازوں کے اندر سے آنے والی گناہگاروں کی آہ و بکا دور تک ان کا پیچھا کرتی رہی۔ ابدی عذاب سہنے والی روحیں مسلسل رو رہی تھیں۔

جہنم کا چھٹا دائرہ۔ ابلتے ہوئے خون کی ندی کے اس پار تھا اس ندی کو پار کئے بغیر آگے

جانا ممکن نہ تھا اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے دانتے کو اس راہ تک جانا تھا جو اوپر چڑھتی ہوئی ستاروں سے جا ملتی تھی۔

وہاں کوئی ملاح دکھائی نہ دے رہا تھا اور ابلتا ہوا خون آنکھوں کے سامنے تھا دوسرے کنارے پر قنطور دکھائی دے رہے تھے اور گھوڑے بھاگ رہے تھے جن پر آدمی سوار تھے یہ گھوڑے ان لوگوں کو پھر سے خون کے دریا میں گرا دیتے تھے جو خون کے دریا سے نکل کر کنارے پر آنا چاہتے تھے یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ خون کے دریا سے نکلنے کے لئے بے چین روحیں رو رہی تھیں، چیخ رہی تھی۔

ورجل کو خصوصی احکامات کے تحت خصوصی اختیارات ملے تھے۔ اس نے ایک قنطور کو آمادہ کر لیا کہ وہ انہیں اپنی پیٹھ پر سوار کر کے دریا پار کرا دے جب وہ قنطور پر سوار خون کا دریا پار کر رہے تھے تو ورجل نے بتایا۔

" یہاں وہ روحیں عذاب سہ رہی ہیں جنہوں نے اپنے ہمسایوں، اپنے عزیزوں، رشتے داروں یا خدا کے خلاف تشدد سے کام لیا یہاں وہ قاتل بھی سزا بھگت رہے ہیں۔ جنہوں نے ان کی زندگیوں کے خون سے ہولی کھیلی اور اب تا ابد یہیں خون کے دریا میں رہیں گے۔"

پھر ورجل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

" ادھر دیکھو "

دانتے اس طرف دوسرے کنارے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہاں آگ کے شعلے ریت پہ چل رہے تھے ورجل نے بتایا،

" وہاں وہ لوگ ہمیشہ اس گرم ریت اور آگ کے شعلوں میں جلتے رہیں گے۔ جنہوں نے خدا کے خلاف یا خدا کی تخلیق، فطرت کے خلاف کوئی گناہ کیا۔"

پھر ورجل نے ایک اور حصے کی طرف اشارہ کر کے کہا

" یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جنہوں نے سود خوری سے اپنی ناجائز کمائی پیدا کی سود خوروں کو سدومیوں، دھوکہ بازوں، قاتلوں اور فریبیوں کے درمیان جگہ دی گئی ہے۔ خدا نے آدمی کو کہا تھا کہ وہ دنیا پہ ہل چلائے، فصل کاٹے، چیزیں بنائے

اور اپنی محنت کی کمائی سے اپنا رزق پیدا کرے۔ مگر سود خوروں نے اپنے لئے
نا جائز کمائی کی راہ نکالی اور وہ گناہگار ٹھہرے۔''

قنطور نے انہیں دریائے خون کے ایک اندرونی کنارے پر اتار دیا اور وہ دونوں
پُر اسرار دھند کے جنگل میں داخل ہوئے یہ جنگل ان روحوں سے آباد تھا۔ جنہوں نے اپنی جان پر
خود تشدد اور ظلم کو روا رکھا تھا اور خودکشی کی تھی:

'' ہم ایک ایسے جنگل میں داخل ہوئے جہاں کبھی کسی کے قدموں نے کوئی راستہ
نہ بنایا تھا۔ یہاں روشنی نہ تھی۔ بس ٹہنیاں اور شاخیں تھیں اور اندھیرا، جہاں
درختوں پر ایک پھل بھی دکھائی نہ دیا۔ پھلوں کے بجائے کانٹے تھے جو زہر سے
بھرے تھے ''

دانتے اس جنگل کے ایک درخت کی ٹہنی توڑ بیٹھتا ہے اور پھر خوف سے کانپنے لگتا ہے
جہاں سے اس نے ٹہنی توڑی تھی۔ وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ درخت نے آہ و بکا کرتے
ہوئے کہا۔

'' تم نے مجھے زخمی کیوں کیا؟ ''

اس جنگل میں وہ لوگ درخت بنا دیئے گئے تھے۔ جنہوں نے خودکشی کی تھی۔ روزِ حساب
جب ہر انسان پھر اپنے اصل وجود میں آجائے گا۔ ان لوگوں کو لباس نصیب نہ ہوگا کیونکہ انہوں
نے اپنے آپ کو خود ہی اپنے جسموں سے محروم کیا تھا۔ روزِ حساب فیصلہ ہو چکنے کے بعد ان کے
جسم ان ٹہنیوں سے لٹکا دیئے جائیں گے تاکہ روحیں ہمیشہ نوحہ کناں رہیں۔ اپنے جسم کو دیکھ دیکھ
کر عذاب سہتی رہیں۔

جنگل سے گزر کر وہ ایک ندی کے منبع تک پہنچتے ہیں۔ جہاں ریت جل رہی تھی اس جلتی
ہوئی ریت میں دھوکے بازوں کے جسم بھُن رہے تھے۔ سود لینے والوں نے اپنے چہرے لٹکا رکھے
تھے اور جل رہے تھے۔

پاگلوں کی طرح بلا سستائے بغیر بگٹٹ بھاگ رہے تھے ان کے تلوے جلتی ہوئی ریت پر
مسلسل بھاگنے سے پھٹ چکے تھے بھاگتے بھاگتے وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام کر کبھی دائرہ

بنا لیتے اور اسی میں تھوڑی سی مسرت حاصل کر لیتے تھے۔

اگلے دائرے کی حفاظت مہیب ناک درندے کر رہے تھے کہ ایک درندے کو ورجل نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر وہ دونوں اس کی کمر پر سوار ہو گئے اور نیچے اترنے لگے۔ یہاں دانتے نے دس بڑی بڑی عجیب ریگھاریاں دیکھیں جنہوں نے جہنم کے مرکزی پاتال کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ یہاں سے شیطان نظر آرہا تھا جو منجمد جھیل میں گڑا ہوا تھا۔

اس کے اوپر ایک اور دائرہ تھا جو بڑے پہیے کی طرح تھا۔ وہاں اونچی اونچی چٹانیں تھیں ہوا میں گوشت کے جلنے کی بو آرہی تھی اور دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس دھوئیں سے بچتے ہوئے دانتے اپنے رہنما ورجل کے ساتھ ان دس ریگھاریوں سے گزرا۔ جہاں اسی قسم کے فریبی اور دھوکے باز اپنی اپنی سزا بھگت رہے تھے۔ یہاں دانتے نے بھڑووں اور خوشامدیوں کو دیکھا اور ان کو جنہوں نے کام کرتے ہوئے اپنے اداروں اور دفاتر میں بے ایمانی کی تھی۔ وہ سوراخوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ وہاں بوجھل ہوا میں ننگی مخلوق چل رہی تھی۔ جن کے پاؤں مچھلی پائیوں کی طرح تھے۔ سر پشت کی طرف شانوں پر لگے تھے۔ چہرے سے بہتے ہوئے آنسو ان کے چوتڑوں پر گر رہے تھے۔ ان کی سزا ان کے اعمال کے عین مطابق تھی۔ انہیں دیانت اور تقدیس کے فرائض سونپے گئے تھے اور انہوں نے بے ایمانی کی تھی۔ ان کے چہرے ان کی پشت پر تھے۔ اور پاؤں مڑ گئے تھے۔ ان کے پیروں کے نیچے جلتی ہوئی زمین تھی وہ اپنے منہ اور نتھنے یوں کھولتے تھے جیسے مینڈک ہوں۔

وہاں وہ چور تھے۔ جنہوں نے دوسروں کے گھروں سے مال اڑایا تھا اور اب وہ سانپوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور انہی سانپوں کے ساتھ انہیں ہمیشہ رہنا تھا۔ سانپ اور چور ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔

آٹھویں ریگھاری میں عذاب سہنے والی روحیں اپنی شباہت کھو چکی تھیں اور پہچانی نہ جا رہی تھیں۔ اپنے ضمیر کے شعلوں میں لپٹی ہوئی گمراہ روحیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بڑی دانشمندی سے برائی کو اپنایا تھا اور خدا کی بخشی ہوئی ذہانت کا غلط استعمال کیا تھا۔

اس سے آگے جہاں ہوا تک تاریک ہو جاتی تھی۔ آخری ریگھاری تھی۔ یہ جہنم کا منجمد ترین سرد

حصہ تھا۔ جہنم کا وسطی پاتال، یہاں گندی اور غلیظ بیماریوں سے داغدار روحیں بس رہی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے ملاوٹ کی تھی۔ دھوکے باز، فریبی، ملاوٹ کرنے والے کیمیادان وہ اس وقت بھی ایک دوسرے پر فقرے اچھال رہے تھے، ایک دوسرے کو زبانی کلامی دگید رہے تھے۔ اپنے اپنے اعضا کو نوچتے کھسوٹتے وہ ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔

جہنم کے وسطی حصے میں۔ کوکٹیس جھیل برف کی طرح منجمد تھی۔ جہنم کے تمام دریا یہیں سے نکلتے اور یہیں واپس آکر ختم ہو جاتے تھے۔ بڑے بڑے جسمانی سائے دھند میں لہرا رہے تھے۔ ان میں نمرود بھی تھا اور وہ سب تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کو قدیم زمانوں میں ورغلایا تھا کہ وہ فطرت اور فطرت کے خالق سے منہ پھیر لیں۔

وسطی جہنم کے دائرے کی چار سطحوں میں منجمد پاتال میں شیطان کھڑا تھا۔ وہ رانوں تک منجمد ہو چکا تھا وہ مسلسل اس کوشش اور تگ و دو میں مصروف تھا کہ کسی طرح یہاں سے ہل سکے مگر اس کے پر بھی برف جسم چکی تھی۔ جسم کا نچلا حصہ رانوں تک منجمد تھا۔ شیطان کے سر پر ازلی اور ابدی، انکار کا سایہ تھا۔ اس کے سائے کے نیچے وہ روحیں تھیں جنہوں نے دغا بازی سے دوسروں کو دھوکا دیا۔ اپنے عزیزوں کو قتل کیا اپنے ملک سے غداری کی۔ اپنے آقاؤں اور محسنوں کے اعتماد کو دھوکا دیا۔

اس حصے کے نیچے ایک دائرہ تھا جس کا نام "جوڈیکا،، ہے یہاں وہ یہوداسقر وطی بھی تھا۔ جس نے حضرت عیسٰیؑ سے غداری کی تھی۔

دانتے جہنم کے نظارے سے اوسان کھو چکا تھا۔ ناامیدی یایوسی اور دکھ نے اس کے دل کو شکنجوں میں کس لیا تھا۔ مگر اس کا رہنما ورجل اسے دلاسہ دیتا ہوا اوپر لے جاتا ہے۔ اب وہ اس راستے پر گامزن ہیں جو اونچے آسمان اور ستاروں کی طرف جاتا ہے۔

ورجل اور دانتے جہنم سے باہر نکل آتے ہیں جب دانتے اوپر پہنچ کر مہربان سورج کی کرنوں کو دیکھتا ہے جو اس کا دل امید سے جگمگا اُٹھتا ہے۔

فصوص الحکم

"میں نے ایک خواب ۶۲۷ ہجری کے ماہ محرم کے آخری عشرے میں دیکھا۔ ان دنوں میں دمشق میں مقیم تھا۔ جو ملک شام کا دارالخلافہ ہے۔ اس خواب میں مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ کے دستِ مبارک میں ایک کتاب تھی اور حضورؐ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

"یہ کتاب لے لو۔ اسے خلقِ خدا تک پہنچا دو تاکہ وہ اس سے فیض اٹھا سکے۔" میں نے سرِ نیاز جھکا دیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب میں جن مطالب و معانی سے مجھے سرفراز فرمایا تھا۔ میں نے انہیں پوری دیانت اور اخلاص سے تحریر کر کے خلقِ خدا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کتاب کی تالیف کے پورے عرصے میں میں ہمیشہ خدا کے سامنے دعا کرتا رہا کہ خدا کی عنایت میرے شاملِ حال رہے۔ شیطانی وسوسوں اور اوہام سے خدا میری حفاظت کرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے جود و کرم سے نوازتا رہے تاکہ میں جو کچھ ضبطِ تحریر میں لاؤں، وہ حضور نبی کریمؐ کے خیالات کی ترجمانی ہو اور اس میں میری اپنی کوئی رائے اور بات شامل نہ ہو۔"

یہ خواب شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اپنی بے مثل اور لاثانی تصنیف "فصوص الحکم" کے دیباچے میں لکھا ہے اور اس خواب کو انہوں نے اس کتاب کی تحریر و تالیف کا سبب بتایا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جب یہ تصنیف مکمل کر چکے تو انہیں پورا اطمینان تھا کہ انہوں نے اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو حضور نبی کریمؐ نے ان کو عطا کیا تھا۔

فصوص الحکم، الٰہیات اور فلسفہ، تصوف پر ایک گرانقدر اور بے مثل تصنیف ہے۔ یہ کتاب شیخ اکبر ابن عربی کے مشہور نظریہ "وحدت الوجود" پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے اور شیخ اکبر ابن عربی کے تمام خیالات و افکار کا جوہر اور نچوڑ ہے۔

اپنے عالمگیر شہرت یافتہ نظریۂ وحدت الوجود کے لیے شیخ اکبر ابن عربی نے تمام فلسفوں اور مذاہب سے استفادہ کیا تھا اور قرآن پاک اور سنتِ نبویؐ سے خاص فیض پایا تھا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے افلاطون کے فلسفۂ اشراق، فلسفۂ رواقیہ، مسیحی افکار اور فیلون تک کے نظریات و فلسفہ کو کھنگالا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرقۂ باطنیہ، قرامطہ کے اعتقادات اخوان الصفا کے نظریات و تعلیمات اور بہت سے دوسرے مکاتیب سے خیالات اخذ کیے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا کمال یہ ہے کہ وہ ان سب فلسفوں اعتقادات اور نظریات کو اپنے نظریۂ وحدت الوجود کی تائید میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے نظریے کو کسی مکتبِ فکر کے تابع نہیں ہونے دیتے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے نظریۂ وحدت الوجود نے نہ صرف پوری اسلامی دنیا کے افکار کو متاثر کیا بلکہ اس نظریے کی آفاقیت نے پوری دنیا کے افکار کو متاثر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصنیف "فصوص الحکم" کے بعد جو فلسفی، دانشور، شاعر اور ادیب اس دنیا میں سامنے آیا خواہ وہ کسی رنگ، ملت ملک اور قوم سے تعلق رکھتا تھا وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریہ اور فلسفہ وحدت الوجود سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصانیف میں 'فتوحات مکیہ' کو بھی عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ 'فصوص الحکم' کی طرح اس کے بھی دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہوئے اور موجودہ صدی میں مغرب میں خاص طور پر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے فلسفہ الٰہیات پر بڑا گرانقدر کام ہوا ہے فتوحاتِ مکیہ کی اپنی عظمت اور آفاقی تاثیر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ فتوحاتِ مکیہ میں تصوف کے تمام پہلوؤں اور افکار کو سمو دیا گیا ہے۔ مگر فصوص الحکم میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے تصوف کی مباحث کو جس جامعیت سے بیان کیا اور مسائل تصوف کو حل کر کے اس کی افادیت

کو ثابت کیا ہے وہ بات شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کسی تصنیف میں بھی اس درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی نہیں ملتی۔

شیخ اکبر ابن عربی نے اپنے نظریۂ حیات وحدت الوجود کے اظہار کے لیے صرف عقل و منطق سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اس کی بنیاد وجدان اور ذوقِ باطنی پر رکھی ہے اور اسے کشف کا درجہ دے کر اس کا رشتہ مابعد الطبیعاتی سائنس سے جوڑ دیا ہے جو اتنا بڑا کام ہے کہ اسے شیخ اکبر ابن عربی ہی انجام دے سکتے تھے۔

جن حقائق کا ادراک اور شعور بہت بعد میں جا کر بعض اکابر کو حاصل ہوا۔ شیخ اکبر ابن عربی نے صدیوں پہلے ان موضوعات و مسائل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

فلسفے کے طالب علم جانتے ہیں کہ کانٹ جیسے فلسفی کے اس نظریے کو عالمی فلسفے میں کتنی اہمیت دی گئی ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع صرف عقل و دانش اور منطق نہیں ہیں اور صرف مادی اشیا اور حواسِ خمسہ کے ذریعے ہی حصولِ علم ممکن نہیں بلکہ ذوق اور وجدان بھی حصولِ علم کے لیے بے حد ضروری ہیں جو صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں اور عقل و منطق اور دانش کی طرح ذوق اور وجدان پر بھی پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ کے اس نظریے کو عالمی فلسفہ میں بڑا اونچا مقام دیا گیا ہے جبکہ شیخ اکبر ابن عربی کانٹ سے صدیوں پہلے اس حقیقت کو پا چکے تھے اور اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اس علم کو خدا کی خاص عطا سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں پیغمبر یا نبی نہیں ہوں۔ تاہم میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ میرے قلب پر الہام کی طرح نازل ہوتا رہا ہے کیونکہ میں علم انبیاء کا وارث ہوں اور مجھے جو ورثہ ملا ہے وہ علوم ظاہری تک ہی محدود نہیں بلکہ علوم باطنی بھی عطا ہوئے ہیں جو انبیاء کے علم کا حصہ ہوتے ہیں۔"

شیخ اکبر ابن عربی کا یہ ارشاد بھی قابلِ توجہ ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک علم و دانش کا تعلق ہے ان کا نزول ہمیشہ دلوں پر ہوتا ہے عقل پر نہیں۔"

"فصوص الحکم" کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی کے مشہور زمانہ نظریہ وحدت الوجود پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی کے سوانح حیات کو اجمالاً بیان کر دیا جائے۔

فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو پیر کے دن سپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ مرسیہ باغوں اور مساجد کے میناروں کی وجہ سے سپین کے دوسرے شہروں سے ممتاز تھا۔ مرسیہ میں وہ آٹھ برس تک رہے اور یہیں قرآن پاک حفظ کیا۔ ۵۶۸ھ میں وہ اشبیلیہ آگئے جہاں انہوں نے ۵۹۸ھ تک بڑے بڑے نامور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ اور تمام علوم پر دسترس حاصل کی۔

۵۹۸ھ میں وہ اندلس سے نکلے اور پھر انہیں واپس اندلس آنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ اور جہاں گئے علم حاصل کرتے رہے۔ اسی زمانہ سیاحت میں انہوں نے حدیث کا درس حدیث کے آئمہ کرام سے حاصل کیا۔ جنہوں نے ان کو درس حدیث دینے کی سند مرحمت فرمائی۔ ان کے اساتذہ میں ابن الجوزی اور ابن عساکر جیسے آئمہ محدثین کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عالم اسلام کے عظیم اکابر و مشائخ میں امام غزالی اور بوعلی سینا کا مقام بے حد بلند ہے ان کے ساتھ شیخ اکبر ابن عربی کا موازنہ بھی مقصود نہیں۔ صرف ایک خاص حقیقت کی طرف نشاندہی کرنا مقصود ہے کہ جتنی تالیفات و تصانیف ابن عربی نے اپنے پیچھے چھوڑیں۔ وہ تعداد و کثرت میں ان اکابر کی تصانیف و تالیفات سے کہیں زیادہ ہیں۔ جب شیخ اکبر ابن عربی کی تصانیف کی طرف دھیان جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر دینی اور دنیاوی مصروفیات اور سفر و سیاحت کے باوجود اتنا کچھ کس طرح لکھ لیا۔ شیخ اکبر ابن عربی صوفیائے کرام کے مسلک کے پابند تھے۔ عبادت و ریاضت، مجاہدہ، مذاکرہ، اوراد وظائف، فرائض دنیوی و دینوی اور نوافل میں ان کا بیشتر وقت صرف ہوتا تھا۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود شیخ اکبر نے ایسی تصانیف تحریر کیں جو دو ہزار صفحات سے پچاس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے قرآن پاک کی جو تفسیر قلم بند کی اس کی ۹۵ جلدیں تھیں اور یہ تفسیر بھی نامکمل

ہے اور سورۂ کہف تک ہے۔ فتوحات مکیہ دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

جرمن مستشرق ہمبر وکلمان نے شیخ اکبر ابن عربی کو دنیا کا سب سے بڑا زرخیز ذہن اور دماغ قرار دیا۔ وہ شیخ اکبر ابن عربی کو سب سے بڑا وسیع الخیال اور وسیع المشرب عالم قرار دیتا ہے۔ اور شیخ اکبر ابن عربی کی ایسی ڈیڑھ سو تالیفات و تصانیف کا ذکر کرتا ہے جو مطبوعات یا مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔ مولانا جامیؒ نے شیخ اکبر ابن عربی کی تصانیف کی تعداد پانچ سو بتائی ہے ۶۳۲ ہجری میں اپنی وفات سے چھ برس قبل شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی تصانیف کی تعداد دو سو نواسی لکھی ہے۔ ان کا انتقال ۲۸ ربیع الثانی ۶۳۸ھ بمطابق ۱۲۴۰ء کو جمعہ کی شب ہوا۔

شیخ اکبر ابن عربی کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کی تمام تالیفات و تصانیف کا سرچشمہ اور موضوع ایک ہے اور موضوع ہے 'فلسفۂ تصوف'، اسی ایک موضوع پر انہوں نے سینکڑوں کتابیں تحریر کیں۔ وہ تمام علوم ظاہری اور باطنی پر دسترس رکھتے تھے مگر اپنے لیے انہوں نے ایک موضوع کا انتخاب کیا اور اسی کے سب گوشوں اور امکانات کو اپنی بے مثل علمیت اور وجدان کے ساتھ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پیش کرتے رہے۔

فصوص الحکم دو سو صفحات کے قریب ہے۔ اردو میں اس کا ناقص ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی فرانسیسی اور انگریزی میں یہ منتقل ہو چکی ہے۔ "فصوص الحکم" دراصل شیخ اکبر ابن عربی کے پختہ شعور، بصیرت اور اجتہادی کمالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی کی سب سے عظیم تصنیف فصوص الحکم ہی ہے کیونکہ فتوحات مکیہ کی طوالت اور دوسری کتابوں میں جتنا مواد موجود ہے۔ فصوص الحکم ان سب کا جوہر اور خلاصہ ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی کا نظریۂ وحدت الوجود "فصوص الحکم" کے حوالے سے،

وحدت الوجود کے فلسفے کے پیچھے معانی اور اسرار کا ایک ایسا جہان پوشیدہ ہے کہ بیشتر مسائل نازک ہونے کی وجہ سے بعض ذہنوں کو الجھا بھی دیتے ہیں اور مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ الٰہیات و تصوف کے مسائل کی گہرائیوں تک پہنچنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے نہ ہی ہر شخص کی رسائی ہو سکتی ہے۔

سادہ ترین الفاظ میں وحدت الوجود کے نظریے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائناتِ رنگ و بو میں ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ دراصل وہ سب کچھ صفاتِ الٰہیہ کا عکس ہے باری تعالےٰ نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ وہ ساری کائنات سے بے نیاز ہے اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو موجودات کی کیا ضرورت آپڑی تھی۔ ذاتِ باری تعالےٰ اپنے اندر شانِ فردیت رکھتی ہے۔ لیکن اس ذاتِ برتر و بالا کی ان گنت صفات بھی ہیں۔ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور کائنات کے معرضِ وجود میں آنے سے ہوا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک انسان جیسے بوقلموں اور ہمہ جہت وجود کا ظہور نہ ہوتا صفاتِ الٰہیہ کا بھرپور انعکاس ممکن نہ ہوتا۔ ارشادِ نبوی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی صورت گری صفاتِ الٰہیہ کے عین مطابق کی گئی۔

شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ خداوندِ ذوالجلال نے اس کائنات رنگ و بو کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کائنات کے آئینے میں اپنی تجلیات وصفات کا مشاہدہ کرے۔ حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ خود کو بھی اپنی تمام صفات کے حوالے سے پہچان لوں اور دنیا بھی میری عظمتوں کی شناسا ہو۔ چنانچہ میں نے لوگوں کو تخلیق کیا اس کے ذریعے لوگوں نے میری معرفت حاصل کی۔"

وحدت الوجود کے اس نظریے کو سمجھنے میں دقت اس لیے پیش آئی کہ ذاتِ خداوندی کی صفات میں غلط مبحث پیدا کر دیا گیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذات باری تعالےٰ تنزیہ و تقدیس کے پردوں میں مستور ہے اور اس کی ذات کے مانند کوئی شے نہیں ہے۔ لیکن وہ بصیر بھی ہے۔ سمیع بھی ہے، علیم بھی ہے یہ سب صفات جس درجہ کمال کی اس ذات باری تعالےٰ میں ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ مگر یہ بہر حال صفات الٰہیہ ہیں۔ جن سے انسان کو بھی متصف کیا گیا ہے۔ ابن عربی بتاتے ہیں کہ ہر اچھا نام خدا کا ہے۔ خوبی و کمال کی ہر صفت سے ذات باری تعالےٰ متصف ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی معتزلہ کی طرح صفات کو غیر ذاتِ حق نہیں سمجھتے۔ تاہم ذاتِ تشبیہہ سے منزہ ہے۔ مگر صفات کی تشبیہہ قرآن پاک میں

موجود ہے۔ اس لیے صفات کا جلوہ آرا ہونا۔ اگرچہ اس کی ذات کی تجلیات کا نمود ہے۔ لیکن چونکہ ذات باری تعالےٰ تشبیہہ و تمثیل سے ماوراء الورا ہے۔ اس لیے اس آئینہ خانہ ہستی میں جو کچھ ہے وہ اس کی صفات کا ہی عکس ہے۔

"فصوص الحکم" پر ایک نگاہ اور مطالب و مفاہیم کا خلاصہ

فصوص الحکم کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی کے اسلوب کے بارے میں علماء اور مشائخ نے فرمایا ہے کہ اس کا اسلوب، طرز نگارش، انداز استدلال اپنی جگہ بے حد انفرادیت کا حامل ہے۔

فصوص الحکم کے کل ۲۷ ابواب ہیں۔ ہر باب کسی نہ کسی پیغمبر کے نام سے معنون و منسوب ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے ہر پیغمبر کو انسان کامل کے روپ میں پیش کیا ہے جو معرفت حق اور اسرار الٰہی سے آگاہ ہے۔

فصوص الحکم کے ہر باب کا آغاز قرآن پاک کی کسی آئت مبارکہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد شیخ اکبر ابن عربی اس کو کسی حدیث نبوی ؐ سے مزین کرتے ہیں۔ اس کے بعد شیخ اکبر قرآن و سنت کے اس مفہوم و معنی کو جگہ دیتے ہیں جو اہل علم کے حلقوں میں متداول ہے۔ اس کے بعد وہ صاحب عنوان پیغمبر کے حوالے سے وہ توجیہات پیش کرتے ہیں جو ان کے مؤقف کی تائید میں جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کامل اور خدا کے باہمی رشتے پر اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایسی کوئی کتاب آج تک معرض وجود میں نہیں آسکی۔ جس میں انسان کی عظمت پر اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہو۔

فصوص الحکم کے پہلے باب میں شیخ اکبر ابن عربی آدم ؑ کی خلافت اور نیابت خداوندی کا تذکرہ کرتے ہوئے عام ڈگر سے صریحاً اختلاف کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ تشریح و تفسیر کی جاتی ہے کہ چونکہ آدم ؑ کو ذات باری تعالےٰ نے علم سے نوازا تھا۔ آدم ؑ کو علم و دیعت ہوا تھا۔ اس لیے اسے خداوند کریم نے اپنا نائب بنایا۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ آدم ؑ اس لیے خلافت کا

مستحق ٹھہرا کہ اسے صفاتِ الٰہیہ کا آئینہ خانہ بنایا گیا تھا اور آدمؑ کو خلافت پر اس لیے مامور کیا گیا کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت میں جلوہ گر کیا تھا۔

کتاب کے دوسرے باب میں جو حضرت شیثؑ کے متعلق ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے انکشاف کیا ہے جو آج کے حالات کے مطابق بے حد چونکا دینے والا ہے ان کے اس انکشاف کا حرف بحرف ترجمہ یوں ہے :۔

"حضرت شیثؑ کے نقشِ قدم پر نسلِ انسانی کا وہ آخری فرد ظہور پذیر ہوگا جو حضرت شیثؑ کی مانند اسرارِ خداوندی کا محرم ہوگا۔ حاملین اسرار الٰہی میں یہ بچہ بمنزلہ خاتم الاولیاء کے ہوگا اس کے بعد کوئی ایسا بچہ پیدا نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بہن بھی پیدا ہوگی۔ جس کی ولادت اس بچے سے پہلے ہوگی۔ اس بچے کا سر اپنی بہن کے قدموں کے پاس ہوگا۔ اس بچے کی ولادت ملکِ چین میں ہوگی اور وہ اس ملک کی زبان میں اسرار الٰہیہ کو منکشف کرے گا۔

شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ بچہ پیدا ہوگا اس وقت آبادی بہت کثیر ہوگی اور وسائل معیشت محدود ہو جائیں گے وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"مردوں اور عورتوں میں بانجھ پن کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ نکاحوں کی کثرت کی وجہ سے اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔"

یہ صاف اور واضح اشارہ ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی طرف۔ یعنی اس زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی پر بڑی شدت سے عمل کیا جا رہا ہوگا۔

فصوص الحکم میں ایسی کئی چونکا دینے والی باتیں موجود ہیں جو آنے والے زمانوں کے بارے میں پیش گوئی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انکشافات کسی نجومی یا ستارہ شناس کے نہیں نہ ہی ان میں کوئی تعلق ملتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شیخ اکبر ابن عربیؒ اسرار و رموز کو جانتے تھے اور ان کو علم لدنّی حاصل ہوا تھا۔ اس لیے وہ ان میں سے بعض اسرار کا انکشاف بھی کر دیتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اس زمانے میں ان اسرار و رموز کو سمجھنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن اب سائنسی تحقیق کے اس دور میں ان انکشافات کی سچائی ثابت ہو گئی ہے اور بہت سی سچائیوں کو ثابت کیا جائے گا۔

شیخ اکبر ابن عربی کے بعض افکار و نظریات کی بنا پر ایک زمانے میں ان پر بڑی تنقید کی گئی اور ان کو گمراہ کرنے والا بھی کہا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے افکار و نظریات میں ظاہری صورت بعض امور میں واقعی مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن اگر شیخ اکبر ابن عربی کے افکار و نظریات پر غور کیا جائے تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ ایک خاص مسئلے کی وجہ سے ان پر بہت تنقید کی گئی۔ جس کا ذکر ضروری ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی بظاہر نبوت غیر تشریعی کے اجرار کے قائل نظر آتے ہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہت جلد جذباتی بنا دیتا ہے اور اس نظریے کی طرف پوری توجہ دینے کے قابل نہیں چھوڑتا۔

فصوص الحکم سمیت شیخ اکبر ابن عربی کی جملہ تصانیف پڑھ لیجیے کہ غیر تشریعی نبوت کے اجرار کے قائل ہونے کے ساتھ اپنے بے پناہ علم کے باوجود ان کے ہاں ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ وہ خود اس منصب پر فائز ہونے کا رلی بھر بھی شوق رکھتے ہوں۔ راد ہر زمانے کی بات یہ ہے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو جھوٹی نبوت کا دعوے کرتے دیکھا جو علم میں صفر تھے)

شیخ اکبر ابن عربی ختم نبوت کے دل سے قائل تھے۔ وہ غیر تشریعی نبوت کے اجرار کے صرف اس حد تک قائل تھے کہ جس حد تک انہیں اسلام کی تعلیمات میں اس کی گنجائش ملتی ہے شیخ اکبر ابن عربی غیر تشریعی نبوت کے اجرار کی جو تعریف پیش کرتے ہیں وہ نہ تو خلاف شرع ہے نہ الجھا دینے والی ہے وہ علمار کو وارثین نبوت قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمار انبیائے بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔ لیکن شیخ اکبر ابن عربی اس سلسلے میں جو شرط عائد کرتے ہیں۔ وہ ہر شبہے کو دور کر دیتی ہے۔ وہ علمار کو مذکورہ بالا حیثیت دینے کے باوجود ان کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اس کا دعوے کریں۔ کیونکہ وہ اہل علم کے لیے ایسے دعوے کو نازیبا سمجھتے ہیں۔

مشیت الٰہی کے باب میں وہ "فصوص الحکم" میں سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ وہ جبر مشیت کے قائل ہیں۔ مگر ان کا عقیدہ حضور نبی کریم صلعم کے اس ارشاد کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ عمل سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہ کرو۔ ہر شخص کو اس امر کی توفیق نصیب

ہوگی۔ جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

"فصوص الحکم" میں وہ حضرت ایوبؑ کی تکالیف اور اذیتوں کے حوالے سے یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ یہ اذیتیں دراصل جسمانی نہ تھیں۔ انوارِ تجلیات الٰہیہ اور حضرت ایوبؑ کے مابین جو پردے حائل ہو گئے تھے اور ان حجابات کے حوالے سے حضرت ایوبؑ کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑی تھیں اسے وہ ابتلا و آزمائش سے تعبیر کرتے ہیں۔

"فصوص الحکم" میں وہ ایک اور چونکا دینے والے نظریے کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں:۔

"دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں تناسخ کی جڑیں مضبوط نہ ہوں۔

تناسخ کے عقیدے کے سلسلے میں وہ ہندومت کی تشریحات کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے خیال میں تناسخ مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور پیروکاروں میں قدرِ مشترک تو ضرور ہے۔ لیکن ہر شخص کو اس معاملے میں اپنی ذاتی اور منفرد رائے رکھنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اپنے اس نظریے کے استدلال میں انہوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کا ابطال کم از کم میرے نزدیک ان علمائ کے بس میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا جو علم و دانش بصیرت اور اسرار و رموز کے کشف میں شیخ اکبر ابن عربی کے مقابلے میں بہت کمتر درجے پر فائز ہیں۔

"فصوص الحکم" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضور نبی کریمؐ کی محبت ایک ایک سطر میں جھلکتی ہے۔ "فصوص الحکم" کے مطالعے سے اس حقیقت کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف فنا فی الرسول کی منزل سے گزر کر وحدت الوجود کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی۔ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل کی تلاش و جستجو کا حاصل قرار دیتے ہیں کہ جو اس کا ادراک حاصل کر لیتا ہے اسے حقیقت الٰہیہ تک رسائی میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جس نے نبی آخر الزماں صلعم کو پا لیا۔ اس نے خدا کو پا لیا۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں۔

"اس کرۂ ارض پر ہی نہیں بلکہ پوری وسعت کائنات میں اگر کوئی بندۂ مومن ہے کہ جس کا قلب عارفِ مصارفِ یزدانی ہو۔ تو وہ صرف اور صرف محمد عربی صلعم ہیں۔ کسی دوسرے کی

کیا مجال کہ وہ اس مقام کی رفعتوں اور عظمتوں سے شناسا ہو سکے ۔

شیخ اکبر ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان کامل یعنی انبیائے کرام گزرے ہیں۔ ان کے لیے اسوۂ کامل اگر کوئی ذات ہے تو وہ نبی آخر الزماں محمد صلعم کی ذاتِ مبارک اقدس ہے۔ جس نے مشاہدہ حق کے ہفت خواں کو سر کرنا ہو، اسے اپنا دامن تجلیات محمد صلعم سے بھرنا چاہیئے۔

توحید باری تعالےٰ کے عقیدے کو جس طرح شیخ اکبر ابن عربی نے پیش کیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے کے ہاں شاذ ہی ملتی ہے۔ توحید الٰہی کا تصور اس صورت میں جامع ہوگا کہ جب اس حقیقت کا وجدان حاصل ہو جائے کہ تنہا اس کی ذات ہے جو اس انجمن نیست و نابود میں حقیقت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ لاشئے ہے۔ ذاتِ باری تعالےٰ کے بارے میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے افکار و نظریات کو شیخ اکبر ابن عربی نے فصوص الحکم میں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ توحید کا اثبات سامنے آگیا ہے۔

فصوص الحکم کے ستائیس ابواب کا ایک جائزہ

پہلا باب "حکمت الٰہیہ" ہے جس کا تعلق حضرت آدمؑ اور بنی نوع آدم سے ہے۔ اس باب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:۔

"جب خداوند بزرگ و برتر نے اپنے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ کہ جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ چاہا کہ وہ ان صفات کے اعیان و مظاہر کا خود مشاہدہ کرے۔ یعنی آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب حق تعالےٰ نے اپنے عین ظہور کو دیکھنا چاہا کسی ایسی مخلوق کے روپ میں جو اپنے اندر جامعیت رکھتی ہو اور پورے امر کا احاطہ کر سکتی ہو تو اس نے آدم کو پیدا کیا۔"

اس پہلے باب میں شیخ اکبر ابن عربی نے انسان کی خلافت اور نیابت پر بحث کرتے ہوئے انسان کی اہمیت کو پوری طرح اُجاگر کیا ہے کہ وہ اس کائنات میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ یوں تو ساری کائنات ہی تجلیات خداوندی کا آئینہ ہے مگر انسان اس کائنات میں سب سے برتر ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد خداوندی کے

مطابق حق تعالےٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ خدا ہی اول اور وہی منتہا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بشر کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ انوار و تجلیات الٰہیہ کا آئینہ ہے اور اس میں خود رب لایزال نے اپنی روح پھونکی ہے شیخ اکبر ابن عربی لکھتے ہیں :-

"دنیا میں مخلوق تو بہت تھی، لیکن جسے خلافت سے نوازا گیا ہو جو کچھ اس کے حصہٗ جامعیت میں آئے گا۔ وہ کسی اور کے نصیب میں کہاں؟"

فصوص الحکم میں آئینہ اور صورت کی اصطلاحوں کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی نے بڑی مدلل بحث کی ہے اور مسائل تصوف کو بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسائل تصوف محض فکر و نظر کے ذریعے عقل انسانی حل نہیں کر سکتی۔" بلکہ اس کا سرچشمہ کشف الٰہی ہے۔"

۲۔ دوسرا باب حضرت شیث علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ جس کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس باب میں انہوں نے کشف الٰہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ تفصیل سے اس باب میں خاتم الانبیاء کے موضوع پر دلائل دیتے ہیں اور ایک نئی اصطلاح "خاتم الاولیاء" کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن عربی لکھتے ہیں :-

"آدم علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر تک ہر پیغمبر کو حضور خاتم الانبیاء صلعم کے مشکوٰۃ نبوت سے کسب من اللہ اکتساب فیض کرنا پڑے گا۔ خواہ پیدائش کے اعتبار سے وہ حضور نبی آخر الزماں کا وجود متاخر ہی کیوں نہ ہو۔"

خاتم الاولیاء کی بھی یہی حیثیت ہے کہ اس کی ولایت سے استفادہ کیے بغیر کسی کی ذات مستحق نہیں ہو سکتی۔

۳۔ تیسرا باب حضرت نوحؑ کے بارے میں ہے۔ اور اس کا عنوان "حکمتِ سبوحیّہ" ہے اس باب میں وہ ایک بہت چونکا دینے والی بات لکھتے ہیں :-

"ذات الٰہی کی تنزیہ اہلِ حقیقت کے نزدیک "تحدید و تقیید" ہی کی صورت ہے۔"

اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص ذاتِ خداوندی کی تنزیہ کرتا ہے۔ وہ یا تو جاہلِ محض ہے یا بڑا بے ادب ہے۔ "حق کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کائناتِ ارضی د

سماوی کی صورتوں کی تحدید ممکن نہیں ہے تو پھر حق کی تحدید کس طرح ممکن ہو گی ۔"

ابن عربی فرماتے ہیں کہ اگر تنزیہ کے ساتھ تشبیہہ کی رعایت ملحوظ کی جائے اور تشبیہہ کو تنزیہ کا پابند کیا جائے تو پھر عرض گفتگو کا یارا ہو سکتا ہے ۔

۴۔ چوتھا باب حضرت ادریسؑ کے بارے میں ہے جس کا عنوان "حکمت قدوسیہ" رکھا گیا ہے۔ چونکہ حضرت ادریسؑ کی عام شہرت علم نجوم و افلاک اور ہیئت کے زبردست عالم کی حیثیت سے ہے۔ اس لیے اس باب میں قرآن مقدس کی ان آیات مقدسہ کو موضوع زیر بحث بنا کر جو حضرت ادریسؑ کی شان میں ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے نجوم و فلکیات کی مصطلحات پر بحث کی ہے۔ اس باب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمِ نجوم پر شیخ اکبر ابن عربی کو کتنی دسترس حاصل تھی۔ شیخ ابن عربی لکھتے ہیں۔

"یہ مقام رفیع و بلند جس پر حضرت ادریسؑ متمکن ہیں سورج کا فلک ہے۔ یہی وہ فلک ہے جو تمام نظام افلاک کا مدار و محور ہے ۔"

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس فلکِ شمس کے اوپر بھی سات فلک ہیں اور نیچے بھی۔ یہ فلک شمس ہے۔ اس کے اوپر جو ہفت افلاک ہیں وہ یہ ہیں ۔

۱۔ فلک احمر۔ ۲۔ فلک مشتری ۔ ۳۔ فلک کیوان ۔ ۴۔ فلک منازل ۔ ۵۔ فلک اطلس ۶۔ فلک کرسی ۔ ۷۔ فلک عرش ۔

اس فلک شمس کے نیچے جو سات فلک ہیں وہ یہ ہیں ۔

۱۔ فلک زہرہ ۔ ۲۔ فلک کاتب ۔ ۳۔ فلک قمر۔ ۴۔ فلک ایثر (یعنی ایتھر) ۵۔ کرۂ ہوا ۶۔ کرۂ آب ۔ ۷۔ کرۂ خاک ۔

اس باب میں شیخ اکبر ابن عربی لکھتے ہیں ۔

"عمل سے ارتفاع کا مکان نصیب ہوتا ہے۔ جبکہ علم سے علو مرتبت حاصل ہوتا ہے۔ اُمتِ محمدیہ کو علم و فن دونوں کے اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے دونوں مرتبے اس کے قدموں کے نیچے ہیں ۔"

۵۔ پانچواں باب حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے جس کا عنوان انہوں نے "حکمت مہیمنیہ"

رکھا ہے۔ اس باب کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اس لیے کہا گیا کہ ان تمام صفاتِ کمال کو اپنے اندر سمو چکے تھے جو ذاتِ الٰہی کی خاص صفات ہیں۔"

۶۔ چھٹا باب حضرت اسحاق علیہ السلام کے بارے میں ہے جس کا عنوان ہے "حکمت حقیہ" یہ باب خواب کے موضوع پر مبنی ہے۔

۷۔ ساتواں باب حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے۔ عنوان "حکمت علیہ" ہے۔ اس باب میں حضرت اسماعیلؑ کے "صادق الوعدہ" ہونے پر بحث کی گئی ہے۔

۸۔ آٹھواں باب۔ حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ہے۔ جس کا عنوان "حکمتِ نوریہ" ہے اور اس باب میں نیند اور خواب، خوابوں کی تعبیر اور خوابوں کی حقیقت پر ایک ایسی بحث کی گئی ہے جو انتہائی پُر معنی ہے۔

۱۰۔ دسواں باب۔ حضرت ہودؑ کے بارے میں ہے۔ اس کا نام "حکمت احدیہ" ہے۔

۱۱۔ گیارہواں باب۔ حضرت صالحؑ کے بارے میں ہے۔ نام "حکمت فتوحیہ" رکھا گیا ہے۔

۱۲۔ بارہواں باب۔ حضرت شعیبؑ سے متعلق ہے۔ اس باب کا عنوان حکمت قلبیہ ہے۔

۱۳۔ تیرہواں باب۔ حضرت لوطؑ کے بارے میں ہے اور اس کا عنوان "حکمت ملکیہ" ہے۔

۱۴۔ چودہواں باب۔ حضرت عزیز علیہ السلام سے متعلق ہے۔ اس کا نام "حکمت قدریہ" ہے اور تقدیر کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

۱۵۔ پندرہواں باب۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے جس کا نام "حکمت نبویہ" ہے۔ یہ باب حقیقتِ روح اور حقیقت نبوت کے موضوع پر ہے۔

۱۶۔ سولھواں باب۔ حضرت سلیمانؑ سے متعلق ہے۔ عنوان "حکمت رحمانیہ" ہے۔

۱۷۔ سترہواں باب۔ حضرت داؤدؑ کے بارے میں ہے۔ عنوان ہے "حکمتِ وجودیہ"۔

۱۸۔ اٹھارہواں باب۔ حضرت یونسؑ کے متعلق ہے۔ عنوان حکمت نفسیہ ہے۔

۱۹۔ انیسواں باب۔ حضرت ایوبؑ کے بارے میں۔ نام ہے "حکمت غیبیہ"

۲۰۔ بیسواں باب۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ہے۔ عنوان "حکمت جلالیہ" رکھا گیا ہے۔

۲۱۔ اکیسواں باب۔ حضرت ذکریا سے متعلق ہے۔ عنوان "حکمت مالکیہ" ہے۔

۲۲۔ بائیسواں باب۔ حضرت الیاس کے بارے میں ہے۔ عنوان "حکمت الیاسیہ" ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے نزدیک حضرت الیاس اور حضرت ادریس ایک ہی پیغمبر کے دو نام ہیں۔

۲۳۔ تیئیسواں باب۔ حضرت لقمان کے بارے میں ہے جس کا عنوان "حکمت احسانیہ" ہے۔

۲۴۔ چوبیسواں باب۔ حضرت ہارون کے بارے میں ہے اور عنوان "امامیہ" ہے۔

۲۵۔ پچیسواں باب۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں ہے۔ نام "حکمت علویہ" رکھا گیا ہے اس باب میں فرعون کے بارے میں شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ اس کی مغفرت آخری لمحوں میں کر دی گئی تھی اور وہ تائب ہو گیا تھا۔

۲۶۔ چھبیسواں باب۔ جسے "حکمت حمدیہ" کا نام دیا گیا ہے۔ وہ حضرت خالد بن سنا سے تعلق رکھتا ہے۔ جنہیں لسان نبوت و وحی میں پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔ یہ شیخ اکبر ابن عربی کی اپنی تحقیق ہے۔ وہ خالد بن سنان کی نبوت کو "نبوت برزخیہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ خالد بن سنان کا زمانہ حضور نبی کریم صلعم سے یا تو بہت قریبی عہد ہے یا حضرت عیسیٰ اور حضور نبی کریم صلعم کے مابین کسی وقت مدت میں ان کا ظہور ہوا ہے۔ بعض اکابر علماء کی رائے میں ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے بھی بہت پہلے کا ہے۔

تاریخ و سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ خالد ابن سنان کی اولاد میں سے ایک لڑکی ایک بار حضور نبی کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضور نبی کریم صلعم نے ارشاد فرمایا۔

"خوش آمدید اے نبی کی بیٹی۔ اس کی قوم نے اُسے ضائع کر دیا"

ستائیسواں اور آخری باب حضرت محمد صلعم سے متعلق ہے اور شیخ اکبر ابن عربی نے اس عنوان کا نام "حکمت فردیہ" رکھا ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی حضور نبی کریم صلعم کی حکمت کو حکمت فردیہ سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ نسل انسانی میں اکمل موجودات حضور کی ہی ذات ہے۔ اس کمال ذات ہی کے سبب امر الٰہی کا آغاز بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہوا اور اختتام بھی حضور ہی کی ذاتِ اقدس پر ہوا۔

فصوص الحکم (یعنی حکمت کے نگینے) علم وعرفان اور وحدت الوجود اور عقیدت رسول اقدس صلعم کا ایک ایسا خزینہ ہے کہ جس سے قاری کا دامن و دل مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کے مطالب و مفاہیم کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی اس عظیم و بے مثل تصنیف میں "من و یزداں" کے سارے راز بیاں کردیے ہیں۔ انسان۔ دریائے ناپیدا کنار کا ایک قطرہ ہے کہ وہ دریا کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ یہی فلسفۂ وحدت الوجود ہے!

علی ہجویریؒ

کشف المحجوب

"کتاب کی تصنیف و تالیف اور جمع کرنے سے سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ مصنف کا نام زندہ رہے اور پڑھنے اور تعلیم پانے والے اس کے لیے دعا کرتے رہیں۔"

یہ الفاظ ۔ صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخشؒ کے ہیں۔ انہوں نے کتاب کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے جو بات کہی ہے اس میں یہ نکتہ بے حد اہم ہے کہ اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ اسے پڑھنے اور اس کتاب کے ذریعے سے تعلیم پانے والے مصنف کے لیے دعا کرتے رہیں۔ یعنی وہ کتاب انسانی فلاح اور انسان کی ذہنی اور باطنی تربیت کے لیے اتنی مفید اور اہم ہو کہ اسے جو پڑھے اس کے دل سے مصنف کے لیے دعا نکلے کہ اس نے ایسی کتاب تصنیف کی کہ جو انسان کو بھلائی، خیر اور سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشف المحجوب ایسی ہی ایک کتاب ہے جو اس کے مصنف کے اپنے قائم کردہ معیار پر پورا اترتی ہے اور یہ کتاب زمانوں پر حاوی ہے اپنے موضوع پر بے مثل ہے اور سرچشمۂ خیر ہے جو سدا جاری رہے گا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کا مزار لاہور میں ہے اسی نسبت سے لاہور داتا کی نگری کہلاتا ہے اور صدیوں سے یہ مزار مرجع خاص و عام ہے اور صدیوں سے اس کتاب سے لوگوں نے فیض اٹھایا ہے اور ہمیشہ فیض اٹھاتے رہیں گے۔

سید ابوالحسن علی المعروف داتا گنج بخشؒ محمود غزنوی کے دور میں غزنی کے ایک محلے

ہجویر میں ۴۰۰ ھ کے ماہ ربیع الاول میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی دینی تعلیم حاصل کرنے لگے اور مختلف مدارج اور منازل طے کرنے کے بعد حضرت ابوالفضلؒ کو پیر طریقت بنایا۔ انہی کے حکم پر تبلیغ و تشہیر اسلام کے لیے عازم لاہور ہوئے۔ آپ نے اکیلے ہی کٹھن اور جاں گسل منزلیں طے کیں اور لاہور پہنچے۔ جہاں اس وقت کوئی اسلام کا نام لیوا نہ تھا ایک ویران جگہ پر جھونپڑی بنا کر ڈیرہ ڈال دیا اور تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ بلاشبہ ان گنت انسانوں نے آپ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر دین حق کو قبول کیا ان میں لاہور کا نائب حاکم رائے راجو بھی شامل تھا جو آج داتا صاحب کے مزار کے احاطے میں دفن ہے۔ اس کی اولاد ہی مجاور اور جانشین بنی۔ داتا صاحب کی حیات اور ان کے وصال کے بعد ان گنت لوگوں نے آپ سے فیوض حاصل کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی یہاں اعتکاف کیا اور وہ شعر کہا جو آج زبانِ زد عام ہے ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

حضرت داتا گنج بخشؒ کا سنِ وصال ۴۶۵ ھ ہے۔

کشف المحجوب ۔ فارسی زبان میں تصوف پر پہلی کتاب ہے اور تصوف کی کتب میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے ایک عزیز شاگرد ابوسعید ہجویری آپ سے بسلسلہ تصوف سوالات کیا کرتے تھے۔ انہی سوالوں کے جواب اور وضاحت کے ضمن میں یہ کتاب معرضِ تخلیق میں آئی اور یہ وہ کتاب ہے جس کو ہر دور کے صوفیاء کرام نے خراج تحسین پیش کیا ہے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کتاب کشف المحجوب کی برکت سے اسے مرشد مل جاتا ہے۔

کشف المحجوب کے قلمی نسخوں اور اشاعت کا احوال بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اے جے آربری نے انڈیا آفس لائبریری کی فارسی کتب کی فہرست مرتب کی تھی۔ اس حوالے سے اس کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ موجود ہے جس کا اس فہرست میں یوں اندراج ہے۔

کشف المحجوب ۔ از ہجویری ۔ صفحات ۲۶۷ ۔ لیتھو ۔ مطبوعہ لاہور ۱۸۷۲ء کشف المحجوب کا پہلا اردو ترجمہ مولوی فیروز الدین نے کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن نے

اس کا پہلی بار انگریزی میں ترجمہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ سمرقندی نسخے کی اشاعت ملا سید عبدالمجید مفتی بن ملا سید عبداللہ المدرس الحنفی نے ۱۹۱۴ء میں کرائی۔ سمرقندی نسخے کے کئی ایڈیشن مختلف ممالک سے شائع ہو چکے ہیں۔

کشف المحجوب کا مستند ترین ایڈیشن روسی ماہر شرقیات والنتین ژوکوفسکی کا مرتب کیا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں ژوکوفسکی کا طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔ ژوکوفسکی نے اسے ترتیب دینے پر کئی برس صرف کیے۔ ۱۹۰۵ء میں کتاب کا متن ترتیب دے کر بمع سات ضمیمہ جات شائع کروایا۔ آٹھواں ضمیمہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ مگر روس کے اندرونی انتشار اور سیاسی حالات کی بنا پر اس کی جزبندی نہ ہو سکی۔ اور یہ منصۂ شہود پر نہ آسکا۔ ۱۹۰۸ء میں ژوکوفسکی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں جب روس میں کچھ امن ہوا تو سوویت حکومت نے ۱۹۱۴ء میں تیار ہونے والے نئے ایڈیشن کو ۵، مارچ ۱۹۲۶ء کو دو صفحوں کے پیش لفظ کے اضافے کے ساتھ شائع کر دیا۔

ژوکوفسکی نے کشف المحجوب کے اس نسخہ کی تکمیل و تدوین کے لیے متعدد قلمی نسخوں سے مدد لی تھی۔ بہر حال یہ نسخہ مستند ترین تسلیم کیا جاتا ہے۔

کشف المحجوب کے کئی قلمی نسخے لینن گراڈ، سمرقند، تاشقند، لندن، پیرس کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ایل۔ ایس ڈگن نے اس سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ بہت اہم ہے۔

اردو میں جن لوگوں نے کشف المحجوب کا ترجمہ کیا ہے ان میں مولوی فیروز الدین، شاہ ظہیر احمد ظہیری، خورشید احمد صمصام، محمد الدین بن منشی میراں بخش مزنگوی، محمد حسین مناظر اور میاں طفیل محمد شامل ہیں۔

کشف المحجوب کی مقبولیت کے بارے میں کچھ لکھنا بے معنی ہوگا کہ اس کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ اس ایک کتاب نے انسانوں کی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کیے ہیں۔ یہ کتاب فیض و برکت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔

کشف المحجوب کا ایک انتخاب پیش خدمت ہے۔

کشف المحجوب سے اقتباسات

٭۔ جس شخص کو معرفت کا علم نہیں اس کا دل بسبب جہالت بیمار ہے۔

٭۔ علم اگرچہ بے عمل ہی ہو، باعثِ عزت اور شرف ہوتا ہے۔
٭۔ علم اس صفت کا نام ہے جس کے پالینے سے ایک جاہل عالم ہوجاتا ہے۔
٭۔ علم کا ترک کرنا بھی جہالت ہے۔
٭۔ آگ پر قدم رکھنا آسان ہے، علم کی صحیح مطابقت اور موافقت مشکل ہے۔
٭۔ فقیر وہ ہوتا ہے جس کی کوئی چیز نہ ہو۔
٭۔ غنی خدا کا نام ہے، مخلوق اس نام کی مستحق نہیں ہوسکتی۔
٭۔ عزت درحقیقت وہ ہوتی ہے جو بندے کو خدا کے دربار میں حاضر کردے اور ذلت وہ ہے جو بندے کو خدا سے غائب اور غافل کردے۔
٭۔ درویش اپنے تمام معانی میں غیر اللہ سے بے تعلق اور تمام اسباب سے بیگانہ ہے
٭۔ جب دل دنیا کے علائق سے آزاد ہو تو اس کی تمام کدورت جاتی رہے گی اور یہ صفت ایک حقیقی صوفی میں ہوتی ہے۔
٭۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہو۔ تصوف کا حقیقی تقاضا ہے کہ صوفی مشاہدہ ذات حق کے لیے عالم ظاہر اور عالم باطن دونوں میں سے کسی کو نہ دیکھے۔
٭۔ گدڑی پہننا صوفیوں کا نشان ہے نیز گدڑی پہننا سنت بھی ہے مگر آداب فقر کی بجا آوری کے لیے گدڑی لازمی شے بھی نہیں ہے۔
٭۔ مشائخ دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔
٭۔ دنیا میں اللہ تعالے کے خاص بندے ملامت کے لیے مخصوص ہوا کرتے ہیں۔
٭۔ تقدیر کا انکار اہل قدر کا مذہب ہے اور معاصی کو اللہ تعالےٰ کے ذمے لگانا اہل جبر کا طریق ہے پس بندہ اللہ کی طرف سے اپنی استطاعت کے مطابق اپنے سب فعل میں مختار ہے۔ اور ہمارا مذہب قدر اور جبر کے درمیان ہے۔
٭۔ باطل پر راضی ہونا باطل ہوتا ہے۔
٭۔ جب مصیبت آتی ہے تو غافل لوگ کہتے ہیں کہ الحمدللہ جسم پر نہیں آئی اور دوستانِ

الٹی کہتے ہیں کہ الحمدللہ مدبن پر آئی ہے اور دین پر نہیں آئی ہے۔
؎ ۔ توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔
؎ ۔ محبت کو نفاق سے کچھ واسطہ نہیں۔
؎ ۔ غفلت اس کے دوستوں پر حرام ہے۔
؎ ۔ جو شخص ہوائے نفسانی سے آشنا ہو وہ خدا تعالےٰ سے جُدا ہوتا ہے۔
؎ ۔ مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا بالکل ایسے ہے جیسے قیدی سے قیدی مدد مانگے۔
؎ ۔ ایک سانس عبادت الٰہی میں بہتر ہے کہ خلقت تمہاری فرماں برداری کرے۔
؎ ۔ حقیقت میں علم عمل کی نسبت زیادہ بزرگ ہے کیونکہ خدا تعالےٰ کو علم سے پہچان سکتے ہیں۔ عمل سے اسے پا نہیں سکتے۔
؎ ۔ دل کے اعمال اعضاء کے اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں۔
؎ ۔ زبان کی حفاظت کرسچ بولنے سے، نظر کی عبادت کر عبرت حاصل کرنے سے۔
؎ ۔ دوست دوست کے فرمان کو حقیر نہیں سمجھتے اور اس فرمان کا ادنےٰ درجہ اختیار نہیں کرتے۔
؎ ۔ درویشی کی عزت کو خلقت سے پوشیدہ رکھ۔
؎ ۔ درویش کی غذا حالتِ وجد ہے، اس کا لباس تقوےٰ ہے اور مسکن غائب ہے۔
؎ ۔ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے نفس کے عارف، سو ان کا شغل مجاہدہ اور ریاضت ہوتا ہے۔ دوسرے عارفِ حق، ان کا شغل مجاہدہ اور اس کی عبادت اور رضا جوئی ہوتا ہے۔
؎ ۔ ثواب حق سے حجاب کا محل ہے۔
؎ ۔ شوق اور خوف ایمان کے دوستوں میں سے ہیں۔
؎ ۔ جس نے تمام اشیاء کو اللہ کی طرف سے جانا وہ ہر چیز میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے نہ کہ چیزوں کی طرف۔
؎ ۔ محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نازک نہیں۔

٭۔ جب کوئی شخص یوں کہے کہ میں فاضل ہوں یا ولی تو وہ شخص نہ فاضل رہتا ہے نہ ولی۔

٭۔ ولی کرامت سے آپؐ (رسول کریم) کی نبوت کو بھی ثابت کرتا ہے اور اپنی ولایت کو بھی۔

٭۔ جس نے اللہ تعالےٰ کو پہچان لیا۔ اس کا کلام کم ہوگیا اور اسکی حیرت ہمیشہ کے لیے ہوگئی۔

٭۔ دل کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبر اور تفکر کرنا ہے۔

٭۔ دوست دوست کی بلا سے بھاگا نہیں کرتے۔

٭۔ محبت تو یہ ہے کہ تو اپنے کو بہت تھوڑا جانے اور اپنے دوست کے تھوڑے کو بہت۔

٭۔ ولایت کی شرط سچ بولنا ہے۔ جھوٹا ولی نہیں ہو سکتا۔

٭۔ کرامت کی شرط پوشیدہ رکھنا اور معجزے کی شرط ظاہر کرنا ہے۔

٭۔ عذر کرنا بے گانگی کی شرط ہے اور محبت میں بے گانگی ظلم ہے۔

٭۔ اچھا کلام اگرچہ سخت ہو اچھا ہوتا ہے۔

٭۔ آدمی سامان کی زیادتی سے دنیا دار نہیں ہو جاتا اور اس کی کمی سے درویش نہیں ہو جاتا۔

٭۔ شریعت کا رد کرنا الحاد اور حقیقت کا رد کرنا شرک ہے۔

٭۔ جب عالم بگڑ جائے تو عبادتِ الٰہی اور شریعت کے امور میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے جب امیر بگڑ جائے تو انتظامِ معاش بگڑ جاتا ہے۔ اور جب فقیر بگڑ جائے تو مذہب اور اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔

٭۔ لقمے کا دوسروں پر ایثار کرنا تو کتوں کا کام ہے۔ مردانِ حق تو اپنی جان اور زندگانی ایثار کرتے ہیں۔

٭۔ بندہ سوائے مخالفتِ نفس کے حق تعالےٰ کی طرف راہ نہیں پا سکتا۔

٭۔ بہشت رضائے تاثیر اور دوزخ اس کے غضب کا نتیجہ ہے۔

٭۔ حق کی تدبیر درست ہے اور خواہش کی تدبیر خطا۔

٭۔ جیسے مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے حاصل نہیں ایسے ہی مجاہدہ بھی بغیر مشاہدے کے محال ہے۔

٭ ۔ کرامت کا اظہار جھوٹے کے ہاتھ پر محال ہے ۔

٭ ۔ ولی کرامت سے مخصوص ہوتا ہے، نبی معجزہ سے ۔

٭ ۔ علم الیقین مجاہدے سے ہوتا ہے ۔

٭ ۔ عین الیقین عارفوں کا مقام ہے، اس لحاظ سے کہ وہ موت کے لیے بالکل مستعد ہوتے ہیں ۔

شاہنامہ

"شاہنامہ" فردوسی کا شمار دنیا کی عظیم ترین رزمیہ شاعری میں ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہنامہ فردوسی کا وہ عظیم شعری فن پارہ ہے جو بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ فارسی زبان نے عظیم فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ ان میں شاہنامہ کی حیثیت بے حد منفرد ہے شاہنامہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بارے میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاہنامہ فردوسی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سر جارج ہملٹن کے بارے میں بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کے سوانح نگار اور شاہنامہ کے مترجم کی حیثیت سے انگریزی میں جو کام کیا ہے اس کے حوالے سے ساری دنیا میں فردوسی کا شاہنامہ مقبول اور مشہور ہوا۔

فردوسی ایک ایسی شخصیت ہے جسے اس کے اپنے دور میں اختلافی قرار دیا گیا تھا۔ شاہنامہ پر بھی خاصی لے دے ہوتی رہی ہے۔ پھر سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے حقیقی یا فرضی واقعہ کے حوالے سے بھی ایک طویل ترین بحث صدیوں سے جاری ہے۔ فردوسی کی زندگی کے حالات اور نظریات پر بھی خاصی بحث ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اردو زبان میں حافظ محمود شیرانی نے فردوسی پر گرانقدر کام کیا ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق و تدقیق سے فردوسی کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی ایک کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

شاہنامہ کیسے لکھا گیا۔ اس کی شان نزول بہت دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر فردوسی

کی زندگی میں ایک رات نہ آتی تو شاید شاہنامہ کبھی لکھا نہ جا سکتا۔ فردوسی عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ نیند نہ آ رہی تھی۔ بیوی کو آواز دی۔ جس نے چراغ لا کر روشن کیا حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:۔

"الغرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر میوے اور ایک جام شراب بھی لایا گیا۔ کچھ دیر شراب اور موسیقی، ساز سے دل بہلایا گیا۔"

(فردوسی پہ چار مقالے صہ ۳)

اس کے بعد فردوسی کی بیوی نے کہا:

"اگر تمہاری خوشی ہو تو دفتر پاستاں سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم و بزم، فریب اور محبت کے واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خردمند لوگوں کے ذکر سے مملو ہے اور جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہو گی۔ فردوسی نے اصرار سے کہا: "اے ماہرو آج رات یہ داستان تم ضرور سناؤ۔ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہو گا۔ بیوی نے کہا: "میں یہ داستان سنانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم اقرار کر لو کہ سننے کے بعد اس کو نظم کر دو گے۔ فردوسی نے جواب دیا۔ مجھے منظور ہے۔

(فردوسی پہ چار مقالے صہ ۳)

اس رات فردوسی نے اپنی بیوی سے جو داستان سنی وہ داستان بیژن ہے۔ جس کا ذکر خود فردوسی نے کیا ہے کہ اس نے جس پہلی داستان کو شاہنامہ کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے نظم کیا۔ وہ یہی داستان بیژن ہے۔ یہ داستان اسی زمانے میں شاہنامہ سے پہلے شائع ہوئی مشہور ہوئی اور شاہنامہ کی تکمیل کا محرک بنی۔

"دفتر پاستاں" یا "نامہ خسرواں" فردوسی کے زمانے سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی جس میں قدیم ترین شاہان ایران کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ بعد میں اس کا اصل نسخہ غائب ہو گیا۔ مگر اس کے اجزا سلامت رہے۔ جنہیں ۳۴۸ ہجری میں ابو منصور العمری نے دوبارہ ترتیب دیا۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے حاصل کیے۔ لیکن دراصل دفتر پاستاں ہی شاہنامہ کا اصل ماخذ ہے

فردوسی کو ایک خاص شہرت یہ بھی حاصل رہی ہے کہ وہ اختصار پسندی اور ایجاز گوئی میں کمال رکھتا ہے۔ اس کے ہاں بے جا طوالت دکھائی نہیں دیتی۔ جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو اس کی عمر چالیس اور پچاس برس کے درمیان تھی۔ شاہنامہ مکمل کرنے کے لیے وہ اصل نسخہ، دفتر پاستاں کی تلاش میں بخارا، ہرات اور مرو بھی گیا۔

شاہنامہ کا آغاز کب ہوا۔ اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاہنامہ کے خاتمے پر فردوسی خود بیان کرتا ہے کہ اس نے شاہنامہ پر ۲۵ برس صرف کیے۔ "شاہنامہ" ۴۰۰ ہجری میں مکمل ہوا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:۔

"اس لیے ظاہر ہوا کہ ۳۶۵ ہجری میں شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد قائم کیا گیا ہوگا۔ اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے۔

بسے رنج بُردم دریں سال سی
عجم گرم کردم بدیں پارسی

تو ۳۷۰ ہجری شاہنامہ کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے۔ ۳۸۸ھ میں سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی کے ایام میں جب وہ چھیاسٹھ سال کا ہے۔ لکھتا ہے۔

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار ایں گنج کیست

اس حساب سے ۳۶۸ ہجری پہلا سال ہے۔"

(حافظ محمود شیرانی۔ فردوسی پر چار مقالے ص۱۲)

اس بحث و تحقیق کے بعد حافظ محمود شیرانی ۳۷۰ ہجری کو شاہنامہ کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا سال قرار دیتے ہیں۔

"شاہنامہ" کے حوالے سے سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے قصے کو بڑی شہرت ہوئی۔ اسے تاریخ کا ایک اہم حصہ بنا لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت عنصری سے منسوب ہے کہ عنصری کے حوالے سے فردوسی سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا۔ محمود غزنوی سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہزار ابیات پہلے سے لکھے ہوئے تھے جن

کے بدلے میں فردوسی کو ایک ہزار طلائی درہم ادا کر دیے گئے۔ بعد میں بادشاہ کا ارادہ بدل گیا کہ ساٹھ ہزار اشعار کے عوض ساٹھ ہزار طلائی درہم دینے پڑیں گے۔ جب شاہنامہ مکمل ہوا تو اسے چاندی کے ساٹھ ہزار درہم بھجوائے گئے۔ فردوسی اس وقت حمام میں تھا۔ اُسے رنج ہوا۔ اس نے اسی وقت بیس ہزار درہم حمّال کو بیس ہزار فقاعی کو اور بیس ہزار درہم لانے والے کو بطور انعام دے دیے۔ بحر متقارب میں ہجو لکھی۔ سلطان محمود غزنوی کے مقرب ایاز کے حوالے کی اور روپوش ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی کی نگاہ سے وہ ہجو گزری تو وہ طیش میں آ گیا اس نے اس کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر دیا۔

نظامی عروضی کی روایت اس سے بالکل مختلف ہے کہ شاہنامہ طوس میں مکمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے کم انعام دیا۔ فردوسی نے اسے بانٹا۔ سو ابیات پر مشتمل ہجو لکھی۔ طبرستان بھاگ گیا۔ طبرستان کے والیٔ شہریار سے کہا کہ تمہارے آباؤ اجداد کے کارنامے نظم کیے ہیں اسے تمہارے نام معنون کرتا ہوں۔ والیٔ طبرستان نے کہا۔ "نہیں اسے سلطان محمود غزنوی کے نام ہی رہنے دو۔ البتہ ہجو میں خریدنا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک لاکھ درہم فردوسی کو بھجوا دیے۔ ہجو کو دھو ڈالا۔

ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انعام اس لیے کم دیا گیا کہ فردوسی سے مذہبی نقطہ نظر کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ معتزلی ہے۔

"شاہنامہ" میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں فردوسی نے سلطان محمود کی مدح کی ہے فردوسی سلطان محمود غزنوی کو "ژندہ پیل" اور "روح جبرائیل" اور "دل دریائے نیل" کہتا ہے۔

حقیقت کچھ یوں ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے شاہنامہ کی تکمیل کی کوئی اخلاقی ذمے داری قبول نہ کی تھی۔ فردوسی نے اسے کسی بھی سرپرستی اور اعانت کا وعدہ لیے بغیر خود ہی شروع اور مکمل کیا تھا۔ فردوسی مال و دولت کا بھی رسیا نہ تھا۔ بقول حافظ محمود شیرانی فردوسی "غذا، لباس اور بستر" ان تین اشیاء کو ہی ضرورتِ زندگی سمجھتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے خیال میں فردوسی کا یہ اپنا ذاتی ردِّعمل تھا۔ سلطان محمود غزنوی قصوروار نہ تھا۔

اسی ضمن میں حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "فردوسی پہ چار مقالے" میں تفصیل سے

بحث کی ہے۔ اس میں ایک مقالہ "ہجو سلطان محمود غزنوی" خصوصی مطالعے کی چیز ہے۔

فردوسی پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کی فتوحات کا ذکر جان بوجھ کر گھٹا کر کیا ہے۔ اس طرح اسلامی جذبات کو مجروح کیا ہے۔ مذہبی حلقوں میں اس حوالے سے شاہنامہ پر بڑی تنقید ہوئی۔ حالانکہ یہ طرز فکر سراسر غلط تھا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی۔ جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزامات کے عالیشان قصر تعمیر کر لیے گئے۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایران مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطہ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مباہات کا صنم کدہ تعمیر ہو رہا ہے تو پھر دوسری قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ جس صورت میں کہ رقابت کی آگ بھی زیر خاکستر ہو... فردوسی صنادید عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا۔ ساسانی ایمان اور کیانی ایران کی مرثیہ خوانی کر رہا تھا۔ وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملے میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی۔

(فردوسی چار مقالے صد ۱۳۶)

شیخ سعدیؒ نے شاہنامہ کے بارے میں فرمایا ہے ؎

سخن گوئے پیشہ دانائے طوس
کہ آراست روئے سخن چوں عروس

ایک بار امام غزالیؒ نے اثنائے وعظ فرمایا۔ "اے مسلمانو! تم کو وعظ و نصیحت کرتے مجھ کو چالیس برس کا زمانہ گزرا۔ اس دراز زمانے میں جو پند و نصیحت میں نے تم کو کی ہے فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ز روز گزر کردن اندیشہ کن
پرستیدن داد گر پیشہ کن

اگر اس پر عمل کرو تو پھر تم کو کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں۔"

ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل قدیم ایران کی تاریخ کو لکھنے والا یہ عظیم شاعر فردوسی ۳۰۰ ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کا نام منصور تھا حکیم لقب اور ابوالقاسم کنیت۔ طوس کا ایک گاؤں۔ شاداب اس کا مولد ہے اس کا باپ ایک فاضل مذہبی پیشوا تھا۔

شاہنامہ فردوسی سے داستان "ضحاک و فریدون"

شاہ جمشید کا قتل ہو چکا ہے۔ ایران کے تخت پر ضحاک جیسا ظالم وستم گر حکمران بن بیٹھا ہے۔ ضحاک کے دونوں شانوں پر دو سانپ ہیں جن کی غذا انسانوں کے مغز ہیں۔ ضحاک اپنے سانپوں کی پرورش اور زندگی کے لیے ظلم وستم کی انتہا کر دیتا ہے۔

دو بے گناہ انسانوں کو ہلاک کر کے ضحاک کے شانوں پر موجود سانپوں کی غذا بنا دیا جاتا ہے۔ ایران میں لوگ ضحاک کے ظلم وستم سے تنگ آ چکے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ضحاک کو قتل کر کے ظلم وستم کا خاتمہ کر سکے۔

ضحاک کا ظلم وستم اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ اہل ایران یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ضحاک ان کا مقدر بن چکا ہے۔ اس تصور سے وہ اپنی جان کسی طرح نہیں بچا سکتے۔

ایک رات ضحاک ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خواب میں تین افراد دکھائی دیے ان میں دو بڑے اور ایک جوان تھا۔ اس جوان کے ہاتھ میں ایک انوکھا، بھاری اور شاندار گرز تھا۔ اس نوجوان نے اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں میں جکڑ دیے اور اس پر اس انوکھے اور بھاری گرز سے حملہ آور ہوا ہے۔

ضحاک یہ خواب دیکھ کر ڈر گیا۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے سارے محل کو سر پر اٹھا لیا۔ سب جاگ گئے۔ ضحاک نے حکم دیا کہ اس وقت ستارہ شناسوں اور نجومیوں کو حاضر کیا جائے۔ اس خواب نے اس کی چین اور قرار کا خاتمہ کر دیا تھا۔

ستارہ شناس اور نجومیوں کا اجتماع ہوا۔ ضحاک نے اپنے خواب بیان کر کے حکم دیا کہ اسے اس کی تعبیر سے آگاہ کیا جائے۔ ستارہ شناس اور نجومیوں نے حساب لگایا۔ غور کیا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔ تین دنوں تک وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس خواب کی

سچی تعبیر سننے کے بعد ضحاک کہیں ان پر ہی ظلم وستم توڑنا شروع نہ کر دے۔ جب ضحاک نے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچی تعبیر سننے کے باوجود ان ستارہ شناسوں اور نجومیوں کو کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ تو انہوں نے اس خواب کی تعبیر بیان کر دی اور کہا۔

بادشاہ۔ فریدون نام کا ایک شخص پیدا ہوگا۔ ایک بہت دودھ دینے والی گائے کے دودھ پر وہ پلے گا۔ وہ طاقت وحشمت میں بے مثل ہوگا۔ اس کے پاس جوانی میں ایک شاندار اور انوکھی شکل کا گرز ہوگا۔ جس کی شکل گاؤ سر سے ملتی ہوگی۔ وہ تیرے سر پر اسے مارے گا اور تجھے ایران کے تخت سے محروم کر دے گا۔

اے بادشاہ۔ تیرے ہاتھوں اس فریدون کے باپ کا قتل ہوگا۔ اور ایک اور آدمی جس کو تم نے بڑی عمر کا اپنے خواب میں دیکھا ہے وہ فریدون کا ساتھی بنے گا۔

جب ضحاک نے اپنے خواب کی یہ تعبیر سنی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو۔ فریدون کو تلاش کیا جائے۔

نجومیوں نے اسے بتایا کہ ابھی فریدون پیدا نہیں ہوا۔ اس کا باپ تیرے ہاتھ سے قتل ہوگا۔ وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے نکلے گا۔

ضحاک کی نیند اڑ گئی۔ وہ شب و روز بے چین رہنے لگا۔ اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ کسی طرح فریدون کا پتہ چل جائے اور اسے ہلاک کر کے اپنے انجام سے بچ جائے۔ ضحاک نے اپنے آدمیوں کو فریدون کی تلاش میں بھیج دیا اور حکم دیا وہ نسلِ کیان سے تعلق رکھنے والے جس بچے کو دیکھیں اس کو ہلاک کر دیں۔

فریدون۔ شاہ طہمورث کی نسل میں واحد و تنہا باقی رہ گیا تھا۔ اس کے باپ اور ماں کو ہر دم یہی فکر رہتی تھی کہ ضحاک کہیں ان کے لختِ جگر کو تلاش نہ کر لے۔ اس خوف کے پیشِ نظر وہ فریدون کو گھر سے باہر لے کر نہ جاتے تھے۔ فریدون ابھی شیر خوار ہی تھا کہ ایک دن اس کے باپ نے اس کی ماں سے کہا کہ اب تو گھر میں رہتے رہتے دم گھٹنے لگا ہے۔ کیوں نہ کچھ دیر کے لیے ہم دشت کی سیر کو چلیں۔

قسمت اور ستاروں کا حساب پورا ہوتا تھا۔ ادھر وہ جنگل میں پہنچے، ادھر ضحاک کے

وہ آدمی ادھر آنکلے جو فریدون کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ فریدون کے باپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ جس طرح ہو سکے وہاں سے نکل جائے۔ دل گرفتہ اور پریشان خاتون اپنے لختِ جگر کو سنبھالے وہاں سے نکل بھاگی۔ فریدون کے باپ کو آدمیوں نے جکڑا اور اسے ضحاک کے حضور پیش کر دیا۔ ضحاک کو جب معلوم ہوا کہ یہ نسلِ کیان سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے اسی وقت اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔ یوں خواب کی تعبیر کا ایک حصہ پورا ہوا کہ ضحاک فریدون کے باپ کو قتل کرے گا۔

فریدون کی ماں اسے لے کر دور نکل گئی۔ وہ ایک مرغزار میں پہنچی۔ جہاں ایک بزرگ رہتا تھا۔ جس کی ایک گائے تھی جو بہت زیادہ اور بہت شیریں دودھ دیتی تھی۔ اس مردِ بزرگ نے فریدون کی ماں کو پناہ دی۔ فریدون کو گائے کا دودھ پیٹ بھر کر پلایا گیا۔ رات ہوئی تو اس عورت نے اپنی بے بسی کا ماتم کیا۔ دل میں وسوسوں نے گھر کیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے پہچان لیا گیا تو اس کا بیٹا بھی مارا جائے گا۔ جس طرح سے بھی ہو دل پر جدائی کا پتھر رکھ کر مجھے اپنے بیٹے کی جان بچانی چاہیے۔ وہ اس بزرگ کے پاس گئی۔ اسے سارا ماجرا سنایا اور درخواست کی کہ وہ اس بچے کو اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اس کی پرورش اس گائے کے دودھ سے کرے۔ وہ اگر وہاں رہی تو پھر ضحاک ستم گر کو سراغ مل جائے گا۔ اور اس کے بچے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ مردِ بزرگ نے اسے تسلّی دی۔ اس کے شیر خوار بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ماں بے چاری دل پر جدائی کا پتھر رکھ وہاں سے چلی گئی۔

یوں تین برس کا عرصہ گزر گیا۔ وہ مردِ بزرگ فریدون کو باپ کی شفقت دیتا رہا۔ اسے گائے کے دودھ پر پالا۔ اور اس کی حفاظت کی۔ تین برس کے بعد فریدون کی ماں کی محبت نے جوش مارا اور وہ اپنے لختِ جگر کو دیکھنے کے لیے اس مرغزار میں پہنچی جہاں وہ اپنے بیٹے کو اس مردِ بزرگ کے پاس سونپ آئی تھی۔ بزرگ نے ماں بیٹے کی ملاقات کرائی۔ اور پھر فریدون اپنی ماں کے پاس کوہ البرز چلا گیا جہاں اس کی ماں کا ایک مکان تھا۔ ضحاک اور اس کے مخبروں کو فریدون کی خبر ملی تو وہ مرغزار میں مردِ بزرگ کے پاس پہنچے۔

مگر وہاں سے فریدون جا چکا تھا۔ ضحاک نے اس مردِ بزرگ کے ساتھ اس گائے کو بھی ہلاک کر دیا۔ جس کا دودھ پی کر فریدون نے پرورش حاصل کی تھی۔ ضحاک اور اس کے آدمی فریدون اور اس کی ماں کی کھوج میں نکلے۔ فریدون کی ماں کے دل کو دھڑکا تو لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو کوہ کی چوٹی پر رہنے والے ایک بزرگ کے پاس لے گئی۔ اپنے بیٹے کو اس کے قدموں میں ڈال کر اس نے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹے کو پناہ دے۔ بزرگ نے شفقت سے فریدون کو قدموں سے اُٹھا لیا۔

ادھر ضحاک اور اس کے آدمیوں نے فریدون کی ماں کے گھر کو تاخت و تاراج کر دیا، لیکن وہ اس چوٹی تک نہ پہنچ سکے جہاں فریدون اس مردِ بزرگ کی پناہ میں تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اس مردِ بزرگ نے فریدون کی ماں سے فریدون کے سامنے کہا۔ "یہ لڑکا بڑا اظفر مند و خوش اقبال ہے۔ یہ ظلم کا سر کچل دے گا۔ فریدون ضحاک کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔ فریدون کی قسمت میں ایران کا بادشاہ بننا لکھا ہے۔" فریدون کی ماں نے فخر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ضحاک نے فریدون کے باپ کو ہلاک کیا تھا۔ اب بیٹا اس کا انتقام لے گا۔ فریدون ابھی بچہ تھا لیکن وہ جوش میں آ گیا۔ اس نے ماں سے کہا۔ میں ضحاک کا سر قلم کرنے جاتا ہوں۔ ماں نے اسے سمجھایا کہ بیٹے تو ابھی کم سن ہے۔ ابھی بڑا ہو لے۔ پھر خدا ایسا سامان پیدا کر دے گا کہ تو بھی فوج جمع کر سکے۔ ضحاک کا مقابلہ کر سکے۔ ماں کے سمجھانے بجھانے پر فریدون کا جوش کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔

خلقِ خدا ضحاک سے آزردہ ہو چکی تھی۔ صبح و شام اس کے سانپوں کے لیے غذا فراہم کرنے کو انسانوں کو ہلاک کیا جاتا۔ ضحاک کو ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح فریدون مل جائے وہ اسے ہلاک کر کے اپنے انجام سے بچ جائے۔ اس کے آدمیوں نے اسے خبر کی کہ اگرچہ فریدون ابھی کم سن ہے۔ لیکن ابھی سے وہ بہادری میں بے مثل ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ فریدون کی جان بچانے کے لیے اسے ملک ہندوستان بھیج دیا گیا ہے۔ ضحاک نے ارادہ باندھا کہ وہ ایک بھاری فوج جمع کرے اور ہندوستان بھی فتح کرے اور فریدون کو بھی تلاش کر کے قتل کر دے۔ اپنی ایران کی حکومت کو محفوظ رکھنے کے لیے ضحاک نے حکم دیا کہ تمام امیر

عزیب ایک محضر نامے پر دستخط کریں۔ اس کی وفاداری کی قسم کھائیں۔ اس کے بارے میں تحریر کریں کہ وہ عادل و منصف ہے۔ سب امرا اور لوگوں نے اس کے ظلم وستم کے خوف سے اس محضر نامے پر دستخط کر دیے۔

ایک آہن گر بھی وہاں رہتا تھا۔ نام اس کا کاوہ تھا۔ ضحاک کا ارادہ تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو ہلاک کرے اور اپنے شانوں پر جھولنے والے سانپوں کو اس کی غذا کھلائے۔ کاوہ آہن گر کو علم ہوا کہ بادشاہ اس کے بیٹے کی جان کے درپے ہے تو وہ فریاد لے کر دربار میں پہنچا۔ کاوہ نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ شاہ کو اس کے مظالم سے آگاہ کیا۔ ضحاک نے موقع کے مطابق یہ حکمت عملی اختیار کی کہ کاوہ آہن گر کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کو ہلاک نہ کرے گا۔ وہ عادل ہے اور کاوہ آہن گر کو بھی اس محضر نامے پر دستخط کرنے چاہئیں جب کاوہ آہن گر نے وہ محضر نامہ پڑھا۔ اس نے عمائدین کو مخاطب کر کے ان کو بزدل قرار دیا۔ اس نے سب کو خوب لعن طعن کی۔ اس محضر نامے کو چاک کیا اور اپنے بیٹے کو لے کر اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کاوہ آہن گر فریدون کے پاس پہنچا۔ اس کا اطاعت گزار ہوا۔ اس کا حامی بنا۔ اس نے لوگوں کو ضحاک کے ظلم وستم کے خلاف جمع کرنا شروع کیا۔ فریدون کے لیے ایک فوج ترتیب دینے لگا۔ لوگ جو پہلے ہی ضحاک کے ظلم وستم سے تنگ آ چکے تھے وہ جوق در جوق اس فوج میں جمع ہونے لگے۔

اس کاوہ آہن گر نے فریدون کے لیے گاؤ سر گرز تیار کیا۔ اس نے آہن گروں کے پرچم میں تبدیلی کی اور فریدون کے لشکر کے لیے ایک پرچم تیار کیا۔ جسے "درفش کاویانی" کے نام سے ابدی شہرت حاصل ہوئی۔ اس پرچم کے نیچے فریدون کی تاجپوشی ہوئی۔ اس رسم کے بعد فریدون اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے دعا کرے کہ وہ ضحاک کو ختم کر کے ظلم وستم کا نشان مٹا دے۔

ضحاک ہندوستان کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اپنے پیچھے وہ فریدون کی ہلاکت کے لیے کئی جادوگر اور افسوں کار چھوڑ گیا تھا کہ اگر فریدون ایران میں مل جائے تو وہ اسے ختم کر دیں۔ مگر ایک مرد بزرگ و درویش نے فریدون کو ایسے فسوں سکھا دیے کہ جو ہر طلسم

کا توڑ تھے ۔ فریدون تمام طلسمات کو توڑتا ہوا ضحاک کے محل میں پہنچا ۔ اس کے خزانے پر قبضہ کیا جو فوج وہاں موجود تھی اس کو شکست دی ۔ محل پر قابض ہوا اور اس تخت پر جا بیٹھا جو ضحاک کا تخت تھا ۔

ایک شخص جان بچا کر کسی طرح خبر دینے ضحاک کے پاس پہنچ گیا ۔ اسے بتایا کہ اس کے محل پر قبضہ ہو چکا ہے اور تخت پر فریدون جانشین ہو گیا ہے ۔ ضحاک کو خوف لاحق ہوا کہ اگر اس کی فوج کو حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ بغاوت کر دے گی ۔ کیونکہ اب اس کے فوجی بھی اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے ۔ ضحاک نے یہ بات پھیلائی کہ اس کے محل میں اس کا کوئی دشمن نہیں گیا بلکہ اس کا ایک فرماں روا دوست وہاں بطور مہمان ٹھہرا ہے ۔

جب وہ ایران پہنچا تو وہاں اس کی فوج اس سے بد دل ہو گئی ۔ ہزاروں سپاہی فریدون کی فوج سے جا ملے ۔ ضحاک نے سوچا کہ ایک ہی راستہ ہے کہ وہ چوری چھپے محل میں داخل ہو اور فریدون کو ہلاک کر دے ۔ اس نے رات کی تاریکی میں فصیل پر کمند پھینکی اور محل میں جا اترا ۔ لیکن فریدون نے اسے دیکھ لیا ۔ اس نے اپنا گاؤ سر گرز اٹھایا اور پوری قوت سے ضحاک کے سر پر دے مارا ۔ اس کے بعد ضحاک کو ہوش نہ رہا ۔ جب فریدون نے دوسری ضرب لگانے کا ارادہ کیا تو غیب سے صدا آئی کہ ابھی یہ زندہ ہے ۔ اسے کوہ دماوند کی ایک غار میں لے کر قید کر دو ۔ وہاں اژدہے ہیں جو اس کا کام تمام کر دیں گے ۔ اس کا یہی انجام لکھا ہے ۔ اس ندائے غیب پر عمل کرتے ہوئے فریدون نے ضحاک کو اس غار میں لا پھینکا اور وہیں اس کا کام تمام ہوا ۔

فریدون نے عدل و انصاف سے حکومت کی ۔ رعایا کے دل شاد ہو گئے ۔ فریدون نے لمبی عمر پائی ۔ ایران پر حکومت کی پھر اس نے اپنی حکومت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا ۔

گلستاں

شیخ سعدیؒ کو اپنی تصنیف "گلستان" پر خود بھی ناز تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

بچہ کار آیدت ز گل طبقے
از گلستان من ببر ورقے
گل ہمیں پنج روز و شش باشد
ویں گلستاں ہمیشہ خوش باشد

ایک اور جگہ "گلستاں" کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بر خے از عمر گراں مایہ بر و خرج کردیم"

شیخ سعدیؒ کی تصانیف میں جو شہرت "گلستاں" اور "بوستاں" کو حاصل ہوئی ہے وہ فارسی زبان میں لکھی جانے والی چند کتابوں کا ہی مقدر بن سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "گلستاں" اور "بوستاں" مقبولیت اور شہرت کے علاوہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اتنی اہم ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسری کتاب پر ترجیح دینا خاصا کٹھن کام ہے لیکن چند ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر "گلستاں" کو "بوستاں" پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو خود شیخ سعدیؒ کو "گلستاں" بے حد عزیز تھی اور اس پر انہیں بجا طور پر ناز بھی تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی زبان کی شاعری میں "بوستاں" سے پہلے بھی ایسی عظیم شعری تخلیقات وجود میں آچکی تھیں۔ جن کی اپنی اہمیت اور شہرت ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا حالی اپنی کتاب "حیاتِ سعدی" میں لکھتے ہیں۔

"فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اس سے بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہراً کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو۔"

(حیات سعدی۔ حالی ص ۴۳)

شیخ سعدی کے ایک سوانح نگار اور شارح سر گور اوسلی نے لکھا ہے:۔

"سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو مشہور فاضل اجینٹس نے لاطینی میں کیا تھا۔ اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم وادب کو شیخ سعدی کا فریفتہ بنائے رکھا۔"

فارسی زبان میں جن چار کتابوں نے ایران، برصغیر پاک وہند اور دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ان میں "شاہنامہ فردوسی" "مثنوی مولانائے روم" "گلستاں" "دیوان حافظ شیراز" اور "رباعیات عمر خیام" کا کوئی حریف نہیں، ان کتابوں کی شہرت اور مقبولیت کی اپنی اپنی وجوہات ہیں لیکن ایک خوبی ان سب کتابوں میں مشترک ہے۔ وہ ہے بیان اور اسلوب کی دلآویزی اور سادگی۔

یہ مطالعہ اپنی جگہ بے حد دلچسپ ہے کہ گلستاں کو یہ بے مثل مقبولیت کیسے حاصل ہوئی۔ جبکہ شاہنامہ فردوسی میں رزم و بزم کے شاہانہ اور ڈرامائی واقعات ہیں۔ مثنوی تصوف اور اسرار و رموز کا بحر بیکراں ہے۔ حافظ کا دیوان عشق و جوانی اور رندی کے شدید جذباتی موضوعات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے برعکس "گلستاں" ایک تو نثر میں ہے۔ دوسرے اس میں نہ رندی ہے نہ رزم و بزم کی چاشنی نہ تصوف کے اسرار و رموز۔ یہ سادہ اخلاقی حکایتوں پر مبنی ہے۔ لیکن ان اخلاقی حکایات میں معنی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اگر مجھے اجازت دے دی جائے تو میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ "گلستاں" کا موضوع اس کی حکایات کا جو براہ راست تعلق عوام سے ملتا ہے۔ وہ اس کتاب کی روح ہے۔ یوں تو اس سے ہر عمر اور ہر مزاج کا آدمی مستفید ہوا ہے لیکن ان حکایات میں جو ایک خاص تخاطب اور اپروچ ہے وہ اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ عام انسانوں کے دلوں کو چھو لیتی ہے
"گلستاں" نثر میں اخلاقی حکایات کی سب سے عظیم کتاب ہے لیکن شیخ سعدی نے اخلاقیات کا درس جس مؤثر اور دلنشیں انداز میں دیا ہے وہ دلوں پر بوجھ نہیں ڈالتا نہ ہی وہ وعظ کا رنگ اختیار کرتا ہے۔"

لگ بھگ سات سو برس سے "گلستاں" اور "بوستاں" دنیا بھر میں پڑھی جا رہی ہے ایران اور برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے اسے ابتدائی تعلیم کا جزو بنایا گیا۔ اب بھی اس کی یہی اہمیت برقرار ہے۔

"بوستاں" کے مقابلے میں "گلستاں" کے تراجم دنیا کی زیادہ زبانوں میں ہوئے اور بار بار ہوئے۔ مولانا حالی "حیات سعدی" میں لکھتے ہیں:-
"گلستاں" کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنچایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ (صفحہ ۷۶)

"گلستاں" کے اکثر قطعات و ابیات کا ترجمہ عربی زبان میں شیخ سعدی کی زندگی میں ہی ہونے لگا تھا۔ پھر کئی صدیوں تک اس کے مختلف تراجم مختلف ادوار میں ہوتے رہے ترکی میں بھی اس کا ترجمہ ابتدائی زمانے میں ہی ہوا۔ اردو، ہندی، گورمکھی اور پنجابی، برصغیر کی کتنی ہی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مغرب میں اجینٹس نے سب سے پہلے گلستاں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ ڈوریائر نے فرانسیسی میں اسے پہلی بار منتقل کیا۔ یہ فرانسیسی ترجمہ ۱۶۳۴ء میں پہلی بار پیرس میں شائع ہوا۔ ۱۷۸۹ء اور ۱۸۳۴ء میں بھی اس کے دو فرانسیسی تراجم ہوئے جن کے مترجم گاڈین اور سیمالیٹ تھے۔ جرمنی میں اس کے کئی تراجم ہوئے جن میں اولی ایرلیس کا ترجمہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۶۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں گراف نے بھی گلستاں کا جرمنی ترجمہ چھپوایا ہے۔ ڈچ زبان میں بھی گلستاں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں گلستاں کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں۔ جن میں گیڈرن

۱۹۵۵ء ۔ اور الیسٹک کے تراجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُردو میں میر شیر علی افسوس کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں حصہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور حصہ نظم کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔

گجراتی، بنگالی اور بھاشا میں بھی گلستاں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

شیخ سعدی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

گلستاں، بوستاں، کریما، دیوانِ غزلیات، مجموعہ قطعات و رباعیات، قصائد عربی و فارسی، تاریخ عباسیہ، تاریخ بغداد (آٹھ جلدوں میں) جزائر افریقہ (چار جلدوں میں) کتاب ہیئت، تصوف میں چند رسائل، (شیخ سعدی نے ہزلیات بھی لکھیں، جس میں فحش و ہزل درجہ کمال پر ہے۔)

شیخ سعدی کی حیات اور ان کی تخلیقات پر جو اہم کتابیں لکھی گئیں اور میرے مطالعے سے گزری ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں مولانا حالیؔ، شبلی نعمانی، مرزا حیرت دہلوی، براؤن، لی جانسٹن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ سعدی کا نام شرف الدین تھا۔ بعض روایات میں مشرف الدین بتایا گیا ہے ان کا لقب مصلح الدین اور تخلص سعدی تھا۔

شیخ سعدی کی جائے ولادت اور سن پیدائش کے بارے میں بھی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ مورخین اور محققین نے اپنے اپنے انداز میں خاصی تحقیق کی ہے۔ تاہم ان کا سن پیدائش ۵۷۰ھ اور ۶۰۶ھ کے درمیان ہے۔ جائے پیدائش میں بھی اختلاف ہے بعض شیراز بتاتے ہیں اور بعض طوس بتاتے ہیں جو شیراز کے قریب ہی ایک مشہور قصبہ تھا۔ شیخ سعدی کے والد بزرگوار شیخ عبداللہؒ تھے۔ آباؤ اجداد مدتوں پہلے عرب سے ہجرت کر کے ایران میں آن بسے تھے۔ شیخ عبداللہ ایک عالم اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے ابتدائی عمر میں ہی سعدی نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ گھر کا ماحول دینی اور مذہبی تھا وہ بھی اس رنگ میں رچ بس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی کم عمر ہی تھے (گیارہ برس عمر بھی بتائی جاتی ہے) کہ ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمے داری

ان کی والدہ محترمہ کے کندھوں پر آن پڑی۔ جو خود بڑی زاہدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔ ان کا نام فاطمہ بیان کیا جاتا ہے۔ "بوستان" میں شیخ سعدی نے اپنی یتیمی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

مرا باشد از درد طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر گزشتم پدر
من آنگہ سر تاجور داشتم
کہ سر در کنار پدر داشتم

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ سعدی نے اپنا پہلا حج اپنے والدین کی معیت میں کیا تھا۔ ان کے والد محترم حج سے واپس آنے کے بعد فوت ہوئے۔

شیخ سعدی نے جس دور میں ہوش سنبھالا۔ یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ تاج و تخت کے دعوے داروں میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شیراز علماء اور فضلاء کا مرکز تھا لیکن اس بدامنی نے شیخ سعدی کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ شیراز سے بغداد روانہ ہوئے۔ وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد بغداد پہنچے۔ اس زمانے میں عالم اسلام کی سب سے بڑی درسگاہ "مدرسہ نظامیہ" بغداد میں تھی۔ شیخ سعدی مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور کئی برس تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ قیام بغداد کے زمانے میں ہی انھوں نے امام ابن جوزی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض اٹھایا۔

شیخ سعدی بغداد سے سیر جہاں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ بغداد میں کتنے برس رہے۔ کس برس بغداد سے روانہ ہوئے اور کتنا عرصہ سیر و سیاحت میں صرف کیا۔ اس کے بارے میں مستند معلومات حاصل نہیں ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ سعدی جہاں گشت تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت میں صرف کیا۔ وہ درویش تھے، صوفی تھے۔ کسی سے نفرت نہ کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے اس طویل زمانے میں وہ ہر طرح کے لوگوں سے ملے اور ہر طرح کے مقامات پر ٹھہرے۔ اپنی طویل سیر و سیاحت کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں ؎

در اقصائے عالم بگشتم بسے

بسر بردم ایام باہر کسے
تمتع زہر گوشہ یافتم
زہر خرمنے خوشہ یافتم

شیخ سعدی نے اپنے زمانۂ سیاحت میں عراق، یمن، عمان، عرب، مصر، شام، فلسطین، برکوچک ہند، آرمینیا، حبش، طرابلس، چین، کاشغر، جملہ ایران، خراسان وغیرہ کی سیر کی۔ کئی بار بحری سفر بھی کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں چودہ بار پاپیادہ حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر عام حلقوں (اور لکھے پڑھے لوگوں) میں بھی یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ شیخ سعدی نے علم چالیس برس کی عمر گزرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ یہ بات سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی اور حضرت امیر خسروؒ کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ شیخ سعدی ہندوستان ضرور آئے اور سومنات کے مندر میں جانے کا واقعہ بھی وہ بیان کرتے ہیں لیکن امیر خسرو کے ساتھ ان کی ملاقات کا واقعہ بالکل غلط ہے۔

شیخ سعدی جب طویل سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن پہنچے تو ملک میں امن و امان قائم ہو چکا تھا۔ طوائف الملوکی کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اپنی بقایا عمر انہوں نے شیراز میں بسر کی۔ وہ عوام و خواص کی محبت اور عقیدت کا مرکز بن گئے۔ وہ صوفی تھے اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ "گلستاں" اور "بوستاں" سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں ایک حلب میں، دوسری صنعا (یمن) میں۔ ان کی متاہلانہ زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں۔ ایک بیگم سے ان کی اولاد ہوئی جو بچپن میں ہی انتقال کر گئی۔

آخری عمر میں شیخ سعدی نے شیراز سے باہر ایک زاویہ تعمیر کروالیا تھا۔ رات دن وہیں عبادت میں مصروف رہتے۔ بادشاہ اور امراء وہیں سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ شیخ سعدی کی عمر کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ ایک سو دو اور بعض کے نزدیک ایک سو بیس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کا سن وفات ۶۹۱ھ ہے۔

گلستانِ سعدی سے چند حکایات

ایک مصری امیر کے دو بیٹے تھے۔ ایک نے طلب علم کی راہ انتخاب کیا اور دوسرے نے جاہ و مرتبے کی۔ نتیجہ یہ نکلا طلب علم کی راہ میں نکلنے والا علامہ اور استاد بن گیا اور دوسرا بھائی ترقی کرتے کرتے مصر کا وزیر۔ دولت مند وزیر نے ایک دن اپنے غریب عالم بھائی سے کہا "ذرا دیکھو تو تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میں صاحب منصب اور مالدار ہوں۔ تم قلاش بنے رہے۔ عالم نے جواب دیا۔" میں بھی اپنی اور آپ کی حالت پر غور کرتا ہوں اور جو نتیجہ نکلا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ میں نے پیغمبروں کی میراث حاصل کی اور آپ نے فرعون ہامان کی۔"

سکندر سے لوگوں نے پوچھا کہ مشرق و مغرب کے ممالک تونے کیسے فتح کر لیے حالانکہ پہلے بادشاہ خزانوں اور عمر، ملک اور لشکر میں تجھ سے کہیں بڑھ کر تھے۔ لیکن اتنی عظیم فتوحات ان کو بھی حاصل نہ ہوئیں۔ سکندر نے جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ملک میں نے فتح کیا اس کی رعایا کو میں نے کبھی نہ ستایا۔ پرانے زمانے کی عمدہ اور اچھی رسموں کو بھی منسوخ نہ کیا اور گذشتہ بادشاہوں کو ہمیشہ اچھے انداز میں یاد کیا ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نام نیکت برقرار

حجاج بن یوسف کے زمانے میں ایک مقبول حق بزرگ بغداد میں تشریف لائے۔ یوسف بن حجاج نے بھی ان سے استدعا کی کہ وہ اس کے لیے دعا فرمائیں۔ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، یا خدا، اس کی جان لے لے۔ حجاج نے کہا۔" حضرت یہ آپ کیا دعا فرما رہے ہیں۔" بزرگ نے فرمایا۔" اصل میں تمہارے اور تمہاری رعایا کے لیے یہی بہترین دعا ہے تاکہ رعایا تمہارے ظلم سے اور تم اپنے ظلم کی سزا سے بچ سکو۔"

ایک بے انصاف اور ظالم بادشاہ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ میرے لیے کوئی افضل عبادت تجویز فرمائیں۔ بزرگ نے جواب دیا۔" تمہارے لیے دوپہر تک سونا سب عبادتوں

سے اچھا ہے۔ تاکہ تم اس وقت تک کسی پر ظلم نہ کر سکو۔"

لوگوں نے دیکھا کہ ایک لومڑی بڑی گھبرائی ہوئی بھاگتی جارہی ہے۔ اسے روک اس کے اضطراب اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو بولی "بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ تمام اونٹوں کو بیگار کے لیے پکڑ لیا جائے۔ اس لیے جان بچانے کے لیے بھاگ رہی ہوں۔" لوگوں نے کہا۔ "لومڑی تو بھی عجیب ہے۔ بھلا تجھے اونٹ سے کیا نسبت اور اونٹ کی تجھ سے کیا مشابہت لومڑی نے جواب دیا۔" لوگو! حاسدوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اگر کسی حاسد نے بادشاہ سے یہ جا لگائی کہ میں اونٹ کا بچہ ہوں تو مجھے بے گار میں پکڑا جائے گا۔ بھلا بادشاہ سے کون کہے گا کہ تحقیق کریں۔ اور اگر تحقیق کا ڈول ڈالا بھی گیا تو جب تک فیصلہ ہوگا میں تو ختم ہو چکی ہوں گی۔"

نوشیرواں عادل کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ وہ شکار گاہ میں تھا کہ کباب بنانے کے لیے نمک کی ضرورت پڑ گئی۔ نوشیرواں نے غلام سے کہا کہ گاؤں جا کر نمک لے آئے۔ لیکن نمک کی قیمت ادا کر کے نمک لینا۔ ورنہ گاؤں اجڑ جائے گا۔ غلام نے حیرت سے پوچھا۔ "حضور تھوڑا سا نمک مفت لینے پر بھلا گاؤں کیسے اجڑ جائے گا۔" نوشیرواں نے جواب دیا "تھوڑا سا نمک مفت لینے پر بھی بڑا اثر گاؤں پر پڑے گا۔ خوب یاد رکھو کہ دنیا پر پہلے ظلم بہت کم کیا جاتا تھا۔ جو کوئی آیا اس نے ظلم میں زیادتی کی اور اب تم دیکھ رہے ہو کہ نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اگر رعیت کے باغ سے بادشاہ ایک سیب توڑ کر کھائے تو اس کا لشکر اور اس کے غلام درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اگر سلطان ایک انڈہ مفت میں کھائے تو اس کا لشکر ہزاروں مرغوں کو چٹ کر جائے گا۔

ایک پہلوان فنِ کشتی میں بڑا ماہر اور مشہور تھا وہ اپنے ایک شاگرد پر خاص توجہ دیتا تھا۔ اور دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں اسے زیادہ داؤ پیچ سکھاتا تھا۔ جب وہ جوان شاگرد سب داؤ پیچ سیکھ گیا تو وہ بادشاہ وقت کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ حضور۔ استاد اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں سب داؤ پیچ جان گیا ہوں اور استاد کے مقابلے میں شہ زور اور قوی بھی ہوں۔ بادشاہ نے ثبوت کے لیے استاد اور شاگرد کی کشتی کرانے کا فیصلہ کیا۔ کشتی کا دن

معزز ہوا۔ بادشاہ، امراء اور وزراء کشتی دیکھنے تشریف لائے۔ استاد شاگرد کے مقابلے میں واقعی کمزور ہو چکا تھا مگر وہ پھر بھی استاد تھا۔ اس نے ایک ایسا داؤ استعمال کیا جو اس نے شاگرد کو کبھی نہ سکھایا تھا اور شاگرد کو چت کر دیا۔ بادشاہ نے استاد کو انعام واکرام سے نوازا۔ شاگرد کو لعنت ملامت کی کہ اس نے اپنے محسن اور استاد کا مقام لینے کی کوشش کی تھی۔ شاگرد نے عرض کیا حضور! استاد پہلوان زور اور طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر غالب نہیں آیا بلکہ وہ ایک داؤ استعمال کرنے کی وجہ سے جیت گیا ہے۔ جو اس نے مجھے نہ بتایا تھا۔ استاد پہلوان نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے وہ داؤ اسی دن کے لیے بچا کر رکھا تھا کیونکہ داناؤں کا قول ہے کہ دوست کو اس قدر طاقت نہ دینی چاہیے کہ دشمن ہو کر تمہیں نقصان پہنچا سکے۔

ایک مرید نے مرشد سے تصوف کی حقیقت پوچھی۔ مرشد نے جواب دیا۔ اب سے پہلے جو لوگ بظاہر پراگندہ اور بباطن جمع تھے انہیں صوفی کہا جاتا تھا۔ لیکن آج جو لوگ ظاہری طور پر جمع اور باطنی طور پر پراگندہ ہیں۔ وہ صوفی کہلاتے ہیں

ایک زاہد کسی بادشاہ کا مہمان ہوا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو زاہد نے چند لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ جب نماز کا وقت آیا تو بڑے ظاہری خضوع و خشوع کے ساتھ بڑی لمبی نماز پڑھی۔ تاکہ بادشاہ کے دل پر اس کے زہد کا خاص اثر ہو۔ دعوت سے فارغ ہو کر وہ گھر آئے۔ اور آتے ہی کھانے کا تقاضا کیا۔ کیونکہ بادشاہ کو دکھانے کے لیے جان بوجھ کر بھوکا رہے تھے۔ اس زاہد کے بیٹے نے پوچھا۔ "کیا بادشاہ کی دعوت میں کھانا نہ تھا۔ زاہد نے فرمایا۔ تھا تو بہت کچھ لیکن میں نے خود ہی نہ کھایا کہ بادشاہ پر میری نفس کشی کا سکہ جم جائے۔ اسی لیے میں نے نماز لمبی پڑھی تاکہ بادشاہ کے دل پر زہد کا اثر ہو جائے۔ بیٹے نے کہا، آپ اب کھانا کھا کے نماز کی قضا بھی پڑھیے۔ جس طرح وہاں کا کھانا آپ کا پیٹ نہیں بھر سکا۔ ویسے ہی آپ کی نماز بھی اپنا حقیقی فرض ادا نہیں کر سکی۔

حلب کے بازار میں ایک گداگر صدا دے رہا تھا۔

۔۔۔ے دولت مندو اگر تمہیں انصاف اور ہمیں قناعت کی عادت ہوتی تو دنیا سے

رسم سوال ہی اُٹھ چکی ہوتی ۔"

ایک دفعہ میں ایک مکان خریدنے کے لیے دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک سود خور بھی آنکلا بولا۔" حضرت یہ مکان بڑا مبارک، بہت عمدہ اور نفیس ہے۔ آپ اسے ضرور خرید لیجیے۔ میں اس مکان کے پاس رہتا ہوں۔ آپ کا پڑوسی ہوں۔ آپ کو ہر طرح کا آرام رہے گا۔ میں نے کہا، معاف کیجیے۔ اس مکان کی بُرائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم اس کے پاس رہتے ہو۔"

میں دیار بکر میں ایک بڈھے رئیس کا مہمان ہوا۔ اس کی بہت سی دولت اور جائداد کا وارث اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس بوڑھے رئیس نے مجھے بتایا کہ ہمارے علاقے میں ایک بہت قدیم درخت تھا۔ جہاں لوگ منتیں ماننے اور دعائیں مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ میں نے کئی راتیں اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر دعائیں مانگی تھیں تب جا کر میری مراد پوری ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا۔ مگر اب سنا ہے کہ صاحبزادہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ مجھے بھی وہ درخت دکھاؤ۔ اس کا پتہ بتاؤ تاکہ میں دعا کروں کہ میرا بوڑھا باپ جلدی ٹھکانے لگ جائے۔"

ایک امیرزادہ اپنے باپ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا ایک درویش زادے سے بڑے فخر سے کہہ رہا تھا۔" ذرا دیکھو تو میرے والد کی قبر کتنی شاندار ہے، کتنی مضبوط ہے، کتبہ کتنا عالی شان اور مضبوط ہے کیسا پختہ فرش بنا ہے۔ ایک تمہارے باپ کی قبر ہے کہ بس دو اینٹیں رکھ دیں اور مٹی ڈال دی گئی۔ درویش زادے نے کہا" بات تو ٹھیک ہے۔ مگر قیامت کے دن جب سب امیر وغریب کا بلاوا آئے گا تو جب تک آپ کے والد محترم اس پختہ قبر کو کھرچتے اور اینٹیں اکھیڑتے رہیں گے۔ میرے والد محترم آرام سے مٹی ہٹا کر حساب کتاب سے فارغ ہو کر بہشت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔"

ایک بادشاہ کسی شدید اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے دعا کی اللہ تعالے مجھے اس اُلجھن سے نجات دے۔ میں تیری راہ میں ایک خطیر رقم زاہدوں میں تقسیم کروں گا۔ جب بادشاہ کی وہ اُلجھن رفع ہو گئی تو اس نے رقم اپنے غلام دے کر کہا جاؤ اور جا کر زاہدوں

میں تقسیم کر دو۔ غلام واپس آیا تو رقم اس کے پاس جوں کی توں موجود تھی۔ بولا۔ جہاں پناہ میں نے بہت تلاش کیا۔ مگر اس رقم کو لینے والا مجھے کوئی نہیں ملا۔ بادشاہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو اس شہر میں چار سو زاہد رہتے ہیں۔ غلام نے دست بدستہ عرض کی۔" حضور جو زاہد ہیں وہ تو روپیہ چھوتے نہیں اور جو زاہد نہیں ہیں ان کو میں نے روپیہ دیا نہیں۔"

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کو دیکھا گیا کہ آپ کعبۃ اللہ کے سنگ ریزوں پہ سر رکھے ہوئے کہہ رہے تھے، الٰہی، مجھے اپنی رحمت سے بخش دیجئے۔ اگر بخشش کے قابل نہ سمجھیں تو قیامت کے دن نابینا اٹھائیں تاکہ نیکوں کے سامنے شرمساری نہ ہو۔

ایک درویش نے جنگل میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ ایک دن وہاں بادشاہ کی سواری آ نکلی۔ درویش نے بادشاہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ کے پندار کو بڑی تکلیف ہوئی کہ ایک معمولی انسان نے اسے سلام تک نہیں کیا۔ اس نے وزیر کو اشارہ کیا۔ وزیر نے درویش سے کہا۔" اے درویش" کتنے افسوس کا مقام ہے کہ بادشاہ وقت تیرے سامنے ہو اور تو اسے سلام نہ کرے اس کی تعظیم کے لیے اٹھ کر کھڑا ایک نہ ہو۔

درویش نے جواب دیا۔" وزیر صاحب، بادشاہ سلامت کو بتائیے کہ وہ سلام و تعظیم کی اُمید اس سے رکھیں، جسے ان سے مال و دولت کی توقع ہو۔ پھر انہیں سمجھائیے کہ بادشاہ رعایا کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس لیے کہ اس کی بندگی کی جائے۔

بادشاہ درویش کا کلام سن کر خوش ہوا اور بولا" حضور کچھ طلب فرمائیے۔" درویش نے جواب دیا، بس اتنا کرم کیجیے کہ پھر دوبارہ آکر تکلیف نہ دیجیے گا۔ بادشاہ نے کہا" کوئی نصیحت فرمائیے۔"

درویش نے کہا" ہاتھ میں دولت ہو تو نیکی کماؤ۔ کیونکہ یہ دولت و حکمرانی ہاتھوں ہاتھ چلی جاتی ہے۔ یہ وفادار نہیں۔"

مثنوی

مثنوی مولانائے روم کے بارے میں عقیدے کی حد تک کہا جاتا اور تسلیم کیا جاتا ہے کہ

ہست قرآں درزبان پہلوی

یوں رومی نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں ان کا دیوان جو دیوان شمس تبریزؒ کے نام سے مشہور ہے لگ بھگ پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک تصنیف 'فیہ مافیہ' بھی ہے جس کا ترجمہ اُردو میں عبدالرشید تبسم نے کیا ہے۔ لیکن جو شہرت اور ابدیت رومی کی مثنوی کو حاصل ہوئی۔ وہ دنیا میں بہت کم کتابوں کا مقدر رہی ہے۔

"کشف الظنون" کی روایت کے مطابق مثنوی کے اشعار کی تعداد ۲۶۶۶ ہے۔ چھٹا دفتر نامکمل رکھا اور رومی نے لکھا ہے

باقی ایں گفتہ آید بے گماں
در دل ہر کس باشد نور جاں

بہت لوگوں نے کوشش کی کہ نامکمل کو مکمل کریں۔ مگر ناکام رہے۔ رومی بیماری سے صحت یاب ہوئے تو خود اس کو پورا کیا۔ مثنوی کا ایک ساتواں دفتر بھی ہے جس کا مطلع ہے ۔

اے ضیاء الحق حسام الدیں سعید
دولت پائندہ عمرت بر مزید

مولانا شبلی نے رومی کی سوانح میں لکھا ہے ۔

"شیخ اسماعیل قیصری جنہوں نے مثنوی کی بڑی ضخیم شرح لکھی ہے۔ ان کو اس دفتر کا ایک نسخہ ۸۱۴ھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ انہوں نے تحقیق اور تنقید کی تو ثابت ہوا کہ خود مولانا کی تصنیف ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اس کا اظہار کیا۔ اس پر تمام ارباب طریقت نے مخالفت کی اور اس کی صحت پر بہت سے شبہات وارد کیے۔ اسماعیل نے ان تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب لکھا۔ اب تمام شام و روم میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ دفتر بھی مولانائے روم ہی کے نتائج طبع سے ہے۔

(سوانح مولانا روم۔ شبلی نعمانی صـ ۶۰)

بہر حال اب بھی مثنوی کے ساتویں دفتر کو مشکوک و غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔

سلاطین میں آلِ سامان اور سلطان محمود کو یہ ذوق پیدا ہوا کہ اُن کے آبا و اجداد یعنی شاہانِ عجم کے کارنامے نظم کیے جائیں۔ تاکہ شعر کی صورت میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔ اس بنا پر مثنوی کی صنف وجود میں آئی۔ جو واقعاتِ تاریخی کے ادا کرنے کے لیے اصنافِ نظم میں سب سے بہتر صنف تھی۔ (شبلی نعمانی سوانح مولانا روم صـ ۹۴) اس کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلیاں ہوئیں۔ فرید الدین عطار کی مثنویاں تصوف سے لبریز ہیں حسام الدین چلپی نے مولانا رومی سے درخواست کی کہ وہ بھی فرید الدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" کی طرز پر مثنوی لکھیں۔ رومی نے کہا کہ انہیں خود یہ خیال آچکا ہے اور چند اشعار اسی وقت موزوں کر دیے۔ جن میں وہ مطلع بھی ہے جو مثنوی مولانائے روم کا سرِ آغاز ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

پہلا دفتر مکمل ہوا۔ ادھر حسام الدین چلپی کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہ سوگ میں ڈوب گئے اور مولانا رومی سے اصرار جاری نہ رکھ سکے۔ دو برس کے بعد وہ پھر مُصر ہوئے تو رومی نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ دوسرے دفتر کا آغاز ۶۶۲ھ میں ہوا۔ چھٹا دفتر زیرِ تصنیف تھا کہ رومی بیمار ہوئے۔ عام روایت یہی ہے کہ چھٹے دفتر کو پورا کرنے کی نوبت نہ آئی۔

رومی کا نام محمد اور لقب جلال الدین تھا۔ عرف مولانائے روم ۶۰۴ھ میں بلخ میں پیدا

ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد محترم سے حاصل کی۔ پھر سید برہان الدین سے جو ان کے والد کے شاگرد خاص تھے۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی کہ قونیہ منتقل ہوئے۔ سات برس دمشق میں بھی رہے۔ مولانائے روم کی زندگی کا پہلا دَور وہ ہے جب وہ فتوے دیتے۔ وعظ کرتے اور سماع سے پرہیز کرتے تھے۔

ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ شمس تبریز سے ان کی ملاقات ہے۔ حضرت شمس تبریز سے ان کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی۔ اس سلسلے میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے بہرحال کہا جاتا ہے کہ یہ ملاقات ۶۴۲ھ میں ہوئی۔ ایک روایت ہے کہ رومی ایک تالاب کے کنارے کتابیں لیے محو مطالعہ تھے کہ شمس تبریز اُدھر آنکلے۔ علم پر بات ہوئی تو شمس تبریز نے کتابیں پانی میں پھینک دیں۔ رومی اس نقصان پر تلملائے تو شمس تبریز نے تالاب سے کتابیں دوبارہ اس حالت میں نکال دیں کہ وہ خشک تھیں۔

مولانا روم کے ایک شاگرد سپہ سالار نامی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس ملاقات کے بعد چھ ماہ تک دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں چلّہ کشی کرتے رہے مناقب العارفین میں یہ مدت تین ماہ بتائی گئی ہے۔ اب مولانا روم میں ایک تغیر پیدا ہوا۔ ظاہرداری اُٹھ گئی۔ سماع سے لطف اندوز ہونے لگے۔ درس و تدریس، وعظ و کلام کا سلسلہ ترک کر دیا۔ شہر میں شورش بپا ہوئی کہ ایک درویش ان کو ورغلا کر راہ راست سے ہٹا رہا ہے۔ رومی کو لمحے بھر کے لیے بھی حضرت شمس تبریز کی جدائی گوارا نہ تھی۔ شہر میں شورش بڑھی۔ حضرت شمس تبریز کو یہ بدامنی گوارا نہ تھی وہ ایک دن چپکے سے کہیں چلے گئے۔

ان کے فراق کا صدمہ رومی کو اس حد تک ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سب سے قطع تعلق کر لیا۔ حتیٰ کہ مریدان خاص سے بھی کنارہ کر لیا۔ مدّت گزرنے کے بعد شمس تبریز نے دمشق سے ان کو خط لکھا۔ اب اہل شہر کا ایک وفد حضرت شمس تبریز کو منانے کے لیے دمشق روانہ ہوا۔ رومی نے منظوم خط ان کے ہاتھ روانہ کیا۔ حضرت شمس تبریز وفد کی گزارش اور رومی کی خواہش کے احترام میں قونیہ چلے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت شمس تبریز نے مولانا روم کی پروردہ ایک کنیز سے شادی کر لی۔ جس کا نام کیمیا بتایا جاتا ہے۔

حضرت شمس تبریز کے لیے رومی نے ایک خیمہ اپنے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ رومی کے ایک صاحبزادے علاؤالدین چلپی تھے۔ جو رومی سے ملنے آتے تو اس خیمے سے ہو کر گزرتے۔ حضرت شمس تبریز کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ علاؤالدین چلپی۔ رومی کے صاحبزادے نے ایک بار پھر حضرت شمس تبریز کے بارے میں افواہوں کا بازار گرم کر دیا۔ قونیہ کے لوگ پھر برافروختہ ہوئے۔ حضرت شمس تبریز اچانک غائب ہو گئے۔ رومی تلاش کروائی۔ خود تلاش میں نکلے لیکن حضرت شمس کا کچھ نشان نہ ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شمس تبریز رومی کے پاس قونیہ میں ہی تھے۔ مولانا روم کے مریدوں نے ان کو قتل کر دیا۔ "نفحات الانس" میں مرقوم ہے کہ حضرت شمس تبریز کو قتل کرنے میں خود مولانائے روم کے صاحبزادے کا ہاتھ تھا۔

مولانائے روم ہجر و فراق میں تڑپنے لگے۔ حضرت شمس تبریز کی جدائی میں گھر سے نکلے تو راہ میں صلاح الدین زرکوب کی دکان آ گئی۔ وہ چاندی کے ورق کوٹ رہا تھا۔ ورق کوٹنے والی ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر کیا۔ وہیں مولانائے روم پہ وجد طاری ہوا۔ زرکوب نے رومی کی یہ حالت دیکھی تو وہ ورق کوٹتے چلے گئے۔ بہت چاندی ضائع ہوئی۔ جب مولانائے روم ہوش میں آئے تو صلاح الدین زرکوب نے وہیں کھڑے کھڑے دکان لٹا دی اور مولانائے روم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ نو برس تک صلاح الدین زرکوب سے صحبت رہی۔ مولانائے روم نے صلاح الدین زرکوب کی مدح اور شان میں غزلیں بھی لکھی ہیں ؎

مطربا اسرار ما را باز گو
قصہ ہائے جاں فزا را باز گو
چوں صلاح الدین صلاح جان ماست
آں صلاح جاں ما را باز گو

اب مولانائے روم کے مریدان و شاگرد صلاح الدین زرکوب سے حسد کرنے لگے کہ وہ ان پڑھ اور جاہل ہے مگر مولانائے روم نے اسے اپنا رکھا ہے۔ مولانائے روم نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی اور اس تعلق کو قائم رکھا۔ ۶۶۲ھ میں صلاح الدین زرکوب

کا انتقال ہو گیا تو حسام الدین چلپی جو مولانائے روم کے معتمد خاص تھے۔ انہیں اپنا ہمدم و ہمراز بنا لیا۔ یہی حسام الدین چلپی ہیں جن کی درخواست پر مولانائے روم نے مثنوی لکھنی شروع کی

مولانا روم کا انتقال ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ کی شام کو ہوا۔ صبح جنازہ اٹھا۔ ایک دنیا تھی جو جنازے کے ساتھ اشکبار جا رہی تھی۔ یہودی اور عیسائی بھی رو رہے تھے۔ ہزاروں لوگوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ قونیہ میں ان کا مزار ہے۔

آج تک فارسی کی کسی کتاب کو وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جو مثنوی مولانائے روم کو حاصل ہے۔ ہر دور میں اس کی ضخیم شرحیں لکھی گئیں۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے خالق اور مثنوی پر ان گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان گنت عظیم شعرا نے اس سے فیض اٹھایا ہے۔ جن میں علامہ اقبال بھی ہیں۔

مثنوی کے بارے میں یہ دعوےٰ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ قرآنی تعلیمات کی تفسیر ہے اور اسی لیے اس کی ایک مذہبی اور دینی حیثیت ہے۔ انتہائی دقیق اور نازک موضوعات کے باوجود اس کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ مثنوی میں روایات اور حکایات بھی ہیں درا صل ان کے پردے میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ مثنوی ہی میں مولانائے روم کا یہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرنے والا یہ شعر ہے۔ جو مثنوی پر پورا اترتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مثنوی میں جو روایات و حکایات ملتی ہیں۔ ان کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"جو اگرچہ فی الواقع غلط ہیں۔ لیکن اُس زمانے سے آج تک مسلمانوں میں بڑا حصہ ان کو مانتا آتا ہے۔ مولانا ان روایتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو نکال دیا جائے تو مثنوی کی عمارت بے ستون رہ جاتی ہے۔" (سوانح مولانائے روم صہ ۹۵)

مثنوی معنوی کا ایک انتخاب اور تلخیص

صحرائی جانوروں اور شیر میں معاہدہ ہوا کہ شیر جانوروں کا شکار نہ کرے گا اور اس کی روزانہ

کی خوراک اسے پہنچا دی جائے گی۔ معاہدہ پر عمل درآمد کا پہلا دن ہی آیا تو جو خرگوش شیر کی خوراک بننے کے لیے آنے والا تھا۔ دو گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا۔ شیر نے خفگی کا اظہار کیا تو خرگوش نے عرض کیا کہ وہ تو وقت پر ہی روانہ ہوا تھا۔ لیکن راستے میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہے۔ شیر نے دوسرے شیر کی موجودگی اور اس حرکت کو اپنی توہین سمجھا اور خرگوش سے کہا کہ چل اور مجھے اس شیر کے پاس لے چل۔ خرگوش شیر کو کنویں کے پاس لے گیا۔ شیر نے کنوئیں میں جھانکا تو پانی میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ وہ اسے اپنا حریف اور دشمن شیر سمجھا۔ پھر کر حملہ آور ہوا اور کنوئیں میں کود کر مر گیا ؎

عکس خود را او عدوئے خویش دید
لاجرم بر خویش شمشیرے کشید
اے بسا عیبے کہ بینی در کساں
خوئے تو باشد در ایشاں اے فلاں
اندر ایشاں تافتہ ہستی تو
از نفاق و ظلم و بد مستی تو
آں توئی واں زخم بر خود می زنی
بر خود آں دم تار لعنت می تنی
در خود ایں بد را نمی بینی عیاں
ورنہ دشمن بودہ خود را جہاں
حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

گاؤں کے ایک بدآواز موذن سے اہلِ گاؤں بہت تنگ تھے۔ لوگوں نے ان سے چھٹکارا پانے کے لیے روپے جمع کر کے ان کے سپرد کیے کہ وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے چلے جائیں۔ موذن سفر پر روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک گاؤں آیا۔ جہاں مسجد تھی۔ موذن نے اذان دی۔ اذان کے تھوڑی دیر بعد ایک مجوسی شیرینی اور کپڑے لے کر آیا اور موذن کے

نذر کیے ۔ وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ اس کی ایک بیٹی ہے۔ عاقل و بالغ ، نیک طبع وہ مذہب اسلام کی طرف راغب تھی ۔ بہت قائل کرنے کی کوشش کی پر نہ مانی ۔ بہت سمجھایا گیا مگر ایک نہ سنی ۔ آج مؤذن کی یہ اذان سنی تو پوچھنے لگی ، یہ کیسی مکروہ آواز ہے ۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمانوں کا شعار ہے کہ عبادت سے پہلے اذان دیتے ہیں ۔ اس نے یقین نہ کیا ۔ جب اسے یقین دلایا تو وہ اسلام سے متنفر ہو گئی ہے ۔ اس لیے میں مؤذن کے لیے شیرینی اور کپڑے لے کر آیا ہوں کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا ۔ ان کی بدولت ہو گیا ۔

مثنوی مولانائے روم کے اشعار کا ترجمہ :

عشق جو رنگ و آب سے مانوس ہے
وہ عشق ہرگز نہیں اک ننگ ہے
عشق اس سے کر جس سے بقا طلے
اس سے کر جو شرابِ جانفزا پلاتا ہے

ذات باری تعالےٰ کے ثبوت میں مثنوی کے چند اشعار کا ترجمہ :

قلم لکھ رہا ہے لیکن ہاتھ دکھائی نہیں دیتا
سوار کا پتہ نہیں لیکن گھوڑا دوڑ رہا ہے

ہر سمجھ دار یہ یقین رکھتا ہے کہ
جو چیز حرکت کرتی ہے اس کا کوئی حرکت دینے والا ضرور ہے
تم اس کے اثر کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے
تو اس کے اثر کو محسوس کر کے سمجھ جاؤ ۔
بدن جو حرکت کرتا ہے جان کی وجہ سے کرتا ہے ۔
تم جان کو نہیں جان سکتے
تو بدن کی حرکت سے جان کر جانو سچ

لیک از جنبیدنِ تن جاں بداں
گر چکہ نیست ایں ترتیب چیست

اول فکر ہے پھر عمل ہے۔ عالم کی افتاد اسی طرح کی ہے۔ دیوار اور چھت کی صورت جو معمار کے خیال کا سایہ ہے۔ صورت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے اس کی خاص صورت نہیں ہوتی۔ جس طرح آگ سے دھواں۔ بے صورتی سے تم کو حیرت پیدا ہوگی کر سینکڑوں قسم کے آلات بغیر آلہ کیونکہ پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس علت سے معلول کو کچھ مشابہت ہے۔ کوٹھے پر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ ان کا سایہ زمین پر پڑ رہا ہے۔ وہ لوگ جو چھت پر ہیں گویا افکار و فکر ہیں اور عمل گویا ان کا سایہ ہے۔

جسم ظاہر اور رُوح پوشیدہ ہے۔
جسم گویا آستین ہے اور جان گویا ہاتھ۔
پھر عقل رُوح سے بھی زیادہ مخفی ہے۔
کیونکہ حس رُوح کو جلد دریافت کر لیتی ہے۔
تم کسی چیز میں حرکت دیکھ کر یقین کر لیتے ہو۔
کہ وہ زندہ ہے۔
لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ اس میں عقل بھی ہے۔
عقل کا یقین اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے جسم سے موزوں حرکتیں سرزد نہ ہوں۔ اور یہ حرکت جو مَس ہے۔ عقل کی وجہ سے سونا نہ بن جائے۔
جب مناسب اعمال سرزد ہوتے ہیں تو
تمہیں یقین ہوتا ہے کہ اس میں عقل بھی ہے۔
اے دوست، عالم روح جہت سے منزّہ ہے۔
تو عالم روح کا خالق اور بھی منزّہ ہوگا۔
آفتاب کی روشنی کے علاوہ آفتاب کے وجود کی۔
اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔
سائے کی کیا ہستی ہے کہ دلیل آفتاب بن جائے
اس کے لیے یہی بہت ہے کہ وہ آفتاب کا غلام ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا ایک جگہ سے گزر ہوا تو ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے "اے خدا تو کہاں ہے۔ تو مجھے ملتا تو میں تیرے بالوں میں کنگھی کرتا۔ تیرے کپڑوں سے جوئیں نکالتا۔ تجھ کو مزے مزے کے کھانے کھلاتا۔" حضرت موسیٰؑ طیش میں آکر اُسے سزا دینے کے لیے بڑھے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت موسیٰؑ پر وحی آئی۔ مولانائے روم کے الفاظ میں ؎

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندۂ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی
یا برائے فصل کردن آمدی؟
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حق او مدح و در حق تو ذم
در حق او شہد و در حق تو سم
موسیا! آداب داناں دیگر اند
سوختہ جاں درد داناں دیگر اند
در درون کعبہ رسم قبلہ نیست
چہ غم از غواص پاچیلہ نیست
عاشقاں را ہر زمانہ عشر نیست
بردہ ویراں خراج و عشر نیست
خون شہیداں از آب روی تر است
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تر است
ملت عشق از ہمہ ملت جدا است
عاشقاں را ملت و مذہب خدا است

چار افراد سفر میں یکجا ہوئے۔ ایک رومی، ایک عرب، ایک ترک، ایک ایرانی۔ کسی نے ان چاروں کو ایک سکّہ دیا۔ ایرانی بولا۔ "اس کے انگور منگواؤ۔" عرب نے کہا "اس سے عنب خریدو" ترک بولا "اس کا ازم لو" رومی نے کہا۔ "سکے کے عوض استافیل لو۔" چاروں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے۔ اس لیے جھگڑنے لگے۔ مولانائے روم اس حکایت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی ایسا شخص ہوتا جو زبان دان ہوتا تو وہ ان کے سامنے انگور لاکر رکھ دیتا۔ کیونکہ وہ اپنی اپنی زبان میں سب انگور ہی کہہ رہے تھے اور ان میں جھگڑا کبھی نہ ہوتا۔

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک
نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

پانی میٹھا ہو یا کڑوا۔ دونوں کا رنگ صاف ہوتا ہے۔
بھڑ اور شہد کی مکھی دونوں ایک پھول کو چوستی ہیں۔
لیکن اس سے غیبتی اور اس سے شہد پیدا ہوتا ہے۔
دونوں قسم کے ہرن گھاس کھاتے اور پانی پیتے ہیں۔
لیکن اس سے مینگنی اور اس سے مُشک پیدا ہوتا ہے۔
ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے بُخل اور حسد پیدا ہوتا ہے۔
دوسرا آدمی جو کھاتا ہے اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے۔
یہ پاک زمین ہے اور وہ شور۔
یہ فرشتہ ہے اور وہ شیطان
شیریں اور تلخ سمندر ملے ہوئے ہیں۔
لیکن دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔
جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔
کھرے اور کھوٹے روپے کی تمیز کسوٹی کے بغیر ممکن نہیں۔
نیک اور بدکار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں۔

آنکھیں کھولو تو تمیز ہوگی۔
جس شخص کے دل میں لطف حق ہے۔
اسی کے لیے پیغمبر کا چہرہ اور اس کی آواز معجزہ ہے۔
جب پیغمبر باہر سے آواز دیتا ہے۔
تو اس شخص کا دل اندر سے سجدہ کرتا ہے۔
لکھنے کے لیے سادہ کاغذ تلاش کیا جاتا ہے۔
بیج اس زمین میں ڈالا جاتا ہے جو بنجر ہوتی ہے۔
ہستی نیستی میں دکھائی جاتی ہے۔
دولت مند فقیروں پر سخاوت کا استعمال کرتے ہیں۔
تم جس دن سے کہ وجود میں آئے۔
پہلے آگ یا خاک یا ہوا تھے۔
اور تمہاری وہی حالت قائم رہتی۔
تو یہ ترقی کیونکر نصیب ہوتی۔
بدلنے والے نے پہلے ہستی بدل دی۔
پھر اس کی جگہ دوسری ہستی قائم کر دی۔ اسی طرح
ہزاروں ہستیاں بدلتی چلی جائیں گی یکے بعد دیگرے۔
یہ بقا تم نے فنا کے بعد حاصل کی ہے۔ پھر فنا سے کیوں جی چراتے ہو۔
ان فناؤں سے تمہیں کیا نقصان جواب بقا سے چپٹے جاتے ہو۔
جب دوسری ہستی پہلے سے بہتر ہے تو فنا کو ڈھونڈو اور انقلاب کنندہ کی پرستش کرو۔
تم سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے۔ ابتدائے وجود سے اب تک۔
تم پہلے جمادات تھے پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی۔ پھر تم میں جان آئی۔
پھر عقل و تمیز۔ پھر حواس خمسہ کے علاوہ بھی کچھ حواس ملے۔

جب فنا میں تم نے یہ بقا دیکھی تو پھر جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو۔
نیا لو اور پرانا چھوڑ دو۔ (تازہ می گیرد کہن را می سپار)
کیا کوئی لکھنے والا کوئی تحریر محض تحریر کی غرض سے لکھے گا۔؟
نہیں بلکہ پڑھنے کے لیے لکھے گا۔
دنیا میں کوئی معاملہ اپنے لیے آپ نہیں کیا جاتا۔
بلکہ اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ ہو۔

دیوان

فارسی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود میں نے حافظ کے دیوان کو کئی بار پڑھا ہے اور اس کی شرحوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ حافظ کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت حد تک نظر سے گزرا ہے اس کے باوجود میرے لئے یہ ایک دلچسپ مطالعہ رہا ہے کہ وہ حافظ جس کی شاعری ہستی، دنیا کی ناپائیداری اور زندگی کی عظیم ترین نمائندہ شاعری ہے۔ اس کا دیوان کن وجوہات کی بنا پر ایک طویل عرصے سے فال نکالنے کے کام آرہا ہے۔

حافظ ایک سرمست اور رند شاعر تھے۔ علامہ اقبال نے ان کی شاعری کے تباہ کن اثرات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ذہن میں رکھئے اور پھر میری طرح سوچنے کی کوشش کریں کہ وہ کون سے اسباب، عناصر اور عوامل ہیں۔ جنہوں نے حافظ شیراز کو "لسان الغیب" کا رتبہ بھی دے رکھا ہے۔ یہ دلچسپ عقدہ حل ہو یا نہ ہو۔ لیکن حافظ کی شاعری کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جو اس کی عالمگیر شہرت اور شعری اہمیت کی غمازی کرتا ہے۔

فارسی زبان کے بڑے شاعروں میں حافظ، فردوسی، شیخ سعدی اور عمر خیام ایسے شاعر ہیں جن کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے، جن کے تراجم دنیا کی بڑی زبانوں میں ملتے ہیں جن کا کام دنیا کے عظیم تخلیقی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے، جن کی شہرت ابدیت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ذہنوں اور بڑے لکھنے والوں کے علاوہ کئی نسلوں کو ان فارسی شعراء نے متاثر کیا ہے اور رہتی دنیا تک ان کا کام آنے والی نسلوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ ان کی حیثیت محض تاریخی یا دستاویزی ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ہاں زندگی کے وہ عناصر وہ پہلو انسانی نفسیات کا مشاہدہ اور شعر کا وہ لازوال متاثر کرنے والا حسن پایا جاتا ہے جو زندگی کی طرح ہے۔ جاری و ساری رہنے والا، دلوں کو ہمیشہ چھونے والا......

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں؛

"تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہو سکتا کہ خواجہ حافظ کے حالاتِ زندگی اس قدر معلوم ہیں کہ تشنگانِ ذوق کے لب بھی تر نہیں ہو سکتے۔ اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانح عمریاں لکھی جاتیں کہ اس کی تصویر کا ایک ایک خدوخال آنکھوں کے سامنے آجاتا لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا۔ ان سب کو جمع کر دیا جائے تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نظر نہیں آتا۔ جس قدر تذکرے ہیں سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور وہی چند واقعات ہیں۔ جن کو بہ اختلاف الفاظ یہ نقل کرتے آئے ہیں۔"

(شعر العجم (حصہ دوم) صفحہ ۲۱۲)

خواجہ حافظ شیرازی کے جو حالات میسر ہیں۔ وہ مختصراً درج ہیں۔ حافظ کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ شیراز منتقل ہوئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ حافظ کے والد کا نام بہاالدین تھا اور وہ تاجر پیشہ دولت مند انسان تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو تین بیٹے اور بڑا ترکہ چھوڑا۔ لیکن بیٹوں میں سے کوئی بھی کاروبار تجارت کو نہ چلا سکا اور حالات بگڑ گئے خواجہ حافظ نے بچپن میں ایسی غربت دیکھی کہ ان کی والدہ نے انہیں فاقوں سے بچانے کے لئے محلے کے ایک آدمی کو سونپ دیا کہ وہ خواجہ حافظ سے خدمت لے اور اس کو معاوضے میں روٹی دے کہتے ہیں کہ وہ شخص بدچلن اور بداطوار تھا۔ خواجہ حافظ نے ہوش سنبھالتے ہی اس سے تعلق توڑا۔ اور خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔ پاس ہی مکتب تھا۔ دل میں پڑھنے کا شوق اٹھا۔ خمیر سازی سے جو حاصل ہوتا۔ اس کا ایک حصہ اپنی والدہ اور اپنے خرچ کے لئے رکھتے، دوسرا حصہ مکتب میں دے دیتے اور تیسرا خیرات کر دیتے۔ یوں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ مکتب میں ہی انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا اور کچھ معمولی پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا۔

شیراز اس وقت شعر و سخن کا گہوارا تھا۔ محلے میں ایک شاعر تھا جس کے ہاں شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ حافظ بھی اس سے متاثر ہوئے اور یوں شاعری کا آغاز ہوا۔ وہ شخص جس کا شمار آنے والے زمانوں میں دنیا کے بڑے شاعروں میں ہونا تھا۔ اس کی شاعری کا آغاز یوں ہوا کہ وہ طبع موزوں نہ رکھتا تھا اور جو انٹ شنٹ اور لغو کہتا۔ اس پر لوگ اس کا مذاق اڑاتے خواجہ حافظ

اہلِ شیراز کے لئے ایک مذاق بن گئے۔

تذکروں میں رقم ہے کہ دو برس یونہی گزر گئے۔ جب لوگوں کے استہزا ئیہ اور اہانت آمیز رویئے کی انتہا ہوگئی تو خواجہ حافظ کو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے مذاق تضحیک اور اہانت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہاں بابا کوہی کا ایک مزار تھا حافظ وہاں گئے اور بہت روئے۔ اسی رات انہیں خواب میں ایک بزرگ دکھائی دیئے جو انہیں ایک لقمہ کھلاتے اور کہتے ہیں اب تم پر سارے علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناب علیؓ ہیں۔

حافظ صبح اُٹھے تو ایک غزل کہی، جس کا مطلع ہے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجہ تم دادند

وندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

اس غزل کے ساتھ ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ کئی امتحانوں سے گزرنا پڑا کہ لوگ شک کرتے تھے کہ یہ خود ایسا کلام نہیں کہہ سکتے۔ کسی سے لکھواتے ہیں۔ بہر حال ان کی شہرت اب پورے ایران میں پھیلنے لگی اور پھر سرحدوں کے پار تک پہنچ گئی۔

حافظ شیراز کے زمانے میں شیراز میں کئی بار حکومتیں تبدیل ہوئی۔ ان میں سے شاہ ابواسحاق کا ذکر بطور خاص ضروری ہے۔ اس کے دور میں شیراز ایک ایسا خطۂ ارضی تھا۔ جہاں شراب و عیش نے گھر گھر ڈیرے ڈال دیئے۔ شاہ ابواسحاق انتہا کا عیش پسند تھا۔ خواجہ حافظ کی شاعری پر اس دور کا اثر بہت گہرا ہے۔ ۷۵۴ھ میں محمد مظفر نے شیراز پر لشکر کشی کی۔ فوجیں شہرپناہ کے اندر تک داخل ہوگئیں۔ لیکن شاہ ابواسحٰق عیش و عشرت میں مگن رہا اور کوئی اسے یہ خبر بد سنانے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ امین الدین جو اس کا خاص مقرب تھا۔ اس نے شاہ ابواسحاق سے کہا حضور بہار نے شہر کو چمنستان بنا دیا ہے۔ آیئے ذرا نظارہ تو کیجئے۔ ابواسحٰق نے بالا خانے پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف دشمن کی فوجیں دکھائی دیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ جب بتایا گیا کہ دشمن کا لشکر ہے تو شاہ ابواسحٰق نے کہا کیسا احمق ہے۔ ایسے موسم میں وقت ضائع کرتا ہے پھر یہ شعر پڑھا اور بالا خانے سے نیچے اتر آیا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم

چو فردا شود فکرِ فردا کنیم

محمد مظفر نے شہر فتح کیا۔ شاہ ابواسحٰق قتل ہوا۔ حافظ کو شاہ ابواسحٰق کی ہلاکت کا شدید صدمہ ہوا

مظفر کے حکمران ہوتے ہی تمام میکدے بند کروا دیئے اور محتسب آ گئے۔ خواجہ حافظ کا ردعمل اس غزل میں ملتا ہے ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن
کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خوں ریز است
ز رنگ بادہ بشوئید خرقہا از شک
کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

دیوان میں ایک غزل جس کا مطلع یوں ہے ؎

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشائند؟
گرہ از کار فرو بستہ ما بکشائند

اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس دور کے بعض دوسرے حافظ کے ہم عصر شاعروں نے بھی میکدوں کے خاتمے اور محتسبوں کے ظلم کا اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے۔ لیکن جس انداز میں خواجہ حافظ نے اسے باندھا ہے اس نے اسے آفاقی تاثیر کا حامل بنا دیا ہے۔ بہر حال محمد مظفر کے بعد شاہ شجاع کا دور آیا تو میکدے پھر کھل گئے اور مے خواروں کو آزادی مل گئی۔ دیوان حافظ میں ایک غزل ایسی ہے جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے مطلع ہے ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

اسی غزل کا مقطع ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

لیکن ... ایک فقیہہ خواجہ عماد تھے جن کی شاہ شجاع بڑی تکریم کرتا تھا۔ یہ خواجہ عماد بھی دلچسپ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بلی سدھا رکھی تھی کہ جب خواجہ عماد نماز پڑھتے تو یہ سدھائی ہوئی بلی بھی ان کی تقلید کرتی۔ خواجہ حافظ کو ایسی ریاکاریوں سے ہمیشہ سے چڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک غزل لکھی جس میں یہ شعر بھی شامل ہے ؎

اے کبک خوش خرام کہ خوش می روی بناز
غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

بس یہیں سے فقیہہ شہر اور سلطان شہر نے خواجہ حافظ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔شاہ شجاع نے ایک بار حافظ کو طلب کیا اور تحقیر کے انداز میں کہا۔آپ کی غزل ہموار نہیں ہوتی ایک شعر میں تصوف ہے۔دوسرے شعر میں مے پرستی تیسرے میں شاہد بازی....خواجہ حافظ نے جواب دیا۔ان سب خامیوں کے باوجود میری غزلیں میری زبان سے نکل کر دنیا میں پھیل جاتی ہیں۔جب کہ دوسرے شاعروں کا یہ حال ہے کہ ان کے اشعار شہر کے دروازے تک نہیں پہنچ پاتے۔شاہ شجاع جو خود بھی شعر کہتا تھا جل بھن کر رہ گیا۔خواجہ حافظ کے ایک شعر کے حوالے سے فقیہہ اور سلطان شہر نے ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ قیامت کے منکر ہیں یا کم از کم اس میں شک کرتے ہیں۔خواجہ حافظ نے یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔

حافظ کی شاعری اور طرز زیست سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ رند اور آزاد انسان تھے۔حالانکہ ایسا نہیں۔وہ شادی شدہ تھے۔ان کی اولاد بھی تھی۔ایک بیٹا شاہ نعمان تھا جس نے برہان پور (ہندوستان) آکر رہائش اختیار کی اور یہیں انتقال کیا۔

شاہ شجاع کا انتقال ۷۸۲ھ میں ہوا۔اس کے بعد منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا جس نے امیر تیمور کا جان لڑا کر بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا۔میدان میں ہلاک ہوا۔اور شیراز امیر تیمور نے فتح کر لیا۔

کہتے ہیں کہ امیر تیمور نے حافظ شیراز کو بلا کر کہا۔"میں نے ایک عالم کو اس لئے تاخت و تاراج کیا کہ اپنے وطن سمرقند اور بخارا کو آباد کر دوں۔اودھر تم ہو کہ ان کو ایک تل کے بدلے دے رہے ہو امیر تیمور کا اشارہ حافظ کے اس شعر کی طرف تھا۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ نے جواب دیا تھا۔ایسی ہی فضول خرچی کی وجہ سے تو فقر و فاقہ کی نوبت پہنچی ہے۔
حافظ اب ایک ایسے شاعر تھے جن کا کلام دنیا میں پھیل رہا تھا۔ان کا ایک شعر ہے ؎

بہ شعر حافظ شیراز می گویند می رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

خواجہ حافظ کے دور کے اکثر سلاطین اور حکمرانوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ خواجہ حافظ شیراز کو اپنے دربار سے متعلق کریں حافظ کو کئی سلاطین اور حکمرانوں کی جانب سے دعوتیں ملیں۔ ان کا بھی جی چاہا کہ وہ بعض سلاطین کے دربار سے منسلک ہو جائیں لیکن وہ گئے کسی کے پاس نہیں۔ اصل میں رکنا باد کی خاک ان سے چھوٹتی نہ تھی ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلیٰ و آب رکنا باد

مصلیٰ خواجہ کو بہت محبوب تھا۔ یہیں ۷۹۲ھ میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں ان کو دفن کیا گیا۔ محمد معائی نے جو سلطان بابر بہادر کا معتمد خاص تھا۔ حافظ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو اب تک قائم موجود ہے۔ انہی کے نام کی نسبت سے اس جگہ کو اب 'حافظیہ' کہا جاتا ہے۔ یہاں تب سے اب تک ایک طرح سے میلے کا سماں بندھا رہتا ہے۔ لوگ وہاں جاتے، دن بسر کرتے ہیں اور مزار کی زیارت کرتے ہیں۔

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

دیوانِ حافظ، انتخاب اور کچھ اشارے

خواجہ حافظ شیراز کہ رندی و شاہد بازی کی بے مثل شاعری میں یکتا اور عالم میں مشہور ہوئے وہ بڑے خوش الحان واقع ہوئے تھے۔ قرآن مجید حفظ تھا اور اس پر بہت فخر کرتے تھے کہ ان کو قرآن کا فہم حاصل ہے۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

کہتے ہیں کہ حافظ کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر جمعہ کی رات کو مسجد کے منصورہ میں ساری رات خوش الحانی سے تلاوت قرآن پاک کیا کرتے تھے۔

حافظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ تاہم تمام شعری اصناف میں ان کا کلام ملتا ہے۔ فارسی میں غزل کے بانی شیخ سعدی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے اسے آگے بڑھایا۔ بھی کے اور سلمان ساوجی، خواجو کرمانی کا دور ہے لیکن حافظ نے فارسی غزل کو عروج کمال تک پہنچا دیا۔

غزل میں اس سے پہلے یہ انداز سرمستی، جوش نہ تھا، نہ ہی حافظ سے پہلے غزل کا دامن موضوعات کے اعتبار سے اتنا متنوع تھا۔ ناقدوں نے کہا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ تاریخ اتنا بڑا غزل گو پیدا نہیں کر سکی۔

حافظ کی شاعری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں پوری احتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جس فلسفہ اور طرز حیات کو پیش کرتے ہیں۔ وہی فلسفہ ہے جسے صدیوں پہلے یونانی فلسفی اپی قورس نے پیش کیا تھا۔ یعنی خوش عیشی کا فلسفہ اس ضمن میں حافظ کے کچھ اشعار ؎

عید است ساقیا قدحے پر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد و شتاب کن

بنوش بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

خوشتر از فکرِ می و جام چہ خواہد بودن
چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

ای کہ با زلف و رخ یار گزاری شب روز
فرصتت باد کہ خوش عیشی و مامے داری

مسند بہ گلستاں بر شاہد و ساقی را
لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

زاہد و عالم کے ہاں جو ریاکاری پائی جاتی ہے اس کا انکشاف اور اس پر طنز — فارسی شاعری کی ایک روایت رہی ہے لیکن خواجہ حافظ نے اسے جس شدت اور بے باکی سے باندھا اور پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ خواجہ حافظ کے کلام کا یہ حصہ بطور خاص بہت اہمیت رکھتا ہے چند اشعار اس حوالے سے دیوان سے پیش ہیں ؎

گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نہ شود
تا ریا ورزد و سالوس، مسلماں نہ شود

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نہ بود
بہتر از زہد فروشی کہ درو روی و ریاست

من از پیر مغاں دیدم کرامت ہائے مردانہ
ایں کہ دلق ریائے را بہ جامی ودنمی گیرد
بادہ بہ محتسب شہر نہ نوشی زنہار
کہ خورد با تو می و سنگ بہ جام اندازد
زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید
من ہم از مہر نگارے بگزینم چہ شود
ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ
ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

دیوان سے انتخاب

ذیل میں حافظ کے دیوان سے کچھ اشعار پیش ہیں حافظ کا انتخاب آسان کام نہیں ان اشعار کے حوالے سے ان کا رنگ خاص اور موضوعات کا تنوع بہر طور کسی حد تک سامنے آجائے گا۔

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بہ جوی نفروشم
واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست
صوفیاں جملہ حریف اند نظر باز ولے
زاں میاں حافظ سودہ زدہ بدنام افتاد
عاشقاں بندۂ ارباب امانت باشند
لاجرم چشم گہربار ہماں است کہ بود
مشاطہ را جمال تو دیوانہ می کند
کائینہ را خیال پری خانہ می کند
اعتمادے نیست بر دور جہاں
بلکہ بر گردون گرداں نیز ہم

بده ساقی می دانی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی
خدمت از ما برساں سرو گل ریحان ما

ترسم اں قوم کہ بر دردکشاں می خوانند
در سر کار خرابات کنند ایمان را

ہر چہ ہست از خاصت ناساز بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بالای کس کوتاہ نیست

فرصت نگر کہ فتنہ در عالم او فتاد
عارف بہ جام زد و از غم کراں گرفت

میانِ گریہ می خندم کہ چوں شمع اندریں مجلس
زبان آتشینم ہست لیکن در نمی گیرد

من و انکار شراب ایں چہ حکایت باشد
غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد
زدیم بر صف رنداں و ہر چہ بادا باد

دردمنداں بلا زہر ہلاہل نوشند
قتل ایں قوم خطا شد ہاں تا نہ کنی

مرا روز ازل کارے بجز رندی نفرمودند
ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

برق عزت کہ چنیں می جہد از پردہ غیب
تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم

در نمازم خم ابروئے تو ام یاد آمد
حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

بادہ نوش غم مخور و پند مقلد مشنو
اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن
می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد
محراب ابروی تو حضور نماز من
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گہ ز کنار تو جواں برخیزم
سوز آہ سینۂ سوزان من
سوخت این افسردگانِ خام را
بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
ساقی بہ نور بادہ برافروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را
عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
بہ خدا کہ عارف و سالک بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
من ترک عشق بازی و ساغر نمی کنم
صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بین
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب
مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

مئے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

دو یار زیرک واز بادہ کہن مینے
فراغتے وکتابے و گوشہ چمنے
من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم
گرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

نفس بادہ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

ہر کس کہ بدید چشم او گفت
کو محتسبے کہ مست گیرد

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلشادم
بندہ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز بازخواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

بیار بادہ نخور زاں کہ پیر میکدہ دوش
بہ بے حدیث غفور و رحیم و رحماں گفت

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست
ای بادشاہ حسن سخن با گدا بگو

گرچہ بد نامی است نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

ہزار نکتہ درین کاروبار دلداری است
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

کرشمہ کن کہ بازار ساحری بشکن
بغمزہ رونق بازار سامری بشکن
بر باد دہ سرو دستار عالمے یعنی
کلاہ دگوشہ بہ آئین دلبری بشکن
چو [illegible] سالی شد زلف سنبل از دم باد
تو [illegible] بر سر زلف عنبری بشکن
گر دبا از غمزۂ دلدار تابے برد برد
درمیاں جان و جاناں ماجرائے سفت رفت

یوٹوپیا

مفکّروں، علمأ اور شاعروں، ادیبوں، مصلحوں، رہنماؤں، فلسفیوں اور دانشوروں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ انسان جس دنیا میں جنت سے نکالا جانے کے بعد آباد ہوا ہے۔ یہ دنیا ایک مثالی دنیا بن جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں انسان ایک دوسرے کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ایک دوسرے کے کا دکھ بانٹ سکیں۔ اور اس دنیا میں ایک ایسی حکومت، ایک ایسا نظام قائم ہو جائے جو انسانوں کی فلاح اور بہبود کے تمام تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ اس آرزو، اس خواہش کی تکمیل کے لیے صدیوں سے انسان جدوجہد کر رہا ہے اور صدیوں سے دنیا کے بڑے اور خلاق ذہن لکھ رہے ہیں۔

انسانی دنیا کو جنت بنانے کا خواب جن لوگوں نے دیکھا ان میں ایک تھامس مور بھی تھا جس کی کتاب "یوٹوپیا" کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اپنے موضوع کی وجہ سے اس کتاب کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کی اشاعت کے بعد سے اب تک اس کو ان گنت انسان پڑھ چکے ہیں اور ہمیشہ اُسے پڑھتے رہیں گے۔ اس کتاب کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔

تھامس مور کی اپنی زندگی بہت دلچسپ، تجربوں سے بھرپور اور ڈرامائی رہی تھی۔ پھر جس طرح وہ اپنے انجام کو پہنچا اس کی وجہ سے بھی تھامس مور کو ابدی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ تھامس مور شاعر بھی تھا اور مفکر بھی تھا۔

تھامس مور جس عہد میں پیدا ہوا وہ انگلستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین دور ہے۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ امریکہ اسی دور میں دریافت ہوا۔ چھاپہ خانہ کو فروغ ہوا۔ کتابیں چھپنے لگیں۔ صنعتی آلات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ برطانیہ میں جاگیرداری دور اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اور ہنری ہشتم اپنی تمام تر برائیوں اور تضادات کے باوجود بعض ایسے اقدامات بھی کر رہا تھا جنھوں نے برطانیہ پر بالخصوص اور ساری دنیا پر بالعموم بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ ہنری ہشتم نے برطانوی کلیسا کو پاپائے روم کی غلامی سے آزاد کیا اور ایک خود مختار چرچ آف انگلینڈ قائم کیا۔ جس کا سربراہ وہ خود بن بیٹھا۔ ہنری ہشتم کے ان اقدامات کے کچھ ذاتی اسباب بھی تھے۔ جن سے تاریخ کا طالب علم پوری طرح آگاہ ہے تاہم اس کے جو مثبت نتائج سامنے آئے اس نے پوری دنیا کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔

تھامس مور ۱۴۷۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ لندن کے دولت مند گھرانوں میں سے ایک تھا۔ باپ وکالت کرتا تھا۔ بچپن ہی میں تھامس مور نے اپنی علمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ یونانی فلسفہ، ادب اور مذہب اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ بعد میں وہ اپنے زمانے کے اقتصادی اور معاشی امور میں بھی گہری دلچسپی لینے لگا۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے مقابلے میں تھامس مور کو تاجر طبقے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ طالب علمی میں ہی وہ افلاطون کی "ری پبلک" کا مداح بن گیا تھا۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔

وہ انیس برس کا تھا کہ جب اس کی ملاقات اپنے دور کے عظیم دانشور اور فلسفی ایراسمس سے ہوئی۔ ایراسمس کا اثر سر تھامس مور پر ساری زندگی رہا۔ ۱۵۰۴ء میں تھامس مور پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ عہدوں اور حیثیتوں پر فائز ہوتا چلا گیا۔ وہ لندن کا نائب میئر رہا۔ پریوی کونسل کا رکن بنایا گیا اور پھر ۱۵۲۳ء میں اسے پارلیمنٹ کا سپیکر چن لیا گیا۔ اس کے بعد اسے بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنا وزیر بنا لیا۔ ۱۵۲۹ء میں اسے وزیر اعظم کا عہدہ سونپ دیا گیا۔

ہنری ہشتم کی زندگی کے بعض واقعات کو ڈرامہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ کتنے ہی ایسے ڈرامے آج کلاسیک میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے

کردار ہنری ہشتم اور این بولین تھے۔ ہنری ہشتم اپنی ملکہ کیتھرائن کو طلاق دے کر این بولین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ رومن کیتھولک عقیدے کے لوگ طلاق کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اس کی حیثیت کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تھامس مور کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ہنری ہشتم سمجھتا تھا کہ اگر اسے اپنے وزیر اعظم کی حمایت حاصل ہو جائے تو پادریوں کے اعتراضات اور مخالفت کی گنجائش نہیں رہے گی۔ لیکن تھامس مور نے بادشاہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا وہ مذہبی امور میں ناجائز طور پر حصہ لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ ہنری ہشتم کو بہت طیش آیا۔ انتقام کی آگ اس کے دل میں سلگتی رہی۔ کسی اور طرح سے تو وہ تھامس مور کو سزا نہ دے سکتا تھا۔ اسی لئے سر تھامس مور پر رشوت اور خیانت مجرمانہ کا الزام لگایا جو سراسر جھوٹا تھا۔ سر تھامس مور کو ٹاور آف لندن میں قید کر دیا گیا اور یہیں جب وہ اپنی ضد پر قائم رہا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔ یہ ۱۵۳۵ء کا واقعہ ہے۔

تھامس مور کی اس موت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے فکشن اور شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں رابرٹ بولٹ کے ڈرامے A MAN FOR ALL SEASONS کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ ہمارے عہد میں سر تھامس مور پر لکھا جانے والا یہ ڈرامہ ایک عظیم فن پارہ ہے۔ اس ڈرامے پر مبنی ایک خوب صورت فلم بھی بن چکی ہے۔ سر تھامس مور بلاشبہ "اے مین فار آل سیزنز" تھا۔ اس دور میں بھی اس کی کتاب "یوٹوپیا" پڑھی جاتی ہے۔ موضوع بحث بنتی ہے۔ اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں اور ان گنت انسان اسے پڑھ چکے ہیں۔

یوٹوپیا — پس منظر، جائزہ اور تلخیص

"یوٹوپیا" کا بڑا حصہ اینٹورپ (بلجیم) میں ۱۵۱۶ء میں لکھا گیا۔ یوٹوپیا سفرنامے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نقادوں اور محققوں نے کہا ہے کہ یوٹوپیا پر بعض سفرناموں کا اثر ہے۔ ۱۵۰۷ء میں شائع ہونے والا گو دس لوچی اور ۱۵۱۱ء میں شائع ہونے والے پیٹر مارٹر کے سفرنامے تھامس مور کی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ اور ان دونوں سفرناموں کے یوٹوپیا پر

اثرات کا سراغ لگایا جاچکا ہے۔

سر تھامس مور نے یوٹوپیا کو لاطینی زبان میں لکھا ہے جو اس دور کی تہذیبی زبان تھی ۱۵۱۶ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اور بہت جلد مقبول ہوگئی۔ اسی زمانے میں دوسری زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہونے لگے۔ انگریزی زبان میں یوٹوپیا کا ترجمہ ۱۵۵۱ء میں یعنی مور کی موت کے سولہ برس بعد شائع ہوا۔ انگریزی میں اس کے ترجمے میں جو تاخیر ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ مور کا سر قلم ہو چکا تھا۔ وہ بادشاہ کی نگاہوں میں مجرم تھا۔ اس لیے کسی کو جرأت نہ ہوسکی کہ وہ یوٹوپیا کا ترجمہ انگریزی میں شائع کرسکے۔ جب ہنری ہشتم اس دنیا سے اٹھ گیا تو پھر خوف بھی دور ہوگیا اور انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا گیا۔ انگریزی کے حوالے سے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

"یوٹوپیا" ایک فرضی سیاح کے فرضی سفرنامے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ رافیل ایک سیاح ہے جس کی ملاقات تھامس مور سے ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنے سفرنامے کے قصے سناتا ہے۔ ایسے ملکوں کے سفر کے قصے، جن کا نام اور وجود دنیا کے کسی نقشے میں نظر نہیں آتا۔ یوٹوپیا بھی ایک ایسا ہی فرضی اور تخیلاتی ملک ہے۔ خود یوٹوپیا کے لفظی معنی بھی "فرضی" کے ہیں۔ رافیل کی زبان سے سر تھامس مور اس فرضی اور مثالی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہے۔

یوٹوپیا میں اس دور کے برطانیہ کے قوانین پر بھی کڑی تنقید کی گئی ہے۔ اس زمانے میں برطانیہ میں چور کو موت کی سزا دی جاتی تھی (یہ دلچسپ تقابل ہے کہ چور کو موت کی سزا دینے والا معاشرہ آج چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو ظالمانہ اور غیرانسانی قرار دیتا ہے۔) اس کے باوجود چوری کی وارداتوں میں کمی نہ ہوتی تھی۔ اور آئے دن چوروں کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سر تھامس مور رافیل کی زبانی لکھتا ہے

"چوری کی سزا موت دینے سے تو چوری میں کمی نہ آئی۔ اگر ان ضرورت مندوں کی ضروریات اور روزگار کا بندوبست کرایا جائے تو چوری کی وارداتیں خود بخود کم ہو جائیں۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پہلے تو انسان کو اس حالت پر پہنچا دو کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو جائے اور پھر اسے پھانسی پر لٹکا دو۔"

"سر تھامس مور۔ ری پبلک کا مداح ہونے کے باوجود اس پر دلچسپ طنزیہ انداز میں تنقید بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ فلسفی حکمران بن جائے تو افلاطون کے خیال میں ملک خوشحال ہو جاتا ہے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں۔ کوئی بادشاہ فلسفی نہیں بن سکتا اور فلسفی مشیروں کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ بادشاہوں کو تو خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

تھامس مور لکھتا ہے، جہاں معیار دولت ہو وہاں عوام پر انصاف سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ہی عوام خوشحال اور آسودہ ہو سکتے ہیں جہاں دولت پر چند افراد قبضہ کر لیں وہاں سب کی ضرورتیں کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ اشیاء کی حقیقی اور منصفانہ تقسیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ذاتی ملکیت کا رواج اور نظام باقی ہے۔

رافیل کی زبانی سر تھامس مور ہمیں "یوٹوپیا" لے جاتا ہے۔ یہ ایک جزیرہ ہے، جو جنوبی امریکہ میں کہیں واقع ہے۔ اس کا طول پانچ سو میل اور عرض دو سو میل کے لگ بھگ ہے۔ پہلے وہاں وحشی لوگ آباد تھے۔ پھر ایک بادشاہ یوٹوپس نے اسے فتح کیا اسی کے نام پر اس جزیرے کو "یوٹوپیا" کہا جانے لگا۔

نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے "یوٹوپیا" کو ۵۴ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی وہاں ۵۴ شہر ہیں، یوٹوپیا کا صدر مقام اماروت ہے۔ یہ ریاست ایک جمہوری وفاقی مملکت ہے۔ ہر ضلع کو یکساں حقوق اور اختیار حاصل ہیں۔ وفاق کا انتظام ۱۶۲ ارکان پر مشتمل ایک مجلس کرتی ہے۔ ہر ضلع سے تین نمائندے چنے جاتے ہیں ضروریات زندگی کی پیداوار اور ان کی تقسیم کے فرائض یہی مجلس ادا کرتی ہے۔

ہر ضلع چھ ہزار گھرانوں اور چھ ہزار کھیتوں پر مشتمل ہے۔ تیس گھرانوں پر ایک نمبردار مقرر کیا گیا ہے جس کو یہ گھرانے مل کر چنتے ہیں۔ دس نمبرداروں پر ایک مہا نمبردار ہوتا ہے یوں تو ہر ضلع میں ۲۰۰ نمبردار ہوتے ہیں جو خفیہ رائے شماری کے ذریعے اپنے حاکم کا انتخاب کرتے ہیں۔ ضلع کی انتظامیہ کمیٹی بڑے نمبرداروں اور حاکم پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر ہفتے میں دو بار اس کمیٹی کا اجلاس لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں دو نمبردار بھی مشورے

کے لیے بلائے جاتے ہیں۔

"یوٹوپیا" کے لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ عورت کیا مرد اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زراعت کے تقاضوں سے واقف ہو۔ جو لوگ شہروں میں رہتے ہیں ان کی ایک مقررہ تعداد کو ہر برس دیہات میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ دیہاتی زندگی کا عملی تجربہ کرسکیں ان شہریوں کی جگہ اتنے ہی دیہاتیوں کو شہر بھیج دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ شہری زندگی سے مانوس رہیں۔ یوں شہروں اور دیہات کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ زراعت کے علاوہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرا ہنر بھی سیکھے۔ صحت مند مرد اور عورت ہر روز چھ گھنٹے کام کریں بوڑھے، بچے اور علمی کام کرنے والوں کو اس ذمے داری سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اس ریاست 'یوٹوپیا' میں علمی اور تخلیقی کام کرنے والوں کو مملکت کی طرف سے وظیفہ جاری کیا جاتا ہے۔

"یوٹوپیا" کے لوگ زراعت کے لیے بیلوں کو استعمال کرتے ہیں۔ دالیں، سبزیاں اور گندم اگاتے ہیں۔ انگور، سیب اور ناشپاتی پسندیدہ پھل ہیں۔ ہر برس وہ اتنا اناج پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ پوری آبادی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ دیہاتی اور غلہ اگانے والے اس اناج کے عوض شہر میں بننے والی چیزیں حاصل کرتے ہیں۔

لوگ مشترکہ طور پر خواہ وہ گاؤں میں ہو یا شہر میں، کھانا پکاتے ہیں۔ ان کا ممبر داران کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ البتہ کوئی چاہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی کھانا کھانا چاہتا ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں۔

لوگ خواہ شہری ہوں یا دیہاتی ان کا لباس سادہ ہے۔ کنواری اور شادی شدہ عورتوں کے لباس میں ایک فرق قائم رکھا جاتا ہے۔

شہروں کی آبادی ۶ ہزار سے بڑھنے نہیں دی جاتی۔ آبادی بڑھنے کی صورت میں فاضل آبادی کے لیے نئی بستی بنالی جاتی ہے۔ شہر کے بازاروں میں ضرورت کی ہر چیز کثرت سے ملتی ہے۔ پیداوار جمع کر کے محفوظ کر لی جاتی ہے۔

"یوٹوپیا" میں مکان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہر گھر کے پیچھے ایک چھوٹا

بانع ہے مکانوں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ انہیں مقفل نہیں کیا جاتا چونکہ گھر ذاتی ملکیت نہیں ہوتے۔ اس لیے لوگ ہر دس برس کے بعد قرعہ اندازی کر کے گھر بدل لیتے ہیں تیس گھرانوں کے لیے ایک وسیع طعام گاہ ہوتی ہے۔ برتن مٹی اور شیشے کے ہوتے ہیں البتہ کموڈ، اگالدان سلفچی وغیرہ سونے اور چاندی کے ہوتے ہیں۔

"یوٹوپیا" میں کثرت ازدواج کی قطعاً اجازت نہیں۔ شادی کرنے سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ انسان گھوڑا خریدے تو اس کی زین اُتار کر اچھی طرح اس کے جسم کا معائنہ کرتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی زخم تو نہیں تو پھر جس کے ساتھ پوری عمر بسر کرنی ہے اس کے جسم کو شادی سے پہلے دیکھنے میں کیا بُرائی ہے۔ اگر میاں بیوی مشترکہ طور پر عدالت سے رجوع کر کے طبیعتوں اور مزاج کے اختلاف کی وجہ سے کامیاب شادی شدہ زندگی بسر کرنے سے معذوری کا اظہار کریں تو طلاق مل جاتی ہے اور دوسری شادی کی اجازت بھی۔

"یوٹوپیا" میں بچوں کی تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیم لازمی اور مفت ہوتی ہے۔ تعلیم مادری زبان میں دی جاتی ہے۔

یوٹوپیا میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ کوئی کسی کے عقیدے میں دخل نہیں دیتا۔ نہ کسی کو زبردستی اپنا ہم مذہب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جسمانی اذیت، افاقے اور ریاضت کو اس مملکت میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ جنگ اور خون خرابے کے یہ لوگ شدید مخالف ہیں۔ وہ مسرت اور شادمانی سے زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔

بیماروں کے علاج پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مرض لاعلاج ہو جائے تکلیف ناقابل برداشت بن جائے تو مریضوں کو خودکشی کی اجازت ہے۔

دولت کی ہوس سے آزاد ہو کر یوٹوپیا کے باشندے کتنی ہی الجھنوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ دولت کی ہوس نہ ہو تو سیاہ کاری اور خباثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

"یوٹوپیا" ایک ایسی ریاست ہے جس میں کوئی، کسی کا کسی طرح استحصال نہیں کر سکتا کیونکہ اس مثالی ریاست میں وہ تمام برائیاں اور خامیاں سرے سے موجود ہی نہیں جو استحصال

کے امکانات کو پیدا کرتی ہیں۔ جب سر تھامس مور رافیل کو مشترکہ ملکیت کے خلاف دلیل دیتا ہے تو اس وقت اسے مطلق علم نہ تھا کہ اجتماعی معیشت اور اجتماعی ملکیت کے فوائد کتنے دور رس اور آسودگی سے بھرپور ہیں۔ جب اس یوٹوپیا کا پورا نقشہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کا مدح خواں بن جاتا ہے۔

"یوٹوپیا" کے حوالے سے سر تھامس مور نے غریبوں، ناداروں اور محنت کش طبقے کے حقوق کے لیے آواز اُٹھائی ہے۔ امیر اور غریب میں جو خلیج حائل ہو چکی ہے وہ اسے پاٹنا چاہتا ہے۔ وہ نیچے لوگوں کی نفی کرتا ہے۔ لیکن محنت کشوں کو ان کا پورا حق دلوانا چاہتا ہے وہ کہتا ہے

"یہ محنت کش اور مزدور ہی ہیں جن کے سہارے ملک چلتے ہیں لیکن انہی سے ان کے حقوق چھین لیے جاتے ہیں۔

"یوٹوپیا" میں ہر چیز سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں۔ وہاں کسی کو یہ فکر نہیں کہ اگر ذاتی استعمال کی چیز نہ ملی تو کیا ہوگا۔ کیونکہ یوٹوپیا کے ہر شہری کے علم میں یہ بات ہے کہ دوکانیں اور گودام وافر اشیائے سے اٹے ہوئے ہیں۔ وہاں کی ہر چیز سب کے لیے ہے اور ان میں مساوی تقسیم کی جاتی ہے۔

"یوٹوپیا میں کوئی گداگر ہے نہ حاجتمند۔

یوٹوپیا میں کسی کے پاس اس کا کسی قسم کا ذاتی اثاثہ نہیں۔ اس کے باوجود ہر شخص مطمئن اور آسودہ ہے۔ اسے فکر معاش میں جان گھلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اس کے لیے کام کا تعین ہو چکا ہے وہاں ہر شخص کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس لیے نہ تو کسی کو یہ خوف ہوتا ہے کہ بیوی۔ تنگی اور غربت کا طعنہ دے گی۔ نہ بیٹے کی بیروزگاری کا غم۔ کہ اسے ملازمت مل ہی جائے گی اور اسے کام کرنا پڑے گا اور نہ ہی وہاں کسی کو یہ غم ہلکان کرتا ہے کہ بیٹی کا جہیز کیسے تیار کیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں جہیز کی رسم ہی سرے سے موجود نہیں۔!!

نیو اٹلانٹس

فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کی تحریک کے بانی دیدرو نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا تو اس کا سہرا ان اثرات کے سر باندھا جو بیکن کی تصانیف نے اس پر چھوڑا تھا۔ خاص طور پر بیکن کی کتاب نیو اٹلانٹس کا اثر تو بہت گہرا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بیکن کی تحریروں (بالخصوص نیو اٹلانٹس) نے صرف اس کے اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں کو ہی متاثر نہ کیا، بلکہ پوری دنیا کی فکر پر اس کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کے بانی دیدرو نے اس منصوبے کے حوالے سے فرانسس بیکن کو یوں خراج تحسین پیش کیا تھا:

"اگر ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہوگیا تو اس کا سہرا بیکن کے سر ہوگا۔ جس نے ایسے زمانے میں سائنس اور آرٹ کی ایک بین الاقوامی لغت کی تجویز پیش کی تھی جب دنیا میں سائنس کا وجود تھا نہ آرٹ کا۔ اس غیر معمولی دانشور نے علم کی ضرورت کے بارے میں اس وقت لکھا جب معلومات کی تاریخ لکھنا ممکن نہ تھا"

فرانسس بیکن بڑے خاندان کا بڑا فرد تھا۔ ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین اپنے عہد کے سر برآوردہ لوگ تھے۔ اس کے والد سر نکولس نے ہنری ہشتم ایڈورڈ ششم اور ملکہ الزبتھ کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں کو زینت بخشی اور نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ علم کی پیاس اور علم سے محبت، بیکن کو بطور خاص ودیعت ہوئی تھی۔ کم عمری ہی میں وہ علمی انہماک کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ خاص علمی وقار رکھتا تھا ابھی وہ جوان ہی تھا کہ ملکہ الزبتھ اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ "YOUNG LORD KEEPER" کہہ کر پکارتی تھی۔ بیکن تیرہ برس کی عمر

میں کیمبرج داخل ہوا۔ لیکن وہاں کا انتظام اسے پسند نہ آیا۔ تین برسوں کے بعد اس نے کیمبرج چھوڑ دیا۔ وہ پیرس چلا گیا۔ جہاں برطانوی سفارت خانہ میں ملازم ہو کر ڈپلومیسی کی تربیت و تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۱۵۷۹ء میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے لندن واپس آنا پڑا۔

سائنس کے ساتھ بیکن کو گہرا شغف تھا۔ لیکن جب اسے مناسب سہولتیں اور سرکاری امداد حاصل نہ ہوئی تو اس نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کا چچا لارڈ برلے اس وقت شاہی خاندان میں خاص اثر و رسوخ رکھتا تھا بیکن کا خیال تھا کہ وہ اس کے ذریعے سائنس کی تعلیم کے لئے شاہی خاندان سے مدد حاصل کر سکے گا۔ لیکن بیکن کا چچازاد بھائی بیکن کی ذہانت اور صلاحیت سے بہت خار کھاتا تھا۔ اس لئے چچا اس کے کام نہ آسکا۔ ارل آف ایسکس جو اس کے چچا کا حریف تھا اس نے فرانسس کی مدد کی اور اسے ایک اچھی خاصی جاگیر ڈونکنہام بخش دی۔ افسوس کہ بیکن نے ارل آف ایسکس کی اس فیاضی کا صلہ خود غرضی اور ناشکر گزاری کی صورت میں دیا۔ جب ارل آف ایسکس پر مصیبت بنی اور اس پر مقدمہ چلا تو اس کے خلاف جس شخص کی آواز سب سے زیادہ زہریلی اور بلند تھی۔ وہ بیکن کی آواز تھی! بیکن نے صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی۔ بلکہ اپنے محسن کو سزا دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا دیا۔ وہ لوگ جو اس ضمن میں بیکن کی طرف سے معذرت کرتے ہیں کہ بیکن نے احساس فرض کی وجہ سے اپنے محسن کی مخالفت کی۔ وہ ایک بات بھول جاتے ہیں کہ بیکن کو خود ایک زمانے میں رشوت لینے کے الزام میں سزا ہوئی جس سے اس کے کردار اور فرض شناسی کا خاصا پول کھل جاتا ہے۔

۱۵۹۰ء میں بیکن ملکہ الزبتھ کا منشیر بنا۔ وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی بن گیا۔ بادشاہ جیمز اول کے عہد میں اس نے مزید ترقی کی اور اعلیٰ ترین عہدوں پر نامزد ہوا۔ وہ اٹارنی جنرل بنا دیا گیا اس کے بعد وہ لارڈ چانسلر بنا۔ اسے لارڈ ورلیولم کا خطاب ملا۔ پھر اسے وائیکاؤنٹ آف سینٹ البانا کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

بیکن۔ شاہ پرست تھا اور راشی۔ وہ رشوت میں کھلے دل سے تحفے وصول کرتا۔ وہ بے حد فضول خرچ تھا۔ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے کا عادی، اگرچہ اس کی اپنی اور اس کی بیوی کی جاگیر سے ملنے والی آمدنی بہت معقول تھی۔ اس کے باوجود وہ اکثر مقروض رہتا اور

قرض اتارنے کے لئے رشوت لیتا وہ اپنے شاہانہ طرز زیست کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔

بیکن۔اپنے دور میں اسی حوالے سے ایک بڑے سکینڈل کا مرکزی کردار بھی بنا۔بیکن پر رشوت لینے کے الزام میں مقدمہ چلا اس نے خود اعتراف کیا کہ ۲۳ بار رشوت لینے کا مرتکب ہوا تھا۔اس کو اس مقدمے میں چالیس ہزار پونڈ جرمانہ کیا گیا۔اس کے تمام عہدوں سے اسے معطل کر دیا گیا سزا میں یہ بھی حکم شامل تھا کہ اب وہ شاہی دربار میں کبھی حاضر نہ ہو سکے گا۔بیکن کو اصل سزا ندامت اور شرمساری کی ملی۔اب اس کے عظیم نام پر دھبہ لگ گیا تھا اس کا جرمانہ معاف کر دیا گیا۔اسے زندان میں بھی صرف دو دن رہنا پڑا۔اسے پارلیمنٹ میں اپنی نشست سنبھالنے اور دربار میں حاضری کی بھی اجازت دے دی گئی،لیکن بیکن اپنے نفس اور ذات کا محاسبہ کر چکا تھا۔باقیماندہ زندگی میں اس نے کوئی ایسا کام نہ کیا جس پر اسے شرمسار ہونا پڑا ہو۔ بادشاہ نے اس کے عہدوں کو بحال کر دیا تھا۔لیکن اب بیکن نے سب کچھ چھوڑ کر تنہائی میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حکومت کی پنشن پر گزارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی باقیماندہ زندگی آرٹ ادب اور بالخصوص سائنس کے لئے وقف کر دی۔

جدید سائنس اور فکر کی دنیا میں بیکن کو بڑے عجیب الفاظ اور اعزاز سے یاد کیا جاتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ وہ سائنس اور فلسفے کی دنیا میں۔ GREATEST

WISEST AND MEANEST OF MAN KIND

تھا۔۱۵۹۷ء میں اس کے "مضامین" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو شہرہ آفاق حیثیت رکھتے ہیں۔۱۶۰۵ء میں ایڈوانسمنٹ آف لرننگ اور ۱۶۱۰ء میں وزڈم آف اینشینٹس شائع ہوئی۔اس کے مضامین چونکہ نسبتاً عام فہم ہیں اس لئے بار بار شائع ہوئے، ۱۶۲۰ء میں اس کی ایک شہرہ آفاق تصنیف "WOVOUM ORG RNUM" شائع ہوئی۔۱۶۲۷ء میں نیو اٹلانٹس منصۂ شہود پر آئی۔

بیکن کا انتقال ۹ اپریل ۱۶۲۶ء کو ہوا۔اس کی موت سردی لگنے سے واقع ہوئی۔ان دنوں وہ گوشت کو برف کے ذریعے محفوظ کرنے کے تجربات میں مصروف تھا۔

بیکن کو جدید مادی فلسفے اور تجرباتی سائنس کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔مادیت کے بارے

میں بیکن کے نظریات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض بنیادی نکات کا ذکر کیا جائے اور دیمقراطس کا بھی جس کا بیکن معتقد اور مداح تھا۔

پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مادیت کیا ہے۔ نظریۂ مادیت کی رو سے سورج، چاند، زمین، پہاڑ، دریا، درخت، پودے، جانور حتیٰ کہ اس کائنات کی تمام اشیاء خارج میں اپنا وجود رکھتی ہیں اور محض ہمارے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ اشیاء انسان کے وجود سے لاکھوں برس پہلے ہی موجود تھیں۔ نظریۂ مادیت میں انسان اور اس کا دماغ بھی دوسری تمام اشیاء کی طرح مادے کی ہی پیداوار ہیں ہم جسے خیال یا روح کہتے ہیں۔ اصل میں وہ انسان کے دماغ کا ہی عمل ہے۔ دماغ سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔ مادہ ہر دم متحرک اور متغیر رہتا ہے اسے فنا نہیں۔ تاہم اس کی ماہیت اور ہیئت میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اقبال نے اسی حوالے سے کہا تھا ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آئیڈیل ازم (یعنی تصوریت) مادیت کی ضد ہے تصوریت کے مطابق خیال یا روح مقدم ہے اور کائنات انسان کے ذہن کی تخلیق یا ہمارے خیالات کا ہی عکس ہے یہ وہ بات ہے۔ جسے غالب نے یوں بیان کیا ہے ع

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔!

مادیت کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانی شعور، یونان قدیم کے تقریباً تمام فلسفی مادیت پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن یہ فلسفی ایتھنز اور اسپارٹا کے یونانی نہ تھے۔ بلکہ ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

طالیس (۶۲۴-۵۴۷ ق م) آنکسی ماندر (۶۱۱-۵۴۷ ق م) کے علاوہ اس سلسلے میں سب سے قابل ذکر ہراقلیطس (۵۳۵-۴۷۰ ق م) ہے ہراقلیطس کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ کہ اسے جدلی مادیت کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایفی سس (ترکی) کا رہنے والا تھا۔ اس کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں، وہ شاہی خاندان کا فرد تھا اور اپنے بھائی کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس نے جو کتاب لکھی وہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کائنات، دوسرا سیاسیات اور تیسرا مذہبیات سے متعلق ہے۔ یہ کتاب معدوم ہے۔ اسے کسی

نے نہیں دیکھا، لیکن ہر اقلیطلس کے ڈیڑھ دو سو کے قریب مقولے یونانی فلسفیوں نے اپنی تصانیف میں نقل کئے ہیں۔ جن میں سے چند ایک ــــ

- تمام موجودات عالم ایک وحدت ہیں۔
- آپ ایک ہی دریا میں دوبارہ نہیں نہا سکتے اس لئے کہ ہر لمحہ تازہ پانی آپ پر سے گزرتا رہتا ہے۔
- انسان کے لئے تضاد میں خیر ہے۔ خیر اور شر ایک ہیں۔
- لوگ نہیں جانتے کہ اجتماع ضدین کیا شے ہے یہ متضاد تناؤ کا آہنگ ہے جیسے کمان یا بربط۔
- اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔
- دائرہ کی ابتدا اور انتہا ایک ہی ہوتی ہے۔
- ہم ایک ہی دریا میں اترتے بھی ہیں اور نہیں بھی اترتے۔ ہم ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔
- انسان کا کردار ہی اس کی تقدیر ہے۔

اس کے بعد دیمقراطس آتا ہے جس کا زمانہ (۴۶۰، ۳۷۰ ق م) ہے کارل مارکس نے اسے "یونانیوں میں پہلا قاموسی دماغ کہا ہے۔

دیمقراطس ایٹمی فلسفے کا موجد بھی ہے اور عیقراطس وہ فلسفی ہے جس نے سب سے زیادہ دنیا کی خاک چھانی اور علم حاصل کیا وہ تنہائی پسند تھا اور اس نے افلاطون یا ارسطو کی طرح ادارے قائم نہ کئے۔ لیکن اس کی تعلیمات و نظریات ساری دنیا میں پھیل گئیں ارسطو کا سا نقاد اور نکتہ چین فلسفی بھی اس کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے۔ دیمقراطس کے نظریات کا خلاصہ یوں بنتا ہے۔

- یہ کائنات ایٹموں (مادے کا سب سے چھوٹا جزو) سے مل کر بنی ہے۔
- کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی اور جو موجود ہے وہ معدوم نہیں ہو سکتی۔
- تغیر کیا ہے ــــ؟ ایٹموں کی ترتیب و تفریق۔
- کوئی واقعہ اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ ہر واقعہ کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ہر حرکت قانون قدرت کے تابع ہے۔

• ایٹم لاتعداد ہیں۔ ان کی شکلیں ان گنت ہیں۔ وہ لامحدود خلا میں مسلسل گرتے رہتے ہیں۔ جو وزن میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے آنے کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ بڑے ایٹم اپنے سے چھوٹے ایٹموں سے ٹکراتے اور اس حرکت سے دنیاؤں کی تشکیل ہوتی ہے ہر لحظہ بے شمار دنیائیں بن اور بگڑ رہی ہیں۔

• انسانی ذہن بھی مادے ہی کی ایک شکل ہے۔

مادی فلسفے اور نظریات کے اس پس منظر میں فرانسس بیکن کے افکار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بیکن دیمقراطیس کا معتقد تھا۔ اس سے بیکن نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔

بیکن سائنس اور مادی نظریات کا مبلغ ہے۔ وہ انسان کو سب سے پہلے روائتی تصورات اور تصریحات و توجیہات سے چھٹکارا پانے کی ہدایت کرتا ہے وہ دوسروں کے خیالات کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لینے کا بھی شدید مخالف ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ سچا علم ان بری ذہنی عادتوں کو ترک کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ علم کی بنیاد تجربے کی سچائی کو قرار دیتا ہے وہ اخراجی طریق استدلال کی بجائے استقرائی طریقہ اختیار کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔

بیکن کا اہم ترین تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مادی فلسفے کی قدیم روایت کو بحال کیا۔ مروجہ نظریات کی پرکھ مادی اصولوں کی کسوٹی پر کی۔ آئیڈیل ازم کی خامیوں کو اس نے اجاگر کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

نیو اٹلانٹس، اس کی آخری تصنیف ہے اس کے ذہن پر سائنس ہمیشہ حاوی رہی۔ اس لئے اس کی یہ خیالی جنت۔ ایک بڑی سائنسی تجربہ گاہ لگتی ہے۔ اٹلانٹس کی اصطلاح بھی اس نے یونانی دیو مالا سے مستعار لی۔ قدیم یونانیوں کے خیال میں اٹلانٹس مغربی سمندر میں ایک جزیرہ تھا۔ جو زلزلے کی وجہ سے ڈوب گیا تھا۔ افلاطون نے اس کا ذکر اپنے مکالمات میں کیا ہے اور افلاطون کا دعویٰ تھا کہ اٹلانٹس کے باشندوں کی تہذیب انتہائی ترقی یافتہ تھی۔ بیکن نے نیو اٹلانٹس کو ایک خوشحال اور روشن خیال معاشرے کے لئے بطور علامت استعمال کیا ہے۔

بیکن ہمیں اٹلانٹس کے حوالے سے بتاتا ہے۔ وہاں کے لوگ اپنے دانش مند بادشاہ کی وجہ سے بہت خوش حال ہیں۔ اس معاشرے کی بنیاد سائنس پر قائم ہے۔ جزیرے کا دارالخلافہ بن سالم

ہے۔ جہاں شہر کے وسط میں ایک کالج ہے جس کا نام بیت سلیمان ہے یہ وہ کالج ہے، جہاں اشیاء کے اسباب اور مخفی حرکات کے علم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس تعلیم کا مقصد انسانی ذہن کی حدود کو وسعت بخشنا ہے تاکہ انسان تمام اشیاء اور موجودات کو اپنے استعمال میں لا سکے، یہاں تجربات کے لئے ہر طرح کے آلات موجود ہیں۔ زمین کے اندرونی حالات جاننے کے لئے گہرے غار کھودے گئے ہیں۔ خلا کی تحقیق کے لئے اونچے مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔ طبی تحقیق اور نامیاتی مادے کی تیاری کے لئے تجربہ گاہیں موجود ہیں اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے زرعی مرکز اور اوزار بنانے کے کارخانے موجود ہیں۔

اس دنیا میں سائنس کی بدولت نہ کوئی محتاج ہے نہ مفلس 'نیو اٹلانٹس'، کا رابطہ ساری دنیا سے قائم ہے، ساری دنیا کی ترقی پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ وفود بیرون ملک جاتے ہیں، سائنسی امور پر غور و فکر کے لئے کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔

بیکن 'نیو اٹلانٹس'، کی اس فرضی ریاست میں ملوکیت کا علمبردار ہے۔ اس ریاست کا آئین ناقابلِ ترمیم ہے۔ اس دنیا میں طبقات بھی موجود ہیں۔

یہ اس نئی دنیا کا ابتدائی خاکہ ہے، جس کے آثار واشکال ہمارے زمانے میں سائنس کی ایجادات کی وجہ سے بہت نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس ریاست میں اس کے باشندوں کو نہ تو نظم و نسق میں شریک کیا گیا ہے، نہ ہی معاشی امور میں، اشیائے ضرورت کی پیداوار، ان کی تقسیم کے فرائض چند سائنسدان اور ماہرین سائنسی مشینوں کے ذریعے انجام دیتے ہیں۔

بیکن نے اس کتاب میں آنے والی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ اپنے تخیل سے خوب کام لیا ہے۔ 'نیو اٹلانٹس'، نئے سائنسی عہد (جس کی شکل سامنے آ چکی ہے) کا خاکہ ہے۔ نیو اٹلانٹس، سائنس کی سربلندی کا ترجمان ہے۔ آنے والے دور کی نشاندہی کرتا ہے جب سائنسدان مشینوں کے ذریعے دنیا کا سارا انتظام سنبھال سکیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی اہمیت میں گزشتہ چند دہائیوں میں خاص اضافہ ہوا ہے۔ اس کے تراجم نئے سرے سے دنیا کی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اٹلانٹس کے حوالے سے فلمیں بنی ہیں۔ اس سائنسی دنیا کے پسِ منظر میں جو مادی فلسفہ کام کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کی بنا پر ہی یہ کتاب

لافانی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی بڑی کتابوں میں سے ایک ---!

"نیو اٹلانٹس" کی تصنیف کے کچھ اور محرکات بھی تھے۔ بادشاہ جیمز اول کی خوشنودی جس کے حوالے سے بیکن سائنس کالج کی تعمیر کے منصوبے کو عملی صورت دینا چاہتا تھا۔ لیکن بیکن ایک معتوب شخص تھا۔ اس کے نام کو دھبہ لگ چکا تھا۔ اس کے اپنے زمانے میں تو ایسا نہ ہوا لیکن یہ کتاب اپنا اثر دکھا کر رہی۔ ۱۶۴۵ء میں پارلیمنٹ کے حکم سے لندن میں ایک "کالج آف فلاسفی" قائم ہوا۔ جس کے بانی سیموئیل ہارٹ نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ

"اس کالج کی محرک بیکن کی تصنیف نیو اٹلانٹس ہے۔"

۱۶۶۲ء میں اسی کالج کو ترقی دی گئی اور اسے رائل سوسائٹی کی شکل دے دی گئی۔ اس کے بانیوں نے بھی بیکن کو خراج تحسین پیش کیا اور نیو اٹلانٹس کے بیت سلیمان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"ہم دراصل نیو اٹلانٹس میں بیان کردہ بیت سلیمان کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جسے بیکن نے پیش کیا تھا۔"

نیوٹن

پرنسپیا

پرنسپیا دنیا کی وہ عظیم تصنیف ہے جس نے اکتشافاتِ عالم کے نئے منطقوں کی نشاندہی کی اور کشش ثقل کے قانون و اصول کو منضبط انداز میں پیش کیا یہ ایک ایسی بنیادی کتاب ہے جس پر مشتمل نظریات و اکتشافات پر آنے والے زمانوں میں بہت کام ہوا۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس کے بارے میں جو علم و عرفان ہمیں حاصل ہے۔ اس میں "پرنسپیا" کا بڑا حصہ ہے اور نیوٹن کے بعد آئین سٹائین تک ایسا مہتم بالشان علمی اور سائنسی کام ہوا ہے کہ جس نے اس کائنات کی گتھیاں سلجھا دی ہیں اور ہماری دنیا کی نئی صورت گری ہوئی ہے۔

نیوٹن کی اس عظیم کتاب کا پورا نام PHILOSPHIA NATURALIS PRINCIRIA MATHEMATICA یعنی دی میتھمیٹکل پرنسپلز آف نیچرل فلاسفی۔ ہے جو اختصار میں "پرنسپیا" کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و مقبول ہوا ہے۔

۱۶۴۲ میں گیلیلو کی موت کے بعد یورپ میں سائنس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ جسے اہم دانشورانہ بحران کا نام دے سکتے ہیں۔ کوپرنیکس کے ماننے والوں کے خلاف کلیسیا نے جو کاروائیاں کیں۔ تعزیر و سزا کا بازار گرم کیا اور خود گیلیلو کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ایک طویل داستان ہے۔

سائنس دان فطرت اور اس کے اکتشافات کے بارے میں کام اور بات کرتے گھبراتے تھے۔ کلیسیا کا خوف دلوں پر حاوی ہو چکا تھا۔

وہ شخص جس نے اس بحران کو دور کیا اور دنیا کو بدل دینے والے نظریات کا موجد اور خالق بنا۔ وہ نیوٹن تھا۔ نیوٹن اسی برس پیدا ہوا جس برس گیلیلو کا انتقال ہوا تھا۔ کرسمس کے

دن ۲ ۱۶۴۲ء میں نیوٹن لنکن شائر میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس کی ماں صدمے سے بے حال تھی۔ نیوٹن کی پیدائش بھی پورے دنوں سے پہلے ہوئی وہ بہت لاغر اور کمزور بچے کی صورت میں اس دنیا میں آیا۔ وہ خاتون جو دوائی لانے کے لئے گاؤں کے کسی معالج کے پاس بھیجی گئی اس کا خیال تھا کہ اس کی واپسی تک یہ نومولود بچہ مر چکا ہوگا لیکن یہ لاغر و کمزور بچہ اپنی ماں کی شفقت اور محبت کے سائے میں پروان چڑھا۔ ماں نے اس کی دیکھ بھال کا فریضہ اس طرح سے ادا کیا۔ کہ اس کی صحت بہتر ہونے لگی نیوٹن کو اسی لئے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ وہ اپنے وجود کا تصور اپنی ماں کے بغیر نہ کر سکتا تھا۔ لیکن جب وہ چار برس کا ہوا تو اسے اپنی ماں سے جدا ہونا پڑا۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور اپنے نئے خاوند کے پاس چلی گئی۔ نیوٹن کو اس کی ماں ساتھ لے کر نہیں گئی بلکہ اسے اس کی نانی کے پاس چھوڑ گئی۔

نیوٹن ایک نرم و نازک لڑکا تھا۔ بے حد حساس، خاموش طبع، ماں کی جدائی کا دکھ بھی کسی سے بیان نہ کرتا تھا لیکن وہ ایک پیدائشی اور فطری نابغہ تھا۔ اپنی ابتدائی عمر میں ہی اس نے ایک کلاک بنایا اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی مشینیں جن میں ایک آٹا پیسنے والی چکی تھی۔ نیوٹن لڑکپن سے مطالعے کا دلدادہ تھا۔ لڑکپن سے جوانی کی عمر میں پہنچا تو وہ مس سٹوری کی محبت میں گرفتار ہو گیا جس کے ساتھ اس کی منگنی بھی ہو گئی۔ نیوٹن کی والدہ کا دوسرا خاوند بھی فوت ہو گیا۔ نیوٹن نے فارم کا انتظام سنبھال لیا۔ ماں کے امور میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ممکن ہے اس کی ساری عمر دیہات اور ایسے کاموں میں ہی گزر جاتی۔ لیکن اس کے رشتے کے ایک ماموں پادری ولیم ایسکف نے یہ بھانپ لیا کہ نیوٹن کو خدا نے فطری صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر وہ گاؤں میں ہی رہا تو اس کی یہ تمام صلاحیتیں بے کار جائیں گی۔ اس بزرگ نے نیوٹن کی والدہ کو ترغیب دینی شروع کی کہ نیوٹن کو تعلیم کے لئے یونیورسٹی بھجوایا جائے اس کی ان کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیوٹن کو کیمرج کے ٹرینٹی کالج میں تعلیم کے لئے بھجوا دیا گیا۔ وہ ایک ایسا طالب علم تھا جسے اس وقت کی اصطلاح میں SIZAR کہا جاتا تھا یعنی ایک ایسا طالب علم جو اپنی تعلیم اور ضروریات کے لئے چھوٹی اور حقیر خدمات انجام دیتا تھا۔

اس وقت نیوٹن کی عمر ۱۹ برس تھی۔!

نیوٹن کا کنبہ نادار تھا یہی وجہ ہے کہ مس سٹوری جس سے نیوٹن محبت کرتا تھا اور جو اس

کی منگیتر بھی تھی اس کے ساتھ یہ رشتہ قائم نہ رہ سکا۔ نیوٹن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اور مس سٹوری بھی نادار تھی۔ دونوں جلد ہی اس فیصلے پر پہنچے کہ ان کی شادی ناکام ہو گی۔ یوں یہ منگنی ٹوٹ گئی۔

کیمبرج میں اپنی تعلیم کے پہلے تین برسوں (۱۶۶۱ء، ۱۶۶۴ء) میں نیوٹن کی کسی مصروفیت یا حرکت سے اندازہ نہ ہوا کہ وہ غیر معمولی طالب علم ہے۔ تاہم ریاضی میں اس کا شغف اس کے استاد بارو (BARROW) کو متاثر کر چکا تھا۔ اس زمانے میں کیمبرج میں تعلیمی سرگرمیاں عروج پہ نہ تھیں۔ خانہ جنگی کی وجہ سے یونیورسٹی کے مالی معاملات خاصے خراب ہو چکے تھے اور پھر ۱۶۶۴ء میں جب مشہور زمانہ پلیگ پھیلا تو کیمبرج یونیورسٹی کو بند کر دیا گیا۔

پلیگ کی یہ وبا جو ان گنت انسانوں کی موت کا سبب بنی جس نے لندن کو ہلا کر رکھ دیا۔ نیوٹن کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ نیوٹن نے اپنی عمر کے آخری حصوں میں لکھا تھا:

"میں نے جو کچھ کیا اس کی ابتدا طاعون کے انہی دو برسوں ۱۶۶۵ء اور ۱۶۶۶ء میں ہوئی یہی وہ دن تھے۔ جب میں نے اپنی اختراع پر کام شروع کیا۔ ریاضی اور فلسفے نے جس طرح ان دو برسوں میں میرے ذہن و دماغ پر اپنا غلبہ قائم رکھا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد پھر کبھی ایسا استغراق اور انہماک نصیب نہ ہوا"

ان دنوں نیوٹن اس مسئلے پہ غور و فکر کر رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو چاند اور سیاروں کو دائرے کی صورت میں گردش میں متحرک رکھتی ہے۔

اور پھر وہ مشہور و معروف واقعہ رونما ہوا۔ جس نے نیوٹن کو کشش ثقل کی تھیوری کا موجد و بانی بنا دیا۔

انہی دنوں میں ایک دن وہ ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا انہی خیالوں میں گم اور مستغرق تھا کہ جب سیب کے درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر زمین پر گرا۔ سیب کے گرنے کی آواز سے اس کی یکسوئی اور انہماک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ کیپلر کے نظریات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک لمحے میں ایک سیب کے گرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو گیا یہ اتفاق انسانی علوم اور ترقی کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیوٹن نے اس "مقناطیسیت" کو دریافت کر لیا تھا جو سیب کو زمین پر گرانے کا باعث بنی تھی۔

بہر حال اس واقعہ کی جتنی بھی اہمیت ہو۔ سائنس دانوں اور محققوں نے کہا ہے۔ کہ نیوٹن جس نتیجے تک پہنچا تھا اس تک گلبرٹ کے مشہور مفروضہ، مقناطیسیت سے لاعلم ہو کر

نہ پہنچ سکتا تھا۔ سیب گرنے کے واقعہ کا راوی والٹیئر ہے جسے یہ واقعہ نیوٹن کی ایک عزیزہ کیتھرائن بارٹن نے سنایا تھا۔ جو ایک عرصہ تک نیوٹن کے ساتھ رہی تھی۔

مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا اب نیوٹن یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کشش کا وہ کونسا اصول ہے جو اس کا محرک بنتا ہے یہاں پھر اس نے اپنے پیش رو کیپلر سے مدد لی اور اہم سائنس دانوں کے نظریات سے استفادہ کیا۔ یوں نیوٹن دور تک دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ خود نیوٹن نے اعتراف کیا ہے:

"میں اتنی دور تک دیکھنے میں اس لئے کامیاب ہو سکا کہ میں بعض قد آور اور عظیم سائنسدانوں کے کندھوں پر کھڑا تھا......"

نیوٹن نے کچھ عرصہ اپنے اس مسئلہ پر کام کیا اور پھر اسے التوا میں ڈال دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اسے غیر اہم سمجھتا تھا بلکہ اس کے ذہن میں کئی دوسرے متعلقہ اور غیر متعلقہ مسائل اور سوالات نے قبضہ کر رکھا تھا۔ سیاروں کی تبدیل ہوتی ہوئی رفتار کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ایسے مسائل کے حل کے لئے ایک نئے ریاضیاتی نظام کی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ مسائل حل نہ ہو سکتے تھے۔ پرانا الجبرا اور ریاضیاتی نظام صرف ان چیزوں سے بحث کرتا تھا جو غیر تبدیل تھیں۔ نیوٹن نے پہلے اس مسئلے کو سر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نیوٹن نے جسے FLUXIONS کا نام دیا اور جسے ہم آج کی اصطلاح میں INFNITESIMAL CALCULUS کہتے ہیں۔ علم ریاضی میں یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو قدیم یونانیوں کے بعد نیوٹن نے انجام دیا تھا۔ یہ سب کچھ جاننے، حاصل کرنے اور دریافت اور ایجاد کرنے کے باوجود نیوٹن نے اپنے نظریات کو شائع کرنا پسند نہ کیا جو بعد میں اس بڑے علمی شاخسانے اور تنازعے کا سبب بنا جو جرمن فلسفی اور ریاضی دان ولہیلم فان لیبنز (LEIBNIZ) سے چھڑا اور جس نے بڑی بدمزگی پیدا کی۔

طاعون کے ان دو برسوں میں تیسرا اہم مسئلہ جس پر نیوٹن نے غور و فکر کیا وہ روشنی کی حقیقت تھی اس ضمن میں نیوٹن نے کئی تجربات سے کئی غلط نتائج اخذ کئے جو بعد میں جا کر صحیح ہوئے لیکن وہ اپنے کام میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ایک چھوٹی سی دوربین بھی بنالی جس سے وہ ستاروں اور آسمان کا نظارہ کرتا رہتا۔

دو برس بعد ۱۶۶۷ء میں جب پلیگ کی وبا ختم ہوئی تو نیوٹن وولتھروپ سے واپس

کیمبرج آیا اب وہ چوبیس برس کا ہو چکا تھا اپنی زندگی کے سب سے بڑے اور لافانی کام کی بنیاد یں رکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود اپنے نظریات اور عظیم کام کے بارے میں اس کا رویہ بڑا لاپرواہانہ تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی افتاد طبع ہو۔ وہ نظریات میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ شہرت سے اسے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہ رہی تھی۔ دو برس کے بعد اس کے استاد نے سیاروں میں تبدیلی اور رفتار کے بارے میں مسائل کا ذکر کیا تو نیوٹن نے زبان کھولی اور بتایا کہ وہ ان مسائل پر کام کر چکا ہے۔ اس پر بارو نے اس کا کام دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نیوٹن نے اسے اپنے نوٹس دے دیئے۔ نیا ریاضیاتی سسٹم جو نیوٹن نے بنایا تھا اس سے پروفیسر بارو کتنا متاثر ہوا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تاہم اس نے نیوٹن سے کہا کہ وہ اپنے ان اشارات اور نوٹس کو ایک مقالے کی صورت دے۔ نیوٹن نے مقالہ قلم بند کیا۔ اس کی متعدد نقول اہم ریاضی دانوں کو بھجوا دی گئیں۔ لیکن اس کی اشاعت چالیس برس بعد ہوئی۔

پروفیسر بارو بھی خوب آدمی تھا وہ اپنی پروفیسر شپ چھوڑ کر دینیات کی طرف جانا چاہتا تھا جسے وہ ہر علم پر ترجیح دیتا تھا۔ نیوٹن کی ذہانت کو دیکھ کر اس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ اس کے بعد اس کا جانشین کون ہوگا۔ نیوٹن ستائیس برس کا تھا۔ جب اسے کیمبرج میں ریاضی کا استاد مقرر کیا گیا اس کے تین برس بعد نیوٹن کو رائل سوسائٹی کا فیلو بھی بنا لیا گیا۔

آنے والے برسوں میں نیوٹن اپنے نظریات و اکتشافات پر کام کرتا رہا۔ اس نے اس "غیر مرئی تار"، کو دریافت کر لیا جو ستاروں کو سورج کے گرد جھولا جھلاتے رکھتی ہے اس نے ثابت کر لیا کہ اگر توپ کے گولہ کو کسی خاص نشانے پر داغا جائے تو توپ کا گولہ بتدریج زمین کی طرف گرتا چلا جاتا ہے چونکہ وہ قوت جو اسے زمین کی طرف کھینچ رہی ہے اس قوت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جو اسے دور فاصلے پر نشانے تک پہنچا رہی ہے۔ سیارے کی کشش ثقل اسے ایک دائرے میں گردش میں رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی اتنی قوت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ گر کر پھٹ جاتا ہے (جیسے کہ ایک دن چاند کو زمین پر گر کر پھٹنا ہے)

بلاشبہ نیوٹن پر یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ خلا میں موجود تمام اجسام توپ کے گولوں کی طرح ہیں جو ایک بہت بڑے دھماکے سے پھٹ کر ٹوٹ کر، باہر کی طرف جھکتے چلے آتے ہیں۔

نیوٹن اپنے تمام تر تجربات اور نظریات کو ابھی تک شائع کرنے کے حق میں نہ تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں اسے علم کیمیا سے بہت گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی وہ ریاضی

اور کیمیا کا ایک خاص سنگم بھی پیدا کرنے کا خیال رکھتا تھا۔ نیوٹن کو اس پر بھی اعتقاد تھا کہ "فلاسفرز سٹون"، حقیقت ہے کہ جس کے چھونے سے ہر دھات سونے میں تبدیل ہو جاتی ہے نیوٹن نے اس پارس کو پانے اور تلاش کرنے میں بھی بہت وقت صرف کیا۔ اسی زمانے میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل ہوا۔ نیوٹن کی زندگی کا یہ پہلو خاصا چھپا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تصوف میں بڑا شغف رکھتا تھا اور انگریزی کے مشہور عالم صوفی شاعر بلیک کی طرح تصوف کا قائل تھا۔

۱۶۸۴ء کا ایک دن تھا۔ اب نیوٹن اکتالیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس کا ایک دوست ایڈمنڈ ہیلے اسے ملنے کے لئے آیا۔ وہ ایک مسئلے کے حل کے لئے نیوٹن کی مدد چاہتا تھا۔ یہ ہیلے تھا جس نے ایک خاص انداز میں نیوٹن سے پوچھے بغیر رائل سوسائٹی میں یہ اعلان کر دیا کہ نیوٹن سیاروں کے مابین کام کرنے والی قوت کے بارے میں ایک مقالہ پڑھے گا اور اس سلسلے میں خاص شواہد اور ثبوت پیش کرے گا۔ رائل سوسائٹی نے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا کہ اگر مقالہ ایسا ہی ہوا تو اسے دوبارہ شائع بھی کیا جائے گا۔

یوں نیوٹن کو یہ مقالہ لکھنا پڑا۔ اس نے پارس کی تلاش کو ترک کیا اور اپنے برسوں کے کام اکتشافات، تجربات، نظریات اور اختراعات کو منضبط صورت میں قلم بند کرنے لگا۔ یوں پرنسپیا کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔ دوسرے حصے میں اس نے مختلف اجسام کی حرکت کے حوالے سے اپنے کام کو تکمیل صورت دی۔

نیوٹن کے ایک ہمعصر سائنسدان رابرٹ ہوک (HOOKE) نے اس پر الزام لگایا کہ نیوٹن نے اس کے نظریے کو چرا لیا ہے اس نے دعویٰ کیا کہ چھ برس پہلے نیوٹن کو اپنے اس نظریے سے متعارف کرایا تھا۔ نیوٹن نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ ۲۰ برس پہلے یہ نظریہ قائم کیا تھا اور یہ اس کے اپنے تجربات اور افکار کا حاصل ہے۔ نیوٹن کو اس الزام اور یاوہ گوئی کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے اعلان کیا کہ وہ پرنسپیا کا تیسرا حصہ اب کبھی نہ لکھے گا۔ لیکن نیوٹن کے دوست ایڈمنڈ ہیلے اسے ترغیب دیتا، قائل اور مجبور کرتا رہا اور یوں "پرنسپیا" کا تیسرا حصہ بھی مکمل ہو گیا۔ یوں پرنسپیا، ستمبر ۱۶۸۷ء میں مکمل ہو گئی۔ نیوٹن کی یہ کتاب جس نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا تین برسوں میں مکمل ہوئی۔

اب اس کی اشاعت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رائل سوسائٹی کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ اسے

شائع کرسکے۔ یہاں پھر ایڈمنڈ ہیلے نے فیاضی کا ثبوت فراہم کیا۔ اگر چہ وہ خود کوئی دولت مند شخص نہ تھا لیکن اس نے پرنپیا کو چھاپنے کا اہتمام کیا اور ۱۶۸۷ء کے موسم خزاں میں یہ کتاب شائع ہوگئی جو ایک بڑے سائنسی اور فکری انقلاب کا سبب بنی۔ ایڈمنڈ ہیلے نے مشہور ادیب سیموئل پیپیز (PEPYS) کا نام بطور پرنٹر دیا۔ پیپیز کو لندن کے پلیگ کے زمانے میں لکھی جانے والی ڈائری کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

'پرنپیا' انسانی ذہانت کا عظیم ترین کارنامہ ہے اس کی تصنیف نے نیوٹن کو تھکا اور گھلا کر رکھ دیا۔ اس کی تصنیف کے زمانے میں وہ مخبوط الحواس کی شہرت حاصل کر گیا۔ پرنپیا، اس کے ذہن پر اس طرح چھا چکی تھی کہ وہ ہر چیز بھول چکا تھا۔ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتا اور سمجھتا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔

'پرنپیا' کی اشاعت نے اسٹرانومی کو سائنس کا درجہ بخش دیا۔ پرنپیا کی اشاعت نے نیوٹن کو پورے یورپ اور پھر پوری دنیا میں شہرت بخشی۔ لیکن اس کی یہی شہرت اس کے لئے باعث آزار بھی بنی۔ لوگ اس سے حسد کرنے لگے۔ بہت سے الزام لگائے جانے لگے کوئی کہتا کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں صرف نظریات پیش کئے گئے ہیں اور ثبوت فراہم نہیں کیا گیا۔ نیوٹن کے کارٹون بنائے جانے لگے اس کے نظریات کا مذاق اڑایا گیا۔

نیوٹن بہت حساس تھا۔ اسے شہرت کی کبھی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اسی لئے اسے لوگوں کے ایسے رویے سے بہت صدمہ اور دکھ پہنچا۔ حتیٰ کہ وہ تقریباً دماغی توازن کھو بیٹھا۔

بہر حال آنے والے دور میں اسے پارلیمنٹ کا رکن بنا لیا گیا۔ جان لاک جیسے فلسفی سے اس کی دوستی ہوگئی۔ تصوف سے دلچسپی لینے والا نیوٹن مذہبی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

۱۶۹۶ء میں نیوٹن کے ایک سرکردہ دوست چارلس مونٹیگو کی وجہ سے اُسے شاہی ٹکسال میں وارڈن کا عہدہ مل گیا۔ تین برس کے بعد اسے ٹکسال کا انچارج بنا دیا گیا۔ ۱۷۰۵ء میں اسے ملکہ این نے سر کے خطاب سے نوازا۔ اس کی زندگی اب پُر سکون تھی کہ جرمن فلسفی اور ریاضی دان لیبنز نے دعویٰ داغ دیا کہ CALCULUS کو اس نے پہلے دریافت کیا تھا نیوٹن نے نہیں۔ جس نے اسے پھر خاصا صدمہ پہنچایا۔

آخری عمر میں نیوٹن کو بائبل سے بہت دلچسپی ہوگئی تھی۔ اس نے بائبل کے ادوار کی ترتیب پر بھی بہت کام کیا۔ ۱۷۲۷ء میں جب اس کی عمر چوراسی برس تھی۔ اس کا انتقال

ہوا۔ اسے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفنایا گیا۔

'پرنسپیا' کے علاوہ اس نے کئی دوسری کتابیں بھی لکھیں جن میں OPTICS بطور خاص قابلِ ذکر ہے لیکن یہ پرنسپیا ہے، جس نے اسے شہرت دوام بخشی اور انسان پر علم کے نئے دروازے کھولے ہیں۔

اصل الانواع

باپ کی خواہش کر وہ کلیسیا سے رشتہ قائم کرے اور پادری بنے۔ لیکن اس کے مقدر میں کچھ اور بنا لکھا جا چکا تھا۔ اس پر مذہب دشمنی، الحاد اور انسان کی قدر و قیمت گھٹانے کے الزامات اور فتوے لگے۔ جب وہ "اصل الانواع" لکھ رہا تھا تو اس کی بیوی نے اس کے نظریات کا خلاصہ سنا تو وہ بولی "مگر یہ تو صریحاً الحاد اور مذہب دشمنی ہے۔ چارلس کیا تم خدا کو نہیں مانتے؟ تمہارے نظریات سے تو خدا ایک ظالم اور بے حس بن کر سامنے آتا ہے۔

چارلس ڈارون نے اپنی بیوی کو جو جواب دیا تھا۔ یہ جواب اسے بار بار دُہرانا پڑا۔ اس نے کہا تھا۔

"میں خدا کو مانتا ہوں۔ میں اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ میں مذہبی آدمی ہوں۔ گرجے عبادت کے لیے جاتا ہوں۔

اس کے نام کے ساتھ ارتقاء کا نظریہ وابستہ ہے۔ اس نظریے کی بدولت اس نے لافانی شہرت حاصل کی اور اپنی کتاب THE OKIG IN OF SPECIESBY MEANS NATURAL SELEETION OR THE PRESERVATION OF FAVOURED RACES IN THE STROBGLE OF LIFE"

۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تو ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ "اصل الانواع" فطری انتخاب انتخاب ارتقاء اور جہد البقا کے نظریات نے دنیا بھر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مذہبی حلقوں نے اس پر بائیبل اور عیسوی مذہب کی توہین کے فتوے جاری کیے اور تب سے اب تک اس کی تعریف و تعریف

کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے نظریات کو اس زمانے سے اب تک ہر دور میں پرکھا گیا اور اسے رد کیا گیا۔

دنیا کا یہ عظیم ماہر فطرت ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو شروزبری انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس کے زمانے میں ہی اس کے نظریات کو 'ڈارون ازم' کے نام سے شہرت و رسوائی حاصل ہوئی۔ وہ ڈاکٹر رابرٹ ڈارون ایف آر کا بیٹا تھا۔ اس کے دادا اراسمس ڈارون نے ایک معالج شاعر اور فطری علوم کے فلسفی کی حیثیت سے بڑا نام کمایا تھا۔ ڈارون نے ابتدائی تعلیم شروزبری میں حاصل کی اس کے بعد ایڈنبرگ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ رہا اور پھر کرائسٹ کالج کیمبرج میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے بی اے کی ڈگری لی۔ وہ بچپن سے ہی فطری عوامل اور مظاہر میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ اور اس حوالے سے اس کے بعض استاد اسے بے حد پسند کرتے تھے۔

اس زمانے میں شاہی برطانوی بحریہ نے ایک جہاز۔ بیگل کپتان فٹزرائے کی قیادت میں جنوبی امریکہ اور پھر ساری دنیا کے مطالعاتی دورے کے لیے روانہ کیا۔ ڈارون کو بطور نیچرسٹ اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ پانچ برس تک وہ دنیا کا چکر لگاتا، حشرات الارض، پودے، نباتات اور نوادرات اور ارضیاتی نمونے جمع کرتا رہا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی محبوبہ نے دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ڈارون نے اس طویل بحری مشاہداتی اور مطالعاتی سفر کے دوران میں جو ڈائری لکھنی شروع کی۔ اس کی اشاعت نے اس پر شہرت کے دروازے کھول دیے۔ یہ سفر ۱۸۳۱ء میں شروع ہوا اور ۱۸۳۶ء میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ سفر کے دوران میں وہ ان گنت نمونے لندن بھجواتا رہا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ ایک مشہور آدمی بن چکا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں اس کا جرنل شائع ہوا جس کا نام JOURNAL OF THE RESEARCHES INTO THE GEOLGY AND NATURAL HISTORY OF THE VARIOUS COUNTRIES VISITED BY H.M.S BEAGLE, ہے اس کی اشاعت نے متعلقہ علوم کے نئے دروازے وا کر دیے۔ ۱۸۴۳ء میں اس کی دوسری اہم تحقیقی کتاب ZOOLOGY OF THE VOYAGE OF H.M.S BEAGLE شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کی کئی دوسری اہم تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جنہوں نے نیچرل سائنس کی دنیا میں نئے کشف اور دریافتوں کے دروازے کھولے۔ اس کی ان کتابوں نے علمی اور سائنسی

حلقوں میں اسے بڑی شہرت بخشی۔ لیکن اس وقت کوئی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ اس شخص کا نام ساری دنیا میں ہمیشہ کے لیے لافانی ہوجائے گا۔ پوری دنیا اس کے افکار سے فیضیاب ہو گی۔ اور خود اس وقت چارلس وارڈن کو بھی یہ وہم و گمان نہ تھا کہ دنیا میں اسے کیا مقام حاصل ہونے والا ہے۔

۱۸۴۲ء میں اس نے اپنے مہتم بالشان کام پر مبنی ایک رسالہ مکمل کر لیا تھا۔ اپنے اس عظیم اور منفرد کام کو اس نے کئی بار التوا میں ڈالا تھا۔ اور کسی دوسرے تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ "قدرتی انتخاب کے اصول پر" اس کا کام خود اس کے لیے خاصا پریشان کن ثابت ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس پر بہت لے دے ہوگی۔ اسے کافر، ملحد اور لادین گردانا جائے گا۔ کلیسا اس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو گا۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ درست اور حقیقی ہے۔ اسی لیے اسے ایک نہ ایک دن یہ کام دنیا کے سامنے لانا ہی پڑے گا۔ ۱۸۵۸ء میں جب الفریڈ آر ویلس نے اس موضوع پر اپنا مسودہ بھیجا تو ڈارون چونکا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے کام کو دنیا کے سامنے لائے۔ اس نے اپنے قریبی احباب سے مشورہ کیا اور پھر اپنے مسودے کو مکمل کرنے میں جُت گیا۔

۱۸۵۹ء میں "اصل الانواع" کا مسودہ شائع ہوا اور ڈارون نے دیکھا کہ اس کے بہت سے مداح اب اس کے خلاف تنقیدی اور مخالفانہ مضامین لکھ رہے تھے۔ لیکن عوام اور خاص حلقوں میں اس کے کام کی شاندار پذیرائی ہوئی۔

"اصل الانواع" میں جانوروں، پودوں کی حیاتیاتی نشو و نما کے حوالے سے ڈارون نے ارتقا کا نظریہ پیش کیا اور فطری اخذ و انتخاب کے اصول کو بھی دنیا کے سامنے لایا۔ بقائے اصلح اور جہد البقا جیسے نظریے جنھوں نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اسی کتاب کی دین ہیں۔

اسی کتاب کے حوالے سے انسانی نسل اور انسان کے حیاتیاتی ارتقا کا باقاعدہ مطالعہ شروع ہوا۔ جس پر ڈارون کے حوالے سے آج تک تنقید و تعریض کی جاتی ہے۔ لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈارون کے نظریات پر اعتقاد رکھنے والوں کی ہمیشہ سے ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے۔ مذہبی اور قدامت پسند حلقوں میں اب بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے کہ انسان

کا ارتقار ایک خاص قسم کے بندر کی نسل سے ہوا ہے۔

"اصل الانواع" کے بعد ڈارون کی کچھ اور اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ جن کی اشاعت اور مقبولیت سے ڈارون کو ایک خاص مسرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان کتابوں "فرٹیلائزیشن آف آرچڈز" وغیرہ کی اشاعت پر لوگوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد جب اس کا دوسرا عظیم ترین کام "دی ڈیسینٹ آف مین" شائع ہوا۔ جس کا پورا نام THE DESKENT OF MAN: EXPRESSION OF THE EMOTIONS IN MAN AND ANI-MAL شائع ہوا تو پھر طوفان اُٹھا۔ اگرچہ اب اس میں "اصل الانواع" جیسی مخالفت کی شدت نہ تھی۔

ڈارون نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ علالت میں بسر کیا۔ اس کی بیوی ایما بڑی محبت کرنے والی اور شفیق خاتون تھی۔ جس نے اسے کام اور غور و فکر کے مواقع فراہم کیے۔ ڈارون کی زندگی کے آخری چالیس برس علالت میں گذرے اور انہی چالیس برسوں میں اس نے اپنی زندگی کے عظیم کارنامے انجام دیے۔ انسان کے اعتبار سے وہ بڑا دھیما، خوش مزاج ہمدرد اور فراخدل انسان تھا۔ وہ اپنے نام آنے والے خطوط کے جواب خود دیتا تھا۔

۱۹ اپریل ۱۸۸۲ء کو اس کا انتقال ہوا اور اس کا خاندان اسے قصبے کے قبرستان میں اس کے بھائی اور بچوں کی قبر کے پاس دفنانے کا خواہاں تھا۔ لیکن اس کے مداحوں اور دوستوں نے اسے دارالعوام سے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفنانے کی اجازت حاصل کرلی۔ جہاں انگلستان کے مشاہیر دفن کیے جاتے ہیں۔

ڈارون کو اسی جیسے ایک خلاق اور عظیم سائنسدان نیوٹن کے پہلو میں دفن کیا گیا اس کے جنازے میں مختلف ملکوں کے سفارت کار اور سائنسدان شریک ہوئے۔ اس کے ہزاروں مداحین اس کے جنازے کے ساتھ سوگوار چل رہے تھے۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی اعزاز اور ڈگریاں حاصل کیں لیکن اسے حکومت برطانیہ نے سر کے خطاب سے نہ نوازا حالانکہ اس کا عظیم کام اس خطاب کا پورا استحقاق رکھتا تھا۔ رابرٹ مورلے نے اس حوالے سے ایک دلچسپ بات لکھی ہے جس پر یقین کر لینے کو بے

اختیار کی جا سکتی ہے۔ رابرٹ مورلے نے لکھا:

"کلیسا اس کے نظریات کا شدید دشمن تھا برطانوی حکومت پر اس وقت ملکہ وکٹوریہ کی عملداری تھی جسے علوم و فنون کا بڑا سرپرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ملکہ وکٹوریہ بھی کلیسا کی مخالفت مول لے کر اسے سر کا خطاب دینے سے ساری عمر ہچکچاتی رہی اور بالآخر ڈارون یہ خطاب حاصل کیے بغیر ہی دنیا سے اُٹھ گیا۔"

دنیا بھر کے کارٹونسٹ، مزاح نگار، مذہبی علماء، سائنسدان، مفکر اور شاعر ڈارون کا اب تک خاکہ اڑاتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور شاعروں نے اس کے نظریات کی خوب بھد اُڑائی ہے لیکن ایک سائنسی اور علمی کام کا جس طرح سے سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے وہ ہمارے ہاں کسی نے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ موجودہ دور میں بعض ایسے انکشافات بھی ہوئے ہیں کہ جن کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ڈارون کا پیش کردہ نظریۂ ارتقا اور اصولِ فطری انتخاب خام اور غلط تھا۔ اس کے باوجود ڈارون کے نظریات کو نہ تو پوری طرح جھٹلایا جا سکا ہے اور نہ ہی اس کے اثرات میں ہی کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔

ذیل میں میں نے "اصل الانواع" DESCENT OF MAN اور ڈارون کی دوسری تحریروں سے بعض ایسے اقتباسات جمع کیے ہیں جن سے اس کے نظریات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

ڈارون نے بیگل میں سفر کے بعد ہزاروں خول، پودے، ہڈیاں، حشرات الارض وغیرہ محفوظ کر لیے تھے۔ وہ ان کے مطالعے اور مشاہدے میں مصروف رہتا تھا۔ اپنے خیالات اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتا رہتا تھا۔ اپنی ڈائری میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

آخر زندگی اتنی مختصر کیوں ہے؟ انسان کیوں مرجاتے ہیں؟ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ایک سا کیوں نہیں رہ سکتا۔

ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے۔

"اگر کوئی جاندار شے اپنی الگ ہیئت اور شکل وصورت لے کر پیدا ہوئی ہے تو بہت سے لوگوں کے لیے یہ اپنی موت تک اسی شکل وصورت میں رہے گی۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ برہا برس یا صدیاں گزرنے کے بعد اس کی شکل وصورت یا ہیئت میں کچھ تبدیلی ہو جائے گی اور اسے اس کے پہلے روپ اور حلیے کے حوالے سے پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔

"ستارہ شناس کہتے ہیں کہ خدا نے کائنات میں جتنے سیارے اور دیگر اجرام فلکی بنا رکھے ہیں۔ انہیں ان کے اپنے راستوں پر چلنے کا حکم دے رکھا ہے اور یہ خالق کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی طرح خدا مختلف مخلوقات کو ایک دوسرے سے الگ مختلف شکلوں اور رنگ روپ میں پیدا کرتا ہے۔ ان مخلوقات کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں اپنی الگ شکل و صورت میں سینکڑوں، ہزاروں برس جیتی مرتی رہتی ہیں اور ان اتنے طویل عرصوں کے دوران ان کی ہیئت اور رنگ و روپ میں تدریجاً غیر محسوس طریقے سے تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اصلی ہیئت اور شکل وصورت سے یکسر مختلف قسم کی مخلوقات بن جاتی ہیں۔

"جب انسان کی دو نسلیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک دوسرے کی جانب ان کا رویہ جانوروں کی دو نسلوں جیسا ہوتا ہے یہ آپس میں لڑتی ہیں۔ ایک دوسرے کو کھا جاتی ہیں۔ ایک دوسرے پر وبائی امراض مسلط کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب ان کے درمیان بقا کی فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے...... اس قسم کی جنگیں صرف انسانوں کے درمیان ہی نہیں لڑی جاتی ہیں۔ بلکہ خشکی اور پانی کے جانور حتیٰ کہ حشرات الارض اور پودے وغیرہ بھی یہ جنگ لڑتے ہیں۔ اس جنگ میں ان سب چیزوں کی ایک نسل بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے اور دوسری نسل خوب پھیلتی پھولتی ہے اور یہ قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔

"ہر چیز اپنی پیدائش کے وقت اپنی ایک الگ ہیئت وصورت رکھتی ہے۔ آگے چل کر اس میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس کا سبب حالات ہوتے ہیں جن میں سے اسے گزرنا ہوتا ہے اور حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ پس حالات کی تبدیلی بھی مختلف اشیاء

کے تغیر و تبدل میں ایک اہم محرک ثابت ہوتی ہے۔

" یہ جانور جو ہمیں روئے زمین پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں یہ اپنے ان ہم جنسوں سے بدرجہا خوب صورت طاقتور اور جاندار دکھائی دیتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے روئے زمین سے نیست و نابود ہو چکے ہیں اور اب محض ہڈیوں کا ڈھیر بنکر رہ گئے۔ یا سخت چٹانوں اور مٹی کے مادوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

" موت، قحط، مہلک وبائی امراض اور فطرت کے خفیہ ہتھیار یعنی زلزلے، طوفان وغیرہ کسی بھی نوع کی ایک نسل کا صفایا کر کے دوسری نسل کی پیدائش کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں قابل قدر کام سرانجام دیتے ہیں۔

" ہماری زمین قدرت کے ایک لگے بندھے اصول کے مطابق حرکت کرتی ہے اسی طرح انسانی اور حیوانی زندگیاں بھی قدرت کے ایک لگے بندھے قانون کے تحت اس زمین پر معرض وجود میں آتی ہیں اور اپنا کام کر چکنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے

" نوع حیوانات کی مختلف نسلوں کی فنا و بقا کا انحصار ان حالات پر بھی ہوتا ہے جن میں انہوں نے جنم لیا ہوتا ہے اور پرورش پائی ہوتی ہے۔ موسم آب و ہوا اور ماحول اور قوت ان کی نشو و نما ارتقا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل نشو و ارتقا پر کچھ اس طرح فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ان حیوانات کی جسمانی ساخت اور شکل و صورت پہلے جیسی نہیں رہتی بلکہ اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان تبدیلیوں اور تغیرات کی ذمہ داری وقت اور حالات پر عائد ہوتی ہے۔

" انسان نے اپنی موجودہ جسمانی ساخت، شکل و صورت سب اپنے تجرباتی مراحل سے گزرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان پہلے اپنی جسمانی ساخت اور شکل و صورت کے لحاظ سے اپنی موجودہ حالت سے قطعی مختلف ہوا کرتا تھا۔

" قیاس و خیال کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ براہ راست اس نتیجے پر پہنچے گا کہ چند مخصوص حیوانات اور انسانوں کا سرچشمۂ ابتدائے پیدائش ایک ہے۔ اب یہ صرف معلوم کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ آخر کن وجوہات اور اسباب کی بنا پر انسانوں نے اپنی ابتدائی جسمانی ساخت

اور شکل وصورت تبدیل کر کے موجودہ ترقی یافتہ جسمانی ساخت اور شکل وصورت اختیار کر لی ہے

"حیوانات اور پرندوں کی جو اقسام قدرت کی پسندیدہ ہوتی ہیں وہ فنا سے محفوظ رہتی ہیں اور جو قدرت کی ناپسندیدہ ہوتی ہیں وہ مکمل فنا کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں۔ رمالتھوس کا بھی بعض نسلوں کی فنا و بقا کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ س۔ ط)

"انواع کی تبدیلی بعض مخصوص حقائق و اسباب کی مرہون منت ہوتی ہے۔ جیالوجیکل ہسٹری، مخلوقات کی جغرافیائی تقسیم اور پھیلاؤ، ابتدائی حصے، مبادیات پیدائش۔ بعض جانور اپنی پیدائش کے ابتدائی حصوں میں کچھ اور ہوا کرتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں مثال کے طور پر وہیل مچھلی پہلے جب وہ اپنے بچپن کے ابتدائی زمانے سے گزرتی ہے۔ تو اس کے منہ میں دانت ہوتے ہیں مگر جب وہ مکمل بلوغت کو پہنچتی ہے تو اس کے منہ میں دانت نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایک نوزائیدہ بچھڑے کے اوپری جبڑے میں بھی دانت نہیں ہوتے حیرت انگیز نظریہ انتخاب یہیں سے جنم لیتا ہے۔ یعنی جب فطرت چیزوں کو زندہ رکھنے کے لیے انتخاب کر لیتی ہے تو وہ روئے زمین پر ہزاروں برس تک اپنا وجود برقرار رکھتی چلی آتی ہیں اور جو چیزیں فطرت کی ناپسندیدہ ہوتی ہیں وہ فنا کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے روئے زمین سے نابود ہو جاتی ہیں۔

" یہ نظریہ خلافِ مسیحیت نہیں۔ کلیسائی نظریات محض مفروضات اور من گھڑت اور افسانوی قیاسات پر مبنی ہیں جبکہ سائنس حقائق کو کھوجتی ہے۔ ہر نظریے کو عملی تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد فیصلہ کن قرار دیتی ہے۔ یہ تمام سائنسی نظریات خدا کے وجود کو باطل نہیں قرار دیتے۔ خدا کا پسندیدہ مخلوق کو زندہ اور ناپسندیدہ مخلوق کو فنا کر دینا خدا کے بے انصاف ہونے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ خدا کا یہ کام مبنی بر انصاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر بعض مخلوقات کی فنا و بقا کا سلسلہ یونہی ہزاروں سال سے جاری نہ رہتا تو اس وقت روئے زمین پر تو کوئی مخلوق موجود نہ ہوتی یا پھر ہر مخلوق اتنی تعداد میں ہوتی کہ یہاں پر انسان کے قدم دھرنے کی جگہ بھی موجود نہ ہوتی۔

"بیج بھی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور مٹی بھی۔ یہ بیج ہر طرح کی مٹی کے اندر نہیں پھوٹ

سکتا۔ ہوا ق اور ناموافق حالات اور موسم بھی ان کی افزائش میں رکاوٹ بنتے ہیں بہت سی اقسام کے بیج پرندوں کے پسندیدہ ہوتے ہیں جنہیں وہ کھا جاتے ہیں۔ بہت سے بیج ایسے ہوتے ہیں جنہیں کیڑا لگ جاتا ہے۔ وہ کیڑے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

پودوں میں بھی اصول وراثت کام کرتا ہے۔ ڈارون نے اس اصول وراثت کے لیے ایک لفظ PANGENESIS استعمال کیا ہے۔ پودوں کا یہ اصول وراثت اس طرح کا ہے کہ یہ علیحدہ یونٹ یا خلیہ آئندہ اُگنے والے پودوں کے بیج یا جراثیم کی پیدائش میں اپنا ایک حصہ رکھتا ہے اور مستقبل کے اُگنے والے پودوں میں یہ حصہ موجود ہوتا تھا اور اپنے طور پر پھلتا پھولتا تھا

ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان اپنی جسمانی ساخت اور شکل وصورت کے لحاظ سے اپنی موجودہ حالت سے خاصا مختلف تھا۔ پہلے اس کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوا کرتے تھے۔ اس کے کان نوکیلے ہوتے تھے اور اس کی دم بھی ہوا کرتی تھی۔ اس قدیم مخلوق کے ڈھانچے پر اگر تحقیقات کی جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ مخلوق قدیم بندروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ جسے RADRUMANA کہا جاتا ہے اور یہ اونچے درجے کے میمل دودھ دینے والے MAMMAL شاید ایک بے حد قدیم MARSUPAL جانور کی نسل سے ہیں۔ اس جانور سے RHADRUMANA تک پہنچنے میں اس مخلوق کو بے شمار ارتقائی مدارج سے گزرنا پڑا ہے۔ کبھی یہ رینگنے والے جانور بنتے ہیں تو کبھی مچھلی کی مخلوق تو کبھی زمین اور پانی دونوں میں زندہ رہنے والی AMPHIAN۔ مخلوق گہری تحقیقات اور چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر آج کل جتنی بھی ریڑھ کی ہڈی رکھنے والی مخلوقات بشمول انسان موجود ہیں وہ اپنے ابتدائی زمانے میں ایسی مخلوق ہوا کرتی تھیں جو خشکی وتری دونوں میں زندہ رہنے پر قادر تھی۔ اس مخلوق میں نر اور مادہ دونوں کے جنسی اعضا ایک ساتھ موجود ہوتے تھے۔ البتہ یہ مخلوق دماغی طور پر کمزور ہوا کرتی تھی۔ اور اس کا دل بھی صحیح طور پر کام نہ کرتا تھا۔

چارلس ڈارون کے بارے میں آخر میں دو باتیں:۔

"اصل الانواع" کا پہلا ایڈیشن صرف ساڑھے سات سو کاپیوں پر مشتمل تھا جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

پہلا ایڈیشن پانچسو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی جلد سبز رنگ کی تھی۔
چارلس کی زندگی میں ہی اس کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے۔
ایک وقت ایسا آیا کہ کلیسا کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ "اصل الانواع" کو نذرِ آتش کر دیا جائے کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے ڈارون کو سر کا خطاب نہ مل سکا۔
اور آخر میں ایک دلچسپ واقعہ
چارلس ڈارون کو کیمبرج یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔ ڈارون اپنی بیوی کے ہمراہ کیمبرج پہنچا۔ سینٹ ہاؤس کی گیلری کھچا کھچ بھری تھی ڈارون کے ہال میں داخل ہوتے ہی طالب علموں اور مہمانوں نے پرجوش تالیاں بجا کر اور نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔ ڈارون نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔ وائس چانسلر کی آمد آمد تھی۔ ان کا انتظار ہو رہا تھا کہ اچانک ایک بندر اچھلتا کودتا سٹیج پر آیا چند قلابازیاں لگا کر غائب ہو گیا۔ ہنسی قہقہوں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔
طالب علموں نے اپنی دانست میں بندر کو انسان کا مورثِ اعلیٰ قرار دینے والے ڈارون کے سامنے خوب مذاق کیا تھا.... !!

مقدّمہ

ابن خلدون — فلسفۂ تاریخ کے بانی اور عمرانیات کے امام اور پیشرو سمجھے جاتے ہیں۔ ابن خلدون کو ان کے مقدمہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی کے پورے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ یوں تو ابن خلدون نے بھی ایک کتاب اپنے ذاتی حالات و واقعات پر لکھی ہے۔ لیکن اس سے بھی ان کی پوری زندگی کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

ابن خلدون — کے بارے میں یہ بات اب بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی جو شہرت اور وقعت اسلامی ممالک میں ہونی چاہیے تھی وہ انہیں آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔ مغرب کا ایک یہ بھی احسان ہے کہ اس کے علماء نے ابن خلدون کے صحیح مقام کا تعین کیا۔ اور ابن خلدون کی عظمت و علمی برتری کو پھیلایا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خود ابن خلدون کی اپنی زندگی میں اور اس کے بعد عالم اسلام کے علما اور فقیہوں نے جیسے جیسے الزامات اس پر تراشے اور اس کے عظیم کام کو دفن کرنے کی کوشش کی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو آج ابن خلدون کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔

ابن خلدون کی تصنیف "مقدمہ"۔ ایک ایسی تصنیف ہے جو دنیا کی سو بڑی کتابوں میں اگر شامل نہ کی جائے تو یہ فہرست نامکمل رہے گی۔ مقدمہ نے ابن خلدون کو فلسفۂ تاریخ کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کے اس مقام کا کوئی حریف نہیں ہے۔ اس طرح وہ عمرانیات کے امام اور پیشرو تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ابن خلدون کا پورا نام ۔ ابو زید ولی الدین عبدالرحمان بن ابی بکر محمد بن ابی عبداللہ محمد بن الحسن بن محمد بن جعفر بن محمد بن ابراہیم ابن عبدالرحمٰن بن خلدون ہے ۔ وہ ۱۳۳۲ء ہجری میں تیونس میں پیدا ہوئے ۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے ابن خلدون پر مقالہ لکھ کر سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ اس کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے ۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کی علمی فضیلت اور اختیار سے انکار محال ہے لیکن ابن خلدون پر ان کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں ابن خلدون کے بے پناہ قائل دکھائی دیتے ہیں وہاں ان کا مضحکہ اُڑانے میں بھی سب سے آگے ہیں ۔ ڈوزی ، شمیڈٹ وغیرہ نے ابن خلدون پر کام کیا ہے ۔ وہ ڈاکٹر طہٰ حسین کے کام سے کہیں زیادہ دقیع ہے ۔ خاص طور پر شمیڈٹ کی کتاب جسے مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے ۔

ابن خلدون کی ابتدائی تعلیم قرآن پاک سے ہوئی ۔ انہوں نے قرآن پاک کا درس ساتوں قرأتوں کے ساتھ لیا ۔ اس کے بعد احادیث کا درس لیا ۔ وہ سترہ برس کے تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا ۔

ابن خلدون کے مزاج کی دو خصوصیات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے ۔ ایک تو یہ کہ وہ جوانی میں ہی اتنا علم حاصل کر چکے تھے کہ وہ کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے ۔ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو ان کی اقتدار اور جاہ پسندی ہے ۔ انہوں نے جیسی زندگی گزاری وہ بے حد حیران کن اور غیر معمولی نوعیت کی ہے ۔ اقتدار اور مرتبے کے حصول کے لیے ابن خلدون کسی رشتے اور پیمان کی پرواہ نہ کرتے تھے ۔

تیونس کے امیر اسحاق الحصفی کے دربار تک رسائی حاصل کی ۔ انہیں کاتب کا عہدہ ملا ۔ جو ابن خلدون کو پسند نہ تھا ۔ امیر ابوزید کے خلاف جب امیر اسحاق کا لشکر لڑائی کے لیے روانہ ہوا تو ابن خلدون بھی ہمراہ ہو گئے ۔ ارادہ تھا کہ اس طرح امیر اسحاق کی ملازمت سے بھاگ نکلیں گے اور امیر ابوزید کو فتح ہوئی ۔ تو اس کا ساتھ دے کر اعلیٰ رتبہ حاصل کریں گے ۔ لیکن لشکر کو شکست ہوئی ۔ ابن خلدون نے ایک گاؤں میں پناہ لی اور پھر بہت عرصے تک یونہی چھپے رہے ۔ ابو عنان امیر مراکش کو ان کی موجودگی کی خبر ملی تو

ابن خلدون کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ ان کو سیکریٹری (امیر اسرار) تک عہدہ ملا۔ مگر ابن خلدون اس سے بھی مطمئن نہ تھے۔

ابن خلدون جس دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور میں عالم اسلام کی مرکزیت بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ آپس میں اقتدار کی جنگیں ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کی جاتی تھیں۔

بجایہ کا والی ابوعبداللہ، امیر مراکش ابوعنان کی قید میں تھا۔ ابن خلدون نے ایک سازش تیار کرنی شروع کر دی کہ ابوعبداللہ کو ابوعنان کی قید سے نکال کر بادشاہ بنایا جائے۔ ابن خلدون اور ابوعبداللہ کے درمیان طے پایا کہ اگر ابن خلدون کی سازش کامیاب ہوئی تو ابوعبداللہ ان کو اپنا وزیر بنائے گا۔ لیکن ابن خلدون کی سازش کھل گئی۔ اور ابن خلدون کو زندان کا منہ دیکھنا پڑا۔ انھیں اس وقت رہائی ہوئی جب ابوعنان کا انتقال ہو گیا۔ نئے حکمران الحسن بن عمر نے ابن خلدون پر خاص احسان کرتے ہوئے ان کو رہا کیا تھا۔ مگر ابن خلدون نے اس کے خلاف بھی سازش میں حصہ لیا۔ المنصور حکمران بنا۔ مگر اس سے بھی ابن خلدون کی زیادہ دیر نہ نبھ سکی۔ ابوسالم تخت کا دعوے دار ہوا تو ابن خلدون اس کے ساتھ ہو لیے سازش کامیاب رہی۔ ابوسالم نے ابن خلدون کو اپنا مشیر خاص اور وزیر بنا لیا۔ لیکن ابن خلدون کو یہ منصب جلیلہ بھی راس نہ آیا۔ حکومت کے دوسرے عمال اس کے خلاف ہو گئے اب ابن خلدون نے اپنے ایک ساتھی سے مل کر ابوسالم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ لیکن ابن خلدون اقتدار سے محروم رہا۔ اس کا دوست تخت پر قابض ہو گیا۔ ابن خلدون تیونس سے بھاگ گئے اور ہسپانیہ چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غرناطہ کے ابوعبداللہ خامس کو اقتدار سے الگ کیا جا چکا تھا۔ ابن خلدون نے پھر ایک نئی سازش اور ایک نیا منصوبہ تیار کیا۔ ابوعبداللہ خامس کو غرناطہ کا تخت دلانے کے لیے ابن خلدون نے اپنی سازشیں اور کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۳۶۴ء میں ابوعبداللہ تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس نے ابن خلدون کی خدمات کے عوض اپنا مقرب خاص بنا لیا اسے وزیر کا عہدہ بھی ملا۔ مگر ابن خلدون اپنی عادت یا طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ پھر اقتدار میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ جب ابوعبداللہ کے چچیرے

بھائی نے حکمران کے خلاف سازش کی تو اعانت کرنے لگے۔ ابو عبداللہ خاص اپنے چچیرے بھائی امیر عبدالعباس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اب امیر عبدالعباس ابن خلدون کا ممدوح ٹھہرا لیکن اب بھی جی کو قرار نہ آیا ان کی ذہانت اور سازشوں کی وجہ سے ان کی مخالفت کا بازار گرم ہوا۔ ابن خلدون نے بھاگنا چاہا لیکن گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔ وہ افریقہ بھاگ نکلے۔ کچھ عرصہ سلطان ابوحمود کے ساتھ بھی رفاقت کی لیکن ابن خلدون کی دلی آرزو کہ وہ پورا اقتدار حاصل کر سکیں کبھی پوری نہ ہوئی۔ انھوں نے سیاست کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھریلو زندگی بسر کرنے کی خواہش قوی ہوئی۔ لیکن ان کے اس فیصلے اور کنارہ کشی کے باوجود ان کی سابقہ شہرت کی وجہ سے حکام اور حکمران ان سے خائف رہے کہ وہ پھر کسی نئی سازش کا ڈول نہ ڈال دیں۔ ان کے علمی کام کی تیونس کے مفتی اعظم اور فقیہہ نے شدید مخالفت کی۔ ان کے خلاف بادشاہ کو بھڑکایا ان پر کفر و الحاد کے الزام لگائے۔ ابن خلدون اب تیونس سے بھاگے تو مصر جا کر دم لیا۔ یہاں ان کی شہرت پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ کچھ عرصہ جامعہ ازہر میں درس دیا پھر ملک الظاہر نے ان کو قضا کا عہدہ سونپ دیا۔ رشوت ستانی اور بدعنوانی کے خلاف ابن خلدون نے ایسے سخت احکام اور اقدامات جاری کیے کہ عمّال اور حکام ان کے مخالف ہو گئے ایک بار پھر ابن خلدون نے عزلت نشینی اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اس کی بدبختی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ بیوی بچے تیونس سے مصر آرہے تھے کہ جہاز راہ میں غرق ہوا اور وہ سب ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ جب ابن خلدون کو خبر ملی تو اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔

"اس حادثے سے میں مالی خوش بختی اور اولاد سب سے محروم ہو گیا۔"

دل شکستہ ابن خلدون نے حج کیا۔ مدینہ منورہ گئے۔ مصر واپس آکر پھر قاضی کا عہدہ سنبھالا پھر اس سفارت میں شریک ہوئے جو امیر تیمور کو یہ سمجھانے گئی تھی کہ وہ مال و دولت لے کر دمشق سے چلا جائے اور تباہی نہ پھیلائے۔ وفد کو ناکامی ہوئی مگر ابن خلدون نے امیر تیمور سے علیحدگی میں ملاقات کی۔ امیر تیمور بے حد متاثر ہوا اور فرمائش کی کہ وہ اس کے لیے افریقہ کی تاریخ قلم بند کر دے۔ ابن خلدون نے یہ دعوت قبول کی اور ایک

مہینے میں امیر تیمور کا مہمان رہ کر کتاب مکمل کر دی۔ ابن خلدون کی بے حسی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ وہ کس مقصد کے لیے امیر تیمور کے پاس بھیجے گئے تھے امیر تیمور ان کا قدر دان بن گیا تھا اس کے باوجود ابن خلدون نے اپنے اثر و رسوخ سے کام نہ لیا۔ شاہی مہمان بنے عیش کرتے رہے اور بڑا انعام حاصل کیا۔ امیر تیمور نے دمشق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابن خلدون کو مطلق احساس ہوا نہ دکھ۔ مصر واپس آکر ابن خلدون کا انتقال ہو گیا۔

ابن خلدون۔ فلسفۂ تاریخ کا بانی اور عمرانیات کا پیشرو امام

مشہور عالم "مقدمہ" اور تاریخ ابن خلدون کے علاوہ بھی ابن خلدون نے کئی تصانیف رقم کیں۔ جن میں شرح قصیدہ بردہ ابن رشد کے بعض رسائل کی تلخیص۔ المحصل کی تلخیص، منطق اور ریاضی پر کتابچے اور رسالے۔ وہ شاعر بھی تھا۔ حکمرانوں کے قصیدے بھی لکھتا رہا۔ ایک فرمانروا سے اس کی جتنی خط و کتابت ہوئی اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شاعری میں ہوئی۔

مورخ کی حیثیت سے ابن خلدون کا مقام بے حد بلند ہے۔ وہ کشادہ دل وسیع النظر مورخ ہے وہ پہلا مسلمان مورخ ہے جو مغرب کی تاریخ و حالات سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، ناروے، ڈنمارک وغیرہ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔

وہ فلسفۂ تاریخ کا بانی تھا۔ اس کے بارے میں ہمارے لبعد عظیم مصنف ٹائن بی نے اپنی کتاب A STUDY IN HISTORY میں لکھا ہے۔

"جہاں تک اس علم کا تعلق ہے عربی لٹریچر ایک ہی نام سے روشن ہے۔ وہ ہے ابن خلدون۔ عیسائی دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ افلاطون اور ارسطو اور آگسٹن بھی اس کے ہم پلہ نہ تھے۔ ابن خلدون نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ تاریخ صرف واقعات و احوال تذکرہ نہیں، اس کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ ابن خلدون تسلسل زمانی کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ ہے۔

"ماضی مستقبل سے اسی طرح مشابہہ ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دوسرے قطرے سے"
ابن خلدون معاشرے کو ایک کلیت سمجھتا ہے۔ ہر دور اور زمانہ ایک اکائی ہے
جس کا ایک مخصوص سیاسی اور اقتصادی مزاج ہے اور اس کے تقاضے معین ہوتے ہیں۔
ابن خلدون مقدمہ میں ہمیں بتاتا ہے کہ فلسفۂ تاریخ دو محوروں کے گرد گھومتا ہے۔
۱۔ تاریخ میں بھی اسی طرح تعلیل اور استنباط کا قاعدہ موجود ہے جس طرح فقہ میں۔
۲۔ واقعات کی تصحیح کے لیے محض روایات کا سہارا اور اعتماد کافی نہیں بلکہ اس
عہد کے تمدنی اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ ناگزیر ہے۔
ابن خلدون کا نظریہ ہے :۔
قومیں مختلف سیاسی کروٹوں سے بدلتی رہتی ہیں۔ ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی
ہیں۔ مزاج عوامل اور رسم و رواج ان تبدیلیوں میں اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ گویا بالکل
ایک نئی قوم معروضِ وجود میں آگئی ہو۔

عمرانیات کا پیشرو

عمرانیات کا علم بمشکل ڈیڑھ دو صدی پرانا ہے۔ سوشیالوجی کی اصطلاح میں سب
سے پہلے آگسٹ کومٹ کے ہاں ملتی ہے۔ مگر ابن خلدون کی عظیم عہد آفریں اور تاریخ ساز
تصنیف "مقدمہ" میں عمرانیات کے بارے میں وہ اظہار خیال کرتا ہوا ملتا ہے۔ وہ ہمیں
بتاتا ہے کہ معاشرہ کس طرح تشکیل پاتا ہے اور پھر کس طرح ریاست کا روپ اختیار کرتا
ہے۔ مقدمہ میں ابن خلدون بتاتا ہے۔
"انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اکیلا اور تنہا نہیں رہ سکتا۔ انفرادی زندگی دراصل
حیوانات کا حصہ ہے۔"
تمدن کی دوسری بنیاد دفاعی ضرورت پر استوار ہوتی ہے۔ ابن خلدون بتاتا ہے کہ
حیوانوں کو ان کے دفاع کے لیے قدرت نے سینگ، پنجے، خونخوار دانت اور وحشت دی
ہے جس سے وہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ انسان بے ہتھیار ہوتا ہے اس لیے انسان

اکیلا نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یوں انسانوں کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان اجتماعیت کا آغاز کرتا ہے تو مختلف طبائع، مزاج اور کردار کی وجہ سے اختلافات رونما ہوتے ہیں جو فسادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ابن خلدون کہتا ہے:۔

"انسان نظام اطاعت کا دل سے قائل ہے۔"

حشرات الارض میں جو اطاعت پائی جاتی ہے وہ ان کی جبلت کا تقاضا ہے انسان جس اطاعت کو قبول کرتا ہے وہ بتقاضائے سیاست ہوتی ہے۔

ایک معاشرہ ابن خلدون کے خیال میں تین بڑے عوامل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ایک گروہ۔ دوسرا جغرافیائی حالات۔ تیسرا اسباب حیات کی فراوانی۔

ابن خلدون حکمائے یونان اور بالخصوص ارسطو کا ہم خیال ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے ہے کہ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ابن خلدون محنت کو انسانی اعمال کی قیمت اور حاصل قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"عمل و محنت کے بغیر تو ہم قدرتی ذرائع سے بھی استفادہ نہیں کر سکتے۔"

وہ رعایا پر کم سے کم بار محنت ڈالنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ حکمائے یونان سے کہیں زیادہ آگے اور انسانی احترام کا قائل ہے۔ اس لیے وہ بے گار اور غلامی کو غیر طبعی قرار دیتا ہے۔

عمرانیات میں ابن خلدون کا سب سے بڑا انکشاف اور دریافت یہ ہے کہ وہ معاشرے کو ساکن و جامد نہیں سمجھتا۔ اس سلسلہ میں وہ یہ نظریہ "مقدمہ" میں پیش کرتا ہے۔

معاشرے کے اصول و شرائط اور صلاحیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو قوم برسر اقتدار رہے۔ دوسری قوموں پر تفوق رکھتی ہے۔ اس کی برتری اور فوقیت ہمیشہ قائم رہے۔ جس طرح انسان کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے۔ تندرستی اور اعصابی قوت کے باوجود اسے آخر ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح قومیں اور ملتیں بھی ایک طبعی عمر رکھتی ہے۔ جس سے آگے جانا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ایک نہ ایک دن ان کو بھی ختم ہونا ہے۔ جیسے اشخاص کی قمری حساب سے ایک عمر ہوتی ہے جو تین "اجیال" سے متجاوز نہیں ہو پاتی۔ اجیال۔ جمع جیل۔ ایک جیل

جس میں ایک قوم اپنے خصوصی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ا

"مقدمہ" ابن خلدون کی تلخیص

"مقدمہ" کا پہلا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا تھا۔ اسی کے تراجم فرانسیسی، اطالوی، لاطینی جرمن، اردو اور انگریزی میں ہو چکے ہیں۔ مقدمہ ایک ایسی تصنیف ہے جو فلسفۂ تاریخ کی بنیادی کتابوں میں سرفہرست تسلیم کی جاتی ہے۔ اور ہر دور میں علماء، قارئین مورخوں اور طالب علموں نے اس سے استفادہ کیا ہے اور استفادہ کرتے رہیں گے۔ ذیل میں ابن خلدون کی اس ہمیشہ زندہ رہنے والی شہرہ آفاق تصنیف کی تلخیص دی جا رہی ہے۔

۱۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ محض نقال نہ ہو بلکہ تاریخ سے متعلقہ تمام علوم سے متعارف ہو۔ مورخ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ حکمران اور سیاست کے اصول اور قواعد کیا ہیں۔ مختلف قوموں کے مزاج اور طبائع میں کیا فرق ہے۔ مورخ کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مختلف مذاہب میں کیا اختلافات ہیں۔ اور ان سب میں کونسی قدر مشترک اور یکساں پائی جاتی ہے۔

۲۔ تاریخ کا ہر واقعہ محض ایک واقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس ایک واقعہ کے اندر کئی پہلو مستور ہوتے ہیں۔ صرف تاریخ ایک خاص دور کے واقعات اور مخصوص لوگوں کے ذکر سے ہی عبارت نہیں۔ صرف واقعات و حوادث کی تفصیل پیش نہیں کرتی بلکہ اس عہد کے تمام حالات، جغرافیہ اور جزئیات پر نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ ورنہ غلطی کا احتمال رہ جاتا ہے۔

۳۔ کسی کلچر کی حقیقت اور جڑوں کا سراغ لگانا ہو تو اس کے دیہات کے کلچر کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ تہذیب و تمدن کے تکلفات کا منبع اور سرچشمہ دیہات والوں کی تہذیب اور تمدن ہے۔ کیونکہ یہی لوگ انسانی آبادی میں بحیثیت اصل اور جڑ کا درجہ رکھتے ہیں دیہات کی ارتقائی شکل کا نام ہی شہر ہے۔

۴۔ انسان اپنے حالات کا نتیجہ ہے وہ جن حالات کا حامل ہے وہی اس کی طبیعت اور جبلت بن جاتے ہیں۔

۹۔ کوئی شخص اپنے طور پر آزاد یا اپنا مالک نہیں۔ زندگی بسر کرنے کے لیے وہ دوسروں کی پیروی کرنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ عدل و انصاف کے احکام کی اطاعت کرتا ہے تو اس کے نفس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ کیونکہ حق و انصاف کی پیروی کی راہ میں سے اپنی خودداری سے دست بردار نہیں پڑتا۔ اس کی شجاعت مجروح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر احکام کی بجا آوری اور اطاعت کے لیے جبر و اختیار سے کام لیا جاتا ہے انسان خوف اور جبر کی وجہ سے ان کی اطاعت کے لیے مجبور ہوگا۔ یوں اس کا جوش اور قوت مدافعت کمزور ہو جاتے ہیں۔

۹۔ اللہ نے انسان میں خیر اور شر کے دونوں پہلو رکھے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

"ہم نے انسان کو نیکی اور برائی دونوں کی راہیں سمجھا دیں۔"

شر انسان کے زیادہ قریب ہے۔ اگر تربیت اچھی نہ ہو تو اس کی نگرانی نہ کی جائے تو پھر انسان کے لیے بڑا نقصان ہے۔

"بدویت اور سادگی میں بہادری کی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کا فروغ اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شجاعت کی وقعت ماند پڑنے لگتی ہے جن قوموں میں بدویت برقرار رہتی ہے اور جو تہذیب و تمدن کے تکلفات کا بوجھ اپنے اوپر نہیں لادتی ہیں ان کی دفاعی قوت اور توانائی دوسری قوموں سے بہتر اور زیادہ ہوتی ہے۔ ایک قوم جو اپنی سادگی اور بہادری کی وجہ سے آج غالب ہے وہ عیش و عشرت کا شکار ہو کر کل مغلوب ہو جاتی ہے۔"

"مغلوب اقوام ہمیشہ غالب اور فاتح اقوام کی تقلیدانہ پیروی کرتی ہیں۔ یہ دراصل انسانی نفسیات کی کمزوری ہے کہ جن غالب لوگوں کی تقلید و اطاعت پر وہ مجبور ہوتا ہے۔ ان میں غیر شعوری طور پر ایک غیر معمولی کمال کو مانتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ کمال اس مغلوب انسان میں منتقل ہو جائے۔ مغلوب افراد اور قومیں یہ نہیں سمجھتے کہ جو ہم پر غالب اور فاتح ہوئے ان کے غلبے کے پس منظر میں ایک خاص قانون کارفرما ہے۔ بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ غالب قوم کمالات میں ہم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ غلط فہمی مذہب و اعتقاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر غالب قوم کے تمام خیالات و افکار بلا سوچے سمجھے اپنانا ضروری سمجھ لیا جاتا،

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوب قومیں کھانے پینے، لباس پہننے اور اسلحہ تک کے استعمال میں ان قوموں کی تہذیب و تمدن کو اختیار کرلیتی ہیں اور یہ بھی نظرانداز کردیتی ہیں کہ ان کی اپنی تہذیب غالب قوم کی تہذیب سے برتر ہوسکتی ہے۔

"جب کسی سلطنت کے ساتھ عصبیت کے علاوہ مذہبی خیال اور عقیدے کا ملاپ بھی ہوجاتا ہے تو اس کی قوت و شوکت میں قبائلی عصبیت سے کہیں زیادہ استواری پیدا ہوجاتی ہے۔ کیونکہ مذہبی جوش و عقیدت نقطۂ نظر کو تمام دوسرے پہلوؤں سے ہٹاکر ایک ہی جگہ مرتکز کردیتی ہے۔ خواہشیں اور آرزوئیں بھی حق کا رُخ کرلیتی ہیں۔ اس طرح ان میں ایک خاص طرح کی بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔"

"اطراف سلطنت کو وسعت دینے کی بجائے حکومت کے مرکز کو مستحکم بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ کسی حکومت کا مرکز دل ہوتا ہے جس سے زندگی اور توانائی دوسرے اعضاء میں منتقل ہوتی ہے۔ اگر یہ استوار و مستحکم رہے تو دوسرے اعضا بھی استوار و مستحکم رہتے ہیں۔ اگر یہ کمزور ہوجائے تو دوسرے اعضا بھی کمزور ہوجاتے ہیں۔"

"کسی بھی ریاست میں اتنی لچک نہیں ہوسکتی کہ اسے جتنی چاہیں وسعت دے سکیں۔ اس کے پھیلاؤ اور وسعت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ حکومت چلانے والا ایک گروہ ہوتا ہے جو کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، مختصر و محدود ہوتا ہے۔ اگر اس گروہ کی قوت منقسم کردی جائے تو پھر اس کے لیے اپنی حدود کے اندر بھی حکومت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"پچھلی قوموں کی دیوہیکل عمارتوں، بلند و بالا محلات اور عظیم الشان ایوانوں کو دیکھ کر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں ان عمارتوں کے بنانے والے ہم سے کہیں زیادہ توانا، بلند و بالا اور مضبوط تھے۔ اور ہم سے بڑھ کر تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی ہم جیسے تھے۔ ہم سے مختلف نہ تھے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جو بڑی بڑی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بلند و بالا لوگوں کی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی تعمیر میں حکومت نے دولت صرف کی تھی۔"

بادشاہ اور حکمران کے اختیارات ایسے ہونے چاہئیں کہ اس پر کوئی عصبیت مسلط نہ ہو۔ تاکہ کوئی اس پر حکمرانی نہ کرسکے۔ اسے متاثر نہ کرسکے۔ اور وہ رعایا کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔

ٹیکس وصول کرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہو۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج اس کے احکام کی تعمیل کر سکے۔"

" ذہنی اور عقلی اعتبار سے حکمران کو غیر معمولی طور پر ذہین اور عاقل نہ ہونا چاہیے۔ حکمران اور بادشاہ کی اصل خوبی رحم اور شفقت ہے۔ زیادہ عاقل بادشاہ اپنے اقتدار کے حوالے سے دور کی کوڑی لاتا ہے۔ مختلف اندیشوں اور پیش بندیوں میں مبتلا رہتا ہے جو کبھی معرض وجود میں نہیں آتے۔ وہ رعایا پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ان پر شک کرتا ہے اور پھر ظلم کرنے لگتا ہے۔"

" حکومت کی تین شکلیں ہیں۔ ملوکیت، سیاست عقلی اور خلافت۔

ملوکیت میں بادشاہ کا عادل ہونا ضروری ہے۔ چونکہ وہ عصبیت کے بل بوتے پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس لیے ایسا ممکن ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی ایسا نکل آئے جو اس سے زیادہ عصبیت رکھتا ہو جس کا نتیجہ فساد اور بدامنی کی صورت میں نکلے گا۔ اس لیے یہ نظام بہتر نہیں۔ دوسرا نظام ایسے دنیاوی اور سیاسی قوانین کی بنا پر قائم ہوتا ہے جسے سب مانتے ہیں (یعنی جمہوریت) اس کے قوانین اور دستور کو قوم کے اکابرین مل جل کر بناتے ہیں۔ جب تک ان قوانین کا احترام باقی رہتا ہے۔ نظم و نسق چلتا رہتا ہے۔ لیکن جونہی یہ احترام اٹھتا ہے سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہ نظام سیاست عقلی کا نظام ہے۔

تیسرا نظام حکومت شرعی قوانین اور بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس میں انسان کا بھلا ہے۔ اسی میں اس کی دنیاوی اور دینوی بھلائی ہے۔ حکمران اور رعایا دونوں کے لیے اس میں ایک مساوی نظریہ فراہم کیا جاتا ہے۔ نری بادشاہت۔ عصبیت پر مبنی ہونے کی وجہ سے چل نہیں سکتی۔ سیاست عقلی نظام میں وہ روشنی موجود نہیں جو دین پیدا کرتا ہے اس لیے وہی نظام بہتر ہے۔ جو دینی ہے۔ اس نظام کو انبیاء علیہم السلام چلاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے خلفاء ان کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ یہ نظام خلافت ہے۔

" ظلم کی متعدد صورتیں ہیں۔ ظلم یہی نہیں کہ کسی کا مال و اسباب اور جائداد چھین لی جائے یا کسی کے قبضہ و اقتدار پر چھاپہ مارا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے کہ کسی شخص سے کسی کام کا بغیر کسی

استحقاق کے مطالبہ کیا جائے۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ لوگوں سے بیگار لی جائے۔ ان کی پوری محنت ادا نہ کی جائے۔

• عمل اور محنت کے بغیر نہریں، چشمے اور قدرتی سوتے تک خشک ہو جاتے ہیں کیونکہ یہاں بھی کھدائی کے لیے محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ زمین کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔ اگر تھنوں میں دودھ ہو لیکن دودھ دوہنے والا نہ ہو تو تھن سوکھ جاتے ہیں۔

• علوم و فنون کا حاصل کرنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔"

تحصیل علم میں حجابات سخت مضر اور نقصان رساں ہے وہ کتابوں کی کثرت اصطلاحات کی رنگارنگی اور نظریات کی بوقلمونی ہے۔

علم الکلام کا منصب و مقصد یہ ہے کہ عقائد ایمانی کو عقل کے ذریعے ثابت کیا جائے اہل بدعت کی تردید کی جائے۔

" ایمان کی بشاشت جب دلوں سے آشنا ہوتی ہے تو پھر ارتداد و انحراف کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایمان کی یہ کیفیت فطرت و جبلت کا روپ دھار لیتی ہے۔"

• فقہا اور صوفیا میں اعمال کا ایک باریک فرق ہے۔ فقیہہ اعمال کو اطاعت کی ترازو میں تولتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ عبادات صحیح طریقے سے ادا ہوئیں یا نہیں۔ صوفیا عبادات کو ذوق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ روح کو اس سے لذت اور ارتقا نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ گویا ان کا طرز عمل سراسر محاسبہ نفس پر مبنی ہے۔

ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر

ایڈورڈ گبن کے اس عظیم کارنامے "انحطاط و زوال رومۃ الکبریٰ" کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے دھیان اس کی خودنوشت کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ گبن نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھا ہے :-

'میں نے ایک سچے عاشق کی طرح آہیں بھریں اور ایک مطیع اور فرمانبردار بیٹے کی طرح باپ کا حکم مان لیا۔'

بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے اور اس سے دلچسپی ہے کہ گبن کی زندگی میں وہ کونسا ایسا دور آیا تھا کہ جب اسے ایک عاشق کی طرح آہیں بھرنی پڑیں اور اسے اپنے باپ کے حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ لیکن آج کی دنیا کا ہر معقول لکھا پڑھا شخص گبن کے عظیم ترین تاریخی شاہکار "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" کے حوالے سے اُسے جانتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ گبن تاریخ کے شعبے میں ایک بے مثل مقام رکھتا ہے۔ اس کی عظیم اور ضخیم تصنیف دنیا کی معدودے چند بڑی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اور مدّتوں سے پوری انسانیت اس کی اس فقید المثال کتاب سے فیض یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

گبن اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے :-

۱۵ اکتوبر ۱۷۶۴ء کا ذکر ہے۔ میں روم میں تھا اور قدیم دارالخلافے کے کھنڈروں

میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا۔ جب میں نے ننگے پیروں والے لوگوں کو جوپیٹر کے معبد میں مناجات گاتے دیکھا۔ یہ میرا تصور تھا جو مجھے اس دور میں لے گیا۔ تب میرے دل میں یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔" ۱۵ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال گبن کے جی میں آیا۔ یہ عظیم الشان کتاب جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۷ر جون ۱۷۸۷ء کو اپنی تکمیل تک پہنچی کتاب مکمل ہوئی۔ تو گبن نے عجیب طرح کا سکون محسوس کیا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب اس نے اس کتاب کی آخری سطور لکھیں۔ کتاب کے آخری پیرے میں اس نے لکھا کہ اس کا یہ کام اب مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی تکمیل میں اس کی زندگی کے تیس برس صرف ہوئے۔ اب وہ اپنا یہ کام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اتنے بڑے کام میں یقیناً کچھ خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ وہ بڑے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قارئین سے درگزر سے کام لینے کی استدعا کرتا ہے۔ یہ آخری سطور لکھنے اور ۲۷ر جون ۱۷۸۷ء کی تاریخ ڈالنے اور اپنے دستخط کرنے کے بعد گبن اپنا قلم ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ وہ اب اپنا عظیم ترین کارنامہ انجام دے چکا تھا۔

دنیا کا یہ عظیم مصنف، سکالر اور مورخ ایڈورڈ گبن ۲۷ر اپریل ۱۷۳۷ء کو پٹنی (برطانیہ) میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اس کے چھ بھائی بہن تھے جو سب انتقال کر گئے۔ زندہ رہنا صرف ایڈورڈ گبن کے مقدر میں لکھا تھا۔ کیونکہ اسے علمی دنیا میں ایک عظیم کارنامہ انجام دینا تھا۔

گبن نے اپنی زندگی کے حالات اپنی خودنوشت میں تحریر کیے ہیں۔ اس کی زندگی کی داستان ڈرامائی عناصر سے محروم ہے۔ لیکن وہ ایسا صاحب طرز لکھنے والا تھا کہ اپنی خاصی حد تک بے کیف زندگی کو بھی اس نے اس انداز میں لکھا ہے کہ اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ بن جاتا ہے۔ اس کی سوانح عمری کا سب سے بڑا وصف اس کی حقیقت بیانی ہے۔ وہ کہیں مبالغے سے یا اخفا سے کام لیتا ہوا نہیں ملتا۔ اپنی اس خودنوشت میں گبن ایک جگہ لکھتا ہے:

"میرے بارے میں خواہ کچھ لکھا جاتا رہے لیکن ایک بڑی حقیقت سے میں پوری طرح واقف ہوں۔ وہ یہ شعور ہے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو جس بہتر انداز میں میں بیان کر سکتا

ہوں ایسا کرنا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔"

اس کا یہ دعوے تعلّی اور مبالغہ نہیں ۔ بلکہ حقیقت ہے اور اس کی گواہی اس کی خود نوشت سے ملتی ہے ۔

بچپن میں گبن کی صحت زیادہ اچھی نہ رہی ۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنی خالہ سے حاصل کی ۔ جسے وہ اپنے "ذہن کی والدہ" کا نام دیتا ہے ۔ اپنی اس خالہ کی شفقت اور محبت کو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا ۔ بہر حال پندرہ برس کی عمر میں وہ مگیڈالین کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا ۔ یہاں اس کا جی نہ لگا ۔ بندھے ٹکے انداز کا نصاب اور طرز تعلیم اسے پسند نہ آیا ۔ بہرحال یہاں اس نے دینیات میں خاصی دلچسپی لی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی عمر کے سولہویں برس میں اس نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا ۔ وہ پیدائشی اعتبار سے پروٹسٹنٹ تھا ۔ اس نے کیتھولک عقیدے کو اپنا لیا ۔ جس کا اس کے باپ کو خاصا صدمہ ہوا ۔ اور اس کے باپ نے اسے سوئٹزرلینڈ بھجوا دیا ۔ یہاں ایک بورڈنگ ہاؤس میں اُسے رکھا گیا ۔ ایک سال کے عرصے میں اس مذہبی بورڈنگ ہاؤس میں اس نے پھر اپنے اندر تبدیلی محسوس کی ۔ یوں اس کا والد جو چاہتا تھا وہ پورا ہوا ۔ ایڈورڈ گبن نے کیتھولک عقیدے کو خیر باد کہا اور پھر سے پروٹسٹنٹ بن گیا ۔ اسی زمانے میں گبن نے بطور خاص اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا ۔ وہ بے تحاشا پڑھتا تھا ۔ تاریخ سے اُسے خاص شغف تھا ۔ اس عرصے میں اس نے تاریخ کے بارے میں جو مواد جمع کیا وہ حیرت انگیز تھا ۔ ای ایم فارسٹر نے گبن پر ایک مضمون لکھا ہے جو ای ایم فارسٹر کے مجموعے ABINGER HARVEST میں بھی شامل ہے ۔ ای ایم فارسٹر لکھتا ہے :۔

" اس نے اس دوران میں جو کتابیں پڑھیں ، جو نوٹس تیار کیے ، ان کی تعداد حیران کن ہے ۔ تاہم اس زمانے میں اسے مطلق علم نہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں پڑھ رہا ہے ۔ "

گبن نے جتنا مطالعہ کیا اور پھر جس انداز میں اپنی عظیم الشان کتاب "انحطاط و زوال رومتہ الکبریٰ" میں اسے برتا ۔ یہ اس اکیلے شخص کا اپنا ذاتی کارنامہ ہے ۔ کیونکہ وہ کسی کی رہنمائی کا قائل نہ تھا ۔ کسی نے اس کی رہنمائی کی ۔ کسی شخص کو گبن کے بارے میں یہ کہنے کی

جرات نہ ہوئی گرگبن نے زندگی کے کسی مرحلے میں اس سے کچھ اکتساب فیض کیا تھا۔ وہ اپنے عظیم اور فقید المثال کام کا تنہا سزوار ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب زندگی میں پہلی اور آخری بار گبن کے دل میں محبت نے اپنا جادو جگایا۔ وہ ایک جوان اور بہت معزز خاتون تھی۔ جس کا نام سوزان تھا۔ یہ خاتون ایک پادری کی بیٹی تھی۔ گبن نے اس سے ٹوٹ کر عشق کیا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں پھر اس کے والد نے اس کی شادی کی شدید مخالفت کی۔ ایک سچے عاشق کی طرح آہیں بھرنے والے گبن نے اپنے والد کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور پھر وہ ساری عمر غیر شادی شدہ رہا۔ اس خاتون کی شادی ایک ممتاز فرانسیسی ایم۔ بنکر سے ہوئی ہے۔ اور یہ خاتون ایک بیٹی کی ماں بنی جو آج عالمی ادب میں مادام ڈی سٹیل کے نام سے مشہور ہے۔

انگلستان واپس آکر گبن ہیمپ شائر ملیشیا میں کیپٹن بن گیا۔ اس کے اس دور کے بارے میں ای۔ ایم فارسٹر نے دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ جب یہ ملیشیا فوج توڑ دی گئی تو گبن سیر و سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اٹلی میں اسے اپنی یہ شہرہ آفاق کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ اور پھر وہ اس کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ سیر و سیاحت کے بعد وہ انگلستان آکر آٹھ برس تک پارلیمنٹ کا رکن بھی رہا۔ اپنی اس پارلیمانی زندگی کے بارے میں گبن نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

" میں اپنے دور کے نامور مقرروں سے بے حد مایوس ہوا اور بڑے مقرروں کی تقریروں سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اور میں نے کبھی پارلیمنٹ میں تقریر نہ کی۔"

۱۷۷۶ء میں جب اس کی عمر ۳۹ برس تھی۔ اس کی زندگی بھر کے کام کا نتیجہ لوگوں کے سامنے آیا۔ یہ " ڈیکلائن اینڈ دی فال آف دی رومن ایمپائر" کی پہلی جلد تھی۔ اس کتاب کی آمد تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔ اسے نقادوں، مورخوں اور قارئین نے ایک عظیم کارنامہ قرار دیا۔

پارلیمنٹ سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد گبن نے لوزان کا رخ کیا۔ لوزان۔ جہاں اس نے اپنی نوجوانی کے دن گزارے تھے۔ جہاں اس نے عشق کیا تھا۔ اب اس نے اپنے آپ کو دنیا سے بالکل الگ تھلگ کر لیا۔ اور اپنی کتاب کی تکمیل میں دن رات جٹ گیا۔ یہیں اس نے

اپنی اس عظیم تصنیف کو ۲۷ رجون ۱۷۸۷ء کو مکمل کیا۔ اور یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ میں نے اس کتاب کا جو ایڈیشن پڑھا وہ موڈرن لائبریری ایڈیشن ہے اور اسے سب سے مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ تین جلدوں میں گبن کے پورے کام کو سمیٹے ہوئے ہے۔

گبن کی اس بے مثل کتاب کی آخری تین جلدیں ۱۷۸۸ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۷۹۳ء میں گبن لوزان سے انگلستان پہنچا۔ اور یہیں لنڈن میں ۱۷۹۴ء کو اس کا انتقال ہوا۔

گبن کا یہ عظیم اور فقید المثال شاہکار ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کے چند بڑے اور ضخیم کاموں میں سے ایک ہے۔ روم کی ابتدا سے روم کے زوال تک کی داستان اس کے صفحات پر اس طرح سے سموئی ہوئی ہے کہ کوئی گوشہ تشنہ اور نامکمل محسوس نہیں ہوتا۔ وہ بہت بڑا صاحب اسلوب بھی تھا۔ اس کی کتاب کا مطالعہ ایک بڑے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ تجربہ ایسی زبان میں لکھا گیا ہے جو بے حد موثر اور خوب صورت ہے۔ عام طور پر مورخین کی زبان اتنی سادہ اور اتنی موثر نہیں ہوتی۔ لیکن گبن کی زبان بہت موثر اور تخلیقی نوعیت کی ہے۔

ابن خلدون یا دوسرے عظیم مورخوں کی طرح گبن نے فلسفۂ تاریخ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اپنے نظریۂ تاریخ پر کوئی خاص کتاب یا مقالہ لکھا ہے۔ لیکن اس کی اس عظیم الشان تصنیف کا مطالعہ کرنے والا ہر باشعور قاری اس کے نظریۂ تاریخ سے آشنا ہو سکتا ہے۔

دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا آغاز اور پھر زوال کی داستان لکھنے والے گبن کو عام انسانی تجربات اور اجتماعی علم سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اس اجتماعی انسانی علم کا بہت بڑا قدر داں تھا۔ اس کے اپنے الفاظ یوں ہیں۔

"BUT WHAT I VALUE MOST IS THE KNOWLEDGE IT HAS GIVEN ME OF MANKIND IN GENERAL."

اگرچہ وہ کسی رہنمائی کے بغیر ساری عمر پڑھتا اور علم حاصل کرتا رہا۔ لیکن اس کا علم بے نظیر

انسان پر انحصار کرتا تھا۔ یہ اس کا زاویہ فکر اور عقیدہ تھا۔ گبن سمجھتا ہے کہ محض پڑھ لینے سے ہی ماضی کی تشریح اور تفسیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ نہ جذبہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بلکہ گبن سمجھتا ہے کہ ایک مورخ کو ایک تعمیری صفت کا بھی مالک ہونا چاہیے۔ اور وہ صفت یہ ہے کہ ایک مورخ کے پاس یہ تصور بھی ہونا چاہیے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ لوگ جو خود مورخ نہ تھے۔ ان کا ان زمانوں میں کیا رویہ تھا۔ اگر مورخ اس خوبی سے متصف نہیں تو پھر وہ محض مردہ زمانوں اور لاشوں میں سفر کرتا ہے۔ ایک مورخ یہ تیسری خوبی کس طرح اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ گبن کے کے خیال میں یہ خوبی اس کے ذاتی تجربے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لیے ایک مورخ کا جینئس ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔

اور گبن بلاشبہ ایک جینئس تھا۔

اپنی اس عظیم تصنیف میں گبن نے اپنے ذاتی علم، ذاتی تجربے کی بنیاد پر صدیوں کا سفر کیا ہے۔ یہ سفر مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور انسانی تاریخ کے انتہائی اہم مراحل کا سفر ہے۔ اس سفر میں کیسے کیسے انسان اور کیسے کیسے معاشرے دامن کو جھٹک کر کھینچتے ہیں اس سفر میں وہ کتنے ہی گرد آلود چہروں سے گرد جھاڑتا ہے۔ کتنے ہی نامکمل واقعات کو تکمیل کی صورت بخشتا ہے۔ کتنے ہی علوم کو سامنے لاتا ہے۔ یہ سفر صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سفر جس کا اختتام ۱۴۵۳ء میں ہوتا ہے جب روم کا زوال مکمل ہو چکا ہے۔

اپنی عظمت اور ایک بے مثل علمی اور تاریخی کارنامے کی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ ہر باشعور انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن آج کے دور میں ذوقِ مطالعہ کم ہو چکا ہے اور پھر اتنی ضخیم کتاب پر کون سر کھپانے کو تیار ہوتا ہے۔ ان وجوہات کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم ہم مسلمانوں، تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے عالموں اور قارئین کو کم از کم اس عظیم کتاب کی آخری جلد کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

یہ آخری جلد (جو ماڈرن لائبریری کے ایڈیشن کی تیسری جلد ہے) وہ ہے جس میں گبن نے اسلام کے آغاز سے لے کر روم کے زوال تک مسلمانوں کے کارناموں اور تاریخ کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم تاریخ کو سمجھنے کے لیے

گبن کی کتاب "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" کے اس آخری حصے کا مطالعہ بے حد ناگزیر ہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں ہم دنیا کے ایک عظیم مورخ کے عظیم کارنامے سے متعارف ہوں گے وہاں اسلام کے حوالے سے اسلامی فتوحات اور اسلامی تہذیب کے بارے میں بھی اس کے بے مثل اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے بھی مستفید ہوں گے۔

ٹائن بی

اے سٹڈی آف ہسٹری

ہزاروں صفحات اور دس جلدوں پر مشتمل آرنلڈ ٹوئین بی کا عظیم کارنامہ "اے سٹڈی آف ہسٹری" عہد حاضر کی ایک عظیم ترین کتاب ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ مطالعہ صدیوں پر محیط ہے۔ اور بیسیوں انسانی تہذیبوں کا تجزیہ اور محاکمہ ہے۔ ٹوئین بی کی اے سٹڈی آف ہسٹری کے اثرات تاریخ کے فلسفے، نظریات پر بہت گہرے ہیں اور اس کتاب نے تاریخ کے بارے میں انسانوں کو نئے نظریات اور انکشافات سے متعارف اور روشناس کرایا ہے۔

آرنلڈ جے ٹوئین بی ۱۴ اپریل ۱۸۸۹ء کو لنڈن میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک معروف سماجی کارکن اور ٹوئین بی کی والدہ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ انگلستان کی ان چند اولین خواتین میں سے ایک تھی جنہوں نے کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی۔ ٹوئین بی اے نے پرانے انداز کی تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ میں لاطینی اور یونانی کلاسیک کا مطالعہ کیا۔ پھر وہ ایک برس کے لیے یونان چلا گیا۔ یونان میں ایک برس کے قیام کے دوران میں ٹوئین کو دو چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک تو امور خارجہ اور دوسرے قدیم تہذیبیں۔

انگلینڈ واپس آکر اس نے اپنی دونوں دلچسپیوں میں عملی اظہار کیا۔ اس نے آکسفورڈ میں قدیم تاریخ پڑھانے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے بین الاقوامی حالات پر لکھنا شروع کیا۔ اس نے اس زمانے میں انگلستان کے چیدہ چیدہ اخبارات و جرائد میں مضامین شائع کرائے۔ ۱۹۱۵ء میں اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک کا نام "دی نیو یورپ" تھا اور دوسری کا "نیشنلٹی اینڈ دی وار"۔

۱۹۱۵ء میں ہی ٹوئین بی نے برطانوی محکمہ خارجہ کے شعبہ پولیٹیکل انٹیلی جنس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس حوالے سے اسے ورسائی کے امن معاہدے میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ بعد میں ٹوئین بی لندن یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیا۔ وہ بازنطینی، یونانی زبانوں کے ادب اور تاریخ کا درس دینے لگا۔ ۱۹۲۵ء تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا رہا۔ بعد میں اسے یونیورسٹی نے بین الاقوامی تاریخ کے ریسرچ پروفیسر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس دوران میں ٹوئین بی نے یونانی اور ترکی کی جنگ کی وقائع نگاری "مانچسٹر گارجین" کے لیے کی۔ اور بعد میں اس نے اس جنگ کے حوالے سے ایک کتاب THE WESTREN QUESTION IN GREECE AND TURKEY بھی لکھی۔

ٹوئین بی کئی دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ بین الاقوامی امور اور خارجہ معاملات کے ضمن میں اس نے جو سروے مرتب کیے اور کتابیں تحریر کیں ان کی ایک اپنی اہمیت اور افادیت ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسے اہم ترین منصب سونپا گیا اور ٹوئین بی نے اپنے وطن کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

اے سٹڈی آف ہسٹری

۱۹۲۲ء میں ٹوئین بی نے اپنی اس عہد ساز عالیشان کتاب کے لیے نصف صفحے پر پنسل سے ابتدائی خاکہ تیار کیا۔ اس کے بعد وہ مسلسل نو برس تک اس کام کے سلسلے میں تحقیقات اور مطالعے میں مصروف رہا۔ اس کی پہلی تین جلدیں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد پانچ برس تک وہ مزید کام کرتا رہا۔ اور پھر ۱۹۳۹ء میں اس کی مزید تین جلدیں شائع ہوئیں اب چھ جلدوں میں یہ عظیم کام ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوا تو یہ تین ہزار چار اٹھاسی صفحات پر مشتمل تھا۔ بقایا چار جلدیں ایک طویل وقفے کے بعد ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئیں اور یوں ٹوئین بی کی یہ عظیم اور معرکتہ الآرا تصنیف ۲۶ برسوں میں مکمل ہوئی۔

جب اس کی پہلی چھ جلدیں شائع ہوئیں تو عوامی سطح پر ان کا خاص نوٹس نہیں لیا گیا۔ علماء کے طبقے میں اس کی اشاعت نے البتہ کچھ سنسنی سی پیدا کی۔ دراصل اتنے بڑے

اور ضخیم کام کا مطالعہ بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ تاہم اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اس عظیم تصنیف کا چرچا ہونے لگا تھا اور محدود ہی سہی۔ اس کو موضوع بنا لیا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ڈی۔ سی سومرویل نے ان پہلی چھ جلدوں کی تلخیص شائع کرائی۔ یہ تلخیص بھی بہت ضخیم تھی۔ لیکن اس تلخیص کے چھپتے ہی اس کا شہرہ مچ گیا۔ ۱۹۴۶ء۔ ۱۹۴۷ء کے سالوں میں اے سٹڈی آف ہسٹری کا یہ ایڈیشن اتنا مقبول ہوا کہ اس عہد کے بڑے بڑے لکھنے والے ناول نگاروں کے ناولوں سے کہیں زیادہ شائع ہو کر فروخت ہوا۔

ٹوئین بی کو روزانہ لکھنے کی عادت تھی۔ وہ جب تک جیا۔ ہر روز لکھتا رہا۔

اے سٹڈی آف ہسٹری میں ٹوئین بی نے انسانی تاریخ کی چھبیس تہذیبوں کا مطالعہ اور محاکمہ پیش کیا ہے۔ یہ چھبیس تہذیبیں ٹوئین بی کے خیال میں وہ تہذیبیں ہیں۔ جنہوں نے چھ ہزار برس میں انسانی تاریخ اور دنیا کی صورت گری کی۔

اس طویل و بسیط مطالعہ کا نتیجہ ٹوئین نے اپنی اس عظیم کتاب اے سٹڈی آف ہسٹری میں یہ نکالا ہے کہ :۔

"تمام تہذیبیں ایک ہی ڈھانچے کی تقلید کرتی ہیں اور ہر تہذیب کی نشوونما اور اس کے زوال کے اسباب تقریباً ایک سے ہیں۔ اور یہ اسباب وہ چیلنج ہیں۔ جن کا ان معاشروں اور تہذیبوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

اس ضمن میں ٹوئین بی نے تاریخ سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ "اے ہسٹری آف سٹڈی" میں وہ لکھتا ہے :۔

"ایک دور میں شمالی افریقہ کے صحرا زرخیز خطے تھے۔ جو شکاریوں کی ایک کثیر آبادی کی کفالت کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ خشک ہوتا چلا گیا۔ شکار وہاں سے بھاگ نکلا اور شکاریوں کو اپنے زمانے کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا کہ اب وہ کس طرح زندہ رہیں گے؟" ان شکاریوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس چیلنج کو نہ سمجھ سکا۔ وہ اپنے آپ میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھے۔ انہوں نے حالات کو سمجھے بغیر شکاری رہنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ یوں وہ لوگ جو اپنے زمانے میں تہذیب

یافتہ تھے، لیکن بعد میں محض "وحشی" بن کر رہ گئے۔

وہ لوگ جنہوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور انہوں نے مکمل طور پر اپنی زندگیوں کو تبدیل کر دیا وہ نیل کی وادی کا رُخ کرنے لگے۔ انہوں نے وہاں جنگلوں کو صاف کیا۔ زمین کو قابل کاشت بنایا۔ اور یوں اعلیٰ قسم کی زراعت کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ خوش حال ہو گئے۔ اور انہوں نے اس عظیم تہذیب کی بنیادیں رکھیں جو چار ہزار برس تک زندہ رہی۔

"اے سٹڈی آف ہسٹری" میں ٹوئین بی لکھتا ہے کہ ایک معاشرے اور تہذیب کو کئی طرح کے چیلنج ہوتے ہیں۔ جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب ایک چیلنج کے مقابلے میں سرخروئی حاصل ہو جاتی ہے تو ایک دوسرا چیلنج اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ٹوئین بی تاریخ سے مثالیں بھی فراہم کرتا ہے۔ ٹوئین بی لکھتا ہے:۔

مثلاً اہل ایتھنز کو لیجیے۔ پہلے پہل انہیں جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ ان کی زمین ناقص تھی اور آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ اہل ایتھنز نے اس چیلنج کا حل یہ نکالا کہ انہوں نے سمندر پار نئی کالونیوں کو بسانا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اسی حوالے سے ایک نیا چیلنج ان کے سامنے پیدا ہو گیا کہ اہل ایتھنز اپنی ان نوآبادیوں اور اہل سپارٹا کے ساتھ کس طرح کے تعلقات قائم کریں۔ چونکہ اہل ایتھنز اپنے اس مسئلے کو حل نہ کر سکے۔ اس لیے یہ عظیم تہذیب زوال سے دوچار ہوئی۔

قوموں اور تہذیبوں کی نشوونما، عروج و زوال کے حوالے سے ٹوئین بی نے جو نظریات اپنی اس عظیم اور عہد آفریں تصنیف میں پیش کیے ہیں عہد جدید کے بعض مؤرخوں اور تاریخ کے طالب علموں نے ان کے حوالے سے ٹوئین بی اور ابن خلدون کے نظریات میں خاصا اہم اشتراک پایا ہے۔ خود ٹوئین بی ابن خلدون کا بہت معترف اور مداح ہے۔ بعض مورخوں اور نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ کے بعد جو سب سے بڑا کام تاریخ کے علم و تجزیہ کے حوالے سے ہوا ہے۔ وہ ٹوئین بی کی تصنیف "اے سٹڈی آف ہسٹری" ہے۔

وہ قارئین جنہوں نے سو عظیم کتابوں کے اس سلسلۂ مضامین میں ابن خلدون کی عظیم تصنیف مقدمہ پر شائع ہونے والا مضمون پڑھا ہے۔ وہ مقدمہ اور اے سٹڈی آف ہسٹری پر چھپنے والے اس مضمون کے تقابلی مطالعہ سے ابن خلدون اور ٹوئین بی کے اشتراک نظریات کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ٹوئین بی 'اے سٹڈی آف ہسٹری' میں بتاتا ہے کہ تہذیبوں کو جن مشکلات اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ عسکری نوعیت کے کم ہوتے ہیں۔ بلکہ بیشتر چیلنج ، اس لیے جنم لیتے ہیں کہ انسانی استعداد ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔ انسانی استعداد۔ قابلیت ، فہم و شعور کو ٹوئین بی انسانی تہذیبوں کے عروج اور استقرار کے لیے بہت اہمیت دیتا ہے۔

کسی بھی تہذیب میں "سرچشمہ عمل" SOURCE OF ACTION فرد کی تخلیقی صلاحیت میں ہوتا ہے یا پھر چند افراد میں۔

ٹوئین بی نے مغرب کے زوال کی بھی نشاندہی کی ہے اور آخری عمر میں مشرق سے اُمیدیں وابستہ کر بیٹھا تھا۔ مغربی تہذیب کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہ اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد اب زوال آشنا ہو چکی ہے۔ یہ اپنے عہد کے روحانی مطالبات کو پورا نہیں کر سکی۔

ٹوئین بی کے نظریات پر اس کے معاصر اور بعد کے مؤرخوں اور ناقدوں نے خاصی تنقید بھی کی ہے۔ لیکن اے سٹڈی آف ہسٹری کے بارے میں یہ متفقہ فیصلہ دیا جا چکا ہے کہ مدتوں کے بعد ایک ایسی تصنیف شائع ہوئی ہے جس کے اثرات دیرپا اور بہت گہرے ثابت ہوئے ہیں۔

ٹوئین بی نے انسانی تہذیبوں اور تاریخ کے طویل سفر کا مطالعہ اور تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ "تاریخ کے مطالعے سے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جاتا۔"

لیویاتھن

تھامس ہوبز کا سن ولادت ۱۵۸۸ء ہے۔

وہ ان فلسفیوں اور مفکروں میں سے ایک ہے جو ایک طرف تو اصولوں کی دنیا میں بھٹک رہے تھے اور بعض اصولوں پر سختی سے عمل پیرا تھا اور دوسری طرف انہی اصولوں کے بارے میں شدید قسم کی تشکیک میں مبتلا تھے۔ تھامس ہوبز جسے اس کے اپنے زمانے میں رد کیا گیا اور جسے آج بھی رد کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ان فلسفیوں میں سے ایک ہے جن کی پیش کردہ سچائیوں کو دنیا کسی طور بھی جھٹلا نہیں سکتی۔

بیسویں صدی میں اس کی اہمیت میں خاص اضافہ ہوا۔ ۱۶۵۱ء میں اس کی سب سے اہم کتاب "LIVIATHAN" شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت نے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جو آج بھی جاری ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود ہماری اجتماعی فکر اور سیاسی نظریات و حالات میں اتنی تبدیلی نہیں ہوئی کہ ہوبز کی "لیویاتھن" کی اہمیت کو کم کیا جاسکے یا اس کے افکار کو کسی طور نظرانداز کیا جا سکتا ہو۔ وہ بعض ایسی مطلق سچائیوں کو پیش کرتا ہے جو بے حد خوفناک اور لرزہ خیز ہیں۔ لیکن بنی نوع انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔

ہوبز کو جیومیٹری سے بے حد شغف تھا۔ یہ شغف اتفاقی طور پر پیدا ہوا۔ اور پھر اسے جنون کی حد تک اس علم سے محبت ہو گئی اس علم کے اثرات کا سراغ اس کے نظریات اور خاص طور پر تھیوری آف ABSOLUTISM پر بہت واضح ہے۔

ہوبز نے سیاسی افکار کو کئی بار مختلف کتابوں میں قلم بند کیا۔ لیکن "لیویاتھن" اس کا

شہکار ہے۔ اور اس ایک کتاب میں اس کے تمام افکار و نظریات یکجا ہو گئے ہیں اور یہ وہ واحد کتاب ہے جو صدیوں سے آج تک اپنی فکری اور نظریاتی اساس کی بنا پر انسانی فکر و خیال کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

تمام تر اختلافات کے باوجود "لیویاتھن" کا آج بھی مطالعہ کریں تو ہم محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہ کتاب آج کے حالات پر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔

ہوبز کی پوری کوشش تھی کہ اس کی اس شہکار تصنیف میں کوئی خامی دکھائی نہ دے اس لیے اس کتاب کا آغاز، سیاسی حقیقتوں کے بیان سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت کے اظہار سے کیا جاتا ہے۔ ہوبز کا نظریہ ہے کہ حقیقت۔ ابدان کی حرکت پر مشتمل ہے۔ آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے کی پرواز اور انسانی ذہن میں آنے والے خیال کو انہی بنیادوں اصطلاحات میں ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

ہوبز بڑا اکٹر مادہ پرست ہے۔ حتیٰ کہ وہ خدا کے بارے میں بھی یہ سمجھتا ہے کہ خدا ایک خاص طرح کا جسم ہے۔ اس کے نظریے کی وجہ سے اس کی بہت مخالفت ہوئی اور اس پر ملحد اور دہریہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔

انسانوں کے بارے میں ہوبز کا خیال ہے کہ وہ انتہائی عمدہ مشینوں کی طرح ہیں۔ اس انسانی مشین کا دماغ پانچ حواس کے ذریعے اس کو معلومات فراہم کرتا اور اس کو زرخیز بناتا ہے۔ اس نے انسانوں کو پیچیدہ مشین قرار دے کر اس کا جو موازنہ مشینوں سے کیا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے۔ وہ سترہویں صدی کی صنعتی ایجادات اور مشینوں کو سامنے رکھ کر انسانی اعضا کی مثالیں دیتا ہے۔ مثلاً ہوبز کہتا ہے "دل کیا ہے؟ ... ایک سپرنگ۔ اعصاب اور پٹھے کیا ہیں بہت سی تاریں .... انسانی جسم کے جوڑ۔ پہیے ہیں۔ یہ سب مل کر انسانی جسم کو متحرک رکھتے ہیں۔

انسانی جسم کو اب بھی ایک جدید مشین ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کے اس دور میں البتہ اب اس کی مطابقت جدید ترین مشینوں کے پرزوں اور حصوں سے کی جا سکے گی سترہویں

صدی کے پرزے اور آلات تو بہت حد تک متروک ہو گئے لیکن ہوبز کا خیال زندہ ہے۔

ہوبز کا اعتقاد یہ ہے کہ انسانوں کی حرکات و اعمال پر ان کے جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ جذبات کو اندرونی تحرکات کا نام دیتا ہے۔ وہ ان جذبات کا ایک مفید اور کارآمد خادم بھی تلاش کر لیتا ہے جس کا نام وہ عقل رکھتا ہے۔ ہوبز کے نزدیک انسان اپنے اس خصوصی خادم، عقل کی وجہ سے ہی دوسرے جانداروں سے ممتاز اور ممیز قرار پاتا ہے اور اسی خادم کی بدولت انسان نے زبان ایجاد کی ہے۔ منطق فلسفے اور سائنس کا بانی موجد ٹھہرا ہے۔

لیویاتھن کے چند مختصر ابواب میں وہ فلسفے کے روایتی مسائل کا تذکرہ کرتا ہے۔ فلسفے اور انسانی نفسیات کی نئی تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی اصطلاحات بڑی سادہ ہیں۔ ان میں کسی طرح کا ابہام نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دلائل اور نظریات کو نہ صرف سچے بالکل راسخ سمجھتا ہے۔

ہوبز کے نزدیک انسان اپنے اندر بند ہے اپنے سانچے میں مقید۔ وہ دوسرے انسانوں کو نہ سمجھ سکتا ہے نہ ان کے مقاصد کو ہی پا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ شعور حاصل ہے کہ وہ زبان جس سے وہ دوسروں تک اپنی بات پہنچاتا ہے جو اس کے لیے ابلاغ کا اظہار ہے یہی زبان دوسروں کو دھوکہ دینے کے کام بھی آتی ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا جذبہ ہے جس سے اسے بے پناہ مسرت ہوتی ہے یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی کبھی تشفی نہیں ہو سکتی یہ جذبہ تفاخر ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں مقابلے میں برتر سمجھنے کا جذبہ اور اس وقت تو اس جذبے کی طمانیت اور شادابی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جب دوسرے بھی اس کی برتری کو پہچان لیں۔

اب یہی وہ بات ہے جسے ہم جدید زمانے کی اصلاحات میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا انسان جذبہ مسابقت میں بُری طرح مبتلا ہے وہ دوسروں پر ہر طرح سے چھانے کی تگ و دو میں ہلکان ہو رہا ہے۔

انسان کے بارے میں ایسے تصورات اور اعتقادات کو تسلیم کر لینے اور اس کے بارے میں بعض نظریات کو بنیاد بنا لینے کے بعد ہی ہوبز انسان کے حوالے سے ایک ریاست کا

ڈھانچہ تیار کرتا ہے اور یہیں بتاتا ہے کہ ریاست کیا ہوتی ہے اس ریاست کا سربراہ کیسا ہونا چاہیئے۔

فلسفے کی تاریخ میں جس انسانی ریاست کا نقشہ اور تصور ہوبز نے پیش کیا ہے وہ تمام تصورات سے زیادہ ہولناک اور لرزا دینے والا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر ریاست کا وجود نہ ہو تو فرد روحانی اور مادی طور پر نادار و مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانوں کے خوف ان کے اوہام اور ان کی ضرورتیں انسانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ریاست کو تشکیل دیں وہ لکھتا ہے:۔

"ریاست نہ ہو تو پھر نہ فنون ہوں نہ تحریر و تصنیف اور پھر ان سب سے بدتر یہ مسلسل صورت حال کہ انسان سدا خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ عدم تحفظ کا ڈر، تشدد کا خطرہ، بے وقت ناگہانی، غیر فطری موت اور پھر ریاست کے بغیر انسان کی زندگی، تنہا، ناکارہ، شرانگیز، وحشیانہ اور مختصر، چند روزہ"

سترہویں صدی کے فلسفی، علم الابدان کے ماہر، دانشور اور مفکر جب انسان کی بات کرتے تھے تو بعض وجوہات کی بنا پر عورت کو انسان کے حوالے سے منہا کر دیتے تھے۔ وہ عورت کو مرد کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے لیکن ہوبز کو اپنے پیشرووٴں اور ہم عصروں سے اس ضمن میں شدید اختلاف ہے وہ لکھتا ہے۔

"بہتر جنس اور صنف ہونے کی صورت میں مرد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مرد کی برتری کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ غلطی کرتے ہیں۔ کیونکہ مرد وزن کے درمیان طاقت کا توازن ہمیشہ مرد کے حق میں نہیں ہوتا۔ مرد وزن یکساں ہیں جو حق مرد کو حاصل ہے کسی تنازعہ اور اختلاف کے بغیر وہی حق عورت کو بھی حاصل ہے۔"

ہوبز سے پہلے اور اب بھی یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ بعض انسان اپنے حسب نسب اپنی بعض خوبیوں، صلاحیتوں اور قدامت پسند ہونے کی وجہ سے حکمرانی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ہوبز اس نظریے کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اس کا اظہار اس نے اپنی اس فکر انگیز اور زندہ رہنے والی کتاب میں کیا ہے۔ ہوبز کے خیال میں تمام انسان مساوی ہیں یہ وہ نظریہ ہے جو اس سے پہلے کے بعض بڑے فلسفیوں

کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اور بعض لوگ اسے سیاسی نعرہ بازی کا ایک حصّہ قرار دیتے ہیں۔ لاک، پین، روسو اسی نظریے کے علمبردار تھے۔ لیکن انسانوں کے مساوی اور ہم سر ہونے کی جو دلیل ..... ہوبز دیتا ہے وہ سب سے علیحدہ منفرد اور چونکا دینے والی ہے۔

وہ یہ نہیں کہتا کہ انسان اس لیے مساوی ہیں کہ ان کو فطرت نے مساوی پیدا کیا ہے اور خدا نے ان کو ایک سا بنایا ہے بلکہ ہوبز انسانی مساوات کی جو توضیح کرتا ہے وہ لرزا دینے والی ہے۔ وہ کہتا ہے "انسان اس لیے مساوی ہیں کہ انسانوں میں سے سب سے بڑے احمق اور کمزور ترین انسان کو بھی اگر مناسب مواقع ملیں تو وہ طاقتور ترین انسان کو قتل کر سکتا ہے۔" اس لیے سب انسان مساوی ہیں۔ !!

اپنی اس انوکھی، حیران کن، ہوشربا توضیح کے باوجود وہ انسانی مساوات کا قائل ہے۔ وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ انسانی عادات قائم و دائم رہنی چاہئیں۔ اس سے ریاست اور معاشرے میں امن برقرار رہ سکتا ہے۔

ہوبز ریاست کی فطری نشوونما میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود حکومت اور ریاست کے بغیر انسان دنیا کے مایوس ترین انسان ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

ہوبز اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ دنیا میں اشیاء کی کمی ہے اور ۔ وہ لکھتا ہے :۔

"اور اگر دو انسان ایک ہی چیز کے طالب ہوں اور وہ دونوں اس سے استفادہ نہ کر سکتے ہوں وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔"

یا پھر اس کے الفاظ میں اس چیز کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یا پھر ایک دوسرے کو۔

جہاں وہ یہ نظریۂ قلت پیش کرتا ہے اس کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے بہت سے مفکر اور فلسفی اس سے اتفاق کرتے ہوئے ملیں گے کہ اشیاء کی قلت اور کمی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے اپنے طور پر اس کی تاویلیں اور اس کا حل بھی پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہوبز کہتا ہے کہ یہ صرف اشیاء کی قلت ہی نہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بناتی ہے۔ بلکہ انسانوں کا جذبۂ تفاخر۔ انسانوں کا احساس برتری بھی ان کے درمیان،

منافقت اور تنازعہ پیدا کرتا ہے ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ دوسرا پہلے وار نہ کر جائے۔

ہوبز انسان کو ایک مضطرب اور بے سکون وجود قرار دیتا ہے وہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ

"انسان کو جو کچھ اور جتنا کچھ حاصل ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا وہ تو شان و شوکت اور بے پایاں کر و فر کے علاوہ کسی چیز سے اطمینان حاصل نہیں کرسکتا۔ اس حوالے سے ہوبز ہمیں بتاتا ہے اس انسانی صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو پھر۔

"زندگی ایک ایسی دوڑ کی طرح ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ۔"

"اس دوڑ کا نہ خاتمہ ہے نہ اس میں کوئی لمحہ آرام آتا ہے۔"

ہوبز کے ان نظریات اور ایسے دوسرے نظریات کے حوالے سے اس کے قارئین اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہوبز بنی نوع انسان کی تذلیل اور ہتک کا مرتکب ہو رہا ہے۔ لیکن اسے کیا کہیئے کہ جب سے "لیویاتھن" شائع ہوئی اور جب تک یہ کتاب کٹھرے میں کھڑی رہی اور ہر بار انسانی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ وقت نے دیا کہ۔ یہ کتاب اور اس کا مصنف۔ بے قصور ہے۔" !

ہوبز کہتا ہے کہ انسان خوف کی حالت میں اپنے جذبۂ تفاخر اور برتری کو بھول جاتا ہے۔ پھر وہ امن و سکون اور تحفظ کا خواہاں ہوتا ہے۔ "لیویاتھن" کے چودہویں اور پندرہویں باب میں ہوبز نے وہ انیس اصول وضع کیے جن سے انسان امن حاصل کر سکتا ہے۔

ان انیس[19] اصولوں میں دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان اپنے تحفظ کے خیال سے دستبردار ہو جائے۔ وہ اس حق کو ذہن سے نکال دے۔ اس کے ذہن میں ذاتی تحفظ کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا مخالف اور حریف سمجھتا ہے اس سے جو خطرہ اُسے ذہنی طور پر لاحق ہے وہ پیش بندی کرتا اور اس کے اندر تحفظ

کا قومی اور ذاتی جذبہ ابھارتا ہے۔ گویا جب انسان اپنے ذاتی تحفظ کے خیال کو دل سے نکال دے گا تو گویا وہ دوسرے انسان کے خلاف ذہنی عناد اور خوف کو ہی نکال دے گا یوں وہ سکون اور امن سے رہ سکتا ہے۔

اور وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے تحفظ کا حق ۔ ایک تیسرے فریق کو سونپ دینا چاہیے۔ یہ تیسرا فریق حکمران ہے یا حکمران طبقہ ۔!

یوں حکمران یا حکمران جماعت کا ہر عمل۔ گویا ہر فرد اور انسان کا عمل بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ حکمران یا حکمران جماعت کا وجود انسانوں کے تحفظ کے لیے معرض وجود میں آیا ہے۔

لیویاتھن کے قاری کو کتاب پڑھتے ہوئے کتنے ہی ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سوالات یقیناً ایسے ہیں جن کا جواب ہوبز کی اس کتاب میں موجود نہیں۔

ہوبز کہتا ہے کہ حکمران یا حکمران جماعت ۔ جو "حکم" دیتی ۔ جس چیز پر عمل پیرا ہوتی ہے وہ "جائز" ہے اور وہ حکمران یا حکمران جماعت کا عمل نہیں رہ جاتا ۔ بلکہ وہ "برا عمل بھی ہے"۔ گویا اگر حکمران یا حکمران جماعت مجھے سزا دیتی ہے تو در اصل میں خود ہی اس سزا کا سزاوار ہوں ۔ ہوبز کے ان خیالات اور اس منطق سے یقیناً شدید اختلافات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ "لیویاتھن" پڑھتے ہوئے بار بار ذہن کو شدید دھچکے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنے پڑھنے کو چونکانا اور صدمہ پہنچانا ۔ خود ہوبز کے پیش نظر تھا ۔ اور وہ پڑھنے والوں کے اس ردِ عمل سے محظوظ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔

اس کے باوجود اس کتاب میں جو انسانی صورت حال پیش کی گئی ہے ۔ وہ اتنی ہولناک اور تکلیف دہ نہیں ہے کہ بنی نوع انسان سے یکسر مایوس ہو جایا جائے ۔ "لیویاتھن" میں ہوبز جس ریاست کا تصوّر پیش کرتا ہے ۔ وہاں انسان محض ایک دوسرے سے حسد کرنے ، جذبۂ مسابقت کی تسکین کے لیے نہ ختم ہونے والی بے منزل دوڑ میں مصروف دکھائی نہیں دیتے ۔ بلکہ انسان اسی حالت امن اور سکون میں بھی رہیں گے اور یہی وہ

مدعا اور مقصد ہے۔ جو ہوبز ہمارے سامنے اس کتاب کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ وہ حکمران اور حکمران جماعت کی افادیت کو انسان اور ریاست کیلئے ناگزیر اور لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صرف جرائم پیشہ اور ملک کے غدار ہی ہوتے ہیں جو حکمران یا حکمران جماعت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ عام شہری تو حکمران اور حکمران جماعت کو اپنا محافظ قرار دیتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہوبز "حق" اور "جائز" کی اصطلاح کو اپنے ہی معنی میں استعمال کرتا ہے۔ جو خاصے پیچیدہ بھی ہیں اور چونکا دینے والے بھی۔

ہوبز کے نظریے کے مطابق انسان اپنے حقوق سے محض اس لیے دستبردار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگیں اور صحیح تحفظ تو حکمران یا حکمران جماعت ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ریاست کا وجود لازمی اور ناگزیر ہے۔ ریاست ہی اس کی بقا کی ضمانت دیتی ہے اور امن و سکون کی بھی، اور انسانی فنون، علوم اور فلسفے کی بھی۔

ہوبز کے پاس ریاست کا نہ تو فطری تصور ہے نہ مسائل کا کوئی فطری حل۔ وہ تو حکمران کو بے پایاں اختیارات سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ حکمران کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون سی کتاب شائع ہونی چاہیئے اور کون سی نہیں اور یونیورسٹیوں کا نصاب کیا ہونا چاہیئے۔ اور کیا پڑھایا جائے۔

اصل میں ہوبز آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب سے بڑا غیر مطمئن اور ناخوش تھا حتیٰ کہ وہ بعض کلاسیکی کتابوں کو بھی طالب علموں کے لیے ضرر رساں سمجھتا تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کی اپنی کتابیں بہتر نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں اور سیاسی تعلیمات کے حوالے سے تو اس کی کتابوں سے بہتر کتابیں ہیں ہی نہیں۔

"لیویاتھن" کی اشاعت پر نہ صرف اس کے ہم عصروں نے اس کے نظریے کی مخالفت کی بلکہ آکسفورڈ نے اس کی کتاب کو نصاب میں شامل کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بہتر تھی۔ بلکہ لیویاتھن کو ایک مخرب اخلاق گمراہ کن اور جعلی خیالات پر مبنی کتاب قرار دے کر اس کو سر عام نذر آتش بھی کیا گیا۔

ہوبز کی اہانت کا بازار اس حد تک گرم ہوا کہ ۱۶۶۶ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے لندن کی عظیم آتشزدگی کے واقعہ کے جو اسباب دریافت کیے ان میں ایک سبب ہوبز کی الحاد پرستی بھی تھا!

خدا کے بارے میں "لیویاتھن" میں ہوبز کے تصور کا ذکر ہوچکا ہے۔ لیکن اس کی کچھ وضاحت ضروری ہے۔ ہوبز منکرِ خدا نہیں تھا۔ وہ خدا کی تجسیم کا قائل تھا کہ کٹر مادہ پرست تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

"خدا ہے۔"

"لیکن ہمارے پاس وہ آلات و ذرائع نہیں کہ ہم یہ جان سکیں کہ وہ کیسا ہے؟ اور جب ہم خدا کے بارے میں اس کی ذات پر بات کرتے ہیں تو ہم اس کی تعریف و ثناء کرتے ہیں۔ اسے پوری طرح جان نہیں سکتے۔"

معجزوں اور خارق العادات کے بارے میں بھی ہوبز کے نظریات نے مذہبی حلقوں اور عام انسانوں میں اس کے مخالفین اور دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔

"لیویاتھن" میں ایک لرزہ خیز حقیقت کو بڑے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کا صحیح شعور تو ہم بیسویں صدی کے انسانوں کو ہی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے میں نے کہا تھا کہ ہوبز آج کا فلسفی ہے۔ وہ قدیم بھی ہے اور جدید ترین بھی۔ ہوبز کی راست فکری سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ جو سمجھتا تھا اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرتا تھا وہ کسی طرح کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ جھوٹی امیدوں کے چراغ جلاتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ ہم اپنے تحفظ کے لیے کسی حکومت یا حکمران کی پناہ لیتے ہیں۔ لیکن تمام تر اصولوں اور تحفظات کے باوجود حکمران یا حکمران جماعت کی بے انصافی کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ یہ فطری حقوق، صورت حال کا محاسبہ اور اس طرح کی تمام پیش بندیاں اور تحفظات بے معنی ہیں۔ کیونکہ ظلم اور تشدد، بے انصافی اور جبر کے خلاف کسی طرح کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

"POWER TENDS TO CORRUPT AND ASOLUTE POWER CORRUPT ABSOLUTELY"

ہوبز کے نظریات زندہ ہیں۔ انہیں بیسویں صدی کی عالمی سیاست نے سچ ثابت کر دکھایا ہے اس کے اثرات عالمگیر ہیں۔ جب ولیم گولڈنگ کا ناول "LORD OF THE FLIES" چند دہائیاں پہلے شائع ہوا اور اسے عالمگیر شہرت نصیب ہوئی تو نقادوں نے اس پر جو تبصرے کیے ان میں لکھا کہ اس پر ہوبز کے فلسفے کا شدید اثر ہے۔ اور ہوبز کے نظریات اس دور کی صحیح عکاسی اور تفسیر پیش کرتے ہیں۔

"لیویاتھن" مارکس کے ماننے والوں کیلئے بھی ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ موجودہ عالمی سیاسی صورت حال میں اگر ہوبز کے نظریات صحیح قرار پاتے ہیں تو پھر مارکس نے جس ریاست کا تصور پیش کیا وہ ایک خواب کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح "لیویاتھن" جمہوریت پسندوں کے لیے بھی ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ ہوبز ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے موجودہ جمہوری معاشرے ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور متصادم ہیں کہ یہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑ نہیں سکتے۔

ٹریکٹیس تھیالوجیکو پولیٹکیس

۴۴ برس کی عمر میں وہ دنیا میں تنہا اور اکیلا رہ گیا تھا۔
اس کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ بینائی زائل ہو رہی تھی۔ دنیا کا یہ ایک اہم ترین فلسفی عدسوں (LENSES) کی رگڑائی اور چمکائی کر کے اپنی روزی کماتا تھا۔ ایسے حالات میں بھی جب اسے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفے کے شعبہ کی سربراہی کی پیشکش کی گئی تو اسپینوزا نے اسے مسترد کر دیا۔
وہ کسی کا احسان اس لیے نہ لینا چاہتا تھا کہ اپنی سوچ، اپنے نظریات پر وہ کسی بھی طرح کی پابندی کو پسند نہ کرتا تھا۔
بینیڈکٹس ڈی اسپینوزا۔ ڈچ فلسفی ۲۴ نومبر ۱۶۳۲ کو ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ وہ پرتگیزی یہودیوں کے خاندان کا فرد تھا۔ پیدائشی یہودی۔ پرتگال میں اس زمانے میں یہودیوں پر مسیحیوں نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس کا باپ سزا سے بچنے کے لیے نیدرلینڈ بھاگ آیا تھا۔ یہودیوں کی صعوبت، سخت گیر اور راسخ روایات کے تحت خالص یہودی انداز میں اسپینوزا کی تعلیم کا آغاز ہوا لیکن لڑکپن میں ہی اسپینوزا نے کٹر اور راسخ العقیدہ خیالات کی بجائے آزادانہ فکر کو اپنا لیا۔ وہ بڑا بے باک اور نڈر تھا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے میں ہی اپنے ساتھی طالب علموں میں ایسے خیالات کا پرچار شروع کر دیا۔ جو یہودی مذہب اور عقائد کی شدید ترین نفی کرتے تھے۔ اس نے یہودیوں کے بڑے بڑے مقدس عالموں اور دینی رہنماؤں کی تعلیمات پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے دعوے کیا کہ ان

بڑے یہودی دینی اور مذہبی عالموں سے زیادہ تو ایک طالب علم دینیات اور طبیعات کے بارے میں علم رکھتا ہے۔

چونکہ اسپینوزا نے منافقت اختیار نہ کی تھی اس لیے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے ہوئے اسے یہودیوں نے اپنے دین اور حلقے سے خارج کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اسپینوزا نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ دنیا میں ملنے والی ہر چیز اور آسودگی سے محروم ہونے کے باوجود وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی دنیا میں یہودیوں کو سرے سے شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ یہودی اپنی جماعت کے فرد کی حیثیت سے ہی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اسپینوزا نے ہر مخالفت کا وار سہا۔ اس کے ہم مذہبوں نے عیسائی حکام کو رشوتیں دیں کہ کسی طرح اسپینوزا کا منہ بند کیا جا سکے۔ لیکن وہ ناکام رہے اصل میں اس زمانے کے یہودیوں کو اسپینوزا سے دوہرا نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ یہودی ہونے کے باوجود یہودیوں کے عقائد کا مذاق اڑا رہا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ جن خیالات و نظریات کا اظہار کر رہا تھا وہ عیسائیت کے بھی خلاف جاتے تھے۔ یہودی جن کی سماجی حیثیت اس زمانے میں صفر کے برابر تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ عیسائی کہیں اسپینوزا کے خیالات کو یہودیوں کے نظریات سمجھ کر یہودی جماعت کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اس لیے انہوں نے اسپینوزا کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اسپینوزا کی ڈھٹائی دیکھیے کہ وہ یہودی عبادت گاہوں میں جاتا اور وہاں اپنے نظریات اور خیالات کا پرچار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہودی اسے اپنی جماعت سے خارج نہ کریں۔ بلکہ اس کے نظریات کو قبول کر لیں۔ چونکہ ایسا نہ ہوا اور اسپینوزا کا کوئی بیان، صفائی اس کے کام نہ آیا تو اسے یہودی مذہب سے خارج کر دیا گیا۔

اب وہ اکیلا، تنہا انسان تھا۔ اس وقت اس کا ایک مسیحی دوست فرانسس وان ڈیمین اینڈن اس کے کام آیا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ کیونکہ اسپینوزا کا اب کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے اسے صلاح دی کہ وہ بچوں کو پڑھایا کرے۔ پھر عدسوں (LENSES) کی رگڑائی اور چمکائی کا کام بھی اسپینوزا نے سیکھ لیا اور وہ اسی پیشے سے منسلک رہ کر

روزی کماتا رہا۔

وہ فلسفے کا مطالعہ کرتا رہا۔ عبرانی زبان پر پوری دسترس حاصل کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے اردگرد دینیات کے کچھ طالب علموں کو جمع کرکے ایک حلقہ بنالیا۔ جہاں فلسفے اور دین کے موضوعات پر بات چیت ہوتی۔ لیکن یہاں بھی اسپینوزا کی بڑی مخالفت ہوئی ۱۶۶۶ء میں وہ رنز برگ چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنے نظریات پر مبنی کچھ رسالے لکھے جو خدا، آدمی اور خدا کے وجود کے بارے میں تھے۔ پھر اس نے وہیں اپنی کتاب ETHICS (اخلاقیات) کا ایک بڑا حصہ مکمل کیا۔ ۱۶۷۰ء میں وہ دور برگ اُٹھ آیا۔

۱۶۷۰ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب " رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات (TRACTATUS - THEOLOGIOCO - POLITIEUS) شائع کیا۔ اس پر کسی کا نام درج نہ تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد وہ ہیگ چلا آیا جہاں اب اس کے ہم خیالوں کا ایک معقول حلقہ پیدا ہو چکا تھا۔ رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات کی اشاعت نے بڑا تہلکہ پیدا کیا۔ اس کے پانچ ایڈیشن یکے بعد دیگرے پانچ برسوں میں شائع ہوئے یورپ میں اس کا شہرہ ہوا۔ اس کی حمایت اور مخالفت میں ایک طویل بحث کا آغاز ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

۱۶۷۲ء میں جب فرانس نے ہالینڈ پر حملہ کرکے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اسپینوزا نے اس قتل و غارت گری کے خلاف آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک بڑا بورڈ بھی تیار کیا جسے نصب کرکے اس کے پاس کھڑا رہ کر وہ قتل و غارت گری کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے دوست ڈان ڈر سپائکس نے نہ صرف اسے اس ارادے سے باز رکھا بلکہ اسپینوزا کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا۔ لازمی بات ہے کہ اگر اسپینوزا احتجاج کے لیے نکلتا تو ہلاک کر دیا جاتا یوں اس کے دوست نے اپنی حکمتِ عملی سے اس کی جان بچالی۔ اس کے رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات " کو سرکاری اور اجتماعی طور پر مذمت کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ جو یہودی مذہب کا ناقد تھا۔ اس کی اس کتاب کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ایک یہودی اور شیطان کی تصنیف ہے۔

اس کی دوسری تصنیف اخلاقیات ہے۔ جسے وہ مختلف ادوار میں مکمل کرتا رہا۔ اسپنوزا کو ہائیڈل برگ میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ بننے کی دعوت دی گئی۔ لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ اسپنوزا نے ساری عمر مصیبتیں سہتے ہوئے کاٹ دی۔ اپنی روزی کمانے کے لیے اس نے جو پیشہ اختیار کیا۔ اس نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ لیکن وہ ساری عمر کسی کا احسان مند نہ ہوا۔ ۲۰ر فروری ۱۶۷۷ء کو وہ انتقال کر گیا اس کی عمر صرف پینتالیس برس تھی!

اس نے جو رسالہ صرف سیاسیات کے بارے میں لکھا تھا وہ اس کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔

اسپنوزا کا فلسفہ

اسپنوزا کو اس کی تصنیف "اخلاقیات" اور "رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات" کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے بہت کم عمر پائی۔ اور جتنا عرصہ زندہ رہا لوگ اس کی مخالفت کرتے اور مصائب میں اضافہ ہی کرتے رہے۔ اس کے باوجود اس کے نظریات اور افکار کو بہت طویل عمر حاصل ہوئی ہے۔ اور آنے والے ہر دور میں فلسفے کے شعبے میں اس کے نظریات و افکار کے حوالے سے بات ہوتی رہے گی۔ اس نے اپنے بعد کی نسلوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ دنیا کے عظیم ترین فلسفیوں میں شمار ہوا۔ اس کی کتابوں کے دنیا کی ہر بڑی زبان میں تراجم ہوئے۔ "اخلاقیات" اور "رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات" نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ جس کے اثرات موجودہ دور کے افکار پر بے حد واضح ہیں۔ اسپنوزا سے اختلاف کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اتنا بڑا فلسفی ہے کہ اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

اسپنوزا ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اپنی ناپائیداری اور باہمی دشمنیوں کے باوجود کس طرح پرامن زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انسان اس کے نزدیک جذبات سے سب سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ لیکن جذباتی ہونے کے باوجود انسانی قوانین کی پابندی کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان جذباتیت کو ترک کر دے۔ منطق اور سائنسی اندازِ فکر کو اپنائے۔ اسپنوزا

کا نظریہ ہے کہ اخلاقیات اور مذہب ۔ انسانی ترقی میں بہت کم اور حقیر کردار ادا کرتے ہیں معاشرے اور سماج کو سمجھنے کے لیے اقتدار کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ ریاست ایک ایسا فن ہے جو اطلاقی نفسیات کی پیداوار ہے ۔ استحکام کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو انسانوں کے عقلی رویوں اور تجربات کے مظہر ہوں ۔

انسان ۔ خواہشات کا پلندہ ہے ۔ انسان جنگ سے بھاگتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ایک فطری ریاست قائم کرے ۔ وہ اس فطری ریاست میں اپنی ذات کا تحفظ چاہتا ہے ذاتی مفاد کی بنیاد اگر عقل پر ہو تو پھر انسانوں کا اجتماعی رویہ ایک خود مختار ریاست کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ اپنے انفرادی مفاد اور اجتماعی رویے کے اظہار کے باوجود انسان اپنے حقوق کو کھونے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا ۔ ایک دانا سربراہ حکومت اپنی رعایا کے مفادات کا نگہبان ہوتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ " ذہنوں کے اتحاد اور یکجائی " کو حاصل کر سکے ۔

اسپینوزا کا ' فطری قانون ' کا نظریہ بے حد اہم ہے ۔ وہ خدا کو ' عالمی فطرت ' کے مساوی قرار دیتا ہے ۔ اس میں انسان کا فطری حق ، فطری اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرتا ہے ۔ وہ قوانین جو فطری انسان کے لیے تیار کیے جاتے ہیں ۔ وہ عقل پر مبنی ہوتے ہیں ۔ اسپینوزا کے ہاں عقل (REASON) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ وہ زور دیتا ہے کہ کسی بھی سیاسی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو یہ آزادی دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عقل کا استعمال و اظہار کرے ۔ اسپینوزا کے نزدیک اور قابل اطمینان اور تسلی بخش ریاست وہ ہے جو نہ صرف انسان کو تحفظ فراہم کرتی ہے بلکہ اسے دانشورانہ آزادی بھی بخشتی ہے ۔ اگر روشن خیال شہریوں کی ضرورت ہے تو پھر کسی بھی شخص کی رائے کو دبانا اور کچلنا نہیں چاہیے ۔ ایک ایسا شخص جو عقل و شعور اور روشنی سے بہرہ مند ہے ۔ وہ یقیناً اس آزادی سے بہتر ہے ۔ جسے اپنی حالت کا مناسب احساس نہیں اور وہ صرف اپنے جذبات کے رحم و کرم پر زندہ ہے ۔

اسپینوزا تحمل، بردباری، مذہبی آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ریاست اور مذہب کو یکجا کرنے کا مخالف ہے وہ انہیں علیحدہ علیحدہ حیثیت دیتا ہے۔ وہ مذہبی توہم پرستی، ضعیف عقائد کو ظلم وجبر اور عدم تحمل کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

اسپینوزا کی تصانیف اخلاقیات اور "رسالہ دربارہ دینیات وسیاسیات" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رسالہ دربارہ دینیات وسیاسیات نے بطور خاص انسانی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسپینوزا نے مذہبی عنصر کو بے وقعت تو قرار نہیں دیا لیکن وہ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ عقل (REASON) کو اہمیت دیتا ہے۔ وجدان کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ بڑی جذباتیت اور ناقابل اعتماد ہے۔

"رسالہ دربارہ دینیات وسیاسیات" نے فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اس کتاب کے نظریات وافکار اپنی اشاعت کے وقت بھی فکر انگیز اور تہلکہ خیز ثابت ہوئے تھے۔ اور آج جب کہ اسپینوزا کو دنیائے فکر کے عظیم معماروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے افکار ونظریات زیر بحث رہتے ہیں۔ فلسفے کے نظریات کی تاریخ میں اس کے نظریات اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ فلسفے کی دنیا میں اسپینوزا کو ایک لازوال مقام اور مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔

ذیل میں اس کے فکر انگیز رسالہ" دربارہ دینیات وسیاسیات کی تلخیص دی جا رہی ہے۔

"ٹریکٹیٹس تھیالوجیکو۔پولیٹیکس" کی تلخیص

فطرت کو یہ مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی قوت۔ فطرت کی قوت ہے۔ خدا جسے کہ تمام چیزوں پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس لیے ہر فرد کو یہ مکمل حق حاصل ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک فرد کے حق کی حدود بے پایاں ہیں۔ ان کو مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک مطلق قانون اور حق فطرت ہے

کہ انسان جیسا چاہے، اپنے آپ کو اس حالت میں برقرار رکھے۔ اپنے تحفظ کے لیے اس کے لیے کسی دوسری چیز کا خیال کرنے کی۔ ماسوائے اپنے۔ ضرورت نہیں ہے۔ یہ مطلق قانون اور حق فطرت ہر فرد پر اطلاق کرتا ہے کہ وہ جیسے اور فطری صلاحیتوں کے تحت عمل کرے۔

فرد کے اس فطری حق کا حصول معقول عقل کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ خواہشات اور طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ فطری طور پر تمام انسان اس کے اہل نہیں ہیں کہ وہ قوانین اور عقل کے اصولوں پر عمل کر سکیں۔ ہر شخص لاعلم اور بے شعور پیدا ہوتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر سکیں۔ اور اپنے اندر عقل پیدا کر سکیں تو خواہ ان کی تربیت اور پیدائش اچھے حالات میں ہی کیوں نہ ہوئی ہو، وہ اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ بسر کر چکے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنے آپ کو نامہ رکھے اور جس حد تک ممکن ہو سکے جذباتیت کے بغیر اپنی حالت کو برقرار رکھے فطرت انسان کو جو اس کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں بخشتی۔ عقل کے تحت زندگی بسر کرنے کی بجائے انسان فطری طور پر خواہشات اور اقتدار سے متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ انسانوں کا ذہن منور نہیں ہوتا۔ وہ قانون فطرت کے تحت زندہ رہتے ہیں۔ اس لیے ایک بلی بھی مجبور ہے کہ وہ اسی طرح قانون فطرت کے تحت زندگی بسر کرے جس کے تحت ایک شیر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

اس کے باوجود۔ خواہ کچھ ہی ہو ایک فرد اپنے لیے کارآمد اور مفید باتیں سوچ سکتا ہے۔ خواہ اس کی یہ سوچ فطرت کی بخشی ہوئی ہو یا اس کی خواہشات کے دباؤ کا نتیجہ ہو۔ بہرحال فرد کا یہ مطلق حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہترین حالت میں زندہ رکھ سکے اس کے لیے وہ چالاکی، فریب اور طاقت سے بھی کام لیتا ہے فرد ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہے جو اس کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

انسانوں کے لیے یہ ناگزیر اور لازم ہے کہ وہ محفوظ اور پرسکون زندگی بسر کرنے کے لیے اس پر متفق ہوں کہ فطرت نے فرد کی حیثیت سے ان کو جو حق دیا ہے وہ اس کا احترام کریں۔ اس طرح انسان ایک بہتر اجتماعی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انسانوں کے لیے ضروری

ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کریں کہ ان کی زندگی پر کسی دوسرے فرد کی خواہشوں اور طاقت کا اثر نہ ہو۔ اگر انسان خواہش اور آرزو کو اپنا رہنما بناتے ہیں تو وہ کبھی پرسکون اور بہتر زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر ہر شخص کی اپنی ہی سمت ہوگی۔ اس لیے انسانوں کو انفرادی طور پر فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ہر معاملے میں عقل کو اپنا رہنما بنائیں گے اور ہر ایسی خواہش کو کچل دیں گے جس سے ان کے ہم جنسوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے انہیں اپنے ہمسائے کے حقوق کا بھی اسی طرح تحفظ کرنا چاہیئے۔ جس طرح وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔

جمہوریت ایک ایسی سیاست ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سماج اور معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام تر اختیارات کا استعمال اجتماعی اور کُل کی صورت میں کرتا ہے۔ لیکن خود مختار قوت کو کسی قانون کے تحت روکا نہیں جاتا بلکہ ہر شخص ہر معاملے میں اس کی استطاعت کرتا ہے۔ یہ فطری اختیار جو ہر انسان کو حاصل ہوا ہے اسے انسان عقل کے ذریعے اس معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے وہ اسے تقسیم نہیں کرتا تاکہ ریاست تباہ نہ ہو جائے۔ اس فطری اختیار کے حوالے سے فرد عقل کی احتیاج کو معاشرے کی ضرورت کے مطابق پورا کرتا ہے۔ احکام کی اطاعت میں جو اعمال رونما ہوتے ہیں وہ بہت حد تک آزادی کو متاثر کرتے ہیں لیکن یہ احکام کسی انسان کو غلام نہیں بنا سکتے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ تمام اعمال کی غرض وغائت کیا ہے۔ اگر مقصد ریاست کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے اور اس کے ایجنٹ کی بھلائی اس کا مقصود نہ ہو تو پھر ایک ایجنٹ ایسا غلام ہے جو اپنی بھلائی نہیں چاہتا ہے۔ وہی ریاست آزاد ترین ہوتی ہے جس کے قوانین عقل پر استوار ہوں اس لیے اس معاشرے کا ہر فرد اگر چاہے۔ اگر ارادہ کرے تو وہ آزاد رہ سکتا ہے۔ اسی طرح کہ وہ عقل کی مکمل رہنمائی میں اپنی زندگی کو ڈھال لے۔

کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنا اختیار، قوت اور حق کسی دوسرے کو منتقل کر دے کیونکہ ایسا ہونے سے وہ انسان ہی نہیں رہتا۔ اس طرح کوئی طاقت کبھی اتنی خود مختار اور مطلق نہیں ہوتی کہ جس کے بل بوتے پر ہر خواہش ممکن ہو سکے۔ اس لیے کسی شخص کے دل میں اس چیز سے نفرت پیدا نہیں کی جا سکتی جسے وہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی

اس کو وہ چیز پسند کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے جو اسے ناپسند ہو۔ فطرت کا قانون اور اصول انسانوں کو ہر خوف سے آزاد کرتا ہے اور جو قانون فرد کے دل میں خوف پیدا کرے وہ فطری نہیں ہوتا۔

کسی ریاست کے استحکام کا دارومدار اس کے باشندوں کی وفاداری پر ہے کہ وہ تسلسل اور مستقل مزاجی سے ان احکام کی اطاعت کرتے ہیں جو غیر مبہم اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ تجربے اور عقل پر استوار ہوتے ہیں۔ شہریوں اور باشندوں کو یہ سکھانا کہ وہ کس طرح احکام کی اطاعت کرتے ہوئے اس سے وفادار رہ سکتے ہیں۔ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ حکمران اور رعایا دونوں انسان ہوتے ہیں اور ان دونوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ لالچ سے اجتناب کریں۔ وہ ان گنت لوگ جو آسودہ اور مطمئن زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل کی بجائے جذبات کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ یہ جذبات ہی ہیں جو ہر ادارے کو اخلاق باختہ اور رشوت خور بناتے ہیں اور جذبات کی رہنمائی میں ہی انسان عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی تحریک حاصل کرتا ہے جب انسان سود و زیاں کو معیار بنا کر سوچنے لگے تو وہ جذبات کا اسیر ہوتا ہے۔ جذبات ہی اسے اکساتے ہیں کہ وہ اپنے جیسے انسانوں سے دغا کرے اور ان کی رہنمائی حاصل کرنے سے انکار کر دے۔ اپنے سے بڑے اور اونچے عہدوں پر فائز لوگوں کی شہرت اور رتبے سے حسد کی وجہ سے اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کی تباہی کا سبب بنے۔

ان تمام برائیوں کے خاتمے اور ہر طرح کے دھوکے کے غلبے سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے لیے ایسے اداروں کو تشکیل دینا ہوگا۔ جن سے متعلق ہر وہ شخص خواہ کسی بھی رتبے پر فائز ہو وہ اپنے ذاتی فائدے کی بجائے اجتماعی بھلائی کو ترجیح دے۔ کسی شخص کا ذہن اور دماغ مکمل طور پر کسی دوسرے کی تحویل میں نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی بھی فرد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ عقل آزاد اور اپنے فیصلے کے فطری حق کو دوسرے کی طرف منتقل کر سکے یا کسی کو اس کے لیے مجبور کر سکے۔ اس لیے وہ حکومت جو لوگوں کے ذہنوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے ظالم و جابر ہے۔ غیر فطری ہے اور وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے اپنے باشندوں کے حقوق کو سلب کرتی ہے۔ فرد کے اپنے اعتقادات خواہ کیسے ہوں۔ وہ خدا کی جس

طرح چاہے عبادت کرتا ہو اس میں مداخلت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اگر ان پر کوئی چیز ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ ان کے حقوق کی نفی کے مترادف ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان خود بھی چاہے تو اپنے فطری رجحان کو یکسر ختم نہیں کر سکتا۔

ایک حکمران کی قوت اور اس کا اختیار خواہ کتنا ہی لا محدود اور بے پایاں کیوں نہ ہو خواہ وہ قانون اور مذہب کا معتقد ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ فرد جو فیصلہ اپنی دانش کے ذریعے یا صحیح اکر اپنے جذبات کے حوالے سے کرتا ہے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے یہ درست ہے کہ ایسے تمام لوگوں اور رعایا کو حکمران اپنا دشمن سمجھے گا جو اس کی رائے اور فیصلے سے متفق نہیں ہیں۔ لیکن ہم اس وقت فرد کی آزادی کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ فرد کے فیصلے اور رائے سے جتنا اختلاف حکمران کو ہو وہ اپنی جگہ لیکن حکمران کو فرد کی رائے اور فیصلے کو کچلنے کا کوئی فطری حق اور اختیار حاصل نہیں۔ ایک حکمران تشدد کر کے حکومت کر سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایک حکمران کو جو اختیار ملے ہیں وہ اس کی قوت کے مطابق محدود ہوتے ہیں۔

ہر شخص اپنے خیالات کا مالک ہے۔ یہی اصول فطرت ہے کسی حکومت کا مقصد اور غائت یہ نہیں ہوتی کہ وہ حکمرانی کرے اس بات سے خوفزدہ رہے کہ احکام کی پوری تعمیل نہ ہو گی، تو لوگ مطیع نہ ہو سکیں گے۔ حقیقت میں ایک حکومت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کو ہر طرف سے آزاد کر دے تاکہ وہ ہر ممکنہ تحفظ کے ساتھ زندگی بسر کر سکے یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہ فرد اپنے فطری حق کو توانا کر سکے۔ اور اس طرح زندگی بسر کرے کہ نہ اسے خود اپنے آپ سے تکلیف پہنچے نہ دوسرے کو۔ حکومت کی غرض و غائت کسی بھی عقلیت پسند فطری انسان کو جانور یا کٹھ پتلی بنانا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کو اس قابل بنانا ہوتا ہے کہ وہ پورے تحفظ کے ساتھ زندہ رہتے ہوئے اپنی عقل و دانش کو بروئے کار لا سکیں دراصل حکومت کا منشا و مقصد ہی آزادی ہے۔

۔۔۔ چونکہ انسان کے آزادانہ فیصلے عموماً متضاد ہوتے ہیں اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ وہ اکیلا ہی سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے گفتگو اور احساسات میں کبھی اتحاد اور یک رنگی

پیدا نہیں ہوتی۔ یوں امن کو برقرار رکھنا مشکل اور ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا یہ حق خود ہی ترک کر دے کہ اسے سب کچھ اپنی آزادانہ رائے اور فیصلے کے مطابق کرنا ہے لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ وہ اپنی آزاد عقل کو بھی ترک نہ کرے۔

اس کی مثال کچھ اس طرح دی جا سکتی ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص ہے جو سمجھتا ہے کہ فلاں قانون عقل کے منافی ہے۔ اس لیے اسے تبدیل کیا جانا چاہیے۔ ایسا سوچنا اور ایسا کہنا چاہیے۔ اس کا فطری حق ہے اسے چاہیے کہ وہ متعلقہ قانون سازوں اور منصفوں تک اپنی بات مناسب انداز میں پہنچائے۔ وہ اس دوران میں قانون کے برعکس اپنی زندگی بسر کرتے ہوئے وہ غیر عقلی انداز اختیار نہ کرے جب ایسا شخص ریاست کے احترام کو برقرار رکھے تو حکومت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے شخص کا احترام کرے اور اس کے اعتراض پر عقل کے مطابق غور کرے لیکن وہی شخص حکومت پر بے انصاف ہونے کا الزام لگانے لگے۔ اور لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکانے لگے اور وہ کسی بھی رائے سے پہلے ہی اس قانون کو توڑ دے تو میرے نزدیک وہ شخص محض ایک احتجاجی اور باغی ہے۔ اس طرح ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کس طرح اپنی آزادی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے نظریے کی اس طرح تبلیغ کر سکتا ہے نہ تو ان حکمرانوں کے اختیار کو مجروح کرے اور نہ ہی امن عامہ کو متاثر کرے۔

اپنی فطری حالت میں جو شخص عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے وہی بے حد توانا اور آزاد شخص ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے باشندوں اور رعایا پر مشتمل حکومت ہی توانا اور آزاد ترین ہوتی ہے جس کی رہنمائی عقل کرتی ہو۔

انسانوں کی اکثریت اندھے جذبات کی تابع ہوتی ہے عقل کی نہیں اس لیے انسان کا وہ فطری اختیار اور حق محدود ہو جاتا ہے جو فطرت کی ودیعت ہے۔ !!!

افلاطون

ری پبلک

" اندھاپن " بینائی کو تباہ کر دیتا ہے۔ کہر فصلوں کو غارت کر دیتا ہے اور گھن لکڑی کو کھا جاتا ہے اسی طرح عجیب و غریب خامیاں انسانی روح کو تباہ کر دیتی ہیں۔ یہ خامیاں بے انصافی غیر معتدل مزاجی، بزدلی اور جہالت ہیں۔ کیا یہ خامیاں اور برائیاں انسانی روح کو تباہ کر سکتی ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں، یہ روح کی لازوال صفت کو کبھی تباہ نہیں کر سکتیں۔ یہ اس طرح روح کو نہیں گھلا سکتیں۔ جس طرح بیماریاں انسانی جسم کو تباہ کر دیتی ہیں لیکن یہ خامیاں انسانی وجود کی موت کا سبب ضرور بن سکتی ہیں۔ برائی روح کو تباہ نہیں کر سکتی کیونکہ روح لازوال ہے۔

" انصاف ۔ ہی انسان کے لیے بہترین انعام اور صلہ ہے انسانی تقدیر خواہ وہ کتنی ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو وہ بھی دراصل انسان کی بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ دیوتا انسانوں کو چاہتے ہیں موت کے بعد کی زندگی جو انسان کا انتظار کرتی ہے وہ انسان کے لیے سب سے بڑا صلہ اور سب سے بڑا انعام ہے۔"

افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "ری پبلک" میں ایک فلسفی حکمران کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ انصاف اور علم کو سب سے بڑی خوبی اور صفت قرار دیتا ہے۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ "ری پبلک" کے حوالے سے ہمارے لیے ایک ایسی مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جہاں انصاف اور علم کی حکمرانی ہے۔

افلاطون دنیا کا وہ عظیم فلسفی ہے جس کا نام ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود دنیا

کے ہر خطے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اپنے دور افتادہ دیہات میں نکل جائیے وہاں بھی لوگ باتوں باتوں میں کسی کا ذکر کرتے ہوئے کہیں گے کہ وہ بڑا افلاطون ہے۔" اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ یہ افلاطون کون تھا ؟ تو وہ اس کا جواب نہ دے سکیں گے۔

افلاطون کے مکالمات اور بالخصوص "ری پبلک" کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے اس کو تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں ری پبلک کا ترجمہ نہ ہوا ہو اور ری پبلک کے حوالے سے فلسفیوں اور دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ برٹرنڈ رسل نے لکھا تھا کہ اتنی صدیاں بیت گئیں لیکن انسانی فکر و دانش پر افلاطون اور ارسطو کے خیالات و افکار اتنے گہرے ہیں کہ انہیں انسانی فکر کی مرکزیت حاصل ہو چکی ہے۔

افلاطون کی "ری پبلک" اور خود اس کی اپنی ذات اور اس کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس دور کے یونان کے عمومی حالات اور بالخصوص سقراط کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا ان ریاستوں میں کارنتھ، سپارٹا اور ایتھنز کی ریاستیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایتھنز علم و ادب اور تہذیب کا مرکز تھا۔ اس کا رقبہ سات سو مربع میل تھا۔ اور آبادی ساڑھے تین لاکھ کے قریب تھی۔ ایتھنز کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کی یا کم از کم یورپ کی پہلی جمہوری ریاست تھی۔

۴۳۱ ق۔م میں سقراط کی عمر ۴۰ برس تھی۔ اس وقت ایتھنز پر سپارٹا، کارنتھ اور تھیبز نے حملہ کیا تھا اور ایتھنز ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی۔ یہ جنگ ۴۳۱ ق۔م سے ۴۰۴ ق م تک لڑی گئی۔ اس دوران میں ایتھنز کا دستور کئی بار بدلا گیا۔ ایتھنز میں پہلے ایک معتدل چند سری (OLIGARCHY) حکومت بنی پھر محدود جمہوریت کا دور آیا۔ جس کے بارے میں ارسطو کا خیال ہے کہ اس سے بہتر جمہوریت ایتھنز کو پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ یہ محدود جمہوریت۔ غیر محدود جمہوریت میں تبدیل ہوئی۔ اس طرح کے الٹ پھیر کا نتیجہ یہ نکلا

کہ سوفسطائی طبقے کو عروج حاصل ہوا یہ سوفسطائی حکماء معاوضہ لے کر لوگوں کو درس اور لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا ایک ہی کام تھا پرانے خیالات پر تنقید اور نئے خیالات کو بغیر تنقید و تحقیق کے تسلیم کر کے ان کی مدح کرنا۔

یہ وہ ماحول اور پس منظر تھا جب ۴۳۱ ق۔م میں افلاطون پیدا ہوا۔ اس وقت سقراط چالیس برس کا ہو چکا تھا۔ افلاطون کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس حیران کن انداز میں وہ صدیوں سے دنیا بھر میں مقبول ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہیئے تھیں۔ مگر افلاطون کے بارے میں بھی ہمیں پوری تفصیل سے حالات معلوم نہیں۔ بہرحال۔ وہ ایک بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ باپ کی طرف سے اس کا رشتہ ایتھنز کے بادشاہوں اور ماں کی طرف سے سولن سے جا ملتا تھا۔ سولن کو قانون سازی اور حکمرانی کے اصولوں کو ترتیب دینے کے ضمن میں عالمگیر لاثانی شہرت ملی ہے۔

افلاطون پہلے تو کریٹلس کا شاگرد رہا جو ہیراکلیٹس کے فلسفہ تغیر کا معتقد تھا۔ اس کے بعد افلاطون نے کچھ عرصہ ابن الوقت سوفسطائیوں سے بھی تعلیم حاصل کی وہ ان کے طلسم میں گرفتار رہا۔ مگر بعد میں وہ ان کا شدید مخالف بن گیا۔ جس کا ثبوت "مکالمات" میں ملتا ہے۔ جب سقراط سے افلاطون کا رابطہ ہوا تو افلاطون کی دنیا ہی بدل گئی۔

سقراط کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ اسے خبطی اور سنکی سمجھتے تھے مگر نوجوانوں میں وہ بے حد مقبول تھا۔ سقراط کا مخصوص انداز تعلیم بھی ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ علمی استدلال اور جرح۔ سقراط زمانہ سازی سے کوسوں دور تھا۔ وہ مروجہ مذہب پر بھی اندھا اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ وہ ساری عمر حق گوئی اور حق پرستی کا جویا رہا افلاطون کی زندگی اور افکار کو سقراط نے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ مگر حقیقی معنوں میں افلاطون ذہنی اور روحانی طور پر سقراط کا اس وقت معترف اور سچا مداح بنا جب سقراط نے زہر کا پیالہ پیا۔ سقراط پر الزام تھا کہ وہ مروجہ مذہب کا قائل نہیں تھا اور سنگین ترین الزام یہ تھا کہ وہ نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ سقراط چاہتا تو زندگی بچانے کے لیے معافی مانگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔

جب سقراط نے زندان میں زہر پیا تو افلاطون بیمار تھا۔ سقراط کی موت کے بعد افلاطون اتنا بد دل ہوا کہ وہ ایتھنز میں نہ ٹھہر سکا۔ اور جگار راچلا گیا۔ کئی برس تک اٹلی، سائرین، سسلی اور مصر میں گھومتا رہا۔ اس زمانے میں اسے غلام بنا کر بیچ دیا گیا اور بڑی مشکل سے اس کی رہائی اور آزادی ہوئی۔ ایتھنز واپس آکر افلاطون نے ایک اکادمی کی بنیاد رکھی۔ جہاں ۴۰ برس تک فلسفہ اور ریاضی کا مفت درس دیتا رہا۔ وہ ساٹھ برس کا تھا جب اس نے ریپبلک لکھی جس میں اس نے فلسفی حکمران کا تصور پیش کیا۔ اس تعلیم اور افکار کو آزمانے کا اسے موقع بھی ملا۔ سیراکیوز میں ان دنوں ڈایونیسس ایک نوجوان حکمران تھا۔ ۳۰ برس کی عمر میں وہ بادشاہ بنا تھا۔ افلاطون کو دعوت دی گئی کہ وہ سسلی آکر نوعمر حکمران کو تعلیم دے اور اس کا اتالیق بنے افلاطون بڑی خوشی سے سسلی گیا مگر نوجوان بادشاہ ڈایو جلد ہی علمی دماغ سوزی سے گھبرا گیا۔ افلاطون کو واپس آنا پڑا۔ دوسرے برس وہ پھر سسلی گیا۔ مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد افلاطون کی زندگی اپنی اکادمی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے گزر گئی۔ ۳۴۷ ق۔م میں ۸۱ برس کی عمر میں افلاطون کا انتقال ہوا۔

افلاطون کا فلسفہ جو بحر بے کنار کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایک دریا کی طرح تھا سقراط کی سیرت اور افکار کو سمجھے بغیر افلاطون کو سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ سقراط کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔

۴۱۱ ق م میں سقراط کی عمر ۶۰ برس تھی۔ اس کی بیوی ژان تھیپ کی بدمزاجی کا شہرہ آج سارے عالم میں ہے۔ وہ زیور علم سے عاری تھی۔ سقراط کی گھریلو زندگی ناخوشگوار تھی۔ سقراط کی کچھ ذاتی ملکیت تھی۔ جس کی آمدنی سے گھر چل رہا تھا۔ سقراط کا سارا وقت تحقیق و تعلیم میں گزرتا تھا۔ وہ کتابوں کا رسیا تھا نہ ہی اسے لکھنے سے کوئی دلچسپی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علوم سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ چلتے ہوئے، ٹہلتے ہوئے، بازاروں میں، جمنازیم اور تفریح گاہوں میں نوجوانوں کو تعلیم دیتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ابن الوقت سوفسطائیوں کا سب سے بڑا حریف تھا۔ جو پیسے لے کر غلط تعلیم دیتے تھے جب کہ سقراط کوئی معاوضہ نہ لیتا تھا۔ سقراط کی تعلیمات کو اس کے اپنے دو اقوال میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

"اپنے آپ کو پہچانو۔"

"نیکی علم ہے۔"

سقراط مردِ حق تھا۔ وہ بے پناہ اخلاقی جرأت کا مالک تھا۔ ۳۹۹ ق-م میں اہلِ ایتھنز کی جیوری کے سامنے پیش کیا گیا جو ۵۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ تین اشخاص خطیب لائکن ایک معمولی شاعر ملیٹس اور بارٹر رہنما اناٹنس نے سقراط پر الزام لگایا تھا کہ وہ پرانے دیوتاؤں کا قائل نہیں اور نئے دیوتاؤں کو مانتا ہے اور نوجوانوں کا اخلاق بگاڑتا ہے جیوری کے پانچ سو افراد میں سے بیشتر سقراط کی علمی استدلال پر مبنی جرح کے زخم خوردہ تھے۔ فیصلہ سقراط کے خلاف ہوا اور تعجب ہے کہ صرف ۶۰ افراد کی اکثریت سے ہوا۔ ایتھنز کے دستور کے مطابق سقراط کو صفائی کا موقع دیا گیا۔ سقراط نے نہ تو الزام کی صداقت کو قبول کیا نہ معافی مانگی۔ سقراط نے اپنی سزا میں تخفیف کی اپیل کے بجائے یہ مطالبہ کیا کہ اس نے اہلِ ایتھنز کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اس کے صلے میں اسے ایوانِ بلدیہ میں معزز مہمان کا رتبہ دے کر رکھنا چاہیئے۔ جیوری کے افراد اس مطالبے سے مزید برہم ہوئے۔ سقراط نے انتہائی بے پروائی سے اپنی موت کا حکم سنا، زندان میں سارے دن اطمینان سے گزارے اس کا شاگرد کرائیٹو زندان کے داروغہ سے سودا کر چکا تھا کہ سقراط کو فرار ہونے دیا جائے۔ لیکن سقراط نے جان بچانے اور فرار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی تعلیم اور قربانی کو یوں رائیگاں کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔

افلاطون نے سقراط کو لازوال شہرت بخشی وہ مکالمات افلاطون کا بنیادی اور مرکزی کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کو جو شہرت بخشی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ افلاطون سقراط کے حوالے سے فلسفے کا ایک شاندار نظام مرتب کرتا ہے۔ جس کا فیض پوری دنیا کو پہنچا اور ہمیشہ پہنچتا رہے گا۔ مسلمانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے افلاطون کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر کے دوبارہ زندگی بخشی۔

افلاطون پر سقراط کی موت کا گہرا اثر ہوا۔ اس اثر کے تحت اس نے لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا اور غالباً افلاطون کے سامنے ابتدا میں یہ مقصد تھا کہ وہ اپنے استاد کے خیالات کی تفسیر

محفوظ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرے۔

افلاطون کے مکالمات میں "بیان صفائی"، "کرائٹو" اور "فیدو"۔ سقراط کے بارے میں ہیں۔ جن میں سقراط کا بیان صفائی، اور اس کی زندان میں زندگی کے آخری ایام اور موت کو پیش کیا گیا ہے۔

افلاطون کے دیگر مکالمات میں "لائیسس" اور "پروٹاگورس" سقراط کے مخصوص اندازِ جرح کے بے مثل نمونے ہیں۔ ان مکالمات میں سقراط کے ان فلسفیانہ افکار و خیالات کی ترجمانی کی گئی۔ جنہیں افلاطون نے براہ راست سقراط سے اخذ کیا۔ لائیسس کا موضوع راستی ہے۔ یوتھائیفرو کا "دینداری" اور "پروٹاگورس" سوفسطائیوں کے فلسفے کے بارے میں۔

"سمپوزیم" میں افلاطون آگے بڑھتا ہے۔ وہ کلیات جن پر علم کی بنیاد ہے۔ اب محض منطقی تصورات نہیں رہتے بلکہ اعیان یعنی اشیا کے کامل نمونے بن جاتے ہیں جو محض ہمارے ذہن میں داخلی وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ عالم مثال میں بھی خارجی وجود رکھتے ہیں۔

یہ نظریۂ اعیان۔ افلاطون کا اپنا نظریہ اور اپنا فلسفہ ہے اس کا کوئی تعلق سقراط کے افکار سے نہیں ملتا۔ افلاطون کہتا ہے کہ دنیا کی اشیاء بذاتِ خود محض ان اعیان کی پرچھائیاں ہیں اور اسی حد تک اصلیت رکھتی ہیں جس حد تک ان میں اعیان کی جھلک ملتی ہے۔

افلاطون کا مکالمہ "فدیاسس" حسن و عشق کے بارے میں ہے اور سمپوزیم کا موضوع بھی یہی ہے۔

افلاطون کے مکالمات میں سے اہم ترین "REPUBLIC اور LAWS" ہیں۔

ارسطو۔ افلاطون کا شاگرد تھا جو دنیائے فلسفہ میں بعد میں اس کا سب سے بڑا حریف بنتا ہے۔

افلاطون شاعر بھی تھا اور ایک عظیم صاحب طرز ادیب بھی۔ اس نے اپنے افکار اور فلسفے کو مکالمے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ بعض ناقدوں نے افلاطون کے مکالمات میں یونانی ڈرامے کے بھرپور عناصر کو بھی تلاش کر کے سراہا ہے۔ بہر حال مکالمات کا انداز ڈرامائی ہے فلسفیوں میں جیسا اسلوب افلاطون کا ہے ایسا اسلوب کسی کے ہاں نہیں۔ افلاطون سمجھتا تھا

کہ سقراط کی تعلیمات و فلسفہ کا اظہار خطبات اور عام نثری اسلوب میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سقراط جس عملی طریقۂ استدلال سے جرح کرتا ہے اس کے لیے تو مکالمے کی صنف کو ہی اختیار کرکے سقراط کی سیرت اور افکار سے انصاف کیا جاسکتا تھا۔

یوں افلاطون نے اپنے فلسفے کو مکالمات کے انداز میں پیش کیا جو ایک منفرد ڈرامائی اور موثر اسلوب ہے۔

افلاطون اور "ری پبلک" ہر دور میں موضوع بحث رہے ہیں۔ اردو میں اغلباً اس کا پہلا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا جو بعد میں بھارت کے صدر بھی رہے ہے۔ عام قارئین کے لیے اس کا ایک ترجمہ ستار طاہر کا کیا ہوا ہے جس میں یہ التزام برتا گیا ہے کہ ہر ذہنی سطح کا قاری اس سے استفادہ کرسکے۔

"ری پبلک" دس ابواب یا حصوں پر مشتمل ہے جن کو کتابوں (BOOKS) کا نام دیا گیا ہے۔ پہلی کتاب میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ انصاف کیا ہے؟ سقراط اپنے علمی استدلال پر مبنی جرح کو جاری رکھتا ہے۔ راستی، روح، بڑھاپے اور ایسے دوسرے موضوعات پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے۔ ان دس کتابوں میں افلاطون اپنے تمام بنیادی افکار کا اظہار کرتا ہے۔ علم، جہالت نیکی، بدی، مثالی ریاست، مثالی حکمران جو اس کے نزدیک صرف فلسفی ہوسکتا ہے علم اور انصاف کو وہ سب سے برتر درجہ دیتا ہے۔ علم و فنون، شاعری اور دیگر موضوعات بھی زیر بحث آتے ہیں۔ اور یہ بھی فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ ایک مثالی ریاست میں شاعر کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ شاعر۔ ہومر جیسا ہو۔ شجاعت اور دیوتاؤں کی بزرگی کو موضوع بناتا ہو تو پھر اس کا وجود ریاست کے لیے ضرر رساں نہیں۔ ایک مثالی ریاست میں بچوں اور شہریوں کو کیسی تعلیم ملنی چاہیے۔ اس کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

غار کی وہ مشہور تمثیل جس پر صدیوں سے لکھا گیا اور جس کی کتنی ہی تفسیریں کی گئی ہیں وہ بھی "ری پبلک" میں موجود ہے۔

افلاطون کے پورے فلسفے اور بالخصوص "ری پبلک" میں افلاطون ہر ایسے سوال کو اٹھاتا ہے جس کا کسی نہ کسی صورت میں انسان کو اپنی زندگی میں سامنا کرنا پڑتا ہے

وہ حیات بعد الممات کے مسئلے کو بھی اپنی آخری کتاب میں پیش کرتا ہے۔ افلاطون کے ساتھ اختلاف ممکن ہے اور اختلاف کیا بھی گیا ہے مگر افلاطون کا کمال یہ ہے کہ وہ جو سوال اٹھاتا ہے اس کا واضح ثبوت بھی فراہم کرتا ہے افلاطون ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم کس طرح صحیح معنوں میں فکری انداز میں اپنے آپ کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ "ری پبلک" کے حوالے سے وہ انصاف کی روح کو تمام انسانوں میں زندہ کرنا چاہتا ہے۔ علم اور نیکی کی تلقین دیتا ہے اور ایک ایسی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جو عملی طور پر تو کبھی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن جس کے خصائص اور عناصر کو اگر انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنایا جائے تو انسانی زندگیوں میں ایک مثبت تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

افلاطون کے زمانے میں یونان میں طبقہ اناث کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی خواتین عموماً ان پڑھ اور علم سے محروم ہوتی تھیں۔ عورتوں کو کمتر سمجھا جاتا تھا۔ مگر افلاطون جب اپنی مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے تو وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ فوجی قیادت کے شعبے کو چھوڑ کر زندگی کے دیگر تمام شعبوں کے دروازے عورتوں پر کھول دینے چاہئیں۔ افلاطون مرد اور عورت کو مساوی تصور کرتا ہے۔ وہ انہیں ایک دوسرے سے کمتر یا برتر نہیں سمجھتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا اپنا شاگرد ارسطو اس سلسلے میں اس سے شدید اختلاف رکھتا ہے اور عورت کو مرد سے کمتر درجہ دیتا ہے۔

"ری پبلک" کا مطالعہ ایک بہت بڑے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس نے بنی نوع انسان کے افکار پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور یہ بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ "ری پبلک" کو ہمیشہ پڑھا جاتا رہے گا۔ اور اس سے دنیا ہمیشہ فیض اٹھاتی رہے گی۔

سیاسیات

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہوں نے پوری انسانیت کے ذہن کو غور و فکر پر آمادہ اور متاثر کیا ہوتا ہے ایسی کتابوں پر دنیا کی مختلف زبانوں میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا ہے اور ان کتابوں کے بارے میں بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابیں لافانی ہیں اور ان کتابوں پر ہمیشہ نقاد، محقق اور اہل الرائے اپنے اپنے زمانوں میں کام کرتے رہیں گے۔ ایسی کتابوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے چاہتا تھا کہ ایک علیحدہ ابتدائی اور تمہیدی مضمون لکھوں جس میں اپنی معروضات پیش کروں۔ بہرحال اس مضمون کے بغیر ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اب مضمون کی تو گنجائش نہیں رہی لیکن چند معروضات مختصراً پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جن سو بڑی کتابوں کا میں نے انتخاب اس سلسلۂ مضامین کے لیے کیا ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار دنیا کی سو بڑی اور عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ بڑی اور عظیم کتابوں کی فہرست ایک سو سے بھی بڑھ کر ہو سکتی ہے مگر جو انتخاب میں نے کیا ہے اس کے بارے میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کتابوں کی بڑائی، اہمیت اور عظمت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

ان سو بڑی کتابوں پر مضامین لکھتے ہوئے اور لکھنے سے پہلے بھی مجھے از خود بعض دشواریوں کا احساس ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ ان مضامین کی حیثیت تعارفی مضامین کی ہو گی۔ ان کتابوں پر دنیا بھر میں جو کام ہوا ہے اس کا پورا احاطہ کرنا میرے لیے کسی طور بھی ممکن لیکن ان کتابوں کے حوالے سے جو اہم کام میری نظر سے گذرا ہے اس کی طرف اشارہ کرنا میں نے ضروری سمجھا ہے۔

ان مضامین کے حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کتابو کے موضوع، ان کی اہمیت

ان کے اثرات اور ان کے مصنفین اور خالقوں کے مختصر حالات زندگی ان مضامین میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھیں گے اور کوشش کی جائے گی کتاب کا بنیادی موضوع اور اس کی روح پڑھنے والوں تک منتقل کرنے کی سعی کی جائے۔

ان مضامین کو لکھتے ہوئے میں نے دو خاص باتوں کی طرف دھیان دیا ہے اور اس میں ان مضامین کو لکھنے کا مقصد بھی یہی دو خاص نکات ہیں۔

ایک تو یہ کہ اردو پڑھنے والا ہر سطح کا قاری ان لافانی کتابوں سے بھرپور انداز میں متعارف ہو سکے اور دوسرے یہ کہ

ان مضامین کے حوالے سے ان قارئین کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ خود ان کتابوں کا مطالعہ کریں۔

ارسطو نے انسانی فکر و فلسفہ پر جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس طرح سے ان کا فلسفہ صدیوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے اور بنا رہے گا۔ اس کے حوالے سے اس کی کسی ایک کتاب کا انتخاب خاصا کڑا کام ہے۔

ارسطو کی ایک تصنیف POETICS بوطیقا ہے جو فن شاعری اور المیہ ڈرامے پر دنیا کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کتاب کو ارسطو کی اہم ترین تصانیف میں سے ایک سمجھا جاتا ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ 'بوطیقا' کا شمار بھی دنیا کی سو بڑی کتابوں میں ہونا چاہیے اس کتاب نے شاعری، ڈرامہ کے بارے میں صدیوں سے انسانی نسلوں کو غور و فکر اور اظہار رائے پر آمادہ کیا ہے۔ شاعری۔ فن شاعری المیہ ڈرامہ نگاری اور ان کی تنقید پر یہ کتاب دنیا کی اہم ترین کتاب ہے۔ 'بوطیقا' کی اس اہمیت کے باوجود میں نے اس کی کتاب "پالیٹکس" کا انتخاب کیا ہے۔ صدیوں سے دنیا کے حکمراں سیاست دان، فلسفی، سماجی علوم کے ماہرین اس کتاب سے فیض اٹھاتے رہتے ہیں۔ سیاسیات کا پانچواں حصہ یعنی پانچویں کتاب جو انقلابات کے بارے میں ہے۔ وہ آج بطور خاص ہماری توجہ کا مستحق ہے اس نے شہریت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ آج بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی اتھل پتھل سیاسی دنیا کے لیے یہ کتاب ہر دور کی طرح بطور خاص مطالعہ کی مستحق ہے۔

ان گنت نوجوان طالب علموں نے افلاطون کی اکیڈیمی میں افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ان میں ایک ارسطو بھی تھا جس نے افلاطون کی طرح دائمی اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔ فکر و فلسفہ میں دونوں سے کون بڑا ہے۔ اس پر صدیوں سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ مگر ایک بات طے ہے کہ ارسطو کو وہ انداز تحریر اور اسلوب کبھی حاصل نہ ہوا جو افلاطون کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔

ارسطو ایک نواحی قصبے سٹاگیرا میں پیدا ہوا۔ اس کا سن پیدائش ۳۸۴ برس ق۔م ہے۔ اس کا والد مقدونیہ کے دربار میں شاہی طبیب تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ارسطو کی کتابوں میں ہمیں طبی اصطلاحات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ارسطو کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر موضوع پہ اپنی رائے دیتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اس نے اپنے استاد افلاطون کو اپنے سوالوں سے خاصا متاثر اور زچ کیا تھا۔

ارسطو کے والدین کی وفات کے بعد اس کی پرورش میٹسا گرائے ایک شہری پروکیسنوس نے کی۔ جب ارسطو اٹھارہ برس کا ہوا تو وہ ایتھنز پہنچا جو اس وقت دنیا کا تہذیبی مرکز تھا۔ ان دنوں افلاطون وہاں موجود نہ تھا اس لیے کچھ عرصہ ارسطو نے اپنے دور کے دوسرے اہم استادوں اور مفکروں سے تعلیم حاصل کی۔ جب افلاطون واپس ایتھنز لوٹ آیا تو وہ اس کی رہنمائی میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ افلاطون بہت جلد ہی اس نوجوان کی ذہانت اور صلاحیتوں سے متاثر ہوگیا۔

ارسطو کا خاندان طبیبوں کا خاندان تھا۔ اس لیے علم طب سے اس کی دلچسپی میں کبھی کمی واقع نہ ہوئی۔ حیوانات اور فزکس کے ساتھ اس کی گہری دلچسپی کے شواہد بھی ہمیں ملتے ہیں اس میں ارسطو ایک سچا متجسس تھا۔ ہر موضوع پر مسئلے کے بارے میں اسے جستجو رہتی تھی۔ اس نے فن خطابت پر بھی کام کیا۔ اپنے دور کے کئی بڑے خطیبوں اور مقرروں پر اس نے شدید نکتہ چینی اور تنقید بھی کی۔ ارسطو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر مکتب فکر اور مکتبی علم کا نقاد ہے۔

یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جب ۳۴۷ ق م میں افلاطون کا انتقال ہوا تو نوجوان فلسفی ارسطو کو اس کی موت کا شدید صدمہ پہنچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ افلاطون نے اپنی وصیت میں اپنی اکیڈیمی کا سربراہ اپنے عزیز سپیسپس (SPEUSIPPUS) کو مقرر کیا تھا جبکہ ارسطو کا خیال تھا کہ استاد چونکہ اسے سب سے ذہین اور چہیتا سمجھتا ہے اس لیے وہ اس مرتبے

پر اُسے فائز کرے گا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ارسطو سے زیادہ اس منصب کا کوئی اہل نہ تھا۔ لیکن، افلاطون نے اس کے خلاف فیصلہ کیوں دیا۔ اس کی کوئی وجہ نہ تو سامنے آسکی ہے نہ ہی قیاس سے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ارسطو اس سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اکیڈیمی سے رشتہ منقطع کیا۔ اور ایشیائے کوچک کے ایک قصبے اٹارنس کا رُخ کیا۔ یہاں وہ ہرمیاس کے ہاں ٹھہرا جو ارسطو کا بے حد معتقد تھا۔ یہ ہرمیاس اس وقت ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور یہ عہدہ اسے ایرانیوں نے سونپا تھا۔ جو اس وقت سارے ایشیائے کوچک پر حکمرانی کر رہے تھے۔ تین برس تک ہرمیاس اور ارسطو نے بڑی پرسکون علمی زندگی بسر کی، مگر جب ایک ایرانی افسر نے کسی وجہ سے ہرمیاس کو قتل کر کے اس کی جائداد تک پر قبضہ کر لیا تو ارسطو کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور اس نے لیبسوس کے ایک جزیرے میں پناہ لی۔ ارسطو شاعر بھی تھا اور اس کی وہ نظم آج بھی موجود ہے جو اس نے اپنے دوست میزبان اور شاگرد ہرمیاس کی موت پر لکھی تھی۔

ارسطو کی ایک اولاد تو بیٹی تھی جو اس کی بیوی سے پیدا ہوئی جو ہرمیاس کی بیٹی تھی۔ ایک اس کا بیٹا تھا جو ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ارسطو نے اپنی مشہور تصنیف "اخلاقیات" (ETHICS) کو اپنے اسی بیٹے کے نام معنون کیا ہے۔

۳۴۲ ق م میں ارسطو کو مقدونیہ آنے کی دعوت دی گئی۔ مقدونیہ کے شاہ فلپ نے اسے اپنے چودہ پندرہ برس کے بیٹے کے لیے اتالیق مقرر کر دیا۔ ارسطو کا یہ شاگرد تاریخ میں سکندرِ اعظم کے نام سے لاثانی شہرت رکھتا ہے۔ سکندر اپنے استاد ارسطو کا ایک فرماں بردار اور سچا شاگرد تھا۔ تین برس تک وہ ارسطو سے علم حاصل کرتا رہا اور پھر سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ تلوار سنبھال کر دنیا فتح کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ سکندرِ اعظم زندہ واپس نہیں آیا مگر اس کا اپنے استاد ارسطو سے مسلسل رابطہ قائم رہا۔ وہ اپنے استاد کے لیے دنیا کے مختلف خطوں سے نایاب پرندے اور جانور بھجوایا کرتا تھا۔ ارسطو۔ ایتھنز واپس آگیا۔ جہاں اس نے لیسیئم کے نام سے اپنا دارالعلوم قائم کیا۔ اب وہ پچاس برس کا ایک پختہ کار انسان تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں رنج و آلام کا مزہ چکھا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم اور فلسفی تھا وہ اپنے لیسیئم کے باغ میں گھوم پھر کر اپنے شاگردوں کو درس دینے کا عادی تھا۔ صبح کے وقت

وہ اپنے خاص شاگردوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ مشکل اور ادق موضوعات کا درس دیتا۔ شام کے وقت وہ ہر طرح کے لوگوں کو درس دیتا تھا۔ یوں ارسطو بارہ برس تک ایتھنز پر چھایا رہا۔ جو اس وقت دنیا میں علم و دانش کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ارسطو درس و تدریس میں مصروف اور اس کا شاگرد ملکتوں اور ملکوں کو فتح کرتا رہا۔ جب سکندر اعظم کی موت واقع ہوئی تو حالات نے پلٹا کھایا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آیا جو سکندر اعظم اور اہل مقدونیہ کے مخالف تھے۔ صاحب اقتدار لوگوں نے ارسطو پر بھی سقراط کی طرح یہ الزام لگایا کہ وہ گمراہ کن نظریات و افکار کا پرچار کرتا ہے۔ سقراط کی مثال ارسطو کے سامنے تھی۔ مگر وہ ارسطو تھا سقراط نہیں۔ اس لیے وہ بھاگ نکلا۔ یوبین میں وہ ۳۲۲ ق م میں پہنچا۔ اور وہاں پناہ لی اور یہیں اسی برس میں اس کی موت واقع ہوئی۔

ارسطو کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے کہ حیاتیات، طبیعات، نفسیات، منطق، جمالیات جیسے موضوعات پر بھی اسے دسترس حاصل تھی۔ اور اس کے افکار میں ان سب کے عناصر ملتے ہیں اخلاقیات پر کتاب کی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ فن شاعری پر "بوطیقا" کا ذکر ہو چکا ہے۔

ارسطو کی تصنیف "سیاسیات" (POLITICS) کا مزاج افلاطون کی "ری پبلک" سے بے حد مختلف ہے۔ ارسطو غیر جذباتی، ٹھنڈے، متوازن نرم اور ولائل سے پُر لہجے میں بات کرتا ہے۔ وہ پرجوش بھی نہیں دکھائی دیتا۔ کسی خاص مسئلے کی حمایت میں بھی وہ زیادہ وکالت کرتا ہوا نہیں ملتا۔ اس کے باوجود "سیاسیات" کے دو پہلوؤں کی نشاندہی ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ افلاطون کی طرح صاحب طرز اور منفرد لکھنے والا نہ تھا اور دوسرے یہ کہ اس کتاب میں ایک منتشر سی منطقی کیفیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ "سیاسیات" ارسطو کے بہت سے لیکچروں کے نوٹس کی ایک شکل ہے اور اس میں بعض مستقل اور علیحدہ نوعیت کے موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ارسطو نے اس کتاب کو ایک کتاب کی طرح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ارسطو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا فلسفی اور مفکر تھا جس نے پولیٹکل سائنس کی قدریں وضع کیں اور علم السیاسیات کو ایک درجہ دیا۔

"سیاسیات" میں وہ مختلف قسم کی حکومتوں اور حکمران جماعتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور ان کے

خصائص پر بحث کرتا ہے یہ ایسا موضوع ہے کہ جس پر ارسطو اور سیاست و حیاتیات کے حوالے سے آج تک بحث جاری ہے اور "سیاسیات" سے اسی سلسلے میں کسب فیض کیا جاتا ہے۔ وہ ہمیں سیاسیات میں بتاتا ہے کہ انقلاب کیوں اور کس طرح آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسیات میں ارسطو یہ بھی بتاتا ہے کہ سیاسی نظاموں کو کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس نے سیاسیات میں جو اصول وضع کیے اور جو افکار پیش کیے آج بھی ان سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے۔

افلاطون کی طرح ارسطو بھی غلامی کا طرفدار اور حمایتی تھا۔ اور غلامی کے ادارے کو ایک اہم ادارہ قرار دیتا تھا۔ اصل میں جس زمانے میں افلاطون اور ارسطو اور اس کے بعد صدیوں تک حتیٰ کہ اسلام کی آمد کے بعد تک اگر غلامی کے ادارے کی حمایت جاری رہی اور اسے ختم نہ کیا گیا۔ تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان مختلف ادوار میں ان ملکوں اور قوموں کی معیشت اور اقتصادیات کا انحصار ہی غلامی پر تھا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ ارسطو غلامی کا حامی تھا۔ افلاطون کے برعکس وہ عورتوں کو مردوں سے کمتر سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ جو دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی جگہ۔ اس دور کی بعض ضرورتوں اور سماجی حالات کے تابع دکھائی دیتے ہیں۔ مظاہر کی نیچر کیا ہے۔ ان میں کس طرح تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ سیاسیات میں اس پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ارسطو ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی کاوشوں اور اعمال کا حاصل خوشگوار ہونا چاہیے اور یہی سب سے بڑی تبدیلی ہے۔ ارسطو کے خیال میں انسان اپنے خوشگوار انجام کو ایک صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر عقل و دلیل سے قابو پالے۔ ارسطو کے نزدیک کسی ریاست کا منتہا یہ ہے کہ وہ خود کفیل بن جائے جو صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ کوئی ریاست اپنے سرمائے، وسائل اپنے دستور اور حکمراں طبقے میں توازن اور اعتدال اختیار کرے۔

ارسطو انسان اور ریاست کو ایک رشتے میں بندھا ہوا پاتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک سیاسی جانور ہوتا ہے جو اپنی تکمیل کر کے مہذب بن کر ایک مکمل شہری کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ریاست ایک قدرتی مظہر ہے اور وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ ریاست اس لیے فطری ادارہ ہے کہ یہ

مختلف تنظیموں، قبائل، خاندانوں کی تبدیلی کے ادوار سے گزر کر تشکیل پاتی ہے اور انسان کے لیے ایک بہتر زندگی پیش کرتی ہے۔

ارسطو نے جمہوریت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی قابل توجہ ہیں۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اجتماعی فیصلے، انفرادی فیصلے کے مقابلے میں ہر حال میں زیادہ اطمینان بخش اور سود مند ہوتے ہیں۔

ارسطو سیاسیات میں قانون کی حکمرانی پر خاص زور دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ قانون کی برتری سے ریاست میں انصاف کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔ سیاسیات میں ارسطو نے انصاف کے حصول اور منصب، حکومت کے فرائض، ریاست کی مادی دولت کی اہمیت، آزادانہ تعلیم، تفریح کی اہمیت و مقصد شہریت کا صحیح مقصد اور تعریف، اور ایک پر مسرت زندگی کے بارے میں جو نظریات و افکار پیش کیے ہیں۔ وہ آج بھی متاثر کرتے ہیں۔

سیاسی افکار و نظریات جو ارسطو نے سیاسیات میں پیش کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو اپنے عہد کے کسی مکتب فکر سے متاثر نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کے خیالات نظریات پر کسی کے اثرات ہی ملتے ہیں۔ آج بھی جب کہ سیاسیات کا علم اتنا پھیل گیا ہے اور ارسطو کے بعد کتنے ہی بڑے بڑے فلسفیوں اور مفکروں نے اس موضوع پر اپنے بیش قیمت نظریات و افکار کو پیش کیا ہے۔ ارسطو ہمیں ان سے الگ تھلگ کھڑا نظر آتا ہے۔ اگر وہ قانون کی بالادستی اور اعتدال پر زور دیتا ہے تو بھی وہ نئے آئین سازوں کے لیے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ دولت کی حدود کا تعین کرنے کے باوجود سوشلسٹ دکھائی نہیں دیتا۔ سیاسیات میں وہ بعض جگہ ہمیں بتاتا ہے مختلف ادوار میں بادشاہی بہترین طرز حکومت رہی ہے تو وہ بادشاہی کے ذریعے حکمرانی کی حمایت بھی نہیں کرتا۔

سیاسیات، میں ارسطو جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتا ہوا ملتا ہے وہ ہے۔ دستور کا استحکام اور دستور کی پائیداری۔ وہ کسی بھی ریاست کے لیے دستوری استحکام اور پائیداری کو بنیادی شرط قرار دیتا ہوا ملتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر دستور کو استحکام اور پائیداری حاصل ہو تو ریاست کی اقتصادی قوت اور معاشی بنیادوں کو استحکام حاصل

ہوتا ہے۔

"سیاسیات" ایک ایسی تصنیف ہے جس کے حوالے سے ارسطو ہمیں سیاسیات کے سائنس بننے کے امکانات کا یقین دلاتا ہے اور آج علم السیاسیات باقاعدہ ایک سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ انسان کس طرح اور کس لیے ریاست کو تخلیق کرتے اور تشکیل دیتے ہیں اور ریاست کس طرح انسانوں کو خوشگوار زندگی بخش سکتی ہے یہ ایسا موضوع ہے جو ہر دور کا موضوع ہے اور ارسطو نے اسی موضوع پر ان افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے جو آج بھی زندہ، قابلِ قدر اور موثر ہیں۔!!

میڈی ٹیشنز

کوپرنیکس اور گلیلیو کی دریافت حرکت ارضی اور اکتشافاتِ عالم نے جہاں سائنس کی دنیا میں انقلاب بپا کر دیا تھا وہاں عیسائی کلیسا کی بنیادیں بھی ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ارسطو کا وہ جادو جو صدیوں سے یورپ کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کی طاقت اور اثر میں کمزوری پیدا ہونے لگی تھی۔ یہ وہی دور ہے جب ڈیکارٹ کے فلسفے کا افق پر ظہور ہوا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ ڈیکارٹ جدید فلسفے کا بانی ہے۔

فرانس نے اور دنیا نے اتنا بڑا فلسفی پھر پیدا نہیں کیا۔ ڈیکارٹ ۱۵۹۶ء میں برٹینی (فرانس) میں پیدا ہوا۔ اس کا والد قانون دان اور خاندان بہت معزز تھا۔ اس کی پرورش طبقۂ امرا کے بچوں کی طرح ہوئی اور تعلیم بھی امرا کے معیار کے مطابق دلوائی گئی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں وہ سبز مخمل کا لباس پہنتا اور نوابوں کی طرح تلوار کمر پر باندھتا رہا۔ دس سے اٹھارہ برس کی عمر تک اس نے ایک مشہور جیسوئیٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے زمانے میں وہ نصابی کتابوں کی سطحیت سے بیزار ہو گیا۔ نام نہاد سائنس، مذہبی نظریات نے اس کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا۔ اس نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ پڑھنا لکھنا یکسر ترک کر کے وہ سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ یقینی اور حتمی صداقت اور علم کی تلاش میں وہ ساری عمر مصروف رہا۔ صرف ایک علم تھا جسے وہ حتمی اور یقینی سمجھتا تھا۔ علم ریاضی۔

۱۶۱۸ء میں وہ فوج میں بطور رضاکار بھرتی ہوا۔ یہ اس کی اپنی مرضی اور خوشی تھی۔ ۱۶۱۹ء میں جب وہ بویریا کے ڈیوک کی کمان میں تھا تو نومبر ۱۶۱۹ء میں اسے جرمنی کے چھوٹے سے قصبے

اُلم (۱۶۱۹ء) میں موسم کی خرابی کی وجہ سے پورا ایک دن رُکنا پڑا۔ ایک پورا دن اس نے اپنے کمرے میں آتش دان کے سامنے گزار دیا۔ اس نے اس دن تنہائی میں اپنی شخصی اور فلسفیانہ حیثیت پر خوب غور کیا۔ اس رات خواب میں اُسے ایک خاص منظر دکھائی دیا۔ اس کی ڈائری میں ۱۰ نومبر کی تاریخ میں یہ اندراج ملتا ہے۔

"میں جذبے اور اشتیاق سے شرابور ہو گیا۔ میں نے شاندار سائنس کی بنیادیں دریافت کر لیں اور مجھ پر میری زندگی کا مقصد منکشف ہوا۔" اس نے اپنی ڈائری کے اس اندراج میں لکھا کہ اب وہ اپنی ساری عمر اسی مقصد کے لئے صرف کر دے گا۔ اور شکرانے کے لیے مقدس لوریٹو کے مزار پر حاضری دے گا۔ اس نے اس خواب میں جو بصیرت پائی۔ وہ ایک متحد سائنس کا منصوبہ اور نظریہ تھا۔ جس میں سارے تضادات اقدار اور مقداری طور پر یکساں برتنے کا عمل شامل تھا۔ اور ریاضی کے ذریعے دنیا کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔

افلاطون کا نظریہ تھا کہ تمام سائنسز متصوفانہ نظریہ خیر کے ذریعے وحدت بنتی ہیں۔ جس کے برعکس ڈیکارٹ نے عقلیت اور ریاضی کو ان کی وحدت کا سبب قرار دیا۔ ڈیکارٹ کے نظریے نے بلاشبہ ارسطو کے نظریات کو بکھیر کر رکھ دیا۔

اس کے بعد کے نو برس ڈیکارٹ نے مختلف سائنسز کو وحدت بخشنے کا میتھڈ تلاش کرنے میں صرف کر دیے۔ اس دوران میں اُس نے ترکے میں ملنے والی جائداد کو فروخت کر دیا۔ وہ کسی پریشانی اور کسی کا مرہونِ منت ہوئے بغیر اپنی زندگی کا منصب پورا کرنا چاہتا تھا۔ بے فکری کی وجہ سے وہ دیر تک سویا رہتا۔ عموماً وہ دوپہر تک بستر میں ہی لیٹا آرام کرتا۔ یوں اسے ایک ایسے فلسفی کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہوئی۔ جس نے اپنا بیشتر کام بستر پر ہی انجام دیا۔ وہ اس بے فکری کو ذہنی اور علمی کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر قرار دیتا ہے۔

ڈیکارٹ کی زندگی کا یہ شخصی پہلو بھی بہت اہم ہے کہ وہ اپنے عہد کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات سے بالکل بے نیاز رہا۔ اس نے تنہا زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسی لیے اس نے شادی بھی نہ کی۔ وہ کہا کرتا تھا "دنیا کا کوئی حسن صداقت کے حسن سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔" شادی کے بارے میں وہ دلچسپ خیالات کا مالک تھا۔ یہ ڈیکارٹ

ہی تھا جس نے کہا تھا جب کوئی خاوند اپنی بیوی کی موت پر آنسو بہا رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی روح کی گہرائی میں خفیہ لذت اور مسرت بھی محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ تاہم دیکارت ایک ناجائز بچی کا باپ بھی بنا جو اوائل عمر میں مرگئی اور اس کا دیکارت کو بہت صدمہ ہوا۔ بہرحال تینتیس برس کی عمر میں دیکارت نے ہالینڈ میں رہائش اختیار کر لی اور بیس برس وہیں رہا۔

۱۶۲۲ء میں اس نے اسٹرانومی پر اپنا رسالہ مکمل کیا جس میں اس نے اپنے ریاضیاتی میتھڈ سے کوپرنیکس کے نظریات کی تائید کی۔ جب وہ اپنے اس رسالے کو اشاعت کے لیے بھجوانے والا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ گلیلیو کو سزا سنا دی گئی ہے اور اس کی کتاب جلائی جا رہی ہے تو دیکارت نے اپنے رسالے کی اشاعت رکوا دی۔ اس سلسلے میں اس کا موقف یہ تھا۔

"یہ اپنے ساتھ زیادتی ہے کہ انسان اپنی جان گنوا دے۔ جبکہ وہ اپنی زندگی کو بے وقار ہوئے بغیر ایمانداری سے بچا سکتا ہو۔"

اس زمانے میں دیکارت نے اپنے بارے میں یہ بات بھی پھیلا دی کہ وہ مذہب کا احترام کرتا ہے۔ دیکارت کے شارحین اور ناقد اس بحث میں بہت الجھے ہیں کہ چرچ کے بارے میں اس کے افکار واقعی حقیقی تھے یا محض دکھاوا۔ اس ضمن میں خود اس کے اپنے ایک جملے کی بہت تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ دیکارت نے کہا تھا۔

"اب جبکہ میں اس دنیا میں محض ایک تماشائی نہیں رہوں گا۔ بلکہ اداکار کی طرح مجھے سٹیج پر ظاہر ہونا ہے اس لیے میں نے نقاب (ماسک) پہن لیا ہے۔"

ایک بات صاف عیاں ہے کہ اس نقاب کی وجہ سے دیکارت نے اس زمانے کے مذہبی احتساب کرنے والوں سے اپنی جان ضرور بچا لی۔ گلیلیو کی تعزیر کے تین برس بعد دیکارت نے اپنے فلسفیانہ میتھڈ کے بارے میں اپنی کتاب شائع کی جس کا نام "DISCOURSE ON METHOD" ہے۔ جسے فلسفہ کی دنیا میں آج بھی کلاسیک کا مرتبہ حاصل ہے ۱۶۴۷ء میں اس نے اپنی شہرہ آفاق اور لازوال تصنیف MEDITATIONS ON FIRST PHILOSPHY شائع کی۔ اس کا نام ہے۔ اس کی اشاعت کے بیس برس بعد چرچ نے اسے ان کتابوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ جن کا پڑھنا عیسائیوں کے لیے مذہباً ممنوع قرار دیا

گیا ہے۔ اس کے بعد دیکارت کی زندگی کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ سویڈن کی ملکہ کرسٹینا نے اسے دعوت دی کہ وہ اسے اپنے فلسفے کی تعلیم دے۔ ڈیکارت سویڈن جانے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ سویڈن کو "برف اور ریچھوں کی سرزمین کا نام دیتا تھا۔ لیکن ملکہ کے اصرار پر اسے سویڈن جانا پڑا۔ ملکہ کرسٹینا کا خیال تھا کہ صبح پانچ بجے اس کا ذہن بہت تر و تازہ اور شاداب ہوتا ہے اس لیے دیکارت صبح پانچ بجے اسے اپنے فلسفے کی تعلیم دیا کرے۔ نومبر کے ایک یخ بستہ دن جب دیکارت ملکہ کے دربار سے واپس آرہا تھا تو اسے شدید سردی سے نمونیہ ہوگیا اور اس کے ایک ہفتے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ بیسویں صدی کے ایک فرانسیسی فلسفی ایتینی گلیسوں نے دیکارت کی زندگی کو ایک جملے میں بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

"وہ اکیلا فکر کے زیر اثر اکیلا فکر کے لیے زندہ رہا۔ اس سے پہلے کبھی اتنا عظیم اور شریف انسان پیدا نہیں ہوا۔"

دیکارت جدید فلسفے کا بانی ہے۔ اس نے فلسفے کی پرانی دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے دل میں نام نہاد مذہبی اعتقادات اور معاشرے کے لیے شدید اہانت کے گہرے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ وہ تعلیمی درس گاہوں میں دی جانے والی تعلیم کو حقیر سمجھتا تھا۔ چرچ کے اقتدار اور بالادستی کے خلاف اس کے دل میں نفرت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ نصابی، تعلیمی اور ایسی کتابوں نے اس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کیے۔ اس نے یونانی، تاریخ، ادب، سائنس، ریاضی اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں سے صرف ریاضی نے اسے مطمئن کیا فلسفے کے لیے اس کے دل میں حقارت تھی۔ کیونکہ حریف فلسفی جس طرح ایک دوسرے کے افکار کی تکذیب کرتے وہ طرز فکر و عمل دیکارت کے لیے انتہائی ناپسندیدہ تھا۔ وہ بڑے یقینی انداز سے کہتا ہے کہ صدیوں سے فلسفے کی تعلیم دی جارہی ہے لیکن آج تک فلسفہ کوئی ایسی چیز پیدا نہ کرسکا۔ جو نزاعی نہ ہو۔ وہ سب پر شک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ سب کو پہلے رد کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اسی طرح صداقت کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ صداقت کا حصول اور دریافت دیکارت کی زندگی کا مشن رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"میرے دل میں ہمیشہ یہ آرزو اپنی انتہا پر رہی ہے کہ میں سیکھ سکوں کہ کس طرح جھوٹ کو سچ سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔"

دیکارت یہ تعلیم دیتا ہے کہ خواہ نظریات وافکار کتنی ہی صدیوں سے چلے کیوں نہ آ رہے ہوں ان کو یکسر نظر انداز اور رد کرنا ضروری ہے۔ بعد میں یہ طے کرنا ہوگا کہ کون سا نظریہ صحیح ہے کون سا غلط۔!

دیکارت جدید فلسفے کا بانی ہے اور میڈی ٹیشنز اس کی بنیادی کتاب۔ اپنی اس کتاب میں وہ جو پہلا جملہ لکھتا ہے وہ اس طرح ہے۔

"اپنی زندگی میں مجھے ایک بار ہر چیز کو اٹھا کر پھینکنا ہوگا..... آج میرا ذہن ہر طرح سے آزاد ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔"

آخر کار مجھے وقت مل گیا ہے کہ میں سنجیدگی اور آزادی سے اپنے تمام پرانے نظریات کو ملیامیٹ کر سکوں۔"

دیکارت، ریاضی کو وسیلہ بناتا ہے۔ ریاضیاتی نظام کے تحت یقین کی منزل تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ ریاضی کے وسیلے سے فلسفے کے انتشار اور بے یقینی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاضیاتی میتھڈ کو بروئے کار لا کر فلسفۂ مطلق۔ تیقن حاصل کر سکتا ہے اس ریاضیاتی میتھڈ میں وہ وجدان اور استخراجی عمل کو بنیادیں قرار دیتا ہے شک اور شبہہ حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ "میڈی ٹیشنز" میں اس نے ان اشیا کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے جن پر شک اور شبہ کیا جانا ضروری ہے پہلے وہ ان تصورات کا ذکر کرتا ہے جو حسیاتی ہیں۔ ان کا محاکمہ ناگزیر ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جن پر عمومی طور پر اعتقاد رکھا جاتا ہے لیکن یہ دھوکا دیتے ہیں۔

دیکارت اس میتھڈ۔ شک و شبہہ کو انتہا تک لے جاتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی فکر کے حوالے سے اس مرحلے میں داخل ہوتا ہے جو فاتحانہ ہے وہ کہتا ہے اگر میرے تمام نظریات مجھے فریب دیتے ہیں۔ اگر میں تمام نظریات واعتقادات پر شبہہ کرتا ہوں تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میرا وجود دھوکا کھا رہا ہے۔ میرا وجود اعتقادات کو رد کر رہا ہے ایک نظریہ

اور عقیدہ ایسا ہے جس پر شک کیا جا سکتا ہے۔ نہ شبہ۔ کہ چونکہ میں شک کر رہا ہوں۔ اس لیے میرا وجود ہے۔ اس لمحے جب میں سوچ رہا ہوں جب میں کسی پر شک کر رہا ہوں۔ تو میں ایک سوچنے والی چیز کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتا ہوں۔

یوں وہ اپنے فلسفے اپنے افکار کی بنیاد ایک جملے میں رکھتا ہے جو فلسفے کی دنیا کا مشہور ترین جملہ ہے۔ اس جملے کو اس نے لاطینی میں لکھا تھا۔

"COGITO, ERGO SAM"

انگریزی میں اس کا ترجمہ یوں بنتا ہے

THINK THERE FORE I AM

اُردو میں ..... یوں .... چونکہ میں سوچتا ہوں۔ اس لیے میں ہوں .... !

دیکارت۔ اس حلقۂ دام خیال کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس سوچ میں شک کرنا، سمجھنا تصدیق کرنا، انکار کرنا، ارادہ کرنا، انحراف کرنا، محسوس کرنا سب شامل ہیں۔ یہ انسانی وجود کی ضروریات ہیں۔

اپنے وجود کی تصدیق اور حقیقت کی بنیادیں رکھنے کے بعد دیکارت اس میتھڈ کو اپنے پورے نظام فلسفہ پر پھیلاتا جاتا ہے اور اس سے وہ موضوعیت، یا داخلیت SHBJECT-I SM ۱۷۱۔ پر بات کو پہنچاتا ہے۔

علم و خبر کا جو نظریہ دیکارت نے اپنے نظام فکر میں پیش کیا ہے اس نے جدید فلسفے کی بنیادیں رکھی ہیں۔ وہ اس حوالے سے سوال پر سوال پوچھتا چلا جاتا ہے کہ کیا اس کے وجود کے باہر، خارج میں بھی کچھ وجود رکھتا ہے۔ یہ کس طرح سے جانا جا سکتا ہے کہ اس کے ذہن سے باہر بھی کوئی صداقت موجود ہے؟ اس کے بعد وہ لکھتا ہے ....

" اب مجھے موقعہ ملتے ہی یہ جاننا ہے کہ کیا خدا کا وجود ہے۔"

اس کے بعد اپنے خاص ریاضیاتی میتھڈ سے دیکارت خدا کے وجود کی تصدیق کرتا ہے اور یہاں سے وہ پھر IDEA کی طرف پہنچتا ہے۔ دیکارت کے فلسفے میں آئیڈیا کا مقصد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو شعور سے تعلق رکھتی ہے محسوسات (خوشی، درد وغیرہ) حسیاتی تصورات

(جن کا تعلق بصریات سے ہے) سورج، درخت، لوگوں کا ہجوم، اس کے بعد یادیں (بچپن کی جنگ کی، کسی حالیہ واقعہ کی) دانشمندانہ خیالات (سائنسی یا ریاضیاتی اور فلسفیانہ)

اس طرح اس نے "آئیڈیا" کی تقسیم کی ہے۔ ان پر تفصیل سے تحقیق کی ہے۔ ان کے حوالے سے وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔

وجود باری کے بارے میں ڈیکارٹ کے افکار کا مطالعہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس کا پورا مفہوم تو "میڈی ٹیشنز" کے مطالعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے تاہم چند نکات کا ذکر کرتا ہوں۔ ڈیکارٹ۔ تمام آئیڈیاز کو اسباب و علل کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور پھر وہ ہمیں بتاتا ہے کوئی شے..... نیستی سے پیدا نہیں ہو سکتی تو وہ خدا کو مکمل قرار دیتا ہے۔ وجود باری کے بارے میں ڈیکارٹ نے جو شواہد اور ثبوت اپنے مخصوص نظام فکر کے تحت پیش کیے ان کے حوالے سے عیسائی مذہبی اجارہ دار طبقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اس کتاب کا مطالعہ کیتھولک عیسائیوں میں مذہباً گناہ اور ممنوع قرار دیا گیا۔

اپنے وجود کو ثابت کرنے کے بعد ڈیکارٹ خدا کے وجود کا ثبوت فراہم کرتا ہے اس کے بعد اس کائنات کے نظام کا کھوج لگاتا ہے۔ روح اور جسم کو بھی اپنا موضوع بناتے ہوئے وہ مابعد الطبیعاتی ثنویت پر اظہار خیال کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے نظام فکر کے حوالے سے پوری کائنات اور اس کے مسائل پر غور کرتا ہوا ملتا ہے۔

ڈیکارٹ کا فکری نظام ریاضیاتی ہے۔ اس میں جذباتیت کا کوئی دخل نہیں۔ وہ اپنے نظام فکر کے ساتھ سچائی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ اس نے اپنے فلسفے کے حوالے سے پوری دنیا کی فکر کو متاثر کیا۔ ڈیکارٹ نے جدید فلسفے کی بنیاد رکھی اور اس جیسا فلسفی پھر دنیا پیدا نہ کر سکی۔ اور اس کی کتاب "میڈی ٹیشنز" نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔

تنقید بر عقل محض

شوپنہار نے کانٹ کے حوالے سے ہیگل کے فلسفے پر جو رائے دی ہے اسے پڑھ کر خاصا تعجب ہوتا ہے کہ شوپنہار نے ہیگل کے لیے خاصی توہین آمیز اور عامیانہ زبان استعمال کی ہے اس نے ایک طرح سے ہیگل کو مجمع باز اور چھچھورا قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اصل فلسفی تو کانٹ تھا۔ جس نے نہ صرف ایک پورے دور کو بلکہ آنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہے لیکن مجمع باز ہیگل نے بڑی شہرت حاصل کر لی جس کا وہ قطعی حقدار نہ تھا۔

۱۷۲۴ء میں پروشیا کے شہر کونگسبرگ میں پیدا ہونے والا عمانویل کانٹ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ خاموش طبع، پستہ قامت شخص تھا۔ جس نے اپنی ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ اگرچہ وہ جغرافیے کے موضوع پر لیکچر دینے کا عادی تھا۔ لیکن خود کبھی اپنے شہر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کانٹ کے آباؤ اجداد صدیوں پہلے سکاٹ لینڈ سے نقل وطن کر کے پروشیا آئے تھے۔ اس کی والدہ کٹر مذہبی خیالات رکھنے والی خاتون تھی۔ بچپن میں کانٹ پر اپنی ماں کا اتنا شدید اثر تھا کہ وہ سختی سے مذہبی امور اور عقائد پر عمل کرتا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی زندگی میں مذہب سے اتنا دور ہو گیا کہ کبھی گرجے کا رخ نہ کیا۔

کانٹ کا دور فریڈرک اعظم جیسے شہنشاہ اور والٹیئر جیسے فلسفی کا دور ہے۔ اس دور میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ نوجوانوں کے دلوں میں کانٹ کے دل میں بعض مسائل اور نظریات کے بارے میں شکوک پیدا نہ ہوتے کانٹ کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ابتدائی عمر میں جن لوگوں کا اثر اس پر بہت گہرا رہا۔ بعد میں انہی لوگوں سے اسے شدید اختلاف پیدا ہوا اور کانٹ نے ان کی نفی کی ان میں برطانوی فلسفی ہیوم خاص طور

قابلِ ذکر ہے۔ ہیوم ایک طرح سے اس کا محبوب دشمن بن گیا تھا۔

کانٹ سیدھا سادا آدمی تھا۔ لیکن جب ہم اس کے فلسفیانہ نظریات کے مختلف مدارج کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ روایت پرست اور کسی حد تک رجعت پسندانہ خیالات کا مالک کس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آزاد خیال اور بے باک فلسفی کا روپ دھار گیا۔ اگر وہ اپنی آخری تصنیف کی اشاعت کے وقت ستر برس سے زائد عمر کا نہ ہو چکا ہوتا تو یقیناً اسے زندان میں ڈال دیا جاتا اور فلسفے کی دنیا کو ایک اور شہید مل جاتا لیکن عمر کی بزرگی کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

کانٹ کا عظیم ترین کارنامہ اس کی کتاب Critique of pure reason ہے یعنی "تنقید برعقلِ محض" یہ سیدھا سادا فلسفی اندر سے بہت جری تھا کہ اس زمانے میں جبکہ کوئی سرکاری تنخواہ دار ملازم ایسی کتاب شائع کر کے حکومت کے عتاب کا نشانہ بن سکتا تھا کانٹ نے اپنی کتاب "تنقید برعقلِ محض" شائع کر دی۔

اس کتاب کی اشاعت فلسفے کی دنیا میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ "تنقید برعقلِ محض" وہ تصنیف ہے جو اپنی اشاعت سے لے کر اب تک بحث اور غور و فکر کا موضوع بنی رہی ہے۔ کانٹ نے اس کتاب میں جو فلسفہ پیش کیا اس نے دنیا کے فکری اور فلسفیانہ نظام کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ فلسفے کا ایک نیا مکتب اس کتاب کے حوالے سے معرضِ وجود میں آتا ہے ایسی عظیم لافانی کتاب لکھنے والے کی زندگی کا ایک سرسری جھلک بھی اس کے فلسفے کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتی ہے۔

۱۷۵۵ء میں کانٹ نے پرائیویٹ لیکچرار کی حیثیت سے کونگسبرگ کی یونیورسٹی میں درس دینا شروع کر دیا۔ پندرہ برس تک وہ اسی حیثیت سے اس یونیورسٹی کے ساتھ منسلک رہا۔ وہ پروفیسر کے عہدے کا حقدار بھی تھا اور طلب گار بھی۔ اس سلسلے میں اس کی درخواستوں کو مسلسل نامنظور کیا جاتا رہا۔ بالآخر ۱۷۷۰ء میں اسے مابعدالطبیعات اور منطق کے مضامین کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس کی خاموش طبعی کی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ وہ فلسفے کی دنیا میں ہیجان پیدا کر دے گا۔ ایسا سیدھا آدمی انسانوں کی زندگیوں کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت سے بظاہر محروم دکھائی دیتا تھا۔ وہ شرمیلا آدمی اندر سے بڑا شجاع تھا۔ خود کانٹ نے ایک بار لکھا تھا:

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں مابعدالطبیعات کا عاشق ہوں لیکن میری

اس محبوبہ نے میرے ساتھ بہت کم التفات کیا ہے۔"

وہ مابعدالطبیعات میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا جس کے بارے میں وہ خود کہتا ہے۔ "میں بعدالطبیعات کے تاریک پاتال میں پھنسا رہا۔ پھر وہ مابعدالطبیعات کے بارے میں کہتا ہے" یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا نہ کوئی کنارہ ہے نہ روشنی دکھانے والا مینار" لیکن اس کانٹ نے مابعدالطبیعات میں تہلکہ خیز انقلاب پیدا کر کے ساری دنیا کو چونکا دیا۔

اپنی زندگی کے خاموش زمانے میں کانٹ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مابعدالطبیعات میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔ تب وہ سیاروں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں، ہواؤں کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔

۱۷۵۵ء میں شائع ہونے والی اس کتاب "تھیوری آف ہیونز" کو ایک خاصی اچھی کتاب سمجھا گیا لیکن اس پر کوئی لمبی چوڑی بحث نہ ہوئی۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے اپنے نظریات کو وسعت دی اور اس کی کتاب اینتھروپولوجی شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے لکھا کہ انسان کی زندگی سحر جنگلوں اور جانوروں کی معیت ہوئی۔ اس لیے ابتدائی دور کا انسان، آج کے انسان سے بے حد مختلف تھا۔ آج انسان کو تہذیب و ثقافت نے جو کچھ بنا دیا ہے ابتدائی انسان اس سے بے حد مختلف تھا کانٹ نے اس کتاب میں اعتراف کیا:

"قدرت نے پھر کسی طرح انسان کی ارتقائی نشوونما میں حصہ لیا اور کن اسباب و عوامل کی وجہ سے انسان موجودہ مقام تک پہنچا۔ اس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔"

ڈارون نے انسانی انواع پر اپنا عظیم اور چونکا دینے والا کام کیا جس سے کانٹ کے ان خیالات و نتائج کی تائید ملتی ہے۔

کانٹ کے افکار و نظریات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس معمولی اور سادہ انسان کے عظیم دماغ میں خیالات آہستہ آہستہ جمع ہوئے اور پھر منظم صورت اختیار کرتے تھے۔ وہ بمشکل پانچ فٹ کا شخص ہوگا۔ شرمیلا، سمٹا سمٹایا لیکن اس چھوٹے قد کے فلسفی کا دماغ بڑا تھا۔ ایسے خیالات اور افکار کی آماجگاہ جنھوں نے پوری فکر انسانی کو تبدیل کر دیا۔ اس کے ایک سوانح نگار نے اس کی زندگی کو چند افعال میں پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے:

"کانٹ کی زندگی چند اعمال پر مشتمل تھی، بندھے ٹکے اوقات پر اس کے روزمرّہ کے ان اعمال میں کبھی فرق نہ آیا۔ صبح بیدار ہونا، کافی پینا، لکھنا، لیکچر دینا، کھانا اور سیر کرنا اس کا ہر کام عین وقت پر ہوتا تھا نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔"

اور پھر جب عمانوئیل کانٹ اپنے بھورے رنگ کے کوٹ میں ملبوس، چھڑی ہاتھ میں لیے اپنے گھر کے دروازے میں نمودار ہوتا تو اس کے ہمسائے گھڑیاں ملاتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت ٹھیک ساڑھے تین بجے ہیں۔ ہر طرح کے موسموں میں وہ ٹھیک وقت پر اپنے گھر سے نکلتا پیدل چلتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ دبلا پتلا اور کمزور انسان تھا۔ لیکن اس کا ذہن اور دماغ بہت قوی تھا وہ اگر کبھی بیمار بھی ہوتا تو ڈاکٹروں کا احسان نہ اٹھاتا وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹروں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اپنے انداز میں وہ اپنا علاج کر لیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے اسّی برس کی طویل عمر پائی اس نے ستر برس کی عمر میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ جس کا موضوع دماغی قوت اور بیماری کے احساسات پر قابو پانا تھا۔ اس کی پسندیدہ حرکات میں ایک حرکت یہ تھی کہ وہ طویل عرصے تک صرف ناک سے سانس لیتا تھا۔ خاص طور پہ جب وہ گھر سے باہر ہوتا تو کبھی منہ کھلا نہ رکھتا اور چلتے ہوئے ناک سے سانس لیتا۔

وہ ہر کام بڑی احتیاط سے کرنے کا عادی تھا۔ ہر بات کو پہلے سوچتا۔ اچھی طرح غور کرتا اور پھر کہیں اس پر عمل کرتا۔ زندگی میں دو بار اس نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پہلی بار یوں ہوا کہ جس خاتون سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اس سے عرضِ مدعا نہ کر سکا اور اس خاتون نے ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ دوسری بار جس خاتون سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا وہ خاتون اس شہر سے ہی چلی گئی۔ اور کانٹ کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ کانٹ ساری عمر کنوارا رہا غالباً وہ بھی نطشے کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ شادی شدہ آدمی کام کا نہیں رہتا۔ ٹالیرانڈ نے تو صاف کہا تھا کہ شادی شدہ آدمی کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ وہ روپے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے اور یقینی بات ہے کہ کانٹ ایسا آدمی تھا کہ جو اپنی زندگی کے اصولوں کو محض شادی کی مسرت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنی عظیم تصنیف "تنقید برعقلِ محض" پر کام کرتا رہا خاموشی سے ..... کسی کو علم نہ تھا کہ

وہ کیا لکھ رہا ہے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ ایک بڑے طوفان کی تخلیق کر رہا ہے وہ بار بار لکھتا اور نظر ثانی کرتا بالآخر اس کی یہ کتاب ۱۷۸۱ء میں مکمل ہو گئی۔ اس وقت کانٹ کی عمر ستاون برس ہو چکی تھی۔ دنیا کا کوئی فلسفی اس عمر میں جا کر ایسی کتاب کا خالق بنتا ہوا دکھائی نہیں دیتا جس نے سارے فکری نظام کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔

تنقید بر عقل محض

اس عنوان کا مفہوم کیا بنتا ہے کتاب کے عنوان سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ "عقل محض" پر تنقیدی حملہ کیا گیا ہے حالانکہ کانٹ ایسا نہیں کرتا یہاں "کریٹیک" کا لفظ تنقیدی تجزیے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس عظیم تصنیف میں کانٹ ہمیں بتاتا ہے کہ عقل ہے کیا اور عقل محض کیا ہے۔ اس کے امکانات کیا ہیں اس کی حدود کیا ہیں۔ عقل محض سے اس کی مراد علم ہے ایسا علم جو حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا جو ہر طرح کے حسیاتی تجربات سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ علم مختلف ذہنی ساخت سے جنم لیتا ہے۔

اپنے اس فلسفے کا حوالے سے کانٹ برطانوی مکتب کے عظیم فلسفیوں ہیوم اور لاک کو چیلنج کرتا ہے جو علم کا منبع حواس کو قرار دیتے ہیں۔ ہیوم کا خیال تھا کہ نہ روح ہوتی ہے نہ سائنس، ہمیں جو کچھ نصیب ہوتا ہے وہ حواس کے ذریعے ملتا ہے۔ کانٹ نے اس کی شدید انداز میں نفی کی۔ کانٹ نے اپنی کتاب میں لکھا:

> "میرا بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ہم عقل سے امید رکھتے ہوئے کیا حاصل کر سکتے ہیں اور یہ سوال اس صورت میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب ہم تمام مواد اور تجربے کی اعانت کو ایک طرف رکھ دیں تب عقل کسی حد تک ہمیں کیا دے سکتی ہے۔"

اپنے اس سوال کے حوالے سے کانٹ اپنی اس عظیم تہلکہ خیز کتاب میں ذہنی ڈھانچے اور دماغ کے مختلف مدارج کو بیان کرتے ہوئے ایسے امکانات کی نشاندہی کرتا ہوا ملتا ہے جو پہلے کبھی ہمارے سامنے نہ آئے تھے وہ اپنی اس کتاب کے حوالے سے بہت بڑا دعوے کرتا ہے اتنا بڑا دعوے شاید ہی کسی فلسفی نے کبھی کیا ہو۔ وہ تنقید بر عقل محض میں لکھتا ہے۔

اس کتاب میں میں نے یہ مقصد سامنے رکھا ہے کہ تکمیل کو اپنا ہدف بناؤں میں نے

یہ کاوش کی ہے کہ کوئی بھی مابعدالطبیعاتی مسئلہ ایسا نہ ہو جس کا جواب اور حل اس کتاب میں موجود نہ ہو یا پھر کم از کم اس مسئلے کے حل کے لیے اس کی کلید کو فراہم نہ کردوں۔

کانٹ "تنقید عقل محض" میں بتاتا ہے۔

"تجربہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس پر علم کا انحصار ہو تجربے کی بدولت ہم خالص علم حاصل نہیں کر سکتے۔ تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ "کیا ہے"! لیکن یہ بتانا اس کے بس میں نہیں کہ کیوں ہے؟ اور پھر لازم نہیں کہ تجربہ ہمیں صحیح معنوں میں یہ بھی بتا سکے کہ کیا ہے؟ کی اصل کیا ہے۔"

٭۔ انسان کے اندر کی سچائی۔ تجربے سے آزاد ہونی چاہیے۔"

٭۔ ہم تجربے کی بدولت کہاں تک آگے بڑھ سکتے ہیں! اس کا جواب ریاضی سے ملتا ہے ریاضی کا علم یقینی بھی ہے اور ناگزیر بھی ہم مستقبل کے بارے میں ریاضی کے اصول کو توڑ کر محض تجربے کی بنا پر علم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ مستقبل میں سورج مغرب میں طلوع ہو سکے گا۔ یہ بھی یقین کر سکتے ہیں کہ آگ لکڑی کو نہ لگے گی لیکن ہم پوری زندگی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ دو اور دو چار کے علاوہ بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ یہ سچائی تجربے سے پہلی کی ہے لازمی اور ناگزیر سچائیاں تجربے کی محتاج نہیں ہوتی ہیں اور ایسی سچائیاں کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔"

٭۔ تجربے کا حاصل انفرادی اور منتشر ہیجان کے علاوہ کچھ نہیں۔

٭۔ سچائیاں ہمارے دماغ کی پیداوار ہیں۔ ہماری ذہنی اور دماغی ساخت سے جنم لیتی ہیں۔

٭۔ ذہن ایسا نہیں ہے کہ جیسے برطانوی فلسفیوں نے کہا ہے کہ اس پر موم رکھی ہو اور اسے حرارت ملے تو اس پر نقش بیٹھ جاتا ہے۔ ذہن مفعول نہیں فاعل ہے۔ ذہن مجرد احساسات اور کیفیات کا بھی نام نہیں۔ ذہن ایک فعال عضو ہے جو ہیجانات کو خیالات (IDEAS) میں تبدیل کرتا ہے جو منتشر اور گمراہ تجربات کے ڈھیر پن کو منظم خیالات کی شکل دیتا ہے۔

کانٹ اپنے اس فلسفے کو TRANSCENDENTAL فلسفے کا نام دیتا ہے اور اسی نام سے اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے کانٹ کو لازوال مقام حاصل ہوا ہے۔

وہ ان دو مراحل کا ذکر کرتا ہے جو ایک خاص طریقہ کار سے گزرتے ہوئے ہیجانات کے خام

مواد کو خیال کی شکل دیتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ہیجان کا وہ ہے جب زمان و مکان کا احساس اور تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ تصور خیال کی صورت اختیار کرتا ہے۔

کانٹ اپنے فلسفے میں احساس زمان اور احساس مکان کو بے حد اہمیت دیتا ہے کیونکہ تصورات اور خیالات کی تشکیل میں یہ دونوں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زمان و مکان کا صحیح احساس ہی خیالات کی تنظیم کرتا ہے۔

ہیوم اور لاک نے ذہن اور دماغ کو محض ?ASSIOBADX کا نام دیا تھا لیکن کانٹ نے دماغ کو خیالات اور عقل کا سرچشمہ اور گنجینہ ثابت کر دکھایا ہے۔

کانٹ کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس ٹکڑے کو غور سے پڑھیے جو اس کے نظریات کا نچوڑ ہے۔

Sensation is unorganised perception is organised sensation conception is organised perception. Science is organised knowledge, wisdom is organised life each is greater degree of order and unity.

وہ عقل کو منبع اور سچائی کا قرار دیتا ہے۔ حواس کے ذریعے سے حاصل ہونے والے تجربوں کو غلط کہتا ہے کیونکہ ان میں انتشار ہوتا ہے ان میں نظم اور وحدت کا فقدان ہوتا ہے کانٹ کا ایک جملہ ہے۔

Peceptions without conceptions are blind.

یہ ذہن اور دماغ ہے جو "بحران" کو دور کرتا ہے اور تجربے سے ماورا اصلی سچائیوں تک لے جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ جو قوانین خیالات کے ہیں وہی قوانین اشیاء پر لاگو ہوتے ہیں۔ کیونکہ اشیاء کا علم خیالات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اس لیے اشیاء کے لیے ان قوانین کی متابعت ناگزیر ہے۔

کانٹ کے فلسفے کے سمجھنے کے لیے شوپنہار کی یہ رائے بھی بے حد مدد دیتی ہے۔ شوپنہار نے کانٹ کے بارے میں لکھا تھا۔

"Kant's Greatest Merits Distinction of the Phenomenon from the thing in itself."

کانٹ نے تنقید برعقل محض میں ایک جگہ لکھا ہے،

"ہم کسی ایسے تجربے کا ذکر ہی نہیں کر سکتے جس کی وضاحت اور تشریح مکان، زمان اور اسباب علت سے نہ ہو سکتی ہو۔"

کانٹ کے فلسفے سے کلیسا اور مذہبی دنیا اور اس کے تعلقات میں انقلاب آیا۔ اختلافات کا ایک باب وا ہوا جو کبھی بند نہ ہو سکا۔ حواس کو ترک کر کے عقل محض کو زندگی کے معنی و مقصد قرار دے کر کانٹ نے فلسفے کا ایسا نظام قائم کیا جس نے پہلے نظریات کو یکسر رد کر دیا۔

سارتر جیسے عظیم مفکر اور دانشور نے کانٹ کی شخصیت اور اس کے افکار کے تضاد کو بڑے موثر انداز میں نمایاں کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

یہ سیدھا سادہ عام پروفیسر ظاہر اور باطن کے عظیم ترین تضاد کا حامل تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت درست کرتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس شخص نے ان کی زندگیوں کے ساتھ وابستہ عقائد کو سفاکی سے قتل کر دیا ہے۔

کانٹ نے مذہب کو اخلاقی قوانین اور اصول۔ کے تابع کر دیا۔ اس نے اپنی بنیادی کتاب اور فلسفے "تنقید برعقل محض" کو وسعت دے کر اس کا اطلاق بعد کے دور میں دیگر موضوعات پر کیا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس کی کتاب "کرٹیک آف ججمنٹ" شائع ہوئی۔ انہتر برس کی عمر میں اس نے کتاب لکھی

Religion within the limits of pure reason.

یہ کتاب جو اس کے بنیادی فلسفے کا مذہب پر اطلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی سب سے "بیباک" کتاب کا درجہ رکھتی ہے اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس کتاب کو اس نے انہتر برس کی عمر میں لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مذہب کی بنیاد نظریاتی عقل کی منطق پر نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ اس کی بنیاد عملی عقل اور اخلاقیات پر استوار ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائیبل جیسی مذہبی کتاب کو اخلاقی قواعد پر جانچا جائے گا اس کی محض روحانی حیثیت کو سامنے نہ رکھا جائے گا۔ گرجے اور مذہبی عقائد اگر اخلاقی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے اور محض مذہبی ذمہ داری، اجارہ داری برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں تو پھر وہ اپنا فرض صحیح طور پر ادا نہیں کر رہے۔ کانٹ لکھتا ہے:۔

"یسوع خدا کی آسمانی بادشاہت کو زمین کے قریب لے آیا تھا۔ لیکن یسوع کو غلط سمجھا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی بادشاہت قائم ہونے کے بجائے پادری کی بادشاہت دنیا پر قائم ہو گئی۔"

"معجزے کسی مذہب کی صداقت کو ثابت نہیں کر سکتے۔" کانٹ کے اس نظریے "عقل محض" اور اس کے مذہب پر اطلاق کی وجہ سے بڑی لے دے ہوئی۔ اس کے خلاف حکومت نے ایک بڑا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کی عمر اور بڑھاپے کی وجہ سے اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی بقایا زندگی زندان میں بسر ہوتی۔ اس کتاب کو جو مذہب کے حوالے سے تنقید بر عقل محض سے تعلق رکھتی تھی۔ اس ناشر نے شائع کرنے سے انکار کر دیا جو اسے پہلے شائع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کانٹ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور یہ کتاب JENA اپنے دوستوں کو بھیج دی JENA کا علاقہ جرمنی کی حدود سے باہر تھا۔ اس لیے اسے JENA یونیورسٹی نے شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر پرویشیا کا بادشاہ بے حد ناراض ہوا۔ اس نے ایک شاہی فرمان کانٹ کے نام جاری کیا جس میں کانٹ کی شدید مذمت کی گئی کہ اس کے نظریات کی وجہ سے مقدس کتابوں کی بے حرمتی ہوئی ہے اور عیسائی اعتقادات کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ اسے متنبہ کیا گیا کہ وہ مستقبل میں ایسی کوئی تحریر لکھے اور اپنے فرائض کو اس طرح ادا کرے کہ اعتقادات پر حرف نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی گئی کہ اگر اس نے آئندہ احتیاط نہ برتی تو پھر ناخوشگوار نتائج پیدا ہوں گے۔

کانٹ نے خاموشی اختیار کیے رکھی اصل میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ اپنی اس کتاب کے حوالے سے کہہ چکا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں کانٹ کا انتقال ہوا۔"

فلاسفیکل ڈکشنری

ڈرامہ، فلسفہ، رومانس، تاریخ، ادبی تنقید، شاعری والٹیئر نے ہر صنف کو اپنی بے پناہ ذکاوت، بذلہ سنجی، طنز اور سماجی تنقید کا موضوع بنایا۔ دنیا والٹیر کو ایک اور حوالے سے بھی جانتی ہے کہ وہ مذہبی تعصب کا کٹرترین نقاد تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں اور اپنے زمانے اور آنے والے دور کے فرانس کو ہی نہیں پوری دنیا کو متاثر کیا۔

اس نے ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ ایسی زندگی جس کے واقعات آج بھی ہمارے ذہنوں میں متحرک اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسی بھرپور طوفانی تہلکہ خیز ہے کہ کئی سوانح نگاروں نے اس پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی زندگی کے کسی ایک عہد کو اپنا موضوع بناکر ایک بھرپور کتاب لکھ دی ہے۔

والٹیر۔ ایک سچا انقلابی تھا۔ اپنی تحریروں سے، اپنے اعمال سے، جدوجہد سے، اپنی گفتار سے، طرز زیست کے اعتبار سے وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک انقلابی تھا۔ فرانس کا آخری لوئی شہنشاہ انقلاب فرانس برپا ہونے کے بعد کہتا ہے

"انقلاب فرانس۔ کچھ بھی نہیں، سوائے والٹیر اور روسو کے۔"

والٹیر کی ہنگامہ خیز زندگی کی کچھ جھلکیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کیسا انسان تھا۔ اور اس نے کیسی زندگی بسر کی۔

وہ ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ سات برس کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۰۴ء میں وہ لوئی لی گراند کے جیسوئیٹ کالج میں داخل ہوا۔ ۱۷۱۱ء میں اس نے کالج کو خیرباد کہہ

دیا اس نے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کیونکہ یہ اس کے والد کی خواہش تھی۔ والٹیر کو اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ۱۷۱۵ء میں والٹیر نے اپنا پہلا ڈرامہ "اوڈیپ" مکمل کیا۔ اب اس کی زبان کھل چکی تھی اس کے منہ سے نکلنے والے جملے فوراً پیرس اور پھر فرانس میں پھیل جاتے تھے۔ ۱۷۱۶ء میں اُسے سچائی اور طنز کی وجہ سے پیرس سے نکال دیا گیا۔ ۱۷۱۷ء میں پیرس واپس آکر اس نے اپنی ہجو اور طنز نگاری زیادہ شدت سے شروع کی تو اسے مشہور زمانہ باستیل زندان کی ہوا کھانی پڑی یہاں اس نے "اوڈیپ" کی نظرثانی کی اور ہیزیڈ لکھنا شروع کیا۔ ۱۷۱۸ء میں اُسے باستیل سے آزادی نصیب ہوئی۔ اسی برس اس کا کھیل "اوڈیپ" سٹیج ہوا اور اس نے فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ ۱۷۱۹ء میں برسراقتدار طبقے کو پھر اس کی حق گوئی پسند نہ آئی تو اسے پیرس سے جلاوطن کردیا گیا۔ اسی سال وہ پھر پیرس آگیا۔ ۱۷۲۱ء میں والٹیر کا والد فوت ہوتا ہے اور ترکے میں اس کے لیے چار ہزار لیور کی سالانہ آمدنی چھوڑتا ہے۔ ہیزیڈ کی اشاعت پر فرانس میں پابندی لگی ہالینڈ میں شائع ہوئی اور اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس نے شارل دوازدہم کی سوانح عمری لکھنی شروع کی۔ "انگلش لیٹرز" پر کام شروع کیا۔ ۱۷۲۹ء میں جب والٹیر موسم بہار میں فرانس واپس آیا تو قسمت اس پر ایک عجیب انداز سے مہربان ہوئی۔ لاٹری میں اسے ایک خطیر ترین رقم جیتنے کا موقع ملا۔ شارل دوازدہم کی پہلی اشاعت پر بھی فرانس میں پابندی لگی۔ لیکن کتاب سمگل ہو کر فرانس پہنچ گئی۔ ۱۷۳۰ء میں اس کے کھیل "بروٹس" نے فقید المثال کامیابی حاصل کی ۱۷۳۴ء میں حکومت نے "لیٹرز" پر پابندی لگادی۔ والٹیر کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کردیے گئے والٹیر پیرس سے چلا گیا۔ ۱۷۳۵ء میں ہیزیڈ کی موت حکام کی اجازت کے بغیر شائع کی گئی۔ فرانس کا برسراقتدار طبقہ اب والٹیر سے بے حد تنگ آچکا تھا اور اسے باقاعدہ دھمکیاں ملنے لگیں۔ ۱۷۳۳ء میں اس کی کتاب "نیوٹن کے فلسفے کے عناصر" شائع کی گئی۔ ۱۷۴۱ء میں اس نے رسول کریم صلعم پر اپنا کھیل مکمل کیا اور اسی برس اسے ۱۷۴۲ء میں کھیلا بھی گیا۔ اور اسے شاندار کامیابی ہوئی۔ ۱۷۴۵ء سے پہلے وہ "میٹرز اینڈ سپرٹس آف دی نیشنز" اور لوئی چہاردہم لکھ چکا تھا۔ مادام پمپاڈور کی وجہ سے اسے حکومت نے سرکاری سوانح نگار مقرر کرلیا ۱۷۴۶ء میں وہ اکیڈمی آف فرانس کا رکن منتخب کرلیا گیا۔ وہ اس کا استحقاق تو برسوں پہلے سے رکھتا تھا۔ لیکن برسراقتدار طبقہ اس کی مخالفت کرتا

رہا تھا۔ والٹیر اپنی صاف گوئی اور بذلہ سنجی کی بنا پر ایک بار پھر معتوب ہوا۔ دربار سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ دو ایک برس وہ فرانس چھوڑ کر برلن میں مقیم رہا۔ فریڈرک اعظم بگڑ گیا اور اس کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ کچھ عرصہ والٹیر حراست میں رہا۔

والٹیر نے ایک عجیب انداز کی زندگی گزاری۔ مالی اعتبار سے خوشحال رہا۔ باپ نے ترکہ چھوڑا۔ بھائی مرا تو وہ بھی جائداد اس کے لیے چھوڑ گیا۔ لاٹری میں خطیر رقم جیت لی ڈراموں سے خاصی آمدنی ہوئی۔ کئی نامور خواتین کے ساتھ اس کے برسوں تک تعلقات رہے۔ حکومت اور مذہب کے اجارہ داروں سے مسلسل نبرد آزما رہا۔ کتنی ہی دفعہ پیرس سے جلا وطن ہوا۔ کتنی ہی کتابوں پر پابندی لگی۔ اور کتنی ہی بار اس کی کتابوں کے خفیہ ایڈیشن فرانس میں شائع ہوئے۔ کتنی ہی بار اس کی کتابوں کو حکومت اور مذہبی اجارہ داروں کے ایما پر سے جلایا گیا۔ لیکن وہ اپنی حق گوئی، بذلہ سنجی، طنز اور سچائی سے باز نہ آیا۔ اس نے فرنی میں ایک بڑی جائداد خریدی جہاں اس نے زندگی کے آخری بیس برس گزارے۔ وہاں اس نے ایک مثالی بستی آباد کی۔ اور مسلسل لکھتا رہا وہ ایک ایسا چشمہ تھا جو کبھی خشک نہ ہوا، رسالے، پمفلٹ، مضامین اور کتابیں لکھتا رہا۔

۱۷۵۹ء میں اس کی کتاب "نیچرل لا" نذر آتش ہوئی۔ انسائیکلوپیڈیا کا کام رکوا دیا گیا اور اسی برس کینڈید شائع ہوئی۔ ۱۷۶۳ء میں اس کی تصنیف "رسالہ درباره تحمل بردباری" شائع ہوا جس نے پاپائیت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں ۱۷۶۴ء سن ہے جب اس کی کتاب "فلاسفیکل ڈکشنری" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ فرنی میں اپنی جاگیر پر اس نے جنیوا کے گھڑی سازوں کو بسا کر گھڑی سازی کی صنعت شروع کر دی۔

والٹیر کاروبار میں بھی بے حد تیز تھا۔ گھڑی سازی کے ساتھ ساتھ لیس سازی کا کام بھی شروع کرا دیا۔ اسے لاکھوں فرانک کی سالانہ آمدنی ہوتی رہی۔ وہ پیرس سے نکال دیا گیا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ فرنی میں ایک نئی بستی تعمیر کر چکا تھا۔ جو دنیا بھر کے فلسفیوں، شاعروں، حکمرانوں، سیاست دانوں، ہنرمندوں اور لکھنے والوں کے علاوہ انصاف کے طلب گاروں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ والٹیر نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور جہاد کیا۔

"آئرین" والٹیر کا آخری ڈراما تھا جو مارچ ۱۷۷۸ء میں پیرس میں کھیلا گیا اس ڈرامے کے افتتاح کے وقت وہ پیرس آیا۔ ۳۰ رمئی ۱۷۷۸ء کو اس کا انتقال ہوا۔ مذہب کے اجارہ داروں کے خوف سے اس کی لاش کو خفیہ طریقے سے شہر سے نکالا اور جلدی سے دفنا دیا گیا۔ کیونکہ مذہب کے اجارہ دار انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں اس کی لاش پھر فرانس لا کر پورے احترام سے دفن کی گئی۔

فلاسفیکل ڈکشنری

ان گنت ایسے طنزیہ اور شگفتہ جملے ہیں جو آج دنیا کی ہر زبان میں والٹیر کے حوالے سے منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ والٹیر جیسے آدمی کو ہی جرأت حاصل تھی کہ وہ پاپائے روم کو للکار کر کہہ سکتا تھا ،۔

"ہم بحث تو کر رہے ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم جو الفاظ استعمال کر رہے ہیں پہلے ان کے معانی کا تعین کر لیں۔" ایک جملے میں اس نے پاپائے روم کی علیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

والٹیر نے بہت لکھا کتابیں، ڈرامے، فلسفہ، شاعری، تنقید، رسالے، پمفلٹ وغیرہ آج اس کا بہت سا کام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو ہنگامی نوعیت کی تھیں۔ اس زمانے کے برسر اقتدار افراد اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف لکھی گئی تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود فراموش کر دی گئیں۔ اس کے ڈرامے بھی اب بہت کم کھیلے جاتے ہیں تاہم اس نے اپنی زندگی میں بیس ہزار کے لگ بھگ خطوط لکھے تھے۔ جو جمع ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور اس کی بعض کتابیں بار بار شائع ہوئی ہیں۔ کینڈیڈ ایسی کتاب ہے جو اُردو میں بھی اغلباً دو بار ترجمہ ہو چکی ہے جو بلاشبہ اس کا زندہ رہنے والا کام ہے۔ والٹیر کس اعتبار سے بڑا لکھنے والا ہے اور "فلاسفیکل ڈکشنری" میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اسے دنیا کی سو عظیم ترین کتابوں میں شامل کیا جا رہا ہے؟

پہلے سوال کا معقول ترین جواب BEN RAY REDMAN نے دیا ہے اور اسی میں دوسرے سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ بن رے ریڈمین لکھتا ہے:۔

"بلاشبہ وہ ڈانٹے، ملٹن اور شیکسپیئر کی صف کا بڑا لکھنے والا نہ تھا نہ ہی وہ ٹالسٹائی، بالزاک دوستوئیفسکی ڈکنز اور پروست کی سطح کا مصنف تھا۔ اور اس نے کردار تخلیق نہیں کیے۔ ایسے مناظر پیش نہیں کیے جن میں زندگی چل رہی ہو اس نے انسانی فطرت کی برائیوں کو بھی دریافت نہیں کیا۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی عظیم نہ تھا۔ وہ ذہین پُر ذکاوت اور قابل تعریف ڈرامہ نگار تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مروجہ قواعد کے مطابق کامیاب کھیل لکھنا جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑا ڈرامہ نگار نہ تھا۔ اس کے کھیلوں نے کبھی قومی اور لسانی سرحدوں کو عبور نہ کیا۔ اور آج فرانس بمشکل ہی اس کے کھیلوں کو یاد کرتا ہے۔ والٹیر ڈیکارت اور لاک جیسا فلسفی بھی نہ تھا۔ مورخ کی حیثیت سے بھی اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ گبن اس کا مداح تھا۔ اور والٹیر سے ملنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ گبن نے اپنے پیچھے ایک بڑا کارنامہ DECLINE OF THE ROMAN EMPIRE چھوڑا ہے جب کہ والٹیر کی کوئی تاریخی کتاب اس مرتبے تک نہیں پہنچی۔ سائنسی تجربات کے میدان میں بھی والٹیر کا مرتبہ فرینکلن سے کمتر بنتا ہے۔

"پھر والٹیر اتنا اہم کیوں ہے؟ والٹیر اپنی صدی کی آواز ہے۔ خردمندی روشن خیالی کے دور کا وہ سب سے اہم اور سب سے بڑا ترجمان اور نمائندہ ہے اور پھر اس کی ذکاوت بذلہ سنجی اور اس کا اسلوب قطعی، پرلطف غیر مبہم اور دل میں اُتر جانے والا۔ والٹیر کو پڑھنے کے لیے زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسے سننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک بولنے والا آدمی ہے جو اپنی کتاب میں بولتا ہے

"اس کی تمام تحریروں میں خواہ وہ پروپیگنڈہ پمفلٹ ہی کیوں نہ ہو وہ خیالات ملتے ہیں جو ہنگامی مسائل سے جنم لیتے ہیں لیکن روشن خیالی اور خرد افروزی کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ جانتا تھا کہ کس بے ریائی سے، کس بے رحمی، کس نرمی، کس التجائیہ انداز اور کس غصیلے لہجے میں اسے کونسی بات کہنی ہے۔"

والٹیر دراصل ایک معلّم تھا۔ اور ایسے معلّم دنیا نے کم ہی پیدا کیے ہیں۔ خود والٹیر کا اس پر ایمان تھا کہ جو لکھنے والا کچھ سکھاتا اور تعلیم نہیں دیتا وہ سرے سے لکھنے والا ہی نہیں ہے تاریخ کو وہ عقلی رویے کے رہنما کا درجہ دیتا تھا۔ اخلاقی فلسفے اور اخلاقیات اس کے خیال میں بے معنی

تھے جو فن معاشرے کی بہبود میں کام نہیں آتا اسے وہ سرے سے تسلیم نہ کرتا تھا۔ فریڈرک اعظم کے نام اس نے لکھا تھا۔

"وہ شاعری جو انسانوں کو نئی اور متحرک سچائیوں کی تعلیم نہیں دیتی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُسے پڑھا جائے۔

پھر اس کی بذلہ سنجی، اس کی ذکاوت، اس کی طنز جو دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہے والٹیر خرد افروزی اور روشن خیالی کے دور کا سب سے اہم لکھنے والا بن جاتا ہے اور اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنی تصانیف اپنی زندگی اور اپنے رویوں سے انقلاب فرانس کے لیے زمین ہموار کر کے انقلاب کا بیج بو دیا جو بار آور ثابت ہوا۔

فلاسفیکل ڈکشنری، والٹیر کی وہ تصنیف ہے جو اس کے آخری زمانے کی چند کتابوں میں اہم ترین درجے کی حامل ہے۔ اس میں اس کی ذکاوت، اس کی بذلہ سنجی، روشن خیالی اور خرد افروزی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جب اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تو ناسازگار حالات کی وجہ سے والٹیر نے اس پر اپنا نام نہ دیا تھا۔ بلکہ یہ گمنام مصنف کی تخلیق کی حیثیت سے شائع ہوئی تھی۔ "فلاسفیکل ڈکشنری" نام سے ہی ظاہر ہے کہ خالص فلسفے کی کتاب نہیں۔ والٹیر کی پوری فکر، رجحانات، رویے اور اسلوب کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب اس کی نمائندہ ترین تصنیف قرار دی گئی ہے۔ فلاسفیکل ڈکشنری اپنی اشاعت سے لے کر دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کے کاٹ دار، تیز فکر انگیز جملے ضرب المثل بنے ہیں۔ جن زبانوں میں اس کا پورا ترجمہ نہیں ہوا (مثلاً اُردو) ان زبانوں میں بھی اس کے ٹکڑے مختلف حوالوں سے موجود ہیں۔ فلاسفیکل ڈکشنری۔ اس والٹیر کی نمائندہ ترین تصنیف ہے جس کی فکر نے انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کی اور انقلاب فرانس، انسانی تاریخ کا وہ منفرد اور یکتا واقعہ اور موڑ ہے جس نے پوری دنیا کو تب سے اب تک متاثر کیا اور رہنمائی بخشی ہے۔

"فلاسفیکل ڈکشنری" کی ایک مختصر سی تلخیص

☆ — ہر دور میں ایسے منطقے ہوتے ہیں جن میں قدماء کے مقابلے میں نئے لوگوں کا کام بہتر

ہوتا ہے۔ خواہ یہ نئے لوگ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں اور تعداد کی یہی کمی ہمیں قدماء کے مقابلے میں کمتر بنا دیتی ہے۔

٭۔ وہ آدمی یقیناً بہت بڑا احمق اور جاہل ہے کیونکہ اس سے جو سوال پوچھا جاتا ہے وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

٭۔ تمام فلسفیوں کے خیال میں مادہ ازلی اور دائمی ہے لیکن فنون بالکل نئے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ روٹی بنانے کا فن تک موجودہ دور کی پیداوار ہے۔

٭۔ لکھنے والے کو سچ بولنا چاہیے اور اپنے قاری کو کبھی فریب نہ دینا چاہیے۔

٭۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے لیکن یہ بات اب ظاہر ہو رہی ہے کہ ایٹم کو فطرت کے قانون نے بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ تقسیم نہیں ہو سکتے۔

٭۔ اختیار اور اقتدار کیا ہے؟ سات کارڈنیل، جن کی اعانت ان کے نائب کر رہے ہیں۔ انہوں نے اٹلی کے رہنے والے اپنے زمانے کے سب سے بڑے مفکر (گیلیلیو) کو زنداں میں پھینکوا دیا۔ اسے صرف روٹی اور پانی پر زندہ رکھا گیا۔ اس لیے کہ اس نے انسانی نسلوں کی رہنمائی کی تھی۔ ان کو تعلیم دی تھی۔ جبکہ اس کو سزا دینے والے .... جاہل اور صاحبِ اقتدار تھے۔

٭۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مصنّف اور لکھنے والے بن بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ان کے والدین نے ان کو کوئی ہنر نہیں سکھایا ہوتا۔ یہ ہمارے دور کا بہت بڑا المیہ ہے جس کا جی چاہے وہ صحافی بن جاتا ہے۔ وہ گھٹیا ترین ادب کی کاشت کرتا ہے اور اپنے آپ کو بڑے فخر سے مصنّف کہلاتا ہے۔ اصلی اور سچے مصنّف تو وہ ہیں جو انسانی نسلوں کو تعلیم دیتے اور ان کو محظوظ کرتے ہیں۔ جن بے ہنر لکھنے والوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی حیثیت آدمیوں میں وہی ہے جو چمگادڑ کی پرندوں میں ہوتی ہے۔

٭۔ ایک روز میں ایک المیہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے فلسفی نے کہا "کتنا خوب صورت ہے۔" میں نے اس سے پوچھا "تم نے اس میں خوب صورتی کو کیسے پالیا؟" "یہ خوب صورت ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کیونکہ اس میں مصنّف جو کہنا چاہتا تھا اس

کامیاب رہا ہے۔"

دوسرے دن اس فلسفی نے ایک دوائی استعمال کی جو اسے فائدہ پہنچاتی تھی۔ میں نے کہا "یہ دوائی جس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس نے یہ مقصد پورا کر دیا۔ کتنی خوبصورت دوائی ہے۔" وہ سمجھ گیا کہ کسی دوائی کو خوب صورت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خوب صورتی کچھ ایسی چیز ہے جو آپ میں تحسین اور مسرت کے جذبات پیدا کرے۔ اس فلسفی نے تسلیم کیا کہ اس المیہ کھیل نے اس میں یہ احساسات پیدا اور بیدار کیے تھے۔ اور یہی خوبصورتی کی صفت ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم انگلستان گئے جہاں وہی کھیل انگریزی میں ترجمہ کر کے کھیلا جا رہا تھا۔ لیکن اس کھیل کو دیکھ کر لوگ جمائیاں لے رہے تھے۔ فلسفی نے کہا۔ اوہ۔ جو چیز فرانسیسیوں کو اچھی لگی وہ انگریزوں کو پسند نہ آئی۔ تب وہ فلسفی اس نتیجہ پر پہنچا کہ خوب صورتی بیشتر صورتوں میں اضافی شے ہوتی ہے جسے جاپان میں نفیس اور عمدہ سمجھا جاتا ہے وہی روم میں ناپسندیدہ قرار پاتی ہے۔

بعض ایسے اعمال ہوتے ہیں جنہیں ساری دنیا خوب صورت تسلیم کرتی ہے سپنزر کے دو فوجی افسر ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ سپنزر نے ان کو پیغام بھیج کر چیلنج دیا کہ جو ایک دوسرے کا خون بہائے گا وہ بہادر نہیں ہوگا۔ بلکہ فلاں معرکے میں جو دشمن کے خلاف بہادری سے لڑے گا وہ بہادر تسلیم کیا جائے گا۔ ایک افسر دشمن کے مقابلے میں گھرا ہوا جب مرنے والا تھا تو اس کے حریف نے آگے بڑھ کر دشمن کو پچھاڑ کر اسے بچا لیا۔ یہ وہ عمل ہے جسے ساری دنیا خوب صورت کہے گی۔ ایک دوست اپنے دوست کے لیے جان دے دیتا ہے۔ ایک بیٹا باپ کے لیے جان دے دیتا ہے۔ یہ ایسے اعمال ہیں جن کی وہ توصیف کرتے ہیں۔ اور ان سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔ خوب صورتی کنفیوشس کے الفاظ میں یہ ہے۔ "زخموں کو بھول جاؤ۔ مہربانی کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ نیکی یہ ہے جس کو زرتشت نے یوں بیان کیا ہے۔ اگر ذرا سا شبہ بھی پیدا ہو جائے کہ یہ کام غیر منصفانہ ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ۔" گول آنکھوں، کالی چمڑی، چپٹے ناک والا حبشی ہمارے دربار کی حسین ترین خواتین کو خوب صورت نہ کہے گا لیکن جن اعمال کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں،

خوب صورت تسلیم کرے گا۔ حتیٰ کہ دنیا کا مفسد اور بدترین شخص بھی اس دانائی کو سراہے گا جس کی تقلید اس نے خود کبھی نہیں کی۔

٭۔ آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیئے کہ جب سے دنیا بنی ہے وحشی نسلوں کو چھوڑ کر، اس پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے۔

٭۔ مذہب اور اخلاقیات۔ قدرت کی قوّت کو توڑ دیتے ہیں۔

٭۔ غور کر کے دیکھ لیجیے، مذاہب پر موسموں کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ گرم خطوں میں مذہب یہ اصول بناتا ہے کہ انسان غسل کرے اور اس کا غسل مذہبی رسم بن جاتی ہے۔

٭۔ زمانہ حال۔ حاملہ عورت کی طرح ہے جس کے پیٹ میں مستقبل پل رہا ہے۔

٭۔ اصول پر کھا جائے تو پھر بڑے آدمیوں کے جرائم۔ جو ہمیشہ اقتدار اور مطالع آزمائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور عوام کے جرائم میں کوئی فرق نہیں جو ہمیشہ آزادی اور مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک متمدن جمہوریہ کو سمجھنے کے لیے ایک تمثیلی حکایت سے بہتر کوئی مثال نہیں ہے۔

ایک اژدہا ہے جس کے کئی سر ہیں۔ ایک اور اژدہا ہے جس کی کئی دُمیں ہیں کئی سر ایک دوسرے کو زخمی کرتے رہتے ہیں اور بہت سی دُمیں ایک بڑے سر کی اطاعت میں ہلتی رہتی ہیں۔ جمہوریت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں بڑی بڑی تباہ کن غلطیاں، لیکن جمہوریت اس سمندر کی طرح ہے جس میں زہر ملا دیا جائے تو بھی سمندر کا کچھ نہیں بگڑتا۔

٭۔ یہ میری ضرورت ہے کہ میں لکھوں۔ یہ آپ کے اندر کی بھوک ہے جو آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ میری تحریر کو رَد کریں۔ میں اور آپ۔ ہم دونوں یکساں سطح کے احمق ہیں۔ آپ کی فطرت میں نقصان پہنچانا ہے میری فطرت میں سچائی سے محبت کرنا شامل ہے اور آپ کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے عام کرنا ہے۔ الّو جو چوہے کھا کر پیٹ بھرتا ہے اس نے بلبل سے کہا۔ "اس خوب صورت سایہ دار درخت کے نیچے چھُپ کر مت گاؤ۔ میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں کھا جاؤں۔" بلبل جواب دیتا ہے۔ "میں یہاں گانے کے لیے پیدا کی گئی اور تم پر ہنسنے کے لیے ....."

☆ ۔ مذہب کا ادارہ اس لیے وجود میں آیا بنی نوع انسان کو منظم کر سکے ۔ اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ خدا کی شان اور خوبیوں کو اپنی دانائی بنا سکیں مذہب میں ہر وہ چیز جو اس مقصد کو پورا نہیں کرتی وہ غیر شے اور خطرناک ہے ۔

☆ ۔ مذہب کو انسانوں پر صرف روحانی اختیار ہونا چاہیے ۔

☆ ۔ انسان اگر ضرورتوں سے آزاد ہو جائیں تو بلاشبہ وہ ایک دوسرے کے مساوی ہو سکتے ہیں ۔ الواح انسانی میں یہ غربت ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کا تابع بنا رکھا ہے ۔ ناہمواری اور غیر مساوات ہماری بدقسمتی ہیں ۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دوسروں کے محتاج بننے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں ۔ ہماری اس رنجور دنیا میں انسانوں کے لیے یہ ناممکن بنا دیا گیا ہے کہ وہ خوش حالی اور آسودہ زندگی بسر کر سکیں ۔ کیونکہ انسانوں کو دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ امیر، جو حکم چلاتا ہے اور غریب، جو خدمت بجا لانے پر مجبور ہے ۔ ان طبقوں کو ہزاروں طرح سے تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کر دی گئی ہے ۔ اس کے باوجود تمام انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ خواہش ایک حق کی طرح موجود ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے برابر ہیں ۔ اس کا فیصلہ یہ نہیں ہے کہ ایک مذہبی رہنما کا باورچی اسے یہ حکم دے کہ چونکہ ہم مساوی ہیں اس لیے تم میرے لیے کھانا تیار کرو ۔ انسانوں کی مساوات کی صحیح تعریف یوں ہے کہ وہ باورچی اپنے عظیم مذہبی رہنما کے سامنے کہہ سکے کہ میں بھی اپنے آقا کی طرح انسان ہوں ۔ میں بھی اسی طرح چیختا ہوا پیدا ہوا تھا ۔ وہ بھی اسی کرب اور درد میں مبتلا ہو کر مرے گا جو میں برداشت کروں گا ۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سے جانوروں کی سی حرکات کرتے ہیں اور ترک رودم پر قبضہ کر سکتے ہیں تو پھر میں بھی مذہبی رہنما بن سکتا ہوں اور میرا موجودہ آقا ۔ میرا خانساماں ہو سکتا ہے ۔

☆ ۔ اُدھر مذاہب دنیا میں آئے ادھر اور ہر مضحکہ خیز رسموں نے جنم لینا شروع کیا ۔

☆ ۔ وہ جس کے دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کا وطن کبھی عظیم تر، حقیر، امیر ترین اور غریب ترین ملک نہ بنے وہ عالمی شہری ہے ۔

☆ ۔ دوستی روحوں کی شادی ہے اور اس شادی میں طلاق ہو سکتی ہے ۔ یہ دو حساس

اور دانا انسانوں میں ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ بڑے لوگوں کو بُرائیاں مل جاتی ہیں۔ خود غرض لوگوں کو ساتھی نصیب ہو جاتے ہیں۔ سیاست دان اپنے ہمنواؤں کو جمع کر لیتے ہیں۔ شاہزادوں کو درباری ملتے ہیں اور آرام طلب لوگوں کو خوشامدی۔ لیکن صرف حساس اور دانا شخص کو دوست نصیب ہوتا ہے۔

٭۔ بڑے آدمی پر کبھی کوئی حکمراں نہیں کر سکتا۔

٭۔ لوگ بے شرمی کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم قتل و غارت کی داستانیں بڑی اونچی آواز میں دُہراتے ہیں۔ دوسروں کو دکھ پہنچانے اور غداری کے قصے بلند آواز میں سناتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے لیکن صرف محبت کا اظہار اور اعلان ہم سرگوشیوں میں کرتے ہیں۔

٭۔ قوانین کا کیا ہے۔ چوروں کے درمیان بھی کچھ قوانین نافذ ہوتے ہیں اور لوٹ اور جنگ کے لیے بھی قانون بنائے جاتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت نے ہر شخص کو یہ سوجھ بوجھ ودیعت کی ہے کہ وہ قانون بنا سکتا ہے۔ لیکن منصفانہ قانون بنانے والے کتنے ہیں۔ تم اس وقت تک احمق اور جاہل ہی رہو گے جب تک تم اپنے بے ہودہ قوانین کی اصلاح نہیں کر لیتے۔"

٭۔ آپ کتابوں سے خوف کھاتے ہیں اس لیے ان پر پابندی لگاتے ہیں۔ سنو! انسانوں کو پڑھنے اور ناچنے دو۔ کتابیں اور رقص۔ دنیا کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

٭۔ خدا سے کس طرح محبت کی جائے۔ خدا سے محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ان سوالوں پر اتنے جھگڑے اُٹھے ہیں کہ انسانوں کے دلوں میں نفرت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ ایک دوسرے کے لیے۔!

٭۔ کبھی خدا سے سب سے زیادہ محبت کی جاتی تھی پھر... اقتدار، آسودگی، عیش و عشرت، مسرت اور دولت سے محبت کی جانے لگی۔

٭۔ نباتات کی سطح سے اوپر اُٹھنے اور خالص حیوانی حالت سے بچپن تک پہنچنے کے لیے آدمی کو بیس برس کی مدت لگتی ہے۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس میں شعور کے آثار نمودار

ہوتے ہیں۔ انسانی ڈھانچے کے بارے میں تھوڑی سی معلومات تیس صدیوں میں جاکر حاصل ہوسکی ہیں۔ اس کی روح کو جاننے کے لیے تو ابدیت کی ضرورت ہے لیکن اسے ہلاک کرنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے۔

٭۔ میں ایک بار پھر آپ جاہلوں کو بتاتا ہوں کہ یہ آپ کی جہالت ہے جس کی وجہ سے آپ محمدؐ کے مذہب کو شہوانی سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں ایک لفظ کی بھی سچائی نہیں ہے۔ اس بات پر بھی کتنی ہی دوسری سچائیوں کی طرح آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ تمہارے راہب، پادری، مذہبی رہنما کیا انسانوں پر یہ قانون لاگو کرسکتے ہیں کہ صبح چار بجے سے رات دس بجے تک نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا۔ اور روزہ رکھنا ہے کیا شراب ممنوع قرار دی جاسکتی ہے کیا جلتے ہوئے صحراؤں میں سفر کرکے تم حج کا حکم دے سکتے ہو کیا تم غریبوں کو اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ زکوٰۃ میں دے سکتے ہو۔ اگر تم اٹھارہ اٹھارہ عورتوں کی محبت سے لطف اٹھا رہے ہوتے اور حکم دیا جاتا کہ صرف چار بیویاں ہی رکھی جاسکتی ہیں تو کیا تم یہ حکم مان لیتے۔ کیا تم ایسے مذہب کو شہوانی کہہ سکتے ہو؟ محمد (صلعم) آسمان پر معراج کے لیے گئے، اس معراج کے واقعہ کو ہم خود ثابت کرچکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ مورخ جو مرضی بکواس کرتے رہیں۔

٭۔ قدرتی قانون کیا ہے وہ جبلت جو ہمیں انصاف کو محسوس کرنا سکھاتی ہے۔

٭۔ وہ جو یہ کہتے ہیں کہ انقلاب خاموشی اور امن سے برپا کیا جاسکتا ہے۔

٭۔ وہ انقلاب کے معنی جانتے نہیں۔ اور مذہبی وہ دانا میں وہ محض احمق ہیں۔

٭۔ تعصب ایک ایسی رائے ہے جس میں انصاف کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ بیشتر تاریخی واقعات اور قصے جن پر یقین کرلیا گیا ہے۔ ان کا بھرپور تجزیہ کبھی نہیں ہوا۔ یہ قصے تعصب کی پیداوار ہیں۔ مذہبی تعصب ظلم کو جنم دیتا ہے۔ اور بردباری کو ختم کرتا ہے۔

٭۔ سقراط نے اس لیے زہر پیا کہ وہ خدا کی وحدت پر یقین رکھتا تھا۔ ایتھنز کے لوگوں نے اس کی موت کے بعد اس کی یاد میں ایک مندر تعمیر کردیا۔ ہاں اس سقراط کی یاد میں جو ہر طرح کے معبدوں سے نفرت کرتا تھا۔

☆ ۔ اوہام پرست شخص مذہبی جنون کا غلام ہوتا ہے اور پھر خود مذہبی جنونی بن جاتا ہے عیسائیت کے بارے میں دعوے تو بہت ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کے سب بڑے جادو کی طاقت کو مانتے تھے ۔

☆ ۔ خدا پرست کو یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ خدا کس طرح سزا دیتا ہے ۔ کس طرح تحفظ فراہم کرتا ہے کیسے معاف کرتا ہے ۔ کیونکہ خدا پرست میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ خدا کے اعمال کو سمجھنے کی کوشش کر سکے ۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ خدا قادر مطلق ہے اور قسمت کے بارے میں جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ خدا پرست کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتے کیونکہ محض دلائل کبھی شواہد کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے ۔

☆ ۔ تحمل انسانی فطرت کی سب سے بڑی حزل ہے ۔ ہم سب خطا کے پتلے ہیں ۔ اس لیے آئیے دوسرے شخص کی حماقت کو معاف کر دیں ۔ یہی فطرت کا پہلا قانون ہے ۔

☆ ۔ اگر صرف سچائی پر مبنی اور کار آمد باتوں کو ہی کتابوں میں محفوظ کیا جاتا تو ہمارے عظیم الشان کتب خانے سکڑ اور سمٹ کر بہت چھوٹے ہو جاتے ۔

☆ ۔ دہریت اور مذہبی جنون دو ایسے درندے ہیں جو معاشرے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں ۔ دہریے کے پاس بہرحال کچھ دلیل اور سوجھ بوجھ ہوتی ہے ۔ وہ اس عقل اور سوجھ بوجھ کو بروئے کار لاتا ہے جبکہ مذہبی جنونی پاگل پن کے زیر اثر ہوتا ہے ۔

☆ ۔ ہر وہ ملک جہاں لوگ بھیک مانگتے ہیں جہاں بے تعصبی نہیں وہاں بُری حکومت قائم ہے ۔

☆ ۔ ہمیں مذہب کے معاملے میں اپنے نظریات کو زیادہ گہرائی میں نہیں لے جانا چاہیئے خدا نے ہمیں اس سے باز رکھا ہے ۔ ہمارے لیے سادہ مذہبی عقیدہ ہی کافی ہے ۔

☆ ۔ تاریخ میں ہمیں محض ان لوگوں کا بیان ملتا ہے جنہوں نے دوسروں کی املاک پر قبضہ کر لیا ۔

☆ ۔ مابعد الطبیعیات اور اخلاق کے باب میں قدما ہر بات کہہ چکے ہیں ۔ ہم محض ان کو دہراتے ہیں ۔

٭۔ ہومر نے کبھی آنسوؤں کو تخلیق نہیں کیا۔ اصل شاعر میرے نزدیک وہ ہے جو روح کو چھوتا اور اسے گداز بخشتا ہے۔ یہ میری اپنی رائے ہے۔ مونتین نے کہا "میں اپنی رائے دیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہتر ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ میری اپنی رائے ہے۔"

٭۔ میرا ذہن یہ پوری طرح قبول کرتا ہے ایک لازمی، ناگزیر، ابدی، بلند ترین، ذہین ترین وجود موجود ہے۔ یہ عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ عقل تسلیم کرتی ہے۔

٭۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی بھی حکومت اور ریاست کو کسی بھی فرقے کی برتری سے محفوظ رکھا جائے تو بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کیجیے۔

٭۔ بُری کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں۔

٭۔ وہ لوگ کہاں ہیں۔ کہاں ملیں گے۔ جو سچ کا اظہار کرتے ہیں۔

٭۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اچھے قوانین بنائے جائیں تو پھر موجودہ تمام قوانین کو جلا دیجیے

٭۔ کسی مقبول عالم رائے کو تباہ کرنے میں عمریں لگ جاتی ہیں۔

٭۔ میرا عقیدہ ہے کہ فلسفہ کے کسی نظام کا کوئی ایسا خالق نہیں ہے جس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ اعتراف نہ کیا ہو کہ اس نے اپنا وقت ضائع کیا۔ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عملی فنون کے موجد بنی نوع انسان کے لیے کہیں زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ وہ جو صرف خیالات کو تخلیق کرتا ہے اسے اپنے خیالات کی تعبیر نہیں ملتی۔ لیکن جس نے بحری جہاز کو بنانے کا ارادہ کیا وہ ایک دن بحری جہاز پر سوار بھی ہو گیا تھا۔

٭۔ شاعری کی ایک ایسی خوبی ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شاعری تھوڑے لفظوں میں نثر کے مقابلے میں بھی زیادہ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

٭۔ یہ کتابیں ہی ہیں جو ہمارے دلوں اور ذہنوں کو روشن رکھتی ہیں۔

٭۔ دریا اتنی تیزی سے سمندر کی طرف نہیں بہتے جتنی تیزی سے انسان غلطی کی طرف لپکتا ہے۔

٭۔ میں تو سینٹ آف ڈائیڈیمس کو اپنا روحانی مرشد مانتا ہوں جو اس بات پر ہمیشہ اصرار کرتا تھا کہ جب تک تم ہاتھوں سے چھو کر نہ دیکھ لو کسی چیز یقین نہ کرو۔

میکاویلی

پرنس

شیطنیت اور میکیاولی۔ ایک ہی چیز کے دو نام اور ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔

میکیاولی کی کتاب "پرنس" کی اشاعت کے ساتھ ہی میکیاولی کو مطعون کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ تب سے اب تک جاری ہے۔ اس کے باوجود انسانی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو یوں لگتا ہے کہ جو درس میکیاولی اپنے پرنس۔ اپنے بادشاہ کو پڑھا رہا ہے۔ وہ سبق تو اس سے پہلے کے حکمران اور پھر اس کے بعد کے حکمران اس سے استفادہ کیے بغیر خود ہی پڑھے ہوئے تھے۔

"پرنس" کی اشاعت سے لے کر اب تک اس کتاب نے جو اثرات دنیا کی سیاست اور کاروبار حکمرانی پر مرتب کیے ہیں اس کتاب پر جو کچھ لکھا گیا اور میکیاولی کو جو کچھ کہا گیا۔ اگر اس کا ایک مختصر سا بھی جائزہ لیا جائے تو ہزاروں صفحات پر مشتمل کئی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔

"پرنس" کا خالق۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سیاست کو سائنس کا درجہ دیا اور وہ سیاسیات کو سائنس بنانے کا موجد اور بانی ہے۔ یقیناً ایسا شخص نہیں ہے کہ اس کے حالات زندگی کو صرف سنین کے حوالے سے بیان کیا جائے۔ اس کی زندگی اور زمانے کو سمجھنے سے اس کی کتاب جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

نکولوڈی برنارڈو میکیاولی۔ صرف سیاسی مفکر نہ تھا، وہ مورخ، سیاست دان،

سفارت کار اور ڈرامہ نگار بھی تھا۔ ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو وہ فلورنس (اٹلی) میں پیدا ہوا۔ اس کی جوانی کا دور بڑے ناخوشگوار حالات میں گزرا۔ فرانس نے اٹلی پر حملہ کیا تھا۔ اور اٹلی کا مشہور میڈیچی خاندان اقتدار سے محروم ہوا۔ اسے اٹلی سے نکال باہر کیا گیا۔ اٹلی میں نئی ری پبلک کا قیام عمل میں آیا تو میکیاولی کو اہم عہدہ ملا۔ اسے فرسٹ سیکریٹری کا عہدہ ۱۴۹۸ء میں ملا جو حکومت کا اہم ترین عہدہ تھا۔ ۱۵۱۲ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔ جب فلورنس کی یہ ری پبلک حکومت ختم ہوئی تو اس کا یہ عہدہ بھی ختم ہوگیا۔ میکیاولی نے کئی اہم سرکاری وفود میں سفارت کار کے فرائض انجام دیے۔ اس نے سفارت کے دوران جو تحریریں لکھیں وہ ان ملکوں کی سیاسی صورت حال کا بھرپور تجزیہ پیش کرتی ہیں۔

۱۵۱۲ء میں میڈیچی دوبارہ برسر اقتدار آئے۔ میکیاولی کا مربی سابق صاحب اقتدار سوڈرینی زیر عتاب آیا۔ اس کے ساتھ میکیاولی پر بھی سازش کا الزام لگایا گیا۔ ۱۵۱۲ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر تشدد بھی ہوا۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا۔ آنے والے کئی برسوں میں وہ تحریر و تصنیف میں مصروف رہا۔ اس نے فلورنس کی تاریخ بھی لکھی۔ یہ زمانہ اس نے فلورنس سے باہر گزارا۔ ۱۵۲۱ء میں اسے دوبارہ سفارتی فرائض سونپے گئے۔ فلورنس آکر وہ بیمار ہوا۔ اور ۲۰ جون ۱۵۲۷ء کو اس کا انتقال ہوا۔ ۱۵۰۲ء میں میکیاولی نے شادی کی تھی۔ وہ چھ بچوں کا باپ تھا۔

وہ صاحب طرز ادیب تھا۔ اس نے خالص تخلیقی کام بھی کیا۔ اطالوی زبان پر اس کا مقالہ اور اس کے متعدد طربیہ ڈرامے اس کی شخصیت کے اس پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔ جنہیں عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ میکیاولی کے ڈراموں کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ ان ڈراموں نے اطالوی سٹیج میں نئی زندگی اور توانائی پیدا کی۔

نظریات وافکار

میکیاولی کو اس کی جس کتاب کی وجہ سے عالمگیر شہرت یا رسوائی حاصل ہوئی۔ اس کا نام "پرنس" ہے۔ اس کا اصل اور پورا نام (DE PRINCI PUTIBUS) ہے۔ اس کتاب

کا موضوع بادشاہ اور حکمران کی حکمرانی کے قواعد کی تعلیم ہے۔

میکیاولی نے جس زمانے میں یہ کتاب لکھی۔ اسے مغربی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ریاست کا ایک غیر جانب دارانہ اور غیر مذہبی تصور پیش کیا گیا ہے۔ یعنی حکومت کے فیصلوں اور تدابیر کاری کو مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس سے پہلے سیاسی امور اور حکمرانی میں مذہبی عناصر اور مذہب اہم ترین کردار ادا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہ تصور پیش ہوا کہ سیاست اور حکومت کے فیصلے خالص سیاسی انداز میں کیے جانے چاہئیں۔ گویا سیاست بھی ایک آرٹ ہے۔ ایک سائنس ہے۔

اس نظریے کے حوالے سے سب سے زیادہ شہرت اور رسوائی میکیاولی کو حاصل ہوئی اور اس کے نظریات و افکار کے اثرات تب سے اب تک دنیا کی سیاست و حکمرانی پر واضح انداز میں مرتب ہوئے۔

"پرنس" کی اشاعت میکیاولی کی زندگی میں ممکن نہ ہو سکی۔ نہ ہی اس دور کی حکومت نے ہی اس کی اشاعت میں کوئی دلچسپی لی۔ ۱۵۳۲ء میں یعنی میکیاولی کی موت کے پانچ برس بعد "پرنس" پہلی بار طبع ہوئی۔ اس نے اشاعت کے ساتھ ہی غیر معمولی کامیابی اور مقبولیت حاصل کر لی۔ آنے والے پندرہ برسوں میں میکیاولی پر تنقید و تعریض کا بازار گرم ہوا تب سے آج تک اس کو اس کتاب کے حوالے سے مطعون کیا جاتا ہے۔ اس دور کے مذہبی حلقوں نے اسے شیطان کا نام دیا۔ ان گنت لوگوں نے ہر دور میں میکیاولی اور پرنس کے خلاف لکھ کر نام پیدا کیا۔

ہزار اختلافات کے باوجود بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میکیاولی ہی ہے جس نے سیاست کو آرٹ کا درجہ دیا۔ جو سیاست کو سائنس بنانے کا خالق ہے۔ اس نے اس کتاب کے ذریعے گویا ایک نیا دروازہ سیاست کی دنیا میں کھول دیا۔ اس نے سیاست سے اخلاقیات اور مذہب کو خارج کر دیا۔ وہ ایک غیر مذہبی اور لادینی ریاست کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس نے حکمرانی کے لیے جو اصول پیش کیے اور جو درس دیا وہ اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ نفرت اور قابلِ اعتراض کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ بہرحال ایک کارنامہ ہے کہ اس نے یہ اصول

نہیں دیا کہ سیاست کو خالص سیاسی معیار پر پرکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ اس نے سیاست کو معروضیت سے ہمکنار کر دیا۔

میکیا ولی کے نظریات و افکار کے نظام کو سمجھنے کے لیے اس کی ایک کتاب — (DISCOURSERS) کا مطالعہ بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب لیوی جیسے مورخ کی تصنیف "تاریخ" کا تجزیہ اور تشریح ہے۔

"پرنس" ایک نظر میں

ذیل میں "پرنس" کی تلخیص دی جا رہی ہے۔ یوں تو اس تلخیص میں میکیا ولی کی پوری کتاب کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم "پرنس" کے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، نویں، پندرہویں، سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں ابواب کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے جو اس کتاب کی پوری روح کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

میکیا ولی بتاتا ہے کہ ایک ریاست کے قیام اور اس کے استحکام اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے ذرائع کو استعمال کرنا چاہیے۔ خواہ وہ کتنے ہی ظالمانہ، کھردرے اور پُرفریب کیوں نہ ہوں۔ ایک حکمران جو ظلم و فریب کاری کو اپناتا ہے وہ اس کا پورا مجاز ہے۔ رعایا اور عوام کی شر پسندی اور دھوکہ دہی کے مقابلے میں حکمران کی فریب کاری اور حیلہ سازی افضل ٹھہرتی ہے۔ اقتدار کی بحالی کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ درست ہے اور حکمران کو اس کا حق حاصل ہے۔

میکیا ولی کا خیال ہے کہ انسانی فطرت پوری تاریخ میں بغیر کسی بڑی تبدیلی کے بغیر دکھائی دیتی ہے۔ یہ فطرت ناقابل تبدیل ہے۔ صرف تاریخی واقعات و امکانات ہی اپنے آپ کو دہرا لیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھ کر حکمرانی کے اصول وضع کریں۔ جب میکیا ولی تاریخ کی مثال دیتا ہے۔ جب وہ تاریخ کے زعما کو پیش کرتا ہے تو وہ ماضی میں پلٹ کر قدیم یونانی عہد کو مثال نہیں بناتا بلکہ قدیم روم کو وہ کہتا ہے کہ ہمیں رومیوں کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔"

میکیا ولی کہتا ہے کہ شر اور بدی کے ذرائع کو استعمال کر کے بعض اوقات اچھے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑی "مدلل" بحث کرتا ہے۔

میکیا ولی ظلم، دھوکہ دہی، تشدد، فریب کاری، وعدہ خلافی اور طاقت کے بے محابا استعمال کو جائز قرار دیتا ہے وہ ایسے تمام اعمال کا تحفظ بھی کرتا ہے۔

میکیا ولی کے نزدیک برائی یا اچھائی، دونوں چیزیں سیاسی کامیابی اور حکمرانی کے لیے بے معنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل چیز اقتدار ہے۔ جسے ہر طرح سے قائم رکھنے کا حکمران کو حق حاصل ہے۔

یہ ایک عجیب حقیقت یا تضاد ہے کہ میکیا ولی آمریت یا بادشاہت کے مقابلے میں ری پبلک کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن پھر خود ہی وہ کہتا ہے کہ یہ اس کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ جس کی کوئی مستند اور ٹھوس حقیقت اور بنیاد نہیں ملتی۔

میکیا ولی کو انسان کے روحانی اور مذہبی مسائل سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ ایک بادشاہ یا حکمران کے لیے مذہبی آدمی ہونا ضروری نہیں لیکن اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکا دے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ مذہبی آدمی ہے۔ وہ مذہبی استحصال کو اقتدار قائم کرنے اور مستحکم بنانے کا ایک طاقتور وسیلہ بتاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح عوام کو دھوکا دے کر اقتدار کو مشکلات سے بچایا جا سکتا ہے اور فوج کے سپاہیوں کے عزم کو مذہبی حوالے سے مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔

وہ ایک قدیم زمانے کے راہب کا حوالہ دیتا ہے کہ وہ سیاست میں اس لیے کامیاب نہ ہوا کہ وہ جھوٹا، دغا یا ظاہری مذہبی انسان تھا۔ بلکہ وہ اس لیے کامیاب نہ ہوا کہ وہ اپنی مذہبیت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر عوام کو بے وقوف نہ بنا سکا۔

کلیسا کے بارے میں میکیا ولی کا طرز فکر بڑا تلخ اور غصیلا ہے۔ وہ کلیسا کو قدیم رومی سلطنت کے زوال کا سبب قرار دیتا ہے۔ بتاتا ہے کہ کلیسا انسان میں تذلیل و اہانت کے جذبات کو قوی کرتا ہے۔

میکیاولی ایک طاقتور فوج کے وجود کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ پرنس اور ڈسکورسز دونوں میں وہ طاقتور فوج کے قیام اور اداروں کو اقتدار کے لیے سب سے بڑی طاقت قرار دیتا ہے۔ وہ قومی ملیشیا کی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے۔

میکیاولی لکھتا ہے:

وہ لوگ جو اپنی صلاحیتوں سے بادشاہ یا حکمران بنتے ہیں وہ یہ اقتدار اور اختیارات بڑی دشواری سے حاصل کرتے ہیں لیکن اسے آسانی سے کھو دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیارات کو مستحکم بنانے کے لیے جو نئی پالیسیاں اور قواعد متعارف کراتے ہیں وہی ان کی ناکامی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں اپنے اختیار کو جاری اور بحال رکھنے سے زیادہ مشکل اور دشوار کام کوئی اور نہیں ہے۔ نئی نئی چیزوں کو متعارف کرانا کامیابی کے لیے بے حد مشکوک اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو بادشاہ یا حکمران صرف اصلاح چاہتا ہے وہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بڑھا لیتا اور اپنے لیے خطرات پیدا کر لیتا ہے۔ یہ مخالف اور دشمن اس نئے نظام اور اقتدار سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایسے قانون پیدا ہو جاتے ہیں جو انہی لوگوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں ہے کہ وہ کسی بھی نئی چیز کو بہت مشکل سے قبول اور تسلیم کرتی ہے جب تک لوگوں کو خود اس کا ذاتی تجربہ نہ ہو جائے اس وقت تک ان میں ایک قوت مدافعت باقی رہتی ہے یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ ایسی نئی چیزوں کے حوالے سے حکمران یا بادشاہ کی حمایت یا تائید کرتے ہیں۔ وہ بھی نیم دلی سے کرتے ہیں۔ اس لیے بادشاہ یا حکمران کو ان پر تکیہ نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمران یا بادشاہ اپنے اوپر تکیہ کرے اور پوری طاقت کا استعمال کرے اس طرح خطرات کم ہو جاتے ہیں۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ تمام پیمبر جو مسلح تھے وہ کامیاب ہوئے اور جو غیر مسلح تھے وہ ناکام۔" لوگوں کے کردار اور نفسیات میں تنوع اور تضاد ہوتا ہے۔ انہیں کسی چیز کے لیے راغب تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس ترغیب کو تادیر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے یہ

لازم وناگزیر ٹھہرا کہ جب وہ اس ترغیب کے شکنجے کو نرم کرنے لگیں تو پھر بے دریغ طاقت کے استعمال سے ان کو جکڑ دیا جائے۔

"موسیٰ، سائرس اعظم، تھیوسس اور رومولس جیسے عظیم حکمران تا دیر اس لیے کامیابی سے حکومت کرتے رہے کہ وہ طاقت کے بے دریغ استعمال کا گُر جانتے تھے۔

کوئی حکمران یا بادشاہ صرف اپنی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے اقتدار اور اختیار کو قائم نہیں رکھتا طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔

وہ لوگ جو قسمت اور دوسروں کے بازوؤں کے بل بوتے پر سیزر بورگیا کی طرح اختیار و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کو اسی طرح جرأت مندی اور بے باکی سے اپنے اقتدار کو طاقت کے بل بوتے پر قائم رکھنا چاہیے۔ اقتدار اور اختیار کے حصول کے لیے طاقت کا استعمال اور فریب کا حربہ اختیار کرنا چاہیے۔

"بادشاہ یا حکمران کو طاقت کے ذریعے کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ اور ان سب کو تباہ اور نیست و نابود کر دینا چاہیے جو اسے نقصان پہنچا سکتے ہوں۔ اسے قدیم رسم و رواج اور روایات کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے۔ اسے بیک وقت نرم اور ظالم تنگدل اور آزاد خیال بن کر سامنے آنا چاہیے۔"

وہ جو اقتدار اور اختیار حاصل کرتا ہے اسے چاہیے کہ اسے ایک ہی وقت میں تمام مظالم اور سختیوں کو فی الفور رائج کر دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ایک ایک کر کے دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ایک ایک کر کے ایسے اقدام کیے جائیں۔ کیونکہ بیک وقت اور فوری سختیوں اور مظالم کو روا نہ رکھا گیا تو لوگوں کو مطیع کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور ان کے دلوں میں اس کا ان مٹ اور گہرا خوف پیدا نہ ہو سکے گا۔ عوام کو مطیع بنانے کے لیے تمام بے انصافیاں اور مظالم ایک ساتھ شروع کر دیں۔ تاکہ وہ سنبھل ہی نہ سکیں۔ لوگوں کی سہولتوں اور بہبود کا سلسلہ قسطوں میں ممکن ہونا چاہیے۔ ان پر ایک دم تمام تر عنایتوں اور سہولتوں کو نچھاور نہیں کرنا چاہیے۔ ان سہولتوں کی مقدار قلیل ہونی چاہیے تاکہ لوگ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ایک بادشاہ یا حکمران کو اپنی رعایا میں اس طرح اپنی زندگی بسر کرنی چاہیے کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی کا کوئی ذائقہ یا حادثہ اس کے

اختیار کی قوت کو کم نہ کر سکے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ بدقسمتی کے زمانے میں ہمیشہ حکمرانوں کی گئی اچھی اصلاحات اور نیکیاں ان کے کام نہیں آتی ہیں۔ بلکہ ان کی سختیاں ان کے اختیار کو قوت بخشتی ہیں۔

وہ بادشاہ یا حکمران جو اقتدار معززین اور شرفاء کے تعاون سے حاصل کرتا ہے اسے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں اس حکمران کے مقابلے میں زیادہ دقتیں پیش آئیں گی جس نے اختیار اور اقتدار عوام کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ یہ شرفا اور معززین جو اس کے حواری ہوں گے وہ اپنے آپ کو اس کے مساوی سمجھیں گے اس لیے ان پر حکم چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ حکمران جو عوامی تائید سے اختیار حاصل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے حکمران کو بیچ کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اسے دونوں طبقوں کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ان پر سرحربہ استعمال کر کے اپنا اختیار برقرار رکھنا چاہیئے۔ اشرافیہ اور معززین کا طبقہ۔ بہت چالاک اور دور رس ہوتا ہے۔ اس پر مطلق اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ ان گنت عوام کو احمق اور مطیع بنانا آسان ہے۔ لیکن چند امرا اور شرفا کو دھوکا دینا مشکل ہوتا ہے۔

ایک ایسا حکمران جو ہر کام اور تمام امور میں اچھائی چاہتا ہے۔ وہ ناکام ہوگا۔ کیونکہ اس کا سابقہ ان گنت ایسے عوام سے پڑتا ہے جو سارے اچھے نہیں ہوتے۔ اس لیے نیکی اور اچھائی کا وطیرہ اختیار کرنا خود اس کے لیے تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک ایسے حکمران یا بادشاہ کے لیے جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے یہ جاننا اور بھی ضروری ہے کہ کس طرح اچھائی کی راہ ترک کی جا سکتی ہے اور اس علم کو اسے استعمال بھی کرنا چاہیئے۔

"میں جانتا ہوں کہ ہر شخص اس کی تائید کرے گا کہ جتنی بھی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ ایک حکمران میں مجتمع ہو جائیں۔ لیکن چونکہ ایسا ممکن نہیں کہ تمام خوبیاں جن کا شمار ہے وہ ایک شخص میں جمع ہو جائیں۔ کیونکہ انسانی فطرت اس استعداد سے محروم ہے۔ اس لیے ایک حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جو برائیاں ہیں اور جن کو رسوا کیا جا سکتا ہے۔ انہیں چھپا کر رکھے۔ ان کو کبھی ظاہر نہ ہونے دے۔ لیکن طاقت، دبدبہ، اختیار، سخت گیری اور بعض ایسی "کمتر خوبیاں" یا برائیاں ہیں جن کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان کی تشہیر میں کوئی خامی نہیں۔ اس طرح عوام کے دلوں میں اس کا خوف انمٹ ہو جاتا ہے۔

"ایک حکمران کے لیے جو چیز سب سے اہم ہے اور جس سے اسے بچنا چاہیئے۔ وہ ہے لوگوں کی نفرت۔ قابل نفرت ہونے سے بہتر ہے کہ لوگوں کے لیے اپنے آپ کو خوفناک بنا لیا جائے اگر کسی شخص کو کنجوس کہا جاتا ہے تو لوگ اسے بُرا سمجھتے ہیں لیکن اس سے نفرت نہیں کرتے اسی طرح حکمران سے اگر لوگ خوفزدہ ہوں تو یہ اس کے لیے بہتر ہے کہ لوگ اسے قابل نفرت سمجھتے ہوں۔"

"یہاں خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں پسندیدہ یا محبوب بننا بہتر ہے۔ یا لوگوں کے دلوں پر اپنے خوف کو مسلط کرنا کسی حکمران کے لیے بہتر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک حکمران ایسا ہونا چاہیئے کہ لوگ اس سے محبت کریں اور خوف بھی کھائیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں کی یکجائی سمونا ناممکن ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ حکمران سے لوگ خوفزدہ رہیں۔ جب تک حکمران کا خوف اس کے لوگوں کے دلوں پر قائم رہتا ہے اس کا اختیار اور اقتدار مستحکم رہتا ہے۔ وہ اس خوف کی بدولت اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ انسان بنیادی طور پر ناشکرا اور غلط کار ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرے تو خطرے کو ٹالنے کے لیے وہ اپنا خون، اپنا مال و اسباب حتیٰ کہ اپنی جان بھی دے سکتا ہے اور خود کو خطرے سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ یہ انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ اپنے اندر بغاوت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ بغاوت کے اس جذبے کو سختی سے کچل دینا چاہیئے۔ عنایات اور داد و دہش سے حاصل کردہ وفاداریاں اور دوستیاں ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ان کو دوسرا بھی خرید سکتا ہے۔ جو حکمران اپنے بہی خواہوں کی باتوں پر یقین کرتا اور دوسری تیاریاں نہیں کرتا۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

"محبت۔ تشکر اور احسان کے جذبوں کی زنجیر میں بندھی ہوتی ہے چونکہ انسان خودغرض واقع ہوا ہے۔ اس لیے وہ اس زنجیر کو توڑ دیتا ہے لیکن خوف ایک ایسا جذبہ ہے جو قوی ہوتا ہے۔ خوفزدہ آدمی سزا سے ڈرتا ہے اور وہ خوف کی وجہ سے مطیع رہتا ہے۔"

"ایک بادشاہ اور حکمران کو چاہیئے کہ وہ ایسا رویہ اختیار کرے کہ لوگ اس سے خوف بھی کھائیں اور اس سے نفرت بھی نہ کریں۔ نفرت کے بغیر خوف کا تسلط ایک قابل عمل اور پائیدار چیز ہے۔ ایک ایسا حکمران جو اپنی رعایا کی جاگیر اور ملکیت میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ وہ اس نفرت سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اس کا خوف دلوں پر مسلط رہتا ہے۔ دشمن کو ہلاک کر دینا

بہتر ہے لیکن اس کی جائیداد کو ضبط کرنا نقصان دہ ہے۔ کیونکہ لوگ اپنے باپ کے قتل کو نظر انداز کر دیتے ہیں، بھول جاتے ہیں لیکن جائیداد کی ضبطگی کا دکھ کبھی دل سے نہیں نکلتا۔ اور نفرت کا سبب بنتا ہے۔

"ایک بادشاہ یا حکمران کو کس حد تک ایماندار اور دیندار ہونا چاہیے؟ ہمارے زمانے نے ثابت کر دیا ہے کہ انہی حکمرانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ اقتدار پر قابض رہے۔ جو صاحب ایمان نہ تھے۔"

"لڑائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک قانونی۔ دوسرا طاقت۔ پہلا راستہ انسانوں کا ہے اور دوسرا درندوں کا لیکن چونکہ پہلے طریقے کو اپنا کر کبھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوتی اس لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے حکمرانوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بیک وقت کس طرح انسان اور درندے کی خصوصیات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں دونوں خصوصیات حکمرانی کے اہل لوگوں کو سکھائی جاتی تھیں۔ اور قدیم زمانے کے مصنّف یہ فریضہ انجام دیتے تھے جس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ یہ کوئی نئی یا نادر بات نہیں ہے۔ ایک حکمران کے لیے یہ جاننا اور سیکھنا لازمی ہے کہ کس طرح انسان اور درندے کی فطرت کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ اور جس میں کسی ایک کی کمی ہوگی وہ ناپائیدار اختیار کا مالک ہوگا۔"

"ایک حکمران کو اپنے اندر شیر اور لومڑی کی خصوصیات یکجا کرنی چاہئیں۔ کیونکہ شیر اپنے آپ کو کبھی پھندوں اور جالوں سے محفوظ رکھنے کا گر نہیں جانتا۔ جبکہ لومڑی اپنا تحفظ بھیڑیوں سے نہیں کر سکتی۔ اس لیے ایک حکمران لومڑی کی یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ پھندوں اور سازشوں کو بھانپ سکے اور دوسری خوبی حکمران میں شیر کی ہونی چاہیے کہ وہ بھیڑیوں کو خوفزدہ کر سکے۔ وہ حکمران جو صرف اپنے آپ کو شیر بنانا چاہتے ہیں وہ محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لومڑی کی چالاکی اور فریب کاری بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایک بادشاہ کے لیے اس وقت صاحب ایمان ثابت ہونا ضروری نہیں کہ جب مذہب اور دینداری اس کے مفاد میں نہ جاتی ہو۔ لیکن اگر دینداری اور ایمان کا ڈھونگ اس کے مفاد میں ہو تو اسے ظاہر کرنا چاہیے۔"

"وہ حکمران کبھی صاحب اختیار اور اقتدار نہیں رہ سکتا جو خود یہ اعتراف کرنے لگے کہ اس

نے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ وعدے سے انحراف اور وعدہ شکنی اختیار کے مفاد میں ہے تو اس کے اعتراف کی ضرورت نہیں۔ حکمران کو اپنے اصل ارادوں اور عزائم کو چھپا کر رکھنا چاہیئے۔ عوام الناس بہت سیدھے اور سادے ہوتے ہیں وہ آسانی سے فریب کھا جاتے ہیں اور جب تک حکمران خوبصورتی اور سلیقے سے ان کو فریب دیتا رہے گا۔ وہ فریب کھاتے رہیں گے۔

حکمران کو چاہیئے کہ وہ مذہب، انسانی وقار، ایمان واعتقاد اور انسانیت کے خلاف اپنی زبان سے کوئی لفظ نہ نکالے۔ اسے یوں ظاہر کرنا چاہیئے کہ وہ سراپا عفو ورحم ہے۔ عفو ورحم کا پیکر دکھائی دینا بے حد ضروری ہے۔ عوام کی اکثریت صرف دیکھتی ہے۔ صرف ظاہر تک ہی پہنچ سکتی ہے۔ وہ چھوکر محسوس نہیں کرسکتی۔ اس لیے ظاہر مکمل ہونا چاہیئے۔ اکثریت حکمران کو اس کے ظاہر کی وجہ سے اپناتی ہے۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ اصلیت کیا ہے ؟

"پرنس" کا یہ خالق میکیاولی۔ جو اپنی ان تعلیمات اور نظریات کی وجہ سے شیطان قرار پایا۔

اس کے بارے میں آخری دو باتیں۔

وہ سچا محب وطن اور اٹلی کی آزادی کی تڑپ اس کے دل میں تھی۔

اور آخری بات۔

کیا جو نظریات اس نے اقتدار، اختیار اور حکمرانی کے لیے پیش کیے۔ کیا ان کو قابل نفرت اور گھناؤنا سمجھنے کے باوجود۔ دنیا کے بیشتر سیاست داں اور حکمران۔ ان ہی پر عمل نہیں کرتے ؟؟؟

معاہدۂ عمرانی

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا۔ لیکن دیکھو آج وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے۔" روسو کے اس جملے اور نظریات کی گونج ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے افکار و نظریات پر صدیوں سے بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ انسانوں کی کتنی ہی نسلوں کے اذہان، فکر و عمل، تصورات و نظریات کو روسو نے متاثر کیا ہے۔

اسے اپنے دور میں ہی اپنے نظریات کی وجہ سے تضحیک و طعن کا نشانہ بننا پڑا۔ حکومت اور مذہب کے اجارہ داروں کی تنقید اور تعزیر کا سلسلہ جاری رہا اور آج بھی اس کے خیالات و افکار کو قبول اور رد کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

وہ سچا اور کھرا ہے۔ آج کے آزادانہ اور کھلے ڈھلے بے باک معاشروں میں بھی بہت کم لوگوں کو یہ جرأت حاصل ہے کہ وہ روسو کی طرح اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں سے پردہ اٹھا سکیں۔ اس کی خودنوشت "اعترافات" (CONFESSIONS) کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔

ژاں ژاکس روسو ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین پروٹسٹنٹ تھے۔ روسو کی ماں اسے جنم دے کر مر گئی۔ اس کا باپ اسے دس سال کی عمر میں کچھ عزیزوں کے حوالے کر کے فرار ہو گیا۔ پھر باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہو سکی۔ روسو نے اپنی زندگی میں کئی کام کیے۔ اس نے جی بھر کر آوارہ گردی کی۔ چھوٹے موٹے کام اور ملازمتیں کرتا ہے۔ کئی خواتین نے اسے اپنی سرپرستی میں لیا اور کفالت کرتی رہیں۔

۱۷۴۱ء میں وہ پیرس میں رہنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ موسیقی تحریر کرنے کے

ایک نئے نظام کے تحت روزی کما سکے گا۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ اسے یہ بھی شرف حاصل رہا ہے کہ والٹیئر کی اجازت سے لوئی پانزدہم کے دربار میں والٹیئر کے ڈرامے پیش کرنے کے لیے ان کو اپنے انداز میں لکھتا رہا۔ وہ اس دور کے فرانس کے عظیم دانشوروں اور لکھنے والوں کا دوست تھا۔ ۱۷۴۹ء میں اس کی کتاب DISCOURSES ON ARTS AND SCIENCES شائع ہوئی۔ جس میں اس نے بڑے خطیبانہ لہجے میں تمام فنون سائنس اور کلچر کو مسترد کر کے انھیں سماجی کرپشن کا سبب قرار دیا۔ ۱۷۵۲ء میں اس نے ایک آپیرا لکھا جو دربار میں پیش ہوا۔ روسو کا تعلق دربار قائم ہو گیا۔ اسی برس اس کی کتاب عدم مساوات کا سرچشمہ شائع ہوئی اور ایک مفکر اور سنجیدہ لکھنے والی حیثیت سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ ۱۷۶۲ء میں اس کی عظیم کتاب "سوشل کانٹریکٹ" (SOCIAL CONTRACT) شائع جس نے اسے عالمگیر اور ابدی شہرت سے ہمکنار کیا ہے۔

روسو کو جنیوا کے باشندوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان کو خاص صفات کا حامل سمجھتا تھا لیکن جب اس کا ناول (EMILE) شائع ہوا اور اہل جنیوا نے اسے پسند نہ کیا تو اس نے سٹی کونسل پر شدید حملے کیے۔ اس کی تصنیف "لیٹرز فرام دی مونٹین" LETTERS FROM THE MOUNTAIN اس کی ناراضگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ روسو کو اپنے افکار کی وجہ سے حکمرانوں اور چرچ کے اجارہ داروں کی مخالفت کا کئی بار سامنا کرنا پڑا۔ اس نے برطانوی فلسفی ہیوم کی دعوت پر کچھ عرصہ برطانیہ میں گزارا۔ تاکہ عتاب کا زمانہ گزر جائے۔ اپنے CONFESSIONS اس نے برطانیہ میں اپنے قیام کی اٹھارہ ماہ کی مدت میں ہی مکمل کیے۔

روسو بڑا شکی مزاج تھا۔ اس لیے ہر کسی سے جھگڑ بیٹھتا۔ اس نے اپنے شکی مزاج اور جھگڑالوپن سے بھی اپنی زندگی کو خاصا بے چین اور ناآسودہ بنایا۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کے مطابق خود بھی سادہ زندگی گزارتا رہا۔ اور جنسی تعلقات کے سلسلے میں بھی بہت آزاد تھا۔ اس کی کئی محبوباؤں سے بچے پیدا ہوئے۔ جن کی نگہداشت اور پرورش کی ذمہ داری روسو نے کبھی قبول نہ کی۔ ۱۷۶۷ء میں وہ فرانس واپس آیا۔ خود جلاوطنی کا زمانہ گزارنے کے

بعد وہ فرانس آیا تو اس کی ذہنی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس نے فرانس آ کر مرالو اور پرنس ڈی کونتی کے ہاں پناہ لی۔ ۱۷۷۰ میں وہ پیرس واپس آیا۔ ایسی حرکات کرنے لگا جو اس کی ذہنی اور دماغی بیماریوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ وہ کچھ عرصہ ہسپتال میں بھی رہا۔ پھر ارما نویل میں ایک جھونپڑے میں رہنے لگا۔ جہاں اچانک ۲ جولائی ۱۷۷۸ کو اس کا انتقال ہوا اس کی موت جس انداز میں ہوئی۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ روسو نے خودکشی کی تھی۔ اسے ایک جزیرے میں دفن کیا گیا۔ ۱۶ برس کے بعد اس کی لاش کو فرانس کے عظیم آدمیوں کے قبرستان میں دوبارہ دفن کیا گیا۔

روسو، شخص، افکار اور معاہدہ عمرانی

روسو سے پہلے لاک اور ہیوم جیسے عظیم فلسفی بھی معاہدہ عمرانی پر اپنی کتابیں لکھ کر اپنے افکار و نظریات کا اظہار کر چکے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات و افکار بھی قابل قدر اور فکر انگیز ہیں۔ لیکن ـــ روسو حقیقی معنوں میں پہلا عظیم اور جدید سیاسی فلسفی ہے۔ یہ کوئی ایسا دعوےٰ نہیں جس میں مبالغہ شامل ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ اس کے سیاسی نظریات کا اثر اتنا ہمہ گیر اور دور رس ہے کہ اس کے بعد جتنے بھی فلسفی آئے ہیں وہ سیاسی اور عمرانی موضوعات پر اس سے استفادہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ روسو۔ وہ فلسفی ہے جس کا موجودہ دور کے افکار پر سب سے زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔

روسو کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کا سمجھنا بے حد ضروری۔ کیونکہ روسو کا فلسفہ بے حد ذاتی ہے۔ وہ شخص آزادی اور اجتماعی آزادی پہ اصرار کرتا ہے۔ یہ اس کا وہ عقیدہ ہے۔ جس پہ وہ بہت آتش بیانی اور جذباتیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ روسو خود بہت جذباتی مشتعل مزاج، مخلص اور حساس انسان تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس کا اسے بہت شدت سے احساس تھا کہ انسان قعر مذلت میں گر چکا ہے۔ انسانی معاشروں اور مخصوص اسباب نے آدمی سے اس کی آدمیت چھین لی ہے۔ اس کی روح کو تباہ کر دیا ہے وہ انفرادیت اور انفرادی آزادی کا بہت قائل ہے۔ وہ بے انصافی کا شدید احساس رکھتا تھا

اس کی شخصیت کے بعض تضادات بھی اس کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ روسو نے اپنی زندگی کے کچھ برس دولت مند عورتوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہر طرح کی آسودگی سے بسر کیے۔ لیکن وہ فرانس کے شاہی دربار سے کوئی بھی تعلق رکھنے سے صاف کتراتا اور انکار کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب اس کا اوپیرا دربار میں پیش ہوا اور بادشاہ نے اسے دربار میں پیشی کا حکم دیا۔ تو روسو نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

روسو کی شخصیت کا یہ تضاد بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے بنی نوع انسان سے شدید محبت تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہر دوست سے جھگڑا کیا وہ انسانوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ اس کے افکار اور شخصیت پر اس کی زندگی میں حملے ہوتے رہے۔ والٹیر نے اسے رگیدا۔ دیدیرو نے اسے خوب کوسا ہے۔ اس کے باوجود اس کے افکار کی چمک دمک سے کوئی بھی آنکھیں نہ چرا سکا۔

مادام ڈی سٹیل نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔ "اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی لیکن ہر چیز میں آگ لگا دی۔"

یہ روسو ہی تھا۔ جس کے معیار اور نصب العین اتنے شدید تھے اور خود اتنے شدید اور انوکھے مزاج کا مالک تھا کہ میری انتومینٹ ملکہ ہونے کے باوجود اپنے محل میں چرواہی کا کردار ادا کیا کرتی تھی۔ کیونکہ روسو بدویت کا مداح اور پرچارک تھا۔ روسو کے ناول بالخصوص EMILE نے جس انداز میں فرانس کی فیشن ایبل خواتین کو متاثر کیا ہے اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں لیکن اتنا کہنا کافی ہے کہ جو جدید تہذیب میں رچے بسے تھے۔ وہ روسو کے افکار کے ایسے اسیر ہوئے کہ اسی کی طرح سوچنے اور رویے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عیش و عشرت، دولت کلچر کی جس طرح روسو نے مذمت کی ہے وہ اس کے شدید ترین جذباتی رویوں کی ترجمانی کرتا ہے وہ سادگی، فطری رتوں اور بے تکلف، آزاد زندگی کا پرچارک تھا ہے۔ اس کے ان افکار و نظریات نے ان پر بھی اثر ڈالا جو اس کے موید ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ جنہوں نے اس کے ان افکار نظریات کی مخالفت کی۔ وہ بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ روسو کے بعد آنے والے فلسفیوں اور سیاسی مفکروں کو اس کے افکار و نظریات ایسے ورثے کی صورت میں ملے ہیں جسے قبول کرنے

سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ سادگی جمہوریت، آزادی، عالمی امن، انفرادی آزادی رومانویت، حب الوطنی کا بھی نمائندہ ہے۔ اور اسے مطلق العنان آمرانہ جمہوریت کا پیغمبر بھی سمجھا جاتا ہے۔

روسو — شدید نظریات وافکار کا مالک ہے۔ وہ تمام ملکیتوں کو غاصبانہ قرار دیتا ہے۔ وہ دولت کو جرم کی پیداوار کہتا ہے۔ تمام حکومتوں کو ظالم سمجھتا ہے۔ تمام سماجی قوانین کو بے انصافی قرار دیتا ہے۔

یہ روسو ہی ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ شخص بنی نوع انسان کا سب سے بڑا دشمن تھا جس نے ایک حلقہ زمین کے لئے دگر حصار باندھ کر کہا کہ یہ میری زمین ہے۔"

بعض فلسفیوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ اپنے افکار کے ساتھ جس انداز سے وہ زندہ رہا اور جس انداز سے وہ اپنے افکار میں خود یقین رکھتا تھا۔

اور جس انداز سے وہ اپنے افکار کو پیش کرتا ہے اس کے حوالے سے وہ نئے دور کا افلاطون ہے۔ ! روسو اخلاقیات کی فطری حیثیت، آزادی کی تعریف اور اس کی ضرورت، زندگی کا صحیح تصور، تعلیم کا صحیح نظام اور فطرت کی طرف واپسی کے امکانات اور ضرورت۔ جیسے اہم مسائل پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ ایک نئے معاشرے کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو انسان کی فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہو اور انسان کی فطرت کو زندہ رکھتا ہو۔ وہ صحیح حکمرانی کی ضرورت کا شدید احساس دلاتا ہے۔ وہ ایسی حکومت چاہتا ہے جہاں ایک آدمی مؤثر ترین انداز سے سیاسی زندگی میں حصہ لے سکے اور اس پر اثر انداز ہو سکے۔

۱۷۶۲ء میں اس کی عظیم کتاب "سوشل کانٹریکٹ (معاہدۂ عمرانی) شائع ہوئی۔ اس میں اس نے GENERA WILL کا تصور پیش کر کے سیاسی فکر میں بیش بہا اضافہ کیا۔ جسے وہ جائز اور راست اختیار (قوت) کا صحیح سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ اس نظریے میں وہ ایک ایسے قانون ساز کو دریافت کرتا ہے جو ایک سیاسی نظام کو صحیح ضرورت کا احساس دلا سکے روسو ایک "شہری مذہب" پر زور دیتا ہے۔ جو انسانوں کو ایک عقیدے میں منسلک

رکھے۔ اور ایک نظام تعلیم بھی دیتا ہے جو اچھے شہری پیدا کرنے کے علاوہ ان کو محب وطن بھی بنا سکے۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اپنے ان نظریات کی وجہ سے وہ آج کے دور میں بھی تنقید و تعریض کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ جس سے صاف عیاں ہے کہ اس کے افکار زندہ ہیں۔ متاثر کرتے ہیں۔ اور ان کو پوری اہمیت منفی یا مثبت دی جا رہی ہے۔

ذاتی طور پر فلسفے اور روسو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے روسو کے ایسے تصورات سے شدید اختلاف ہے۔ جس میں وہ یہ اصرار کرتا ہوا ملتا ہے کہ اگر ایک فرد کا مفاد "جنرل ول" کے مفاد سے بالکل مختلف اور آزادانہ ہے تو اسے مجبور کیا جائے کہ وہ عمومی ارادے کی مطابقت کرے۔ روسو "جنرل ول" سے پیدا ہونے والے اظہار اور فیصلے کو ہر حال میں منصفانہ قرار دیتا ہے۔

اس اختلاف کے باوجود۔ روسو کی فکری عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ پہلا جدید سیاسی فلسفی ہے۔ وہ زیریں سطح پر کام کرنے والی مساوات کا قائل ہے۔ وہ ایک ایسے معاشی نظام کا حامی اور داعی ہے جو انسانوں کو مساوی کر دے۔ ایک سطح پر لا کھڑا کرے۔ ایک ایسا نظام اخلاق کا وہ تصور پیش کرتا ہے جو انسانوں میں مقصدیت کا احساس اور شعور پیدا کر دے۔ ایک ایسے سیاسی نظام کا تصور پیش کرتا ہے جہاں ہر فرد آزادانہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔

آزاد خیال مفکروں میں سب سے زیادہ اثرات۔ روسو کے ہی نظریات کے ہیں۔ سوشل کانٹریکٹ (معاہدۂ عمرانی) کی اشاعت تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔ اسے ایمسٹرڈیم میں پہلی بار شائع کیا گیا۔ کیونکہ روسو کو خوف تھا کہ فرانسیسی حکومت کا عائدہ کردہ سنسر اس کی فرانس میں اشاعت کی اجازت نہ دے گا۔ تب سے اب تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر زبان میں بار بار اس کے تراجم ہوئے ہیں اور اردو میں بھی اس کا ایک وقیع ترجمہ موجود ہے۔ مترجم ڈاکٹر محمود حسین تھے۔

"معاہدۂ عمرانی" کی تلخیص

۔ مسئلہ ایک ایسی ہیئت کو دریافت کرنے کا ہے جو فرد کی ساری توانائی اور بھلائی کے ساتھ منسلک ہو۔ اور جس کے حوالے سے ہر فرد کل کے ساتھ اشتراک و عمل کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کی متابعت نہ کر سکے۔ اور جس طرح وہ پہلے آزاد تھا۔ اسی طرح آزاد رہ سکے۔ یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل روسو کا معاہدہ عمرانی پیش کرتا ہے۔

اس معاہدے کی شرائط کیا ہیں؟ ان سب کو ایک ہی شرط میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ فرد تمام تر حقوق سے مغائرت اختیار کر کے "کل" میں شامل ہو جائے۔ اس طرح کوئی ایک دوسرے پر بوجھ بھی نہ بنے گا۔ کیونکہ سب اپنے حقوق کو تج کر معاشرے کے مفاد میں متحد و یک جان ہو جاتے ہیں۔ یہ اتحاد و اشتراک اتنا مکمل ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی بھی فرد دوسرے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اس معاہدہ میں ایک فرد کو اپنا تمام کل کے حوالے کرنا ہے۔ گویا وہ کسی ایک کے سپرد اپنے آپ کو نہیں کرتا۔ یوں وہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے متبادل اور مساوی حاصل بھی کر سکتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے۔ اس کا وہ بہتر انداز میں تحفظ کر سکتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک اپنی ذات اور پوری توانائی کو اشتراک و اجتماعیت میں برتر رہنمائی میں شامل کرتا ہے۔ جو عمومی ارادہ (GENERAL WILL) سے حاصل ہوتی ہے اور اپنی ذاتی استعداد و اشتراک کے طفیل۔ ہم میں سے ہر ایک۔ کل کا ایک ناقابلِ تقسیم جزو اور حصہ بن جاتا ہے۔

اس طرح اس معاہدے میں شریک ہر فریق کی انفرادی شخصیت۔ اس اشتراک سے ایک اخلاق اور اجتماعی تجسیم کو جنم دیتی ہے۔ یہ اتنے ہی ارکان سے تنظیم و تجسیم ترتیب پاتی ہے جتنے کہ ایک اسمبلی کے ووٹر۔ اس طرح وہ متحد ہوتے ہیں۔ ان کی شناخت ایک ہوتی ہے۔ ان کی زندگی اور ارادہ ایک ہوتا ہے۔ یہ عوامی فرد (PUBLIC PERSON) دوسرے تمام افراد کے ساتھ مل کر متحد ہو کر مدنیت۔ شہر کا نام پاتا ہے اور ری پبلک بنتا ہے

یا ایک سیاسی جسم اس کے ارکان اسے سیاست کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ فعال ہوتا ہے تو حکمران کہلاتا ہے اور اس وقت طاقت بنتا ہے جب اس کا موازنہ دوسروں سے ہوتا ہے اور وہ جو اجتماعی طور پر اس معاہدے کے تحت مشترک و متحد ہوتے ہیں۔ شہری کہلاتے ہیں جیسے ایک خود مختار قوت کے تحت۔ رعایا کہلاتا ہے۔ یعنی وہ ریاست کے قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔

اشتراک و تعاون کا یہ عمل پبلک اور افراد کے درمیان ایک باہمی سمجھوتہ ہوتا ہے اور ہر فرد اپنے آپ کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہوئے دوسری صلاحیت اور استعداد میں بندھ جاتا ہے۔ قوت و حکمرانی کا رکن ہوتے ہوئے وہ افراد کے ساتھ بندھا ہوا ہے ریاست کا فرد ہونے کی حیثیت سے اقتدار و اختیار کے ساتھ ان کا معاہدہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے شہری حقوق میں آزاد ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ فرد انسان ہونے کی صورت میں ایک خاص ارادے کا ہی مالک ہو سکتا ہے جو عمومی اور اجتماعی ارادوں سے مختلف اور متضاد ہو سکتا ہے۔ اس کا اپنا خاص ارادہ۔ عمومی ارادے کے برعکس اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی مطلق اور فطری آزادی اسے یہ سمجھا سکتی ہے کہ اس کا ارادہ اس کی مرضی اور ارادہ دوسروں کے لیے کم نقصان دہ اور اس کے لیے بارگراں ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک اخلاقی فرد اور انسان ہونے کے ناطے سے وہ شہریت کے حقوق سے اس وقت تک پوری طرح لطف اندوز نہ ہوگا۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں کی تکمیل نہ کرے جو اس پر عائد ہوئی ہیں۔

فطری حالت اور فطری ریاست سے شہری ریاست تک کے سفر میں آدمی میں غیر معمولی تبدیلیاں اور انقلاب آئے ہیں۔ انصاف کی جگہ اس کی جبلت میں رویہ کے بہترین اظہار نے لے لی ہے۔ اور اس کے اعمال میں وہ اخلاقی برتری پیدا کی ہے جس کا پہلے فقدان تھا۔

اس معاہدہ میں انسان جو چیز کھوتا ہے۔ وہ اس کی فطری آزادی ہے۔ یہ وہ آزادی ہوتی ہے جو بے پایاں اور غیر محدود ہونے کی وجہ سے وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس فطری آزادی کے بدلے اسے شہری

آزادی حاصل ہوتی ہے اور جو کچھ اس کا ہے۔ اس کا وہ مالک بن جاتا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف اپنے وزن اور برتری کو نظر انداز کر دیں تو ہم واضح طور پر فطری آزادی کو تمیز کر سکتے ہیں جو کہ صرف اور صرف فرد کی قوت کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ مدنی آزادی عمومی ارادے اور مرضی کی وجہ سے محدود اور پابند ہوتی ہے۔

ہمیں جاننا چاہیے کہ اس شہری ریاست میں اخلاقی آزادی نمایاں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ اخلاقی آزادی ہی ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں انسان کو اپنا آقا بناتی ہے۔ محض احساسات اور جذبات کی مجبوک غلامی ہے۔ جبکہ ان قوانین کی اطاعت جو ہم اپنے لیے بناتے ہیں آزادی ہے۔

آج تک ہم نے جتنے قوانین اور اصول وضع کیے ہیں انہیں ایک طرف رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف عمومی ارادے اور اجتماعی مرضی کو ہی یہ شرف حاصل ہے وہ ریاست کی اس منزل کی طرف رہنمائی کرے جس کے حصول کے لیے یہ ارادہ تشکیل پاتا ہے اور وہ مقصد ہے۔ اجتماعی بہبود۔ خاص اور مخصوص آزادی کے تصادم سے کبھی ریاست تشکیل نہیں پا سکتی۔ نہ ہی ان کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے مجموعی اور اجتماعی ارادہ سے ہی یہ ممکن ہے کہ مختلف مفادات و مقاصد کو ایک سماجی معاہدے میں باندھ دیا جائے۔ اگر انسانوں میں اجتماعی ارادہ اور اجتماعی مقاصد کی قدر مشترک نہ ہو تو پھر کوئی معاشرہ بھی معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہی مشترکہ اور اجتماعی مفادات ہیں جن کی بنیادوں پر ہر معاشرہ ترتیب پاتا ہے اور اس کو چلایا جاتا ہے۔

ذاتی اور خاص ارادہ (PARTICULAR WILL) اپنی تمام تر افادیت کے باوجود اپنی فطرت میں جانبدارانہ ہوتا ہے جبکہ مجموعی ارادہ مساوات کا مظہر ہوتا ہے اجتماعی اور عمومی ارادہ اور مرضی ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے اور اس کا جھکاؤ عوامی مفاد کی طرف ہوتا ہے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ عوام کی رائے ہمیشہ مساوی طور پر صحیح ہوتی ہے ہمارا ارادہ اور مرضی ہمیشہ ہمارے اپنے وقار اور بھلے میں ہوتا ہے لیکن ہم ہمیشہ اسے اس طرح سے نہیں دیکھ سکتے کہ وہ ہے کیا؟ لوگوں کو ہمیشہ کرپٹ نہیں کیا جا

سکتا ہے لیکن اکثر ان کو دھوکہ دیا جاتا ہے اور یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ارادے میں کیا خرابی تھی۔ تمام افراد کے ارادے اور مرضی اور اجتماعی اور عمومی ارادے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجتماعی اور عمومی ارادہ اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ جبکہ افراد کا ارادہ ذاتی مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کی حیثیت خاص ارادوں اور مرضی سے مختلف نہیں ہوتی۔ افراد کی ان خواہشوں اور ارادوں میں جمع اور تفریق کر کے دیکھیں ایک سے دوسرے ارادے کو منسوخ کریں تو حاصل میں اجتماعی اور عمومی ارادہ ہی رہ جاتا ہے۔

یہ بنیادی امر ہے کہ اگر عمومی ارادے کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنا اظہار کر سکے تو پھر ریاست میں جزوی اور جانب دار معاشرے کا وجود نہیں ہونا چاہیے۔ عمومی ارادے کے تحت ہر فرد اپنے خیالات پر غور کر سکتا ہے لیکن جانبدار معاشروں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ معاشرے کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس کے افراد مساوی اور یکساں ہوں۔ تب عمومی ارادہ زندہ متحرک اور سندر رہتا ہے۔

بادشاہ صرف اور محض ایک روایت اور بنے بنائے ڈھانچے کی پیروی کرتا ہے۔ جبکہ قانون ساز اس ڈھانچے اور روایت کو ختم کرتا ہے۔ قانون ساز ایک ایسا انجنیئر ہے جو ایک مشین ایجاد کرتا ہے اور بادشاہ صرف ایک مکینک جو اس مشین کی مرمت کر کے اسے "چلتے رہنے" کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ جو عوام کے لیے ادارے بنانے کا فرض اپنے ذمہ لیتا ہے۔ وہی قانون ساز ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اس قابل ہو کر وہ انسان فطرت کی تبدیلیوں اور انقلابات کو محسوس کر سکتا اور ایک فرد کو اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود علیحدہ اور کٹا ہوا ہوتا ہے عظیم تر کل میں منتقل کر سکے۔ اس میں یہ صلاحیت ہو کر وہ انسانی فطرت اور احتیاجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لیے ایک منشور اور قانون بنا سکے۔ جس میں فرد اجتماع اور معاشرے کا حصہ بن کر ہی اپنی آزادی کے حق کا استعمال کر سکے۔ اس قانون ساز کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ استعداد ہو کہ وہ انسان سے اس کے "ذاتی ذرائع" کو واپس لے کر اسے "نئے ذرائع" دے سکے۔

وہ دانا افراد، جو عام انسانوں کی زبان چھوڑ کر اپنی خاص زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کبھی اپنی بات دوسروں کو نہ سمجھا سکیں گے۔ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں اور قانون سازوں نے مقدس انسانوں کے منہ میں اپنی زبان دے کر قوانین بنائے ہیں۔ جو قوانین۔ عوام کے لیے مفید نہ ہوں۔ ان کے شعور و فہم سے بالاتر ہوں۔ وہ ان سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جنہیں وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہوں جو ان کی اپنی زبان اور اجتماعی ارادے کی حدود میں آتے ہیں۔

اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو سب کے مفاد اور بھلائی میں جاتی ہیں جو ہر نظام اور قانون کا منشا اور مدعا ہوتی ہیں۔ تو ہم تفصیل میں جائے بغیر کہہ سکتے ہیں آزادی اور مساوات۔

ریاست مختلف الطبع عناصر، افراد، اذہان پر مشتمل ہوتی ہے۔ جنہیں آزادی ملنی چاہیئے۔ اور مساوات کے بغیر آزادی کبھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔

مدنی آزادی میں دولت اور طاقت کو ہر شخص میں مساوی بانٹنا مشروط نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اختیار۔ قوت۔ کبھی اتنی زیادہ نہ ہونے پائے کہ وہ تشدد کی شکل اختیار کر سکے۔ اور اسے ہمیشہ دانائی اور قانون کے تحت رکھ کر عمل میں لایا جائے۔ اور دولت کی فراوانی کی یہ حد ہونی چاہیئے کہ دولت کبھی دوسرے شخص کو نہ خرید سکے۔ نہ ہی کوئی اتنا نادار اور غریب ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ غیر عملی نصب العین ہے اور عملی طور پر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ چلیئے ایسا ہی سہی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کوشش ہی نہ کریں۔ ایسے قوانین ہی نہ بنائیں۔

حالات و واقعات کی قوتیں تسلسل سے مساوات کو تباہ کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم ایسے قانون بنائیں کہ قانون کی طاقت اس مساوات کو برقرار رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔

ہر ریاست میں قانون سازی کا نظام اس ملک کے حالات کے مطابق تیار ہونا چاہیئے مقامی صورت حال اور انسانوں کے مزاج کو سامنے رکھ کر قانون بنانے چاہئیں۔ لیکن خاص

ارادہ کے تحت نہیں بلکہ عمومی اور اجتماعی مرضی اور ارادے کے مطابق۔ جو ہر ریاست کی منزل اور وجود کا مقصد ہے۔

کسی ریاست کے آئین کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ یہ بات نگاہ میں رکھی جائے کہ مناسب اور جائز کیا ہے۔ تاکہ فطری تعلقات ہمیشہ قوانین کے ساتھ ہر نکتے پر اشتراک کر سکیں اور قانون اس رشتے کو مستحکم اور پائیدار بنائے۔ اگر قانون ساز ان مقاصد کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے ایسے اصولوں کو اپناتا ہے جو حقائق اور حالات سے مختلف ہوتے ہیں اگر وہ آزادی کی جگہ غلامی کو خوش حالی کی جگہ دولت مندی کو امن کی جگہ فتح کو اپنا مطمع نظر بنا لیتا ہے تو پھر ایسے قانون اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔ آئین بدل جاتا ہے۔ ریاست اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک تباہ ہو جائے یا اسے بدل نہ دیا جائے۔ فطرت اپنی ناقابل تسخیر قوت پر آنچ نہیں آنے دیتی۔

ذاتی مفاد کے اثرات سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ اجتماعی مفادات کو تباہ کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگ جن پر غلط طریقے سے حکمرانی نہیں کی جاتی وہ اپنی آزادی کا کبھی غلط استعمال نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر اچھے انداز میں حکومت کی جاتی ہے ان پر حکومت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

ہم لوگ دیوتا نہیں اگر دیوتا ہوتے تو ہماری حکومت مکمل طور پر جمہوریت ہو سکتی تھی لیکن ہم انسان ہیں انسانوں کے لیے کبھی کوئی مکمل حکومت نہیں بن سکتی۔ حالات و واقعات حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک ملک کو جمہوریت کا گہوارہ بنانے کے لیے قانون سازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جمہوریت کی فضا اور روح کو جائز قوانین کے حوالے سے ہمیشہ قائم و برقرار رکھے۔

ایک بہتر منشور کی حامل ریاست میں قوانین ہمیشہ توانائی حاصل کرتے رہتے ہیں اور کمزور نہیں پڑتے۔ ایک غیر آئینی اور برے منشور کی حامل ریاست میں ہی قانون کمزور پڑتے اور مردہ ہو جاتے ہیں۔ اور حکومت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

حکمران کے پاس۔ صحیح معنوں میں قانونی اختیارات کے علاوہ دوسری طاقت نہیں ہوتی۔

وہ قانون کے ذریعے عمل کرتا ہے۔ اور قوانین۔ عمومی ارادے کے مستند اعمال پر مبنی ہوتے ہیں۔ عوام کے سامنے حکمران بے اختیار ہے۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ اسمبلی میں موجودہ ارکان عجیب الخلقت اور موہوم مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ آج ایسا ہی ہوگا۔ لیکن دو ہزار برس پہلے وہ ایسے نہ تھے کیا انسان کی فطرت تبدیل ہوگئی ہے؟

"اخلاقی امور میں امکانات کے رشتے" ۔۔۔ ہمارے تصور سے زیادہ محدود اور تنگ ہوتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوریاں، ہماری برائیاں اور ہمارے تعصبات ہیں جو ہمیں محدود اور تنگ، دل بناتے ہیں۔ حقیر روحوں کا عظیم انسانوں پر اعتقاد نہیں ہوتا۔ بدقماش غلام آزادی کے نام پر مکاری سے مسکراتے ہیں۔"

عوامی خدمت کے ادارے جونہی شہریوں کے مقاصد کو پورا کرنے کے بجائے اپنی دولت اور اختیار کی ترقی کی راہ کو اپنا لیتے ہیں تو ریاست تباہی کے کنارے پہنچ جاتی ہے۔ عوامی خدمت کے یہ نام نہاد ادارے اور ان کے حکمران جنگ چھڑنے تو فوجیوں کو محاذ پر بھیجتے اور ان کو تنخواہ دے کر خود گھروں میں رہتے ہیں۔ جب عوام کی کونسل میں ان کی شرکت ضروری ہو تو یہ اپنے نائبوں کی نامزدگی کر کے خود گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دولت اور عیش و آرام کی راہ اختیار کر کے۔ وہ فوج بناتے ہیں جو انہی کے ملک کو غلام بنا لیتی ہے۔ اور انہی کے نمائندے ملک بیچ دیتے ہیں۔

تجارت اور فنون میں فائدے اور ذاتی مفاد کے لالچ سے ریاست تباہ ہوتی ہے۔

دولت۔ خزانہ۔ روپیہ ایسے الفاظ ہیں جو غلامی کے مظہر ہیں، جو ایک سچی آزاد ریاست میں گمنام ہوتے ہیں۔ یہاں شہری سب کچھ اپنے زور بازو سے کرتے ہیں۔ دولت سے نہیں۔ وہ دولت دے کر اپنے فرائض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ آزاد ریاست کے آزاد شہری دولت دیکر ریاست کے مقاصد کی تکمیل میں حصہ لیتے ہیں۔ آزادی کے لیے میں جبری مشقت کی، ٹیکسوں سے کم مخالفت کرتا ہوں۔

اکثریت کے ووٹ سب کو پابند بنا لیتے اور اپنے اندر شامل کر لیتے ہیں۔ اس نظریے پر بہت اعتراض کیے جاتے ہیں۔ عوام کی اکثریت سے جو فیصلے ہوتے ہیں انہیں وہ

رگ بھی قبول کرتے ہیں جو ان کی مخالفت کر چکے ہوتے ہیں۔ ریاست کے تمام شہریوں کی مستحکم مرضی اور ارادہ ہی عمومی ارادہ کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ آزاد ہوتے ہیں۔ اور شہری بھی ایک عوامی اسمبلی میں جب ایک قانون تجویز کیا جاتا ہے تو لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ اسے منظور کیا جاتا ہے یا نامنظور بلکہ ان کی دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ یہ قانون عمومی ارادے کے تابع اور اس کا مظہر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہر شخص ووٹ دے کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور عمومی ارادے اور مرضی کا نتیجہ ووٹوں کی گنتی سے ہوتا ہے۔

ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا

شوپنہار کو قنوطی اور مایوس کرنے والا انسان اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ طبقۂ اناث کے بارے میں اس کی رائے اور نفرت کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ ایک دلچسپ اور عجیب انسان تھا لیکن یہی وہ انسان ہے جس نے فلسفے کی دنیا کو ایک ایسی کتاب اور ایسا نظریہ دیا جو اسے رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا۔ شوپنہار کی یہ عظیم کتاب "THE WORLD AS WILL AND IDEA" ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب واٹرلو کی جنگ لڑی جا چکی تھی۔ نپولین قید ہو چکا تھا۔ اور انقلاب فرانس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ دنیا پر ایک عجیب طرح کی اداسی اور قنوطیت یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب شوپنہار نے اپنا لاثانی شاہکار شائع کرایا۔

شوپنہار ۲۲ر فروری ۱۷۸۸ء کو ڈینزگ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد خاصا کامیاب اور معزز تاجر تھا۔ وہ آزادی سے محبت کرنے والا ایک مستقل مزاج آدمی تھا۔ جب آر تھر شوپنہار پانچ برس کا تھا تو یہ کنبہ ڈینزگ سے ہمبرگ منتقل ہو گیا۔ شوپنہار نے کاروباری دنیا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ جس کے اثرات اس کی طبیعت پر ساری عمر چھائے رہے ۱۸۰۵ء میں شوپنہار کے والد کا انتقال ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ شوپنہار کی دادی بھی پاگل پن میں ہی مری تھی۔

شوپنہار نے بعد میں لکھا کہ کیریکٹر یا "دل" انسان کو اپنے والد کی طرف سے اور ذہانت اپنی ماں کی طرف سے ورثے میں ملتی ہے۔ شوپنہار کی والدہ اپنے زمانے کی مقبول ناول نگار

خاتون تھی ۔ وہ بہت نازک مزاج تھی ۔ شوپنہار کے والد کو وہ ناپسند کرتی تھی ۔ جب اس کی موت واقع ہوئی تو شوپنہار کی والدہ نے "آزاد محبت" کی راہ اختیار کی اور وائمر کا رُخ کیا جہاں رنگ رلیاں منانے کے لیے ماحول بے حد سازگار تھا ۔ اس کے گوئٹے سے بھی مراسم تھے ۔ شوپنہار کو اپنی ماں سے نفرت تھی ۔ اس کی ماں نے جو راہ اختیار کی اس کا شوپنہار پر وہی اثر ہوا جو ہیملیٹ پر ہوا تھا ۔ وہ عورت ذات سے ہی متنفر ہو گیا ۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کی تو یہ نفرت زیادہ سخت ہو گئی ۔ ماں کے ساتھ اس کی ٹھن گئی ۔ جھگڑے ہونے لگے ۔ ان جھگڑوں کی بدولت اس نے طبقہ اناث کے بارے میں ان آدھی سچائیوں کا شعور حاصل کر لیا جو بعد میں اس کے فلسفے کا حصہ بنیں ۔ اس کی ماں بھی اس سے خار کھانے لگی تھی ۔ ماں بیٹے کے درمیان جو خط و کتابت رہی وہ نوک جھونک سے بھری ہوئی ہے ۔ ماں بیٹا دونوں علیحدہ رہنے لگے تھے ۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجنبیوں کی طرح ہی ملے ۔ گوئٹے جو مادام شوپنہار کو پسند کرتا تھا ۔ وہ شوپنہار کی صلاحیتوں کا بھی معترف تھا ۔ گوئٹے نے ہی اس سے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا کہ جب اس کے بیٹے کا شمار دنیا کے نامور انسانوں میں ہو گا ۔ لیکن شوپنہار کی ماں کو اس پر یقین نہ آیا ۔ وہ اپنی شہرت پر نازاں تھی اور سمجھتی تھی کہ ایک گھرانے کے دو افراد کبھی نامور نہیں ہو سکتے ۔ اسے علم نہیں تھا کہ آنے والے دور میں کوئی اس کے ناولوں کا نام تک نہ جانے گا ۔ اور اس کے بیٹے کا نام ساری دنیا میں ابد تک کے لیے مشہور ہو جائے گا ۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مادام شوپنہار نے غصے میں آ کر اپنے بیٹے کو سیڑھیوں سے دھکا دے دیا ۔ اس کے بعد شوپنہار کی ماں چوبیس برس تک زندہ رہی لیکن شوپنہار اس سے ملنے ایک بار بھی نہ گیا اور اس نے وائمر کو چھوڑ دیا ۔

شوپنہار نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ۔ لیکن علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسا آدمی بھی بنتا گیا جو قنوطی ، شکی اور یاسیت پسند تھا ۔ وہ اپنے پائپ کو مقفل کر کے رکھتا اسے نقب زنوں اور چوروں کا خوف لاحق رہتا ۔ اس لیے وہ رات کو اپنے سرہانے دو بھرے ہوئے پستول رکھتا ۔ حجام پر شک کرتا کہ حجامت بناتے وقت اس کی گردن پر اُسترا نہ پھیر دے ۔ وہ شور سے بے حد خائف تھا اور کہا کرتا تھا کہ "شور تمام دانشوروں کے لیے تشدد

کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماں کے ہوتے ہوئے وہ ماں کے بغیر تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ اس کی بیوی، تھا نہ بچہ کہ وہ عورت ذات سے نفرت کرتا تھا۔ اس لیے شادی ہی نہ کی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ وہ اکیلا رہتا۔ ڈرتا رہتا اپنے وہموں، خوف اور شکوک کا شکار۔ ۱۸۱۴ء میں اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی۔ جس کا نام ہے ON FOURFOLD ROOT OF SUFFICIENT REASON اس نے اپنی ساری توانائی اپنی عظیم ترین کتاب "دی ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا" کے لکھنے پر مرکوز کر دی۔ اس نے پبلشر کو یہ مسودہ بڑے وعدوں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اس کتاب کے حوالے سے فلسفے کے تمام بنیادی سوالوں کا حل تلاش کر لیا ہے لیکن ۱۸۱۹ء میں جب کتاب شائع ہوئی تو کسی نے بھی اس پر توجہ نہ دی۔ اس کتاب کی اشاعت کے سولہ برس بعد شوپنہار کو اطلاع دی گئی کہ اس کی کتاب کے پہلے ایڈیشن کا بڑا حصہ ردّی میں بکا ہے شوپنہار کو اپنے اس عظیم شاہکار پر ناز تھا لیکن کتاب کو کسی نے پڑھا ہی نہیں۔ قابل توجہ ہی نہ گردانا تو اس نے ایک بار زچ ہو کر کہا:۔

"میری کتاب جیسی تصانیف ایک آئینے کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر کوئی گدھا اس میں دیکھے گا تو آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اس آئینے میں اسے فرشتے کی شکل دکھائی دے گی۔"

اپنی کتاب کی ناکامی کی وجہ سے شوپنہار ایک طرح سے انسانوں سے ہی مایوس ہو گیا۔ اس کی یہ مایوسی اس کے مخصوص حالات اور مزاج کے عین مطابق تھی۔ لیکن یہ کتاب اس کے حواس پر سوار رہی۔ اپنی اس شاہکار تصانیف کے بعد اس نے جو کچھ لکھا۔ وہ گویا ایک طرح سے اسی کتاب "دی ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا" کی ہی تشریحیں اور تفسیریں ہیں۔ ۱۸۴۴ء میں اس نے اپنی کتاب ON THE WILL IN NATURE شائع کرائی۔ اس کتاب کا صلہ اسے دس کاپیوں کی صورت میں ملا۔ اس کے بعد اس نے دو اور کتابیں لکھیں جن کو کچھ پذیرائی حاصل ہوئی لیکن اس کے اس شاہکار کو مسلسل نظر انداز کیا گیا۔

۱۸۲۲ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں استاد رکھ لیا گیا۔ یہاں بھی شوپنہار نے ایک

عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے لیکچروں کے لیے وہی اوقات جان بوجھ کر رکھے جن اوقات میں اسی یونیورسٹی میں ہیگل درس دیا کرتا تھا۔ شوپنہار کا خیال تھا کہ طالب علم اس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ لیکن وہ ہیگل کے عروج کا دور تھا اور شوپنہار کو خالی نشستوں اور کمرے سے خطاب کرنا پڑا۔ اس سے وہ اتنا بددل ہوا کہ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ہیگل کا کٹر مخالف بن گیا۔ برلن میں پلیگ پھیلا تو ہیگل بھی وہاں سے بھاگ نکلا اور شوپنہار بھی۔ ہیگل تو کچھ عرصے کے بعد مر گیا لیکن شوپنہار بہتر برس کی عمر تک جیا اور اس نے برلن سے بھاگنے کے بعد اپنی بقایا زندگی فرینکفرٹ میں گزار دی۔

اپنے والد کے ترکے سے اسے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ ساری عمر بہ آسانی گزار سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک کتے کی رفاقت میں بسر کی۔ جس کا نام اس نے آتما رکھا ہوا تھا لیکن ستم ظریف اس کتے کو "چھوٹا شوپنہار" کہتے تھے۔ وہ انگریزی طعام خانوں میں کھانا کھاتا۔ کھانا کھانے سے پہلے سونے کا ایک سکہ نکال کر میز پر رکھ لیتا۔ اور کھانے کے بعد اسے جیب میں ڈال لیتا۔ ایک ملازم نے ایک بار اس سے اس کی اس عادت کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "ہر روز میں کھانے سے پہلے سونے کا سکہ اس نیت سے باہر رکھتا ہوں کہ آج اسے کسی غریب کو دے دوں گا لیکن میری شرط پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ انگریز کھانے کے دوران میں گھوڑوں، کتوں اور عورتوں کے علاوہ کسی موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتے۔

دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے اسے اور اس کے شاہکار کو نظر انداز کیے رکھا لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وقت بدلا۔ اس کا شاہکار "دی ورلڈ ایز وِل اینڈ آئیڈیا" پڑھا جانے لگا۔ اور پھر اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ عمر کے آخری زمانے میں اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جاتا وہ اسے حاصل کر کے سنبھال کر رکھتا۔ اب دنیا کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ ۱۸۵۸ء میں جب اس کی سترہویں سالگرہ منائی گئی تو دنیا بھر سے مبارک باد کے پیغام آئے۔

۲۱ ستمبر ۱۸۶۱ء کو شوپنہار کا انتقال ہوا۔ وہ صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا۔ بظاہر وہ تندرست تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس کی لینڈ لیڈی نے دیکھا کہ وہ ابھی تک میز پر بیٹھا ہے۔ لیکن مرچکا ہے۔!!

دی ورلڈ ایز وِل اینڈ آئیڈیا

آج فلسفے کی دنیا میں شوپنہار کی اس تصنیف کو لازوال مقام حاصل ہوچکا ہے شوپنہار کی یہ عظیم تصنیف ایک اور خوبی کی وجہ سے بھی بے حد اہم ہے۔ یہ خوبی ہے کہ یہ کتاب نہ تو کانٹ کی تصنیف کی طرح ادق اور پیچیدہ اصطلاحات سے پُر ہے۔ نہ ہی ہیگل کے فلسفے کی طرح الجھی ہوئی اور جسیم ——— انداز بیان واضح اور منظم ہے۔ پوری کتاب اصل موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ اس کتاب میں بڑی توانائی ہے۔ اور بڑے صاف اور دو ٹوک الفاظ میں شوپنہار نے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا انداز تحریر آمرانہ ہے۔ اس میں تجریدیت کا شائبہ تک نہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔ جس میں شوپنہار نے اس دور کی وضاحت کی ہے۔ جس میں فلسفے کی صحیح قدر نہیں ہوئی۔ وہ آخر میں لکھتا ہے:۔

" زندگی مختصر ہے لیکن سچائی دیر تک زندہ رہتی ہے۔ اس لیے آئیے ہم سچ کا اظہار کریں۔"

(دل ///// ارادہ۔ اس پر شوپنہار نے دنیا کی تفسیر کی ہے۔ اور فلسفے کی دنیا کو ایک نئے اور جاندار خیال اور نظریے سے متعارف کراتے ہوئے مالا مال کر دیا ہے۔ شوپنہار لکھتا ہے:۔

" جسے ہم شعور کہتے ہیں۔ وہ محض ہمارے ذہنوں کی سطح ہے جس طرح زمین ہو کہ جس کو کھود کر ہم نے اس کے اندر نہ دیکھا ہو تو باہر سے وہ محض مٹی کی تہہ ہی دکھائی دیتی ہے۔"

وہ ہمیں بتاتا ہے:۔

UNDER THE CONSCIONS IN TELLECT IS THE CONC-IONS OR UNCOSIOUS WILL, A STIIIING PERSISTENT VITAL FORCE.

A SPONTANEOUS ACTIVITY, A WILL OF IMPERIOUS DESIRE."

شوپنہار ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی محسوس ہو سکتا ہے کہ ذہانت ارادے (دل) کی پیشوائی کر رہی ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی آقا کی کوئی ملازم رہنمائی کر رہا ہو۔ وہ دل کی مثال یوں پیش کرتا ہے کہ جیسے ایک اندھا مضبوط و توانا فرد ہو جس نے اپنے کندھوں پر ایک نازک اور کمزور ترین انسان کو اٹھا رکھا ہو جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ شوپنہار نے "دل" یا ارادے کے حوالے سے انسانی زندگی کی ایک ایسی تعبیر پیش کی ہے کہ جو بے حد معنی خیز ہے۔

وہ لکھتا ہے:

"ہم کسی چیز کی خواہش اور طلب اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں اس کے حصول کے لیے اسباب کا علم ہو گیا ہے۔ بلکہ ہم چونکہ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے اس کے حصول کے لیے ایسی ہی وجوہات کا علم حاصل کرتے ہیں۔"

شوپنہار کے خیال میں ہم فلسفوں اور دینیات کو بھی اس لیے پھیلاتے ہیں کہ اس سے ہماری خواہشات کو ڈھانپا جا سکے۔

شوپنہار انسان کو "مابعد الطبیعاتی جانور" کا نام دیتا ہے۔ کیونکہ دوسرے جاندار مابعد الطبیعات کے بغیر زندہ رہتے ہیں جب کہ انسان کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے یادداشت انسانی ارادے کی تابع ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن کتنی ہی فتوحات اور شکستوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ ایک اور ثبوت پیش کرتا ہے کہ جب ہم حساب کتاب کر رہے ہوں تو ہم اکثر ایسی غلطیاں کرتے ہیں جو ہمارے حق میں جاتی ہوں ان کے پیچھے بھی ہمارا ارادہ

کام کر رہا ہوتا ہے۔ انسانی کردار بھی ارادے میں مضمر ہوتا ہے۔ کردار کیا ہے؟ شوپنہار کے الفاظ میں یہ روایت اور انسانی رویے کے تسلسل کا نام ہے۔ شوپنہار کہتا ہے کہ وہ زبانیں۔ جو دل و دماغ پر ترجیح دیتی ہیں وہی سچی ہیں۔ دماغ کی اعلیٰ صلاحیتیں تعریف و توصیف کی سزاوار تو ہو سکتی ہیں لیکن یہ دل نہیں جیت سکتی ہیں۔ دل یعنی ارادے کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے شوپنہار ہمیں بتاتا ہے کہ تمام مذاہب یہ نوید دیتے ہیں کہ جن کے ارادے اچھے ہوں ان کے لیے دوسری دنیا میں صلہ اور جزا ہے۔ یہ ارادہ۔ ہی دل ہے جب کہ شاندار ذہن کے لیے کوئی انعام یا صلہ نہیں۔

شوپنہار انسانی جسم کو بھی ارادے کی پیداوار کہتا ہے۔ خون اس ارادے کی قوت سے گردش کرتا ہے جسے ہم زندگی کا نام دیتے ہیں وہ لکھتا ہے:

"ارادے کے عمل اور جسم کی حرکت کو عام طور پر معروضی اعتبار سے دو مختلف چیزیں کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ دونوں کے نظریے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ یہ دراصل ایک ہی ہیں۔ ایک وحدت جسم کی حرکت ارادے کے عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی حقیقت کا اطلاق جسم کی ہر حرکت پر ہوتا ہے۔ سارا جسم دراصل ایک معروضیاتی اوارہ ہے۔ سارا اعصابی نظام بھی ارادے کا تابع ہے۔"

شوپنہار کے فلسفے کے مطابق ذہانت اور عقل تھک جاتی ہے لیکن ارادہ کبھی نہیں تھکتا ذہانت کو نیند کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ارادہ عالم خواب میں بھی مصروف عمل رہتا ہے۔

ارادہ (WILL) انسان کا جوہر ہے۔ اسی لیے زندگی کی تمام اشکال اور زندگی کا جوہر بھی ارادہ ہے۔ ارادہ دراصل زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔ جس کی دشمن صرف موت ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارادہ موت کو بھی شکست دے دے۔

"ارادہ علم کی طرح خود مختار اور آزاد ہوتا ہے۔" اس کے علاوہ وہ لکھتا ہے "اشیاء جتنی زیادہ تبدیل ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ وہ پہلے جیسی رہتی ہیں۔"

اگر یہ دنیا "ارادہ" ہے تو پھر اس دنیا میں بہت سے آلام اور مصائب بھی تو ہوں گے انسانی خواہشوں کا عجیب تماشا ہوتا ہے۔ ایک خواہش کی تکمیل ہو تو دس خواہشیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ خواہشیں بے پایاں اور اس کی تسکین محدود پیمانے پر ہوتی ہے ارادہ مستحکم ہوا ارادہ ہمارے اندر کے خلاؤں اور خوف کو بھرتا رہے تو پھر انسان بہتر، خوش حال اور پُرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ارادے کی گرفت مضبوط ہو تو خواہشیں کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ شوپنہار کے الفاظ میں جو جذبہ سیراب ہو جاتا ہے اور اکثر وہی جذبہ خوشی کی بجائے ناخوشی اور الم کا سبب بنتا ہے کیونکہ اس سیراب اور تشفی یافتہ جذبے کے مطالبے عموماً اس شخص کے بہتر مفادات سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں درد و الم کی ایک مقدار پہلے سے رکھ دی گئی ہے۔ زندگی شر ہے کیونکہ اس میں درد اور حقیقت کی تلخ کامی شامل ہوتی ہے۔ یہاں ایک طرح سے شوپنہار نے ارسطو کی تائید کی ہے۔ کہ جس نے کہا تھا دانشمند خوشی کی طلب نہیں کرتا۔ بلکہ درد و الم سے آزاد ہونے کا خواہاں ہوتا ہے۔ شوپنہار اپنی اس عظیم تصنیف میں لکھتا ہے:-

"تمام سیرابی اور تسکین جسے عرف عام میں مسرّت کہا جاتا ہے ــــ حقیقت میں محض جو فرضی ہے ہم صحیح طور پر اپنے اندر کی خصوصیات اور سچائیوں کا پورا شعور رکھتے ہیں نہ ہی ہمیں اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

اِن آلام کا حل کیا ہے؟۔ علم۔؟ نہیں۔ شوپنہار علم کے فروغ اور اندرونی نشوونما کو اس کا حل قرار نہیں دیتا۔ وہ تو اس کا حل ارادہ کو بتاتا ہے۔ اس کے صحیح شعور کو حل قرار دیتا ہے۔ یہ انسان کی حساسیت ہے جو اس کو رنج و آلام کی شدت سے ہمکنار کرتی ہے جبکہ شوپنہار کے الفاظ ہیں:-

"چونکہ پودے اس حساسیت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے وہ درد بھی محسوس نہیں کرتے۔"

علم میں اضافہ رنج و آلام میں اضافے کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ اچھی یادداشت

اور پیش بینی کی صلاحیت بھی انسانی آلام میں اضافہ کرتی ہے درد اتنا دکھ نہیں دیتا جتنا اس کا احساس شوپنہار کے الفاظ میں:۔

"موت ۔ موت کے احساس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی ۔"

شوپنہار انسانی زندگی کی جو تصویر کھینچتا ہے اور اس کے حوالے سے جو نقشہ مرتب کرتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک بدی اور شر سے تعبیر کرتا ہے زندگی مایوس کرتی ہے انسان کو قنوطی بناتی ہے اس میں یاس والم بھر دیتی ہے ۔ زندگی کا احساس ہی انسان کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے ۔ زندگی کے بارے میں جتنا غور کرو ، جتنا سوچو زندگی مصائب کا مجموعہ نظر آتی ہے ۔ ہم ناخوش اور اداس ہیں ۔ غیر شادی شدہ ہیں تو بھی شادی شدہ ہیں تو بھی ۔ ہم اجتماع اور محفل میں اداس ہیں اور تنہائی میں بھی ۔ کسی بھی فرد کی زندگی کا بغور جائزہ لیجیے ۔ وہ شوپنہار کے الفاظ میں ایک المیہ ہی دکھائی دے گی ۔

زندگی ایک ایسا کاروبار ہے جو کبھی اپنے اخراجات کا خود متحمل نہیں ہوا ۔ اس فلسفے کی رو سے موت آخری حقیقت ہے ۔ موت سے پناہ ذہنیات ملتی ہے ۔ جس طرح درد سے نجات صرف پاگل پن میں موجود ہے یا پھر آخری پناہ خودکشی میں ہے ۔ لیکن شوپنہار اس سے بھی اختلاف کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے زندگی بہر حال جاری و ساری رہتی ہے ۔ انسان خودکشی کرے تو بھی اس کے ارادے پر حرف نہیں آتا ۔ وہ خودکشی کو احمقانہ فعل قرار دیتا ہے ۔ شوپنہار کے الفاظ میں انسان اس وقت تک عوارض سے نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کا ارادہ عقل ۔ ذہانت اور علم کو اپنا تابع نہ کرلے ۔

شوپنہار اسے جینیئس قرار دیتا ہے جو زیادہ علم سے تہی ہے ۔ زندگی کے ادنیٰ مظاہر علم کی بجائے ارادے سے تخلیق و تشکیل پاتے ہیں ۔ انسان بنیادی طور پر ارادہ ہے ۔ اس میں ارادہ وافر اور علم بہت کم ہوتا ہے ۔ شوپنہار کے الفاظ میں جینیئس کی تعریف یہ ہے ۔

"جینیئس وہ قوت ہے جو اپنے مفادات کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ وہ اپنی خواہشوں اور مقاصد کو تج سکتا ہے جو اپنی ذات کی نفی کر

سکتا ہے۔"

شوپنہار نے اپنے اس نظریے کا اطلاق آرٹ، مذہب اور موت کی حقیقت پر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوپنہار کی اس عظیم کتاب پر یہ مضمون محض ایک ایسے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے جو نامکمل ہے شوپنہار کی یہ کتاب WORLD AS WILL AND IDEA ایک ایسی تصنیف ہے جسے برسوں بار بار پڑھنا اور اس پر غور کرنا چاہیے۔

بینگ اینڈ نتھنگنیس

بیسویں صدی میں وجودیت کے فلسفے کو جو عالمی شہرت حاصل ہوئی اس کا سہرا ژاں پال سارتر کے سر بندھتا ہے۔ سارتر سے پہلے کئی ایسے فلسفی اور مفکر گزرے ہیں جنہوں نے فلسفۂ وجودیت کی بنیادیں استوار کیں۔ اور اس میں شاندار فکری اور فلسفیانہ اضافے کیے۔ لیکن یہ صرف سارتر تھا۔ جس نے اس کو عام مقبولیت بخشی اور اس طرح کہ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوا۔ اور بعض حوالوں سے اسے بطور فیشن بھی اپنایا گیا۔

ژاں پال سارتر بیسویں صدی کی عظیم اور مقبول ترین عالمی شخصیات میں سے ایک ہے اس کے ایک ایک لفظ کو عقیدت سے پڑھا گیا ہے۔ اس کے بارے میں ساری دنیا میں اس کی زندگی میں عالمی اخباروں میں اس کے اعمال سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا تذکرہ شہ سرخیوں میں ہوتا رہا ہے۔

فرانس نے کئی ہنگامہ خیز شخصیتیں پیدا کی ہیں لیکن جتنی ہنگامہ خیز شخصیت ژاں پال سارتر کی تھی اس کی مثال شاید خود فرانس بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سارتر نے ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ ایک ناول نگار، کہانی کار، ڈرامہ نگار، مفکر، فلسفی، سیاست داں، دانشور اور انقلابی کارکن کی حیثیت سے وہ ساری عمر ہنگاموں کو جنم دیتا رہا۔ بیسویں صدی میں نسل انسانی اور فکر انسانی کو بہت کم لوگوں نے اپنے افکار و نظریات اور شخصیت کی وجہ سے اتنا متاثر کیا ہوگا۔ جتنا... سارتر نے...!

سارتر ۲۱ر جون ۱۹۰۵ء کو پیرس میں پیدا ہوا ابھی اس کی عمر پندرہ ماہ تھی کہ اس کے باپ کا

انتقال ہوگیا اس کی ماں کو اپنا بچہ لے کر پیرس سے اپنے والدین یعنی سارتر کے ننہال جانا پڑا۔ سارتر کا

بیں سارتر کا چچا لسانیات کا پروفیسر تھا۔ سارتر نے اپنی بچپن کی زندگی کا احوال خود اپنی تصنیف

WORDS میں کیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سارتر نے کس ماحول میں تربیت

حاصل کی۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ کتابوں سے محبت کرنے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری

عمر پڑھتا رہا کتاب سے اس کی محبت بہت سچی اور پائیدار ثابت ہوئی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سارتر کئی سال تک مختلف درسگاہوں سے منسلک رہا

اور ۱۹۳۲ء میں وہ برلن چلا گیا جہاں وہ فرائی برگ یونیورسٹی میں تحقیقی معلم کی حیثیت سے کام

کرتا رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سارتر ہائیڈگر اور مسہرل کے فلسفے سے متعارف ہوا۔ جس نے

اس کے فکری نظام کو بے حد متاثر کیا۔ برلن سے واپسی کے چند برسوں کے بعد وہ پیرس کی ایک

درس گاہ میں فلسفے کا استاد مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں اس نے بعض فلسفیانہ مضمون لکھے

جن کی اشاعت سے سارتر کا خاصا شہرہ ہوا لیکن جب ۱۹۳۸ء میں اس کا ناول ناسیا شائع ہوا تو

اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیل گئی۔ اس ناول کا مرکزی کردار انٹونی روقیونیٹن۔ آج مغربی کلچر کا

ایک جانا پہچانا نام ہے اور اسے وہی شہرت حاصل ہے جو شیکسپیئر کے ہیملٹ، ڈکنز کے اولیور

ٹوسٹ اور جیمز جوائس کے بلوم اور مولی کو۔

ناسیا ایک عظیم اور سچا فلسفیانہ ناول ہے۔ یہ صیغہ واحد متکلم میں بیان ہوا ہے اور مرکزی

کردار کی ڈائریوں کی صورت میں۔ اس ناول کے مرکزی کردار اور سارتر میں کئی مشابہتیں

ملتی ہیں۔

یہ وہ ناول ہے جو اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ سارتر کا نظام فکر کیا ہے وجودیت کی

چھاپ اس ناول پر بہت گہری ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعد میں سارتر نے جس فلسفے کو

مربوط انداز میں پیش کیا اس کا بھرپور عکس اس کے اس پہلے ناول میں ملتا ہے۔

اس ناول کی اشاعت نے سارتر کو عالمی ادب میں اہم مقام بخشا ہے اسی دوران میں

اس کی کہانیوں کا مجموعہ "INTIMACY" بھی شائع ہوا اور پھر دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔

دوسری جنگ عظیم میں سارتر فوج میں گیا۔ وہ جنگی قیدی بنا پھر اسے رہائی ملی اور جنگ

کے زمانے میں وہ مزاحمتی جنگ میں شریک رہا اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے بہت کام کیا۔ اس دور میں اس نے FLIES جیسا کھیل لکھا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ فرانس کے لیے ذلت و رسوائی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں سارتر نے بہت کچھ سوچا لکھا اور بہت سے نتائج تک پہنچا۔ جس کے اثرات بعد میں اس کی تمام تصانیف اور زندگی پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں اس دور میں اس نے آزادی کے حقیقی معنی دریافت کیے۔ ادیب اور لکھنے والے کی ذمہ داری کا شعور حاصل کیا۔

اس حوالے سے اس نے جو کہانیاں اور ناول لکھے انھوں نے سارتر کو صفِ اول کا عالمی لکھنے والا بنا دیا۔ اس کے بعد وہ زندگی کی عملی جد و جہد میں مصروف ہو گیا۔ "نوایگزٹ" اور ناولوں کی ٹرائیولوجی "فریڈم روڈ" کے خالق سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گیا اور اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ بھی اس کا تعلق نظریاتی اور فکری اختلافات کی بنا پر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۵۱ء میں اس نے خود ایک بائیں بازو کی انتہا پسند تحریک کو جنم دینے کی کوشش کی مگر اس میں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی بہر حال کمیونسٹ پارٹی اور مارکسزم کے ساتھ اس کی دلچسپی ہمیشہ قائم رہی مارکس کی مداحی میں کمی نہ آئی۔ جدید عہد میں جب NEW LEFT کی بنیادیں فکری اور سیاسی لحاظ سے استوار ہوئیں۔ اس میں سارتر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ماریس کرینسٹن کی کتاب THE NEW LEFT کا مطالعہ اس سلسلے میں اس تحریک اور نظریات کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔

سارتر ایک بین الاقوامی شخصیت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ فلسفہ وجودیت کے فروغ کی وجہ سے اس کو خاص مقام حاصل ہوا۔ وہ حق و انصاف کا داعی تھا۔ اور اس کے لیے اس نے اپنے ہم وطنوں کو ظالم اور غلط قرار دیا جس پر اس کی بہت مخالفت ہوئی اسے سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر صدر ڈیگال نے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا کہ وہ اسے کیسے سزا دے سکتا ہے سارتر تو فرانس ہے۔

سارتر نظریاتی وابستگی پر بہت اصرار کرتا ہے اگر چہ اس کے معنی اس کے نزدیک بہت

وسیع ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ لکھنے والوں کو اپنے زمانے کے معاملات و سائل میں دل چسپی لینی چاہیے، ظلم وستم کے خلاف جد وجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف اس نے جو تحریک چلائی وہ بھی اس کے انھی نظریات کا حاصل تھا۔ ویت نام میں جنگی جرائم کے بین الاقوامی رسل ٹربیونل کا سرگرم رکن رہا۔

طالب علمی کے زمانے میں سارتر کی ملاقات سمون دے بوار سے ہوئی تھی جو خود بہت اہم فرانسیسی مفکر، ناول نگار ہے۔ شادی کے بغیر وہ دونوں ساری عمر اکٹھے رہے۔ ان کی یہ رفاقت اور محبت بھی سارتر کی زندگی کا اہم واقعہ ہے دونوں ایک جریدہ بھی نکالتے رہے۔

سارتر کو ادب کا نوبل انعام بھی دیا گیا۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ بینائی سے محروم ہو چکا تھا اور جب ۱۹۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا تو وہ دنیائے حاضر کی چند بڑی شخصیتوں میں ایک تھا۔

سارتر نے عجب انداز میں زندگی بسر کی، ہوٹلوں، کیفوں میں اس کا وقت گذرتا رہا اس نے اپنے عہد کے سیاسی معاملات اور انسانی مسائل کو سمجھا اور ان کے لیے جد وجہد کی۔ اس کی زندگی بے حد مصروف تھی وہ لکھنے پڑھنے میں بہت وقت صرف کرتا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنے نظام فکر میں کئی بار ترمیم کی۔ لیکن بنیادی نظریے وجودیت سے منکر نہ ہوا۔ اس نے مارکسزم اور وجودیت کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی اس کی یہ کوشش بحث و گفتگو کا اب تک موضوع بنی ہوئی ہے۔

سارتر کا سارا کام دنیا کی سب بڑی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں سارتر کا شہرہ تو بہت ہوا ہے۔ کچھ لکھنے والوں پر اس کے اثرات بھی ملتے ہیں لیکن سارتر کا کام اُردو میں بہت کم منتقل ہوا ہے۔

اس کے چاروں ناولوں میں سے کسی ناول کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ اس کی کسی فلسفیانہ کتاب کو اُردو میں منتقل نہیں کیا گیا حتیٰ کہ اس کی اہم ادبی تصنیف ادب کیا ہے؟ کو بھی کسی ادیب نے اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی چند کہانیوں کا ترجمہ ضرور ہوا ہے جن میں "دال" اور INTIMACY کا ترجمہ شامل ہے۔ INTIMACY کا ترجمہ بہت ناقص ہے۔ ڈراموں میں ایک

NO EXIT معروف طوائف (ترجمہ مخمور جالندھری) ہے اور ایک پنجابی ترجمہ شفقت تنویر مرزا نے کا کیا ہے۔

تاہم ہمارے ہاں بہت سے لکھنے والوں پر اس کے اثرات واضح ہیں۔ اور سارتر کو پاکستان میں بہت شہرت حاصل رہی ہے۔

فلسفۂ وجودیت اور سارتر کے حوالے سے مضامین خاصی تعداد میں لکھے گئے ہیں لیکن وجودیت پر کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی۔ البتہ قاضی جاوید کی کتاب "وجودیت" تعارفی نوعیت کی بہتر کوشش ہے۔

وجودیت کیا ہے اور سارتر نے اس میں کیا اضافے کیے ہیں اور اس میں اس کا کیا مقام بنتا ہے اس حوالے کے لیے میں عام قارئین کے لیے کتابیں پڑھنے کی سفارش کروں گا۔ ایک کتاب کا نام "وجودیت بطور ایک فلسفہ" ہے اور اس کے مصنف فرنانڈو مولینا ہیں اسے پرنٹس ہال پبلشر نے شائع کیا ہے دوسری کتاب کا نام "سقراط سے سارتر تک" ہے اس کے مصنف ٹی زیڈ لیوین ہیں۔

سارتر نے فلسفۂ وجودیت کے لیے جن فلسفیوں سے بطور خاص استفادہ کیا ان میں ڈیکارٹ ہسرل، ہائیڈیگر، کیرکیگارڈ اور نطشے شامل ہیں

بینگ اینڈ نتھنگنیس

BEING AND NOTHINGNESS

وجود اور لاشیئت۔ "بینگ اینڈ نتھنگنیس" کو سارتر نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں لکھا اور مکمل کیا۔ اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۴۳ء ہے اپنی اس عہد ساز کتاب میں سارتر نے مظہریاتی مطالعے کے حوالے سے وجود کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وجود جوہری معدوم ہے۔ ہائیڈیگر نے انسان کو ہستی کا غلام قرار دیا تھا۔ لیکن سارتر اس سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ ہستی کو تمام وجودات کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ وہ شعور کا مظہر قرار دیتا ہے۔ وجود کی دو اقسام کا تعین کرتا ہے ایک وہ جو MY SELF ہے اور شعور ہے اور دوسرا جو اس کے

شعور سے باہر شے ہے۔ جو اس کے باوجود سوچنے سمجھنے کا شعور دیتا ہے۔ سارتر شعور اور خارجی اشیا
کے تعلق پر بہت اصرار کرتا ہے۔ اپنے وجود کا شعور خارجی اشیا کے بغیر ممکن نہیں، اور اشیا سے
علیحدگی کا طریقہ اپنا کر جو شعور ہوگا اسے وہ ناقابل فہم قرار دیتا ہے
وہ انسان کو اپنے فلسفے میں۔ یعنی وجود میں بہت اہمیت دیتا ہے۔

شعور ہی فیصلہ کن ہے اور وہی فاصلہ پیدا کرتا ہے۔ اپنا وجود اور اپنے لیے وجود ان دونوں
کے درمیان حائل ہے۔ اسے سارتر لاشیئیت NOTHINGNESS کا نام دیتا ہے۔
سارتر کے نزدیک انسان کا وجود حیران کن اور انوکھا ہے کیونکہ وہ انسان کو طے شدہ
فطرت کا مالک تسلیم نہیں کرتا۔ سارتر انسان کو لاشیئیت کے اعتبار سے 'موجود' سمجھ کر اپنی تقدیر
کا خالق قرار دیتا ہے۔ یوں وہ اپنی طویل فلسفیانہ تحلیل اور تجزیے کے بعد ہمیں اس نتیجہ پر لے جاتا
ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔
سارتر دوہری وجودیت کا قائل تھا لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ خدا اگر موجود نہیں تو ایسی ہستی ضرور
اپنا وجود رکھتی ہے جس کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔
یوں اس نظریے اور فلسفے کے حوالے سے سارتر انسان کو آزادی بخشتا ہے اور اس کی
خود مختاری کا جواز بھی فراہم کرتا ہے وجودیت کے فلسفے کے حوالے سے اس عظیم کتاب میں سارتر
ہمیں اپنی تحقیق اور فلسفیانہ تگ و دو میں بہت دور تک لے جاتا ہے۔ وہ اشیا کا شعور اور شعور کا
وجود کے فرق کو بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں بتاتا ہے کہ وجود کا شعور دنیا میں لاشیئیت
اور نفی کو پیدا کرتا ہے۔ اور یوں اسے نفی کی بے پناہ قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ اپنے وجود
کے لیے مکمل طور پر آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی حوالے سے سارتر نے کہا تھا۔
"ایک آدمی ہر وقت آزاد ہوتا ہے۔"
.... غدار یا پھر نہیں ..."
سارتر کا "کانشیئنس بینگ" اپنی دنیا کی پوری ذمے داری کو قبول کرتا ہے اور آپ وہ۔
آزادی کے گہرے معنی بخشتا ہے۔ کیونکہ آزاد وجود ہی یہ ذمہ داری قبول کرے گا کہ وہ جس حالت

میں زندہ ہے اس کا وہ ذمہ دار ہے اور وہی اس دنیا کو معنویت بخشتا ہے اور پھر انتخاب اور شعور کے حوالے سے جو دہشت جنم لیتی ہے اس کا مطالعہ سارتر کے فلسفۂ وجودیت کے حوالے سے بہت اہم اور فکر انگیز ہے۔

کیونکہ سارتر کے نظریات کے مطابق یہ آزادی ہی کا شعور ہے جو دہشت کا سبب بنتا ہے۔ دہشت اس لاشیئیت سے پیدا ہوتی ہے جو فرد کے جوہر اور اس کے انتخاب کے درمیان رکاوٹ بنتی ہے۔

سارتر کہتا ہے کہ دہشت ہی ہے جس میں آزادی کا بھرپور احساس ہوتا ہے سارتر کے ہاں خوف اور دہشت کے معنوں میں بڑا نمایاں فرق ہے۔

انسان۔ سارتر کے نظریے کے مطابق آزاد ہے۔ لیکن انسان کی یہی آزادی ہے جو انتخاب کی ذمہ داری اور اس کے ساتھ منسلک کرب و اذیت کو اپنے ساتھ لاتی ہے فلسفۂ وجودیت اور سارتر کے ہاں اذیت اور کرب کا جو تصوّر بنتا ہے اس کے حوالے سے بھی وجودیت کو بطور فیشن اپنایا گیا ہے اور اس کرب و اذیت کے تصور کے حوالے سے بھی اس پر بڑی تنقید کی گئی ہے۔

سارتر ہمیں بتاتا ہے کہ آزادی میں جو کرب، ذمہ داری اور اذیت ہے۔ اس سے انسان فرار حاصل کرتا ہے۔ انسان گویا اپنی آزادی کا بوجھ اٹھانے سے گریز حاصل کرتا ہے۔ اور اسی گریز کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد حیلوں بہانوں مصروفیات کا جال بنتا رہتا ہے تاکہ کسی طرح اس پر انتخاب اور ذمہ داری کی جو "اذیت" مسلط کی گئی ہے اس سے جان بچا سکے اور اپنی "مجبوری" پر سارا بوجھ ڈال کر خود کو پرسکون بنا سکے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں سارتر نے اپنے نظریات میں خاصی ترمیم کی لیکن وجودیت کے فلسفے کے بنیادی نظریات اور ڈھانچے کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔ بعض امور میں اس کی انتہاپسندی میں کمی واقع ہوئی۔ وہ فرد کی وجودیاتی آزادی اسکے بعد اسکی ذمہ داری اس کے کرب اور اذیت اور اس سے فرار کے بنیادی نظریات پہ قائم رہا۔ سارتر نے وجودیت کے فلسفے کو عام زندگی میں رائج کیا گو ادب و فنون پر اسکے گہرے عالمی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسکی یہ تصنیف بنیادی حیثیت رکھتی ہے جسکے مطالعے سے ہم سارتر کی وجودیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایستھیٹک

کروچے نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے والدین اور بہن اس کی آنکھوں کے سامنے مرگئے۔ وہ خود گھنٹوں ملبے کے نیچے دفن رہا اور جب اسے ملبے سے نکالا گیا تو گویا اس نے دوسری زندگی پائی تھی۔ اس واقعہ کا اثر اس کی زندگی پر بہت گہرا رہا۔ اس کے باوجود وہ فنا اور موت انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری اور الم وحزن کا درس نہیں دیتا بلکہ جمالیات کا فلسفہ لے کر دنیا کے سامنے آیا اور اس نے حسن اور خوب صورتی کو زندگی کا جوہر قرار دیا۔

کروچے کی زندگی کے کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جس کی اس کے فلسفے اور جمالیاتی نظریات کے ساتھ کوئی نسبت دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ جس شخص نے ایسی ہنگامہ خیز زندگی بسر کی وہ ایسے نظریات کا مالک کس طرح ہوسکتا ہے جس کو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

بینڈیٹو کروچے اٹلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا کنبہ کیتھولک اور قدامت پسند خیالات وعقائد کا مالک تھا۔ بچپن سے ہی اسے کیتھولک دینیات کی تربیت اور تعلیم دی گئی۔ اور اس میں اتنی انتہا پسندی سے کام لیا گیا کہ کروچے بالآخر ملحد بن گیا۔ ایسی صورتوں میں جب توازن قائم نہ رہے تو ایسا ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔

کروچے کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اسے پھر سے ایمان اور اعتقاد کی طرف رُخ کرنے پر مجبور کردیا۔ وہ اور اس کا خاندان ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم تھا کہ جب اس قصبے میں تباہ کن زلزلہ آیا اس کے والدین اور اس کی اکلوتی بہن اس زلزلے کی بھینٹ چڑھ گئے وہ خود گھنٹوں تک گری پڑی عمارتوں کے ملبے کے نیچے دفن رہا۔

اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ کئی برسوں تک اس کی صحت بحال نہ ہو سکی لیکن اس کی روح زندہ اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہی۔ اس نے علم حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اپنے آپ کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دیا۔ مالی اعتبار سے وہ خود کفیل تھا۔ اس لیے وہ زندگی کے آخری دم تک ایک سچا طالب علم رہا۔ حالات اسے سیاست کی دنیا میں کھینچ لائے۔ حالانکہ وہ احتجاج کرتا رہا لیکن اسے وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ سینیٹر چن لیا گیا اور اٹلی کی روایت یہ ہے کہ جو شخص ایک بار منتخب ہو جائے وہ تاحیات سینیٹر رہتا ہے۔ اس دور کی اطالوی حکومت دراصل ایک فلسفی کو وزارت کا رکن بنا کر سیاسی وزارت کو وقار بخشنا چاہتی تھی۔ تاہم کروچے نے سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اپنے دور وزارت اور سینیٹر ہونے کے باوجود اپنا جریدہ LA CRITICA مرتب کرتا رہا۔

اور پھر ۱۹۱۴ء کا برس آیا اور پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو یہ کروچے ہی تھا جس نے شدید ترین احتجاج کیا اور اپنی ہی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے ایک معاشی مسئلہ کے حوالے سے چھڑنے والی جنگ کو انسانی ذہن کی ترقی اور نشو و نما کے خلاف ایک سازش اور حماقت قرار دیا۔ حتیٰ کہ جب اس کا اپنا ملک اٹلی اپنے حلیف ممالک کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو کروچے نے شدید مخالفت کی۔ برطانوی منطقی اور فلسفی برٹرنڈ رسل نے بھی ایسا ہی ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں عوام اور حکومت کی نظروں میں معتوب ٹھہرا تھا ایسی صورت حال کا کروچے کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جنگی جنون میں مبتلا حکومت اور عوام کی نظروں میں معتوب و کمتر اور غدار ٹھہرا۔ لیکن جنگ کے بعد اٹلی کے عوام نے کروچے کو معاف کر دیا۔ اس کے رتبے اور عزت و وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ آنے والے دور میں اسے اٹلی کی نئی نسل نے اپنا رہنما، اپنا فلسفی اور سچا دوست قرار دیا۔ اس کی فکر اور اس کے نظریات کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ غالب آیا۔ گسیپ نوٹی نے اس کے بارے میں صحیح کہا تھا۔

"THE SYSTEM OF BENEDETTOCROCE REMAINS THE HIGHEST CONQUEST IN CONTEMPORARY THOUGHT"

اور آج ساری دنیا اس کے نظریات و افکار سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

ایستھیٹک

کروچے کی عہد آفریں اور لازوال کتاب ایستھیٹک (جمالیات) سے پہلے اس کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ اس کی پہلی کتاب "ہسٹاریکل میٹریلزم اینڈ دی اکنامکس آف کارل مارکس" تھی۔ کروچے مارکس اور اس کی شہرہ آفاق کتاب "داس کیپٹال" کا زبردست مداح تھا۔ اس نے مارکس کے نظریات سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اپنی سرگزشت میں مارکس اور اس کے نظریات کے اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تاہم کروچے کو سیاست سے جو دلچسپی مارکس کے حوالے سے پیدا ہوئی تھی۔ آنے والے دور میں اس کی شدت کم ہوتی چلی گئی۔ بہر حال وہ معاشیات اور مارکس کی تعلیمات و نظریات کو ہمیشہ بہت اہم تصور کرتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگرچہ مارکس کے نظریات نامکمل ہیں لیکن اس نامکمل نظریے نے دنیا کو وہ مواد فراہم کیا ہے جسے ہمیشہ پہلے نظر انداز کیا گیا تھا۔ اپنی کتاب میں وہ معاشیات کو ہی "کل" سمجھنے کے نظریے کو مسترد کر دیتا ہے۔ وہ مادیت کو بطور فلسفہ بھی تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی سائنس۔

کروچے نے جو اپنا فلسفیانہ نظام پیش کیا اسے "روح کا فلسفہ" کا نام دیتا ہے۔ وہ ہمیں تصور خالص (PURE CONCEPT) کا نظریہ دیتا ہے۔ جس سے اس کی مراد عالمی اور آفاقی تصور ہے۔ مقدار، معیار، ارتقاء سب تصورات کا اطلاق وہ حقیقت پر کرتا ہے۔ حقیقت ان کے بغیر سمجھی نہیں جا سکتی۔

۱۹۰۲ء میں اس کی عہد آفریں اور لازوال کتاب "دی ایستھیٹک" شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے دنیا کو ایک نئے نظریے اور فلسفے سے متعارف اور روشناس کرایا۔ اس کتاب میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خوب صورتی کیا ہے۔؟

کروچے آرٹ کو مابعد الطبیعات اور سائنس۔ دونوں پر ترجیح دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ سائنس کی افادیت اپنی جگہ لیکن فنون ہمیں حسن اور جمال عطا کرتے ہیں سائنس ہمیں فرد سے دور لے جاتی ہے ایک ایسی دنیا میں جو ریاضیاتی گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے اور آخر میں اس کی کوئی عملی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ جب کہ آرٹ اور فنون ہمیں اصلی فرد کے پاس لے جاتے ہیں اور

ہمیں انوکھی حقیقت سے روشناس کراتے ہیں۔

کروچے اپنی اس کتاب میں علم کی دو اقسام بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "علم کی دو اقسام اور اشکال ہیں۔ یا تو یہ وجدانی علم ہے یا پھر منطقی علم۔ وہ علم جو انسانی قوت متخیلہ سے حاصل ہوتا ہے یا پھر وہ علم جو "دانش" کی دین ہے۔ ایک علم جو فرد کا ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جو آفاقی ہے۔ اصل علم امیجز ہے۔

کروچے کا نظریہ ہے کہ "علم کا منبع امیجز کی تشکیل ہے" آرٹ پر عجیب و غریب انداز سے قوت متخیلہ کی امیج سازی کو دانش اور عقل پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"انسان اس لمحے تک ایک فن کار ہے جب تک وہ قوت متخیلہ سے کام لیتا ہے۔"

کروچے یہ تسلیم کرتا ہے کہ بڑا فن کار "مواد" کی اہمیت سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ اور اس کی اہمیت کو بھی سمجھتا ہے وہ دلیل کے طور پر مائیکل اینجلو کو پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی مصور اپنے ہاتھوں سے تصویر نہیں بناتا، بلکہ اپنے ذہن سے۔" کروچے کا نظریہ ہے کہ "جمالیاتی تخلیق اور عمل کا جوہر فنکار کی بے حرکت کا دش متخیلہ میں مستور ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے اسے جو اظہار کرنا ہے وہ اسے کس انداز میں پیش کرے گا۔ وہ اپنے ذہن میں اسے پہلے تخلیق کرتا ہے۔ یہ تصور اس کے ذہن میں وجدان کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ جس کا تعلق کسی صوفیانہ بصیرت سے نہیں ہوتا لیکن اس کے عناصر مکمل نظر تکمیل شدہ تصور موزوں اور متوازن تخیل اور تصور ہیں۔

کروچے کو آئیڈیلیسٹ بھی کہا گیا ہے وہ آئیڈیا کو بہت اہمیت دیتا ہے اور اپنی عہد آفریں کتاب "ایستھیٹک" میں لکھتا ہے۔

"معجزۂ فن خارج میں نمو نہیں پاتا۔ بلکہ آئیڈیا کے فن میں پلتا ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ ہم جب داخلی دنیا پر پوری طرح غالب آجاتے ہیں جب کوئی تصویر ذہن میں پوری طرح رچ بس جاتی ہے اپنی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اسی لمحے اس کا خارجی اظہار بھی نمود ظہور میں آجاتا ہے ہم جو کچھ اونچی آواز میں گاتے ہیں وہ پہلے اپنے اندر باطن میں گا چکے ہوتے ہیں۔ اپنی اس شہرۂ آفاق اور عہد آفریں تصنیف میں کروچے نے بہت سے سوالوں کا جواب دیا ہے اور بہت سے سوال اٹھائے ہیں

آخر خوب صورتی کیا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر زمانے کے لوگوں نے فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر جواب دوسرے جواب سے مختلف ہے۔ ہر محبت کرنے والا اپنی محبوبہ کو خوب صورت اور حسین قرار دیتا ہے۔ کروچے نے اپنی اس کتاب میں ایسے سوالوں کا جواب اپنے فلسفیانہ نظریات و نظام کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ خوب صورتی کو کسی امیج کی ذہنی تشکیل کا نام دیتا ہے۔ یہ تشکیل کئی امیجز پر مشتمل بھی ہو سکتی ہے۔ یہ امیج ہمارے باطنی تصور کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور خوب صورتی کا تعلق اندرونی امیج سے ہوتا ہے اس کی ہیئت اور مجسم صورت سے نہیں۔ حسنِ جمالیات کو بھی کروچے باطنی اور داخلی غور و فکر کا نتیجہ قرار دیتا ہے ہر تخلیق فن کار کے باطن کا اظہار ہے اور ہم اگر کسی چیز کو سراہتے ہیں تو جس سطح تک ہم اسے سراہتے ہیں اس میں جمالیاتی عنصر کو محسوس کرتے ہیں وہ ہماری اس اندرونی قوت کی دین ہے جو ہم نے اپنے والدین سے حاصل کی ہے اور اسی سے حسن جمالیات جنم لیتی ہے ہمارے اپنے اندر کا جمالیاتی اظہار تحسین کا سبب بنتا ہے۔ کروچے لکھتا ہے :-

"IT IS ALWAYS OUR OWN INTHITION WE EXPRESS WHEN WE ARE ENJOYING A BEAUTIFUL WORK OF ART"

فن کار جمالیات کا خالق ہے اور دیکھنے سننے اور پڑھنے والا اس میں جمالیات کو اپنی حسِ جمالیات سے حاصل کرتا ہے۔ جمالیاتی اسرار کو کروچے متاثر کرنے والی امیج کا نام دیتا ہے۔ خوب صورتی متوازن تاثر میں پائی جاتی ہے۔ اگر اس میں توازن نہیں تو پھر یہ کس چیز کا اظہار کر سکتی ہے اور پھر وہ دوٹوک انداز میں لکھتا ہے :-

BEAUTY IS EXPRESSION

کروچے کی یہ تصنیف "ایستھیٹک" یقیناً عام طالب علم اور قاری کے لیے سہل نہیں ہے۔ اس میں بہت سے سوالات ایسے ہیں جنہیں سمجھنا عام قاری کے بس میں نہیں۔ کیونکہ یہ سمجھنا آسان نہیں ہے کہ جونہی کوئی شخص امیجز تراشنے لگتا ہے وہ کس طرح فنکار بن جاتا ہے اور پھر یہ کہ کیا واقعی خوبصورتی اور آرٹ کا جوہر خارجی دنیا سے یکسر کٹا ہوا ہے اور پھر یہ کہ کروچے کے حوالے سے بہت سے فن پاروں کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ان کو ہم کس اعتبار

سے خوب صورت قرار دیں گے۔

کروچے کی اس عہد آفریں تصنیف نے فنون لطیفہ اور فلسفے کی دنیا میں ان گنت مباحث کو جنم دیا ہے اس فکر انگیز تصنیف نے اپنی اشاعت کے بعد سے اب تک پوری دنیا کو کسی نہ کسی انداز سے متاثر کیا ہے۔ اس کتاب میں جن افکار و نظریات کو پیش کیا گیا ہے ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اور اس اعتبار سے اس کتاب کو فلسفہ جمالیات کے حوالے سے بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کا یہ مقام اور اعزاز آنے والے ادوار میں بھی قائم رہیگا۔

کروچے کے حوالے سے ہمارے ہاں ادب و فن میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہماری تنقید نے کروچے کے نظریات سے اثر لیا ہے۔ اس کے نظریات پر ہمارے بہت سے لکھنے والوں نے اپنے خیالات و افکار کا بھی اظہار کیا ہے۔ ہماری تنقید میں کروچے کے حوالے بھی ملتے ہیں تاہم اس کی اس فکر انگیز اور عہد آفریں کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا۔

محمد علی صدیقی کروچے کی سرگزشت کو اُردو میں منتقل کر چکے ہیں اور اپنی جگہ اُردو ادب و فن میں ایک بہت بڑا اہم اضافہ ہے۔

۴۸

پرنسپلز آف سوشیالوجی

ایک ایسا شخص ذہن میں لائیے جس نے فلسفے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور اس نے کبھی کسی کتاب کو سنجیدگی سے پوری طرح نہ پڑھا تھا۔ اور ہر کتاب کو ادھورا چھوڑ دیا تھا یا اسے سرسری سا دیکھا تھا۔ ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتابوں کو دنیا ایک عرصے سے پڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کے کام پر بے اندازہ لکھا گیا ہے۔ ہربرٹ سپنسر ایسا ہی فلسفی تھا۔

اس کے ایک سیکرٹری کولیر کا بیان ہے کہ سپنسر نے کبھی کوئی کتاب پوری نہ پڑھی تھی۔ سائنسی تجربات کا بھی سپنسر کو شوق تھا۔ لیکن اس میں بھی اس نے باقاعدہ تعلیم یا تربیت حاصل نہ کی تھی۔ سپنسر نے خود لکھا ہے کہ وہ ہومر کی کتاب " ایلیڈ " کو پورا پڑھ ہی نہ سکا اور کانٹ کا فلسفہ سرسری پڑھا تو کانٹ کا ناقد بن گیا۔

برطانوی فلسفی ہربرٹ سپنسر ۲۷ اپریل ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک سکول ماسٹر تھا اور خاص عقائد رکھتا تھا۔ سپنسر نے ۱۷ برس کی عمر تک سکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر ریلوے انجنیئر سرویئر اور ریلوے کے پلوں اور پٹڑیوں کا ڈیزائنر بن گیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے پیشے سے تعلق رکھنے والے رسالوں میں بھی کئی مضامین لکھے۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے مضامین کا ایک سلسلہ قلم بند کیا اور پھر ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک " دہ اکانومسٹ " کا نائب مدیر رہا۔ اس دور میں اس نے عمرانی اور اخلاقی نظریات کو ایک کتاب SOCIAL STATISTICS میں پیش کیا اور اس دوران میں اس نے بہت سی کتابوں پر تبصرے بھی کیے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔

سپنسر کی دیگر اہم تصانیف میں " دی ڈویلپمنٹ آف ہیپوتھیسس (۱۸۵۲ء) میںرز اینڈ

فیشنز (۱۸۵۷ء) جینیسیس آف سائنس (۱۸۵۷ء) پراگرس لاز اینڈ کاز (۱۸۵۷ء) شامل ہیں۔

ڈاروِن کی تہلکہ خیز "اصل الانواع" کی اشاعت سے کئی برس پہلے ہی ارتقاء کے اصول کا اطلاق سپنسر نے مختلف شعبوں پر کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ بہت دلچسپ حقیقت ہے کہ تیس برس کی عمر تک سپنسر کو فلسفے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس کا سیکریٹری کولیئر لکھتا ہے کہ سپنسر نے کبھی کوئی سائنس کی کتاب بھی پوری طرح نہ پڑھی تھی سپنسر کو یہ خاص اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات اور آگہی کو اپنے ذاتی مشاہدات سے اخذ کرتا تھا اس کا ذہن عجیب طرح کا تھا۔ وہ معمولی معمولی چیزوں کو ذہن میں جمع کرتا رہتا، اپنے احباب کو اس حد کریدتا رہتا کہ وہ زچ ہو جاتے۔

سپنسر کو ایجادات سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے بہت سی ایجادات کیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی کمرشل کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں سپنسر نے اعلان کیا کہ وہ "سسٹم آف سینتھٹک فلاسفی" کے عنوان سے ایک بڑے کام کا آغاز کرنے والا ہے۔ اس کا موضوع تمام علوم کے ابتدائی اصولوں کا احاطہ اور زندگی میں ارتقاء کا سراغ لگانا تھا اور یہ بھی کہ ارتقاء سماج اور اخلاقیات پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو ایک ایسا شخص کرنے والا تھا جس کی صحت خراب تھی اور عمر چالیس برس ہو چکی تھی۔ جس کی صحت اس کو قطعاً اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ دماغی کام کر سکے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ سپنسر نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ تجویز سوچی کہ وہ پیشگی خریدار جمع کرے جو اسے چندہ دے سکیں۔ اس نے ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی یہ منصوبہ اس نے اپنے دوستوں کے سامنے بھی رکھا۔ اس نے اپنے منصوبے کو ایک پراسپکٹس کی صورت میں شائع کیا اور یوں اسے یورپ سے ۴۴۰ اور امریکہ سے ۲۰۰ چندہ دینے والے مل گئے۔ جس سے اسے پندرہ سو ڈالر سالانہ آمدنی کی توقع بندھ گئی۔

یوں سپنسر نے اپنی تصنیف "فرسٹ پرنسپل" پر کام شروع کیا۔ لیکن اس کی اشاعت کا ردّعمل یہ ہوا کہ اس کے بہت سے چندہ دینے والوں نے آئندہ کے لیے چندہ دینے والوں کی فہرست سے اپنا نام کٹوا دیا۔ کیونکہ سپنسر نے اپنی اس کتاب میں مذہب اور سائنس میں جو یکتائی اور ہم آہنگی پیدا کرنے

کا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو پسند نہ آیا۔ سپنسر کی اس کتاب پر ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے خلاف لکھا جانے لگا۔ اور اس کا یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ بعض لوگوں جن میں جان سٹورٹ مِل بھی شامل ہے اس کو پیش کش کی کہ وہ اس کی آنے والی کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن سپنسر نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ تاہم اس بحران کے بعد اس کے امریکی پرستاروں نے اس کو ایسے مالی تحفظات فراہم کر دیے کہ جس سے وہ اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا اس کی تصنیف "پرنسپلز آف بیالوجی" ۱۸۶۴۔۶۷ء اور پرنسپلز آف سائیکلوجی ۱۸۷۰۔۷۲ء اور پرنسپلز آف سوشیالوجی کے دیباچے میں لکھا کہ وہ اس کام کو مزید آگے بڑھائے گا۔ وہ لسانیات، جمالیات اور اخلاقیات کو بھی موضوع بنانا چاہتا تھا لیکن یہ کام اس کی خراب صحت کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔

۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو سپنسر کا انتقال ہوا۔ اس کی خود نوشت اس کی موت کے بعد شائع ہوئی اور اس کے کام نے اس کے ہم عصروں اور اس کے بعد کی نسلوں کو بے حد متاثر کیا اور ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

پرنسپلز آف سوشیالوجی

سپنسر کے فرسٹ پرنسپلز کے سلسلے میں اس کی تصنیف "پرنسپلز آف سوشیالوجی" کو سب سے زیادہ اہم اور وسیع سمجھا گیا۔ اپنے نظریات کے حوالے سے سپنسر نے لکھا ہے کہ:

"ہم اکثر یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ نہ صرف برائی میں اچھائی اور خیر کا قوی عنصر شامل ہوتا ہے بلکہ شر میں بھی صداقت کا ایک عنصر پایا جاتا ہے۔"

ارتقاء کو سپنسر نے زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھنے اور پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا اطلاق بھی کیا ہے۔ اس کی یہ ضخیم بالشان تصنیف ایک عظیم ڈرامہ ہے اور وہ اس میں ہمیں انسان اور کائنات کی زندگی کے زوال اور ارتقاء کی داستان سناتا ہے۔ انسانی زندگی پر اس کھیل کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ المیے سے بہت قریب ہیں۔

وہ بیالوجی کو زندگی کے ارتقاء کا علم کہتا ہے۔ سائیکلوجی کو ذہن کا ارتقاء اور سوشیالوجی کو معاشرے اور سماج کے ارتقاء کا نام دیتا ہے۔

"سوشیالوجی پراسس کی یہ عظیم کتاب دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ سپنسر ہمیں اس کتاب میں بتاتا ہے کہ سماجی ہیئت و تنظیم اور فرد کی ہیئت و تنظیم میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں جو اشتراک ہے وہ ہر نوع کو منظم کرتا ہے اور اجتماع کے تمام حصے ایک جیسے ہیں اور تمام حصے اور اجزا ایک ساتھ ایک ہی طرح سے، ایک دوسرے کی مدد کے بغیر نشوونما پاتے ہیں لیکن انتہائی نچلے درجے کی چیزیں اور اجزا اپنی کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اپنے آپ کو حالات کے ساتھ پوری طرح مطابقت کی راہ میں مانع ہوتی ہیں۔ اور یوں وہ تباہ کن اعمال کا نشانہ بنتی ہیں۔ اس بے تنظیم صورت اجتماع میں وہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اس کا ڈھانچہ بناتی اور منظم کرتی ہے۔

سپنسر کہتا ہے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان چیزوں کی اصلیت بہت حد تک کھو جاتی ہے اور ان میں جو مشابہت ہوتی ہے وہ بھی کم پڑ جاتی ہے۔ غیر مشابہت پیدا کرنے والا عمل پہلے آہستہ ہوتا ہے۔ پھر تیز ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں اس کی شناخت آسان ہوتی ہے لیکن بعد میں صورت ہی بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اب بھی ان کی "مشابہت باطنی" برقرار رہتی ہے یوں معاشرہ ترتیب پاتا ہے اور مختلف سطحوں کی اعلیٰ اور کمتر آوازوں کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔ اور یوں ہر معاشرے کے ابتدائی دور اور بعد کے دور میں ایک "حد تمیز" پیدا ہوتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ (PRIMITIVE) قبائل اپنے اجزا اور ترکیبی عناصر کے تضاد و عناصر کا اظہار نہیں کرتے۔ ابتدا میں یوں ہوتا ہے کہ ہر شخص ایک ہی طرح کے اعمال ادا کرتا ہے۔ ان کے مشاغل یکساں ہوتے ہیں وہ زیادہ تر ایک دوسرے پر تکیہ نہیں کرتے۔ شاذ و نادر ہی وہ دوسرے کے تعاون کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی طے شدہ سردار یا سربراہ بھی نہیں ہوتا البتہ زمانہ جنگ میں لوگ ان کی اطاعت و متابعت کرتے ہیں۔ جو بہترین رہنمائی کی صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں اس کے بعد کے ادوار میں حالات کے تحت اجزا و ترکیب عناصر میں جو یک جہتی اور مماثلت ہوتی ہے وہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ابتدا میں یہ عمل محدود ہوتا ہے۔ اس کی کئی تہیں اور سطحیں ظہور میں آتی ہیں یوں مختلف اشغال اور اعمال کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں معاشرے اور سماج کی مختلف اکائیاں جنم لیتی ہیں اور یہ اپنی مقامی ضروریات اور حالات اور ذاتی استعداد سے بھی ان میں نمایاں تبدیلیوں اور متنوع اعمال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یوں اس بتدریج تبدیلی اور عمل کا نتیجہ مستقل سماجی سٹرکچر یعنی ڈھانچے کو جنم دیتا ہے۔

سپنسر اس سلسلے میں اپنے جو نظریات پیش کرتا ہے اس کا خلاصہ اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :-

A SOCIAL ORAGANISM IS LIKE AN INDIVIDUAL ORGANISM IN THESE ESSENTIAL TRAITS, THAT IT GROWS, THAT WHILE GROWING IT BECOMES MORE COMPLEX; THAT WHILE BECOMING MORE COMPLEX ITS PARTS ACQUIRE INCREASING MUTUAL DEPENDENCE; THAT ITS LIFE IS IMMENSE IN LENGTH COMPARED WITH THE LIVES OF ITS COMPONENT UNITS, ... THAT IN BOTH CASES THERE IS INCREASING INTEGRATION ACCOMPANIED BY INCREASING HETEROGENEITY.

(PRINCIPLES OF SOCIALOGY P.P. 286 NEW YORK EDITION.)

اس طرح سپنسر کے نظریات کے مطابق سماج اور معاشرے کی ترقی اور نشو و نما آزادانہ طور پر ارتقا کے فارمولے پر جاری رہتی ہے اور اس کا حجم بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس کی سیاسی وحدت خاص طور پر نمایاں ہوتی اور پھیلتی پھولتی ہے اور یوں خاندان سے مراحل طے کرتی ہوئی ریاست کے مرحلے اور تنظیم تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح دیہات سے شہر جنم لیتے ہیں۔ پیشوں اور ہنروں میں پھیلاؤ جو محنت پر انحصار کرتا ہے۔ بڑی تبدیلیوں کا محرک بنتا ہے۔ یوں شہر جب اقتصادی طور پر کفیل ہوتا ہے تو اس کا اثر ملک پر پڑتا ہے اور ملک خود کفیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح قوم بنتی ہے۔

اپنے اس نظریے کا اطلاق سپنسر زندگی کے ہر شعبے پر کرتا ہے۔ سائنس، آرٹ، مذہب اور حکومت سب اس کے تابع ہیں۔ مذہبی سلسلے میں ارتقاء کے مراحل سپنسر کے نظریے کے مطابق اس طرح طے ہوتے ہیں کہ پہلے مختلف اقوام اور ممالک کے ہزاروں اور ان گنت دیوی دیوتا تھے جن کی انسان پوجا کرتا تھا اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے انسان ایک مرکزی قوت، ایک خدا اور ایک قادر مطلق کے تصور تک پہنچا۔

اپنے نظریات والکار کے حوالے سے سپنسر بے حد دیانتدار تھا۔ اس نے اپنی خود نوشت میں لکھا تھا :-

I AM A BAD OBSERVER OF HUMANITY IN THE CONCRETE, BEING TOO MUCH GIVEN TO WANDERING INTO THE ABSTRACT.'

اس ABSTRAETION کا اطلاق اس کے نظریات نے دنیا کے افکار پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اس کی اس دو ہزار صفحات پر مشتمل کتاب پر بہت تنقید بھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی اثر پذیری سے کوئی انکار نہیں کر سکا۔

پرنسپلز آف سوشیالوجی عظیم تصنیف ہے۔ ہمارے ہاں سپنسر کا حوالہ تو متعدد انداز سے آیا ہے۔ لیکن اس کے کسی کام کا ترجمہ نہیں ہوا۔ لیکن جدید علوم اور انگریزی زبان کے حوالے سے سپنسر ہم پر بھی اثر انداز ہوا ہے اور بطور خاص اس کی یہ کتاب دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی فکر پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اور زرتشت نے کہا

"کیا میری بات سمجھ لی گئی ہے۔ ؟"

یہ جملہ نطشے کی آخری کتاب Ecco Homo کا آخری جملہ ہے۔ ۱۸۸۸ء میں مکمل دماغی پاگل پن کے حملے سے چند ہفتے پہلے نطشے نے بڑے قنوطی انداز میں اپنے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا آغاز کیا جس میں اس نے اپنی کہانی بیان کی۔ اپنی کتابوں اور تصانیف پر روشنی ڈالی۔ اس کی یہ آخری کتاب Ecco Homo. ہے جو جرمن زبان کی خوبصورت ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ نطشے کو اپنے ہوش و حواس کے آخری لمحے تک یہی احساس رہا کہ اسے پوری طرح سے سمجھا نہیں گیا ہے۔ کیا میری بات سمجھ لی گئی ہے ؟

حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی زندگی میں اور پھر اس کی موت کے بعد بھی آج تک اسے پوری طرح نہیں سمجھا گیا۔ جدید فلسفیوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو جسے نطشے کی طرح غلط سمجھا گیا ہو۔ اس کو بیشتر صورتوں میں غلط انداز میں پیش کیا گیا۔ حتیٰ کہ نازی دانشوروں نے تو اسے بہت ہی غلط اور بھونڈے انداز میں پیش کیا ـــ جس سے یہ تاثر ملا کہ فاشزم اور نازی ازم جیسے غیر انسانی اور بھیانک نظاموں کا سرچشمہ ـــ نطشے کے افکار و نظریات ہیں اس کے "فوق البشر" کے نظریے کی جس طرح مٹی پلید کی گئی اس کی مثال پوری انسانی فکر میں نہیں ملتی۔

نطشے کو پڑھنا سمجھنا اور پھر ہضم کرنا مشکل کاموں میں ایک ہے۔ کیونکہ خود نطشے کے الفاظ میں "درد کے روحانیت بننے تک" کے مراحل بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔

بہرحال اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے فکر و فلسفے پر نطشے کے

اثرات بہت گہرے ہیں۔ جارج برنارڈشا، تھامس جان، ژاں پال، سارتر، آئیبر کامیو اور اقبال پر اس کے اثرات بہت واضح اور قوی ہیں۔

اقبالیات کو تو پوری طرح سمجھنے کے لیے نطشے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اقبال کے مرد مومن کا تصور نطشے کے فوق البشر Superman سے مستعار ہے علامہ اقبال نے مرد مومن کو اپنے مخصوص نظریات اور مذہب کے حوالے سے اپنا رنگ و روپ دیا اور اس کے خد و خال اُجاگر کیے۔ لیکن اس کے پس منظر میں نطشے کا ہی 'فوق البشر' کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اور نطشے کے افکار کا موازنہ ایک علیحدہ باب اور اہم اور دلچسپ مطالعہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

نطشے کی تصانیف میں اس کی سب سے اہم تصنیف 'اور زرتشت نے کہا' تسلیم کی گئی ہے انگریزی میں اس کے متعدد تراجم Thus spoke Zarathustra کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو اس اعتبار سے میرے نزدیک بہت خوش قسمت ہے کہ برسوں پہلے برصغیر کی تقسیم سے پہلے اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے "اور زرتشت نے کہا" کے عنوان سے براہ راست جرمنی زبان سے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ ترجمہ ان دنوں کمیاب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو زبان میں نطشے کی اس تصنیف کا اس سے بہتر ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو نطشے کو اپنی ہر کتاب بہت عزیز تھی لیکن خود اسے بھی اس کا بھرپور احساس تھا کہ اس کی سب سے اہم تصنیف "اور زرتشت نے کہا" ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نطشے کی ساری فلسفیانہ فکر اسی کتاب میں یکجا ہوئی ہے۔

"اور زرتشت نے کہا" محض فلسفہ کی ہی ایک بے مثل کتاب نہیں ہے بلکہ اپنے شاندار بے مثل تخلیقی اور ادبی اسلوب کی حیثیت سے بھی اس کا شمار دنیا کی معدودے چند کتابوں میں ہوتا ہے فلسفے کو اتنے موثر، تخلیقی ادبی اور تمثیلی انداز میں ایسے جاندار اسلوب میں نطشے کے علاوہ کم ہی فلسفیوں نے پیش کیا ہے۔ عام طور پر فلسفے کی کتابیں بے حد خشک اور بے کیف ہوتی ہیں۔ لیکن "اور زرتشت نے کہا" اپنے اسلوب، ڈرامائی انداز، شعری حسن اور اعلیٰ ترین تخلیقی اسلوب کی بنا پر فلسفے کی کتابوں میں یکتا اور منفرد کتاب ہے۔ اسے پڑھنا بذات خود ایک بہت بڑا ادبی اور فکری

سطح کا بے مثل تجربہ ہے۔!

زرتشت کے حوالے سے اس کتاب میں نطشے نے اپنے نظام فکر کو پیش کیا ہے۔ اپنے افکار اور فلسفے کو پیش کیا ہے، اپنے افکار اور فلسفے کو پیش کرنے کے لیے نطشے نے زرتشت کو ترجمان کیوں بنایا یہ سوال بنیادی بھی ہے اور بہت اہم بھی۔ نطشے نے اس سلسلے میں خود وضاحت بھی کی ہے۔ زرتشت کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ قدیم ترین ایرانی مذہب کے بانی اور پیغمبر تھے۔ اس مذہب کی کتاب "ژند اوستا" ہے۔ اس مذہب کا بنیادی تصور وہ کشمکش ہے جو آہورا مزدا" یعنی خیر اور روشنی کا دیوتا اور اہرمن یعنی شر اور تاریکی کے دیوتا کے درمیان جاری رہتی ہے۔ نطشے نے زرتشت کو اپنا ترجمان کیوں بنایا۔ اس کا جواب نطشے کے الفاظ میں ہی پڑھیے۔

"مجھ سے یہ پوچھا نہیں گیا حالانکہ یہ سوال کیا جانا چاہیے تھا۔ کہ" زرتشت کا یہ نام میرے نزدیک کیا مطالب و مفاہیم رکھتا ہے۔ زرتشت۔ پہلا مفکر اور انسان تھا جس نے خیر اور شر کی کشمکش کو دیکھا۔ اور یہ وہی کشمکش ہے جو انسانی زندگی میں اعمال کے پس منظر میں پہیے کی طرح گردش کرتی ہے۔ اس نے اخلاقیات کو مابعدالطبیعات کی مملکت تک پہنچا دیا۔ میرے لیے جو چیز بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ زرتشت دوسرے تمام مفکرین کے مقابلے میں زیادہ راست باز ہے۔ وہ اس میدان میں اکیلا ہے۔ اس کی تعلیمات سچائی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔"

(نطشے۔ Ecco Homo)

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زرتشت کا زمانہ۔ ساتویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ !!

~ ✻ ~

فریڈرچ ولہیلم نطشے ۱۵ ؍ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو لیپزگ کے قریب پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک پادری تھا۔ سارے گھرانے کا ماحول مذہبی تھا۔ نطشے پر بھی یہ توارثی مذہبیت خاصے عرصے تک سوار رہی اس نے پرونٹا سکول اور بھر بون اور لیپزگ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ فلالوجی میں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اور اسی زمانۂ طالب علمی میں اس نے پہلی بار شوپنہار کو پڑھا۔ اور پھر ساری عمر وہ شوپنہار کا مداح رہا۔ نطشے فلالوجی میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا کہ چوبیس برس کا ہی تھا کہ جب اسے باسل یونیورسٹی میں

کلاسیکل فلالوجی کے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ طالب علمی کے زمانے میں اسے سفلس کا مرض لاحق ہوا۔ نطشے نے ساری عمر شادی نہ کی اور نہ ہی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اسکے کسی عورت سے تعلقات رہے ہوں ۱۸۶۵ء میں اس کی علالت کا جو دور شروع ہوا وہ اس کی موت تک جاری رہا۔

نطشے جلد ہی مذہب سے بے گانہ ہوگیا۔ عیسائیت کے خلاف اس کا ردعمل بہت شدید تھا شاید ہی کوئی فلسفی اور مفکر عیسائیت کا اتنا مخالف رہا ہو۔ نطشے کی کتاب "اینٹی کرائسٹ" اس کا ثبوت ہے۔ اسی زمانے میں اس کی ویگنر سے دوستی ہوئی جو موسیقار کی حیثیت سے نمایاں ہو رہا تھا۔ نطشے نے ویگنر کے روپ میں جرمنی کا نیا ہیرو دیکھا۔ لیکن بعد میں ان دونوں کے درمیان بگڑ گئی اور نطشے کو ویگنر کے خلاف شدید اعتراضات پیدا ہوئے جو اس کی ایک کتاب کا موضوع بھی بنتے ہیں۔

۱۸۶۹ء میں اسے باسل یونیورسٹی میں کلاسیکل فلالوجی کا استاد مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اُسے امتحان دیے بغیر ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دے دی گئی۔ ۱۸۷۱ء تک اس کی صحت بگڑنے لگی تھی۔ ۱۸۷۲ء میں اس کی کتاب "دی برتھ آف ٹریجڈی" شائع ہوئی۔ وہ بیماری کی وجہ سے تعلیمی فرائض انجام نہ دے سکتا تھا۔ اور اس کو مختلف اوقات میں رخصت لینی پڑتی۔ اس کی بہن الزبتھ نے اس کی تیمارداری کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ اس نے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی طویل سیاحت بھی کی۔ اس کی کتاب Human all too Human بھی ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے حوالے سے ویگنر نے لکھا تھا کہ یہ کتاب گواہی دیتی ہے کہ اس کا مصنف ذہنی اور دماغی بیماری میں مبتلا ہے۔

۱۸۷۹ء میں نطشے کی درخواست پر اسے یونیورسٹی نے تمام فرائض سے سبکدوش کر دیا۔ ۱۴ جون کو اسے پنشن دے کر ریٹائر کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کی صحت اب اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ اپنے تعلیمی فرائض انجام دے سکتا۔ نطشے نے اپنی باقی ماندہ عمر اسی پنشن پر بسر کی۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی کتاب DAY BREAK - اور ۱۸۸۲ء میں GAY SCIENCE شائع ہوئی۔

"اور زرتشت نے کہا" کا پہلا حصہ نطشے نے جنوری فروری ۱۸۸۳ء میں لکھا۔ اسی سال ویگنر کا انتقال ہوا۔ بیماری سے نطشے کو کچھ سنبھالا ملا تھا۔ اپنی بہن الزبتھ سے اس کی کچھ عرصہ پہلے ٹھن چکی تھی۔ اس برس پھر الزبتھ سے صلح ہوگئی۔ اور پھر الزبتھ نے ہمیشہ نطشے کے آخری سانس

تک اس کی نگہداشت اور تیارداری کی۔ "اور زرتشت نے کہا" کے یہ دونوں حصے ۱۸۸۳ء میں ہی شائع ہوئے۔ تیسرا حصہ اس نے ۱۸۸۴ء میں لکھا۔ اور نئی کتاب will to Power پر کام شروع کیا، لیکن یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۵ء میں اس نے "اور زرتشت نے کہا" کا چوتھا اور آخری حصہ مکمل کر کے اسے محدود تعداد میں نجی طور پر شائع کرا دیا۔ ۱۸۸۶ء میں اس کی کتاب Beyond good and Evil شائع ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں "ویگنر کیس" ۱۸۸۸ء میں اس نے کئی کتابیں شروع کیں جو ادھوری رہیں۔ لیکن Twilight of Gods. اور Anti christ لکھیں اور شائع کیں۔ Ecce Homo اس کی آخری کتاب بھی ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی۔ ۱۸۸۹ء میں اس پر پاگل پن کا شدید دورہ پڑا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ نطشے کے مقدر میں تھا کہ وہ ایک بار پھر بچہ بن جائے۔ اب وہ ذہنی اور دماغی اعتبار سے ایک بچے جیسا تھا۔ اس دوران میں اس کی تصانیف کے collected ایڈیشن شائع ہونے لگے۔ اس کی بہن الزبتھ نے اس کے تمام کاغذات اور تصانیف کو اپنے انتظام و انصرام میں لے لیا تھا۔ وہی اس کی وارث ٹھہری۔ ۲۰ر اپریل ۱۸۹۷ء کو نطشے کی والدہ کا انتقال ہوا لیکن نطشے کو کچھ خبر نہ ہوئی وہ ہوش و حواس سے بے گانہ بچہ تھا۔ ۱۸۹۹ء میں نطشے کے collected works، کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور ۲۵ر اگست ۱۹۰۰ء کو نطشے کا انتقال ہوتا ہے۔

—٭٭٭—

نطشے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے لیے اس کے کام کا جائزہ لینا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ نہ میں فلسفی ہوں نہ دانشور۔ لیکن نطشے کے طالب علم کی حیثیت سے چند باتوں کا اظہار میرے لیے ضروری ہے۔ نطشے کی کتابوں میں سے "اور زرتشت نے کہا" کو میں نے کئی بار پڑھا ہے۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ اسے اتفاق کہیے کہ نطشے کی بیشتر کتابوں کو آر جے ہولنگ ڈیل نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ آر۔ جے ہولنگ ڈیل وہ مترجم ہے جس نے نطشے کے فکر اور اس کی روح کو سمجھا ہے۔ اس کے حوالے سے میں نے نطشے کی ان تصانیف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ Ecco Homo نطشے کی وہ تصنیف ہے جو اس کی اپنی خود نوشت ہے۔ اس میں اس نے اپنی کتابوں کے بارے میں بھی اپنی رائے دی ہے یہ گویا self Advertisme..t

کی ایک انوکھی مثال ہے Twilight of God اور Antichrist کے علاوہ اس کی دوسری کتابوں کو بھی کئی بار پڑھا ہے۔ نطشے کو اگر پوری طرح سمجھا اور ہضم نہیں کیا گیا تو اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ مثلاً عیسائیت کے بارے میں اس کی شدید مخالفت جو نفرت کی حدوں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے بھی اس کے بارے میں تعصب پیدا کیا گیا ہے۔ نطشے کی یہ کتاب Antichrist مذاہب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ضرور پڑھنی چاہیے۔ عیسائیت پر اس کے بعض اعتراضات ایسے ہیں جن کا آج تک جواب نہیں دیا جا سکا۔

"اور زرتشت نے کہا" اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ فکر و فلسفہ کے اعتبار سے بھی اور اسلوب و اظہار کے حوالے سے بھی Ecco Homo میں خود نطشے نے اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس جیسی تحریر پہلے کبھی نہیں لکھی گئی، نہ محسوس کی گئی نہ ایسا کرب ہی سہا گیا۔" یہ تو محبت کرنے والے عاشق کا نغمہ ہے جسے پوری دردمندی سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

"اور زرتشت نے کہا" چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں زرتشت اپنی تنہائیوں کی دنیا چھوڑ کر نیچے اترتا ہے اور خدا کی موت کا اعلان کرتا ہے اس کا یہ جملہ God is dead اس عہد کا سب سے اہم اور متنازعہ جملہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جملے کی حقیقت کو کم ہی سمجھا گیا ہے اسے محض ایک سنسنی خیز اعلان کی طرح سمجھا اور پڑھا گیا ہے۔ حالانکہ اسے "اور زرتشت نے کہا" کے پورے سیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نطشے کا جو مفہوم اس جملے سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اب انسانی حالات اور معروضیت میں ہی حل کرنا اور سمجھنا ہوگا اور انسان کو فوق البشر Superman. بننا ہوگا۔ انسانی تقدیر کے ساتھ ساتھ کائنات کی تقدیر کا مالک اب فوق البشر ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو اقبال کے ہاں اس طرح سے ڈھل جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور زرتشت نے کہا، میں نطشے خدا کی موت کے اعلان کے بعد اپنی تعلیمات پیش کرتا ہوں۔ جو نطشے کا فلسفہ ہے۔ زندگی کے ہر موضوع پر وہ اظہار خیال کرتا ہے وہ کہتا ہے:

"میں انسانوں کو یہ سکھانا چاہتا ہوں کہ ان کے وجود کے کیا معنی ہیں اور یہ فوق البشر ہے۔"
نطشے ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اپنے سب سے اہم مسائل کا خود تجزیہ کرنا چاہیے۔ اور یہ مسائل کیا ہیں۔ انسانی جسم یعنی وجود اور اس کی روح۔ وہ انسانی خیالات کو تجربات کا درجہ نہیں دیتا کیونکہ انسان نے جو دنیا اپنے لیے تعمیر کی ہے۔ جس دنیا میں وہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا ہے وہ دنیا ہی ایسی ہے جو غلطیوں اور انسانی خامیوں سے اٹی پڑی ہے۔ انسانوں کے لیے نطشے کا پیغام بڑا واضح ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"فوق البشر روح کائنات ہے۔"

"تمام دیوتا مر چکے ہیں اور اب ہم چاہتے ہیں کہ فوق البشر زندہ رہے۔" نطشے خدا اور دیوتاؤں کی موت کے بعد ان کے وارث اور جانشین۔ فوق البشر کی تبلیغ کرتا ہے۔ پہلے حصے میں وہ بائیس موضوعات پر گفتگو کرتا ہے۔ ان میں روح کی تربیت، آزادی، تخلیق، خود پر قابو پانا، مابعد الطبیعاتی دنیا، مجرمانہ جبلت، مسرت قہقہہ، ریاست، شہوانیت اور اس کے مختلف روپ اور سچی دوستی اپنے ہمسائے سے ایسی ہی محبت کرو جیسے اپنے آپ سے کرتے ہو پر اعتراض اور تنقید، انسان کے لیے تنہائی کی ضرورت اور اس کے نقصانات۔ عورت اور اس کی فطرت، انسان کی فطرت، اچھی اور بُری شادیاں، اچھی اور بُری اموات، ان تمام تعلیمات کے پس منظر میں اصل موضوع برقرار رہتا ہے۔ نطشے کا فلسفہ۔ جسے اس کے ہی ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

Man is something must be overcome.

دوسرے حصے میں بھی فوق البشر کی تبلیغ ہے اور اسے خدا کا جانشین بتایا گیا ہے۔ منظم مذہب اور رہبانیت سچ اور جھوٹ، رحم کے خلاف نظریے۔ سچی اور جھوٹی حقیقتیں اور سچا اور جھوٹا فلسفہ، اس دوسرے حصے میں نطشے کی نثری نظمیں بھی شامل ہیں (نثری نظموں کی مخالفت کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ)

"اور زرتشت نے کہا" کے تیسرے حصے میں زرتشت ہمیں اکیلا ہی خود سے باتیں کرتا ملتا ہے پہلے حصوں کے موضوعات پر اس حصے میں بھی اظہار خیال ہوا ہے۔ اس حصے میں اس کی شخصیت اور تعلیمات، ابدیت سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔

چوتھا اور آخری حصہ ۔ وہ ہے ۔ جو نطشے نے ۱۸۸۴ء میں پہلے تین حصوں کو مکمل کرنے کے بعد کتاب کو مکمل سمجھنے کے باوجود پھر لکھا تھا ۔ ۱۸۸۴ء میں اس نے سوچا کہ ابھی "اور زرتشت نے کہا" میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہے ۔ اس کے آخری حصے کو لکھنے کے بعد نطشے نے اسے محدود اور نجی ایڈیشن کی صورت میں ۱۸۹۲ء میں شائع کرایا تھا ۔ یہ حصہ اسلوب کے اعتبار سے پہلے تین حصوں سے خاصا مختلف ہے ۔ لیکن اس میں اس کی تعلیمات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں ۔ اس حصے میں تمثیلی انداز میں اس نے جس شخص کو سب سے بدصورت شکل میں دکھایا ہے ۔ وہ شخص ان لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو ملحد اور آزاد خیال کہتے ہیں ۔ نطشے کو ملحدوں اور آزاد خیال مفکروں سے شدید نفرت تھی ۔ جس کا اظہار اس نے اپنے انداز میں کیا ہے ۔

" اور زرتشت نے کہا " دنیا کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک ہے ۔ یہ فلسفے کی وہ کتاب ہے جس نے پوری دنیا کے فکر کو متاثر کیا تھا ۔ نطشے کو اپنی اس کتاب پر بڑا فخر تھا ۔

یقینی امر ہے کہ کسی مضمون کے ذریعے اس کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ کسی کتاب سے پورا انصاف تو اسے پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے اور میرے جیسے طالب علم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کو ان کتاب کے پڑھنے کی ترغیب دی جائے ۔ جنہوں نے انسانی فکر کو تبدیل کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے ۔

نطشے نے اپنی کتاب Anti christ کے پیش لفظ میں لکھا تھا ۔

" یہ کتاب چند لوگوں کے لیے ہے اور ان میں سے بھی شاید ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا کل یا پرسوں ۔۔ یا مستقبل کا زمانہ میرا ہے ۔ بعض لوگ مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں ۔ "

نطشے کے الفاظ نہ صرف اس کی پوری تصانیف پر بلکہ " اور زرتشت نے کہا " پر بھی صادق آتے ہیں ۔

یہ کتاب " اور زرتشت نے کہا " یقیناً ہر شخص کے لیے نہیں ہے ۔ یہ خاص لوگوں کے لیے ہے اور یہ خاص لوگ ۔ نطشے کی موت کے بعد پیدا ہو چکے ہیں اور آج پوری دنیا میں نطشے کا نام گونجتا ہے اور پوری دنیا میں یہ کتاب پڑھی جاتی ہے ۔

کونسیپٹ آف دی ڈریڈ

کیر کیگارڈ کی سب سے اہم تصنیف ہے بلکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس نے بیسویں صدی کے جدید افکار اور فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں بعض ناقدوں اور عالموں کا کہنا ہے کہ کیر کیگارڈ کی اس تصنیف نے بیسویں صدی کی فکر کو جس سطح پر متاثر کیا ہے اور اس کے جو دوررس اور دائمٹ اثرات عہد حاضر کی فکر پر نظر آتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اسے ان کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ جو بنیادی تبدیلی لانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

"کونسیپٹ آف ڈریڈ" اس اعتبار سے بھی اہم کتاب ہے کہ اس میں سورین کیر کیگارڈ کی بنیادی فکر نظریات اور فلسفہ یکجا ہو گئے ہیں۔

کیر کیگارڈ ۵ مئی ۱۸۱۳ء کو کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔ اس کی تربیت بڑے کٹر قسم کے مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس نے عشق بھی کیا اور اس عشق نے کیر کیگارڈ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے وہ جس خاتون سے عشق کرتا تھا اس سے منگنی بھی ہو گئی اور شادی کا مرحلہ طے ہونے والا تھا کہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اس خاتون نے کیر کیگارڈ کو ٹھکرا دیا۔ اس کا رد عمل کیر کیگارڈ پر بہت شدید انداز میں ہوا۔ یہ واقعہ اس کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے اور وہ محبت میں ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو ساری عمر کے لیے لکھنے پڑھنے اور مطالعے کے لیے وقف کر دے گا

اس نے ایسا ہی کیا اور ساری زندگی لکھنے پڑھنے میں بسر کردی اس نے اپنی زندگی میں جو کتابیں لکھیں وہ فرضی ناموں سے شائع کراتا رہا۔ کیونکہ کیر کیگارڈ کو معلوم تھا کہ اس کی کتابوں کی بہت مخالفت کی جائے گی اور یہی ہوا۔ اس نے جو افکار و نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے وہ تہلکہ خیز اور ہنگامہ پرور تھے۔ اس کی کتابوں پر بہت لے دے ہوئی۔ ان کی بے حد مخالفت کی گئی۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ اس کے نظریات و افکار کو ہی آج "فلسفہ وجودیت" کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیر کیگارڈ ہی تھا۔ جس کے افکار و نظریات سے بعد میں آنے والے فلسفیوں ہسرل اور ہیڈگر نے فیض اٹھایا اور فلسفہ وجودیت کو فروغ دیا سارتر نے بھی کیر کیگارڈ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ سارتر کیر کیگارڈ کا پرجوش مداح بھی تھا۔ اور ناقد بھی۔

نطشے کی طرح کیر کیگارڈ بھی عیسائیت کا بڑا ناقد تھا۔ بلکہ اس سلسلے میں اسے اولیت حاصل ہے کہ کیر کیگارڈ کو عیسائیت پر جو اعتراضات تھے ان کی وجہ سے بھی اس کی بہت مخالفت ہوئی۔ اس نے جو کتاب عیسائیت کی مخالفت میں لکھی تھی وہ اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۹۴۷ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔ کیر کیگارڈ کا انتقال ۱۱ر نومبر ۱۸۵۵ء کو ہوا۔ چالیس بیالیس برس کی عمر میں ہی اس نے جو کچھ لکھا وہ آج تک بحث اور غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کا پڑھا لکھا طبقہ کیر کیگارڈ سے ناآشنا ہو۔

"دی کونسیپٹ آف ڈریڈ"

کیر کیگارڈ کی یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کی یہ کتاب اس کے فلسفے کی بنیادی فکر اور روح کو پیش کرتی ہے۔

کیر کیگارڈ مغرب کے فلسفیوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کے ہاں صداقت کا تصور بھی دوسرے فلسفیوں سے بہت مختلف ہے۔ کیر کیگارڈ کے ہاں صداقت مکمل ہے۔ اس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ غیر متبدل اور دائمی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے باوجود یہ صداقت خاص فرد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اور یہ اس کے خصوصی اعمال سے جنم لیتی ہے، کیر کیگارڈ دوسرے فلسفیوں سے جس اعتبار سے خاص طور پر ممتاز اور منفرد دکھائی دیتا ہے وہ اس کی عقلیت کے مقابلے میں غیر عقلی عوامل پر اصرار ہے وہ انسانی زندگی میں غیر عقلی عوامل اور مظاہر کو بہت اہمیت دیتا

ہے اس کے علاوہ وہ مذہب کو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں احساس جمال، اخلاقیات اور مذہبی مسائل کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

کیر کیگارڈ کو اس کی مذہبیت کی وجہ سے جدید مغربی فلسفے اور دینیات کا بہت بڑا عالم بھی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی اس کتاب میں کیر کیگارڈ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اور جسے وہ اسحاقؑ سمجھتے ہیں کیونکہ عہد نامہ قدیم میں بھی اسے اسحاقؑ ہی بتایا گیا ہے۔ جبکہ اسلام میں حضرت اسماعیلؑ کا ذکر ہے) ہم قارئین کی سہولت کے لیے یہاں حضرت اسحاقؑ کی بجائے حضرت اسمٰعیلؑ کا ہی نام دیں گے اس کے قصے کو اپنی کتاب اور فلسفے کا مرکز بنایا ہے۔ مغربی فلسفے اور جدید فکر کو سمجھنے کے لیے اس قصے کو جو علامتی رنگ دے کر اس کی تفسیر کیر کیگارڈ نے اس کتاب میں پیش کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ اور اس کے حوالے سے ہم جدید یورپی فلسفے اور فکر کو بہت بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے اور پھر کیر کیگارڈ کے نظریات کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ کیر کیگارڈ صداقت کو مستقل بالذات قرار دیتا ہے۔ حالانکہ مغربی فلسفے میں صداقت کو مستقل بالذات تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مغرب کی قدیم روایات اور فکر سے کیر کیگارڈ کا یہ انحراف بڑی اہمیت رکھتا ہے اور کیر کیگارڈ کے بعد آنے والے فلسفیوں نے اس سے جو اثرات قبول کیے ہیں اس سے کیر کیگارڈ کی اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کیر کیگارڈ کی یہ کتاب خاصی پیچیدہ ہے اس کا اسلوب فلسفیانہ تجزیے کا ہے اس لیے خاصا خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن بعض حصے بڑے جذباتی انداز میں بھی لکھے گئے ہیں۔

کیر کیگارڈ کو اس امر سے بڑی دلچسپی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ خدا کے حکم پر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربان کرنے کے لیے لے کر جا رہے تھے تو وہ کیا سوچ رہے تھے۔ کیر کیگارڈ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا موضوع بنایا ہے اس کتاب پر بعض ناقدوں نے اعتراض کیا ہے کہ کیر کیگارڈ کا موضوع ایک برگزیدہ رسول ہیں۔ لیکن وہ انہیں ایک عام آدمی کی حیثیت میں پیش کرتا ہے اور ان کی بشریت پر زور دیتا ہے۔ اور عام آدمی اور ایک پیغمبر کی نفسیات میں جو فرق ہوتا ہے اسے کیر کیگارڈ نے پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا اس اعتراض کی شدت ہمارے خیال میں

کیرکیگارڈ کے اس فلسفے کے سامنے کچھ کم پڑ جاتی ہے کہ کیرکیگارڈ حضرت ابراہیمؑ کو اس انداز میں انسانوں کے سامنے پیش کرنے کا خواہاں ہے کہ اگر عام انسان بھی کوشش کریں تو وہ حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات اور عمل سے فیضیاب ہو کر ان کی طرح قربانی کی راہ پر بخوشی چلنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

کیرکیگارڈ اپنی اس کتاب میں انسان کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی ہیئت ترکیبی دو عناصر پر مشتمل ہے۔ یعنی ایک جسم، دوسرا اس کا ذہن یعنی نفس، حضرت ابراہیمؑ کے قصے کے حوالے سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر غور و فکر اس کتاب کا موضوع ہے ان سوالوں کو بھی کیرکیگارڈ نے ہی تلاش کیا ہے اور پھر ان پر غور و فکر کے بعد وہ ان کے نتائج بھی سامنے لاتا ہے۔ خداوند تعالےٰ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک باپ کے لیے بڑا تکلیف دہ اور کربناک ہوتا ہے۔ ایسی قربانی اخلاقیات اور انسانی جذبات کی نفی کرتی ہے۔ یہاں پر کیرکیگارڈ سوال اُٹھاتا ہے کہ کیا کوئی ایسا مقام بھی ہے جہاں اخلاقی اصول معطل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی مطلق فرض بھی ہوتا ہے۔ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو یہ حکم دیا تو انہوں نے اس کو راز رکھا کسی کو نہیں بتایا حتیٰ کہ اس بیٹے کو بھی پیشگی اطلاع نہیں دی جسے وہ قربان کرنے کے لیے لے جانے والے تھے۔ آخر اس خاموشی کا راز کیا تھا؟

کیرکیگارڈ نے قصہ ابراہیمؑ کو فلسفے اور نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے کیرکیگارڈ لکھتا ہے کہ دراصل یہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کا امتحان تھا اور ایمان کی تعریف کیرکیگارڈ یوں کرتا ہے کہ یہ ایک شدید جذبہ ہے گریزاں کیفیت نہیں۔ اور اس کا گہرا تعلق داخلیت سے ہے کیرکیگارڈ کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ عام اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے بہت ماورا ہو چکے تھے۔ یہاں کیرکیگارڈ اخلاقیات اور آفاقیت کو مترادف اور تقریباً ہم معنی ہی قرار دیتا ہے۔ جس پر بعد میں آنے والے بعض فلسفیوں نے اعتراضات ہی کیے ہیں تاہم کیرکیگارڈ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اگر اپنے بیٹے کی قربانی کے لیے تیار ہوئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا کی خوشنودی چاہتے تھے۔

کیرکیگارڈ ہمیں اپنی اس فکر افروز کتاب " دی ٹرنیسپٹے آف ڈریڈ" میں بتاتا ہے کہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں عمومیت اور اخلاقیات کے نظریے معطل ہو جاتے ہیں۔ اور عظیم انسان اخلاقیات سے بہت آگے نکل کر بلند ہو جاتا ہے۔ بیٹے کو ہلاک کرنے کا عمل و ارادہ اخلاقیات کے اعتبار سے جرم ہے لیکن جب خدا فرض مطلق کو عائد کر دے تو پھر یہ جرم نہیں رہتا۔ اس کے حکم کی تعمیل کرنا مقصد بن جاتا ہے۔

کیرکیگارڈ کی اس کتاب کے حوالے سے ہم کیرکیگارڈ کے فلسفے کے اس پہلو سے بطور خاص متاثر ہوتے ہیں کہ وہ اخلاقیات کو ایک اہم مسئلہ سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تسلیم و رضا پر بھی بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کو خدا کی مرضی کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ ہر مصیبت اور آفت کو رضائے خداوندی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے۔ تاہم انسان کرب محسوس کرتا ہے۔ قصۂ ابراہیم ؑ کے حوالے سے کیرکیگارڈ بھی ہمیں اس کتاب میں بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو بہت بڑے کرب کو برداشت کرنا پڑا۔ ایک طرف وہ ایسا کام کرنے والے تھے جو اخلاقیات اور جذبات کے برعکس تھا اور اپنے اس عمل کی کوئی توجیہہ بھی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے وہ سخت قسم کی تنہائی محسوس کر رہے تھے مگر یہی کرب ان کے لیے لازمی اور ناگزیر تھا اور اس کے ذریعے وہ "وجود" میں آئے۔

کیرکیگارڈ نے کرب کا جو فلسفہ اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کو بعد میں فلسفۂ وجودیت کے ماننے والوں نے تسلیم و قبول کیا اور اپنی فکر کا حصہ بنایا۔

کیرکیگارڈ انسان اور خدا کے ذاتی رشتے کی تفسیر بھی اس کتاب میں کرتا ہے اس رشتے کو وہ خدا کی محبت اور ایمان کا نام دیتا ہے اور یہ ایسے انسان کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کے عائد کردہ فرض مطلق کو قبول کرے۔ کیرکیگارڈ نے اس سلسلے میں ایک بہت فکر انگیز جملہ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"جہاں انسان سوچنا بند کرتا ہے وہاں سے ایمان شروع ہو جاتا ہے۔"

اور انسان خدائے قدوس سے ذاتی اور مطلق رشتہ قائم کر کے اخلاقیات اور عمومیت کی حدود سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ اس تفسیر کے حوالے سے کیرکیگارڈ حضرت ابراہیم ؑ کی معنویت آشکار کرتا

ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا۔ خدا سے ان کا ذاتی رشتہ قائم ہوا اور وہ خدا کے دوست بن گئے۔ یوں وہ لامحدود سے رشتے قائم کر کے عالم محدود کو پا لیتے ہیں اگر وہ عالم محدود سے یہ رشتہ رضا و تسلیم کے مظاہرے سے قائم نہ کرتے تو پھر ان کا بیٹا واقعی قربان ہو جاتا۔ لیکن چونکہ وہ فرض کی ادائیگی میں تمام تر اخلاقیات اور جذبات کو نظرانداز اور قربان کر دیتے ہیں اس لیے اللہ نے ان کو اپنا دوست بنا لیا اور ان کے بیٹے کو بھی زندہ رہنے دیا اور اس کی جگہ مینڈھے کو قربان کر دیا گیا۔

کیرکیگارد کی یہ کتاب "دی کونسیپٹ آف ڈریڈ" اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کی قربانی کے لیے خدا کے حکم پر رضامند ہو جاتا۔ دنیا کے تینوں بڑے مذاہب میں یکساں اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی نبوت اور بزرگی پر مسلمان عیسائی اور یہودی یکساں ایمان لاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس بڑے واقعے کے حوالے سے اس کتاب میں کیرکیگارڈ نے جو نظریات پیش کیے ہیں وہ اگرچہ ہم مسلمانوں کے لیے بہت حد تک ناقابل قبول ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کی خیال افروزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ اس عظیم واقعہ جس واقعہ کو اسلام کی روح قرار دیتے ہوئے اقبال نے "ابتدا ہے جس کی خلیل" کہا تھا اس کی معنویت پر ہمارے ہاں کسی نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔

"دی کونسیپٹ آف ڈریڈ" دنیا کی عظیم فکر انگیز کتابوں میں سے ایک ہے جس نے جدید فلسفے اور مغربی دینیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

۵۱

کریئیٹو ایوولیوشن

جدید دور کے فلسفیوں میں برگساں کو جو مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ اس کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے افکار پر برگساں کے اثرات بہت گہرے اور پختہ ہیں۔ بیسویں صدی میں صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے سائنس اور بطور خاص فزکس کو جو مقام حاصل ہوا، اس کی وجہ سے مادہ پرستانہ فکر و عقائد میں معتد بہ پختگی پیدا ہوئی۔ برگساں نے اسی مادیت کے خلاف سب سے بھرپور آواز اٹھائی اور اپنے فکری نظام سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی زندگی محض مادی نہیں، بلکہ اس کا سب سے اہم پہلو انسان کا ذاتی، داخلی اور وجدانی تجربہ ہے۔ اس اندرونی اور ذاتی وجدانی تجربے کو ہی برگساں نے علم کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ LIFE IS A DEVELOPMENT, CREATIVE EVOLATION EVER ENFOLDING NEW ELEMENTS,"

برگساں کے شعور سنبھالنے سے پہلے تک کے یورپ میں مادی علوم اور سائنسوں نے اتنی ترقی حاصل کر لی تھی کہ وہ جابر طاقتوں کی حیثیت سے سامنے آگئی تھیں اور انہوں نے بطور خاص فلسفہ کو دبا کر رکھ دیا تھا اور مادی اور سائنسی ترقی ہی فلسفہ کے لیے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ اس انتہاپسندی اور غیر فلسفیانہ صورت حال کا جواب برگساں نے دیا تھا۔

ہنری برگساں پیرس میں ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک ذہین اور پرجوش طالب علم تھا۔ اس نے ابتدا میں جدید سائنسی علوم میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے ریاضی اور فزکس میں تعلیمی سطح پر اختصاص حاصل کیا۔ لیکن انہی علوم نے مابعد الطبیعاتی سوالوں کے دروازے کھول دیے۔ اور اس نے ان سوالوں سے منہ نہیں پھیرا نہ ہی مادی علوم اور سائنس سے مرعوب ہوا۔ وہ بہت

جلد اس حقیقت کو پا گیا تھا کہ سائنس اور مادی علوم کے پیچھے مابعد الطبیعاتی مسائل چھپے ہوئے ہیں یوں اس نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور پھر فلسفے کا اُستاد مقرر ہو گیا۔ اس کی پہلی اہم کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔ آٹھ برسوں کی خاموشی کے بعد اس کی دوسری اہم اور مشکل ترین کتاب MATTER AND MEMORY شائع ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں وہ کالج ڈی فرانس میں فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوا۔ اپنے اس فرض کو ہنری برگساں نے اپنی موت تک ادا کیا۔ اسے ۱۹۲۷ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ہنری برگساں کا انتقال ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو ہوا

اس کی سب سے اہم تصنیف CREATIVE EVOLUTION کا سن اشاعت ۱۹۰۷ء ہے۔

علامہ اقبال کے قارئین جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کو برگساں کے نظریات و فلسفہ سے گہری دلچسپی تھی اور علامہ اقبال نے ہنری برگساں سے پیرس میں ملاقات بھی کی تھی۔

برگساں کے ذہن اور فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ سپنسر جیسے مادہ پرست فلسفی کا مداح تھا لیکن جوں جوں وہ سپنسر کا گہرا مطالعہ کرتا چلا گیا۔ برگساں کے ذہن میں سپنسر کے فلسفے اور مادہ پرستی کے بارے میں سوال و شکوک پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور مادی میکانکیت کے خلاف سب سے بھرپور آواز برگساں نے ہی اُٹھائی۔ برگساں نے مادہ اور زندگی، جسم اور ذہن ارادہ اور قوتِ انتخاب کے بارے میں بہت کھُل کر لکھا جو مادہ پرست فلسفیوں بالخصوص سپنسر کے افکار کی شدید نفی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ صدیوں کی جدوجہد اور تجربوں کے باوجود آج تک یہ نہیں بتا سکے کہ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے اس لیے ان کے تمام سائنسی علوم اور مادہ پرستانہ افکار بے معنی ہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی کسی بنیادی الجھن کو نہیں سلجھاتے۔ اس نے یہ اہم سوال اُٹھایا کہ اگر ذہن بھی مادہ ہے اور ذہنی عمل ایک میکانکی نتیجہ ہے تو پھر ضمیر کی کیا حیثیت ہے؟ وجدان کسے کہتے ہیں۔؟

کریئیٹو ایوولیوشن

برگساں کی یہ اہم اور انسانی فکر پر گہرے اور دور رس نتائج مرتب کرنے والی کتاب ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت نے فکر و خیال کے نئے دروازے کھول دیے اور اس کی اشاعت سے اب تک یہ کتاب انسانوں کے لیے فکر و خیال کا نیا مواد فراہم کرتی ہے اور اس کتاب کی اہمیت

وقتی یا ہنگامی نہیں بلکہ ابدی ہے۔

اس مضمون میں برگساں کے فلسفے اور کریٹیو ایوولیوشن ۔ کا بھرپور مطالعہ پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن برگساں کی اس اہم ترین ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کے اہم نکات پیش کرنے کی سعی ضرور کی جا رہی ہے۔

یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت خوب صورت اور مؤثر ہے وہ لوگ جنہوں نے اس کو اصل فرانسیسی زبان میں پڑھا ہے اور وہ اس کے خوب صورت تخلیقی اسلوب میں رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں تو اس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ کیونکہ اس کے انگریزی ترجمے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس کا ترجمہ اور پرتو اتنا بھرپور تخلیقی اسلوب لیے ہوئے ہے وہ اصل زبان میں کیا ہوگی۔ اس تخلیقی اور شاندار اسلوب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ برگساں، محض اور نرا ایک خشک فلسفی نہ تھا۔ وہ عالمی ادب کا بھی پرجوش طالب علم تھا اور تخلیقی ادب کے ساتھ برگساں کی وابستگی بہت گہری تھی۔

اپنے فلسفے میں برگساں وقت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت بھی اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ مکان (SPACE) اور یہ وقت ہی ہے جو در اصل زندگی کے جوہر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بلکہ اس حد تک کہ تمام حقائق بھی وقت ہی کے اندر موجود ہوتے ہیں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ وقت نشو و نما ترقی پذیری ہے اور DURATION وہ اپنی اس اہم ترین کتاب میں لکھتا ہے۔

"زمانہ (DURATION) ماضی کا مسلسل نشو و نما ہے جو مستقبل میں تبدیل ہوتا ہے۔" اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ ماضی ۔ حال میں موجود رہتا ہے اور یہاں وہ بڑے محرک کی صورت میں موجود رہتا ہے۔ DURATION کو بہتر صورت میں "زمانۂ اشنا" کی اصطلاح میں سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس اصطلاح کے حوالے سے برگساں کا مفہوم بہت حد تک ادا ہو جاتا ہے۔ برگساں لکھتا ہے۔ "ماضی بحال و برقرار رکھتا ہے اور اس کا کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔" وہ لکھتا ہے۔

"NO DOUBT WE THINK ONLY, A SMALL PART OF OUR PAST, BUT ITS OUR ENTIRE PAS THAT WE DESIRE, WILL AND ACT."

اس پر وہ مزید اضافہ کرتا ہے کہ وقت چونکہ اجتماعی ACCUMULATION ہوتا ہے اس لیے مستقبل کبھی ماضی جیسا نہیں رہتا۔

وہ وقت کے سلسلے میں اقلیدس اور مادی سائنسی نظریات کو ایک واہمہ اور ڈھونگ قرار دیتا ہے۔ کیونکہ برگساں کے نزدیک انسان ایک باشعور وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے لیے تبدیلی لازمی ہے اور یہ تبدیلی انسان کو پختگی بخشتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنی ذات کی لامحدود سطح پر تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔

اپنی اس فکر افروز کتاب میں وہ انسان کا یہ تصور پیش کرتا ہے۔

MAN IS NO PASSIOELY ADAPTIVE MACHINE, HE IS A FOCUS OF REDIRECTED FORCE A CENTRE OF CREAT-IVE EVOLUTION, !

حیوانات اور انسان میں جس طرح سے برگساں نے فرق بتایا ہے۔ وہ اس کتاب کا ایک اہم پہلو ہے۔ وہ حیوانات کو ایک قیدی قرار دیتا ہے۔ جو اپنی انواع کی عادات اور حقائق کی زنجیروں میں بندھے رہتے ہیں، اگر کبھی ان کے لیے آزادی کا دروازہ کھلتا بھی ہے تو جونہی کھلتا ہے، بند بھی ہو جاتا ہے۔ جبکہ انسان کی صورت حال مختلف ہے۔ برگساں لکھتا ہے

"WITH MAN, CONCIOUSNESS BREAKS THE CHAIN IN MAN AND MAN ALONE, IT SETS IT SELF FREE,"

برگساں سائنس اور میکانزم کے اس دعوے کو جھٹلاتا ہے کہ اس نے انسان کی حقیقت کو پایا ہے اور یہ برتر علوم ہیں۔ برگساں کا دعوےٰ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، جہاں بھی انسان کا سوال اٹھتا ہے۔ سائنس اور میکانکیت کچھ نہیں بتاتے بلکہ خود اپنی حدود کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ آشکار ہوتا ہے کہ خود یہ علم کتنے محدود ہیں۔ اس سلسلے میں فلم اور اس کی متحرک تصویروں کی مثال بھی دی جاتی ہے۔ جو بظاہر تو متحرک ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ساکت ہوتی ہیں۔ ان کے حوالے سے حرکت کے دورانیے کو (یعنی زمانۂ اشارہ) کو کسی طرح بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وقت کے تسلسل کو سمجھ سکے یا سمجھا سکے یا اپنی گرفت میں لے سکے۔

برگساں کے خیال میں دراصل یہ ہماری اپنی بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم مادی اور طبیعاتی افکار کا اطلاق اپنے خیال اور اپنی دنیا پر کرتے ہیں۔ جب ہم یہ طرز فکر اختیار کرتے ہیں تو ہم مادہ پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سائنسی علوم سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اور میکانزم کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں۔

جب یہ صورت حال ہو تو پھر سب سے اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس طرح زندگی کے بہاؤ اور جوہر کو سمجھ سکتے ہیں۔ برگساں کے پاس اس کا جواب ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ اپنی ذات کی حقیقتوں میں جھانکا جائے۔ اپنی ذات پہچانا اور سمجھا جائے اور انسان کا تخلیقی ارتقا اس طرح ہوتا ہے۔ اسی پر ہی برگساں نے اپنی اس کتاب کی بنیاد رکھی ہے۔ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

یورپی فلسفے میں "وجدان" کی اہمیت اور اس کی تعریف و تفسیر پر برگساں نے سب سے پہلے زور دیا اور اس کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انسانی زندگی کی فلسفیانہ تفہیم کے لیے اس نے "وجدان" کو وسیع سطح پر فلسفے میں رائج کرنے کی بلیغ و مؤثر کوشش کی۔

برگساں الفاظ کو افہام و تفہیم کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر الفاظ محض علامتیں اور نفسیاتی شکل ہی دھارلیں تو پھر افہام و تفہیم ممکن نہیں رہتی۔ کیونکہ تمام الفاظ علامتی نہیں ہوتے۔ برگساں اپنے فلسفیانہ نظام فکر میں نفسیات کو بہت اہمیت دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ مجھے اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ نفسیات حیران کن انکشافات کا اظہار کرے گی۔

اپنی عہد آفریں تصنیف میں برگساں نے ڈارون کے نظریہ ارتقا اور ڈارونزم کو ناکارہ اور بیکار ثابت کر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں برگساں کا یہ جملہ بے حد اہم ہے وہ لکھتا ہے :۔

"THERE IS A DESIGN IN THINGS, BUT IN THEM, NOT OUT SIDE."

اس جملے کی روشنی میں ہی اگر ڈارون کے نظریات کا محاکمہ کیا جائے تو بات کھل جاتی ہے کہ ڈارون کے افکار و تجربات حقیقت کی طرف نہیں بلکہ محدود و مقدار کی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں اور ان کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔

انسانی تخلیقی زندگی اور اس کا ارتقا برگساں کے نزدیک ایک تجربے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تجربے کو وہ خدا سمجھتا ہے، وہ خدا اور زندگی کو ایک سمجھتا ہے۔

BUT GOD IS FINITE, NOT OMINIPOTENT LIMITED BY MATTER.

برگساں کے نزدیک خدا لا محدود ہے۔ لا منتختم ہے۔ وہی تخلیق ہے اور خالق اور اسے ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں ، اس محسوساتی تجربے سے گزرتے ہیں جب ہمارا عمل آزادانہ ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم شعوری طور پر اپنے اعمال اور اپنی زندگیوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اس میں انسانی وجدان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ برگساں سچائی کی تلاش کے لیے دعوت دیتا ہے کہ اسے ہم اپنی ذات اور باطن میں تلاش کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ " کریٹیو ایوولیوشن " کی اشاعت سے پہلے دنیا پر جس مادی اور سائنسی فلسفے کا غلبہ تھا۔ اسی کے مطابق انسان ایک مشین بنا دیا گیا۔ بے حسی ، احساسات سے محروم ، وجدان سے سے عاری۔ لیکن جب فلسفے کے افق پر برگساں کا ظہور ہوا اور بطور خاص اس کی یہ کتاب " دی کریٹیو ایوولیوشن " شائع ہوئی تو اس نے انسان کو مادے کی قید اور برتری سے آزاد کر دیا۔ اس نے انسان کو برتر حقیقت دی اور آج کا انسان اس فلسفے کے حوالے سے تخلیقی مراحل سے گزر کر اپنی ارفع ترین تخلیق کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

برگساں تخلیق کو کوئی " اسرار " قرار نہیں دیتا۔ وقت کے تصور کی نئی تفسیر کرکے ، ڈارون اور سپنسر کے فلسفوں کو رد کر کے برگساں نے انسان اور انسانی زندگی کا ایک شاندار اور قابل فہم اور قابلِ عمل نظریہ دیا اور اس فکر و فلسفہ کا مظہر اس کی کتاب " دی کریٹیو ایوولیوشن " ہے۔

لوجک

ہیگل کے بارے میں شوپنہار کی جو رائے تھی۔ اس کا ذکر کانٹ کی عظیم تصنیف "تنقید برعقل محض" کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ تاہم فلسفے کی دنیا میں ہیگل ایک اہم اور عظیم نام ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو اس کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا اجمالی ذکر آگے آئے گا لیکن اس کی کتاب LOGIC ایک ایسی کتاب ہے جس نے فلسفے کے جہان کو نظریہ ضدین یا جدلیات فراہم کیا اور اس نظریے کے حوالے سے دنیائے فکر و عمل میں نئی راہیں کھلیں اور آج دنیا کے فلسفی طالب علم اور دانشور کہتے ہیں کہ یہ ہیگل کا ہی نظریہ ضدین تھا۔ جسے کارل مارکس نے سر کے بل کھڑا دیکھ کر اسے سیدھا کر دیا اور دنیا ایک بڑے فکری اور عملی انقلاب سے روشناس ہوئی۔

کارل مارکس کے طالب علموں کے علم میں شاید یہ بات ہے یا نہیں کہ کارل مارکس نے ہیگل کا بغور اور بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اس کے اتنا زیر اثر رہا کہ اس نے ہیگل پہ ایک نظم بھی لکھی۔

جارج ولہیم فریڈرک ہیگل سٹوگرٹ جرمنی میں ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ محکمہ مالیات میں ایک چھوٹے درجے کا افسر تھا۔ لڑکپن اور جوانی میں ہیگل نے بڑی محنت اور کثرت سے مطالعہ کیا۔ اپنے عہد کی تمام اہم کتابوں کو اس نے بغور پڑھ ڈالا۔ ہیگل کا نظریہ تھا کہ سچا کلچر اس صورت میں معرض وجود میں آ سکتا ہے کہ یہ بچے کو جب وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے تو کم از کم پانچ برسوں کے لیے پڑھایا جائے اور ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہوں۔
ہیگل نے یونانی ادب سے گہرا اثر لیا۔ حتیٰ کہ اپنی عمر کے اس حصے میں جب اسے کسی بھی

چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہیگل یونانی ادب کے اثرات کا اظہار کرتا اور اس میں دلچسپی لیتا رہا۔ شاید یونانی ادب کے مطالعہ کا ہی اثر تھا کہ ہیگل نے ایک زمانے میں حضرت مسیح کی سوانح لکھنے کی کوشش کی جس میں اس کا ارادہ حضرت مسیح کو یوسف اور مریم کا بیٹا ثابت کرنا تھا اور ان کی پیدائش کے ساتھ جو ربانی معجزہ وابستہ ہے اسے نظر انداز کر دینا تھا۔

یہ انقلاب فرانس کا دور تھا۔ دنیا میں نئے نئے خیالات برپا ہو رہے تھے۔ ہیگل کا دور جرمنی کے ادب، فلسفہ اور موسیقی کا اہم ترین دور سمجھا جاتا ہے۔ ہیگل کے احباب اور ہم عصروں میں ایسے ایسے فلسفی اور دانشور شامل تھے جنہوں نے بعد میں عالمگیر شہرت حاصل کی۔

۱۷۹۳ء میں ہیگل نے ٹوبنگن یونیورسٹی سے گریجویشن کا امتحان پاس کیا۔ اسے سند کے ساتھ ایک خاص سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا گیا۔ جس کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ اس سرٹیفکیٹ میں ہیگل کے چال چلن اور کردار کی تعریف کی گئی تھی اور لکھا گیا تھا کہ وہ علم الانسان اور دینیات میں خاص اہلیت رکھتا ہے لیکن فلسفہ کے علم میں صلاحیتوں سے کورا ہے۔ بعد میں اس شخص نے ایک مدت تک فلسفے کی اقلیم پر بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ نادار تھا۔ اسے اپنی روزی کمانے کے لیے ٹیوشنوں کا سہارا لینا پڑا۔ ۱۷۹۹ء تک اس کے معاشی حالات خاصے دگرگوں رہے رہے۔ ۱۷۹۹ء میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے ترکے میں اچھی خاصی رقم ملی۔ جس سے ہیگل اپنے آپ کو امیر سمجھنے لگا اور اس نے ٹیوشنیں چھوڑ دیں۔ اس نے اپنے دوست (نامور دانشور اور مفکر) شیلنگ کو خط لکھا اور مشورہ طلب کیا کہ اس کے لیے کون سا شہر موزوں ہے۔ جہاں وہ رہائش اختیار کر کے اپنے مستقبل کے لیے کچھ کر سکے۔ شیلنگ نے JENA کا نام تجویز کیا۔ جہاں ایک اہم یونیورسٹی تھی۔ جینا یونیورسٹی میں شلر تاریخ کا اُستاد تھا۔ شیلنگ رومانویت کی تبلیغ میں مصروف تھا اور فشٹے کے ساتھ مل کر ایک نئے فلسفیانہ نظریے کو مقبول بنانے میں کوشاں تھے۔ ۱۸۰۱ء میں ہیگل یہاں پہنچا اور سکونت اختیار کی اور ۱۸۰۳ء میں اسے یونیورسٹی میں بحیثیت اُستاد ملازمت مل گئی۔ ۱۸۰۸ء تک وہ یہیں تھا۔ جب نپولین نے پرشیا پر فتح حاصل کی۔ یہ چھوٹا سا علمی ادبی شہر۔ بحران اور انتشار کا شکار ہوا۔ نپولین کے سپاہیوں نے ہیگل کے مکان کی تلاشی لی۔ ہیگل بھاگ نکلا جاتے وقت وہ اپنی کتاب THE PHENOMEN OLOGY OF SIPIRT کا مسودہ ساتھ لے جانا نہ بھولا۔ جس

پر وہ کافی عرصے سے کام کر رہا تھا۔ کچھ عرصے تک اس کے حالات ملتنے خراب رہے کہ گوئٹے نے ایک شخص کے ذریعے اسے کچھ مالی امداد بھجوائی۔ کچھ عرصے تک وہ ایک رسالے کو بھی مرتب کر رہا۔ اسی زمانے میں ۱۸۱۲ء میں اس نے اپنی تصنیف THE LOGIC لکھنی شروع کی جو غالباً ۱۸۱۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے جرمنی کو جھنجھوڑ دیا۔ اسی کتاب کے حوالے سے ہیگل کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفے کا اُستاد بھی مقرر کر دیا گیا۔ ہائیڈل برگ کے قیام کے زمانے میں اس نے اپنی کتاب "انسائیکلو پیڈیا آف دی فلاسفیکل سائنسز" تحریر کی جو ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی اشاعت نے اسے بے حد فائدہ پہنچایا۔ اور ہیگل کو برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد بنا دیا گیا۔ برلن یونیورسٹی میں اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ فلسفہ پڑھاتا رہا۔ اور فلسفے کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا رہا۔ اس وقت ہیگل کی جرمنی میں وہی حیثیت تھی جو گوئٹے کو ادب و شاعری اور بیتھوون کو موسیقی کی دنیا میں حاصل تھی۔ ہیگل کا یوم پیدائش گوئٹے کے جنم دن کے ایک دن بعد آتا تھا۔ جرمنی کے عوام ان دونوں دنوں کو سرکاری تعطیلات کے طور پر مناتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک فرانسیسی نے ہیگل سے پوچھا کہ وہ اپنے فلسفے کو ایک جملے میں بیان کرے۔ ہیگل اپنے فلسفے کو ایک جملے میں بیان کرنے میں ناکام رہا۔ ہیگل نے اپنے فلسفے کو دس کتابوں میں پیش کیا ہے جن میں THE LOGIC اس کی اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کا اندازِ تحریر بے حد اُلجھا ہوا ہے۔ ہیگل کو خود احساس تھا کہ وہ اپنی بات پوری طرح سے سمجھانے میں اکثر ناکام رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا صرف ایک آدمی ہے جو مجھے سمجھتا ہے اور بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ وہ بھی مجھے نہیں سمجھتا۔" اس جملے میں اس کا اشارہ دراصل اپنی ہی طرف تھا۔ ہیگل کی بیشتر تصانیف دراصل اس کے لیکچروں پر مشتمل ہیں۔ بعض اس کے شاگردوں نے کلاس نوٹس سے مرتب کیے ہیں۔ ان میں دو کتابیں ایسی ہیں جو خود ہیگل نے لکھی تھیں۔ ایک THE LOGIC اور دوسری "روح کے مظاہر" اور یہ کتابیں بھی بے حد اُلجھی ہوئی ہیں اور ان شارحین کی شرح کے بغیر ان کو پوری طرح سمجھنا خاصا دشوار کام ہے

"کتابِ منطق"

اپنی اس کتاب THE LOGIC میں ہیگل نے عقل و دانش کے نظام کے بارے میں نہیں

لکھا بلکہ اس کا موضوع وہ تصورات ہیں جو عقل و منطق سے تعلق رکھتے ہیں یہاں ہیگل نے وہی الفاظ اور مدارج استعمال کیے ہیں جنہیں اس سے پہلے کانٹ استعمال کر چکا تھا۔ یعنی وجود جوہر مقدار حقیقت۔ ہیگل یہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہیں ایسی تمام اصطلاحات کو اپنے غور و فکر پر حاوی نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے درمیان جو ایک باہمی رشتہ ہے اس پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ گروپوں اور اجتماعات میں خواہ وہ الفاظ کی صورت میں ہوں یا کسی دوسری نوعیت کے ایک باہمی رشتہ دیکھتا ہے اس پر پوری توجہ کی ضرورت ہے جس میں یہ سب بندھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتے یا باہمی ہم آہنگی دراصل مشابہات اور تضادات پر مشتمل ہے۔ کوئی بھی خیال جس میں اس رشتے یا تضادات کو مدِنظر نہیں رکھا جاتا وہ دراصل ایک خالی خولی نظریہ اور خیال ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ایک جملہ لکھا ہے۔

"TRUE BEING AND NOTHING ARE THE SAME,"

وہ تمام تعلقات جو اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں ان میں اہم ترین تعلق اور رشتہ تضادات کا ہے دنیا کی ہر نوع کی حالت اور کیفیت میں ایک تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک خاص ضد جو بعد میں پیچیدگی اختیار کر کے "جدلیاتی تحریک" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ نظریہ ہے جو نظریہ جدلیات یا تضادات کہلاتا ہے۔ اور اس کو جس صورت میں ہیگل نے پیش کیا ہے اس کے بارے میں مارکسی فکر کے علماء کا دعوےٰ ہے کہ یہ سر کے بل کھڑا تھا جسے مارکس نے پاؤں کے بل سیدھا کھڑا کر دیا۔ یہ جدلیاتی رو ہر چیز میں دوڑتی ہے اور جاری و ساری دکھائی دیتی ہے۔

ہیگل کا یہ نظریہ نیا نہیں ہے بلکہ یہ ایک پرانا نظریہ ہے جسے ہیگل نے اپنے استدلال اور اپنے انداز میں پیش کیا۔ ارسطو کے ہاں بھی یہ نظریہ دھندلی صورت میں ملتا ہے۔ ہیگل نے یہ ثابت کیا کہ ارتقا کے عمل میں ضد کے ساتھ تصادم پیدا ہوتا ہے اور اس طرح ارتقا کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ نفی اور مثبت کا تصادم بہتر کیفیت اور حالت کو جنم دے کر ارتقاء کے عمل کو جاری و ساری رکھتے ہیں اور یوں وہ نظریہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے جو آج زبانِ زدِ عام ہے۔ یعنی ،

"THESIS ANTI THESIS = SYNTHESIS,"

یہ وہ فارمولا ہے جو ہیگل کے نزدیک ساری انسانی ترقی اور حقیقت کے اندر کار فرما ہے۔ یہ راز ہے جس کو ہیگل نے پہلی بار واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ لکھتا ہے۔

FOR NOT ONLY DO THOUGHT DEVELOP AND EVOLUE ACCORDING TO THIS.

"DIALECTICAL MOVEMENT" BUT THINGS DO QUALTY, EVERY CONDICTION, OF AFFAIRS CONTAINS A CONTRADICTION WHICH EVOLUTION MUST RESOLOVE BY A RECONCILING UNITY.

منطق میں ہیگل نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اشیا اور عوامل کے اندر جو تضاد پایا جاتا ہے جو تصادم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس میں معنویت کو تلاش کرنا چاہیے۔ منطق میں وہ لکھتا ہے کہ اخلاقیات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسان کے کردار اور عمل میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرے۔ مذہب کا فریضہ یہ ہے کہ اس حقیقت مطلق کو سمجھا جا سکے۔ جس میں تمام تر تضادات ایک ہو جاتے ہیں۔ فلسفے کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس میں ہم آہنگی کو تلاش کرے جو تضادات میں پائی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"GOD IS THE SYSTEM OF RELATION SHIPS IN WHICH ALL THINGS MOVEAND HAVE THERE BEING AND THIER SIGNIFICANCE,"

اس کا اطلاق زندگی کے ہر عمل اور ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ اپنے اس نظریے کی بدولت ہیگل نے جو کچھ بتانے اور کہنے کی کوشش کی اس کا سب سے زیادہ استفادہ کارل مارکس نے کیا اور دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ بعض لوگ تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ ہیگل کی کتاب THE LOGIC نے ہی اشتراکیت کے لیے راہ ہموار کی اور اس نظریہ جدلیات نے ہی مارکس کو وہ بنیاد فراہم کی جس پر اس نے اپنے افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔ منطق کے حوالے سے اس کے یہ جملے بے حد اہم ہیں۔ ہیگل لکھتا ہے:

"عقل ہی کائنات کا مرکز و محور ہے کائنات کا ڈھانچہ مکمل طور پر عقلیت پر استوار ہے۔"

ہیگل نفی اور بدی کو بھی مثبت اور خیر کا پرتو قرار دیتا ہے اور نفی اور بدی ہی نیکی اور خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ جدوجہد کو وہ نشوونما اور ترقی کا اصول قرار دیتا ہے۔ کردار دنیا کے بحران اور دباؤ کے تحت تعمیر ہوتا ہے۔ اور انسان اپنا اصل قدوقامت اور عظمت اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر ذمے داریوں سے آگاہ ہو اور ان سے سبکدوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

وہ درد و الم اور مصائب کو بھی زندگی کی علامت قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے:

"زندگی خوشیوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ بلکہ ترقی کی منازل اور حصول علم کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔"

تاریخ کے بارے میں جو نظریہ ہیگل پیش کرتا ہے اسے اس کے اس جملے سے پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ ہیگل لکھتا ہے:

"THE HISTORY OF THE WORLD IS NOT THE THREAT OF HAPPINESS PERIODS OF HAPPINESS ARE BLANK PAGES INIT, FOR THEY ARE PERIODS OF HARMONY. HISTORY ISA DIALECTICAL MOOEMENT."

ہیگل لکھتا ہے کہ تاریخ سازی کا عمل صرف ان زمانوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب حقائق کے تضادات ترقی میں نشوونما پاتے اور حل ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ ساز اور عظیم انسانوں کو حالات کا خالق قرار نہیں دیتا۔ بلکہ انہیں محض آیا ئیں (MIDWIFE) کا رتبہ بخشتا ہے۔ یہ روح عصر ہوتی ہے جو تاریخ کو تخلیق کرتی ہے اور اسے ہیگل (ZEITGEIST) کا نام دیتا ہے۔

ہیگل کے اس نظریے نے انسانی سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ دنیا کا مقبول ترین نظریہ ہے اور اس نظریے کے عالم وجود میں آنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے اسی نظریے کے تحت آنے والے ہر دور کی صورت گری ہوئی ہے۔ وہ سیاسی اعمال اور سیاست کا منتہا آزادی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"تاریخ آزادی کی نشوونما کا نام ہے۔"

ایسے انقلابی نظریات کو پیش کرنے والا ہیگل اپنی آخری عمر میں بہت ہی قدامت پسند بن گیا تھا۔ اس پر بہت سے اعتراض کیے گئے۔ وہ آزاد خیال (لبرل) کو خواب دیکھنے والا کہتا تھا۔ اس نے حکومت کے ساتھ گہرا تعلق قائم کر لیا اور حکومت کی پالیسیوں کا مؤید بنا۔ اس کے حریف اور مخالف اسے "سرکاری فلسفی" کہتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہیگل نے اپنے فلسفے کی بنیاد تضادات پر رکھی لیکن وہ اپنے تضادات کا شعور کبھی حاصل نہ کر سکا۔ آخری عمر میں وہ مخبوط الحواس ہوگیا تھا ایک بار جب وہ لیکچر دینے آیا تو اس نے صرف ایک جوتا پہن رکھا تھا دوسرا پاؤں ننگا تھا جب برلن میں ہیضے کی وبا پھیلی تو ہیگل وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن موت اسکے انتظار میں تھی۔ ۱۸۸۱ء میں ایک دن کی علالت کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔!!

رائٹس آف مین

دنیا میں بہت کم ایسے بڑے لکھنے والے فلسفی، انقلابی اور دانشور ہوئے ہیں جن کی زندگیاں مشکلات مصائب، ناہمواریوں اور طوفانوں سے خالی ہوں۔ تھامس پین کا شمار ان معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زندگیوں کے واقعات انتہائی "ڈرامائی" تہلکہ خیز اور سنسنی سے بھرے ہوئے ہیں تھامس پین ایک ایسا شخص تھا جو طوفانوں میں پلا بڑھا اور اس نے خود کئی طوفانوں کو جنم دیا۔

کبھی کبھی عالمی ادب و فکر کے طالب علم کو یہ سوال بھی ضرور کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ تھامس پین نہ ہوتا تو کیا امریکہ برطانوی اقتدار سے اتنی جلدی آزادی حاصل کر لیتا۔

تھامس پین کیا تھا؟ اس کی زندگی کیسے کیسے طوفانوں کو جنم دیتی رہی اور وہ خود کیسے کیسے طوفانوں سے گزرا۔ اس سے دلچسپی ہو تو پھر ہاورڈ فاسٹ جیسے ناول نگار کا ناول "سٹیزن پین" پڑھیے... ا

تھامس پین وہ مصنف، صحافی، انقلابی اور دانشور ہے جسے بیک وقت برطانوی امریکی۔ باشندہ اور شہری کہا جاتا ہے اور یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس کے زمانے میں اسے سٹیزن کا لقب ملا۔ اور وہ فرانس کے انقلاب کی کمیٹی کا رکن بھی رہا۔

تھامس پین آزادی، انسانی حقوق کا وہ عظیم علمبردار اور مفکر ہے جس کے افکار نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور امریکہ کو برطانوی اقتدار سے آزاد ہونے میں مدد دی۔ اس کا اہم ترین کام اس کا کتابچہ Rights of Man ہے جو برک جیسے رجعت پسند برطانوی مفکر کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

تھامس پین تھیٹفورڈ (THETFORD) (نارفوک انگلستان) میں ۲۹ جنوری ۱۷۳۷ء کو

پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک کویکر تھا۔ یعنی ایک انسان دوست، آزاد خیال مذہبی آدمی... پین کو بہت کم تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کئی مختلف النوع کام کرکے وہ بالآخر ۱۷۶۲ء میں محکمہ ایکسائز میں ملازم ہوگیا لیکن تین برس بعد اسے اس الزام پر ملازمت سے جواب دے دیا گیا کہ وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں غفلت سے کام لیتا ہے۔ بعد میں اس کی ملازمت بحال کردی گئی اور ۱۷۶۸ء تک اسی ملازمت سے متعلق رہا۔ اس زمانے میں وہ اپنے طور پر مطالعے اور تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہا۔ اور پھر میتھوڈسٹ چرچ سے وابستہ ہوکر مبلغ بن گیا۔ ۱۷۵۹ء میں اس نے شادی کی۔ اگلے سال ہی اس کی بیوی چل بسی۔ ۱۷۷۱ء میں اس نے دوسری شادی کی۔ اس کی بیوی کی تمباکو کی دکان تھی ۱۷۷۴ء میں ان میں علیحدگی ہوگئی۔ تھامس پین تقریباً ساری عمر مالی مسائل کا شکار رہا۔

۱۷۷۴ء میں پین نے امریکہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچتے ہی اسے نومبر ۱۷۷۴ء میں پنسلوانیا گزٹ کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ ایک فعال انسان تھا۔ اس لیے وہ اس تحریک میں شامل ہوا جو امریکہ کی آزادی کے حق میں تھی۔ ۱۷۷۶ء میں اس کا مشہور زمانہ پمفلٹ Common sense شائع ہوا۔ اس پمفلٹ میں اس نے برطانیہ کی عملداری کے خلاف، امریکہ کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ وہ اپنے دور اور ماحول کی عوامی امنگوں کو سمجھتا تھا۔ اس پمفلٹ میں اس نے لکھا تھا۔ حکومت وہ ناگزیر برائی ہے جسے قبول کرنا پڑتا ہے لیکن نوآبادیاتی نظام کے لیے دنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ جب امریکہ میں برطانیہ کے خلاف شدید ردعمل اور جدوجہد کا آغاز ہوا تو پین نے اس میں عملی حصہ لیا۔ اس نے سولہ پمفلٹ لکھے جو CRISIS کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ وہ پمفلٹ ہیں جنہوں نے آزادی کے خواہاں عوام میں روح پھونکی۔ مورخوں اور محققوں نے لکھا ہے کہ یہی وہ پمفلٹ اور تحریریں تھیں جنہوں نے واشنگٹن کو اتنا متاثر کیا کہ وہ امریکہ کی آزادی کے لیے برطانیہ سے لڑنے میں جو ہچکچاہٹ محسوس کرتا تھا وہ دور ہوگئی۔ پین کا یہ کارنامہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے امریکہ کے عوام اور جارج واشنگٹن جو آزادی کی دہلیز تک پہنچ کر ٹھٹکے کھڑے تھے۔ ان کو آگے بڑھنے کی تحریک تھامس پین کی تحریروں نے دی۔ ۱۷۹۱ء میں "رائٹس آف مین" کی اشاعت ہوئی۔ جس کا انتساب جارج واشنگٹن

کے نام تھا۔ اور جارج واشنگٹن نے برطانیہ کی غلامی اور نوآبادیاتی برتری کا جوا اتارنے کا فیصلہ کر لیا۔

امریکہ میں پین کو سرخ ہندیوں کے مسائل کے بارے میں قائم کردہ کمیشن کا سیکرٹری مقرر کیا گیا اس کے بعد غیر ملکی امور کی کانگرلیسی کمیٹی کا سیکرٹری بھی چنا گیا۔ لیکن اس کے نظریات وافکار کی وجہ سے ۱۷۷۹ء میں اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ مستعفی ہو جائے۔ تاہم اس کی خدمات کو پیش نظر رکھا گیا پین نے فرانس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ جان لارنٹس تھا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ فرانس میں جا کر چندہ جمع کیا جائے جو آزادی کی تحریک کے کام آ سکے۔ امریکہ میں اس کی خدمات کے پیش نظر اسے کچھ جائداد دی گئی۔ خطیر رقم کانگرلیس نے اسے دی۔ یوں پہلی بار پین مالی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

فرانس میں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ اسے فرانس کا "شہری" چن لیا گیا۔ اسے فرانسیسی نہیں آتی تھی، لکھ سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ تاہم اسے انقلابی کنونشن کا رکن بنا دیا گیا۔ یہاں بھی کچھ معاملوں میں اس کے اختلافات کی وجہ سے انقلابیوں نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ یقیناً اس کا سر گلوٹین سے کاٹ دیا جاتا لیکن ۱۷۹۴ء میں وہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس زمانے میں پین نے اپنی اس کتاب کا پہلا حصہ مکمل کیا جو انسانی فکری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب Age of Reason ہے۔

تھامس پین ایک ایسا کیریکٹر تھا جو مذہب کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات رکھتا تھا وہ الہامی مذاہب کا قائل نہ تھا۔ وہ تمام مذاہب کو کمزور اور نامکمل پاتا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں مذاہب نے سیاسی امور کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مذاہب کی یہ خامی اس کو بری طرح کھٹکتی تھی۔ وہ خالص فطری اخلاقیات پر مذہب کی بنیاد رکھنے کا حامی تھا۔ اور ہر طرح کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا دشمن تھا۔ اس کی کتابیں بائیبل پر زبردست تنقید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ بائبل پر بڑے جارحانہ انداز میں اعتراضات کرتا ہے۔ فرانس میں جب وہ قید تھا تو اس نے ایج آف ریزن کا دوسرا حصہ مکمل کیا اسے رابسپیئر کے حکم سے قید کیا گیا تھا۔ دس ماہ کے بعد جب رابسپیئر کو زوال آیا تو پین کو رہا کر دیا گیا اور اسے پھر سے انقلابی کنونشن کا رکن بنا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء تک وہ یہ فرائض ادا کرتا رہا۔

وہ حق گو اور سچا انسان تھا۔ ۱۷۹۵ء میں اس نے ایک خط میں واشنگٹن کی پالیسیوں پر شدید تنقید کی۔ جب وہ واپس امریکہ پہنچا تو اس کی انقلابی فکر و حق گوئی کی وجہ سے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی کتاب Age of Reason کو رجعت پسند طبقوں نے بری طرح رگیدا اور اعتراضات کا نشانہ بنایا تھا۔ پین ایک بار پھر نادار اور قلاش تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی صحت جواب دے گئی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری دن تنہائی اور کسمپرسی میں بسر ہوئے ۸ جون ۱۸۰۹ء کو نیویارک میں اس کا انتقال ہوا۔ اسے نیو روچیل میں دفنایا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں اس کی یادگار تعمیر ہوئی۔ ۱۸۱۹ء میں اس کی لاش کو انگلینڈ پہنچا دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ امریکہ اور برطانیہ کا مشترکہ شہری سمجھا جاتا ہے۔

رائٹس آف مین

برک برطانیہ کا شعلہ بیاں مقرر، خطیب اور مفکر سمجھا جاتا ہے وہ ایک زمانہ میں پین کا دوست تھا۔ برک انقلاب فرانس کا مخالف تھا اور اس موضوع پر اس نے ایک کتاب Reflections on the Revolution in France. لکھی۔ پین پر اس کتاب کا بے حد اثر ہوا۔ برک کی رجعت پسندی اور انقلاب دشمنی نے اسے مجبور کیا اور ۱۷۹۱ء میں اس نے Rights of Man کے نام سے اپنا شہرۂ آفاق کتابچہ لکھا۔ جس کو اس زمانے میں اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ وہ یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گیا۔ برطانوی حکومت اس کی اشاعت پر ناراض ہوئی۔ اسے برطانوی دستور پر ایک حملہ سمجھتے ہوئے پین کو باغی قرار دے دیا گیا۔ پین نے فرانس پہنچ کر اپنی جان بچائی۔

برک قدامت پسند اور روایتی نظریات کا حامی تھا۔ اس کے برعکس پین انقلابی اور انقلابِ فرانس کا حامی تھا۔

پین ہر قوم اور ملک کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جس چیز کا بھی انتخاب کرنا چاہے اس کا اسے حق حاصل ہے۔ وہ پرانے اور مردہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین، صحیفوں کو زندہ انسانوں پر تھوپنے اور لاگو کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ہر ملک اور ہر نسل کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے

جیسا نظام اور قانون چاہے بنائے۔ وہ انقلاب کا داعی اور حامی ہے۔
تھامس پین۔ رائٹس آف مین" میں لکھتا ہے۔

"ہر انسانی نسل اپنے سے پہلے کی نسلوں کی طرح جملہ حقوق رکھتی ہیں۔ اس طرح ہر فرد جب پیدا ہوتا ہے تو اسے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اس کے ہم عصروں کے لیے ہیں۔ انسان کے فطری اور حقیقی اصول وہ ہیں جنہیں انسانوں نے شہری حقوق کا نام دے کر استوار کیا۔

برک سیاسی عمل کو بہت پیچیدہ سمجھتا ہے۔ لیکن پین جو خرد افروزی اور عقلیت کے علمبرداروں میں سے ہے۔ وہ سیاسی عمل کو بہت سادہ سمجھتا ہے۔ وہ عقل کی بنیاد پر اسے استوار کرتا ہے۔ عقل کو کسوٹی قرار دے کر عالمی سچائیوں سے ہمکنار کر کے ایسے واضح اصولوں کی تشکیل کا حامی ہے جو انسان کی فلاح اور انسانی حقوق کی ضمانت بنتے ہیں۔

یوں پین بادشاہت، حکمرانی اور انسان دشمنی کی نفی کرتا ہے۔ غربت و ناداری کے سرچشموں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہوں کی طالع آزمائیوں اور حرص و ہوا کو ختم کر دو تو نتیجہ امن کی صورت میں نکلے گا۔"

پین نمائندہ عوامی حکومت کو اشرافیہ اور ورثے میں ملنے والی شہنشاہیت کا نعم البدل قرار دیتا ہے۔ لندن میں فیبین سوسائٹی بنی۔ وہ پین کے انہی نظریات و افکار پر مبنی تھی۔ پین لکھتا ہے۔

"حکومت کی اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے۔ جہاں ہر انسان کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہوں۔

تھامس پین کا انداز اسلوب، اپنے نظریات کے اظہار میں جس شدت کا وہ اظہار کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک اہم اقتباس اسی کے الفاظ میں پیش کیا جائے "رائٹس آف مین" کا یہ ٹکڑا۔ اس کے افکار کی روح ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ اس کا اسلوب بھی ملاحظہ کیجئے۔

There nsver . nd there never can exist a parliment or eny escription of Men, o. any Generation of Man, in any country possessed the right or the power of binding and controlling posterity to the

end of time or of commanding for ever how the world shall be governed, or whn shall govern it, and therefore all such clauses acts or declarations by which the makers of them attempt to do what they have neither the right nor the power to do nor the power to excute, are themselves Null and Void. Every age and generation must be asfree to act for itself in all cases as the ages and generations which preceded it.''

پین ایسے قوانین کو قبروں سے بھی ماورا، قوانین کا نام دیتا ہے جنہیں مقدس سمجھ کر ان کو ان پر عمل کرانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اسے زیادہ مضحکہ خیز قرار دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ حالات کے تقاضوں کے تحت انسانوں کو اپنے لیے ہر راستہ اختیار کرنے کا حق ہے۔ پین کے ایسے خیالات کے تحت بعض نقادوں نے اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس کے افکار و نظریات میں انارکی کا فلسفہ مضمر ہے اور اس کے افکار و نظریات پر عمل کرنے سے انارکی ہی پھیلے گی۔ کسی حکومت اور طرزِ حکومت کو استحکام حاصل نہ ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی تنقید اور اعتراض ہے جو پین کے خیالات و افکار کے ساتھ شدید قسم کی زیادتی ہے۔ پین تو جس چیز پہ زور دیتا ہے وہ ہے زندہ انسان کے حقوق وہ یہ نہیں چاہتا کہ زندہ اور اپنے عہد میں سانس لیتے ہوئے انسانوں پر وہ قوانین تھوپے جائیں جو ان لوگوں نے اپنے عہد کے لیے وضع کیے تھے جو اب مر چکے ہیں اور موجودہ حالات سے یکسر لاعلم ہیں۔ اس لیے پین انسانوں کو یہ حق دیتا ہے بلکہ اس کا فطری حق قرار دیتا ہے کہ انسان اپنے حالات کے تحت جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"وہ لوگ جو دوسرے جہاں میں پہنچ چکے اور جو لوگ ابھی زندہ ہیں ان دونوں کے درمیان بھلا کونسی چیز مشترکہ ہو سکتی ہے۔ دوسری دنیا اور موجود دنیا کے انسانوں کی قوتِ متخیلہ جداگانہ ہوتی ہے ان میں ایک وہ جس کا وجود ہی نہیں اور دوسرا اپنا وجود رکھتا ہے۔"

تھامس پین رائٹس آف مین میں برک پر یہ الزام لگاتا ہے کہ برک نے ایک خاص قسم کے سیاسی آدم کو تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمیشہ کے لیے پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اب

برک کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس کا یہ آدم کوئی "قوت یا آزادی بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ تھامس پین کا آدمی آزادی کے حق سے مسلح ہے وہ ہر دور میں اپنے لیے اپنے حق کا آزادانہ استعمال کر سکتا ہے۔

تھامس پین ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے خالق نے انسان کو حقوق بھی دیے اور یہ حقوق صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ ہر نسل کے لیے ہوتے ہیں۔ رائٹس آف مین میں تھامس پین لکھتا ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ اٹھا لیجیے۔ روایت کو لیجیے۔ لکھی اور ان لکھی تحریروں کو دیکھیے ایک چیز سب میں مشترک ہے وہ Rights of Man جس کا مفہوم پین کے نزدیک یہ ہے کہ تمام انسان ایک خاص اور مساوی سطح رکھتے ہیں اور تمام انسان مساوی حقوق کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب کو یکساں فطری حقوق حاصل ہیں۔ تھامس پین کے اس انقلاب انگیز کتابچے "رائٹس آف مین" کا یہ ٹکڑا خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ پین لکھتا ہے:

- انسان کسی سوسائٹی میں اس لیے شامل نہیں ہوتا کہ اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں چند حقوق کا طلب گار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معاشرے اور سوسائٹی کو اس لیے تشکیل دیتا ہے کہ اس کے حقوق کو بہتر تحفظ حاصل ہو سکے۔ اس کے فطری حقوق اس کے تمام شہری حقوق کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ پین کے نزدیک فطری حقوق کا مفہوم اسی کے الفاظ میں یہ ہے:

Natural rights are those which appealed to man in right of his existence of this kind are all the intellectual rights or rights of mind; and also those rights of actions as an individual for his own comfort and happiness which are not injurious to the natural rights of others."

اب ضروری ہو جاتا ہے کہ پین شہری حقوق کی جو تعریف پیش کرتا ہے اسے بھی دیکھا جائے۔ تھامس پین "رائٹس آف مین" میں اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ شہری حقوق وہ ہیں:

A memder of society every civil right has for its foundation some natural right pre-existing in the individual but to the enjoyment of which his individeal power is not in all cases competent of this kind we all those which relate to security and protection.

تھامس پین کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر شہری؛ انسان کے فطری حق سے نشوونما پاتا ہے اور پیدا ہوتا ہے یا پھر دوسرے الفاظ میں قدرتی حق ہی یہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔

تھامس پین حکومت کے بارے میں بھی منفرد رائے اور نظریہ رکھتا ہے۔ وہ حکومت کے ادارے کو اتنا مستحکم نہیں سمجھتا جتنا کہ انسانوں کے حقوق اور ان کی آرا کو حکومت کو تشکیل کرتی ہیں۔ انسانوں کے معاشرے میں انسانی اذہان اور ضرورتوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

معاشرہ مل جل کر جو دستور بناتا ہے وہ گویا سب انسانوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے حکومت تو محض نام کی شے ہے بلکہ پین کے الفاظ میں حکومت میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ تو بس نام کا ہوتا ہے۔ حکومت کے ساتھ انسانی حکومت بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے لیکن انسانی معاشرے کے ساتھ انسانوں کی وابستگی بھی کم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسانوں اور معاشرے کی بہتری کے لیے جو چیزیں حکومت سامنے لاتی ہے اور جو دستور بنایا جاتا ہے وہ اس میں معاشرے میں عام اجازت کا حامل ہونا چاہیے۔ کسی خاص انداز کی مستحکم حکومت گویا معاشرے کے لیے ایک چیلنج ہوتی ہے اگر انسانوں کے فطری حقوق اور ان کے متبادل شہری حقوق کا خیال نہ رکھا جائے تو پھر حکومت لعنت بن جاتی ہے۔

ایسی نام کی حکومتیں انسانی تہذیب و تمدن کے لیے کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی ہیں۔ خواہ ان کے لیے بہترین انسانی دانش کو ہی کیوں نہ بروئے کار لایا ئے۔ کیونکہ اصل دانش تو حقوق کا تحفظ ہے۔ اور فطری حقوق کا شہری حقوق کا صحیح معنوں میں تبدیل کیا جانا ہے اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر حکومت کا کیا فائدہ۔؟

داس کیپیٹل

بعض شخصیات اور بعض کتابوں پر لکھا گیا کوئی ایک مضمون بھی کتاب اور صاحب کتاب کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ ایسی ہی صورت حال کارل مارکس اور داس کیپیٹل پر لکھتے ہوئے مجھے بھی درپیش ہے۔ مجھے ابتدا میں ہی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ مضمون مارکس داس کیپیٹل اور اس کے افکار کے بارے میں محض چند اشاروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

جسے ہم جدید دنیا کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے تین معمار ہیں جنہوں نے اس دنیا کی صورت گری کی ہے۔ وہ ہیں کارل مارکس، فرائڈ اور آئین سٹین، کارل مارکس ان میں سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اس کے انقلابی افکار اور فلسفے نے اس دنیا کو تبدیل کیا ہے۔ انقلابوں کا سرچشمہ کارل مارکس کے افکار و نظریات قرار دیئے گئے ہیں وہ شخص جس کے بارے میں علامہ اقبال نے "قلبش اور مومن دماغش کافر است" کہا ہے۔ اس نے پوری دنیا کو اپنے افکار اور فلسفے سے دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام اور فلسفے کا تصادم پوری دنیا کے انسانوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

کارل مارکس کے بارے میں جتنا کچھ حق اور مخالفت میں لکھا گیا ہے اس کا اندازہ اور شمار ممکن نہیں۔ اس کی کتابوں کو دنیا کی ہر زبان میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں بلکہ اردو میں "داس کیپیٹل" کی صرف پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے اور یہ بڑا کام بھی سید محمد تقی نے انجام دیا داس کیپیٹل کی باقی جلدوں کے علاوہ کارل مارکس کا تقریباً سارا بڑا کام اردو میں منتقل نہیں ہو سکا۔

مجھے کارل مارکس اور اس کے افکار و نظریات کے حوالے سے بظاہر ایک غیر متعلق بات

کہنے کی اجازت دیجیے کہ باقی دنیا کا حال مجھے معلوم نہیں۔ نہ ہی میں اس کا دعویدار ہوں۔ لیکن بڑی ذمے داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کارل مارکس کے بارے میں جتنی مخالفت اور حمایت انتہاپسند حلقوں کی طرف سے ایک مدت سے جاری وساری ہے۔ اس کی بنیاد محض تعصب اور لاعلمی پر قائم ہے۔ مارکس کے نظام فکر کو پڑھے بغیر ہمارے ہاں اس کے حق میں یا مخالفت کرنے کا "فیشن" بڑے زوروں پر رہا ہے۔ اور اب بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مخالفوں کی بات چھوڑیے کارل مارکس کے ایسے کتنے ہی ماننے والوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جنہوں نے سرے سے مارکس کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔

کارل مارکس کا جملہ کام بلاشبہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے جو "کولیکٹڈ ورکس" شائع ہوئے ہیں وہ بیسیوں جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اور اب بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سارا کام ابھی تک شائع نہیں ہو پایا۔ مارکس کی بیشتر تصانیف ایسی ہیں جو سنجیدہ مطالعے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ لیکن "داس کیپیٹل" اس کی ہی نہیں پوری دنیا میں لکھی جانے والی چند ایسی کتابوں میں سرفہرست ہے جنہوں نے پوری انسانی دنیا کو متاثر کیا ہے۔ "داس کیپیٹل" کو پڑھنا یقیناً بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطالعے سے پہلے مارکس کی چند اہم تصانیف کا مطالعہ کرلیا جائے۔ ویسے آج کی دنیا میں کارل مارکس کی کیا معنویت ہے اور مستقبل میں وہ کیا اہمیت اختیار کرے گا۔ اس سلسلے میں میں دو کتابوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک کتاب تو اطالوی مارکسٹ ہنسیٹا لوگیووانی کی ہے جو جنگ عظیم کے بعد انگریزی میں شائع ہو چکی ہے جس کا نام ہے۔ کارل مارکس اور مذاہب عالم۔ دوسری اہم کتاب ایرچ فرزم کی ہے جس کا نام ہے BEYOND THE HORIZON OF MIND۔ اس فکر انگیز کتاب میں فرزم نے کارل مارکس اور فرائیڈ کے افکار و نظریات کی مشترکہ اقدار کو تلاش اور دریافت کیا ہے۔ اور مارکس کو فرائیڈ پر ترجیح دی ہے۔

کارل مارکس کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اب پوری عمر اس کو پڑھنے میں صرف کردے تو بھی سب کچھ نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن "داس کیپیٹل" وہ کتاب ہے جسے اگر پڑھ لیا جائے تو کارل مارکس کے افکار و نظریات کا پورا احاطہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بہت کم کتابوں نے

انسانوں کو اتنا مداح اور مخالف بنایا ہے۔ جتنا کہ "داس کیپیٹل" نے!

کارل مارکس کی زندگی ایک بڑے رزمیہ سے کم نہیں۔ اس نے ایسے ایسے حالات کا سامنا کیا جن کے تصوّر سے ہی کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے کنبے کو بھوک اور افلاس کا سامنا کرتے اور معمولی معمولی بنیادی ضرورتوں کے لیے ترستے اور مرتے دیکھا۔ لیکن اس نے اپنے مقصد کو کبھی نظرانداز نہ کیا۔ جو مشن وہ لے کر چلا تھا۔ اس کے لیے وہ زندگی کی آخری گھڑی تک غربت بیماری، بڑھاپے اور مخالفت کے باوجود کام کرتا رہا۔ مارکس کی زندگی ہی بذات خود ایک ایسا موضوع ہے کہ جسے کسی ایک مضمون میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ بہرحال مختصراً اس کی زندگی کی چند جھلکیاں پیش ہیں۔

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو مغربی جرمنی کے شہر ٹرائر میں پیدا ہوا۔ اس کے والد نے مارکس کی پیدائش سے پہلے اپنے نسلی اور آبائی مذہب یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ اس کا والد ایک خوش حال وکیل تھا۔ مارکس نے ابتدائی عمر میں ہی یونانی شاعروں اور شیکسپیئر کا مطالعہ کر لیا۔ اس نے بون اور پھر برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے مضامین میں فلسفہ، قانون اور تاریخ شامل تھے۔ اس دور میں مارکس نے کچھ رومانی نظمیں بھی لکھیں۔ لارنس سٹرن کے انداز میں ایک ناول کے کچھ ابواب لکھے۔ اور نامکمل المیہ بھی۔ ۱۸۳۶ء میں اس کی منگنی جینی سے ہوئی۔ جس نے شادی کے بعد حق رفاقت ادا کرنے میں ایک شاندار مثال قائم کی۔ اس زمانے میں مارکس پر ہیگل کے اثرات نے غلبہ کیا۔ بعض ناقدوں کے خیال میں ساری عمر مارکس ان سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ ۱۰ مئی ۱۸۳۸ء کو مارکس کے والد کا انتقال ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے ڈیموکریٹس اور ایپی کیورس کے فلسفے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں ایک اخبار کے عملے میں شامل ہوا۔ اور اس کا چیف ایڈیٹر بنا۔ یہ آزاد خیال اخبار تھا۔ ۱۸۴۳ء میں سنسر کی سختیوں کی وجہ سے مارکس نے اخبار چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اس برس ۱۲ جون کو اس نے جینی سے شادی کی۔ اسی برس وہ پیرس چلا گیا جہاں ایک اخبار مرتب کرتا رہا۔

۱۸۴۴ء ہی وہ سن ہے جب مارکس اور فریڈرک اینگلز کی دائمی رفاقت کا آغاز ہوا۔ یہ دوستی مثالی تھی۔ اور اس کی استواری نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس کو پیرس سے نکال

دیا گیا۔ وہ برسلز چلا گیا۔ اور پھر یہیں اس کی ان مالی مشکلات اور دشواریوں کا آغاز ہوا۔ جنھوں نے ساری عمر مارکس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ۱۸۴۶ء میں اس کی اہم تصنیف جرمن آئیڈیالوجی، اور ۱۸۴۷ء میں "پاورٹی آف فلاسفی" شائع ہوئی ہیں۔ مؤخرالذکر کتاب پرودھاں کی کتاب "فلاسفی آف پاورٹی" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ مارکس اب کمیونسٹ لیگ کے ساتھ اشتراک کر چکا تھا اور اس کے لندن میں ہونے والے دوسرے اجلاس میں شریک بھی ہوا۔

۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع ہوا۔ جسے مارکس اور اینگلز نے مل کر تیار کیا تھا۔ انسانی تاریخ میں جو تحریریں لکھی گئی ہیں ان میں چند ہی ایسی ہوں گی۔ جن کے اثرات اتنے دوررس اہم نتیجہ خیز اور انقلاب آفریں ہوئے جتنے موجودہ دنیا پر کمیونسٹ مینی فیسٹو کے ہیں۔

اسی زمانے میں فرانس میں انقلاب آیا۔ جرمنی ہنگری اور آسٹریا میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یہ دور مارکس کی زندگی کا بہت اہم اور مصروف دور ہے ۱۸۴۹ء میں مارکس پر مقدمہ چلتا ہے۔ کولون جیوری نے اسے رہا تو کر دیا لیکن اب وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا کوئی ملک نہ تھا ایک جلاوطن، بے وطن۔ وہ اس دوران میں پھر ایک اخبار کی ادارت کر رہا تھا۔ جس کا آخری پرچہ ۱۸ رمئی ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا۔ مارکس پیرس پہنچا اور وہاں سے ۲۴ راگست ۱۸۴۹ء کو لندن جہاں اس کی جلاوطن زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی کتاب "فرانس میں طبقاتی کشمکش" شائع ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ لیگ ختم ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں اسے بحال کیا گیا جس کا انجام بھی بہتر ثابت نہ ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں مارکس نے امریکی اخبار نیویارک ٹریبون کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے سے لے کر ۱۸۶۲ء تک مارکس نے سینکڑوں مضامین لکھے۔ وہ کفالت کے لیے امریکی اخبار کے علاوہ مختلف اخباروں کے لیے لکھتا رہا۔ لیکن عسرت و نکبت کا بھیڑیا اس کی دہلیز پر بیٹھا رہا۔ اس دور میں اینگلز حق دوستی ادا نہ کرتا تو مارکس کے کنبے کے لیے سلسلۂ حیات جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ۱۸۶۵ء میں اس نے "ویجز، پرائس پرافٹ" کے نام سے کتاب شائع کی۔ پہلے انٹرنیشنل کی بنیادیں رکھیں اور اس کے انعقاد کے لیے تیاریاں کیں۔

مارکس نے بڑی مصروف زندگی گزاری۔ کام حالات اور ذاتی ضرورتوں کا دباؤ اس پر ہمیشہ رہا لیکن اس نے اپنے منصب کو ادا کیا۔ لاسال کے ساتھ اس کے نظریاتی اختلافات اور اس کا رد

اپنی جگہ مارکس کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے ۱۸۷۵ء میں سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کی بھی بنیاد رکھی ۱۸۷۸ء میں جرمنی میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔

۲ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو جینی کا انتقال ہوا۔ یہ مارکس کے لیے بہت زبردست صدمہ تھا۔ جینی خوشحال خاندان کی فرد تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے خاندان کی اعانت کو منظور کر کے ناقابل برداشت افلاس سے نجات حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک باوفا ثابت قدم بیوی کی حیثیت سے اپنے خاوند کے ساتھ مصیبتیں برداشت کرتی رہی۔ اور اس کے عظیم کام میں اس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ان پر ایسے ایسے کربناک اور اذیت ناک لمحے بھی آئے۔ جب ان کا بچہ مرا، تو گھر میں کفن دفن کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔

مارکس عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا۔ اس کی صحت جواب دے چکی تھی۔ لیکن اس نے آخری عمر میں بھی اپنا کام جاری رکھا۔ بالآخر ۱۴ر مارچ ۱۸۸۳ء کو کارل مارکس کی زندگی کا سفر ختم ہوا۔

داس کیپٹل

اس زمانے میں نہ صرف عالمی حالات بہت پریشان کن تھے بلکہ خود مارکس کے اپنے نجی حالات بھی شدید دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے۔ جب مارکس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے اپنے دوست ایل کیوگلمان کو ایک خط میں اطلاع دی کہ وہ اپنے بڑے کام کا نام "کیپیٹل" رکھ رہا ہے۔ جس کا ذیلی عنوان "اے کنٹری بیوشن ٹو دی کریٹک آف اکانومی" ہوگا۔

امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں مارکس کا بڑا ذریعہ معاش "نیویارک ٹریبیون" سے ملنے والا معاوضہ تھا۔ جو خانہ جنگی کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔ اس کا خاندان ضرورتوں اور احتیاج کی تکالیف سے گزر رہا تھا۔ لینن نے لکھا ہے

"اگر مارکس کو اینگلز کی طرف سے ملنے والی مستقل اور مخلصانہ امداد جاری نہ رہتی تو نہ صرف یہ کہ مارکس کیپیٹل کو مکمل نہ کر سکتا بلکہ وہ اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں کچلا جاتا۔"

(لینن کلیات جلد ۲۱ صفحہ ۴۸ مطبوعہ ماسکو)

فرسٹ انٹرنیشنل کی تیاریوں اور انتظامات کے سلسلے میں بھی مارکس کو بہت کام کرنا پڑا تھا اب وہ راتوں کو دیر تک کیپٹل پر کام کرتا۔ کام اور حالات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ اکثر اس کی طبیعت ناساز ہو جاتی۔ کیپٹل کی تین جلدوں کا پہلا ڈرافٹ ۱۸۶۵ء کے اواخر میں مکمل ہوا۔ لیکن پہلی جلد کو اشاعت کے لیے دینے کے لیے مارکس نے اس پر نظر ثانی کی۔ اس پر اس نے بہت محنت کی۔ کئی تبدیلیاں کیں۔ حتیٰ کہ جب اینگلز نے پروف پڑھنے کے بعد بعض مشورے دیئے تو پھر اس میں ترمیم اور تبدیلیاں کی گئیں۔ اور پھر بالآخر ۱۶ اگست ۱۸۶۷ء کو کیپٹل کی پہلی جلد اشاعت کے لیے پبلشر کو دے دی گئی۔ کارل مارکس نے اینگلز کو لکھا تھا۔

"یہ جلد ختم ہوئی۔ اس کے لیے صرف آپ ہی اکیلے شکریے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ اگر آپ کا شاندار تعاون اور ایثار میرے شامل حال نہ ہوتا تو میں ان تین جلدوں کو کبھی مکمل نہ کرسکتا۔

(مارکس اور اینگلز کے منتخب خطوط ص ۱۹۱)

"داس کیپٹل کی پہلی جلد ستمبر ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی"۔

مارکس کی دیگر مصروفیات نے اسے بہت مصروف رکھا۔ فرسٹ انٹرنیشنل فرانس اور پروشیا کی جنگ اور پیرس کمیون کے حوالے سے مارکس بہت مصروف رہا۔ ۱۸۷۰ء میں کہیں جاکر وہ کیپٹل کے دوسرے حصوں پر توجہ دینے کے قابل ہوسکا۔ اس دوران میں اسے "کیپٹل" کی پہلی جلد کے دوسرے جرمن ایڈیشن پر بھی بہت محنت کرنی پڑی۔ فرانسیسی ترجمہ کی تدوین نے بھی اس کا خاصہ وقت لیا۔ دوسری جلد کو حتمی صورت دینے میں اسے بہت محنت کرنی پڑی اور کام اس کی اپنی توقع سے کہیں زیادہ پھیل گیا۔ اس سلسلے میں اینگلز نے "کیپٹل" کی دوسری جلد کے دیباچے میں ایک اہم حقیقت کی بھی نشاندہی کی ہے۔

"مارکس پر جو تنقید اس سے پہلے ہوئی تھی اس نے مارکس کے اندر خود احتسابی کا عمل تیز کردیا تھا۔ اس نے اس لیے اس پر بہت محنت کی۔ اس کے پھیلتے ہوئے افق کو سمیٹنے کے لیے بہت کام کیا۔ بہت پڑھا۔

کارل مارکس ابھی "کیپٹل" کی باقی جلدوں کی تدوین نہ کرسکا تھا کہ اس کی زندگی کا سلسلہ ختم ہوگیا اس نے کیپٹل کے جو مسودے اپنے پیچھے چھوڑے تھے وہ ضروری تدوین کے محتاج تھے۔ یہ

فریڈرک اینگلز نے ادا کیا۔ اور اس سے بہتر یہ کام کوئی دوسرا کر بھی نہ سکتا تھا۔ اینگلز کی محنت اور توجہ کے بعد کیپیٹل کی دوسری جلد مارکس کی وفات کے بعد ۱۸۸۵ء میں اور تیسری جلد ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ لینن نے "کیپیٹل" کی دوسری اور تیسری جلد کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ لینن نے لکھا تھا۔

"کیپیٹل" کی دوسری اور تیسری جلد دو آدمیوں کا کام ہے یعنی مارکس اور اینگلز کا۔"

مارکس نے جو کام اپنے پیچھے چھوڑا تھا اس کی بنا پر ایک چوتھی جلد بھی تدوین و ترتیب کی محتاج تھی۔ سیاسی اقتصادیات کی بنیادی تھیوری "سرپلس ویلیو" (قدر فاضل) کا خالق مارکس ہے اور یہ اس کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اینگلز نے اپنے دوست مارکس کی موت کے بعد مارکس کی اس تھیوری کو کیپیٹل کی چوتھی جلد کی صورت میں ترتیب دینے اور شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن اینگلز بھی اس پر عمل نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کی موت نے یہ کام پورا نہ ہونے دیا۔ اینگلز کی موت کے بعد مارکس کا یہ کام علیحدہ کتاب اور مختلف نام کے ساتھ کارل کاؤٹسکی نے ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ اس کا نام تھیوری آف سرپلس ویلیو ہے۔

"داس کیپیٹل" دنیا کے عظیم انقلابی سائنسدان اور ماہر معاشیات کا سب سے عظیم کارنامہ ہے یہ وہ کتاب ہے جس نے پوری دنیا کو تبدیل کیا ہے جو دنیا میں انقلاب کا باعث بنی۔ اس کی مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا۔ وہ اپنی جگہ کتنا ہی اہم اور معتبر کیوں نہ ہو لیکن موجودہ دنیا پر جتنے اثرات مارکس کی تعلیمات و نظریات اور داس کیپیٹل کے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مارکس نے جو کام کیا وہ بہت مشکل اور بہت نادر تھا۔ مارکس نے اپنے ایک دوست لاشاترے کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

سائنس کی طرف جانے والا راستہ آسان نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ جو تھکنے سے خوفزدہ نہیں ہوتے وہی اس کے ڈھلوانی راستوں پر چلنے کی ہمت رکھتے ہیں اور انہی کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس راستے کی بلندیوں پر جا پہنچیں۔

"داس کیپیٹل" نے سیاسی اقتصادیات میں انقلاب پیدا کیا۔ اس کا سارا کام سائنٹیفک بنیادوں پر کھڑا ہے۔ مارکس نے سرمایہ دار معاشروں کے معاشی قانون حرکت کو دریافت کیا۔ یہ سرمایہ دار معاشرہ کس طرح جنم لیتا، کس طرح ارتقائی مراحل طے کرتا اور پھر زوال سے ہمکنار ہوتا ہے اس

کا مطالعہ اس نے سائنسی بنیادوں پر کیا۔ اور اس کے عارضی تاریخی کردار کو ثابت کیا کہ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام اور معاشروں میں جو تضاد پایا جاتا ہے اسے بطور خاص سمجھا اور تلاش کیا۔ مارکس نے یہ ثابت کیا کہ سرمایہ داری نظام کے تمام بورژوا اور پیٹی بورژوا مصلحوں اور ریفارمروں کی کاوشوں اور پردہ پوشیوں کے باوجود یہ تضادات نمایاں ہوتے چلے جائیں گے اور "اصلاح" کا کوئی عمل ان تضادات کو ختم نہ کر سکے گا۔

مارکس نے سرمایہ داری کی میکانزم کو واضح کر دیا۔ اس کے استحصال، اس کی صحیح صورت کو دکھایا ہے "سرپلس ویلیو" کو اس نے واضح کیا۔ یہ مزدور کی قدر محنت جو اس کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں اس کی "لیبر پاور" کے درمیان جو فرق ہے اس کا نام "سرپلس ویلیو" ہے۔ مارکس نے "سرپلس ویلیو" کا نظریہ دریافت اور پیش کر کے سرمایہ داروں کے استحصال کو بے نقاب کر دیا۔ لینن نے لکھا تھا۔

"فاضل قدر کا تصور کارل مارکس کے اقتصادی نظریے کا بنیادی پتھر ہے۔"

مارکس کے نظریات کو سمجھنے کے لیے ان سطور کو پڑھیے وہ لکھتا ہے۔

The Monopoly of Capital becomes fetter upon the mode of Product which has sprung and flourished Along with and under it centralisat of the Production and Socialisation of labour at last reach a point wh They become in Compatible with their captilast integument. T integument is burst as under the knell of capitalist private proper bou The Expropiators are Expropriated.

Money, Production and Commodity.

(کیپیٹل جلد اول صہ ۷۶۳)

داس کیپیٹل کی پہلی جلد "پراسس آف پروڈیوسنگ" کے موضوع پر ہے۔ دوسری جلد میں سرمائے کی تقسیم کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان دونوں پراسس کے اتحاد کے تحت پروڈکشن کے فیصلہ کن کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مارکس سرمائے کو حرکت میں دیکھتا ہے اور اس کی سرکولیشن بھی سرمائے

کی مختلف شکلوں میں ہوتی ہے۔ یعنی MONEY, PRODUCTION AND COMMODITY
ری پروڈکشن کا سائنٹیفک تجزیہ بھی "کیپیٹل" کی دوسری جلد کا موضوع ہے۔ سرمایہ دار
معاشرے میں ناقابلِ اصلاح تضادات کا تجزیہ بھی دوسری جلد میں پیش ہوا ہے۔ کارل مارکس یہ ثابت
کرتا ہوا ملتا ہے کہ پروڈکشن کی انارکی، بحران، بیروزگاری، سرمایہ داری کا ناگزیر جزو ہیں۔
تیسری جلد میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا کل تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ مارکس ثابت کرتا ہے کہ ایک
کارخانے اور صنعتی منافع، ایک تاجر کا تجارتی منافع، سود خور، اور بینک کا حاصل کردہ سودی منافع
اور جاگیردار کی آمدنی، یہ سب "سرپلس ویلیو" سے جنم لیتے ہیں۔ وہ منافع کی تقسیم اور اس کی بدلی ہوئی
صورتوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سرمائے کی مختلف اشکال کا کھوج لگاتا اور ثابت کرتا ہے۔
مارکس کے سارے معاشی نظریات مکمل طور پر "داس کیپیٹل" میں بیان ہوئے ہیں۔ لینن نے
اس کے نظریۂ معاشیات کو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔ مارکس کا نظریہ اس کے
فلسفہ سیاسی اقتصادیات اور سائنٹیفک کیمونزم پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنی تحقیقات میں مادی جدلیات
سے بھرپور استفادہ کیا۔ "داس کیپیٹل" سائنٹیفک کیمونزم کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ محنت و سرمایہ
کے مسائل کو کارل مارکس نے اپنے انداز میں حل کیا ہے۔ اس کا نظامِ فکر آج کے زمانے میں جو اہمیت
اختیار کر چکا ہے اسی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔
"داس کیپیٹل" سائنٹیفک تجزیہ اور نظامِ فکر پیش کرتا ہے۔ جس سے لاکھ کسی کو اختلاف ہو لیکن
اس کو مکمل طور پر نہ جھٹلایا جا سکا ہے نہ جھٹلایا جا سکے گا۔ آپ مارکس کے افکار اور نظریات کو پسند کریں
یا نہ کریں لیکن مارکس نے جس طرح سرمایہ داری اور سرمایہ داری نظام کا پول کھولا ہے۔ وہ اتنی بڑی حقیقت
اور سچائی ہے کہ جس نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔
"داس کیپیٹل" پر یہ مضمون تشنہ، نامکمل، ادھورا اور بے حد سرسری ہے ضروری ہے کہ اس
کتاب کا مطالعہ سنجیدگی اور غور کیا جائے۔ کیونکہ اس کتاب نے دنیا کے نقشے ہی کو نہیں بلکہ انسانی
نظام کو بھی بدلا ہے۔

سائیکو انالیسز

فرائیڈ کے ساتھ اختلافات کا سلسلہ تو اس کی اپنی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا اور پچھلی چند دہائیوں سے تو اس کے افکار و نظریات کی بڑے شدید انداز میں چیر پھاڑ کی جا رہی ہے لیکن ان تمام اختلافات اعتراضات اور تنقید کے باوجود فرائیڈ کے سر پر ایک ایسا تاج ہے جسے کوئی اتار نہیں سکتا۔ فرائیڈ نے انسانی لاشعور کو دریافت کیا اور وہ تحلیلِ نفسی کا بانی ہے۔ فرائیڈ نے بیسویں صدی کے فکر و عمل کو جتنا متاثر کیا۔ اس کے اثرات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ فرائیڈ کے نظریات، اس کی اصطلاحیں ساری دنیا میں زبانِ زد عام ہیں اور اس کے نظریات نے پوری انسانیت کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ وہ عام معنوں میں انقلابی نہیں تھا لیکن موجودہ دور کی ذہنی، جنسی، نفسیاتی اور فکری دنیا میں جتنا بڑا انقلاب فرائیڈ نے پیدا کیا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔

فرائیڈ کی تصنیفات میں سے میں نے اس کی کتاب "انٹروڈکٹری لیکچرز آن سائیکو انالیسز" کا انتخاب بوجوہ کیا ہے۔ یوں تو فرائیڈ کی بیشتر تصنیفات ایسی ہیں جو بہت فکر انگیز ہیں لیکن جو کتاب اس کے نظریات کی وضاحت کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی کتاب ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ فرائیڈ کی جن کتابوں کو سب سے زیادہ پڑھا گیا ان میں بھی یہی کتاب سرفہرست ہے۔ اس کا پہلا جرمن ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں وی آنا میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں ہی اس کا انگریزی ترجمہ ڈبلیو جے۔ ایچ سپروٹ نے کیا۔ جو لندن اور نیویارک سے بیک وقت شائع ہوا۔

فرائیڈ نے یہ لیکچر وی آنا میں ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں دیے تھے۔

سگمنڈ فرائیڈ کے حوالے سے اس کی کسی ایک کتاب کو بنیاد بنا کر اس کے افکار و نظریات کا جائزہ

لینا ناممکن ہے۔ اس مضمون کی حیثیت دراصل فرائیڈ کی زندگی اور جملہ نظریات اور عالمگیر اثرات کے حوالے سے چند اشارے پیش کرنا مقصود ہے۔ فرائیڈ وہ سائنسدان اور مفکر ہے جس کے نظریات و افکار پر اتنا کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے کہ ایک آدمی کے لیے یہ سب کچھ پڑھنا بھی ممکن نہیں۔ تاہم میں نے فرائیڈ کے حوالے سے چند کتابوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جن کے مطالعے سے فرائیڈ کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ ۶ مئی ۱۸۵۶ء کو فریبرگ میں پیدا ہوا۔ جو موراویا کا ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ اور ان دنوں آسٹریا ہنگری کا علاقہ تھا۔ وہ متوسط طبقے کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کی دوسری بیوی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کا والد اون کا تاجر تھا۔ فرائیڈ کی پیدائش سے پہلے ہی وہ مالی مشکلات کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک بڑے کنبے کی کفالت بہت دشوار ہو گئی تھی۔ فرائیڈ کی عمر تین برس کی تھی کہ جب اس کے والد نے وی آنا منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں وی آنا میں فرائیڈ نے اپنی زندگی کے لگ بھگ اسی برس بسر کیے۔

بڑے کنبے کی ضروریات، مالی دشواریوں کے باوجود فرائیڈ کے والد نے اس کی تعلیم پر پوری توجہ دی۔ زمانۂ طالب علمی میں خود فرائیڈ بھی بہت ذہین اور محنتی طالب علم ثابت ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں فرائیڈ نے سکول کی تعلیم پوری کر لی۔ وہ جماعت میں اول آتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ نوجوانی کے زمانے میں ہی اس نے بڑے عزائم اپنے دل میں پیدا کر لیے تھے۔ یونیورسٹی میں اس نے بڑے انہماک سے تعلیم حاصل کی۔ فزیکل سائنس میں اس کی دلچسپی بہت نمایاں رہی۔ اعصابی نظام پر اس نے اسی زمانے میں خاص کام کیا۔ پھر جنرل ہسپتال وی آنا میں ڈاکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگا۔

مارتھا۔ اس کی ہونے والی بیوی سے فرائیڈ کا عشق بھی اس کی زندگی کا اہم واقعہ ہے حالات کی دشواریوں کی بنا پر ان کی شادی تاخیر سے ہوئی۔ لیکن ان کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ فرائیڈ کی مارتھا سے شادی ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ پیرس جا کر اعصابی امراض کے ماہر شارکوٹ کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ جس سے فرائیڈ نے بہت فیض اٹھایا۔ اس نے وی آنا میں اپنا مطب قائم کیا اور وہاں خاص طور پر اعصابی امراض کا علاج کرنے میں شہرت حاصل کی۔ اسی زمانے میں اس نے کوکین

کے ذریعے علاج کے امکانات پر ایک مقالہ لکھا۔ فرائیڈ کی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا۔
ڈاکٹر جوزف بریوئر نے ہسٹریا کے مرض میں مبتلا کئی برس پہلے ایک لڑکی کا انوکھے انداز میں علاج کیا تھا جس سے فرائیڈ بے حد متاثر تھا۔ فرائیڈ نے اس سلسلے میں بھی پیش قدمی کی اور اپنی تحقیقات کو مزید بڑھانے اور پھیلانے لگا۔ اس طریقۂ علاج میں مریض کو ہپناٹائز کیا جاتا تھا۔ بعد میں فرائیڈ نے اس طریقۂ کار میں انقلابی تبدیلی پیدا کر کے اسے "آزاد تلازمہ خیال" کا رنگ دے دیا۔ اسی زمانے میں فرائیڈ کی دوستی برلن کے نامور معالج فلیس کے ساتھ ہوئی۔ ان دونوں کی جو طویل خط وکتابت ہوئی، وہ شائع ہو چکی ہے اور اس سے فرائیڈ کے نظریات اور تحقیقات کے آغاز وارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے مقالہ "پروجیکٹ فار اے سائنٹیفک سائیکلوجی" لکھا جو اس کے طریق تحلیل نفسی کے لیے پہلی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔
اس زمانے میں فرائیڈ نے وی آنا میں شاگردوں کا ایک حلقہ جمع کر لیا تھا۔ دس برس بعد ۱۹۰۶ء میں فرائیڈ کے نظریات کو زیورچ میں سراہا گیا۔ ڈاکٹر Blueler جو زیورچ کے دماغی امراض کا انچارج تھا اس نے فرائیڈ کے نظریات کی تائید کی۔ ژونگ وہاں اسی ڈاکٹر کا نائب تھا۔ اس کے بعد سالزبرگ میں ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں تحلیل نفسی کے ماہرین کی بین الاقوامی کانگریس کا انعقاد ہوا۔ فرائیڈ اور ژونگ کو امریکہ نے لیکچر دینے کی دعوت دی۔ دونوں امریکہ گئے جہاں ان کا پرجوش استقبال ہوا۔
فرائیڈ اپنے کام میں جٹا رہا حالانکہ اس کے ساتھی اس کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ایڈلر نے اس کا ساتھ چھوڑا اور ۱۹۱۳ء میں ژونگ نے نفسیات کے نئے دبستانوں اور افکار و نظریات جہاں دنیا بھر میں تیزی سے پھیل رہے تھے وہاں اس کی مخالفت کا بازار بھی گرم ہوتا چلا گیا۔ فرائیڈ کی زندگی میں کئی المناک واقعات رونما ہوئے۔ اس کی بیٹی اور نواسے کا انتقال ہوا۔ خود فرائیڈ ایسے مرض میں مبتلا ہوا جس سے اسے مرتے دم تک کبھی چھٹکارا نہ مل سکا۔ لیکن فرائیڈ نے اپنا کام جاری رکھا۔ ادھر نازی برسراقتدار آگئے۔ اور فرائیڈ کے افکار و نظریات اور یہودی ہونے کی وجہ سے اس کی بے انتہا مخالفت شروع ہو گئی۔ اس کی تصنیفات کو سر بازار جلایا گیا لیکن فرائیڈ کا شمار دنیا کے عظیم انسانوں میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب اس

۸۲ برس کی تھی اسے رائل سوسائٹی کا رکن بنا کر اسے اعزاز بخشا گیا۔ جون ۱۹۳۸ء میں فرائیڈ کو جرمنی سے جان بچا کر اپنے کنبے کے ساتھ نکلنا پڑا۔ اس نے لندن کا رُخ کیا جہاں ۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اس کا انتقال ہوا "انٹرپریٹیشن آف ڈریمز" (۱۹۰۰ء) فرائیڈ کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے فرائیڈ اپنی تحقیقات کے اہم نتائج تک پہنچ چکا تھا۔ اور ۱۸۹۰ء میں اس نے "تحلیل نفسی" (سائیکو انالیسز) کی اصطلاح سے دنیا کو متعارف کر دیا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں وہ اوڈیپس کمپلیکس اور infantile sexuality کے نظریات کو پیش کر چکا تھا۔ انٹرپریٹیشن آف ڈریمز میں اس نے پہلی بار پوری صراحت اور وضاحت سے لاشعور اور تحت الشعور اور ذہن کے طریقۂ کار کو پیش کیا۔ اس کے یہ نظریات بہت دھماکہ خیز ثابت ہوئے جن کے اثرات سے بیسویں صدی کی نئی صورت گری ہوتی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے سائیکولوجی آف ایوری ڈے لائف" شائع کی۔ اس کتاب کے عنوان سے ہی اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اس کا نظریہ جنس شائع ہوا جس میں اس نے جنس کی جبلت کا سراغ شیرخواری کی عمر سے پختگی کی عمر تک پیش کیا۔ ۱۹۱۰ء میں نرگسیت کے نظریے کو پیش کیا ۱۹۱۳ء میں ٹوٹم اینڈ ٹیبو" کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۱۵ء ۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے انٹروڈکٹری لیکچرز دیے جو بعد میں شائع ہوئے ۱۹۲۱ء میں گروپ سائیکولوجی کی اشاعت جس سے سائنسی انداز میں "ہ ہ ہ" کے تحلیلی مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے ۱۹۲۳ء میں ایگو اینڈ دی اڈ کی اشاعت۔ ۱۹۲۷ء میں دی فیوچر آف این الیوژن ۔ مذہب اور اس کے سماجی اعمال پر فرائیڈ کی پہلی کتاب ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں فرائیڈ نے اس موضوع پر بہت کام کیا۔ "سولائزیشن اینڈ اٹس ڈسکونٹینٹس" (۱۹۳۰ء) جس میں جبلت تہذیب پر روشنی ڈالی گئی۔ فرائیڈ کی آخری کتاب جو اس کی زندگی میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی — moses and Monotheism. ہے ان کے علاوہ فرائیڈ کے خطوط دیگر تمام ناتمام کام بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو میں فرائیڈ کے مطالعے کے لیے جو کتاب اب تک بہتر مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے وہ شہزاد احمد کی "موت، تہذیب مذہب" ہے اس کے علاوہ حسن عسکری کا مضمون " فرائیڈ اور جدید ادب (ستارہ یا بادبان) دنیا کے تین بڑے نفسیات دان (ڈاکٹر سلیم اختر) بطور خاص قابل ذکر ہے۔ فرائیڈ کے حوالے سے کچھ کام ابتدا میں شیر محمد اختر مرحوم نے بھی کیا تھا۔ مضامین کے حوالے سے دیکھا جائے تو فرائیڈ پر اُردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

فرائیڈ کے WORKS مکمل صورت میں انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔ سٹریچی نے ایک ٹیم کی مدد سے یہ فقیدالمثال کام کیا ہے۔ راشاعتی ادارے پیلیکن نے فرائیڈ لائبریری کے عنوان سے فرائیڈ کی اہم تصانیف چھاپی ہیں۔

فرائیڈ پر بیشتر ایسے الزامات لگائے گئے ہیں جن کا فرائیڈ کے نظریات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور بہت سے ایسے الزامات ہیں جو علمی اور سائنسی اعتبار سے بے معنی اور بے کار ہیں۔ بہت سے اختلافات جو علمی اور سائنسی سطح پر کیے گئے ہیں یقیناً ان میں معنویت اور وزن موجود ہے۔ ایڈلر ژونگ اور رائخ کے اعتراضات اور ان کے اپنے افکار کا مطالعہ بھی فرائیڈ شناسی کے لیے ناگزیر ہے۔

فرائیڈ کے بارے میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ اس نے جنس کو انسانی زندگی کا محور و مرکز بنا دیا یقینی امر ہے کہ فرائیڈ نے جنس کو بے حد اہمیت دی ہے لیکن اس میں مبالغہ کا عنصر شامل نہیں ہے اور فرائیڈ کے نظریات و افکار محض جنس تک ہی محدود نہیں ہیں۔ فرائیڈ کی اہم کتابوں کے ذکر کے ساتھ مختصراً ان کے مباحث و تحقیقات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

نیوانٹرڈکٹری لیکچرز جس کو ہم نے دنیا کی سو عظیم کتابوں میں شامل کیا ہے۔ یہ وہ لیکچرز ہیں جو کچھ تو اس نے ۱۹۱۵ء - ۱۹۱۶ء میں دی آنا میں دیے تھے اور بیشتر وہ لیکچرز ہیں جو صرف کتابی صورت میں ہی شائع ہوئے۔ ان لیکچرز میں فرائیڈ نے اس کے مختصر دیباچے میں خود لکھا ہے کہ یہ نئے لیکچرز ابتدائی لیکچرز کا نعم البدل نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کی جگہ لے سکتے ہیں اور ابتدائی اور بنیادی موضوعات کو نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

ان لیکچروں میں خواب کے نظریے خواب اور اصنام و توہم پرستی، نسوانیت، تفکر و پریشانی اور ذہنی امور کو موضوع بنایا گیا ہے اور اصل مرکز تحلیل نفسی اور اس کے مبادیات اور تقاضے۔

فرائیڈ نے لاشعور کی دریافت کے بارے میں کہا ہے کہ دنیا کے بعض بڑے اور خلاق شاعروں اور ادیبوں کے ہاں اس کا سراغ ملتا ہے لیکن وہ سائنسی سطح پر اس کی صراحت نہ کر سکے۔ فرائیڈ نے تحلیل نفسی کے حوالے سے لاشعور کی دریافت کے بعد اپنی تحقیقات کو جاری رکھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے تمام عوامل اور محسوسات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک

انسانی زندگی چار اشیا کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ لاشعور ، انا ، فوق الانا اور اصولِ حقیقت۔

جنس بہر حال حیاتیاتی ضرورت ہے۔ صدیوں سے اسی کے ذکر کو گناہ اور ممنوع قرار دیا گیا اس سے انسان کی نفسی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہوئی۔ اس بڑی حقیقت کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ سماج مذہب اور نام نہاد اخلاقیات نے اس کو کچلنے اور مسلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ فرائیڈ جب اپنی تحقیقات کو انجام تک پہنچاتا ہے تو وہ پوری جرأت سے حقیقت منفی عوامل پر جو صدیوں پر محیط کرتا ہے تنقید کرنا اس وجہ سے بھی اسے مطعون کیا گیا کہ وہ رائج اور قدیم خیالات و افکار کی قلعی کھول رہا تھا۔

فرائیڈ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی حقیر اور معمولی سی چیز بھی بے معنی نہیں ہوتی ۔ انسان اپنی پوری سی کوشش بھی کرے تو بھی اس سے کوئی مہمل اور بے معنی بات یا حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔ انسانی زندگی کا ہر لمحہ اس کو بناتا یا بگاڑتا ہے۔ اور بعض لوگوں کے بڑے کارنامے بھی ان کی شخصیت کو نمایاں نہیں کر سکتے۔ جبکہ ان کی معمولی سی بات اور حرکات اس کی شخصیت کی کلید بن جاتی ہے۔ انسان کا ہر فعل اور عمل ہر نکر اس کی نفسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک کسی شخص کے افکار کا گہرا تعلق اس کی بدحواسیوں اور خوابوں سے بھی ہوتا ہے۔

فرائیڈ نے انسانی شخصیت کو سمجھنے کے لیے جو طریقہ اختیار کرتا ہے اسے آزاد تلازمہ کہا جاتا ہے۔ فرائیڈ تحلیل نفسی کے لیے اپنے معمول یا شخصیت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے جذبات ، احساسات اور خیالات کو بیان کرتا چلا جائے۔ یوں ایسے شخص کی پرانی دبی ہوئی خواہشات اور واہموں کی یادیں شعوری سطح پر نمایاں ہو جائیں گی۔ فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ ذہنی امراض یا عصبی انتشار کی وجوہات وہ اثرات ہیں جو اس نے بچپن میں قبول کیے تھے۔ فرائیڈ کے نظریات کے مطابق شخص تحلیل نفسی کے درمیان سچ بولنا چاہتا ہے لیکن داخلی مزاحمت اسے روکتی ہے۔

یہ منفی مزاحمت فرائیڈ کے نزدیک ان خارجی عوامل کی پیداوار ہے جو بچپن میں اس پر اثر انداز ہوئے تھے۔ یوں مریض لاشعور میں چھپی پیچیدگیوں کو شعوری سطح پر لا کر قدرے صحت مند ہو جاتا ہے۔

تحلیل نفسی کے حوالے سے فرائیڈ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس بات پر زور دیا تھا کہ محض دبی ہوئی خواہشات کا احساس دلانا ہی ضروری نہیں بلکہ انا کی تعلیم و تربیت بھی ناگزیر ہے۔

فرائیڈ لاشعور کو جبلی آرزوؤں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ ان میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وہ فی الفور تسکین چاہتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جس سے الم پیدا ہوتا ہے۔ اور تسکین کے لیے وہ تخیل سے مدد لیتا ہے لیکن واہمہ کی تمثال خارجی دنیا کی حقیقت سے تطابق پیدا نہیں کر پاتی۔ اس سے نفسی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں انسانی آرزوؤں میں سے بہت سی آرزوئیں ایسی ہیں جنہیں سماج پسند نہیں کرتا اسے مذموم قرار دیتا ہے اس لیے ایسی آرزوؤں کو دبانا پڑتا ہے لیکن وہ مٹتی یا مرتی نہیں ہیں بلکہ لاشعور میں چھپ جاتی ہیں اور اسی سے انسانی شخصیت بگڑتی ہے اور اس سے ذہنی اور نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں۔ اس کے لیے تحلیل نفسی ہی وہ طریقۂ کار ہے جس سے انسان کو صحت مند بنایا جا سکتا ہے۔

تحلیل نفسی۔ سائنس ہے اور فرائیڈ کو بھی یہ پسند نہ تھا کہ اسے فلسفی سمجھا جائے وہ اپنے آپ کو سائنسداں کہتا تھا تحلیل نفسی کے حوالے سے۔ نفسیات کو سائنس کا درجہ دیکر فرائیڈ نے انسانی کائنات کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ادب، علم، تہذیب، سماج پر فرائیڈ کے اثرات بہت گہرے ہیں بیسویں صدی اس کے فکر و نظریے سے تشکیل پائی ہے۔ فرائیڈ سے تمام اختلافات ایک طرف لیکن لاشعور کی دریافت ایک طرف اور تحلیل نفسی اور نفسیات کو سائنس بنانا۔ اس کا وہ کام ہے جو انسانی معاشروں اور علوم پر ہمیشہ اثر انداز ہوتا رہے گا۔

•

میموریز۔ ڈریمز ری فلیکشنز

ژونگ کے حوالے سے اس کی بعض دیگر کتابوں کو نظر انداز کر کے میرا اس کتاب کو دنیا کی سو عظیم کتابوں میں انتخاب کرنا، ژونگ کے بہت سے مداحین، قارئین اور ناقدین کے لیے تعجب اور اختلاف کا باعث ہو سکتا ہے۔

مثلاً ایک اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اہم ترین تصانیف "آرکی ٹائپس اینڈ دی کولیکٹو ان کونشنس" یا "سمبلز آف ٹرانسفارمیشن" وغیرہ جیسی کسی کتاب کو دنیا کی سو عظیم کتابوں میں شمار کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال اگر میں نے ژونگ کی کتاب "یادیں، خواب اور عکس" کو دنیا کی سو عظیم کتابوں میں سے ایک سمجھا ہے اور اسے اپنی فہرست میں شامل کیا ہے تو اس کی کچھ وجوہات بھی ہیں۔

ژونگ کے COLLECTED ورکس کی برطانیہ اور امریکہ میں اشاعت ہو چکی ہے ژونگ کا کام بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (میں روٹلج ایڈیشن کا حوالہ دے رہا ہوں۔) ایک ایک جلد میں اس کی کئی کئی چھوٹی بڑی کتابیں اور مقالے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ناشروں نے اس کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ اور انفرادی حیثیت میں بھی شائع کیا ہے۔ جن کی تعداد کئی درجنوں تک پہنچتی ہے مگر اس کی یہ کتاب میموریز، ڈریمز، ری فلیکشنز جو ژونگ کی خود نوشت ہے (خاص انداز میں مکمل اور مرتب کی گئی) اس کتاب کو اس کی کلیات میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی حیثیت اپنی پہلی اشاعت سے اب تک بالکل آزادانہ اور انفرادی سمجھی گئی ہے۔

ژونگ کی اس کتاب کو اگر میں نے دنیا کی سو عظیم کتابوں میں سے ایک کی حیثیت دے کر اپنے اس سلسلہ مضامین میں شامل کیا ہے تو اس سے ژونگ کی اہم کتابوں کو نظر انداز کرنا یا ان کی قیمت

سے انکار مقصود نہیں ہے اگر "میموریز، ڈریمز، ری فلیکشنز" کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو اس کی کچھ معقول وجوہات ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو قاری ژونگ کی شخصیت اس کی فکر کے ارتقا، اس کے نظریات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ اس کتاب میں یقیناً ژونگ کے مہتم بالشان کام کے بارے میں تفصیلات موجود نہیں ہیں لیکن جس ایجاز اور اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ معنی کے اعتبار سے اتنا وسیع اور نتیجہ خیز ہے کہ ہم خود ژونگ اور نفسیات میں اس کی عطا اور اختراع کے بارے میں تمام بنیادی معلومات سے متعارف ہو جاتے ہیں اس کتاب کا مطالعہ ترغیب دیتا ہے کہ ژونگ کے نظریات کو تفصیل سے پڑھا جائے اور اس کے نظام فکر کا زیادہ دلچسپی اور انہماک سے مطالعہ کیا جائے۔

جی۔ بی۔ پریسٹلے نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا تھا۔ "اس کا کام وسعت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ وہ انسانی روح کے بطون کا سب سے بڑا فزیشن تھا۔ اس نے جو نتائج اخذ کیے، اس نے اسے ایک پر جوش درویش کا مقام بخشا۔

فرائیڈ کے بعد جس نفسیات دان کو اپنی زندگی میں ہی بقائے دوام حاصل ہوئی وہ ژونگ ہے ایڈلر وغیرہ بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن فرائیڈ کے مقلدوں، اس کے شاگردوں اور پھر اس سے انحراف کر کے نفسیات کے علم کو نئی گہرائیوں، نئی معنویت سے ہمکنار کرنے والے میں فرائیڈ کے بعد ژونگ ہی سر فہرست دکھائی دیتا ہے۔ ژونگ نے جو نظریات دیے ان کے پھیلاؤ کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ عالمگیر سطح پر اس کے ماننے والے موجود ہیں ژونگ کا ایک اپنا دبستان نفسیات ہے فلپ ٹائن بی نے تو ژونگ کو کیر کیگارڈ اور نطشے کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔

"میموریز، ڈریمز، ری فلیکشنز" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اس کتاب کے حوالے سے ہم دنیا کے اس عظیم ترین نفسیات دان ژونگ کے باطن میں جھانک سکتے ہیں یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ژونگ خود کیا تھا اور اس کا کام کس درجے کا ہے یہ کتاب بلاشبہ ایک حیران کن، منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ژونگ کے تمام نظریات سے ہم متعارف ہو سکتے ہیں اور خود ژونگ کو بھی بہت قریب سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

ژونگ نے خاصی طویل عمر پائی اور اپنی زندگی کے اختتام کے قریب تک وہ اپنے مداحوں شاگردوں، ناشروں اور قارئین کے پرُزور اصرار کے باوجود اپنی خودنوشت قلم بند کرنے سے انکار کرتا رہا۔ ژونگ کا خیال تھا کہ کوئی شخص اپنے بارے میں پورا صحیح بیان کرنے کی صلاحیت اور جرأت نہیں رکھتا بہرحال، ۱۹۵۷ء میں وہ یادداشتیں قلم بند کروانے کے لیے تیار ہوگیا اس کام کے لیے۔ اس نے اپنی ایک دوست اور نائب اینیلا جیف کا چناؤ کیا وہ بولتا جاتا اور دوسرے ضروری مستند مواد کے ذریعے اینیلا جیف اسے مرتب کرتی جاتی۔ ژونگ خود اس کام کی نگرانی کرتا تھا۔ جلد ہی وہ اس کام میں اتنی دلچسپی لینے لگا کہ اس نے خود ہی اپنی زندگی کے واقعات کو قلم بند کرنا شروع کردیا۔ ژونگ نے خود بتایا کہ اس کے دوسرے اہم کاموں کی طرح ایک خواب اس کا محرک بنا اور اس نے خود ہی اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ژونگ کا انتقال ہوا اور اس وقت تک یہ مسودہ مکمل ہوچکا تھا اور اس کا بڑا حصہ خود ژونگ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا یہی مسودہ جس کو پہلے اینیلا جیف نے ریکارڈ کیا اسے اینیلا جیف نے ہی مرتب کیا اور پہلی بار ۱۹۶۲ء میں اسے شائع کروایا تب سے اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

ژونگ کی شخصیت اس کے نظریات اور اس کی نفسیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں خاصا مواد بھی موجود ہے۔ ژونگ نے اس کتاب میں بعض ایسے امور اور موضوعات پر بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے جو اس سے پہلے اس نے اپنی کسی کتاب میں شامل نہ کیے تھے۔ اس کتاب میں وہ انسان اور خدا کے تعلقات، عیسائیت، تثلیث اور حیات بعدالممات کے بارے میں اپنے خاص نظریات کا اظہار کرتے ہوئے ملتا ہے۔

یہ کتاب اس انداز کی خودنوشت تو نہیں ہے جو عام طور پر رائج ہے اس کی ہیئت اور اسلوب جداگانہ ہیں۔ جرمن زبان، جس میں یہ لکھی گئی ہے اس میں اس کا کیا ذائقہ ہے اس کے بارے میں تو کچھ عرض کرنے سے قاصر ہوں مگر وہ لوگ جنھوں نے جرمن زبان میں رچرڈ اور کلارا ونسٹن کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف ایک خاص مقام کی حامل ہے۔

اس کتاب پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ژونگ کے بارے

میں اُردو میں ہونے والے ایک اہم کام کا ذکر کروں۔ ژونگ کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اُردو میں ایک ہی کتاب ہے اور وہ کتاب خاصے تقاضے پورے بھی کرتی ہے اس کا نام تحلیلی نفسیات ہے اور اسے ڈاکٹر محمد اجمل نے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں نفسیات ژونگ کے باب میں یہ کتاب بہت اہم ہے۔ اور اُردو کے قارئین اس کتاب کے حوالے سے ژونگ کے نفسیاتی نظریات سے پوری طرح واقف اور متعارف ہو سکتے ہیں۔

"میموریز، ڈریمز، ری فلیکشنز" بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک باب خاتمۂ کلام سے متعلق اس میں ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں ژونگ کے نام فرائڈ کے کچھ خطوط اور ژونگ کے نام ژونگ کا ایک خط جو شمالی افریقہ سے لکھا گیا اور رچرڈ ولہیم کے بارے میں ایک نوٹ بھی شامل ہے۔

پہلا باب "ابتدائی برس" کے نام سے ہے اس میں ژونگ بتاتا ہے کہ اس کی یادوں کا سلسلہ دو تین برس کی عمر سے جا ملتا ہے۔ اس کے بعد اگلے باب میں "سکول گزرنے والے برس" کا ذکر کرتا ہے۔ تیسرا باب "طالب علمی کا دور" ہے۔

چوتھے باب میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح وہ تحلیلی نفسیات کی طرف راغب ہوا اور اس ضمن میں اس کی ابتدائی سرگرمیاں کیا ہیں۔

پانچویں باب فرائیڈ کے بارے میں فرائیڈ کے ساتھ تعلقات اور عقیدت مندی کا آغاز اس کے نظریات کے بارے میں ژونگ کی رائے، امریکہ کے سفر کا احوال اور پھر فرائیڈ کے ساتھ نظریاتی اختلاف کا آغاز اور تعلقات کا خاتمہ موضوع بنے ہیں یہ باب اپنے اعجاز و اختصار کے باوجود ان تمام تعلقات اور نظریاتی اختلافات پر روشنی ڈالتا ہے جو فرائیڈ اور ژونگ کے درمیان تھے اس باب میں ژونگ نے فرائیڈ کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کو پرکھا ہے اس کا مطالعہ فرائیڈین اور ژونگ کے دبستان نفسیات سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے فرائیڈ جو ژونگ کو اپنا بیٹا اور اپنا جانشین قرار دیتا تھا اس کے بارے میں ژونگ کی رائے بہت اہم ہے۔ اس باب میں اس خواب کا بھی تفصیل سے ذکر ہے جو سفر امریکہ کے دوران ژونگ نے دیکھا تھا اور فرائیڈ نے اس کی جو نفسیاتی تعبیر بتائی تھی وہ ژونگ اور فرائیڈ کے درمیان نظریاتی اختلافات کا سنگِ بنیاد بنا۔

چھٹا باب لاشعور سے تصادم، پر ہے اس باب میں ژونگ نے اپنے تجربات اور نتائج کا ذکر کیا ہے۔ جن کی وجہ سے اس کا مشہور نظریہ لاشعور وجود میں آیا۔ ساتویں باب کا عنوان WORKS ہے جس میں ژونگ نے اپنے کام کا جائزہ لیا ہے۔ آٹھواں باب "ٹاور" ہے جو ژونگ کی زندگی اور شخصیت کے ایک اہم حصے کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔ نواں باب ان ملکوں اور علاقوں کے سفر، ان کے مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہے جنہوں نے ژونگ کے نفسیاتی نتائج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس باب میں شمالی افریقہ، امریکہ یا پیلوا انڈینز، ہندوستان اور راونیا اور روم کے سفر کا ذکر ہے۔ اس باب کا مطالعہ ژونگ کے ذہن، مشرقی علوم اور اجتماعی نفسیات سے اس کی دلچسپی اور اس کے اخذ کردہ نتائج کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ دوران سفر اس نے جو خواب دیکھے ان کا نفسیاتی تجزیہ بہت ہی معنی خیز ہے۔

دسواں باب VISIONS کے نام سے ہے۔ گیارہواں باب "زندگی موت کے بعد" اور بارہواں باب "بعد کے خیالات" پر مشتمل ہے۔

فرائیڈ اور ژونگ کے نفسیاتی اختلافات اور ان کے نتائج میں جو بُعد اور فرق ہے اس کا بھرپور احساس اسی کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات پر مدلل تنقید کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ فرائیڈ نے جنس کو محور و مرکز قرار دیا تھا۔ ژونگ کو اس سے شدید اختلاف ہے۔

خوابوں کے اثرات جو انسان کی نفسیات اور ذہن پر ہوتے ہیں۔ اس کے حوالے سے وہ فرائیڈ کو پورا کریڈٹ دیتا ہے۔ کیونکہ فرائیڈ نے ہی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا۔ لیکن فرائیڈ خوابوں کی تعبیر جس انداز میں کرتا ہے اس سے ژونگ کو شدید نظریاتی اختلاف رہا۔ جس کا بہت مناسب اظہار اس کتاب میں ملتا ہے

مذہب کے بارے میں بشارتوں کے حوالے سے روحانیت کے موضوع پر فرائیڈ نے جو نتائج پیش کیے ان سے بھی ژونگ کو شدید نظریاتی اختلاف تھا۔ ژونگ کے ہاں سماج، معاشرے اور سماجی عوامل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا فقدان فرائیڈ کے نظریات میں ملتا ہے۔ مذہب، بشارتوں اور روحانی تجربات کے بارے میں فرائیڈ کا ردیہ۔ ژونگ کے اخذ کردہ

نتائج سے بالکل مختلف ہے۔ ژونگ روحانیت، بشارتوں اور مذہب کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ ملحد اور مادہ پرست نہیں ہے۔ جیسا کہ فرائیڈ تھا۔ اس کتاب میں "ON LIFE AFTER DEATH" والا باب بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے ژونگ کی اپنی شخصیت ہی سامنے نہیں آتی بلکہ فرائیڈ اور اس کے اپنے مزاج میں جو فرق ہے وہ بھی نمایاں ہوا ہے فرائیڈ مطلق العنانیت اور خاص اجارہ دارانہ علمی تکبر کا مالک تھا۔ ژونگ کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ فرائیڈ اپنی علمی تحقیقات کے نتائج کو بھی اپنی من مانی اور ذاتی شکل دینے کا قائل تھا۔ اس کے برعکس ژونگ فراخدل، منکسرالمزاج اور تحقیق کے نتائج کا تابع دکھائی دیتا ہے۔

ژونگ اور فرائیڈ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ فرائیڈ اور ژونگ کے درمیان جو طویل خط و کتابت تعلقات کے آغاز اور خاتمے کے دوران تک ہوتی رہی وہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ فرائیڈ کو جو مقام اور اولیت حاصل ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خود ژونگ نے جس انداز میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ مگر تحلیل نفسی کے علم میں ژونگ کا اضافہ بے بہا ہے۔ انہوں نے انسانی ذہن کے ساتھ انسانی روح کو بھی سمجھنے اور سمجھانے کی جو سعی کی ہے وہ انسانی علوم اور بالخصوص نفسیات میں ایسی تبدیلیوں اور انقلابات کا باعث بنا جس نے اجتماعی انسانی سوچ کو ہی نہیں بلکہ زندگیوں اور عالمی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ میموریز، ڈریمز، ریفلیکشنز ایک طویل انسانی سفر کی روداد ہے اور مسافر ژونگ ہے۔ اس کتاب کے ابتدائیے کا پہلا جملہ ژونگ نے یوں لکھا ہے:

"MY LIFE IS A STORY OF THE SELFREALISATION OF UNCONSCIOUS."

اور جن جملوں پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔ انہی جملوں پر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"جب لاؤ تزے کہتا ہے "سب کچھ صاف اور شفاف ہے اور میں بھی ہوں کہ جس پہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تو وہ اس امر کا اظہار کرتا ہے جسے میں اب اپنی بڑھتی ہوئی آخری عمر میں محسوس کر رہا ہوں۔ لاؤ تزے ایک ایسے آدمی کی مثال ہے جو برتر بصیرت کا حامل ہے۔ جس

نے کارآمد اور بے کار اشیاء کو دیکھا اُن کا تجربہ کیا ہے اور جو اپنی زندگی کے اختتام پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ پھر اپنے وجود کی طرف پلٹ سکے۔ ابدی نامعلوم علم کو پا سکے بزرگ آدمی کا یہ آرکی ٹائپ جس نے بہت کچھ دیکھا۔ ابدی حقیقت ہے۔ ذہانت کی ہر سطح پر یہ ٹائپ اپنا ظہور کرتا ہے اور اس کی مشابہات ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کوئی بوڑھا انسان ہو یا لاؤ ترزے جیسا عظیم فلسفی۔

اب میں بڑھاپے کی عمر میں ہوں اور اس کی اپنی حد ہوتی ہے لیکن اب بھی بہت کچھ ہے جو میرے اندر کے خلاء کو بھرتا رہتا ہے۔ پودے، جانور، بادل، دن اور رات اور وہ ابدیت جو انسان کے اندر ہے اپنے بارے میں جتنا غیر یقینی محسوس کرتا ہوں اتنا ہی میرے اندر تمام اشیاء کے ساتھ گہری قرابت داری کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ منافرت جس نے مجھے دنیا سے ایک طویل عرصے تک بیگانہ رکھا۔ وہ اب میری اپنی داخلی دنیا میں منتقل ہو گئی ہے اور اس سے مجھ پر اپنی ذات کے ساتھ غیر متوقع عدم آشنائی کا کشف ہوا ہے۔"

پلگرمز پراگریس

انسان کی زندگی میں بڑی بڑی ناقابل یقین تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ خدائے کردگار کے کرشمے ہیں کہ بہت پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ دانائی اور بصیرت نہیں بخشتا جس کی ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں سے توقع رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ بے پناہ بصیرت اور دانائی ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتا ہے جو تعلیمی اعتبار سے صفر ہوتے ہیں۔

میں نہیں جانتا ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے اپنے عقیدے سے وابستہ رہتے ہوئے بھی ایسے عقیدے کے حامل لوگوں کی بصیرت سے بلا تعصب فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن یقینی بات ہے کہ دنیا بے تعصب لوگوں سے خالی نہیں۔ اور پھر ہم جو دائرہ اسلام میں شامل ہیں اس کے لیے تو خاص ہدایت ہے کہ ہمیں جہاں سے علم اور دانائی ملے ہم لے سے حاصل کرلیں۔

جان بنین ایسا ہی شخص تھا جو تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی ہی کتاب لکھی ہے جو ہر عقیدے کے انسان کو متاثر اور فیض یاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب جان بنین کے اپنے ذاتی عقیدے اور روحانی واردات میں ڈوبی ہوئی ہے پلگرمز پراگریس ایک ایسا شاہکار اور فن پارہ ہے جسے نقادوں نے THE PERFECT ALLEGORY کا نام دیا ہے۔

جان بنین جس نے ایک "پرفیکٹ الیگوری" کو تخلیق کیا۔ جس کی تصنیف دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک ٹھٹھیرا تھا۔ دھات کے برتنوں کو جوڑ اور ٹانکے

لگانے والا اور اس نے کسی مکتب، کسی مدرسے میں تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ یہ چھوٹی ذات کا آدمی ایلسٹو (انگلستان) میں ۱۶۲۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بھی ٹھٹھیرا تھا۔ اسے ورثے میں یہی ہنر ملا جو اس نے اپنے باپ سے سیکھا۔ جان بنین کا باپ ایک ایسا شخص تھا جس کی کوئی عزت نہ تھی۔ وہ آوارہ منش اور نادار تھا۔ البتہ میکالے کا خیال ہے کہ جان بنین کا باپ اس اعتبار سے اپنے طبقے کے ان گنت لوگوں سے بہتر تھا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھا بلکہ اس کی ایک مستقل رہائش گاہ تھی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن جس زمانے میں جان بنین پیدا ہوا۔ اس زمانے میں ٹھٹھیروں کا کوئی گھر گھاٹ نہ ہوتا تھا۔ وہ گلی کوچوں، بازاروں میں گھومتے، آوازیں لگاتے، کام کرتے اور پھر جہاں رات آتی، سو جاتے۔ ان کو آوارہ گردوں چوروں اور اٹھائی گیروں کی صف میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

ایسے ماحول میں جنم لینے اور پروان چڑھنے والے فرد میں ہر برائی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسا ہی جان بنین کے ساتھ ہوا۔ لڑکپن کے بعد اس کا جوانی کا زمانہ برائیوں اور گناہوں سے آلودہ ہوا۔ شاید ہی ایسی کوئی برائی ہو جس کا جان بنین نے ارتکاب نہ کیا ہو۔ تاہم بعض محققوں اور ناقدوں کا یہ خیال ہے کہ جان بنین نے عجز و انکسار اور خالص مذہبی سطح کے حوالے سے اپنی برائیوں اور گناہوں کے گنوانے میں خاصے مبالغے سے بھی کام لیا ہے۔

جب انسان کا قلب بدلتا ہے اس کا ضمیر عدا بیدار کرتا ہے تو انسان پہلا کام یہ کرتا ہے کہ وہ اپنا احتساب کرتا ہے۔ اپنے آپ کو مجرم اور گناہ گار سمجھتے ہوئے گناہوں اور جرائم سے توبہ کرتا ہے۔ جب جان بنین پر یہ لمحہ آیا تو اس نے بھی اپنی پرانی زندگی اور اس کی تمام عادات، دلچسپیوں اور مشاغل کو ترک کر دیا۔ وہ اس کے بعد ہمیشہ اپنے آپ کو عاصی سمجھتا رہا۔ پرانے گناہوں اور برائیوں کا احساس ساری عمر اس پر آسیب کی طرح مسلط رہا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۶۴۴ء میں یا اس کے قرب و جوار میں جان بنین کرامویل کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور وہ تقریباً دو برس تک فوجی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کا ذہن علم و فنون کے اثرات سے پاک اور صاف تھا۔ اس نے الیگوری (تمثیل) کے پردے میں سب کچھ کہا ہے۔ اس کے ہاں جنگ کے حقیقی معنی یہ بنتے ہیں۔ گناہ کے ساتھ انسانی کشمکش

فوجوں کی پیش قدمی اس کے ہاں حقیقی انداز میں انسان کا روحانی سفر بن جاتی ہے۔ اس کے ہاں تشبیہہ و تمثیل اور علامتوں کی بہتات ہے۔ وہ ہر چیز کو تمثیلی انداز سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ "پلگرمز پراگریس" اسی لیے آج بھی دنیا کی بڑی کتابوں میں شامل کی جاتی ہے کہ اس کے تمثیلی اظہار میں ایک ایسی "آزادی" ہے جس میں ہر عقیدے کا شخص اس سے اپنے اپنے معنوں میں فیض یاب اور لطف اندوز ہو سکتا اور ایک بڑے ذہنی تجربے سے گزر سکتا ہے۔ "پلگرمز پراگریس" کے پڑھنے والا ہر ذہین قاری یہ محسوس کرتا ہے اس میں جو کچھ دکھایا اور بیان کیا گیا ہے وہ لامحدود ہے۔ جان بنین کسی چیز کو اس کی "حدود" میں نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہی اس کے ہاں آپ کو مفہوم سمجھنے کے لیے لغوی معنوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی پڑھنے والا لغوی اعتبار سے "پلگرمز پراگریس" کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے کبھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ "پلگرمز پراگریس" اس اعتبار سے بھی دنیا کی منفرد تصنیف ہے کہ یہ ایک "مکمل الیگوری" ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے تمثیل کے پردے ہٹا کر اندر سے اس کے باطن میں دیکھنے اور محسوس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس تمثیلی انداز نے جان بنین کی کتاب "پلگرمز پراگریس" کو ایک بے مثل اور لازوال داستان بنا دیا ہے۔

جان بنین فوج کے فرائض سے سبکدوش ہوا تو اس نے ۱۶۴۸ء میں شادی کر لی۔ اس نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو بقول اس کے GOLLY BOOKS کی مالک تھی۔ اور وہ اس کی زندگی پر گہرا انمٹ اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں جان بنین اپنی بیوی کے ساتھ بیڈ فورڈ منتقل ہو گیا۔ اس کی ازدواجی زندگی مختصر تھی۔ یہاں ۱۸۵۵ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جان بنین مذہب میں بے حد دلچسپی لینے لگا تھا۔ مذہبی عقیدے کے اعتبار سے وہ غیر مقلد NON CONFORMIST تھا۔ اس کی بیوی بھی اسی عقیدے پر ایمان رکھتی تھی۔ لیکن جان بنین کے دل میں شکوک و شبہات اور فاسد خیالات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ شدید قسم کے روحانی بحران سے دوچار رہا۔ وہ اپنے ضمیر کے کوڑے سہہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں اپنے گناہوں کو مجسم دیکھتا۔ اپنی گم شدہ روح کو

خیالوں میں دیکھتا ۔ روحانی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ اور اس کی صحت تباہ ہوکر رہ گئی وہ یادوں
کی دنیا میں سانس لے رہا تھا لیکن پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس نے مذہبی تبلیغ کا
آغاز کر دیا ۔ ۱۶۵۷ء کا واقعہ ہے ۔ وہ فاضل عالم اور پڑھا لکھا نہیں تھا ۔ اس کا سارا
علم اس کے تجربے کی دین تھا ۔ اور جو کچھ وہ بیان کرتا اس کے لیے جو الفاظ کا استعمال کرتا
وہ خطیبانہ ہوتے نہ فاضلانہ ۔ بلکہ سیدھے سادے اور کھردرے ۔ آہستہ آہستہ لوگ اس
کی تعلیمات سے متاثر ہونے لگے ۔ اور اس کی طرف کھنچنے لگے ۔ اس کی شہرت پھیلتی گئی
اب سینکڑوں لوگ اس کا وعظ سننے آتے ۔ اس کی کھردری زبان میں بھی ایسا ولولہ اور
ایسی آگ تھی کہ لوگ اس کا وعظ سن کر لرزنے لگتے ۔

برطانیہ میں جب بادشاہت بحال ہوئی تو چارلس دوم نے آزادیٔ اظہار پر پابندیاں
لگانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں اس نے حکم دیا کہ ریاست کے مذہب پر یقین رکھنے
والے مقرر کیے ہوئے سند یافتہ مبلغ ہی وعظ کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں ۔ ایسے لوگ جو
سرکاری کلیسا سے وابستہ نہ تھے ، سند یافتہ نہ تھے ، ان پر وعظ و تبلیغ کی پابندی لگا
دی گئی ۔ لیکن جان بنین ہمت ہارنے والا آدمی نہ تھا ۔ وہ بہت جری اور جرأت مند تھا ۔
اس پابندی کے بعد اس نے پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش ، ولولے اور جرأت
مندی کا اظہار کرتے ہوئے تبلیغ و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا ۔ نتیجہ وہی نکلا جو ایسی کشمکش
میں لازمی ہوتا ہے ۔ جان بنین کو بیڈفورڈ جیل میں قید کر دیا گیا ۔ جہاں وہ بارہ برس تک
قید رہا ۔ جیل میں جانے سے پہلے وہ دوسری شادی کر چکا تھا ۔ اس کے بچے بھی تھے اس
نے جیل میں رہتے ہوئے بھی اپنے بیوی بچوں کی کفالت کی ۔ وہ اچھا دستکار تھا دستکاری
سے جو ملتا وہ بیوی بچوں کی کفالت پر اٹھا دیتا ۔ بارہ برس کی قید کے زمانے میں اس کو
صرف دو کتابیں ہی پڑھنے کو ملیں ایک بائبل اور دوسری فاکس کی کتاب مارٹرز (شہید)
۱۶۶۰ء میں جان بنین کو قید خانے میں ڈالا گیا تھا ۔ ۱۶۷۲ء میں وہ آزاد ہوا ۔ لیکن اس
کے بعد اسے ایک بار پھر جیل جانا پڑا ۔ اگرچہ اس بار قید کی مدت مختصر تھی ۔ !

عالمی ادب میں اور خود ہماری اردو زبان میں بھی ایسی بہت سی شاہکار اور یادگار

کتابیں جو جیل میں لکھی گئیں۔ جان بنین کی کتاب "پلگرمز پراگریس" بھی ایسے ہی عظیم فن پاروں میں سے ایک ہے جو جیل میں لکھے گئے بعض نقادوں نے بہت حد تک درست کہا ہے کہ اگر جان بنین کو زندان کے حوالے نہ کیا جاتا تو اغلباً وہ اپنا یہ شاہکار کبھی لکھ نہ سکتا جب یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تو لوگوں نے اس پر خاص توجہ نہ دی۔ اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو پھر اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا گیا۔ اس میں دشواری وہی آن پڑی تھی کہ اس کے سمجھنے کے لیے خاص ذوق اور قدرے سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی۔ سرسری انداز میں پڑھی جانے والی یہ کتاب نہیں ہے۔ "پلگرمز پراگریس" کا پہلا ایڈیشن ۱۶۷۷ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۶۷۸ء میں شائع ہوا۔ "پلگرمز پراگریس" روح کی ترقی اور سفر کا عجیب و غریب ڈرامہ ہے۔ روح مقدس شہر کی طرف محو سفر ہے۔ سفر میں بڑے بڑے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ جان بنین نے تمثیلی انداز میں جو کردار تخلیق کیے وہ آج آسانی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جان بنین کے حوالے سے ALLUSIONS, AB IDE, GREAT HEART GIA-NT DESPAIR, THE SLOUGH OF DESPOND. ایسے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے شیکسپیئر کی بعض تشبیہات و تراکیب۔ اسی طرح جس تجسیمی انداز میں جان بنین نے "سکرپچر"، "فیلنگز"، "امپلسز" وغیرہ الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کو تجسیمی انداز ہی میں انگریزی زبان میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

جان بنین کا انتقال ۳۱ر اگست ۱۶۸۸ء کو لندن میں ہوا۔ اس کی موت تک اس کے عظیم شاہکار کے دس ایڈیشن شائع ہوچکے تھے۔ اس کی موت کے بعد یہ کتاب کتنی بار شائع ہوئی۔ اور کتنی زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کا کوئی شمار اور حساب نہیں۔ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں "پلگرمز پراگریس" کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اردو میں مجھے اس کے چند تراجم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن وہ سارے تراجم بے حد ناقص اور بے معنی تھے۔

جان بنین نے " پلگرمز پراگریس " کے علاوہ بھی چند کتابیں لکھیں۔ لیکن ان کتابوں کو وہ شہرت اور مقام حاصل نہ ہوا جو " پلگرمز پراگریس " کو ملا ہے۔ آج بھی انسانی روح کے اس ڈرامے کو پڑھا جائے تو اس کی معنویت آشکار ہوتی ہے۔ ہر بڑی کتاب کی طرح " پلگرمز پراگریس " میں بھی یہ صلاحیت اور سکت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے۔

ڈی سیڈ

٥٨

جسٹین

جب میں دنیا کی سو عظیم کتابوں پر مضامین لکھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا تو میرے لیے اس منصوبے پر عمل کرنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ میں پہلے ان سو کتابوں کی فہرست تیار کروں۔ جن کو میں واقعی دنیا کی عظیم ترین کتابیں سمجھتا ہوں۔ اس مرحلے کو طے کرنے میں کئی مشکل اور دشوار مقام آئے۔ انگریزی زبان میں بھی چند کتابیں ملتی ہیں جو دنیا کی عظیم کتابوں کا احاطہ کرتی ہیں لیکن ایسے انتخابات کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنف دنیا کا جو نقشہ بناتے ہیں اس میں افریقہ، ایشیا اور تیسری دنیا کے ممالک شامل نہیں ہوتے۔ اگر تحقیق اور غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو انسانی دانست اور فکر کی حامل اہم ترین کتابیں انہی خطوں کی تخلیق اور پیداوار ہیں۔ جن کا ذکر یہ مصنف نہیں کرتے۔ بہرحال میں نے سو کتابوں کا جو انتخاب کیا وہ سراسر میرے اپنے معیار اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں بہت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس معیار کے سلسلے میں میں ایسے دلائل رکھتا ہوں کہ اختلاف کرنے والے اصحاب کو بہت حد تک قائل کر سکتا ہوں۔

میں نے اس سلسلۂ مضامین کے حوالے سے ہر کتاب کو ایک بار پھر پڑھا۔ بعض مصنفوں کے حوالے سے بھی بڑی دقتیں پیش آئیں کہ ان کا کونسا کام شامل کروں اور کونسا ردّ کروں۔ اس سلسلے میں بھی میں نے ایک راہ یہ نکالی کہ مصنفوں کے حالات کے علاوہ ان کے کام کے بارے میں بھی قدرے تفصیل سے لکھوں تاکہ پڑھنے والوں کو اس مصنّف اور اس کے کام کے بارے میں کم از کم ایک بھرپور قسم کا تاثر مل سکے۔

بعض کتابیں جنہیں دنیا کی سو عظیم کتابوں میں شامل کرنے یا نہ کرنے پر مجھے بہت زیادہ غور و فکر سے کام لینا پڑا ان میں ایک کتاب وہ ہے جس پر اب آپ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یعنی مارکوئیس ڈی سیڈ کی کتاب " جسٹین "۔

مارکوئیس ڈی سیڈ کے بارے میں لوگ کتنی ہی کم معلومات کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اس کے حوالے سے نفسیاتِ جنس میں جو ایک اصطلاح رائج ہوئی ہے وہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ! " SADISM " کی اصطلاح جسے ہم اردو میں " سادیت " کہتے ہیں۔ فرائیڈ نے اس اصطلاح کو تخلیق کیا اور اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"THE INSTINCT OF DESTRUCTION IS PLACED DIRECTLY IN THE SEXUAL FUNCTION. THIS IS TRUE SADISM."

مارکوئیس ڈی سیڈ کی یہ کتاب ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بیک وقت انسان کو بہت کچھ سوچنے پر ہی مجبور نہیں کرتی بلکہ خوفزدہ بھی کر دیتی ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جنہیں پڑھ کر قاری اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ شدید ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے خواہ وہ موافقانہ یا مخالفانہ۔ "جسٹین" پڑھنے والوں کے لیے ایک دائمی تجربہ بن جاتی ہے۔ "جسٹین" کا ایک خاص مقام عالمی ادب میں یہ بھی ہے کہ اسے ممنوعہ کتابوں میں سرِ فہرست رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ہی وقت میں بے حد مقبول اور بے حد نامقبول اور رسوا سمجھی گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بے حد خوب صورت اور موثر ہے لیکن اس کا مواد بے حد گھناؤنا اور ناقابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے۔

ایک ایسی کتاب جو ایک عرصے تک مختلف ملکوں میں فحش سمجھی جاتی رہی۔ جس کی اشاعت کی اجازت نہ تھی جو ممنوعہ کتابوں میں سرِ فہرست ہو۔ ایسی کتاب کو جب میں سو عظیم کتابوں میں شمار کرتا ہوں تو یقیناً میرے پاس اس کا جواز موجود ہے۔

ایک تو یہی کہ خفیہ طور پر سہی۔ اس کتاب کو عالمگیر ریڈرشپ حاصل رہی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسے افسانوں کی کمی نہیں جنہوں نے نسل در نسل اس کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

اس کتاب کے خفیہ تراجم کئی زبانوں میں ہوئے۔

اپنی ادبی خوبیوں (قطع نظر مواد) کے باعث یہ کتاب ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتی ہے
مارکوئیس ڈی سیڈ کی اس کتاب کی ایک بڑی اہم خوبی یہ ہے کہ یہ ایک سچی کتاب ہے
اس کتاب میں اس نے اپنے تجربات کی پوری صداقت اور پوری صحت کے ساتھ بیان کیا ہے
اب اس کتاب پر جو بھی کوئی اعتراض کیا جاتا ہے اور جو سب سے بڑا اعتراض ہے۔
اس کے حوالے سے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

کہا جاتا ہے اور ایک مدت سے یہ رٹ لگائی جا رہی ہے یہ کتاب فحش ہے۔ اس کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے بڑے بڑے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود فحاشی ایک ایسی اصطلاح ہے جس پر ابہام کے پردے ابھی تک چھائے ہوئے ہیں۔ بہت سی ایسی کتابیں جنہیں ایک دور میں فحش قرار دیا گیا۔ اسی دور میں یا اس کے بعد ان کو عظیم ادب میں شمار کر لیا گیا۔

شیکسپیئر، اور پھر چاسر اور پھر اس کے بعد جیمز جوائس اور ہمارے ہاں منٹو کے بعد ان کے کتنے ہی فن پاروں پر فحش کا الزام لگا۔ لیکن وہ ادب کا بہترین حصہ قرار دیے گئے۔
میں نے اس کتاب کو اس لیے سو عظیم کتابوں میں شامل کیا ہے کہ مارکوئیس ڈی سیڈ کی یہ کتاب دراصل مغربی تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو پچھلے تیس چالیس برسوں میں شائع ہونے والے امریکی اور برطانوی ناولوں کا مطالعہ کیجیے۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی اور امریکی تہذیب جنسی اعتبار سے کیسے کیسے تجربات میں ملوث ہے۔ اور پھر جنسی اعمال کی جیسی گھناؤنی، تفصیلی اور بے رحم روئیداد بیان کی گئی اسکے سامنے تو مارکوئیس ڈی سیڈ کا یہ ناول مجھے ایک چھوٹے بچے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جو معصوم اور عریاں کھڑا ہے۔!

آج کے امریکی اور یورپی ادب کے علاوہ آج کے یورپی اور امریکی معاشرے کو سمجھنے کے لیے جسٹین سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب ہو۔ اگرچہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ لیکن اگر آپ امریکہ اور یورپ کے لوگوں کی جنسی اور نفسیاتی صورت حال کو سمجھنا چاہتے ہوں تو مارکوئیس ڈی سیڈ

کے ناول کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یہ چند معروضات جنہیں میں نے اختصار سے پیش کیا ہے۔ ان کی روشنی میں میں نے مارکوئیس ڈی سیڈ کے اس ناول کو دنیا کی سو عظیم کتابوں میں شامل کرنے کی جسارت کی ہے۔ اپنی اس جسارت پر مجھے ندامت ہے نہ ہی تفاخر کا احساس۔ کیونکہ یہ کتاب تھی ہی اتنی اہم کہ اسے عظیم کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

اس ناول کو سمجھنے کے لیے خود مارکوئیس ڈی سیڈ کی زندگی کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ وہ شخص ہے جو انسانی نفس اور جنس کی ایک اصطلاح بن کر ایک مدت سے زندہ ہے۔

مارکوئیس ڈی سیڈ کو انسانی تاریخ میں دنیا کا بدترین جنسی کجرو، فحش نگار، نیکی کا دشمن اور پاگل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ مفکر بھی تھا۔ خواہ اس کی فکر کو کتنا ہی بازاری اور عریاں کیوں نہ سمجھا جائے۔!

مارکوئیس ڈی سیڈ اور سیڈازم (سادیت) کے حوالے سے کتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا شمار ممکن نہیں۔ ڈیوِن بلوخ نے اس کے بارے میں لکھا تھا:

"وہ بدی کا نظریہ ساز تھا۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنے ناولوں میں یکجا کیا۔ انہیں انتہائی صحت اور صداقت کے ساتھ قلم بند کر دیا۔ اس کے اپنے تجربات اور مشاہدات محض اس کے اپنے نہ تھے۔ بلکہ اس دور کے معاشرے کی بھی عکاسی کرتے تھے۔ اس لیے اس کے تجربات اور تحریروں کی ایک فیصلہ کن کلچرل اور تاریخی اہمیت بنتی ہے۔"

ڈی سیڈ کی زندگی اور اس کا یہ ناول ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہے۔ جس میں جنسی کجروی، تشدد، ظلم و ستم کے عناصر چھائے ہوئے ہیں۔

اس عظیم اور طاقتور ناول "جسٹین" کا خالق ۱۷۴۰ء میں پیدا ہوا اور طبقۂ امراء سے تعلق رکھتا تھا جو اس زمانے میں زوال اور انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ جب وہ لڑکا تھا تو اس کی خوب صورتی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ جنہوں نے اُسے دیکھا، ان کا کہنا ہے کہ اس کے جمال میں نسوانی حسن کا عنصر غالب دکھائی دیتا تھا۔ لڑکپن ہی میں وہ

بدی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس زمانے کی حسینائیں اسے دیکھتے ہی ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اس کے حسن سے اثر لیے بغیر رہنا ممکن نہ تھا۔

ڈی سیڈ اپنے زوال پذیر طبقۂ امراء کا نمائندہ تھا۔ اپنے عہد کے شرفا اور امراء کی طرح اس نے بھی فوج میں کمیشن حاصل کیا اور جرمنی کے ساتھ سات سالہ جنگ میں حصہ لیا۔ جب وہ ۲۳ برس کا ہوا تو اس نے فوج سے استعفیٰ دے دیا اور پیرس میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ بدکار تھا اور اس کے باپ نے اس کی اس قابل نفرت زندگی کی راہ میں دیوار کھڑی کرنے کے لیے اس کی شادی کر دی۔ اس کی شادی ایک چھوٹے درجے کے طبقۂ امراء کی ایک لڑکی ایبی مونٹرلیو سے کی گئی جو نظرتاً نیک، خوبصورت اور لمبے قد کی خاتون تھی۔ سیڈ کو اپنی بیوی پسند نہ آئی۔ شادی سے پہلے وہ جنسی کجروی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ اپنی بیوی کے برعکس اسے اپنی چھوٹی سالی سے محبت ہو گئی۔ جو سرخ بالوں والی ایک حسینہ تھی۔ سیڈ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ یہ انتخاب اس کے والد کا تھا۔ اس کا ردِ عمل اس صورت میں ہوا کہ اس کی گھناؤنی جنسی سرگرمیوں میں اضافہ ہو ہو گیا۔ لیکن اس کی ان تمام بد حرکات کے باوجود اس کی بیوی اس کی وفادار رہی۔

مارکوئیس ڈی سیڈ اب قحبہ خانوں میں جانے لگا۔ اپنے ہاں ایسی طوائفیں لانے لگا جو اس کی مرضی کے مطابق چلتی تھیں۔ وہ ان کے برہنہ جسموں پر کوڑوں کی بارش کر دیتا دوسروں پر تشدد کر کے، ایذا پہنچا کر ہی مارکوئیس ڈی سیڈ کی جنسی تشفی ہوتی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۳ء کو اسے اسی جرم میں قید کر لیا گیا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ایک قحبہ خانے میں اس نے طوائفوں پر لوتے چابک برسائے کہ وہ لہولہان ہو کر چیخنے لگیں۔ اس پہلی حراست کے بعد اس کی زندگی پکڑ دھکڑ کا ایک مسلسل سلسلہ بن کر رہ گئی۔ یوں اسے اپنی زندگی کے بیس برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے۔

جیل کی ان ہی سلاخوں کے پیچھے اس نے ایک چھوٹی سی کہانی لکھی جو دراصل اس کی فینسی کی غمازی کرتی تھی۔ یہ کہانی کبھی زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ لیکن اس کہانی نے اس کی تحریروں کے لیے بنیاد فراہم کر دی۔ گویا یہی تحریر اس کی تصانیف کا محرک بنی۔ پہلی

حراست کے کچھ ہفتوں کے بعد اسے رہائی مل گئی۔ اس نے جرمانہ ادا کیا۔ کیونکہ وہ طبقۂ امراء سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے وہ اگلے سال پارلیمنٹ کا رکن بن گیا۔ لیکن اسے اپنے اس منصب جلیلہ کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے پھر سے پیرس میں ایک ایکٹرس کیساتھ رہنا شروع کر دیا۔ جہاں مختصر سے عرصے میں سیڈ کو عورتوں کو زدوکوب اور کوڑے مارنے والے کی حیثیت سے رسوائی حاصل ہوئی ہے۔

۱۷۶۸ء میں اس نے ایک عورت روز کیلر کو اغوا کیا اور اس کے جسم پر اس وقت تک کوڑے برساتا رہا جب تک وہ خون میں نہ نہا گئی۔ وہ ننگی ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ چیخ چیخ کر اس نے پولیس کی مدد طلب کی۔ سیڈ کو گرفتار کرنے کے بعد اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے نے پورے یورپ میں سنسنی پھیلا دی۔ لیکن چونکہ سیڈ کا خاندان بڑا اثر و رسوخ والا تھا اس لیے اسے سات ہفتوں کی قید اور معمولی جرمانہ کر کے رہا کر دیا گیا۔

سیڈ میں اس کے باوجود کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس نے اپنی سالی کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور انہیں دنیا سے بھی چھپانے کی کوشش نہ کی۔ اس کے ارد گرد طوائفوں اور ہم جنس پرستوں کا مجمع رہتا۔ وہ اجتماعی جنسی تقریبات کا انعقاد کرتا۔ عورتوں پر کوڑے برساتا۔ ۱۷۷۲ء میں چار طوائفوں کو اس نے اپنے کوڑوں کا نشانہ بنایا۔ انہیں اس عمل سے پہلے نشہ آور دوائی پلا دی گئی تھی۔ یہ چاروں طوائفیں بمشکل جانبر ہو سکیں۔ انہوں نے حکام کو اس کی اطلاع دی۔ مارکوئیس سیڈ اس وقت تک اپنی سالی کے ہمراہ اٹلی روانہ ہو چکا تھا اس کی عدم موجودگی میں اس کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔

کئی برسوں تک فرانس سے غائب رہا۔ ۱۷۷۹ء میں واپس آیا تو اب بھی اس کی بداعمالیوں میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ ان میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ مئی ۱۷۷۵ء میں پھر دو عورتیں اس کے مکان سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جنہوں نے پولیس کو اس کی گھناؤنی بداعمالیوں سے آگاہ کیا۔ سیڈ کا خاندان بھی اب اس سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کے اپنے ماموں نے کہا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے اس لیے سیڈ کو گرفتار کر لینا چاہیے۔ سیڈ پھر اٹلی بھاگ نکلا اور اٹھارہ ماہ تک وہیں رہا۔ لیکن اسے جلد ہی پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۷۷۸ء میں

اسے رہائی نصیب ہوئی۔

اس کی ساس اس کی جانی دشمن بن چکی تھی۔ جس کی دونوں بیٹیوں کی زندگی سیڈ نے تباہ کر دی تھی۔ اس کی درخواست پر سیڈ کو گرفتار کیا گیا۔ ۱۷۷۸ء سے ۱۷۸۴ء تک اسے ونیز جیل میں رکھا گیا۔ ۱۷۸۴ء سے ۱۷۸۹ء تک وہ مشہور زمانہ باستیل جیل میں رہا۔ پھر اسے وہاں سے دماغی امراض کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ اپریل ۱۷۹۰ء تک رہا۔

جب وہ اڑتیس برس کی عمر میں جیل گیا تو وہ توانا اور وجیہہ انسان تھا۔ تیرہ برس کی سزا کے بعد باہر نکلا تو وہ ایک فربہ اور بدنما انسان بن چکا تھا۔ ذہنی اور دماغی طور پر بھی وہ بیمار تھا۔ اب اس نے زور شور سے لکھنا شروع کیا۔ ان کتابوں اور تحریروں میں وہ لذت کی گمشدہ دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ جنسی واہموں کا اسیر نظر آتا ہے۔ اس کے ذاتی واہموں، خواہشوں اور تجربوں پر مبنی یہ کتابیں انسانی روح کی صعوبتوں کی ایک دستاویز بن جاتی ہیں۔

رہا ہونے کے بعد اس نے تصنیف و تحریر کے ذریعے زندہ رہنا چاہا۔ کیونکہ وہ قلاش ہو چکا تھا۔ اور قرض خواہوں نے اس کے خلاف مقدمے دائر کر رکھے تھے۔ چند روپے کمانے کے لیے اس نے ۱۸۰۰ء کے اواخر میں ایک کتابچہ نپولین کے خلاف لکھ کر شائع کرا دیا۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۰۱ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ دو برس کے بعد وہ جیل سے پاگل خانے لے جایا گیا۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے بقایا آخری گیارہ برس گذارے۔

پاگل خانے کے داروغہ نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارے ہاں ایک ایسا آدمی آ پہنچا ہے جس نے اپنی بداخلاقی اور بداطواری کی بدولت شہرت حاصل کی ہے۔ اس کی موجودگی عظیم ترین شر اور بدی کی طرح ہے۔ اس کے پاس کسی کو نہ آنے دیا جائے۔ اسے سب سے الگ تھلگ اور تنہا رکھا جائے۔

سیڈ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بہت کچھ لکھا۔ ان گنت خطوط اپنی گرفتاری کے خلاف تحریر کیے۔ ۱۸۱۴ء میں بالآخر اس کی اس ہنگامہ خیز اور بداطوار زندگی کا خاتمہ ہوا۔

مارکوئیس ڈی سیڈ نے اپنی زندگی میں درجنوں ناول لکھے۔ ۱۷۸۵ء میں اس نے "سدوم کے ایک سو بیس ایام" لکھا۔ لیکن اس کا جو ناول سب سے پہلے شائع ہوا۔ وہ "جسٹین"

تھا۔ یہ ناول ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کی تاریخ کے حوالے سے فرانس پر تشدد اور دہشت کا راج تھا۔ ہر چیز تہس نہس ہو چکی تھی۔ صدیوں کے اخلاقی نظام اور روایات کو تہہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ سیڈ کو ڈر تھا کہ اگر یہ ناول پیرس میں شائع ہوا تو اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اس کے ٹائیٹل پر چھپوایا کہ یہ ناول ہالینڈ میں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ پیرس میں ہی چھپا تھا۔

سیڈ اپنے اس ناول سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اسے بار بار بدلتا رہا۔ اور جب ۱۷۹۷ء میں یہ پھر شائع ہوا تو اس وقت یہ پہلے سے زیادہ ضخیم ہو چکا تھا۔ یہ ناول کبھی تقسیم نہ ہوا زیر زمین پڑھا جاتا رہا۔ ایک ڈیڑھ صدی تک اسے خفیہ اور ممنوعہ کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ تب سے اب تک اس ناول پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس کتاب پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن یہ ناول خفیہ طور پر ہمیشہ شائع ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۱۵ء ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۵ء میں فرانس کی مختلف حکومتوں نے اس کے خلاف قدم اُٹھایا۔ اس کے باوجود اس کی خفیہ اشاعت میں کوئی کمی نہ آئی اور یہ دوسرے ملکوں میں سمگل ہوتا رہا پھر اس کے تراجم بھی خفیہ طور پر شائع ہونے لگے۔

انگلستان اور امریکہ میں کسٹم والے سمگل شدہ نسخوں کو نذرِ آتش کرتے رہے۔ امریکہ میں پہلی بار اس کا مستند ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور پھر ساری دنیا میں یہ ناول انگریزی زبان کے حوالے سے پھیل گیا۔ اس پر کیے جانے والے اعتراضات کی بازگشت اب بھی سُنی جاتی ہے۔ لیکن اس ناول پر اب کسی ملک نے پابندی نہیں لگائی ہے۔

جسٹین، یقیناً ایک مجرمانہ بیمار ذہن کی پیداوار ہے اور یہ امریکی اور یورپی معاشرے کی سچی عکاسی کرتا ہے، جو مجرم اور بیمار ہے۔ لیکن یہ ایک سچی روئیداد ہے۔ اس کی ایک خاص نوع کی اخلاقی حیثیت بھی ہے۔ مارکوئیس ڈی سیڈ نے اس کتاب کا انتساب اپنی ایک خاتون دوست کے نام کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے: "اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ ایک عجیب ناول ہے یہاں بدی ہر چیز پر غالب آتی ہے اور نیکی اپنی ہی قربانیوں کا نشانہ بن گئی ہے۔ لیکن جرم اور گناہ کی انہی بدترین تصویروں نے مجھے نیکی اور اچھائی سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ نیکی اپنی بدقسمتی میں کتنی عظیم دکھائی دیتی ہے۔"

لامزرابیلز

LES MISERABLES

بعض اوقات مجھے بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زبان جس میں ہم لکھتے ہیں جو پاکستان کی قومی زبان ہے جو ہماری تہذیب، ہمارے اتحاد اور کلچر کی امین ہے جس زبان میں بہت بڑا تخلیقی کام ہوا ہے جو یقیناً دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کا دامن کتنا تہی اور خالی ہے دنیا کی مختلف زبانوں میں جو بڑے بڑے کام ہوئے جنہوں نے پوری نوع انسانی اور عالمی ادب کو متاثر کیا، وہ چند سو بڑی کتابیں بھی اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکیں۔ جو عالمی ادب کی آبرو ہیں جنہوں نے انسانی فکر کو جلا بخشی ہے۔ زندگی کی معنویت سے ہمکنار کیا ہے۔

وکٹر ہیوگو کا ناول LES MISERABLES ایک ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جس پر پوری دنیا کو فخر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اسے برصغیر کے پڑھنے والوں نے نہیں پڑھا۔ اسے یہاں انگریزی میں پڑھا گیا اور پڑھا جاتا رہے گا لیکن اگر اس کا کوئی ترجمہ اردو میں ہو جاتا تو اردو ادب اور زبان میں ایک بہت بڑا اور جاندار اضافہ ہوتا اور اردو لکھنے والے جو انگریزی یا فرانسیسی سے براہِ راست آشنا نہیں وہ سب ایک عظیم فن پارہ پڑھ سکتے۔

وکٹر ہیوگو کا نام ہمارے ہاں اجنبی نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹو مرحوم نے اس کی ایک کتاب لاسٹ ڈیز آف کنڈیمڈ کا اپنے ابتدائی دور میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے میں حسن عباس نے ان کی اعانت کی تھی۔ بہت برسوں کے بعد اب یہ ترجمہ دوبارہ "سرگزشت اسیر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاں بھی وکٹر ہیوگو کا ذکر ملتا ہے وکٹر ہیوگو

پر کچھ اچھے بھلے اور سطحی مضامین بھی ایک دور میں شائع ہوئے۔

لامزرا بیلز ایک ایسا شاہکار ہے جو فلم والوں کو بھی بے حد مرغوب رہا۔ فرانسیسی یا دوسری زبانوں کا تو مجھے علم نہیں یقیناً اُن زبانوں میں بھی اس پر فلمیں بنی ہوں گی لیکن انگریزی میں اس ناول کو متعدد بار فلمایا جا چکا ہے اور رینی والی فلم کی تو پاکستان میں بھی نمائش ہو چکی ہے۔ تقسیم کے بعد بھارت میں سہراب مودی نے اُسے ADOPT کیا اور اس پر ایک فلم 'کندن' کے نام سے بنائی گئی۔ پاکستان میں اس کے بہت سے حصوں اور ٹکڑوں کو مختلف فلموں میں جوڑا گیا۔

وکٹر ہیوگو کو اس کے ایک اور ناول پر بننے والی فلم کی وجہ سے بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ ناول ہے۔ نوترے ڈیم کا کبڑا اس ناول پر بھی بہت فلمیں بن چکی ہیں لیکن جینا لولو بریجیڈا اور انتھونی کوئین والی فلم ہمارے ہاں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اس حوالے سے ہمارے ہاں کا عام فلم بین بھی اس ناول کے خالق کو جانے بغیر اس کے ایک بڑے کام سے متعارف ہوا اور اسے دل کھول کر داد دی۔ اس فلم کی ہی مقبولیت نے زنگیلا کو 'کبڑا عاشق' بنانے کی تحریک و ترغیب دی اور پاکستان میں یوں اس فلم کے حوالے سے وکٹر ہیوگو کو مسخ کیا گیا۔ کبڑا عاشق بلاشبہ ایک بڑی اور گھٹیا فلم تھی۔ اس فلم کے حوالے سے پاکستان کے عام فلم بینوں نے جو فیصلہ دیا وہ ہمارے دانشوروں کے لئے توجہ کا طالب ہے کہ ایک ایسی فلم 'ہنچ بیک آف نوترے ڈیم' کو ہمارے ہاں کے عام ان پڑھ اور ہر سطح کے قاری نے بے حد پسند کیا۔ جب کہ بیشتر فلم دیکھنے والے انگریزی زبان سے نابلد تھے لیکن جب اسی موضوع پر اپنی زبان میں ایک فلم بنی جو بڑی تھی تو اسے مسترد کر دیا۔

اس پھیلے ہوئے بڑے ناول کا ایک اجمالی ترجمہ کرنے کا اعزاز مجھے بھی حاصل ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے!

لامزرا بیلز ایک ایسا اہم ناول ہے جس کے بارے میں عالمی ادب کے نقادوں نے ایک دلچسپ بحث بھی ایک زمانے میں شروع کی تھی اور کبھی کبھار اب بھی اس کی بازگشت سنی جاتی ہے۔ بعض بڑے تخلیق کاروں اور نقادوں کی رائے ہے کہ یہ ناول ٹالسٹائی کے عظیم ناول 'وار اینڈ پیس' سے بھی بڑا ہے۔ خود ہمارے ہاں کرشن چندر نے جہاں بالزاک کو ٹالسٹائی سے بڑا ناول نگار کہا، وہاں 'لامزرا بیلز' کو وار اینڈ پیس سے بڑا ناول قرار دیا۔

ظہیر کاشمیری جو عالمی ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو کا یہ ناول ٹالسٹائی کے وار اینڈ پیس سے بڑا تخلیقی ناول ہے۔ یہ بحث بے حد دلچسپ اور خیال افروز ثابت ہو سکتی ہے کہ دو مختلف زبانوں میں دو بڑے GIANTS کے ان دو بڑے تخلیقی شہپاروں کا کس طرح موازنہ کیا جا سکتا ہے، جن کے موضوعات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

وکٹر ہیوگو نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ وہ صرف ناول نگار ہی نہیں شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار اور سیاست دان بھی تھا وہ ۲۶ فروری ۱۸۰۲ء کو بسکاں میں پیدا ہوا۔ اس کا والد نپولین کی فوج میں ایک افسر تھا۔ بعد میں وہ جنرل کے عہدے تک پہنچا اور "کاؤنٹ" کا خطاب و اعزاز بھی حاصل کیا۔ وکٹر ہیوگو کا بچپن مختلف ملکوں اور شہروں میں بسر ہوا۔ ایلبا، کارسیکا، نیپلز، میڈرڈ اس نے اپنے باپ کی ملازمت کی وجہ سے بچپن میں ہی دیکھے۔ بعد میں پیرس میں ایک بورڈنگ سکول میں داخل کرا دیا گیا وہ پندرہ برس کا تھا کہ اکادمی فرانس کی طرف سے منعقد کئے جانے والے ایک شعری مقابلے میں شریک ہوا اور اس نے اس مقابلے میں نمایاں اعزاز حاصل کیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے شاعری کے تین مقابلوں میں اول انعام حاصل کیا۔ اسی برس اس کے بھائی نے ایک پندرہ روزہ ادبی رسالے کا اجرا کیا آنے والے تین برسوں میں جب تک یہ جریدہ شائع ہوتا رہا، وکٹر ہیوگو نے اس میں بے شمار تحریریں لکھیں۔ اس کی بعض نظموں میں ایسے عناصر پائے جاتے تھے جن میں بادشاہی کو پسندیدہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے شاہ فرانس اس پر مہربان ہوا اور اسے پانچ سو فرانک کا وظیفہ جاری کر دیا گیا۔

۱۸۱۹ء میں اسے شدید عشق ہوا۔ اس کی محبوبہ ایڈلی فوشر تھی وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دونوں گھرانوں کے سربراہ بالخصوص وکٹر ہیوگو کی والدہ اس رشتے کی مخالف تھی۔ ۱۸۲۱ء میں جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی برس اس کی ان نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ جو اس نے اپنی محبوبہ کے لئے لکھی تھیں۔ ۱۸۲۳ء میں ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اب وکٹر ہیوگو اپنی شاعری اور ڈراموں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے وظیفے کی رقم بڑھا کر دو ہزار فرانک کر دی گئی۔ ۱۸۳۰ء تک وہ تین بیٹوں کا باپ بن چکا تھا اور ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہا تھا۔

۲۲ مئی ۱۸۸۵ء کو وہ انتقال کر گیا پہلے اسے PANTH EON میں دفن کیا گیا۔ پھر پورے قومی اعزاز کے ساتھ اسے فتح کی محراب (ARC DE TRIUMPHE) کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

وکٹر ہیوگو انقلابی ذہن کا مالک تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند بڑے باشعور لکھنے والوں میں کیا جاتا ہے اس نے پھانسی اور موت کی سزا کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی۔ اس سزا کو منسوخ کرانے کے لئے اس نے کتابیں لکھیں۔ کتابچے تحریر کئے۔ تقریریں کیں۔ اس ضمن میں اس کا شاہکار LAST DAY OF A CONDMEND یعنی سرگزشت اسیر جس کے مترجم منٹو ہیں۔ وکٹر ہیوگو نے اس دلدوز کتاب میں پھانسی کی سزا کے خلاف زبردست دلائل پیش کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو اس نظریے کا وہ بڑی سنگینی سے مذاق اڑاتا ہے۔ سماجی عوامل اور انسان کی زندگی پر اس کی نظر اتنی گہری ہے کہ وہ ان نتائج کو بڑے شدومد اور استدلال سے پیش کرتا ہے جو ایک شخص کی پھانسی کے بعد اس کے گھرانے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ان دشواریوں، صعوبتوں اور آلام کا ذکر کرتا ہے جن کا پہاڑ اس خاندان پر ٹوٹ پڑتا ہے جس کے ایک فرد کو کسی جرم میں پھانسی دی گئی ہو۔

آج اگر دنیا کے بیشتر ممالک میں پھانسی کی سزا منسوخ ہو چکی ہے تو یقیناً اس کی منسوخی میں وکٹر ہیوگو کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

وکٹر ہیوگو — اجتماعی معاشی اور سماجی زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے حوالے سے کمیون سسٹم کا بہت بڑا حامی بن کر سامنے آتا ہے۔ سماج کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان اجتماعی زندگی بسر کرے اور کمیون سسٹم قائم کرے۔ اس کے ان انقلابی افکار کی وجہ سے اسے بہت سی پریشانیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے نظریات پر ڈٹا رہا۔

"نوتر دے دیم کا کبڑا" ایک عظیم ادبی شہپارہ ہے۔ انسانی محبت اور رشتوں کی ایسی تفسیر دنیا کے ادب میں بہت کم پیش کی گئی ہے۔

نوتر دے دیم کے نیم انسان گونگے، بہرے، مسخ اور بدصورت ترین شکل والے کبڑے کے حوالے سے وکٹر ہیوگو ہمیں ایک ایسی انسانی صورت حال اور انسانی نفسیات سے متعارف کراتا ہے جو پڑھنے والے کے لئے ایک عظیم انسانی تجربے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

۱۸۴۱ء میں وکٹر ہیوگو کو فرانسیسی اکادمی کا رکن منتخب کر لیا گیا جو یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا۔ ۱۸۴۸ء میں وہ اسمبلی کا رکن چنا گیا۔ اس کے بعد اگلے برس وہ مجلس قانون ساز کا رکن بن گیا۔ وہ نپولین کا حامی تھا لیکن جب ۱۸۵۱ء میں نپولین نے ری پبلک کو ختم کر کے اپنے آپ کو بادشاہ (EMPEROR) بنانے کا فیصلہ اور عمل کیا تو وکٹر ہیوگو اس کا مخالف بن گیا۔ ہیوگو نے حزبِ اختلاف کو منظم کرنے کی کوشش کی اور بغاوت بھی ہوئی لیکن ناکامی سے دوچار ہوئی۔ ہیوگو کو اپنی جان بچانے کے لئے فرانس سے بھاگ کر برسلز میں پناہ لینی پڑی۔ ۱۸۵۱ء سے لے کر نپولین کے زوال تک ہیوگو پیرس واپس نہ آیا اور جلا وطنی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں ہی اس نے اپنے بڑے تخلیقی شاہکار تصنیف کئے جن میں "لامزرابیلز" بھی شامل ہے۔

ہیوگو کی محبوبہ اور بیوی بھی اس کے ساتھ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جلاوطنی میں ہی اس کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ اپنی محبوب بیوی کی موت کا غم وہ کبھی نہ بھلا سکا۔ ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ہیوگو پیرس پہنچا۔ فروری ۱۸۷۱ء کو اسے قومی اسمبلی کا رکن چنا گیا۔ نپولین اپنے زوال سے دوچار ہو چکا تھا اور اس وقت پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ حالات اس کے بس سے باہر تھے۔ چند مہینوں کے بعد ہی اس نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اپنے نظریات کے خلاف کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ سماجی اور معاشی زندگی میں کمیون سسٹم کا زبردست حامی تھا۔ برسلز میں اس نے کمیون سسٹم پر جو تقریریں کی تھیں۔ اسی کی وجہ سے اس کی شدید مخالفت ہوئی تھی اور برسلز کی حکومت نے اسے ملک سے جبراً نکال دیا تھا۔

اس کی زندگی اب صدموں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا ایک بیٹا ۱۸۷۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا اور آخری بیٹا ۱۸۷۳ء میں انتقال کر گیا۔ اب وہ ایک تنہا بوڑھا تھا جسے عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ دنیا بھر میں اس کے مداح پھیلے ہوئے تھے لیکن وہ اکیلا اور تنہا تھا۔ اس نے دو بار قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا لیکن ناکام رہا۔ بالآخر ۱۸۷۶ء میں وہ سینٹ کا رکن چن لیا گیا۔ اس کی شہرت میں پھر اضافہ ہوا جب تک وہ زندہ رہا سینٹ کا رکن رہا۔ لیکن اس کی تمام تر سیاسی سرگرمیاں اور دوسری مصروفیات بھی اس کی تنہائی کا مداوا نہ بن سکیں۔ اسے پناہ اور تسکین ملی تو لکھنے سے جب تک وہ زندہ رہا لکھتا رہا۔ اس کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔

عشق، انسانیت اور ایثار ایسے جذبے ہیں جن کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے ہے۔ انسان کا باطن حسین ہے تو وہ دنیا کا بدصورت ترین انسان ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل وہی صاحبِ جمال ہے۔ دنیائے ادب میں بڑے بڑے بدصورت کردار پیش کئے گئے ہیں لیکن جتنا بدصورت یہ نوترے ڈیم کا کبڑا ہے۔ اتنا بدصورت شاید ہی کوئی دوسرا کردار ہو۔ لیکن یہی بدصورت کردار ہمیں دنیا کا حسین ترین انسان نظر آنے لگتا ہے کیونکہ اس کا دل سچی محبت، وفاشعاری اور اطاعت سے لبریز ہے۔

وکٹر ہیوگو کا سب سے بڑا تخلیقی اور لازوال کام لامزرا بیلز ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت اس لحاظ سے بھی ایک تاریخ ساز واقعہ ہے کہ یہ بیک وقت دنیا کی دس زبانوں میں شائع ہوا۔ ان کی اشاعت عالمی ادب کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس ناول کے حوالے سے عالمی ادب پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے ان کی ایک اپنی تاریخ ہے۔

اس عظیم اور ضخیم ناول کے حوالے سے وکٹر ہیوگو نے انسانی زندگی اور معاشرے سے تعلق رکھنے والے بعض بنیادی سوال اٹھائے اور ان کا جواب دیا ہے۔

انسان اور قانون کا رشتہ ؟ قانون انسان کو مجرم بناتا ہے اور جب کوئی انسان جرم کی راہ چھوڑ کر شرافت اور انسانیت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قانون اسے شرافت کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

"لامزرا بیلز" میں وکٹر ہیوگو نے بنی نوع انسان کے سب سے بڑے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ بھوک اور غربت !! اس کا مرکزی کردار ژوا لجین۔ ایک فرانسیسی نادار ہے یہ وہ انسان ہے جو دنیا کے ہر خطے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں بستا ہے۔ وہ غریب ہے، وہ شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ محنتی ہے سادہ دل ہے۔ قانون کا احترام کرتا ہے لیکن وہ جس سماجی اور معاشی نظام میں زندہ ہے اس میں اسے اس کی تمام تر کوششوں، ذلتوں اور ناکامیوں کے باوجود روٹی نہیں ملتی کہ وہ اپنا یا اپنے کسی عزیز کا پیٹ پال سکے اسے کام سے عار نہیں ہے وہ چھوٹے سے چھوٹا اور حقیر سے حقیر کام کرنے کے لئے بھی تیار ہے لیکن اسے کام نہیں ملتا اور وہ کب تک فاقے سہہ سکتا ہے کب تک اپنے کسی معصوم بچے کو بھوک سے بلبلاتا اور کسی عزیز کو بیماری میں سسکتے دیکھ سکتا ہے۔

جب سماج ایسا ہو۔ نظام اتنا مکروہ ہو تو پھر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ والجین روٹی

چراتا اور پکڑا جاتا ہے اس کے بعد اس کی عزیزہ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں اسے روٹی چرانے کے جرم میں سخت سزا دی جاتی ہے۔ وہ جیل سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا ہے ناکام رہتا ہے اس کی سزا میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بالآخر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اب اس کا اور پولیس کا تعاقب شروع ہو جاتا ہے۔

انسانی معاشرہ: قانون، اخلاق یہ تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اس نے آخر روٹی کیوں چرائی تھی؟ پورا نظام یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں کہ ایک انسان کو روٹی مل سکے۔ والجین ایک دہشت کی طرح ہے۔ لوگ اس کے فرار کی خبر سن کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے کہیں جائے پناہ نہیں۔ وہ ایک جاگیردار کے کتوں کی کوٹھری میں سونے کی کوشش کرتا ہے اور نکال دیا جاتا ہے ایک پادری اسے اپنے ہاں رات گزارنے کی اجازت دے دیتا ہے اور وہ اسی پادری کے سونے کے شمعدان چرا کر بھاگ نکلتا ہے یہ پادری اس کی زندگی بدل دیتا ہے کیونکہ والجین جب مسروقہ اشیاء کے ساتھ پکڑا اور پادری کے سامنے لایا جاتا ہے تو پادری کہتا ہے کہ یہ شمعدان اس نے خود اسے تحفے میں دیے تھے.....

نیک بننے، پرسکون زندگی گزارنے۔ دوسرے انسانوں کے کام آنے کی پرانی خواہش پھر والجین کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ان شمعدانوں کو بیچ کر ظروف سازی کا کارخانہ لگاتا ہے اپنی کھوئی ہوئی عزیزہ کی تلاش میں نکلتا ہے۔ جس پر زمانہ اتنے ستم توڑ چکا ہے۔ کہ جس کی تفصیل ہماری زندگیوں اور ہمارے معاشرے کے لئے اجنبی نہیں، اپنی نیکی، خدا ترسی اور انسان دوستی کی وجہ سے وہ انتہائی شہرت حاصل کرتا ہے۔ سماج اسے عزت کا مقام دیتا ہے وہ شہر کا میئر چن لیا جاتا ہے۔ اس کی نیکی انسان دوستی کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن قانون کو اس کی سماجی اور انسانی خدمات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس کی تلاش میں ہے اور ایک دن اس تک پہنچ جاتا ہے۔

انسپکٹر کا کردار بھی ایک ایسا کردار ہے جو یادگار کرداروں میں سے ایک ہے یہ اندھے قانون کا مطیع فرد ہے انسانی جذبات سے عاری ہے لیکن بہرحال وہ انسان ہے۔ قانون سنگدل ہے اندھا ہے لیکن انسان کا دل کبھی پتھر نہیں بن سکتا۔ اس کردار کے حوالے سے ہیوگو نے جس انسانی بصیرت کا اظہار کیا ہے یہ اسی کا حصہ ہے یہ انسپکٹر والجین کی انسانی عظمت سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اسے گرفتار کرنے کی بجائے خودکشی کر لیتا ہے۔ قانون کی سفاکی جبر اور شقاوت

کے حوالے سے اس انسان کے کردار کو بھی سامنے رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسے تمام قوانین کی دھجیاں بکھر کر رہ جاتی ہیں جو انسانی احساسات سے عاری ہیں جو انسان کو روٹی نہیں دے سکتے محض مجرم اور غلام بناتے ہیں۔

"لامزرا بیلیز"، جب سے لکھا گیا تب سے اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گا یہ جہاں انسانی باطن اور فرد کے کئی انقلابوں کو سامنے لاتا ہے۔ سیاسی انقلاب کی بھی نشاندہی کرتا ہے انسان سے تعلق رکھنے والی تمام اقدار اور ضروریات اور بنیادی مسائل کو اس ناول میں سمویا گیا ہے یہ ناول انسانی فطرت اور سماج کے حوالے سے ایک ایسی دستاویز ہے جس کے پس منظر میں ایک عظیم اور باشعور تخلیقی ذہن موجود ہے جو ہمیں زمانوں کے ساتھ انسانوں کے چہرے دل اور باطن سے متعارف کراتا ہے جو انسان کے فرسودہ ڈھانچوں اور بے اثر قوانین کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔!

سکارلٹ لیٹر

فطرت نے انسان کو جو جذبے بخشے ہیں۔ ان پر پابندیاں لگانے والے معاشروں میں کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اس پابندی کو توڑ دے۔ اور معاشرے کے قوانین سے بغاوت کر دے تو ایسے شخص کو کیا سزا ملتی ہے؟

اس کا ایک جواب ہیسٹر کی صورت میں ملتا ہے۔ ہیسٹر۔ جس نے ایک متشدد دیندار معاشرے میں اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں ایک بچی کو جنم دیا اور اس کے معاشرے نے اسے یہ سزا دی کہ وہ ہمیشہ کے لیے۔ جب تک وہ زندہ ہے اپنے سینے پر سرخ دھاگوں سے کڑھا ہوا ایک لفظ A آویزاں کر کے پھرے۔ A۔ جو ADULTRESS یعنی زانیہ کا مخفف ہے۔ تاکہ اس معاشرے کے دیندار لوگوں کی مذہبی انا کو تسکین ملتی رہے۔ اپنے سینے پر اپنے گناہ کا اعلان سجائے، چلتی پھرتی جیتی جاگتی عورت کے حوالے سے یہ کہہ سکیں کہ گناہ کی سزا دی جا چکی ہے۔ یہ عورت وہ ہے جس نے زنا کیا اور یہ عورت ہمیشہ اس گناہ کے دہکتے ہوئے سرخ نشان کو اپنے سینے پر لٹکائے، نمائش کرتے ہوئے عبرت کی ایک علامت بن کر معاشرے کی پاکیزگی اور دینداری کا اعلان کرتی رہے گی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو گناہگار کو ڈھکا چھپا رہنے نہیں دیتا۔ اس معاشرے کے مذہب کا اصول تو یہ ہے کہ دوسرے کے عیوب اور برائیوں کی پردہ پوشی کی جائے لیکن ان لوگوں کی مذہبیت اس روا داری کی قائل نہیں بلکہ وہ اس گناہ کی تشہیر کو اپنے معاشرے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ عورت۔ ہیسٹر۔ یہ معاشرہ۔ نتھینیل ہاتھورن کے ناول "سکارلٹ لیٹر"

کے کردار ہیں....

پندرہ سولہ برس پہلے جب میں نے ہاتھورن کا ناول سکارلٹ لیٹر پڑھا تو میں نے اس ناول اور ہاتھورن کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ لیکن ہاتھورن کی کوئی چیز اس سے پہلے میرے مطالعے میں نہ آئی تھی۔ جب میں نے اس ناول کو پڑھا تو میں نے اسے ختم کرنے کے بعد محسوس کیا کہ میں نے دنیا کی ایک عظیم تخلیق کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے میرے ذہنی اُفق کو وسیع کیا ہے۔ میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کے بعد میں نے تلاش کر کے ہاتھورن کی ہر چیز پڑھی۔ اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ تب سے اب تک اس ناول کو میں متعدد بار پڑھ چکا ہوں۔ یہ ان ناولوں میں سے ایک ہے جن کا شمار سومرسٹ ماہم نے دنیا کے دس بڑے ناولوں میں کیا ہے جس کے تراجم دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہو چکے ہیں جس پر کئی بار فلمیں اور ٹی وی ڈرامے بن چکے ہیں اور جس نے دنیا کے بہت سے لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے۔

اُردو میں سیدہ نسیم ہمدانی نے اس کا بہت موثر اور خوب صورت ترجمہ " لال نشان " کے نام سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ اب نایاب ہے۔

نتھینیل ہاتھورن ۴ جولائی ۱۸۰۴ء کو سالیم (میساچوسٹس) میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک تجارتی جہاز کا کپتان تھا۔ ہاتھورن چار برس کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوا۔ مرنے والے نے اپنے پیچھے کوئی ترکہ نہ چھوڑا تھا۔ گھر کے حالات جلد ہی خراب ہونے لگے۔ ہاتھورن نے کم عمری میں ہی غربت اور ناداری کا ذائقہ چکھ لیا۔ جب وہ اٹھارہ برس کا ہوا تو اس کی والدہ سالیم سے ایک دوسرے شہر منتقل ہو گئی اور ہاتھورن کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ جانا پڑا۔ ہاتھورن کی زندگی کچھ ایسے انداز سے اور ماحول میں گذری کہ وہ عزلت نشین اور تنہائی پسند ہو گیا۔ اس نے بروکلین کالج میں تعلیم حاصل کی لیکن کالج کے زمانے میں بھی اس کی تنہائی پسندی کی عادت برقرار رہی۔ گریجویشن کے بعد وہ واپس سالیم آ گیا اور اس نے اپنی زندگی تصنیف و تحریر کے لیے وقف کر دی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تنہا اور اکیلا ہو گیا۔

... ہاتھورن کے حوالے سے سالیم (SALEM) کا ذکر ہوا۔ جس کے حوالے سے چند وضاحتی باتیں ضروری ہیں۔ سالیم میں ایک زمانے میں بعض عورتوں، لڑکیوں اور مردوں پر اس جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا کہ وہ بدروحیں اور WITCHES ہیں۔ جس کا شہرہ پورے ملک میں ہوا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس پر امریکہ کے عظیم ڈرامہ نگار آرتھر ملر نے عظیم کھیل CRUCIBLE لکھا۔ جس کا ترجمہ کتابی صورت میں "آزمائش کی گھڑی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ ستار طاہر نے کیا تھا۔

اس ماحول اور سالیم کے ماضی کے اثرات ہاتھورن کے ماضی کے اثرات ہاتھورن کے ذہن پر بڑے گہرے تھے۔ اس کے خاندان کا ایک فرد (اغلباً) دادا اس مقدمے میں ایک جج ہی تھا۔

ہاتھورن نے بارہ برس تک ایک تارک الدنیا جیسی زندگی گزاری۔ وہ اس زمانے میں مختصر کہانیاں لکھتا رہا۔ یہ ایک ایسی صنف تھی جسے امریکہ میں کوئی نہ جانتا تھا اور پڑھنے والے اس سے ناآشنا تھے۔ یوں ہاتھورن امریکہ میں شارٹ سٹوری کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ بارہ برسوں میں اس نے جو ناول لکھا وہ FANHAWES کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایک رومانس تھا۔ ایک کمزور تخلیق۔ جسے بعد میں خود ہاتھورن نے بھی مسترد کر دیا۔

۱۸۳۷ء میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ TWICETOLD TALES شائع ہوئی جو امریکی ادب میں کہانیوں کی اولیں اور اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس اولیت کی وجہ سے اس کی ایک تاریخی حیثیت بھی بنتی ہے۔

۱۸۴۲ء میں ہاتھورن کی شادی ہوئی۔ یہ اس کی زندگی کی بہت بڑی خوشی تھی کیونکہ وہ جس خاتون سے بیاہا گیا وہ ایک فعال اور دانشور خاتون تھی۔ صوفیہ پی باڈی SOPHIA PEA BODY نے اسے عزلت نشینی سے نکالا۔ اس کی تنہائیوں کو ختم کیا۔ اسے ادیبوں اور دانشوروں کے حلقوں اور مجلسوں میں لے گئی۔ یوں ہاتھورن کے تعلقات اس دور کے بڑے امریکی لکھنے والوں ایمرسن، الیکوٹ اور مارگریٹ فلر سے ہوئے۔ شادی کے بعد ہاتھورن

نے نقل مکانی کی اور میسنے (کونکارڈ) میں رہائش پذیر ہوئے۔

اب وہ پرسکون اور مسرور خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہا تھا۔ جو اس کی شریک حیات کی دین تھی۔ ۱۸۴۶ء میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ MOSSES FROM AMOLD MANSE شائع ہوا۔ تین برسوں میں کہانیوں کا ایک مجموعہ اتنا باا‌ثر نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے گھر کے اخراجات چل سکتے۔ اس کے بعض دوستوں نے اسے مشورہ دیا اور وہ ان کے مشورے پر سالیم کے کسٹم ہاؤس میں ملازم ہوگیا۔ ملازمت کے دوران بھی وہ کہانیاں لکھتا رہا۔ اس نے کسٹم ہاؤس میں پانچ برس ملازمت کی۔ جب انتظامیہ میں تبدیلی آئی تو اس کی ملازمت چھن گئی۔ اس کی عقل مند بیوی نے ایسے دنوں کے لیے کچھ رقم بچا رکھی تھی۔ اس لیے ہاتھورن مالی پریشانی کا شکار نہ ہوا۔ اور ملازمت چھن جانے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا شہکار "سکارٹ لیٹر" تخلیق کیا۔ جو اب عالمی ادب کا بھی شہکار سمجھا جاتا ہے۔

سکارٹ لیٹر ۱۸۵۰ء میں شائع اور اپنی اشاعت کے ساتھ ہی مقبول ہوگیا۔

ہاتھورن سالیم میں خوش نہ تھا۔ ملازمت کی وجہ سے وہ وہاں مقیم تھا۔ اس لیے وہ اس ناول کی اشاعت اور بے پناہ کامیابی کے بعد سالیم سے نکل کھڑا ہوا۔ اور اپنے گھرانے کے ساتھ کچھ عرصہ لینوکس میں مقیم رہا۔ جہاں اس نے اپنا دوسرا شاہکار THE HOUSE OF THE SEVEN GABLES تحریر کیا۔ اس کے بعد وہ ویسٹ نیوٹن میں آباد ہوا۔ جہاں اس نے ایک کتاب لکھی جو یوٹوپین ذہن رکھنے والوں پر ایک گہری طنز تھی۔

۱۸۵۳ء میں اسے لیورپول میں قونصل مقرر کر دیا گیا۔ یوں اس نے سات برس پرانی دنیا یعنی انگلستان اور اٹلی میں بسر کیے۔ یہیں اس نے اپنی کتاب MARBLE FAUN لکھی جس کا پس منظر اور ماحول اطالوی ہے۔ ۱۸۶۰ء میں وہ واپس کونکارڈ لوٹا اور یہیں اپنی زندگی کے آخری چار برس گزارے۔ اپنی علالت اور خانہ جنگی کی وجہ سے یہ برس بہت رنج و ملال میں گزارے۔ اس کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیٹی اور بیوہ نے اس کی کچھ اور کتابیں بھی شائع کیں۔

ادب میں کبھی کبھی ایسی روش بھی چل نکلتی ہے کہ کسی منفرد لکھنے والے کو بھی کسی دوسرے کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔ ہاتھورن کے بارے میں بھی ایک زمانے میں ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔ اس میں اور ایڈگر ایلن پو میں گہری مشابہت تلاش کی گئی۔ حالانکہ ہاتھورن کی کہانی کا کوئی انداز ایڈگر ایلن پو کی کہانی سے نہیں ملتا۔ انیسویں صدی کے آخر تک امریکہ میں جو تنقید لکھی گئی اس میں یہی اندازِ فکر دکھائی دیتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو اپنی کہانیوں میں ڈراما پیدا کرنے کے لیے جو وحشت ناک تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس سے ہاتھورن کی کہانیاں یکسر خالی ہیں۔ پھر اسلوب کے اعتبار سے بھی دیکھیں۔ جو موثر اور ہنرمندانہ اسلوب ہاتھورن کی کہانیوں کا ہے۔ پو اس سے بہت دور دکھائی دیتا ہے پو کا اسلوب تحریر خاصا مختلف تھا۔

"سکارلٹ لیٹر" اور "ہاؤس آف دی سیون گیبلز" کے حوالے سے ہاتھورن نہ صرف امریکی ادب میں بلکہ عالمی ادب میں بھی سب سے الگ، منفرد اور یکتا دکھائی دیتا ہے وہ بڑا تخلیقی فنکار تھا۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے وہ فن کی دنیا میں بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جس انداز سے وہ اپنے ناول اور کہانیوں میں ماحول تخلیق کرتا ہے۔ اس کو سامنے رکھیں تو ہارڈی جیسا مصنّف — جسے اپنے خاص وصف پر بڑا فخر ہے ہمیں ہاتھورن ان سے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جوزف کانرڈ کو بھی ماحول کی تعمیر اور تاثیر پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ لیکن اس کے ناول بھی اس خاص حوالے سے ہاتھورن کے دونوں فن پاروں سکارلٹ لیٹر اور دی ہاؤس آف دی سیون گیبلز سے بہت پیچھے دکھائی دیتا ہے۔ ا

ہنری جیمز نے سکارلٹ لیٹر اور ہاؤس آف سیون گیبلز کو امریکی ادب کے ایسے شاہکار قرار دیا ہے جن کی مثال پورا امریکی ادب پیش نہیں کر سکتا۔

"سکارلٹ لیٹر" ایک متعصب مقتدر مذہبی معاشرے کی کہانی ہے۔ جس میں چلنگورتھ ہیسٹر، پرل اور ایک پادری جیسے انسان بستے ہیں۔

چلنگورتھ ایک بدہیئت، ادھیڑ عمر طبیب ہے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکلا رہتا ہے
ہیسٹر اس کی بیوی ہے۔ جوان خوب صورت شائستہ، پادری اس علاقے کا وہ فرد
ہے، جسے لوگ کرامتوں والا پادری کہتے ہیں۔ اسے خداوند یسوع کا مظہر سمجھتے ہیں، اس
کے روحانی کرشموں، اس کی عبادات، اس کے زرد اور حسین چہرے پہ سارا علاقہ مرمٹا ہے
چلنگورتھ اپنی بیوی ہیسٹر کو چھوڑ کر طویل عرصے کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی
عدم موجودگی میں پادری اور ہیسٹر جو اپنے اپنے جذبات کو دبائے بیٹھے ہیں، ایک دن جذبات
کی طغیانی میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں فطرت جو
بڑی جابر ہے، اپنا آپ منواتی ہے۔ انسانوں کے صبر و ضبط کے بند تنکے کی طرح بہالے
جاتی ہے۔ فطرت جو انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے زیادہ قوی اور جابر ہوتی ہے۔
اس ملاپ، اس فطری تقاضے کے پورا ہونے کے بعد ہیسٹر ماں بنتی ہے۔ اس کے
ہاں جو بچی پیدا ہوتی ہے اس کا نام پرل رکھتی ہے۔ اس کا باپ کرامتوں والا پادری ہے
اس گناہ کی پاداش میں ہیسٹر کا دیندار معاشرہ اسے یہ سزا دیتا ہے کہ وہ اپنے سینے پر
ہمیشہ سرخ رنگوں سے کڑھا ہوا A کا نشان آویزاں رکھے تاکہ لوگوں کی نظروں میں ہمیشہ
ایک حقیر زانیہ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اپنے گناہ کی تشہیر کرنے پر وہ مجبور ہے۔ کیونکہ
وہ جس معاشرے میں رہتی ہے وہ بڑا طاقتور ہے۔
وہ کسی کو یہ نہیں بتاتی کہ اس بچی کا باپ کون ہے۔ وہ بہت اچھی کڑھائی کرتی
ہے۔ ایک محنتی شائستہ عورت ہے۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر لاپتہ ہو چکا ہے۔ اپنا
پیٹ پالنے کے لیے وہ کام کرتی ہے۔ اب وہ ایک بچی کی ماں ہے۔ پورا معاشرہ اس
کے گناہ کی سزا تو دے سکتا ہے لیکن اس کی کفالت کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اس کے
جذبات اور فطری تقاضوں سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔ اُسے لالچ دیا جاتا ہے، اُسے
ڈرایا دھمکایا جاتا ہے لیکن وہ پرل کے باپ کا نام نہیں بتاتی۔
اس کے سینے پر A کا سُرخ دہکتا ہوا انگارہ ہمیشہ کے لیے اس کی ذلت کی نشانی بنا
کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسے مرتے دم تک اسی طرح اس انگارے کی جلن کے ساتھ زندہ

رہنا ہے۔ !

اور ہر کراموں والا پادری روح کی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اصل میں گنہگار تو وہ ہے۔ یہ سزا تو اسے ملنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ "بزدل" ہے وہ اپنے گناہ کا اعتراف نہیں کر سکتا۔

اور پھر وہ خبیث بوڑھا چلنگورتھ واپس آجاتا ہے۔ وہ بہت گھٹیا بہت چھوٹا انسان ہے۔ جو کام کسی نہ کر سکا وہ نفرت اور انتقام کی وجہ سے خود کرنا چاہتا ہے۔ "تلاش اس شخص کی جو پرل کا باپ ہے۔ جس نے اس کی بیوی کے ساتھ گناہ کیا۔ وہ سراپا انتقام ہے۔ وہ بدی کی علامت ہے۔ وہ طبیب ہے۔ لیکن جسم کے فطری تقاضوں کو نہیں سمجھتا پھر وہ پادری تک جا پہنچتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ پادری جرات کے آخری پہر اپنے جسم پر کوڑوں کی بارش کرتا ہے یہی وہ شخص ہے جو پرل کا باپ ہے۔

چلنگورتھ، ہیسٹر، پادری اور پرل ، اور وہ پورا معاشرہ اس فن کارانہ انداز سے سکارلٹ لیٹر میں پیش ہوئے ہیں کہ ایک بار پڑھنے والا قاری ساری عمر اس ناول کے طلسم سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جس فضا، ماحول اور جس گہری انسانی بصیرت کے ساتھ انسانی جذبات کو ہاتھورن نے اس ناول میں تخلیق کیا ہے۔ وہ انمٹ تاثر کا حامل ہے۔

پادری روح کی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ راتوں کو اپنے آپ کو کوڑے مارتا ہے۔ چیختا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ نفس کشی اور عبادت میں مصروف ہے۔ وہ پہنچا ہوا ہے۔ وہ SAINT ہے۔ حالانکہ وہ انسان ہے جو بھٹک گیا ہے۔ جسے فطرت نے ورغلایا تھا۔ اور اب جیتے جی جہنم سے بھی بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔ اور پھر چلنگورتھ اس کا تماشائی ہے۔ اسے دیکھتا ہے۔ اس کی اذیت سے خوش ہوتا ہے ....

اور پھر ایک دن پادری ہمت کرتا ہے۔ پورا شہر جمع ہے۔ جہاں وہ مرنے سے پہلے اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ جب وہ اپنا چوغہ اتارتا ہے تو لوگ دیکھتے ہیں کہ اس کے دل کے عین اوپر A کا لفظ دہک رہا ہے۔ پادری مرتے مرتے چلنگورتھ کی

طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے :-

"خدا تمہیں معاف کرے ..... تم نے بھی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے !

پادری جس حقیقت کو پالیتا ہے وہ اتنی بڑی اور سفاک ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے درجنوں صفحوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اسی ایک جملے میں ہاتھورن نے اس کا اظہار کردیا ہے۔ پھر وہ اپنی بیٹی کی طرف مڑتی اور بکھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے :-

"MY LITTLE PEARL, DEAR LITTLE PEARL,

WILT-THOU KISS ME NOW ....

PEARL KISSED HIS LIPS"

پادری کے کردار کے اردگرد ہاتھورن نے ایک ایسا ہالہ بُنا اور تیار کیا ہے کہ اس کے اس اعتراف کے باوجود شہر کے لوگ اُنہیں گنہگار نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اسے بھی پادری کی بڑی کرامتوں میں سے ایک کرامت سمجھتے ہیں کہ اس نے ہیسٹر کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس نے اپنے سینے پر دہکتا ہوا 'A' کوڑوں کی ضربوں سے بنا کر دراصل ہیسٹر کے لیے نجاتِ اُخروی حاصل کی تھی۔

سکارلٹ لیٹر میں پادری اور ہیسٹر کی بچی کا نام ہاتھورن نے PEARL رکھا ہے صاف، شفاف، بے داغ، موتی، عصمت اور عفت کی علامت۔

اب اس پر غور کرنا قارئین کا مسئلہ ہے۔

ڈیڈ سولز

اس سوال کا جواب میں عالمی ادب اور گوگول کے قاری کی حیثیت سے بڑی آسانی سے دے سکتا ہوں کہ گوگول کے ناول "ڈیڈ سولز" کو دنیا کے دس عظیم ترین ناولوں میں کیوں اور کیسے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ناول کے حوالے سے بعض سوال میرے ذہن میں ہمیشہ پیدا ہوئے ہیں جن کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔

ایک بڑا سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ ناول مکمل ہو جاتا تو پھر اس کی ادبی اور تخلیقی اہمیت کیا ہوتی کیا اسے دنیا کے دس بڑے ناولوں اور سو عظیم کتابوں میں شامل کیا جاتا؟

کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب تو دیا جا سکتا ہے کہ مفروضوں پر کسی حقیقت کی بنیاد نہیں رکھنی چاہیئے۔ فلابیر کے آخری ناول کو بھی تو دنیا کا عظیم ناول تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ نامکمل ہے۔ کافکا کے ناول "ٹرائل" اور "کاسل" کے بارے میں بھی مسئلہ اٹھتا ہے کہ وہ نامکمل ہونے کے باوجود دنیائے ادب کا شہکار ہیں۔ یہ ناول جس حالت میں بھی ہیں میں اسی صورت کو قبول کرتے ہوئے ان کو سمجھنا، پڑھنا اور پھر ان کا ادبی مقام قائم کرنا ضروری ہوگا۔ جب کہ دنیائے ادب کے ناقدوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "ڈیڈ سولز" گوگول کا ہی عظیم شاہکار نہیں۔ روسی زبان کا ہی بے مثل فن پارہ نہیں، بلکہ عالمی ادب میں یکتا ہے۔

لیکن وہ سوال جس کا جواب کسی صورت بھی کم از کم میرے لیے دینا ممکن نہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ کوئی تخلیق کار کسی حد تک اپنی روح، احساسات اور پورے وجود سمیت اپنی تخلیق کے ساتھ ملوث ہو سکتا ہے۔ اس کی تخلیق کس حد تک اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

یہ بہت اہم سوال ہے اور دُنیا میں چند ہی ایسے تخلیقی فن پارے لکھے گئے ہیں جن کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کا سامنا کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کچھ گفتگو گوگول کے بارے میں ہو جائے۔ اس کے فن کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ اور پھر اس کے اس شہکار "مردہ روحیں" DEAD SOULS پر گفتگو کی جائے۔

نکولائی واسیلی وچ گوگول ۱۸۰۹ء کو یوکرین میں پیدا ہوا۔ بچپن میں ہی اس نے یوکرین کے فوک ادب اور کرداروں سے گہری واقفیت پیدا کر لی تھی۔ یوکرین میں ہی اس نے تعلیم حاصل کی اور پھر وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے پیٹرز برگ کا رُخ کیا۔ تب اس کا ارادہ سٹیج اداکار بننے کا تھا۔ لیکن اس وہ ناکام رہا اور نتیجے میں اسے کلرکی کرنی پڑی۔ کچھ عرصہ وہ ایک سکول میں پڑھاتا بھی رہا وہ اپنی ملازمتوں سے غیر مطمئن تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایک نظم لکھی جو اس کے نام کے بغیر شائع ہوئی تو اس کی ہمت بندھ گئی۔ گوگول کی شہرت کا آغاز کہانیوں سے ہوتا ہے۔ جب اس کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈنکا کے قریب ایک فارم ہاؤس میں بیتی شامیں" شائع ہوا تو بطور ادیب اور افسانہ نگار اس کی لازوال شہرت کا آغاز ہوا اور انہی کہانیوں کی وجہ سے وہ روس کے عظیم شاعر اور جدید روسی ادب کے بانی پشکن کی قربت میں پہنچا۔ وہ پشکن کا مداح بن گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت پشکن کی رفاقت میں بسر ہوتا۔ اس زمانے میں اس نے اپنے ایک دوست کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

"میں نہیں جانتا کہ میں چند دنوں کے بعد کہاں ہونگا۔ لیکن اگر مجھے پشکن کی معرفت اس کے پتے پر خط لکھا جائے تو یہ خط مجھے ضرور مل جائے گا۔"

گوگول کو اس کی کہانیوں کی اشاعت کی وجہ سے پیٹرز برگ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لیکچرار لگا دیا گیا۔ لیکن اس سے اس نے کم ہی فائدہ اٹھایا۔ اور اس کی لیکچرر شپ کا زمانہ بہت مختصر ہے اس کے شاگردوں میں ترگنیف بھی شامل تھا جو ساری عمر گوگول کا مداح اور اسے پوجتا رہا۔

گوگول جہاں بحیثیت انسان بہت عجیب و غریب شخص تھا۔ وہاں وہ بعض لازوال تخلیقات کی وجہ سے بھی ساری دنیا کے لیے اب تک دل چسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس نے یوکرین کے علاقے اور اس کے لوگوں، ثقافت اور رسم و رواج کو زندہ جاوید کر دیا۔ عالمی ادب کا کونسا

ایسا طالب علم ہے جس نے گوگول کے شاہکار "تارس بلبا" کو نہ پڑھا ہو۔ تارس بلبا اس کا وہ طویل افسانہ یا ناولٹ ہے۔ جس نے اپنی اشاعت کے دور سے لے کر اب تک ساری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ آزادی کے لیے لڑنے والوں، شجاع کرداروں کے حوالے سے تارس بلبا ایک لافانی کردار ہے۔

دنیا کے شاہکار افسانوں کی جب بھی فہرست بنے گی اس میں "اوورکوٹ" کا نام شامل ہوگا۔ دوستوئفسکی نے اوورکوٹ کے حوالے سے لکھا تھا۔

"روسی ادب نے گوگول کے اوورکوٹ سے جنم لیا ہے۔"

اس عظیم افسانے کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ عالمی افسانے کا انتخاب اس افسانے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اردو میں اس شہکار افسانے کا ترجمہ ستار طاہر نے کیا ہے جو "امروز" میں شائع ہوا تھا۔

تارس بلبا، اوورکوٹ کے خالق گوگول نے ہی "ڈائری آف اے میڈ مین" DIARY OF A MAD MAN جیسا شاہکار بھی لکھا ہے جو اس کے سب افسانوں سے مختلف ہے۔ اور اس افسانے کا شمار بھی دنیا کے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے۔

گوگول اداکار نہ بن سکا۔ لیکن ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس نے "انسپکٹر جنرل" جیسا شاہکار لکھا۔ جو عالمی ڈرامے میں یکتا اور لازوال مقام کا حامل ہے۔ "انسپکٹر جنرل" کے ساتھ بہت سے واقعات وابستہ ہیں۔ جب یہ کھیل لکھا گیا تو سنسر کے لیے گیا تو زار شاہی نے اسے سٹیج کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر یہ کھیل خود زار نکولس اول نے پڑھا اور بعض ترامیم کے اسٹیج کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ گوگول نے اس سلسلے میں اپنی والدہ کے نام لکھا تھا۔

"اگر خود شہنشاہِ معظم اسے سٹیج کرنے کی اجازت نہ دیتے تو نہ یہ کھیل سٹیج ہو سکتا نہ ہی اس کی اشاعت ممکن تھی۔"

جب یہ کھیل ۱۹ اپریل ۱۸۳۶ء کو پہلی بار پیٹرز برگ میں سٹیج ہوا تو خود زار نکولس اول کھیل دیکھنے والوں میں شامل تھا۔ اور کھیل کے اختتام پر اگرچہ گوگول وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن زار نکولس اول سٹیج پر خود آیا۔ اداکاروں سے بات چیت کی۔

انسپکٹر جنرل ایک عالمی اپیل اور صداقت رکھنے والی طنزیہ کامیڈی ہے۔ سرکاری نظام افسر شاہی پر اس سے زیادہ بلیغ اور شگفتہ طنز عالمی ادب میں شاذو نادر ہی ملتی ہے۔ ہمارے پاکستان میں ایوب خاں کے دور میں آغا بابر نے اس کھیل کو "بڑا صاحب" کا روپ دیا اور ایوب دور میں بڑا صاحب کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی اور ابھی ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ مشرقی یورپ کے ایک اشتراکی ملک میں ایک تھیٹر کا مینجر کو اس لیے نوکری سے جواب دے دیا گیا کہ اس نے گوگول کا یہی کھیل "انسپکٹر جنرل" سٹیج کرنے کی جسارت کی تھی۔

تارس بلبا، یوکرین کے بارے میں زندہ کہانیوں اوور کوٹ، ڈائری آف اے میڈ مین اور انسپکٹر جنرل جیسے لازوال شاہکاروں کے خالق۔ گوگول کی آخری تخلیق "ڈیڈ سولز" تھی۔

گوگول کا فن ایسا ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ اردو میں اس کی کئی کہانیوں اور ڈراموں کا ترجمہ ہوا۔ لیکن اس کی شخصیت اور فن کے بارے میں سلیقے سے کسی نے کام نہ کیا۔

گوگول عجیب وغریب آدمی تھا۔ وہ ساری عمر کنوارا رہا۔ وہ خود لکھتا ہے اس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی۔ نہ ہی اس سے کبھی کسی نے محبت کی۔ کبھی جنسی جذبات کو محسوس نہ کیا اور کبھی کسی جسم کی قربت سے آشنا نہ ہوا۔ اسے اپنی ان محرومیوں پر فخر تھا۔ اپنی آخری عمر میں وہ البتہ چند خواتین کا ذکر ضرور کرتا ہے جن سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کبھی حظ اٹھایا تھا اور شاید ایک بار اس نے شادی کا ارادہ بھی کیا تھا۔ لیکن یہ قصہ بھی بس ارادے تک ہی محدود رہا۔

وہ ذہنی اور عملی طور پر بے چین اور آوارہ گرد تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ روس سے باہر بسر کیا۔ گوگول کے حواس پر "ناک" چھایا ہوا تھا۔ ناکوں کے بارے میں وہ بڑا وہمی تھا۔ اس کا یہ عجیب وغریب OBSESSION اس کی ایک کہانی میں ظاہر ہوا۔ جسے میں موجودہ دور کی جدید ترین کہانی سے تعبیر کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ کہانی آج سے تین سو برس پہلے لکھی گئی تھی۔ فرائیڈین نقطۂ نظر سے ناکوں کے بارے میں اس کی دلچسپی اور وہم کی تعبیر کی جا سکتی ہے اور اس سلسلہ میں اس کا ساری عمر جنس سے گریز بھی بہت سی گتھیوں کو کھولتا ہوا ملتا ہے۔

اس عظیم شخصی، ادبی اور تخلیقی پس منظر میں گوگول کے عظیم شاہکار "ڈیڈ سولز" کا جائزہ

لینے کی ضرورت ہے۔

"ڈیڈ سولز"

گوگول نے "ڈیڈ سولز" کے پہلے حصے کی تکمیل پر آٹھ برس کا عرصہ (۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۲ء تک) صرف کیا اور اس کے بعد اس ناول کے دوسرے بدقسمت حصے کی تکمیل پر دس برس لگائے یعنی ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۲ء تک۔ اس کے بعد وہ اس کے تیسرے حصے پہ کام کرنے لگا۔ اس کے بارے میں گوگول کا دعوےٰ تھا کہ یہ اختتامی تیسرا حصہ اس کو لازوال شہرت سے ہمکنار کرے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد دوسرے حصے تک اس پر جو بیتی اس نے ہی اس کی ذاتی زندگی اور اس ناول پر ایسے اثرات مرتب کیے کہ تیسرا حصہ شروع ہی نہ ہو سکا۔

گوگول نے اعتراف کیا ہے کہ "ڈیڈ سولز" کا موضوع پشکن کی دین ہے۔ یہ پشکن ہی نے اسے بتایا تھا گوگول نے اپنے "اعتراف" میں لکھا ہے کہ پشکن اس موضوع پر بڑی نظم لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گوگول کو اس اعزاز پر جو فخر حاصل ہے وہ بے جا نہیں کہ پشکن نے اسے یہ موضوع دیا اور پشکن کو گوگول اتنا عزیز تھا کہ اس کے علاوہ یہ موضوع وہ کسی کو بھی نہ دیتا۔

جون ۱۸۳۶ء میں روس سے جانے سے پہلے گوگول ۱۸۳۴ء کے اواخر میں یہ ناول شروع کر چکا تھا۔ اس نے اس کے ابتدائی ابواب پشکن کو بھی سنائے تھے۔ جس کے ردِّ عمل کو گوگول نے اسی جملے میں اپنے "اعترافات" میں محفوظ کر دیا ہے:

"وہ بے حد پژمردہ دکھائی دینے لگا اور بالآخر بولا: "آہ ہمارا روس کتنا غمزدہ اور اداس ہے۔"

۱۸۳۶ء میں جب گوگول سوئٹزرلینڈ میں تھا تو وہ یہ ناول لکھ رہا تھا۔ جب وہ پیرس گیا تو وہاں بھی اس کی تکمیل کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۷ء کے موسم خزاں اور ۱۸۳۸ء میں گوگول روم میں ناول کے پہلے حصے پر نصف سے زیادہ کام کر چکا تھا۔ اس ناول کی تحریر کے دوران میں ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا۔ جس کا ذکر بے حد ضروری ہے اور یہ واقعہ خود گوگول نے ہی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"میرے ساتھ عجیب ماجرا ہوا ۔ میں جولائی کے مہینے میں ایک دن البانو اور گنزالو نامی چھوٹے قصبوں کے درمیان جا رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک خستہ حال سرائے میں رکنا پڑا ۔ جو ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھی ۔ لوگ وہاں مختلف زبانوں میں مسلسل گفتگو میں مصروف تھے ۔ بلیرڈ کی میز سے مسلسل گیندوں کی کھٹا کھٹ آواز آ رہی تھی ۔ ان دنوں میں اپنے ناول "ڈیڈ سولز" کا پہلا حصہ لکھ رہا تھا ۔ اس لیے اس کا مسوّدہ کبھی اپنے آپ سے دور نہ کیا تھا میں نہیں جانتا کہ اچانک کیا ہوا لیکن جونہی میں اس پُرہجوم اور پُرشور سرائے کے اندر داخل ہوا ۔ میرے پورے وجود کو اس خواہش نے غلبے میں لے لیا کہ میں ابھی لکھنا شروع کردوں ۔ میں نے ایک چھوٹی میز لانے کا حکم دیا ۔ اور سرائے کے ایک گوشے میں رکھوا کر بیٹھ گیا ۔ مسودہ نکالا اور تمام تر شور کے باوجود میں لکھنے لگا ۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا ۔ آس پاس کا احساس ہی میرے وجود نے قبول کرنا بند کر دیا تھا ۔ میں نے اس ماحول میں پورا ایک باب لکھا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب کے لکھنے میں مجھے جو تحریک حاصل ہوئی وہ بے مثل اور عجیب تھی ۔ اس تحریک نے ہی مجھ سے ایسا باب لکھوایا جو بے حد شاندار، خوب صورت اور سب سے بہتر ہے ۔"

اپنی تحریر میں گوگول نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس خاص تحریک کے تحت اس نے کون سا باب اس پُرہجوم سرائے میں لکھا تھا ۔ تاہم اس کے بارے میں مختلف قیاسات پائے جاتے ہیں ۔ گوگول کے سوانح نگار اور نقاد پاول اینیسکوف نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہی زیادہ معتبر اور مستند قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس نے لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۱ء میں گوگول اپنے ناول پر نظرِ ثانی کر رہا تھا تو اس نے ایک باب کا بطورِ خاص ذکر کیا ۔ جب وہ اس شاندار، خوبصورت اور بے مثل باب کو دوبارہ مجھ سے لکھوا چکا تو خود میں اس باب سے اتنا متاثر ہو رہا تھا کہ میں نے کہا نکولائی گوگول میرا خیال ہے کہ یہ باب واقعی ایک حقیقی جینئس کی تخلیق ہے ۔

گوگول نے مسودے کو بڑی مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا ۔ "تم ٹھیک کہتے ہو ۔ لیکن دوسرے

اوراب بھی بُرے نہیں، پھر بولا" چلو ہم تھوڑی دیر کے لیے سیر کرنے چلیں۔ چلتے وقت اس خیال سے کہ بارش نہ ہونے لگے۔ اس نے اپنا چھاتہ بھی ساتھ لے لیا۔ وہ بہت مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے اس باب پر نازاں۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جونہی ہم ایک سنسان اور خالی گلی میں داخل ہوئے۔ گوگول گانے اور رقص کرنے لگا۔ وہ یوکرینی رقص کے ساتھ یوکرینی نغمہ گا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے جوش سے چھاتے کو بھی لہرا رہا تھا وہ اتنا مدہوش اور پُرجوش تھا کہ چھاتہ اس کے ہاتھ سے یوں چھوٹا کہ اس کی ہتھی اس کے ہاتھ میں رہ گئی اور باقی چھاتہ دور جا گرا۔ اس نے رقص کرتے ہوئے چھاتے کو اٹھایا۔ اس طرح گوگول نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

گوگول کو اپنے ناول" ڈیڈ سولز" کے بارے میں ہمیشہ سے یہ یقین تھا کہ ناول بہت سنسنی پھیلائے گا۔

اس ناول کا ہیرو ایک مکار عیار شخص ہے۔ شیطان کا ایک بہروپ اس کا نام شیشکوف ہے وہ ایک عجیب چال چلتا ہے۔ روس میں زرعی غلام رکھنے کا رواج تھا۔ زرعی معیشت کا تمام تر دارومدار ان زرعی غلاموں (SERFS) پر تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار ان زرعی غلاموں کی ملکیت پر فخر کرتے تھے۔ ان کا اندراج باقاعدہ رجسٹروں میں درج ہوتا اور پھر مردم شماری میں بھی ان کو شامل کیا جاتا۔ شیشکوف مردہ زرعی غلاموں کی روحوں کو خریدنے نکلتا ہے۔ یہ دنیا کا عجیب وغریب کاروبار ہے جو وہ کر رہا تھا۔ وہ ان غلاموں کو خریدتا جو مر چکے تھے۔ گویا وہ مردہ روحیں خرید رہا تھا۔ اس سے وہ کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ مردہ غلاموں کو کوڑیوں کے داموں خرید کر اپنی ملکیت ظاہر کر کے ان کو آگے دھوکہ دہی سے بیچنے کا خواہاں تھا۔ اپنے اس کاروبار میں وہ پورے روس کے دیہات کا دورہ کرنے نکلا۔ ایک طرف تو شیشکوف ہے اس کا کردار اس کا کاروبار اور دوسری طرف پھیلے ہوئے روسی دیہات اور اس میں بسنے والے گوں ناگوں انسانی کردار۔

گوگول اس ناول کا آغاز کرتے ہی اس ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اسے اپنے ناول کا صحیح مقصد پہلے سے معلوم ہونا چاہیئے۔ وہ بار بار اس ناول کے بارے میں ذہنی طور پر الجھتا

تھا۔ ایسے سوالوں سے جو اس کی تخلیقی زندگی میں پہلے شاید کبھی پیدا نہ ہوئے تھے جب تک تو وہ اس ناول کی تحریک اور کیفیت میں اس طرح شرابور تھا کہ وہ لکھتا چلا گیا وہ اس وقت ایک خاص تخلیقی ۱۸۷۲ء کے زیر اثر تھا۔ لیکن بعد میں جب تخلیقی تحریک رُک گئی تو وہ بے حد پریشان ہوا اور یہیں سے اس کے ان ذہنی امراض کا آغاز ہوا۔ جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئے وہ ان ذہنی امراض سے نجات حاصل کرنے کے لیے پھر روس سے باہر چلا گیا۔ تاکہ سیر و سیاحت ہی کسی طرح اس کے غم کا مداوا بن سکے۔ ۱۸۶۷ء میں جب اسے روس چھوڑے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ کوئی معمولی انسان نہیں کر سکتا۔ میں اپنی روح میں شیر جیسی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں اس نے لکھا۔

"اگر میں نے اس ناول کو مکمل کر لیا تو یہ کتنا فقید المثال کارنامہ ہوگا۔ پورا روس اس میں ظاہر ہوگا۔ یہ میرا سب سے عمدہ تخلیقی کارنامہ ہوگا۔ جو مجھے ہمیشہ کے لیے زندہ کر دے گا۔"

اس ناول کو اگر ایک دلدل سے تعبیر کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ گوگول اس میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ پہلے تو وہ پورے روس کو اس میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس سے بھی اس کی تشفی نہ ہو رہی تھی۔ اس ناول کے موضوع کے حوالے سے وہ سمجھنے لگا کہ مقدر نے اسے ایک ایسا موقع فراہم کیا ہے کہ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ناول کو روس کی نجات کا ایک وسیلہ بنا سکتا ہے۔

مارچ ۱۸۴۱ء میں اس نے اپنے ایک دوست کے نام روم سے ایک خط میں لکھا۔

"یہ خدا کا مقدس ارادہ ہے۔ ایسے موضوع انسان کے ذہن میں خود نہیں آسکتے۔ انسان خود ایسے موضوع سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ڈیڈ سولز" کے پہلے حصے میں ایسے اشارے اور کنائے ملتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کچھ لکھنے والا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جس اسرار کو وہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ وہ اس

ناول کے موضوع کی انتہائی گہرائیوں میں اسے برآمد کر کے تخلیقی سطح پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔

وہ اپنے ہی اس ناول، اپنی ہی اس تخلیق میں اس طرح اُلجھتا چلا گیا کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اس ناول کے حوالے سے وہ دراصل اپنے وجود کے معمے" کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ ذہنی اور دماغی طور پر علیل رہنے لگا تھا۔ اس کی بیماری طوالت پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ ایسے ذہنی کرب سے دوچار ہوا جس نے اس کے حواس اور اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ بہرحال اسے ڈیڈ سولز کا پہلا مکمل حصہ شائع کرنا پڑا۔ کیونکہ صحت کے علاوہ اس کے مالی حالات بھی دِگرگوں ہو چکے تھے۔ اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ناول کا پہلا حصہ شائع ہو اور کچھ پیسے ہاتھ لگ سکیں۔

جنوری ۱۸۴۲ء میں وہ ماسکو واپس آیا اور آتے ہی ناول سنسر کے لیے بھجوا دیا۔ سنسر نے اس کے ناول کو اشاعت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ روحوں کو مُردہ قرار دے کر وہ مذہبی عقائد کی نفی کر رہا ہے۔ گوگول نے اسے سنسر کرنے کے لیے پیٹرز برگ بھجوا دیا۔ یہاں سنسر کے حکام نے ناول کے اس حصے پر شدید اعتراض کیا۔ جس میں کپتان کوپیکین کی تباہی کا ذمے دار سرکاری حکام کو قرار دیا گیا۔ سنسر کے حکام کے مجبور کرنے پر اسے یہ حصہ بدلنا پڑا۔ اس میں اس کردار کو اپنی تباہی کا خود ذمے دار دکھایا (بعد میں جو ناول شائع ہوا اس میں اصل مسودے کو ہی شامل کیا گیا۔ جو ناول آج ملتا ہے وہ بھی اور یجنل حصے پر مشتمل ہے۔)

۲ر جون ۱۸۴۲ء کو ڈیڈ سولز کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اسے خاصی شہرت ملی۔ لیکن یہ گوگول کی توقع سے بہت کم تھی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ اس ناول کے بعد میں لکھے جانے والے حصے پورے روس کو ہلا کر رکھ دیں گے۔

دوسرے حصے میں گوگول روس کی روح کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے معمے کو بھی حل کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے حصے میں وہ اس ناول کے حوالے سے روس کو نجات کا راستہ دکھانے کا خواہاں تھا۔ لیکن اب وہ ذہنی علالت کے اس درجے میں تھا کہ اس سے کچھ لکھا نہ جا رہا تھا۔ جون ۱۸۴۵ء میں اس نے ڈیڈ سولز کے اس پورے دوسرے حصے کو خود نذرِ آتش کر دیا۔ جتنا کہ اس نے اسے اب تک لکھا تھا۔

اب وہ اپنی ذات کے الجھاؤ میں پھنس چکا تھا۔ اُسے خود روحانی رہنمائی کی ضرورت ہوئی۔ ایک مذہبی جنونی پادری میتھو اس کی رہنمائی کے لیے آیا جس نے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ اس کی تمام بیماریوں کی جڑ اس کی تصانیف ہیں اور اسے چاہیے کہ اس نے ڈیڈ سولز کا جو حصہ لکھا ہے اسے جلا دے۔ اس کے بعد وہ ترکِ دنیا کر کے خانقاہ میں چلا جائے۔ اس میں اس کی نجات ہے۔ گوگول نے پادری میتھیو کی خواہش پوری کرتے ہوئے ڈیڈ سولز کے دوسرے اور تیسرے حصے کو جتنا اس نے لکھا تھا نذرِ آتش کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۴ر فروری ۱۸۵۲ء کی رات کو پیش آیا اور اس کا اسے اتنا صدمہ ہوا۔ اپنی عظیم تخلیق کو اپنے ہاتھ سے جلا دینے کے غم نے اسے ہمیشہ کے لیے بستر سے لگا دیا۔ اس نے فاقے کرنے شروع کر دیے۔ غذا کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور اسی فاقہ کشی کے عالم میں اپنے مسوّدے کو نذرِ آتش کرنے کے نو دن بعد ۱۸۵۲ء کو گوگول کا انتقال ہو گیا۔

'ڈیڈ سولز' جو اس وقت دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس میں پہلا حصہ مکمل ہے دوسرے حصے کے وہی صفحات اس میں ملتے ہیں جو اس مسوّدے کا پہلا ڈرافٹ تھا۔ اور وہ بھی نامکمل ہے۔

وہ اپنے اس ناول کے ذریعے اس 'راز' کو ظاہر نہ کر سکا جس میں پوری بنی نوعِ انسان کی نجات مضمر تھی۔ اس کی اپنی تخلیق اس کے لیے موت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس کی روح اور وجود اس تخلیق میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ گوگول کی وفات کے آٹھ برس بعد روس میں زرعی غلاموں کے ادارے کو معطل کر دیا گیا۔ لیکن اپنی نامکمل صورت میں بھی 'ڈیڈ سولز' زندہ ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی کرداروں کی جو گیلری بنائی گئی ہے وہ انمٹ ہے۔ ہر رنگ لازوال۔ کیونکہ اس ناول کے کردار تمام بنی نوعِ انسان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ہیریٹ سٹوو

انکل ٹامز کیبن

دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے داعی سرپرست امریکہ میں "کالے" یعنی حبشی کس طرح زندہ ہیں۔ ان کے حقوق کس طرح پامال کیے جاتے ہیں۔ آج وہ پہلے درجے کے شہری کیوں تسلیم نہیں کیے جاتے؟ ان کی تحریکوں، رویوں، موسیقی وادب اور سیاست مقبیرٹر کے بارے میں آج کا بالغ نظر قاری بہت کچھ جانتا ہے۔ کیونکہ موسیقی، باکسنگ، اداکاری ناول، افسانہ اور سیاست میں انیسویں، بیسویں صدی میں ایسے سرکردہ حبشی فنکار اور لکھنے والے پیدا ہوئے جن کی شہرت اور کام سے پوری دنیا واقف ہے۔

کبھی کبھی میں آج کے اور ماضی قریب کے بعض بڑے حبشی ناول نگاروں کے کام کو پڑھتے ہوئے سوچتا ہوں کہ ان کا کام اپنی نسل اور نسل کی ذاتی اور اجتماعی صعوبتوں کی صحیح آئینہ داری کرنے کے باوجود۔ اس اثر پذیری کا حامل کیوں نہیں۔ جو ہیریٹ بیچر سٹوو کے ایک ناول میں اس انداز میں سامنے آئی کہ پورا امریکہ گونج اُٹھا اور ...

لیکن اس اور سے پہلے کچھ اور باتیں .....

حبشی شعرا نے جو کچھ لکھا۔ اس میں اپنی طویل غلامی، صعوبتوں اور سیاسی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ کھینچا۔ وہ بے حد موثر ہے۔ اور بعض شاعر اور ان کی شاعری کو بلاشبہ بڑی شاعری بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جس کا ذکر مجھے اصل میں کسی اور مضمون میں کرنا چاہیے۔ اس وقت فکشن کے حوالے سے بات کرنے کی ضرورت ہے اور یہ موضوع بھی اپنی جگہ اتنا اہم اور پھیلا ہوا ہے اور اس پر بھی اجمالاً ہی بات ہو سکتی ہے۔

انگریزی کے حوالے سے، آج کے بالغ نظر وسیع المطالعہ پاکستانی قاری سے امریکی روپے کے بارے میں بات کی جائے اور اس ضمن میں سوال حبشی لکھنے والوں کا ہو تو۔ پاکستانی قاری جو امریکی ادب کا طالب علم ہے۔ وہ چند بڑے نام اور چند بڑے کام فوراً گنوا دے گا۔ کیونکہ یہ ناول تخلیقی تحریریں ہیں جو ایک نسل کی غلامی اور ان کی حالت کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔

رچرڈ رائٹ کو ہی لیجیے، جس کے ناولوں میں NATIVSON کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اور امریکی نقادوں نے بھی اس ناول کے بارے میں کہا ہے کہ یہ پہلا جدید ناول ہے جو دنیا میں کسی حبشی نے لکھا ہے۔ فیڈمسن تو اس ناول کا خاص طور پر بے حد مداح ہے اور اس نے اس ناول کے حوالے سے کئی مضامین لکھے ہیں۔۔

اس کے بعد ایلی سن (ALLI SON) کا ناول ہے "(THE INVISIBLE MAN)" جس عنوان کے حوالے سے دھیان فوراً ایچ۔ جی۔ ویلز کے ناول کی طرف جاتا ہے۔ جس کا موضوع ہی بڑا چونکا دینے والا ہے اور اس پر متعدد ایسی فلمیں بنی ہیں کہ جنہیں ہر دور میں ان گنت انسانوں نے بڑے ذوق وشوق سے دیکھا ہے۔ لیکن ALLI SON کا ناول "دی انویزیبل مین" دراصل حسنِ اسلوب، موضوع، فنی رچاؤ کے اعتبار سے رچرڈ رائٹ جیسے بڑے لکھنے والے تخلیقات سے بھی اہم اور بڑا ناول ہے۔ اس ناول میں بےحد گہرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا ادبی اور فنی رتبہ بہت اونچا تسلیم کیا گیا ہے۔ پوری انسانیت کا ایک حصہ۔ حبشی۔ امریکہ میں بستا ہے۔ موجود ہے لیکن پھر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسے معدوم اور غائب رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ دیکھا نہیں جاتا۔ ہر چند کہیں کہ ہے مگر نہیں ہے۔۔۔۔ کی ایسی بلیغ معنی خیز تشریح حبشیوں کے حوالے سے شاید ہی دنیا کے کسی فن پارے میں کی گئی ہو۔ رالف ایلی سن کے اس ناول کے مداحوں کی تعداد نہیں بتا سکتا۔ خاص طور پر فرانس کے بڑے والوں نے اسے بے حد سراہا ہے۔

رچرڈ رائٹ اور رالف ایلی سن کے بعد ایک اور بڑا نام سامنے آتا ہے جیمز بالڈو

(JAMES BALDWIN) جیمز بالڈون کے ناولوں، کہانیوں اور حبشیوں جیسے متعلقہ مسائل پر فکر انگیز تحریروں نے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔ بھلا FIRE NEXT SIDE پڑھنے کے بعد کون شخص ہے جو امریکہ میں رہنے والے حبشیوں کی زندگی کے بارے میں دل پر ایک بھرپور نقش ثبت کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ مالکم ایکس کی زندگی پر اس نے جو تخلیقی کام کیا ہے اس کی معنویت کا دائرہ وسیع ہے بالڈون کے ساتھ ساتھ PINTER جیسا ڈرامہ نگار بھی امریکی سٹیج پر اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ پورے امریکہ اور پوری دنیا کو چونکاتا ہے۔

یہ چند آج اور کل کے بڑے تخلیقی نام اور ان کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے سینکڑوں اہم، غیر اہم اور کم اہم لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ... لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح آج کے زمانے میں ہاورڈ فاسٹ نے امریکی حبشیوں کی زندگی کی سچی تصویر کشی اپنے ناولوں بالخصوص FREEDOM ROAD میں کی۔ کیا اسی طرح پہلے ادوار میں کوئی سفید فام امریکی ایسا لکھنے والا نہ تھا۔ جس نے امریکہ میں سفید فاموں کی بالا دستی، جبر ظلم اور سرمایہ دارانہ استحصال کے شکار حبشیوں کو موضوع بنایا ہو۔

اسی سوال کا جواب ہیریٹ بیچر سٹو ہے۔

جس کا ناول "انکل ٹامز کیبن" تکنیک، زبان، فنی رچاؤ کے اعتبار سے یقیناً اتنا بڑا ناول نہیں جتنا بڑا رالف ایلیسن کا یا جیمز بالڈون کا کام ہے لیکن UNCLE TOMES CABIN آج کے تخلیقی اسلوب معیار اور تکنیک کے پیمانے پر کیسا ہی خام اور کمزور کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔ یہ وہ ناول ہے جس میں بڑی سچائی، بلکہ سفاکی سے امریکی حبشیوں کی زبوں حالی اور عہد غلامی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مصنفہ حبشیوں کی حالت زار پر آنسو نہیں بہاتی بلکہ ان کی ہمدردی کے جذبے میں بھی شرابور دکھائی دیتی ہے اور پھر یہ ناول ایک ایسے دور میں لکھا گیا جب حبشیوں کی حق اور مفاد میں لکھنا۔ امریکی معاشرے میں ایک گناہ اور بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔

"انکل ٹامز کیبن" وہ ناول ہے جس نے واقعی دنیا میں انقلاب برپا کیا یہ ان معدودے چند ناولوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ ابراہام لنکن کو

یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے دورِ صدارت میں امریکہ میں غلامی کی تنسیخ کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ جن محرکات اور اسباب کے حوالے سے ابراہام لنکن نے اتنا بڑا انقلابی قدم اٹھایا ان میں واضح حد تک "انکل ٹامز کیبن" کے اثرات بھی شامل تھے۔

انکل ٹامز کیبن کا شمار ان ناولوں میں ہوتا ہے جو بہت پڑھے گئے۔ بہت سی زبانوں میں منتقل ہوئے اور جن کے گہرے اثرات انسانی سماج پر مرتب ہوئے۔

ہیریٹ الزبتھ بیچر سٹووایک پادری لیمن بیچر کی بیٹی تھی جو ۱۴ رجون ۱۸۱۱ء کو لیچ فیلڈ میں پیدا ہوئی۔ وہ چار برس کی تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ۱۸۱۵ء میں ہوگیا اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اور اس کی بڑی ہمشیرہ کیتھرائن نے اپنے ذمے لی جس نے بعد میں ہارٹفورڈ میں ایک سکول قائم کیا۔ جس میں داخل ہونے والی پہلی طالبہ علم ہیریٹ بیچر سٹوو تھی اور اسی سکول میں اس کے بعد ہیریٹ سٹوو نے خود بھی معلّمہ کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کے والد نے ایک زمانے میں اپنا گرجا اور فرائض چھوڑ کر سنسناٹی میں لیمن تھیالوجی سیمناری میں سربراہ کے فرائض سنبھال لیے۔ ہیریٹ کی بڑی بہن کیتھرائن اپنے والد کے ہمراہ چلی گئی۔ کیونکہ وہ مزید مطالعے اور تجربے کے بعد ہارٹفورڈ میں عورتوں کا ایک کالج قائم کرنے کی بڑی خواہاں تھی۔ ہیریٹ نے اس عظیم کام میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹایا۔ بڑی لگن کا مظاہرہ کیا۔

اسی زمانے میں ہیریٹ نے کہانیاں خاکے اور مضامین لکھنے شروع کیے جو مقامی اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔

۱۸۳۶ء میں اس نے سیمناری کے ایک لیکچرار کالون اسٹوو سے شادی کی۔ پادری کالون ایلس سٹوو ایک زندہ اور سچی روح کا مالک تھا۔ وہ امریکہ میں حبشیوں کی غلامی کے خاتمے کا زبردست حامی تھا اور اسے امریکہ کے ماتھے پر ایک بدنما دھبہ سمجھتا تھا۔

شادی کے بعد ہیریٹ نے تحریر و تقریر کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۸۴۳ء میں اس کی ایک تصنیف MAY FLOWER OR SKETCHES OF SCENES AND CHHRACTERS

AMONGS DESCEXIDANTS OF THE PILGRIM "
شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مطالعہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ امریکی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

ہیریٹ بیچر سٹوؤ نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس سنسناٹی میں گزار دیے تھے اس زمانے میں اس کا رابطہ کچھ مفرور حبشی غلاموں سے پیدا ہوا۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بدولت اس نے دیکھا کہ جنوبی امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ کتنا غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کس طرح سفید فام خدا بنے بیٹھے ہیں۔ ان تجربات و مشاہدات نے ہیریٹ بیچر سٹوؤ کو حبشیوں کی غلامی کا کٹر دشمن اور آزادی کا حامی بنا دیا۔

یہ نیک دل عورت جو خالص مذہبی ماحول میں پیدا ہوئی، پروان چڑھی، جس کا باپ پادری تھا جس کا شوہر پادری تھا۔ اس نے اپنی مذہبیت کو انکل ٹامز کیبن میں ہی ایک نئی معنویت کے ساتھ رچایا بسایا ہی نہیں ہے بلکہ وہ مذہب کے مثبت پہلوؤں کو سامنے رکھتی ہے ورنہ امریکہ ہی کے پادری اور مذہبی رہنما تھے جنہوں نے حبشیوں کو شیطان کی اولاد قرار دیا تھا۔ غلامی کو جائز ثابت کیا تھا۔ مذہبی علماء اور پادریوں نے ہی حبشیوں کی غلامی کے ادارے کو اپنے فتووں سے استحکام بخشنے میں ایک نمایاں ترین کردار ادا کیا تھا۔ ایسے ماحول میں ہیریٹ بیچر سٹوؤ کا انحراف بڑی انقلابی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

۱۸۵۰ء میں ہیریٹ کے خاوند کو بوڈوین کالج برنسویک مین میں پروفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ اور یہیں برنسویک میں ہیریٹ بیچر سٹوؤ نے اپنا عظیم تخلیقی ناول انکل ٹامز کیبن یعنی LIFE AMONG THE LWOLY لکھنا شروع کیا۔ اس ضمنی عنوان سے ہی اس کے موضوع کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ ضمنی عنوان ایک دوسری حقیقت کی بھی غمازی کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے ہم رنگ سفید فاموں کو مذہبی پیغام بھی پہنچانا چاہتی ہیں کہ وہ صرف سماجی، عمرانی اور انسانی سطح پر ہی حبشیوں کی غلامی کے خلاف نہ تھی بلکہ مذہبی تعلیمات و اعتقاد کے اعتبار سے بھی وہ غلامی کو غلط اور گناہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایک اخبار نیشنل ایرا (NATIONAL ERA) شائع ہوتا تھا

جو غلامی کے خلاف تھا۔ یہ اعزاز اسی روزنامے کو حاصل ہوا کہ اسی میں انکل ٹامز کیبن قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔ نیشنل ایرا واشنگٹن سے شائع ہوتا تھا۔

مارچ ۱۸۵۲ء میں یہ ناول پہلی بار کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آیا۔ اپنی اشاعت کے ساتھ انکل ٹامز کیبن کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور مخالفوں نے بھی پڑھا۔ بعد میں اس ناول کے ترجمے دنیا کی بائیس زبانوں میں ہر خطے میں اس ناول کو مختلف ادوار میں قارئین نے پڑھا۔ اُردو میں میں نے ایک بھدا اور غلط سا ترجمہ کتابی صورت میں دیکھا تھا وہ ترجمہ اتنا غیر مؤثر تھا کہ مجھے مترجم کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ ا

دنیا میں بہت کم کتابوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایسے وقت شائع ہوئی ہوں کہ جس زمانے میں واقعی انہیں شائع ہونا چاہیے تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اہم تخلیقی کام یا تو وقت سے پہلے شائع ہوئے یا پھر بعد میں۔ انکل ٹامز کیبن ایک ایسے زمانے میں شائع ہوا جو اس کی اشاعت کے لیے موزوں اور برمحل تھا۔ امریکہ میں غلامی کے حق اور مخالفت میں ایک ہنگامہ بپا تھا ملک خانہ جنگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

اس ناول پر معتبر ناقدوں اور متعصب قارئین نے بڑے شدید حملے کیے۔ آنکھیں بند کر کے منافقانہ زندگی بسر کرنے والے بہت سے لوگوں نے اس ناول پر یہ اعتراض کیا کہ جس طرح کی زندگی حبشی کردار ناول میں بسر کرتے دکھائے گئے ہیں۔ وہ غلط جھوٹ اور مبالغہ آمیزی سے مملو ہے۔ حبشی تو بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی حالت پر مطمئن ہیں۔ اور غلامی میں ہی اپنی نجات سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ رنگت اور ذہن کے اعتبار سے غلامی کی زندگی کے علاوہ کسی قسم کی زندگی بسر کرنے کی اہلیت اور صلاحیت سرے سے رکھتے ہی نہیں۔ اس لیے یہ ناول گمراہ کن، جھوٹ کا پلندہ اور بکواس ہے۔

ابراہام لنکن نے اس ناول کو پڑھا اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ غلامی کے خلاف اس کے جذبات میں مزید قوت اور شدت پیدا ہوئی اور وہ غلامی کے خاتمے کے فیصلے پر ڈٹ گیا۔

• انکل ٹامز کیبن" کے خلاف جو کچھ معاندانہ انداز میں لکھا گیا اور اس کی صداقت پر

جو کیچڑ اچھالا گیا اور حملے کیے گئے اس کے جواب میں ہیریٹ بیچر نے ایک کتاب KEY TO UNCLE TOM'S CABIN لکھی۔ اس کتاب کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب میں ہیریٹ بیچر سٹوو نے واقعاتی اور مستند شہادتوں اور دستاویزات سے ثابت کیا کہ امریکہ میں حبشی غلاموں کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہے اور غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔

فیض صاحب نے لکھا ہے کہ بڑے لکھنے والے پر مجاہدہ بھی فرض ہوتا ہے۔ ہیریٹ بیچر سٹوو نے حبشیوں کی غلامی کے خلاف آواز ہی نہیں اٹھائی۔ ایک بڑی تخلیق کو ہی جنم نہیں دیا۔ لوگوں کے اعتراضات کو ہی برداشت نہ کیا بلکہ عملی سطح پر بھی وہ غلامی کے خلاف میدان میں نکل کھڑی ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا جس کا صرف ایک مقصد تھا کہ اپنی ہم جنس سفید فام انگریز عورتوں پر واضح کر سکے کہ غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔ وہ حبشیوں کے لیے لوگوں اور بالخصوص عورتوں کے دلوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں شائع ہونے والی اس کی تصنیف DRED-ATALE OF THE DISMAL SWAMP اپنی جگہ بصیرت افروز مطالعہ ہے اس فن پارے میں ہیریٹ بیچر سٹوو نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ معاشرہ اور سماج کس طرح تباہ اور مسخ ہو کر رہ جاتا ہے جو غلامی کو برداشت کرتا ہے۔

ہیریٹ بیچر سٹوو کا بھائی، وارڈ بیچر بھی لکھنے والا اور صحافی تھا۔ اپنی بہن کی بیشتر تصانیف اسی نے شائع کی تھیں۔ وہ خود بھی غلامی کا شدید مخالف اور دشمن تھا۔ ہنری وارڈ بیچر کرسچین یونین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اس دور میں بھی امریکہ کا مشہور جریدہ "اٹلانٹک" شائع ہونا شروع ہوا۔ ہیریٹ بیچر سٹوو اس کی مستقل لکھنے والی تھی۔

"انکل ٹامز کیبن" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ہیریٹ بیچر سٹوو کی کسی دوسری کتاب کو تو حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اس کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن کو دلچسپی سے پڑھا گیا۔ ہیریٹ بیچر سٹوو بہت اچھی داستان گو بھی تھی۔ جب وہ ادبی حلقوں اور دیگر تقریبات میں اپنی تحریریں کو سنایا کرتی تو ایک سماں باندھ دیتی تھی۔

۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۳ء تک ہیریٹ بیچر سٹوو اپنے شوہر کے ساتھ اینڈ رومیساچوسٹس میں رہی جہاں ایک سیمینار میں اس کا خاوند پروفیسر تھا۔ اس کے بعد یہ گھرانہ ہارٹفورڈ منتقل،

ہو گیا۔ امریکہ میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے بیٹے نے بھی ابراہام لنکن کی فوجوں کا ساتھ دیا اور جنگ میں حصہ لیا۔ وہ کیپٹن کے عہدے پہ فائز تھا اور خانہ جنگی میں شدید زخمی ہوا۔ خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد وہ لوگ فلوریڈا چلے آئے۔ جہاں کی آب و ہوا زخمی بیٹے کے لیے مفید تھی۔ ۱۸۶۸ء میں HEARTH AND HOME نامی ایک جریدے کا آغاز کیا۔ جس کا مدیر ڈونالڈ ایم مچل تھا۔ ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے شوہر نے بطور معاون مدیر اس پرچے میں شرکت کی۔ ۱۸۸۶ء میں ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے شوہر کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد ہیریٹ عزلت نشین ہو گئی۔ اور ہارٹ فورڈ جا بسی۔ تقریبات اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا ترک کر دیا اور یہیں یکم جنوری ۱۸۹۶ء کو وہ انتقال کر گئی۔ اور اسے اس کے خاوند کے پہلو میں اینڈ ورو میں دفنایا گیا۔

"انکل ٹامز کیبن" ایک ایسا ناول ہے جو نہ صرف غلامی کے خلاف شدید ترین تخلیقی احتجاج بلکہ انسانوں کی مظلومی کی ایک ایسی سچی دستاویز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ٹام ایک نیک دل، اطاعت گذار، مذہبی حبشی ہے۔ سارا ناول اگرچہ اس کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا لکڑی کا چھوٹا سا کیبن بظاہر ایک چھوٹی سی دنیا کی طرح کا ہے لیکن یہ اس پورے امریکی سماج کا احاطہ کرتا ہے جہاں حبشی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا جینا اجیرن ہو چکا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ان کی روحوں تک کو غلام بنانے کی جابرانہ کوشش کی گئی ہے اور اس میں برتر اور حاکم سفید فام معاشرہ کامیاب رہا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتے۔ اپنے گھر آباد نہیں کر سکتے۔ ان کے کنبے کو جب سفید فام آقا چاہے تتر بتر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ پیدائشی غلام ہیں۔ ان کی بہنوں اور بیویوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں۔ کیونکہ سفید فام آقا جب چاہے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔

اتنی مجبوری اور بے کسی کے باوجود وہ احتجاج کرتے ہیں۔ زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کے لیے وہ ظالم آقاؤں کی گرفت سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرار کے منصوبے

تے ہیں اور آزادی کیلئے غلامی سے فرار کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔

" انکل ٹامز کیبن " حبشیوں کی زندگی کے سارے دکھوں اور غلامی کی بدترین لعنت کا بھرپور اور مؤثر ترین مرقع ہے۔

آج جب اس ناول کے حوالے سے میں سوچتا ہوں تو ہیریٹ بیچر سٹوو کی جرأت مندی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ خود مذہبی خاتون تھی اور ایک ایسے مذہب سے وابستہ تھی جس کی تعلیم یہ ہے کہ تمہارے ایک رخسار پر کوئی تھپڑ مارے تو اس کے آگے دوسرا رخسار کر دو۔ اگر تمہیں کوئی میل بیگار پر لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو میل جاؤ۔ ایسے مذہبی عقائد پر ایمان رکھنے والی ہیریٹ بیچر سٹوو نے غلامی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور اس ناول کے ذریعے اس مذہب کے ماننے والوں کو یہ سمجھایا کہ غلامی لعنت ہے۔ غلامی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے۔

" انکل ٹامز کیبن " اپنی اس جرأت مندانہ فکر اور اثر پذیری کی وجہ سے آج بھی بڑا ناول ہے۔ اور ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی تاریخ اور مقدر کو بدلنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

وُدرنگ ہائیٹس

۱۹۸۳ء کے اوائل میں مجھے ایک خاتون کا سفرنامہ پڑھنے کا موقع ملا۔ خاتون سفرنامہ نگار نے ایک پروگرام کے مطابق اس علاقے کی سیر و سیاحت کا منصوبہ بنایا تھا۔ جہاں ایملی برونٹے پیدا ہوئی' اور جہاں اس کے ناول، وودرنگ ہائیٹس کے کردار کبھی زندہ تھے۔ گویا اس خاتون نے اس علاقے کو اپنی سیاحت کے لیے منتخب کیا تھا جو 'وُدرنگ ہائٹس' کا لینڈ سکیپ ہے ۱۹۸۲ء میں یہ خاتون سفرنامہ تحریر کرا کے چھپوا چکی تھیں۔ اس خاتون نے اس سفرنامے میں سب سے زیادہ جن باتوں پر حیرت کا اظہار کیا۔ وہ یہ تھیں۔

انگلستان کا یہ حصہ اب بھی انگلستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں پسماندہ ہے اب بھی یہاں کے لوگ پرانے انداز کی روایتی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہاں غربت بھی نہیں ہے۔

اس خاتون سفرنامہ نگار نے اس حقیقت کی نشاندہی بھی کی ہے۔ آج بھی اس علاقے کا موسم اتنا ہی غیر یقینی اور تند و تیز ہے جتنا کہ ایملی برونٹے کے ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ لوگ اکھڑ اور بدمزاج ہیں۔ زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے۔ گویا وہ علاقے جو ایملی برونٹے کے ناول "وودرنگ ہائیٹس" کا لینڈ سکیپ ہے۔ وہ حقیقی ہے۔ اسی حالت میں موجود ہے۔ جس طرح اس کا ذکر ایملی برونٹے نے کیا تھا۔

ایملی برونٹے کے ناول "وودرنگ ہائیٹس" کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے۔

۱۸۰۱ء ..... یہ بنگلہ جس کا نام گریج ہے۔ میں نے اسے حال ہی میں کرائے پر حاصل کیا

ہے۔ شہروں کے ہنگاموں اور شور شرابوں سے دور رہنے والوں کے لیے انگلستان بھر میں اس سے زیادہ جاذب صورت اور پرسکون جگہ شاید ہی کہیں ہو..... ؟

۱۸۴۷ء سے اب تک وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ لیکن وودرنگ ہائیٹس کا لینڈ سکیپ نہیں بدلا۔ فطرت وہاں اسی طرح دکھائی دیتی ہے جس طرح اس ناول میں ظہور پذیر ہوئی۔ اور "وودرنگ ہائیٹس" آج بھی ایک سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

وودرنگ ہائیٹس۔ عشق بلاخیز کی داستان ہے۔ پاگل کر دینے والا عشق۔ جو انسانوں میں مثبت اقدار کو دبا کر منفی اقدار کو نمایاں کرتا ہے۔ جو ایسا وحشی جذبہ بن کر سامنے آتا ہے کہ انسانوں کو ان کی سطح سے گرا کر وحشیوں اور جانوروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ وودرنگ ہائیٹس کا مطالعہ ایک ناقابل فراموش تجربہ ہے۔ اس میں ایسے ایسے جذبات مضمر ہیں جن کو صرف حواس ہی محسوس کرتے ہیں۔ اور اس تجربے کو بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک گہرا دل میں بس جانے والا حیران کن حد تک انوکھا ناول ہے۔ اس کے کرداروں کے بارے میں پڑھنے والوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی تعبیر کیا کریں۔ یہ قوی لیکن متضاد جذبوں کا پیکر ہیں۔ اور ان میں ایسے نفرت کرنے والے عناصر بھی گندھے ہوئے ہیں جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کردار انسان ہیں، جو کچھ ہمیں دکھائی دیتے ہیں اپنے بارے میں تاثر دیتے ہیں۔ وہ دراصل ان کے کرب کی پیداوار ہیں۔ یہ ایسے کرب سے گذرے ہیں جس کا احوال دنیا کے بڑے ادب کے فن پاروں میں کم ہی ملتا ہے۔

وودرنگ ہائیٹس، ایک ایسا ناول ہے جس کا سکہ ایک صدی سے زائد عرصے سے رائج ہے۔ اور وقت کے گزرنے اور زمانے کی تبدیلیوں نے اس سکے کو دھندلایا ہے نہ اسے بے وقعت بنایا ہے۔ بلکہ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے اس سکے کی قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وودرنگ ہائیٹس، ایک ایسا ناول ہے جس کی عالمگیر کشش کو ہر قاری نے محسوس

کیا ہے۔ اس پر مبنی کئی بار ٹی وی ڈرامے لکھے اور پیش کیے جا چکے ہیں۔ ریڈیو کے لیے اسے بار بار دنیا بھر میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر مبنی کئی بار فلمیں بن چکی ہیں۔ جن میں وہ فلم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں سر لارنس اولیویر نے ہیتھ کلیف کا کردار ادا کیا تھا۔ شیکسپیئر کے کے بعض لازوال کرداروں کی طرح ہیتھ کلیف بھی ایک ایسا کردار ہے جسے دنیا کے بڑے فنکار اپنے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اسے ادا کرنے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اُردو میں میں نے اس ناول کے دو تراجم پڑھے ہیں۔ ایک ترجمہ سید قاسم محمود کا ہے جو خاصے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ اچھا نہیں ہے۔ اصل میں ان کرداروں کی زبان ایسی ہے کہ اسے کسی زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ پھر اس ناول میں ایک جاندار کردار جوزف کا ہے جو اس گھرانے کا ملازم ہی نہیں بلکہ بہت سے امور میں دخیل بھی ہے۔ یہ جوزف جس انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کے لہجے میں جو کاٹ استہزا اپنی برتری اور دوسروں کے لیے حقارت کھلی ملی ہے۔ وہ لہجہ اُردو میں منتقل کرنا تو ایک طرف دوسری زبانوں میں ہی منتقل کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔

" وودرنگ ہائیٹس " کا دوسرا ترجمہ سیف الدین حسام ایم اے نے کیا ہے۔ ترجمے کو رواں دواں بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بے ربطی کا شکار ہے۔ کہانی کا تعلق ۱۸۰۱ء میں ہے۔ یہ ترجمہ کا کمال ہے کہ اس نے ترجمے میں اپنی طرف سے " جیٹ طیاروں " کا بھی ذکر کر دیا ہے ۔۔۔۔ حالانکہ اس زمانے میں جیٹ طیارے ہوتے ہی نہیں تو ان کے حوالے سے کوئی مثال کیسے دی جا سکتی ہے۔ !

وودرنگ ہائیٹس کی مصنفہ ایملی برونٹے " برونٹے سسٹرز " میں سے ایک ہے اور جہاں ایک بہن کا ذکر ہو وہاں باقی بہنوں کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔

ایملی برونٹے اپنی دوسری نامور بہن شارلٹ برونٹے کی طرح تھارنٹن یارک شائر میں پیدا ہوئی۔ ایملی کی تاریخ پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۱۸ء ہے۔ وہ صرف تیس برس زندہ رہی اور اپنی مختصر سی عمر میں اسنے بڑے مصائب کا سامنا کیا۔ وہ پادری باپ کی بیٹیاں تھیں اور ان کی ماں

ایک کورنشھ خاتون تھی ۔ ان سب بیٹیوں کی زندگی غربت کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد کی داستان کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ۔ اس وقت یہ خاندان ہاورتھ منتقل ہوچکا تھا ۔ سات برس کی عمر میں شارلٹ سکول میں داخل کرائی گئی ۔ اسی سکول کو شارلٹ برونٹے نے اپنے ناول "جین آئر" میں زندہ جاوید کردیا ہے ۔ شارلٹ کی طرح ایملی اور این بھی شدید بیماری میں مبتلا رہیں ۔ وہ اعصابی تکلیف میں مبتلا رہتی تھیں ۔ ان بہنوں کو پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا کیونکہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا ۔ ایملی نے ایک عرصے تک گورنس کی حیثیت سے بھی کام کیا ۔ لیکن یہ کام پسند نہ آیا ۔ کچھ عرصے کے لیے یہ بہنیں برسلز بھی رہیں ۔

قدرت نے ان بہنوں کو تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا ۔ ۱۸۴۶ء میں تینوں بہنوں نے شاعری کی ایک کتاب شائع کی یہ ان تینوں بہنوں شارلٹ ۔ ایملی اور این ۔ برونٹے سسٹرز کی نظموں کا مجموعہ تھا ۔ اس نظموں کے مجموعے نے ادبی دنیا میں کوئی ہل چل پیدا نہیں کی ۔ اس مجموعے کی ناکامی نے ان بہنوں کو نثر کی طرف مائل کیا اور وہ ناول لکھنے لگیں ۔ شارلٹ کا پہلا ناول "پروفیسر" تھا ۔ این کا پہلا ناول "ایگنس گرے" تھا ۔ ان دونوں ناولوں کی خاص پذیرائی نہیں ہوئی ۔

ایملی برونٹے کو زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کوئی دوسرا ناول لکھ سکے ۔ اس کا پہلا اور آخری ناول "وودرنگ ہائیٹس" ہے اور اس ناول نے ہی اسے زندہ جاوید کردیا ۔

ان تینوں بہنوں کے بھائی برانول کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ جو سدا کا بیمار تھا ۔ لیکن بڑی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا ۔ تینوں بہنوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو چمکانے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا ۔

برونٹے سسٹرز میں دو بہنوں نے اپنے اپنے ناولوں کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی ہے ۔ شارلٹ کا ناول "جین آئر" اور ایملی برونٹے کا ناول "وودرنگ ہائیٹس" عالمی ادب کے اہم اور مقبول ترین شہکار تسلیم کیے جاتے ہیں ۔

۱۹؍دسمبر ۱۸۴۸ء کو ایملی کا انتقال ہوا ۔ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں بہت دکھ سہے ایسا لگتا ہے کہ اس نے جو کربناک زندگی بسر کی اس کا سارا کرب اپنے اس اکلوتے واحد شاہکار

ناول "وورنگ ہائیٹس" میں بھر دیا۔

"وورنگ ہائیٹس" میں ناول کا قصہ پہلے تو گریج کو کرائے پر حاصل کرنے والے مسٹر لاک وڈ کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ مسٹر لاک وڈ کے حوالے سے ہمیں اس ناول کے اہم کرداروں سے ملایا جاتا ہے۔ ماضی کی داستان ایک ملازمہ نیلی سناتی ہے اور اس کے اختتام کو پھر مسٹر کلارک وڈ کے ذریعے سامنے لایا جاتا ہے۔

عشق بلاخیز کی اس داستان میں ہیتھ کلیف ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون ہے اس کی ماں کون ہے۔ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا حلیہ بھی اس علاقے کے لوگوں سے مختلف ہے۔ اسے تو سڑک سے اٹھا کر لایا جاتا ہے۔ اور ایک خاندان کا فرد بنا دیا جاتا ہے۔ وہ منتقم المزاج ہے اور بعد میں لالچی بھی بن جاتا ہے۔ جس جس نے اسے دکھ پہنچایا ہے اس سے انتقام لینا اور اس کو تباہ و برباد کر دینا اس کی جائداد پر قبضہ کر لینا۔ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنا اس کا کردار بن چکا ہے لیکن وہ خود بہت دکھی ہے وہ محبت میں ایک ایسا چرکا کھا چکا ہے۔ جس نے اس کی روح کو زخمی کر دیا ہے۔ اس زخم کا کوئی مداوا نہیں۔ کوئی علاج نہیں یہ زخم سدا رستا رہے گا اور جب تک وہ ہمارے حافظوں میں محفوظ ہے۔ جب تک ہم اس ناول کو پڑھتے رہیں گے۔ ہیتھ کلیف مرنے کے بعد بھی دکھی ہی محسوس ہوگا۔

عشق بلاخیز کی یہ داستان کیتھی کی داستان ہے۔ جو ٹوٹ کر اس وحشی سے محبت کرتی ہے مرنا اس کا مقدر ہے۔ لیکن بہت دکھ سہہ کر۔ بہت رنج دیکھ کر۔ وہ ہیتھ کلیف سے شادی نہیں کر سکتی۔ شادی اس کی ایک نرم خو اور ہیتھ کلیف سے بالکل مختلف شخص کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ ہیتھ کلیف کو اپنے ذہن سے اپنی روح سے نہیں نکال سکتی۔ اس کے عشق کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی تمام برائیوں، اس کی تمام تر خامیوں سے آگاہ ہے۔ ان کا اسے پورا شعور ہے لیکن وہ اس پر ہی مرتی ہے۔ بلھے شاہ نے کہا تھا۔ ع

رانجھا رانجھا آکھدی نی میں آپے رانجھا ہوئی

بالکل اسی طرح کا تجربہ کیتھی کو عشق میں ہوا ہے۔ وہ محبت اور جذب کے اس مقام پر پہنچی

ہوئی ہے جہاں وہ کہتی ہے:۔

"میں ہیتھ کلیف ہوں۔"

وہ ایڈگر سے شادی کرنے کا تہیہ کر چکی ہے اور ایڈگر سے شادی کر بھی لیتی ہے۔ لیکن اس شادی کو وہ اپنے محبوب سے جدائی نہیں سمجھتی۔ جب ملازمہ نیلی اسے کہتی ہے کہ اس کے اس فیصلے سے ہیتھ کلیف تنہا رہ جائے گا تو کیتھی کہتی ہے:۔

"کون جدا کر سکتا ہے ہمیں جب تک میرے دل کی دھڑکنیں زندہ ہیں جبتک سانس آ رہی ہے ہم جدا نہیں ہو سکتے۔ ہیتھ کلیف کی ہستی تو میرے انگ انگ میں سمائی ہوئی ہے۔ ہیتھ کلیف سے میری محبت ان چٹانوں کی طرح ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن جن پر یہ دھرتی کھڑی ہے جن کے بغیر اس کائنات کا وجود ہی نہیں ہے۔ نیلی۔ میں خود ہیتھ کلیف ہوں۔ اس لیے کہ میری امنگوں میں وہ چمک رہا ہے۔ میرے دل میں وہ دھڑک رہا ہے میرے خون کی گردش کا باعث وہ ہے۔"

ہیتھ کلیف۔ اس گھر کا پروردہ ہے۔ کیتھی کا باپ اسے شہر کی ایک گلی سے اٹھا کر لایا تھا۔ اس کے حسب نسب کا کسی کو علم نہیں۔ کیتھی کا بھائی اس سے خار کھاتا ہے لیکن کیتھی اس پر مرمٹی ہے۔ ہیتھ کلیف ہر ظلم سہتا ہے۔ اس کا مربی مر چکا ہے۔ اور اس کے وارث کیتھی کے بھائی نے اس کا درجہ گھٹا کر ملازم بنا دیا ہے۔ وہ گندہ رہتا ہے لیکن اس گندے وحشی کے عشق میں کیتھی ڈوب چکی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ کیتھی مہذب ایڈگر سے رہ ورسم بڑھا رہی ہے تو وہ ایک دن وہاں سے نکل جاتا ہے۔ کیتھی اس کی جدائی میں مرتے مرتے بچی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہیتھ کلیف کہاں گیا ہے۔ جب وہ واپس آتا ہے تو وہ دولت مند ہے۔ منتقم مزاج بن چکا ہے۔ وہ کیتھی کے بھائی کو جوئے میں لوٹتا ہے اور وودرنگ ہائیٹس اور ساری جائداد پہ قابض ہوتا اور اس خاندان کے افراد کو اپنا غلام بناتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ذہن اب شیطان کے ذہن کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ انتقام لیتا ہے۔ بہت خوفناک انتقام۔ وہ کیتھی کی نند کو ورغلاتا ہے۔ اسے لے بھاگتا ہے اس سے شادی کر لیتا ہے۔ اس پر ظلم وستم توڑتا ہے اور پھر ایک ایسے بیٹے کا باپ بنتا ہے جو

لاعز دکمزور ہے جس کے بارے میں ہر لمحے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مرنے والا ہے۔ کیتھی ایک بچی کو جنم دے کر مر چکی ہے۔ ساری جائیداد پر قبضہ کرنے اور انتقام پورا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ کیتھی کی بیٹی سے اس کے بیٹے کی شادی ہو جو لاعز کمزور ہے۔ وہ اپنے مہرے آگے بڑھاتا ہے اور کامران ہو جاتا ہے۔ اب اس کا انتقام پورا ہو چکا ہے اس کا بیٹا کیتھی کی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد اپنے باپ۔ ہیتھ کلیف کے نام ساری جائیداد منتقل کر کے مر چکا ہے۔

انتقام کی آگ بجھانے کے باوجود ہیتھ کلیف ایسے کرب میں مبتلا ہے جس نے اسے اکھڑ بنا دیا ہے جو اسے راتوں کو گھر سے باہر رکھتا ہے جو اسے ایک پل چین نہیں لینے دیتا کیتھی کی شکل اس کو ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کی محبوبہ مرکر بھی اس کے لیے زندہ ہے اس کے سامنے آتی ہے۔ اس سے باتیں کرتی ہے۔ وہ عشق بلاخیز میں بہتا چلا جا رہا ہے اس عشق کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ ہیتھ کلیف اپنی محبوبہ کی قبر کھدواتا ہے۔ وہ نیلی ملازمہ سے کہتا ہے :۔

"میں نے گورکن لڑکے کو راضی کر لیا کہ وہ کیتھی کے کفن سے مٹی اکھاڑ دے۔ اس نے مٹی پرے کی تو میں نے کفن کھول لیا۔ کیا بتاؤں نیلی .... اٹھارہ سال بعد بھی وہ بالکل ایسے لیٹی تھی جیسے ابھی ابھی دفن کی گئی ہو۔ گورکن لڑکے نے مجھے جلدی سے کفن بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں نے ڈھکنا بند کر دیا۔ لیکن تابوت کے ایک پہلو کے تختوں کے پیچ کھول کر تختہ الگ کر دیا۔ میں نے گورکن لڑکے کو خاصی رقم دی ہے اس کو رضامند کر لیا ہے کہ جب میں مروں تو مجھے کیتھی کی قبر کے اس پہلو میں دفنایا جائے جدھر سے اس کے تابوت کا درمیانی تختہ میں نکال چکا ہوں۔ میرے تابوت کا تختہ بھی نکال دیا جائے گا۔ میں کیتھی کے قرب میں دفن ہوں گا۔"

اٹھارہ برس کے بعد ہیتھ کلیف کو چین آیا ہے۔ اس کے عشق کی انتہا کا تصور یہ ہے کہ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس نے اپنا رخسار کیتھی کے رخسار پر رکھا ہوا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے .....!

یہ ہیتھ کلیف روحوں پر سی یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے عشق نے اسے یہ اعتماد بھی بخشا ہے کہ جب تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں دفن نہ ہوگا اس کی محبوبہ کیتھی کی لاش بالکل صحیح حالت میں برقرار رہے گی۔ اسے مٹی اس وقت تک نہ لگے گی جب تک وہ خود اس کے پہلو میں دفن نہیں ہو جاتا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سوتے ہوئے خاک بن جائیں گے۔

جس روز کیتھی کو دفنایا گیا۔ وہ رات طوفانی رات تھی۔ اس رات وہ قبرستان میں چلا گیا تھا اور اس نے قبر کھود کر اپنی مردہ محبوبہ سے بغل گیر ہونے کی خواہش کی تھی۔ طوفانی رات میں اسے اپنی محبوبہ کا ہیولہ قبر سے باہر دکھائی دیا تھا۔

یہ سب عشق کے کرشمے ہیں۔ عشق جو بلا خیز ہے جو ایسے کرب سے آشنا بھی ہو جاتا ہے کہ روحانیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

' وودرنگ ہائیٹس ' دنیائے ادب کا عظیم تخلیقی کارنامہ ہے یہ اس لیے بھی بڑا فن پارہ ہے کہ اس کی خالق نے بھی کرب ناک زندگی بسر کی تھی اور وہ سارا کرب اس ناول میں منتقل ہو جاتا ہے۔

اس عشق میں وہ منفی قوتیں شامل ہو جاتی ہیں جنہوں نے ہیتھ کلیف کو وحشی بنا دیا ہے لیکن اسے اپنی بے انصافی کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قابض ہو کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا بیٹا مر چکا ہے۔ بیوی مر چکی ہے۔ محبوبہ مر چکی ہے۔ وہ نیم دیوانہ ہو چکا ہے اس کی محبوبہ اسے جاگتی آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ صرف موت ہی اس کو تسلی اور سکون بخش سکتی ہے۔

' وودرنگ ہائیٹس ' مقامی لوگوں کی زبان میں اس جگہ کو کہتے تھے۔ جہاں آندھیاں چلتی ہوں۔ ہوائیں چیختی ہوں۔ طوفان آتے ہوں۔ "وودرنگ ہائیٹس" ناول بھی عشق کے طوفان اور عشق کی آندھی کا قصہ ہے۔!!

فادر اینڈ سنز

انقلاب روس سے پہلے کے لکھنے والوں میں ترگنیف کا شمار ٹالسٹائی، گوگول اور دوستوئفسکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور لینن نے ترگنیف کو اپنی تحریروں میں کئی بار سراہا اور لینن نے روسی زبان کے حوالے سے ترگنیف کو اس طرح بھی خراج تحسین پیش کیا تھا کہ ترگنیف کی زبان، عمدہ عظیم اور شاندار ہے۔

یہ ایک بڑی حقیقت ہے جس کا اعتراف لینن نے کیا تھا۔ روح انسانی اور مناظر فطرت کی تصویرکشی کے کمال کے ساتھ ساتھ ترگنیف کے یہاں اسلوب کی سادگی اور صفائی طاقت اور فصاحت، بیان اور زبان کی صحت اور موسیقیت بھی بدرجہ اُتم موجود ہے ترگنیف کی تخلیقات روسی ادبی زبان کے ارتقا میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ بیان روس کے ایک ماہر لسانیات پھیلڈون کا ہے۔ جو اوپر درج کیا گیا ہے۔

یوں تو ترگنیف کی ہر تخلیق معرکے کی ہے جن کا ذکر اجمالاً آئے گا۔ لیکن اس کے ناول "باپ اور بیٹے" (فادر اینڈ سنز) کو عالمی ادب کا شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی اشاعت سے آج تک اس ناول کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور اس ناول کے حوالے سے روس اور مغرب میں ایک بڑی تحریک نے بھی جنم لیا ہے جسے NIHILISM کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی ہر چیز کی نفی کرنا۔ انحراف میں اقرار تلاش کرنا اور نفی میں اثبات ... اس طرز فکر اور تحریک کے ڈانڈے اگرچہ تشکیک سے جا ملتے ہیں لیکن دونوں میں ایک خاص سطح کا نازک سا فرق بھی ہے۔

بعض نقادوں نے بعض دیگر خصوصیات کی وجہ سے ترگنیف کے ایک دوسرے بڑے ناول NEST OF THE GENTRY کو فادرز اینڈ سنز سے بڑی تخلیق قرار دیا ہے ۔ خود روس میں ایک عرصے تک " فادرز اینڈ سنز " پر کڑی تنقید ہوتی رہی ۔ لیکن NEST OF THE GENTRY ایک بڑی تخلیق اور بڑا ناول ہونے کے باوجود " فادرز اینڈ سنز " سے بلند اور عظیم نہیں ، جو ہمہ گیر معنویت " فادرز اینڈ سنز " میں ہے ۔ وہ دنیائے ادب کے بہت کم شاہکاروں کا مقدر بنی ہے ۔

ہماری اردو زبان میں " فادرز اینڈ سنز " کا ترجمہ " نئی پود " کے نام سے انتظار حسین شائع کرا چکے ہیں ۔ اس ترجمے کی دہری خوبی یہ ہے کہ معنویت اور روح تو اس میں اصل ناول کی ہی لیکن ترجمہ انتظار حسین نے اپنی مخصوص زبان میں مخصوص انداز سے کیا ہے ۔ یوں یہ ترجمہ پڑھ پڑھ کر ترگنیف کے ناول سے بھی خاصا اچھا تعارف ہو جاتا ہے ۔ اور انتظار حسین کی خاص زبان کا ذائقہ بھی ......!

ترگنیف ۔ ۹ رنومبر ۱۸۱۸ ر کو اورال میں پیدا ہوا ۔ اس کے والدین کا تعلق کھاتے پیتے زمیندار اشرافیہ طبقے سے تھا ۔ اس خاندان کی اچھی خاصی جاگیرداری تھی ۔ اور اس دور کے زرعی غلاموں (SERFS) کے بغیر تصور بھی نہیں جا سکتا ۔ ترگنیف کے آباؤ اجداد بھی زرعی غلاموں کے مالک تھے ۔ ترگنیف کی والدہ ایک " سچی جاگیردارنی " تھی ۔ ان زرعی غلاموں کے ساتھ جو سلوک اس جاگیرداری نظام میں روا رکھا جاتا تھا ۔ یہ غلام بھی اسی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے تھے ۔ ترگنیف کی والدہ پیٹر رخنا خود غلاموں کو چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر کوڑے مارا کرتی تھی ۔ ایک بار اس نے اپنے تمام غلاموں کو صرف اس وجہ سے کوڑے مارے کہ پھولوں کی کیاری سے ایک خاص پودے کا پھول موجود نہ تھا ۔

ترگنیف جس نے اپنا بچپن فطرت کی آغوش میں گزارا ۔ بلبل کے نغمے پر فریفتہ رہا جس کا ذکر اکثر اس کی تحریروں میں ملتا ہے ۔ بچپن میں ہی SERF DOM کے نظام سے متنفر ہو گیا ۔ اپنی والدہ کے ساتھ اس کے جو اختلاف ہوئے ۔ اس کی وجہ اس کی والدہ کا یہی سفاکانہ رحم سلوک تھا ۔ جو وہ اپنے زرعی غلاموں پر روا رکھتی تھی ۔ لیکن اس دور کی اشرافیہ کے نمائندہ ۔ بڑے

طور پر اس کی والدہ کو روسی اور فرانسیسی ادب سے عشق تھا۔ ترگنیف کی والدہ نے ہی اس کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ جب ترگنیف کی پہلی تخلیق ایک نظم کی صورت میں شائع ہوئی تو اس کی والدہ نے اس نظم کو بے حد سراہا۔ اس نے ترگنیف کو جو خط لکھا وہ اس کے ادب سے گہرے تعلق کا غماز ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

"مجھے بلاشبہ تمہارے اندر ذہانت دکھائی دی ہے۔ یہ نظم شاندار ہے۔ ہاں میں پوری سنجیدگی سے یہ لکھ رہی ہوں .... مجھے ابھی کچھ سٹرابیریز کھانے کے لیے دی گئی ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ ہر اصلی اور خالص چیز کے قدردان ہوتے ہیں۔ تمہاری اس نظم سے سٹرابری کی مہک آتی ہے۔"

بچپن میں ترگنیف کو ایسا ماحول ملا جو متضاد اور متصادم تھا۔ ایک طرف خوش حال، فطرت کے مناظر، بلبل کی آواز دوسری طرف زرعی غلاموں کی حالت زار اور مالکوں کا جبر و ستم۔

ترگنیف نو برس کا تھا کہ جب اس کا خاندان ماسکو منتقل ہو گیا۔ یہاں ترگنیف نے پہلے تو ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لیا پھر ایک سال بعد وہ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا جہاں انیس برس کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں اس نے گریجویشن کی۔

جس ماحول اور طبقے سے وہ تعلق رکھتا تھا اس کے کسی بھی فرد کے لیے یہ تعلیم کافی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ترگنیف کے دل میں علم کی گہری طلب تھی اس نے برلن کا رخ کیا اور وہاں برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس کے موضوعات تاریخ اور قدیم زبانوں کے علوم تھے۔ اس نے ہیگل کا یہاں بطور خاص مطالعہ کیا۔ اس کو یونیورسٹی میں بعض ایسے طالب علموں کی رفاقت بھی حاصل ہوئی جو بعد میں اہم اور نامور افراد ثابت ہوئے۔ ان میں باکانن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے ایک انارکسٹ انقلابی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

ترگنیف کی زندگی کا بیشتر حصہ روس سے باہر گزرا۔ اس نے یہ جلا وطنی خود اختیار کی تھی۔ یہ فیصلہ اس نے بہت غور و فکر کے بعد کیا تھا۔ اور اس کے پیچھے زرعی غلاموں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے خلاف نفرت کا قوی جذبہ تھا۔ ترگنیف لکھتا ہے:

"میں اس نفرت کے ساتھ رہتے ہوئے، اس فضا میں سانس نہیں لے

سکتا تھا۔ جہاں نفرت بھی اسی ہوا سے ملتی تھی۔ میرے لیے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ میں اپنے دشمن سے جتنی دور ہو سکے چلا جاؤں۔ تاکہ میں اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر سکوں۔ میں نے قسم کھائی تھی اور اس قسم کو نبھانے کے لیے میں وطن چھوڑ کر مغرب میں چلا آیا۔"

اس خود جلا وطنی کی وجہ سے اس نے اپنی جابر اور خود مختار والدہ کی مخالفت مول لی اور ماں بیٹے کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی جاگیر کے زرعی غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اب وہ ایک خود مختار اور خوش حال انسان تھا۔ اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو تخلیقی زندگی کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے ڈرامے لکھے نظمیں لکھیں اور مغنیہ پاولین سے عشق کیا جو ساری عمر چلتا رہا۔ ۱۸۵۲ء میں جب گوگول کی موت واقع ہوئی تو وہ ان دنوں روس میں تھا۔ اس نے گوگول کی موت پہ ایک تعزیتی مضمون لکھا جس سے زار شاہی شدید ناراض ہوئی اور اسے اس کی جاگیر سے جلا وطن کر دیا گیا۔ ترگنیف نے پھر مغرب کی راہ لی اور پیرس چلا گیا۔ اب تک اس کی شہرت نہ صرف روس بلکہ دنیا میں پھیل چکی تھی۔ اس کے ہم عصر ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی اس کی شہرت کے علاوہ اس کے وطن سے دور رہنے کی بنا پر اس کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہ رکھتے تھے لیکن وہ اس کی تخلیقی عظمتوں کے دل سے قائل تھے۔

۱۸۴۰ء تک روسی ادب میں بڑی نمایاں تبدیلیاں آ ئی تھیں۔ یہ وہ دور ہے جب ترگنیف اپنی نظموں، چھوٹے ناولوں اور کہانیوں کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس زمانے میں روسی ادب میں سماجی صورت حال، انسانی ماحول، لوگوں کے اندرونی رویوں کے بارے میں لکھا جانے لگا تھا۔ روایتی کردار آہستہ آہستہ فکشن سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ اور ان کی جگہ کلرک، ہنر مند، چھوٹے تاجر، ملازم، زرعی ملازم، آوارہ گرد، موسیقار، سازندے اور اداکار لینے لگے تھے۔ فکشن کی دنیا کا منظر بدل رہا تھا۔ اعلیٰ اشرافیہ طبقے کے ڈرائنگ روموں اور دیوان خانوں کی جگہ سڑکوں، بازاروں اور فٹ پاتھوں اور ان پر آباد شراب خانوں نے لے لی تھی۔ لکھنے والوں کے ایک خاص مکتب نے اپنے ظہور کو یقینی بنا دیا تھا۔ جسے روس کے

عظیم نقاد بیلنسکی نے "نیچرل سکول" کا نام دیا تھا۔ یہاں نیچرل سے مراد حقیقت پسندی تھی۔
اس زمانے میں جب ترگنیف کی کہانیوں کا مجموعہ "اے ہنٹرز سکیچز" A HUNTER'S SKETCHES شائع ہوئی تو اسے روسی ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا گیا۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی "کھور اور کالینچ" بیلنسکی جیسے نقاد کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالے "ہم عصر" میں ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اور بعد میں دوسری کہانیاں جو ۱۸۵۲ء میں "اے ہنٹرز سکیچز" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ شچدرین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"ایک نیا ادب معرض وجود میں آیا ہے۔ عوام کے لیے ان کی امنگوں کا مظہر۔ اس کتاب میں ایک شکاری ایک رائفل اور ایک شکاری کتے کے ساتھ وسطی روس کے دیہات میں آوارہ گردی کرتا ہے وہ دیہاتیوں کی زندگی کو دیکھتا ہے۔ وہ زرعی غلاموں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتا ہے۔ روس کا دیہی علاقہ ان کہانیوں میں زندہ ہو گیا ہے۔ ان کہانیوں میں ترگنیف بتاتا ہے کہ روس کے عظیم زاروں سے بھی بدتر روس کا عام کسان ہے۔ روس کی ساری طاقت اس کے کسانوں کے حوالے سے ہے۔"

ان کہانیوں کے حوالے سے اور پھر بعد میں ترگنیف کی دوسری تخلیقات میں پہلی بار روسی عورت کو بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ ترگنیف کا یہ روسی ادب میں ایک بڑا کنٹری بیوشن یہ بھی ہے کہ اس نے روسی عورت کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی اور اس نے اس نظر انداز کی جانے والی عورت کی روحانیت سے لبریز محبت کرنے والی روح کو پہلی بار الفاظ کے ذریعے سچائی اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا۔ ترگنیف کی یہ ہیروئن یہ نسوانی کردار کمزور اور چھوٹے مردوں کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ روحانی اعتبار سے جری اور مضبوط مردوں کو پسند کرتی ہیں اور اسی میں ان کا مخصوص اخلاقی روپ اور ذاتی قوت مضمر ہے۔ وہ محبت کر سکتی ہیں اور ایثار بھی۔
ترگنیف سے پہلے روسی کسانوں کو جذبات اور محبت کے احساسات سے عاری سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے بیلنسکی نے ترگنیف کی کہانیوں کے مجموعے کے حوالے سے لکھا تھا۔

"ان کہانیوں کے حوالے سے ترگنیف نے ایک ایسے پہلو کو دکھایا ہے جو پہلے روسی ادب میں مفقود تھا۔"

لے ہنٹر پیکچر نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اور آج بھی اس کے الفاظ زندہ اور تابندہ ہیں جب کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ترگنیف کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے اس کے حوالے سے فرانس کے بڑے اور ہم عصر ادیبوں سے اس کا تعارف ہوا جو بعد میں گہری اور ذاتی دوستی میں منتقل ہوا۔ اس کے ہمعصروں میں میریمی اور فلابیئر اس کے مداح اور دوست تھے اور ایک صدی بعد ہیمنگوے اپنی کتاب AMOUEA LEFEAST۔ میں لکھ رہا تھا، "میں لے ہنٹرز سکیچ کے ساتھ روس میں گھوم پھر رہا ہوں۔" ترگنیف کی شہرت فرانس برطانیہ اور امریکہ میں پہنچ گئی۔ اس کے کھیل روس میں خاصے مقبول ہوئے لیکن اب وہ ایک بڑے سوال سے دوچار تھا۔ اس نے خود ایک جگہ لکھا ہے

"بہت ہو چکا .... بہت ہو چکا۔" سوال یہ ہے کہ عظیم تخلیق کا اہل ہوں۔"

اس نے سوال کو حرز جان بنا کر اس کے بعد بڑے کام کرنے کی ٹھانی۔ اس کے بعد وہ ناول لکھتا چلا گیا۔ ۱۸۵۶ء RUDIN کا سن اشاعت ہے۔ ۱۸۵۹ء میں A NEST OF THE GENTRY۔ ۱۸۶۰ء میں ON THEEVE (اس کا ترجمہ، سرِ شام، کے نام سے اردو زبان میں کمال احمد رضوی کر چکے ہیں) اور پھر ۱۸۶۷ء میں SMOKE اور ۱۸۷۷ء میں VIRGIN SOIL۔

ان بڑے کاموں اور ناولوں کے دوران ۱۸۶۲ء میں اس کا ناول باپ اور بیٹے FATHER AND SONS شائع ہوتا ہے جو اس کا بے مثل شاہکار ہے اور عالمی ادب میں بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔

"فادرز اینڈ سنز" کا ہیرو بازروف عالمی ادب کے بڑے کرداروں میں سے ایک ہے اس نے خود کہا تھا کہ وہ ایک ایسا قوی اور توانا کردار تخلیق کرنا چاہتا ہے جو متشکک اور نفی کرنے والا ہو۔

یہ کردار جس پر اس نے برسوں غور و فکر کیا تھا "فادر اینڈ سنز" میں بازروف کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔ اس ناول پر بہت لے دے ہوئی۔ وہ روسی نقاد جو ترگنیف کے قصیدے پڑھتے نہ تھکتے تھے۔ انہوں نے اس ناول اور اس کے مرکزی کردار بازروف کو ایک کردار

کی بجائے ایک کیری کیچر قرار دیا۔ نازک مزاج ترگنیف کے لیے یہ تنقید ناقابل برداشت تھی۔

ترگنیف کہا کرتا تھا کہ "فادرز اینڈ سنز" میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کو پورے طور پر صرف دوستو ئیفسکی سمجھ سکا تھا۔ جس نے اس ناول پر شاید دنیا کی مختصر ترین رائے دی تھی اور وہ رائے یہ تھی ۔۔۔

بے چین اور رنجیدہ غصیلا بازروف (ایک بہت بڑے دل کی علامت) "!

آخر بازروف کی اتنی مخالفت کیوں ہوئی؟ طالب علموں اور نقادوں کے لیے ایک خاص فکر رکھنے کی وجہ سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو نئی نسل اور نئی پود کے رجحانات میلانات اور رویوں کے ساتھ ہمدردانہ اور صحیح معنوں میں حقیقت پسندانہ رویہ رکھتے ہیں ان کے لیے "فادرز اینڈ سنز" اور اس کا مرکزی کردار بازروف کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا اور یہی اس ناول کی وہ خوبی اور صفت ہے جس نے اس کو ہر عہد کا ناول بنا دیا ہے۔ ہر دور کی نئی نسل اس ناول کو اپنا ناول کہہ سکتی ہے۔

نئی نسل پر ہر دور میں ایک ایسا وقت آیا ہے جب وہ پرانی نسل اس کے افکار اور اعمال سے بدظن ہو کر ان کے ہر عمل اور فکر کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بازروف بھی ایک ایسا کردار ہے۔ وہ ایک بے چین روح ہے اسی کے مقدر میں جوانی میں موت لکھی ہے۔ لیکن وہ کسی چیز میں اثبات نہیں کرتا۔ جان لیوا بیماری کے دنوں میں بھی وہ اپنی عادت کو نہیں چھوڑتا۔ جب وہ ایک شدید دورے سے سنبھلتا ہے تو اس کا باپ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہتا ہے:

"شدید بحران آیا تھا .... اور وہ آکر ٹل گیا ... "

بازروف اس وقت بھی چوکتا نہیں۔ وہ کہتا ہے:

"بے ہودہ، بے کار" بازروف بولا "ایک لفظ میں کیا رکھا ہے تم ایک کو ضرب لگاتے ہو۔ کہتے ہو بحران .... اور تم مطمئن ہو جاتے ہو ... کتنی حیرت کی بات ہے کہ لوگ اب بھی لفظ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی آدمی کو زدوکوب کیے بغیر کہو کہ وہ احمق ہے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اور کسی بھی شخص کو انعام دیے بغیر ہوشیار آدمی کہہ دو تو

وہ مسحور ہو جائے گا"

اپنی موت کے حوالے سے وہ بڑی بے نیازی سے ایک عالمگیر صداقت کا اظہار اس طرح کرتا ہے؛

"DEATH IS AN OLD STORY, YET ALWAYS NEW TO SOMEBODY."

عالمی ادب کا یہ عظیم کردار ہر چیز پر شک کرتا ہے۔ وہ بیزار نسل کا نمائندہ ہے۔ سیاسی نعرے اس کی تسکین نہیں کر پاتے۔ وہ لبرل لوگوں کی اصلاحات سے مایوس ہے۔ کیونکہ لبرلزم کے کھوکھلے پن کو وہ سمجھ چکا ہے۔ دہقانوں کے کمیون بنانے پر وہ یقین ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دہقانوں کے کمیون بنانے کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسانوں کو سوشلزم کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جائے۔ وہ تو ہر چیز کی نفی کرنے پر آمادہ ہے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کی بھی....

"فادرز اینڈ سنز" کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ترگنیف کے ایک بیان کو سامنے رکھ لیا جائے تو بہت آسانی ہو سکتی ہے۔ ترگنیف نے ایک بار لکھا تھا۔

"TO ACHEIVE A REPRODUCTION OF THE TRUTH, THE REALITY OF LIFE ACCURATELY AND POWERFUL-LY IS THE GREATEST HAPPINESS FOR A WRITER EVEN IF THIS TRUTH DOES NOT COINCIDE WITH HIS OWN SYMPATHIES."

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی ادبی صداقت کا اظہار بہت کم ہوا ہے اور اسی صداقت کے حوالے سے لکھنے والے کا کردار اور منصب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۲۲ اگست ۱۸۸۸ء کو ترگنیف کا پیرس سے کچھ فاصلے پر واقع بوژوال میں انتقال ہوا اس کی نعش سینٹ پیٹرز برگ لائی گئی اور والکوفا کے قبرستان میں دفنادی گئی۔

ارنسٹ رینان۔ فرانسیسی عالم نے تعزیتی تقریر کرتے ہوئے کہا؛

"وہ پوری انسانیت سے تعلق رکھتا تھا۔"

ہیرو آف آور ٹائمز

میخائیل لرمنتوف کا یہ ناول THE HERO OF OUR TIMES ۱۸۴۰ء میں شائع ہوا لرمنتوف نے اسے ۱۸۳۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور ۱۸۳۹ء میں اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس ناول کی اشاعت روس میں خاصی تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔ لرمنتوف کے اس فن پارے پر بہت اعتراض کیے۔ بعض اعتراضات بہت بودے اور بے معنی تھے۔ اور بعض خلوص سے کیے گئے تھے۔ اس ناول کے حوالے سے لرمنتوف کو بہت شہرت اور رسوائی حاصل ہوئی۔ اس ناول کو عام قاری پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ نقاد حضرات کے اپنے پیمانے ہوتے ہیں اور اکثر وہ تخلیق کا جائزہ اس تخلیق کے حوالے سے نہیں لیتے — بلکہ اپنی عینک سے اسے پڑھتے اور اپنے پیمانوں سے اس کا حساب کرتے ہیں۔ لرمنتوف کا یہ ناول بھی اسی بدمذاقی کا شکار ہوا ہے۔

میرے نزدیک اس ناول کی اس زمانے میں جو عام سطح پر قدردانی نہ ہو سکی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ناول اپنے دور اور زمانے سے ذرا آگے کی چیز تھا۔ بہرحال وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدروقیمت کا اندازہ ہونے لگا۔ اور اب ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی یہ ناول زندہ ہے اپنی معنویت کا اظہار کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے کسی اہم راز اور اسرار ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ہمیں بہت کچھ سمجھاتے ہوئے الجھاتا بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بڑا فن پارہ ہے۔ اور بڑے فن پارے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہمارے اندر کی دنیا کو متحرک کرتا اور بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔

لرمنتوف کے اس ناول کے تراجم دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہو چکے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے

میں نے اس ناول کا اردو میں ایک ترجمہ پڑھا تھا۔ جس کا ترجمہ پرنسپل غلام سرور نے کیا تھا۔ یہ بہت اچھا ترجمہ تھا اور آج کل دستیاب نہیں ہے۔ ماسکو کے روسی بدیسی زبانوں کے اشاعت گھر نے بھی اس کا ترجمہ اردو میں شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ خدیجہ عظیم نے کیا تھا۔

"دی ہیرو آف آور ٹائمز" کا شمار دنیا کی بڑی تخلیقات میں کیوں کیا جاتا ہے۔؟ اس میں ایسی کونسی انفرادیت ہے جس نے اسے ڈیڑھ سو برس سے زندہ رکھا ہے۔ اور ڈیڑھ صدی میں اسے ان گنت لوگوں نے مختلف زبانوں میں پڑھا ہے۔ تو اس کا سیدھا سادا جواب میرے پاس یہ ہے کہ جہاں اس ناول کا اسلوب بے حد جاندار ہے وہاں اس کا مرکزی کردار پچورین عالمی ادب کا ایک ایسا کردار ہے جو ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا رہے گا۔ پچورین ایک ایسا کردار ہے جسے ابدیت کی روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ ہر دور میں یہ کردار زندہ رہے گا۔ ہر دور کے لوگ اسے اپنے عہد کا ہیرو سمجھیں گے۔ کیونکہ اس میں بعض ایسی انسانی خوبیاں اور ایسی صداقتیں جمع کردی گئی ہیں جو ہر انسان کے لیے معنی بھی رکھیں گی اور کشش بھی۔

اصل میں یہ پچورین ہی ہے جسے اس دور میں سمجھا نہ جا سکا۔ اور جو اتنا عمیق گہرا اور تہہ در تہہ کردار ہے کہ ہر دور اس کی پرت اتارے گا۔ لیکن اس کو پوری طرح دیکھ نہ پائے گا۔ اس دور میں بیشتر قاری اور آج کا عام قاری بھی ایک رٹے کرداروں کے ہی مداح ہوتے تھے۔ اس لیے ایک بگڑے ہوئے جذبات سے عاری انسان کو جب اپنا آئیڈیل بنا کر پیش کیا گیا تو لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا۔ خود لرمنتوف کو اپنے اس کردار کے بارے میں وضاحت کرنی پڑی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ہیرو آف آور ٹائمز" کا ہیرو ایک تصویر ہی ہے۔ کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ ہماری پوری نسل کی تمام خرابیوں کی بھرپور تصویر ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان اتنا برا نہیں ہوسکتا۔ میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ جب آپ تمام رومانی اور المناک ناولوں کے بدمعاشوں پر یقین لا چکے ہیں تو آپ کو پچورین کی شخصیت پر کیوں یقین نہیں آتا۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کو اس میں اس سے زیادہ صداقت ملتی ہے جتنی آپ

توقع کرتے تھے ؟

واقعی حقیقت یہی ہے کہ پچورین ایک ایسا کردار ہے اور اسی لیے وہ ہر عہد کا ہیرو بنتا ہے کہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ صداقت کا اظہار کرتا ہے ۔ اور یہ صداقت اتنی کھری قوی اور کڑوی ہے کہ ہم سے ہضم نہیں ہوتی ۔

لرمنتوف نے اپنے اس ناول اور اس کردار کے حوالے سے اپنے نظریۂ فن کا بھی اظہار کیا ہے ۔ اس ناول اور اس کردار کو سمجھنے کے لیے لرمنتوف کے فن سے واقفیت بے حد ضروری ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

"آپ سوال کریں گے کہ اخلاقیات کو اس سے کچھ حاصل ہوگا یا نہیں ؟ معاف کیجیے گا ۔ میٹھی میٹھی باتیں بہت ہو چکی ہیں ۔ اب ضرورت ہے کڑوی حقیقتوں کی ۔ تیزابی صداقتوں کے اظہار کی ۔ لیکن آپ کہیں یہ مفروضہ قائم نہ کر لیجیے ۔ کہ اس کتاب کے مصنف کو کبھی یہ خوش فہمی رہی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی خرابیوں سے نجات دلائے ۔ خدا اس کو اس الزام سے محفوظ رکھے ۔ بات ساری اتنی ہے کہ مصنف کا جی چاہا کہ موجودہ زمانے کے آدمی کا خاکہ کھینچے ایسے روپ میں جس میں اسے خود مصنف دیکھتا ہے اور کم از کم اتنا تو ہو کہ بیماری کی تشخیص ہو جائے ۔ مگر اس کا علاج کیونکر اور کیسے ہوگا ۔ یہ خدا جانے ۔"

انقلاب روس کے بعد روسی ادب کے نئے خدوخال نمایاں ہونے لگے ۔ پرانے اسلوب بھی بدلے اور موضوع بھی لیکن ہزارہا تبدیلیوں اور نظریاتی انقلابات کے باوجود چند مصنف ایسے جاندار ، اتنے قوی ثابت ہوئے کہ ان کا انقلاب روس بھی کچھ نہ بگاڑ سکا ۔ ان معدودے چند مصنفوں میں سے ایک لرمنتوف اور اس کا شاہکار ناول " دی ہیرو آف آور ٹائمز " ہے ۔

" دی ہیرو آف آور ٹائمز " کی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو نہ ترگنیف کے ہاں ملتی ہیں نہ دوستوئفسکی اور ٹالسٹائی کے ۔ یہ گہرا نفسیاتی ناول ہے ۔ اور انسان کو سمجھنے کی ایک بڑی معنی خیز تخلیقی کوشش بھی ۔ " آئیڈیاز " IDEAS اور بڑے فنی رچاؤ اور انسانی احساسات میں گندھے ہوئے ملتے ہیں ۔ بیسویں صدی میں لکھے جانے والے NOVEL OF IDEAS سے یہ بہت مختلف ناول ہے ۔ یہاں ہمیں آلڈوس ہکسلے اور اس قبیل کے دوسرے ناول نگاروں

کے ناولوں کی طرح کردار لمبی لمبی بحثیں کرتے نہیں ملتے۔ لرمنتوف کے ہاں آئیڈیاز انسان کے باطن سے جنم لیتے ہیں۔ خارجی علم سے نہیں۔ آئیڈیاز کا منشا دانشوری کا اظہار نہیں بلکہ ازلی انسانی صورت کو سمجھنے کی ایک خلاقانہ سعی ہے۔

یہ ناول مختلف داستانوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان داستانوں میں ہمیں جہاں قدیم روس جیتا جاگتا اور سانس لیتا ہوا ملتا ہے۔ وہاں انسان بھی۔ جو کسی بھی ملک سے زیادہ قدیم ہے۔ ناول کی ایک خاص تکنیک ہے۔ پہلا حصہ بیلا ہے۔ اس ناول کے راوی کو ایک سفر کے دوران میں ایک پرانا فوجی افسر ملتا ہے جس کا نام میکسم میکسی میچ ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو راوی کو اس ناول کے ہیرو پیچورین سے متعارف کراتا ہے۔ اور اس کی اور اپنی زندگی کے ایک دور کا واقعہ سناتا ہے۔ جو "بیلا" کے عنوان سے ہے۔ یہ حصہ اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہے۔ بوڑھا تجربہ کار فوجی افسر راوی کو پیچورین سے جس انداز سے متعارف کراتا ہے وہ بڑا دلچسپ اور گہرا ہے۔ ہمیں آغاز میں ہی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ ہم ایک انوکھے انسان سے ملنے والے ہیں۔ تعارف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"پیچورین یقیناً مالز خوب لڑکا تھا۔ اگرچہ وہ کچھ خبطی سا تھا۔ بعض اوقات تو وہ کئی کئی دن سردی اور بارش میں شکار کھیلتا رہتا۔ ہر شخص سردی سے ٹھٹھر رہا ہوتا۔ تھک کے نڈھال ہو جاتا۔ لیکن پیچورین پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اور بعض اوقات اس کے کمرے میں ہوا کا جھونکا بھی آ جاتا تو بول اٹھتا کہ اسے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ بعض اوقات گھنٹوں بات نہ کرتا اور بعض اوقات گھنٹوں قصے کہانیاں سنا کر سب کو اتنا ہنساتا کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔"

پورے ناول میں ہمیں اس کے بچپن، اس کے والدین، اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ چند اشارے ایسے ملتے ہیں کہ وہ بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس دور میں ناول کے ہیرو کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کا عام رواج تھا۔ لیکن لرمنتوف نے اس سے انحراف کیا ہے۔ وہ اصل میں ہمیں اس طرح خود اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

بیلا میں وہ ایک ضدی، جنونی اور جی دار انسان کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہ

اس لڑکی کو خطروں میں اپنی جان ڈال کر حاصل کر لیتا ہے۔ جس سے اسے محبت نہیں لیکن اس کے حصول کے لیے اس نے سر دھڑ کی بازی لگادی ہے۔ وہ لڑکی اس کی قید میں اس سے بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے بات تک نہیں کرتی۔ لیکن وہ ڈرامہ رچانا جانتا ہے عورتوں کا دل موہ لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب وہ لڑکی بیلا اس سے محبت کرنے لگتی ہے اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے تو وہ اس سے اکتا جاتا ہے وہ کسی چیز کو سنجیدگی سے قبول کرنے کا عادی نہیں۔ اس پر جذبات کے دورے کبھی کبھی پڑتے ہیں۔ کیونکہ وہ آدمی ہے لیکن وہ جلد ہی ان پر قابو پا لیتا ہے اس کا نظریہ ہے۔

"اگر انسان اچھی طرح غور کرے اور سوچے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ زندگی اس قابل تو نہیں ہے کہ آدمی اس کی فکر میں گھلتا رہے۔"

وہ دولت سے خوب عیش کر چکا ہے۔ زندگی کی مختلف دلچسپیوں میں اس نے بہت انہماک کا اظہار کیا۔ اونچی سوسائٹی کی دوشیزاؤں سے دل لگایا۔ مطالعے میں اپنے آپ کو غرق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایک ایسا آدمی ہے جسے قرار نصیب نہیں۔ ایک بے چینی ہے جو اسے لیے لیے پھرتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے:۔

"سب سے زیادہ مسرور تو وہ لوگ تھے جو جاہل مطلق تھے۔ باقی رہی شہرت تو وہ قسمت کا کھیل ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو ریاکاری کی ضرورت ہے اور بس۔!"

وہ خود کہتا ہے:۔

"میرے دماغ میں ہر لمحہ ہل چل مچی رہتی ہے۔ میرے دل میں انمٹ پیاس ہے۔ کوئی چیز مجھے اطمینان اور تشفی نہیں بخش سکتی۔"

یہ ہے پچورین۔ آج کے دور کا انسان۔ بے چین۔ سنسنی کی تلاش میں سرگرداں جسے کہیں قرار نہیں۔ ایک معمہ۔ اور یہ وہ کردار ہے جو آج سے ڈیڑھ صدی پہلے لرمنتوف نے تخلیق کیا تھا۔

بیلا جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے سردھڑ کی بازی لگادی تھی۔ وہ مرچکی ہے، لیکن پچورین کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہیں آتا۔ جب بڑھا فوجی میکسم اسے زمانے کی رسم کے مطابق تسلی دیتا ہے تو پچورین ہنسنے لگتا ہے۔

پچورین عجیب ضدی انسان ہے۔ وہ دوسروں کو دکھ دیتا ہے۔ خود دکھ سے ہنستا ہے لیکن کسی سے اظہار نہیں کرتا۔ وہ انسانی زندگی اور اس کے مقصد کے بارے میں بنیادی سوالوں میں سدا اُلجھا رہتا ہے۔

پچورین ایک ایسا آدمی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا ہے :۔

"وہ جب ہنستا تو اس کی آنکھیں نہ ہنستی تھیں۔ یہ انوکھی خصوصیت یا بدطینتی کو ظاہر کرتی ہے۔ یا ابدی اداسی کو۔"

ناول کے دوسرے حصے میں ناول کے راوی اور بوڑھے فوجی کی اچانک ملاقات اسی پچورین سے ہو جاتی ہے۔ بوڑھا فوجی پرانے ناطے کی وجہ سے جذباتی ہو رہا ہے لیکن پچورین اس سے بہت سردمہری سے ملتا ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ وقت رکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ پچورین بتاتا ہے کہ وہ ایران کی سیاحت کے لیے جارہا ہے۔ پتہ نہیں وہ زندہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔ ناول کا یہی دوسرا حصہ ہے۔ جہاں ہم پچورین کو دیکھتے ہیں پہلے حصے میں اس کی زندگی اور اس کے کردار کے بارے میں ایک داستان بوڑھا فوجی سناتا ہے دوسرے حصے میں وہ تھوڑی سی دیر کے لیے زندہ حالت میں ناول کے چند صفحات میں اپنے وجود کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

بوڑھے فوجی میکسم کو پچورین کی اس سردمہری کا اتنا دُکھ ہوتا ہے کہ اس کا دوستی جیسے رشتے سے ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ وہ پچورین کی ڈائریاں برسوں سے اس اُمید سے اٹھائے اُٹھائے پھرتا رہا ہے کہ پچورین سے ملاقات ہو تو وہ یہ ڈائریاں اس کے حوالے کر دے گا۔ لیکن اس کے رویے کی وجہ سے وہ اب ان ڈائریوں کو بھی ایک بوجھ سمجھنے لگا ہے۔ پچورین کی یہ ڈائریاں اس ناول کا راوی حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد اگلے حصے میں یہ راوی ہمیں بتاتا ہے :۔

"حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ ایران سے واپسی میں پچورین کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ سُن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کیونکہ اب مجھے یہ اوراقِ پریشان شائع کرانے کا پورا پورا حق حاصل ہو چکا ہے"۔

ناول کا تین چوتھائی حصہ پچورین کی یادداشتوں کی شکل میں ہے۔ یوں ابتدا میں ناول کی جو تکنیک تھی وہ تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی لرمنتوف کا ناول خاص حوالی کا مظہر ہے۔ ان ڈائریوں میں اس کی زندگی کے واقعات ہیں۔ چونکا دینے والے خاص طور پر اس لیے کہ یہ واقعات پچورین کی نفسیات اس کے مزاج، اس کی شخصیت اور اس کی روح کو سامنے لاتے ہیں۔ راوی تیسرے حصے کی ابتدا میں اس حوالے سے لکھتا ہے۔

"مجھے یقین ہوگیا ہے کہ پچورین نے اپنی کمزوریوں اور برائیوں کا پردہ پورے خلوص سے چاک کیا ہے۔ انسانی روح کی کہانی جہاں تک گھٹیا سے گھٹیا روح کی کہانی بھی اتنی ہی دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہے جتنی کہ کسی قوم کی تاریخ" یہاں راوی جو دراصل ناول نگار ہے وہ پڑھنے والوں کے تجسس کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔

آپ میں سے کچھ لوگ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ پچورین کے کردار کے بارے میں میری رائے کیا ہے۔! میرا جواب آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔"

واقعی۔ جواب کتاب میں ہی موجود ہے!! یادداشتوں کے حصے کی پہلی کہانی یا پہلا باب تامان ہے جو ایک ساحلی شہر کا نام ہے۔ جہاں پچورین کو کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑا ہے یہاں وہ اپنی تمام تر ذہانت، جرأت مندی اور چالاکی کے باوجود ایک لڑکی کے ہاتھوں اُلّو بن کر اپنی بہت سی قیمتی چیزیں کھو بیٹھتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس میں آئیڈیا نہ کی کمی ہے اور پچورین کا اپنا کردار بھی زیادہ تفصیل سے سامنے نہیں آتا۔

یادداشتوں کے پہلے حصے کے بعد ناول کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے اور اس کا پہلا باب۔ شہزادی مارنی ہے یہ انسانی ضد اور بہادری کی کہانی ہے جس میں پچورین کے کردار کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ یہاں وہ کٹھور، سنگدل اور غیر جذباتی انسان بھی دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر جب اس کی محبوبہ ویرا اپنے بوڑھے خاوند کے ساتھ جانے پر مجبور ہے اور روانہ ہو چکی ہے تو وہ بہت جذباتی ہو کر اس کا تعاقب کرتا ہے لیکن اس

تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہاں اس پر شدید جذباتی دورہ پڑتا ہے۔ جو اپنے اوپر مکمل ضبط اور قابو رکھتا ہے۔ اس نے اپنے آنسوؤں اور سسکیوں کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ اگر اس کا گھوڑا راستے میں گر کر نہ مر جاتا تو شاید وہ دریا اپنی محبوبہ کو راستے میں جا لیتا لیکن وہ دورہ گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور اسے شدید احساس ہوا۔

"اچھا تو میں رو بھی سکتا ہوں۔"

لیکن وقت گزرنے کے فوراً بعد وہ سنبھل گیا۔ جذبات کا دورہ ختم ہوا تو اسے سردی کے ساتھ بھوک محسوس ہونے لگی اور اس نے دل میں کہا اچھا ہوا کہ گھوڑا راستے میں گر کر مر گیا اگر میں دریا کی سواری کو راستے میں ہی جا لیتا تو کیا ہوتا۔ اس محبت کا انجام کیا ہو سکتا ہے وہ شادی شدہ اور میں شادی سے نفرت کرنے والا آزاد پسند، چلو اچھا ہوا۔ اور وہ پھر جذبات سے عاری ہو گیا۔

وہ شہزادی ماری پر ضد میں عاشق ہوا۔ اسے یہ تاثر دینے لگا کہ وہ تو کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کا ایک اپنا جاننے والا جو شہزادی ماری کے عشق میں گرفتار تھا۔ اور دوسرے لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کے لیے سازش تیار کی گئی "وہ ڈوئل لڑا اور اپنے حریف کو مار دیا۔ لیکن وہ شہزادی سچ مچ اس سے محبت کرنے لگی۔ لیکن وہ تو اس کو دکھ دینا چاہتا تھا اور سچ بولا۔ اس نے اسے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کر سکتا اور پھر بڑی بات کہ وہ اس سے محبت بھی نہیں کرتا۔ وہ اس صدمے سے شدید علیل ہو گئی۔ وہ اس سے شدید علالت کے دنوں ملا ملتا ہے۔ اور تب بھی اسے بڑی صفائی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی جان بچانے کے لیے بھی اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے دل میں اپنے لیے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اور جب وہ واقعی اس سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔

ایسا ہے یہ آدمی۔ ہمارے زمانے کا ہیرو، پیچورین!

وہ ایسا آدمی ہے جو ایک بات بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ "میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیتا۔" وہ ایک ایسا انسان ہے جو اپنے جہنم میں خود جلتا ہے۔ یہ جہنم بھی خود اس نے بنایا ہے۔ یہ جہنم ہے ماضی کی یادیں اور تفصیلات۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے،

"میری فطرت کتنی حیران کن ہے۔ یہ کس قدر حماقت کی بات ہے کہ میں کچھ بھی نہیں بھول سکتا کبھی کچھ نہیں بھولتا۔"

وہ بہت سی عورتوں سے وقتی عشق کر چکا ہے۔ جب وہ عشق کرتا ہے تو دنیا ومافیہا سے لاتعلق ہوجاتا ہے وہ اس عشق میں بُری طرح ڈوب جاتا ہے لیکن دل ہی دل میں وہ اس عشق سے بیزار بھی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جب عشق کے ابتلا سے نکل آتا ہے تو پھر اس کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اپنے آپ کو کوستا ہے۔ عورت ذات کے بارے میں اس کی رائے بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ وہ عورتوں کے بارے میں سمجھتا ہے کہ ان کی اپنی سرے سے کوئی رائے ہوتی ہی نہیں ہے۔

وہ اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

"محبت کے جذبات اب میرے عقل وہوش پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے۔ حالات نے میری انا کو کچل ڈالا لیکن ایک دوسری صورت میں یہ نمایاں ہوگئی۔ یہ حرص وہوس آخر ہے کیا؟ طاقت کی فتح، مجھے اپنے اردگرد کی ہر چیز کو فتح کرنے اور اپنے سامنے جھکانے سے خوشی ہوتی ہے اور پھر یہ جذبات کیا ہیں؟ یہ خیالات کے ارتقاء کی پہلی منزل ہی تو ہیں اگر کوئی سمجھے کہ جذبات ساری عمر برقرار رہیں گے تو اس سے بڑا احمق کوئی نہیں۔"

وہ اپنی زندگی کے مقصد اور وجود کے بارے میں بہت غور وفکر کرتا ہے جو سوال اس حوالے سے پچورین کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ ان سوالوں کا جواب بھی ڈھونڈتا ہے وہ انسانی خواہشوں کی بے کرانی کے طلسم سے بھی آگاہ ہے۔ اور ان کی ناپائیداری کا بھی راز جانتا ہے۔

وہ دشمنوں سے عشق کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ "مگر عیسائیت کے نقطۂ نظر سے نہیں میں انہیں دیکھ کر بہت محظوظ ہوتا ہوں۔ میں ان کی سازشوں کو دُھتا دینے میں ہی اپنی زندگی کا مقصد پاتا ہوں اگر دشمن نہ ہوں اور ان سے عشق کر کے بدلہ نہ چکایا جائے تو پھر زندگی کا کیا حاصل؟

وہ دوسروں کو دکھ پہنچا کر مسرت حاصل کرتا ہے اور پھر سوچتا بھی ہے۔ کڑھتا

بھی ہے۔ دکھ بھی محسوس کرتا ہے کہ میں اس طرح کی خوشی کیوں محسوس کرتا ہوں۔ اسے مستقبل پر کوئی یقین نہیں۔ موت سے وہ نہیں ڈرتا۔ لیکن کبھی کبھی اپنی تنہائیوں سے خوفزدہ ہو جاتا ہے اس پر عجیب سا احساس سوار رہتا ہے۔

"ممکن ہے میں کل مر جاؤں۔ دنیا میں کوئی ایک وجود بھی ایسا نہیں ہوگا جو پوری طرح مجھے سمجھ سکے۔"

وہ ڈوئل لڑنے جاتا ہے تو وصیت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی ضرورت ہی وہ محسوس نہیں کرتا۔ وہ کسی کو دوست نہیں سمجھتا۔

پیچورین کس بات پر یقین رکھتا ہے۔ آخر وہ زندگی اور انسان کے بارے میں کونسا تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لرمنتوف نے لکھا ہے۔ اس کا جواب کتاب میں موجود ہے اور واقعی اس کا جواب کتاب میں موجود ہے۔ یہ اس کتاب کا آخری باب ہے۔ "تقدیر کا غلام" آدمی تقدیر کا غلام ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"ہم مسلمانوں کے عقیدے پر بات کر رہے تھے کہ آدمی کی تقدیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ اس تقدیر کو مسلمانوں کے عقیدے کو مانتا ہے۔ پیچورین کی ذات کا سارا حسن اور سارا تضاد اسی عقیدے کا ثمر ہے وہ جانتا ہے کہ جب تک تقدیر میں موت نہیں لکھی موت نہیں آئے گی۔ اور اس کا ثبوت بھی وہ فراہم کرتا ہے۔ دولیچ کا کردار اسی مسئلے اسی عقیدے کا بین ثبوت بن کر ناول میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مزاج میں جو بے چینی اور اضطراب ہے۔ اس کے اندر کی جو آدمیت ہے وہ اسے اس پر بھی ٹکنے نہیں دیتی۔ پیچورین آدمی کو تقدیر کا غلام مانتا ہے۔ اس کے لیے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن آدمی بڑی عجیب چیز ہے۔ اسے سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ کہتا ہے، اب کون ہے جو اس پر یقین نہ کرے گا کہ آدمی تقدیر کا غلام ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آدمی کے بارے میں یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کس بات پر یقین رکھتا ہے۔

تو پھر کس طرح زندہ رہنا چاہیئے۔ پیچورین کے حوالے سے یہ سوال اٹھتا ہے اور پیچورین ہمیں بتاتا ہے۔

"میں ہر چیز پر شبہ کرنے کو بہتر خیال کرتا ہوں۔ کوئی اپنی ایسی طبیعت بنالے تو پھر آدمی نامعلوم حالات کا بھی بہتر انداز میں بہادری سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ بہر حال موت سے بد تر حادثہ پیش آنے سے تو رہا۔ اور موت سے کسے فرار حاصل ہے؟"

انیسویں صدی میں الٰہ منتوف نے پچورین کے حوالے سے جو کردار اپنے عہد کا نمائندہ بنا کر پیش کیا۔ وہ تخلیقی اور انسانی سطح پر ایک آفاقی کردار بن کر دنیا کے ادب پر چھا چکا ہے اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

ستاں دال

ریڈ اینڈ دی بلیک

ژولیاں سوریل عالمی ادب کے چند اہم لازوال اور فکر انگیز کرداروں میں سے ایک ہے یہ کردار ستاں دال نے اپنے ناول "سرخ و سیاہ" میں پیش کیا ہے۔ جب یہ ناول ۱۸۳۰ء میں شائع ہوا تو اس وقت ستاں دال کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک بھرپور زندگی بسر کر چکا تھا اور زندگی کے اَن گنت تجربات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اَن گنت تجربات سے گزر چکا تھا۔ لیکن جیسا کردار اس نے ژولیاں سوریل کی صورت میں پیش کیا ویسا وہ نہ تو خود تھا اور نہ ہی کوئی اس کا ملنے والا۔

فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والے اس ناول "سرخ و سیاہ"

"LEROGUE ETLE NOIR"

کا مقدر یہ ٹھہرا کہ یہ عالمی ادب کا عظیم شاہکار قرار پایا۔ دنیا بھر کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ ماہم نے اسے دنیا کے دس بڑے ناولوں میں ایک قرار دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس ناول کی عظمت اور خوش قسمتی ہے کہ اسے اُردو زبان میں مرحوم محمد حسن عسکری جیسا مترجم ملا جنہوں نے اس کا ترجمہ "سرخ و سیاہ" کے نام سے شائع کیا اور اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔

جب یہ ناول پہلی بار شائع ہوا تو اس کے بارے میں پڑھنے والوں اور ناقدوں کا تاثر ملا جُلا تھا۔ اس میں ژولیاں سوریل کا کردار بہت بڑی مشکل بن گیا تھا لیکن وہ بہت اچھا لگتا ہے بہت پیارا اور محبت کے قابل اور کہیں وہ اتنا بُرا لگتا ہے کہ اس سے نفرت ہونے لگتی ہے اس قسم کے تاثرات تھے جو لوگوں اور نقادوں نے اس ناول کے حوالے سے بیان کیے۔ پھر اس

ناول میں "ستاں دال" نے ایک اور تجربہ بھی کیا تھا جو مروجہ ناولوں سے بہت مختلف تھا۔ اس ناول میں ایک کے بجائے دو ہیروئین ہیں جو دونوں ہیرو ژولیاں سوریل پہ مرتی ہیں اور وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ اگرچہ اس محبت کا انداز عام ناولوں کی محبت سے بہت مختلف ہے۔ ستاں دال کے ناول "سُرخ و سیاہ" کی اشاعت سے پہلے عام طور پر یورپی ناولوں میں ایک ہی ہیروئن پیش کی جاتی ہے۔ اور اسی پر توجہ دی جاتی تھی۔

ستاں دال کو اپنے اس ناول اور اپنے بعد میں شائع ہونے والے ناول کے حوالے سے کچھ مایوسی ہوئی کہ ان کتابوں کو جو اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس خیال کے پیش نظر ستاں دال نے یہ لکھا کہ ان کے ناولوں کو ایک سو برس کے بعد پوری طرح سمجھا جا سکے گا ستاں دال کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اب جبکہ اس ناول کی اشاعت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے ستاں دال کو عالمی ادب میں اس کے ناول کے حوالے سے وہی مقام مل چکا ہے جس کا وہ حقدار تھا۔

ستاں دال کا اصلی نام ہنری بلیل تھا جو آج پڑھنے والے بہت کم جانتے ہیں۔ اسے عالمگیر شہرت اس کے قلمی نام "ستاں دال" سے ہوئی۔ "ستاں دال" فرانس میں گرنیویل میں ۲۳ جنوری ۱۷۸۳ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اور ریاضی میں خاصا نام پیدا کیا بعد میں وہ پیرس چلا گیا جہاں ایک پولی ٹیکنیک سکول میں پڑھنے لگا۔ ستاں دال کا تعلق خاصے خوشحال خاندان سے تھا۔ پولی ٹیکنیک کی اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ کیونکہ اس کے ایک عزیز نے اس کے لیے محکمہ جنگ میں معقول ملازمت کا بندوبست کر دیا تھا بعد میں اسے حکومت نے اٹلی اور میلان کے سفارت خانوں میں بھیج دیا اسے اٹلی بہت پسند آیا اور بعد میں اس نے اپنا طرز زیست اور انداز بود و باش اطالوی انداز میں ڈھال لیا۔ ۱۸۰۰ء میں وہ فوج میں بھرتی ہوا اور اسے لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔ بعد میں اس نے مارسیلز میں کچھ کاروبار کرنے کی کوشش کی ۱۸۰۶ء میں وہ پارلیمنٹ کا رکن بنا اس کے بعد ۱۸۱۰ء تک وہ ایک پرچے کو مرتب کرتا رہا۔ نپولین نے جب روس پر حملہ کیا تو اس نے بھی اس فوجی مہم میں حصہ لیا جب نپولین کو زوال ہوا تو ستاں دال اٹلی چلا گیا۔ جہاں وہ ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۱ء تک مقیم رہا میلان میں بھی کچھ عرصہ گزارا جہاں باراں اور مادام ڈی سٹیشل سے

اس کے تعلقات پیدا ہوئے۔

ستاں وال نے ایک دوسرے قلمی نام سے ۱۸۱۴ء میں پیرس سے ایک کتاب شائع کی جو موسیقی کے بارے میں تھی اس کے بعد اپنے نئے قلمی نام ستاں وال کے ساتھ اس نے اٹلی اور نیپلز کے سفرنامے اور تاریخ شائع کرائی' وہ اطالوی طرز زیست اور کلچر کا زبردست مداح بن گیا ۱۸۲۱ء میں جب وہ پیرس لوٹا تو ادبی حلقوں میں آنے جانے لگا۔ اور اس دور کے بعض اہم فرانسیسی ادیبوں سے گہرے روابط قائم ہوئے ۱۸۲۲ء تک اس نے کئی دوسری کتابیں لکھیں جو روم کے بارے میں تھیں۔ ۱۸۳۰ء میں اس کا شاہکار ناول "سرخ و سیاہ" شائع ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں اسے ایک ملک کا سفیر بنا دیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں اس کا دوسرا شاہکار ناول LACHARTREU SEPARMA شائع ہوا۔ جسے بعض ناقدین اس کا سب سے اہم اور بڑا تخلیقی کارنامہ ہی قرار دیتے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت ستاں وال کے لیے باعث مسرت ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ وہ ناول ہے جس کی بالزاک جیسے عظیم فرانسیسی ناول نگار نے بے حد تعریف کی۔ اور اس پر ایک شاندار تبصرہ لکھا۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام کردار اطالوی ہیں اور یہ اطالوی طرز زیست کی عکاسی کرتا ہے۔

۲۲ مارچ ۱۸۴۲ء کو ستاں وال کا انتقال ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی ہمشیرہ نے اس کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا جو مکتوب نگاری میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔

ستاں وال نے ایک بار لکھا تھا کہ اس کے ناول دراصل خوش قسمت لوگوں کے لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قاری یقیناً خوش قسمت ہے جس نے اس کے عظیم شاہکار "سرخ و سیاہ" کا مطالعہ کیا ہے۔

"سرخ و سیاہ" ایک ایسا حقیقت پسندانہ شاہکار ہے جس میں انسانی نفسیات کی گہرائی میں اتر کر مصنف نے انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں اور عوامل کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ نام دراصل علامتی ہے۔ "سرخ" رنگ اس ناول میں فوج اور اقتدار کی علامت بنتا ہے۔ اور دوسرا رنگ سیاہ مذہب اور اختیار کی علامت۔ اس دور میں (اور اب بھی) یہ سمجھا جاتا رہا کہ انسان کو اقتدار یا تو مذہب کے حوالے سے مل سکتا ہے یا پھر فوج کے

ذریعے سٹیفن کرین نے اپنے مشہور زمانہ ناول "دی ریڈ بیج آف دی کرج" میں سرخ رنگ کو "دلاوری کا سرخ نشان" کہا تھا۔ ستاں دال بھی اسے انہی معنوں میں لیتا ہے اور سیاہ رنگ پادریوں کے لباس کے حوالے سے اقتدار کی علامت بنتا ہے۔

"سرخ و سیاہ" کا ہیرو ژولیاں سوریل ایک قصباتی بڑھئی کا بیٹا ہے وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے بے حد مختلف ہے۔ وہ پرکشش اور نازک ہے وہ ایک طالع آزما اور مہم جو طبیعت کا مالک ہے۔ وہ سُرخ اور سیاہ، فوج اور مذہب کے درمیان سے ایک ایسی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے سودمند ہو ژولیان نے نپولین کو نہیں دیکھا لیکن وہ نپولین کو پوجتا ہے۔ وہ اس کا آئیڈیل اور ہیرو ہے ایک ایسے زمانے میں جب نپولین کا مداح ہونا سماجی اعتبار سے نقصان دہ ہے وہ نپولین کی محبت میں گرفتار ہے لڑکپن میں اسے ایک ایسے شخص سے دوستی کرنے کا اتفاق ہے جو نپولین کی فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اس پنشن یافتہ ڈاکٹر سے وہ نپولین کے بارے میں بہت معلومات حاصل کر چکا ہے

جب یہ ناول شروع ہوتا ہے تو نپولین پر زوال آچکا ہے۔ فرانس میں امن وامان کا دور دورہ ہے۔ نپولین جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے ملک میں کلیسا کے زیر اثر ایک رجعت پسند حکومت قائم ہو چکی ہے اس لیے ژولیاں مجبور ہے کہ وہ نپولین کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کو چھپا کر کلیسائی زندگی کو اپناتے ہوئے مستقبل کی ترقی کے لیے سیڑھی بنائے وہ حیرت انگیز حافظے کا مالک ہے اس نے انجیل مقدس کو عبرانی زبان میں پورا یاد کر رکھا ہے وہ WONDER BOY کی سی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اس کی عملی زندگی کا آغاز عجیب انداز میں جنوبی فرانس کے اس قصبے سے ہوتا ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا اس قصبے کے تاجر اور میئر کے ہاں اسے بچوں کا اتالیق رکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں اس کے پہلے عشق کا آغاز ہوتا ہے جو وہ میئر کی بیوی سے کرتا ہے جو خود اس کے عشق میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ اس عشق کی تفصیل جس انداز سے ستاں دال نے پیش کی ہے۔ اس کی تعریف ممکن نہیں۔ ژولیاں اس طبقے سے نفرت کرتا ہے۔ جس سے اس کی شادی شدہ محبوبہ کا تعلق ہے۔ ژولیاں ایک ریاکار ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس محبت میں ریاکاری کا عنصر

کرتا ہے اور وہ کس حد تک خالص محبت کرتا ہے۔ جب اس کے عشق کو قصبے میں رسوائی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس وقت تک اپنی اس محبوبہ سے فیض یاب ہو چکا ہوتا ہے جو ژولیاں کے ساتھ بے حد گہری بے حد الجھی ہوئی محبت کرتی ہے۔ یہ ایک نکوکار عورت کا کردار ہے جو ماں ہے لیکن اس نوجوان سے محبت کرنے لگی ہے اس کے دل میں گناہ کا احساس جس انداز میں جس نفسیاتی اور تخلیقی صداقت کے ساتھ بیان ہوا ہے یہ اس ناول کا سب سے خوب صورت اور موثر پہلو ہے۔

ژولیاں ایک کلیسائی درسگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہت کم ایسے یورپی ناول ہوں گے جن میں کلیسائی زندگی کا نقشہ اس کی پوری صداقت کے ساتھ اس طرح بیان ہوا ہو جس طرح "سرخ و سیاہ" میں ہوا ہے لیکن ژولیاں یہاں بھی پوری تعلیم حاصل کر کے پادری نہیں بن پاتا کہ اسے پیرس جانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ایک مقتدر نواب کا سیکرٹری بن جاتا ہے یہاں بھی وہ پادریوں جیسے سیاہ لباس کو پہنتا ہے اس لباس کو ترک نہیں کرتا۔

یہاں اس کی زندگی کا دوسرا عشق شروع ہوتا ہے اس کا آقا نواب دلامول ہے۔ جس کی بیٹی سے وہ عشق کرتا ہے وہ اس سے شادی پر تل جاتی ہے۔ نواب دلامول اسے اپنا داماد بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس کے لیے فوج میں اعلیٰ ملازمت کا بھی بندوبست کر دیتا ہے۔ ناول کے اس حصے میں سرخ رنگ ظہور پذیر ہو جاتا ہے اس کی سابقہ محبوبہ میئر کی بیوی ایک خط میں نواب دلامول کو اپنے اور ژولیاں کے تعلقات سے آگاہ کرتی ہے۔ جلد باز اور ناعاقبت اندیش ریاکار ژولیاں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیتا ہے وہ اپنی سابقہ محبوبہ پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے جو بچ جاتی ہے۔ ژولیاں پر مقدمہ چلتا ہے اور اسے موت کی سزا دی جاتی ہے۔ یہاں جیل میں موت کی سزا پانے سے پہلے اس کو اپنی اصلی محبت اور اپنی منافقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

انسانی منافقت اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کش مکش کے حوالے سے دنیائے ادب میں "سرخ و سیاہ" سے بڑا ناول شاید ہی لکھا گیا ہو۔ اب اس کی دونوں محبوبائیں اس کی جان بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتی ہیں لیکن ژولیاں موت کو ترجیح دیتا ہے وہ۔

منافقت اور ریاکاری سے عاجز آچکا ہے۔ اس نے زندگی کا کشف حاصل کرلیا ہے۔

ژولیاں سوریل ایک رومانی ہیرو سے مشابہت رکھنے کے باوجود مختلف ہیرو ہے۔ وہ کلیسا کے سیاہ رنگ کے چغے کے نیچے اپنی ہوس چھپائے ہوئے ہے۔ وہ ایک پُراسرار کردار کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ خواتین اس میں بطور خاص دلچسپی لیتی ہیں۔

۱۹ ویں صدی میں فلابیئر بالزاک اور زولا جیسے عظیم فرانسیسی ناول نگار پیدا ہوئے ان میں ستاں دال بھی پروقار انداز میں کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا شاہکار "سرخ و سیاہ" ہے جو عالمی ادب کا ایک عظیم کارنامہ ہے وہ ژولیاں سوریل کے خالق کی حیثیت سے لازوال ہوا۔ ژولیاں جو ایک پورے معاشرے سے نبرد آزما اور برسرپیکار ہے۔ کہیں کہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ژولیاں صرف اپنے کردار کے بل بوتے پر پورے معاشرے کو شکست دینے اور چھا جانے پر تلا ہوا ہے۔ کیونکہ اسے نہ دولت کی ہوس ہے نہ مذہبی معاشرے میں اونچے مرتبے کی پرواہ۔

ستاں دال نے ایک مذہبی معاشرے کی منافقت کو جس انداز میں پیش کیا ہے یہ اس ناول کا خاص پہلو ہے۔ ستاں دال نے اس ناول میں ناول نگاری کے بارے میں اپنے نظریے کا بھی اظہار کیا ہے۔ یوں وہ ایک حقیقت نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ناول تو ایک آئینہ ہے جسے لے کر سڑک پر نکلا جاتا ہے اگر راستے میں گڑھے اور جوہڑ دکھائی دیتے ہیں تو اس میں اس آئینہ کا تو کچھ قصور نہیں۔"

"سرخ و سیاہ" یورپی ادب کا ہی نہیں عالمی ادب کا بھی عظیم شاہکار ہے۔

ریمیمبرینس آف تھنگز پاسٹ

۱۹۲۲ء میں جب مارسل پروست کا انتقال ہوا تو وہ اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کا ایک عظیم ترین فن پارہ مکمل کر چکا تھا۔ اپنا عظیم الشان تخلیقی کارنامہ جو آج ساری دنیا میں ریمیمبرینس آف تھنگز پاسٹ کے نام سے مشہور ہے۔

مارسل پروست نے ایک دلچسپ اور عجیب وغریب زندگی بسر کی اور اس سے بھی عجیب تر اور محیر العقول تخلیقی کارنامہ اس نے اپنے اس ناول کے حوالے سے تخلیق کر کے تخلیقی ادب میں ہمیشہ کے لیے اپنے لیے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جو صرف اور صرف اسی سے ہی مخصوص ہے۔

فرانسیسی زبان میں لکھا جانے والا یہ ناول۔ فرانس کے ہر اس ناول نگار اور نثر نگار کی تخلیق سے مختلف اور منفرد ہے۔ جن کا شہرہ پوری دنیا میں ہے۔ ڈوما، ہیوگو، زولا، آندرے ژید، سارتر، فلابیر، ژاں ژینے، کوکتو اور پھر رومین رولاں کے ضخیم شہکار "ژاں کرستوفی" تک فرانسیسی ادب میں ناول کی عظیم الشان اور منفرد تخلیقی تاریخ ہے۔ یہ سب بڑے نام اور ان کے بڑے کام عالمی ادب کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح روسی، انگریزی اور دوسری بڑی مقتدر زبانوں کے ناول نگاروں کا بھی ایک اپنا مقام ہے۔ لیکن مارسل پروست کا ناول "ریمیمبرینس آف دی تھنگز پاسٹ" سب سے علیحدہ دکھائی دیتا ہے۔

بیسویں صدی تک جن ناول نگاروں نے اس صنف ادب میں نمایاں تخلیقات کا اضافہ کیا اور ناول کی صنف کو زندگی کا سب سے اہم ترجمان بنا دیا۔ ان میں بڑے بڑے نام آتے ہیں

جن کے بہت سے فن پاروں کا ذکر اس سلسلۂ مضامین میں تفصیل اور اجمال سے آچکا ہے لیکن مجھے یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مارسل پروست کا ناول سب سے مختلف و منفرد ہے۔

ہر شخص جس کا لکھنے پڑھنے سے سنجیدہ تعلق رہا ہو وہ اپنی زندگی میں جتنا کچھ پڑھتا ہے۔ اس میں سے چند تصانیف اور کتابیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو وہ اپنے مطالعے کا حاصل قرار دیتا ہے۔ مارسل پروست کے اس ناول "ریمیمبرینس آف تھنگز پاسٹ" کا ایک کردار سوان (SWANN) ہے۔ جس کی زبان سے مارسل پروست نے یہ جملہ لکھوایا ہے۔

"زندگی بھر میں ہم تین یا چار ہی ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جو حقیقی اور اصلی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔"

مارسل پروست کا یہ ناول۔ انہی تین چار کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ کتابوں کا دائرہ کچھ محدود کر لیں تو پھر یوں کہا جا سکتا ہے کہ عالمی ادب میں تین چار ہی ایسے بڑے ناول ہیں جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے ایک مارسل پروست کا ناول ہے۔

میں تو اس ناول کے حوالے سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے اور اس میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے، اسے اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن مارسل پروست کے اس ناول کو پڑھنا بھی تو ایک مشکل کام ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ سکاٹ مونکریف نے کیا ہے اور جس کے ترجمے کے بارے میں خود مارسل پروست نے یہ جملہ کہہ کر مترجم کو داد دی تھی کہ۔ ترجمہ اصل ناول سے بڑھ گیا ہے۔ یہ ترجمہ چار ہزار صفحات میں کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ آج کے اس مصروف دور میں اتنا ضخیم ناول پڑھنا یقیناً "کارے دارد۔ والا مسئلہ ہے لیکن ادب کے ہر سنجیدہ قاری سے کم از کم یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کی کتابوں کو نظر انداز کر کے ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس" اور مارسل پروست کا "ریمیمبرینس آف تھنگز پاسٹ تو پڑھ ہی لے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل الم غلم اور بے کار کتابوں کے مطالعے سے کہیں بہتر ہے کہ دو ناول ہی پڑھ کر انسان اس عظیم تجربے کو محسوس کرے جس کا احوال بیان کرنا مشکل ہے۔

میں مارسل پروست کے اس ناول سے سینکڑوں ایسے ٹکڑے نقل کر سکتا ہوں اور ان کے حوالے سے تمام بڑے بڑے ناول نگاروں کے ساتھ اس کا موازنہ کر سکتا ہوں لیکن اس سے بھی

اس عظیم تخلیق کے ساتھ بھرپور انصاف نہ ہو سکے گا۔

اس ناول میں ہی ایک ٹکڑا ہے جہاں آنٹ لیونی۔ ننھے مارسل کو چائے پلاتی ہے اس کا بیان مارسل پروست نے کوئی ۴۴ سطروں میں قلم بند کیا ہے اس واقعے کو ہیمنگوے اپنی اختصار پسندی سے بیس الفاظ میں قلم بند کر سکتا تھا اور دنیا کا ایک اور بڑا ناول نگار بالزاک سو لفظوں میں اسے اپنے انداز میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ لیکن اس واقعہ کو جس انداز میں مارسل پروست نے لکھا ہے وہ صرف اسی سے مخصوص ہے اور دنیا کا کوئی مصنف اسے اس انداز میں بیان کر ہی نہیں سکتا تھا۔

یہاں پھر یہ وضاحت ضروری ہے کہ میرے جیسے طالب علم جو براہ راست فرانسیسی زبان نہیں جانتے۔ وہ انگریزی کے وسیلے ہی سے اسے پڑھ سکتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے اچھا ترجمہ سکاٹ مونکریف کا ہے۔ (اس کے علاوہ کوئی دوسرا ترجمہ نہ میں نے دیکھا ہے نہ میرے علم میں ہے اور پھر مونکریف کے ترجمے کے بعد کسی دوسرے ترجمے کو پڑھنے کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔)

مارسل پروست کے ہاں لفظ جو شکل اختیار کرتے ہیں وہ کسی دوسرے بڑے لکھنے والوں کے ہاں دکھائی نہیں دیتی، یہاں لفظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے لازمی، توام اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ ان میں زندہ چیزوں جیسا خستہ پن پایا جاتا ہے۔ اور پھر جب ہم اس نثر کے حوالے سے پوری کتاب پڑھ جاتے ہیں تو ہمیں یہ بھرپور احساس ہوتا ہے جو ایک کشف کی سی حالت رکھتا ہے کہ اس ناول میں زندگی اور فطرت۔ یک جان ہو چکے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس ناول کے حوالے سے میں یہ بات سمجھا سکتا ہوں کہ نہیں۔ کہ مارسل پروست نے یہ ناول ایک خاص "اعصابی نظام" کو بروئے کار لا کر تحریر کیا تھا۔ تخلیق اور اظہار کی دنیا میں یہ اسلوب "اعصابی نظام" اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس ناول کا کوئی از خود توجہ سے مطالعہ کرے۔ جیسا کہ اس ناول کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ بیتی ہوئی گھڑیوں، لمحوں اور اشیاء کی یادیں ہیں۔ بیتے ہوئے وقت کی بازیافت ___ یہی اس ناول کی تھیم ہے۔!

وقت ___ اس ناول کا سب سے اہم عنصر ہے اور وقت کو جس طرح "میٹامورفوسس"

نے بدل دیا ہے۔ اس کی بازیافت ۔ اس کا حاصل ہے۔

METAMORPHOSIS کی یہ حسّ ۔ مارسل پروست کے اعصابی نظام کے ساتھ وابستہ اور مربوط ہے اور یہ دونوں حسّیں جو اس کتاب میں منظم و مربوط ہو گئی ہیں۔ مارسل پروست کی حساس ترین تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے جنم لے کر بدلتے ہوئے تناظر کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں اور یوں ایک پورا انسانی معاشرہ اپنے ماضی اور بدلے ہوئے تناظر کو ہمارے ساتھ زندہ ہو کر سانس لینے لگتا ہے۔ مارٹینویل، سوان اوڈیٹ، مادام وردون ایسے کردار ہیں جو مارسل پروست نے تراشے اور اپنے عظیم فنی اور تخلیقی تجربے اور اپنے ناول کی تفہیم کے لیے ان کو استعمال کیا۔ اس ناول میں خارجی حقائق اپنی جھلک دکھاتے ہیں لیکن کسی ایک خارجی لمحے کی تفسیر۔ دوسرے لمحے سے نہیں ملتی۔ ایک جیسے لمحوں کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے اس طرز اسلوب میں تاثریت کا پہلو نمایاں قرار دیا جاسکتا ہے لیکن یہ تاثریت متحرک ہے۔ معمولی سے معمولی جزئیات میں بھی یہ متحرک تاثری انداز پایا جاتا ہے۔

اس ناول کا گہرا تعلق مارسل پروست کی اپنی زندگی سے بھی ہے۔ مارسل پروست اور اس کی ماں میں جو محبت تھی اور اس حوالے سے جو پیچیدہ اور گتھا ہوا رشتہ جنم لیتا ہے۔ اس کے بارے میں مارسل پروست کے نقادوں اور نفسیات دانوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ جب ۱۹۰۵ء میں مارسل پروست کی والدہ کا انتقال ہوا تو مارسل پروست تنہا اور اکیلا رہ گیا۔ اس تنہائی کی عظیم دین اور عطا ۔ یہ ناول ہے۔

بعض ناقدوں نے اسے جدید ناول کے بجائے انیسویں صدی کے اسلوب کے ناولوں میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ اس میں کردار نگاری، وسیع و عریض سکیل اور مثالی اندازِ فکر پایا جاتا ہے اور پھر اس کے ناول کے خالق کے تخلیقی اعتماد کی جو بھرپور جھلک، اپنی ذات   اور اس ناول کے حوالے سے اس ناول میں ملتی ہے ۔ یہ بیسویں صدی کے جدید ناولوں میں دکھائی نہیں دیتی اور پھر وہ کونسا ناول ہے جس کے بارے میں پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں مصنف اور خدا کی ذات ایک ہو گئے ہیں۔ خالق کی حیثیت سے۔

"ریممبرینس آف تھنگز پاسٹ" کا ہر سنجیدہ قاری اس ناول کے اس پہلو سے واقف ہو گا کہ

اس ناول میں جو تصورات پیش ہوئے ہیں وہ SUBSTANCE سے اخذ نہیں کیے گئے بلکہ یہ
تصورات بذات خود SUBSTANCE ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ امیجز اور رمزیات کے رشتے
کے حوالے سے ترتیب نہیں پاتا بلکہ اس میں ایک حقیقی اور براہ راست ڈرامائی انداز بھی شامل ہے
اس ناول کا ایک ایک لفظ دوسرے لفظ سے جڑا ہوا ہے۔ اس نثر میں وہ خوبی ہے کہ
وہ ہمارے دلوں میں نقش بناتی چلی جاتی ہے۔ ہم کسی کردار کو کسی واقعے کو بھول نہیں پاتے۔ اس ناول
کا ایک کردار ڈی فورش دیل — تین ہزار صفحات گزرنے کے بعد پھر ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ طویل
غیر حاضری کے باوجود اس ناول کی عظیم عمارت میں جڑی ہوئی ایک مضبوط اینٹ کی حیثیت رکھتا
ہے کہ جسے نکال دیا جائے تو عمارت میں سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک خاص تعمیراتی
تکمیل بھی موجود ہے۔ جو شاید ہی کسی اتنے بڑے ضخیم ناول میں اس انداز سے ملتی ہو۔

دانتے نے بہت کچھ لکھا لیکن وہ زندہ اپنے ایک ہی کام "ڈیوائن کامیڈی" کے حوالے سے
رہا۔ اسی طرح مارسل پروست اپنے اسی اکلوتے عظیم اور ضخیم ناول کی بدولت زندہ ہے اور زندہ
رہے گا۔ اور اس کے اس اکلوتے تخلیقی فن پارے کی بدولت اس کی زندگی اس فن اور اس کے
ناول کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ایک پوری لائبریری انہی کتابوں سے بھر سکتی ہے
اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کے حوالے سے اس کے فن اور اس کی ذات پر ہمیشہ لکھا جاتا رہیگا۔

مارسل پروست ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں دنیا بھر میں اس کی سو سالہ برسی کی
تقریبات ہوئیں اور اس کے ناول کے حوالے سے اس کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

سات جلدوں پر مشتمل یہ ناول (یہی ایڈیشن میرے مطالعے میں رہا ہے) جس کا ترجمہ سکاٹ
مونکریف نے کیا ہے اس کے بارے میں اردو زبان کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ مارسل پروست
کا ذکر محمد حسن عسکری کے ہاں ملتا ہے۔ ایک دو جگہ انتظار حسین نے بھی مارسل پروست کا حوالہ دیا ہے
ان دو ایک حوالوں کے علاوہ ہمارے ہاں اس کا ذکر کم ہی ہوا ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں اس کے
بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جبکہ ہمارے ہاں مارسل پروست سے کہیں کمتر غیر ملکی لکھنے والوں کا بہت
ذکر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ اس ناول کی ضخامت بھی ہے لیکن میں اسے کوئی
وجہ نہیں سمجھتا۔

ایڈمنڈ ولسن نے اس ناول کے حوالے سے لکھا تھا۔ یہ ناول بھی بائبل کی طرح ہے۔ یہ ایک
ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جس میں انسان کو تشفی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں جسم اور رُوح کی "
کا بیان منفرد ہے۔ ناقابل تقلید مارسل پروست نے اسی ناول میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"جسم رُوح کو ایک قلعے میں قید کر لیتا ہے۔"

ماضی کی یادوں کی بازیافت اسی روح کی کشمکش اور جدوجہد ہے۔ تنہا رُوح جو آزا
کی خواہاں ہے۔ جسم کے قلعے سے نکلنے کی جدوجہد۔ یہ ناول ایک عظیم تخلیقی تجربہ ہے۔ اپ
اس عظیم تخلیقی فن پارے اور تجربے کی قدر و اہمیت سے مارسل پروست بھی آشنا تھا اپنے ایک
خط میں لکھا تھا کہ میں اس کی عظمت پر متکبر نہیں ہوا۔

مارسل پروست نے "ریمیمبرینس آف تھنگز پاسٹ" کے حوالے سے اپنے ہی الفا
میں "ابدیت کی ایک حس" کو اپنا تذکرہ بنا کر چھوڑا، اس اُمید اور یقین کے ساتھ کہ "میرے بعد
آنے والے اس خزانے سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔"

دی ٹرائل

بیسویں صدی کے فکشن میں علامتی طرز کا ایک بہت بڑا اور بعض کے نزدیک سب سے بڑا ناول نگار اور کہانی کار کافکا ہے۔ وہ کافکا جس نے اپنی موت کے بعد عالمگیر شہرت حاصل کی اور جس کے ناول اور کہانیوں کا بیشتر حصہ اس کی موت کے بعد شائع ہوا۔ وہ فرانز کافکا جس نے اپنی جان لیوا بیماری کے آخری دنوں یہ ہدایت تحریری طور پر دی تھی کہ اس کے تمام مسودے جلا دیے جائیں۔

جب وہ مرا تو اس کے کاغذات میں سے اس کے عزیز دوست میکس بروڈ کو ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کے ڈیسک میں ملا۔ یہ تحریر سیاہی سے لکھی ہوئی تھی اور یہ میکس بروڈ کے نام ایک خط تھا۔ اس خط کا متن تھا۔

ڈیرسٹ میکس۔ میری آخری درخواست، ہر وہ چیز جو میں اپنے پیچھے (اپنے بک کیس کپ بورڈ، گھر اور دفتر کے ڈیسکوں اور جہاں کہیں بھی تمہاری نظر میں میری کوئی چیز پڑے) ڈائریوں کی صورت میں، مسوّدوں کی شکل میں اور خطوط (میرے اپنے اور دوسروں کے) خاکے اور ایسی ہی چیزیں، بغیر پڑھے سب کے سب جلا دیے جائیں۔ حتیٰ کہ وہ تمام خاکے اور مسوّدے بھی جو تمہارے اور دوسرے دوستوں کے پاس ہیں، میرا نام لے کر دوسروں سے درخواست کرنا اور ایسے خطوط جو وہ تمہیں دینا نہ چاہیں اپنے ہاتھوں سے وہ خود جلا دیں"

اگر میکس بروڈ اپنے دوست کی آخری خواہش پر عمل کرتا تو آج دنیا میں کافکا کی وہی چند تحریریں ہوتیں جو اس کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ اور اس کے ناول اور کہانیوں سے کوئی واقف نہ

ہوتا اور کافکا یقیناً وہ شہرت اور مقام عالمی ادب میں حاصل نہ کر پاتا جو اسے آج حاصل ہے
کافکا کے تین ناول ہیں۔ "ٹرائل" "دی کاسل" اور "امریکا" یہ تینوں ناول نامکمل صورت
میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ان ناولوں میں "ٹرائل" اور "کاسل" کو جدید عالمی ادب کا شہکار
تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن زیادہ اہمیت "دی ٹرائل" کو حاصل ہے۔ "دی ٹرائل" کو کافکا نے ۱۹۱۶
۱۹۱۷ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ "کاسل" اور "امریکا" کو ۱۹۱۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ناول
اور اس کی بہت سی کہانیاں اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔ وہ اپنی زندگی میں انہیں چھپوانے
کا خواہش مند نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے عزیز ترین دوست میکس بروڈ سے زبانی بھی
کہا تھا کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے تمام مسودوں کو نذر آتش کر دے۔ میکس بروڈ نے
اس سلسلے میں لکھا ہے کافکا نے کہا تھا۔

" میری آخری خواہش بہت سادہ ہے، میری ہر چیز جلا دینا، میکس بروڈ لکھتا ہے۔
"مجھے آج بھی اپنے اس جواب کے الفاظ یاد ہیں جو میں نے اسے دیا تھا" اگر تم سنجیدگی سے مجھے
اس کام کا اہل سمجھتے ہو تو مجھے ابھی بتا دو کہ میں تمہاری خواہش پوری نہ کر سکوں گا۔"

یقیناً عالمی ادب پر میکس بروڈ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے کافکا کی درخواست پر عمل نہ کیا
فرانز کافکا۔ ایک جرمن یہودی بوہمین کنبے کا فرد تھا۔ جو پراگ (چیکوسلاویکیہ) میں ۱۸۸۳ء
میں پیدا ہوا۔ اس نے جون ۱۹۰۶ء میں قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس کے
بعد وہ ۱۹۰۶ء سے ایک نیم سرکاری ملازمت پر فائز رہا۔ جس کے صلے میں اسے معقول
تنخواہ ملتی تھی اور اوقات کار مختصر تھے۔ اس ملازمت کی وجہ سے اسے پہلی جنگ عظیم میں
فوج میں جانے سے چھٹی مل گئی۔ اس نے پہلی کہانی ۱۹۱۳ء میں شائع کرائی۔ اپنی زندگی میں
اس نے بہت کچھ لکھا لیکن چند کہانیاں ہی شائع کرائیں۔ جن کی بدولت اسے ادبی حلقوں میں
خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کا سارا بڑا کام ناول، کہانیاں اس کی موت کے بعد اس کی
خواہش کو نظر انداز کر کے شائع کی گئیں۔ کافکا کو تپ دق کا مرض لاحق تھا اور یہی مرض اس
کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کی موت ۳ر جون ۱۹۲۴ء کو واقع ہوئی۔ جب وہ مرا تو اس
کی عمر ۴۱ برس تھی۔

ایک کہانی کار کی حیثیت سے اس نے "میٹامفارسس" اور "دیہاتی ڈاکٹر" جیسی شہرہ آفاق کہانیاں لکھی ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے اس کو جو مقام جدید عالمی ادب میں حاصل ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اس کا عظیم فن پارہ "ٹرائل" اس کی موت کے بعد پہلی بار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا اور تب سے اب تک اس ناول کو دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل کر کے شائع کیا گیا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ "ٹرائل" کے اب تک ان گنت ایڈیشن امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ کافکا کی ایک ایک تحریر اور سطر شائع ہو چکی ہے اس کے خطوط، اس کی ڈائریاں تک چھپ چکی ہیں،—

کافکا کے فن اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ نقّادوں کے علاوہ ماہرین نفسیات کو بھی اس میں خاص دلچسپی رہی ہے۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں کے علاوہ اس کی شخصیت اور ذات کے بھی نفسیاتی تجزیے کیے گئے ہیں۔ بعض ناقدوں نے اس کے ہاں جو مابعد الطبیعاتی عنصر پایا جاتا ہے اس پر بھی خاص کام کیا ہے۔

اردو میں اس کی کئی کہانیاں مترجم ہو چکی ہیں لیکن اس کا کوئی ناول منتقل نہیں ہوا۔ تاہم اس کے اثرات اردو اور پنجابی کے بعض مصنفوں پر بہت واضح ہیں جن میں پنجابی کے ناول نگار فخر زمان خاص طور پر نمایاں ہیں۔ کافکا کے اثرات عالمی ادب پر بے حد نمایاں اور واضح ہیں۔

کافکا کے ایک نقاد نے اس کے کام کے حوالے سے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک خاص امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کافکا کے حواس اور لاشعور پر ہمیشہ اس کا باپ چھایا رہا۔ وہ ہمیشہ کوشاں رہا کہ کسی طرح وہ باپ کی نظروں میں بچ سکے۔ اس کے اس نفسیاتی الجھاؤ کو کئی نقادوں نے موضوع بنایا ہے۔

کافکا کا ناول "دی ٹرائل" بیسویں صدی کے علامتی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی جوزف کے۔ ہے جو اس کے دوسرے ناولوں کا بھی مرکزی کردار ہے۔ اور وہ خود کافکا ہے۔ اصل میں کافکا انسان کی تنہائی اور تقدیر کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنا چاہتا تھا اور چونکہ وہ خود مطمئن نہ تھا کہ وہ اپنی روح کی تنہائی کو سمجھ سکا ہے۔

اس لیے وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت کے حق میں نہ تھا اس کی یہ بے اطمینانی اس لیے بھی تھی کہ وہ اپنے الجھاؤ اور الجھنوں کے حوالے سے پڑھنے والوں کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا اپنا ذاتی خیال تھا۔ حالانکہ اپنی تمام تر علامتی گہرائی کے باوجود اس کے نامکمل ناولوں سے بھی پورا ابلاغ حاصل ہوتا ہے۔

"دی ٹرائل" کا ہیرو جوزف کے۔ (K) ایک بنک میں چیف کلرک ہے جسے اس کی تیسویں سالگرہ کے دن عین صبح کے وقت گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ اسے کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ پھر یہ گرفتاری بھی بہت عجیب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام پر جا سکتا ہے۔ روزمرہ کے معمولات پر عمل کر سکتا ہے لیکن وہ ہے ایک زیر حراست شخص۔

اب اس کردار کو اپنی بقایا زندگی ایک ایسے الزام کے دفاع میں بسر کرنی ہے۔ جس سے اسے آگاہ نہیں کیا گیا۔

اپنے اس موضوع کی بدولت یہ ناول ایک متھ (MYTH) کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ بیسویں صدی میں بہت کم ناولوں کو اس حد تک بحث کا موضوع بنایا گیا ہے جتنا کہ "دی ٹرائل" کو۔!

"دی ٹرائل" میں جہاں ڈرامائی عنصر بہت نمایاں ہے۔ وہاں اس کے فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلو بھی بہت اہم ہیں جنہوں نے اس ناول کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ "ٹرائل" میں معنویت اور علامتوں کا ایک جہان سمویا ہوا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے والا ہر قاری اپنی ذہنی سطح اور استعداد کے حوالے سے اس کے معنی اخذ کر سکتا ہے۔ یہ انسان کی تنہائی کا بھی مظہر ہے اور ان دیکھی قوتوں کی اس "کارروائی" کو بھی سامنے لاتا ہے۔ جو انسان کے لیے ایک بہت بڑے اسرار کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ زندگی کے عذاب کی بھی کہانی ہے اور یہ بھی کہ آج کا انسان زندگی کی بھرپور معنویت سے محروم ہو چکا ہے اور وہ زندگی کے ذرائع سے محروم ہو چکا ہے۔

"ٹرائل" کا اس حوالے سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے کہ یہ انسانی تقدیر کے جبر کے پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ "دی ٹرائل" کا مطالعہ بذات خود ایک بڑے تجربے سے روشناس ہونے کے مترادف ہے۔ "کاسل" اور "ٹرائل" دونوں ناولوں میں مابعد الطبیعاتی عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔ اگر اس ناول کی علامتوں کو وسیع تر معنی دیے جائیں تو یہ ناول انسانی زندگی کی ایک تفسیر

بن جاتا ہے جو زندگی کی طرح پُر معنی بھی ہے۔ اور پُراسرار بھی۔۔۔ بعض نقادوں نے اس میں لایعنیت (ABSURDITY) کے عنصر کو بھی تلاش کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شہکار عظیم ترین علامتی ناول ہے۔ (ABSURD) ناولوں اور تخلیقات کی ذیل میں نہیں آتا۔

"دی ٹرائل" نامکمل ناول ہے، زندگی کے اسرار کی طرح زندگی کی طرح۔۔۔ قابل فہم اور ناقابل فہم ولا (WILLA) اور ایڈون میور نے اس کا جرمن زبان سے جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے وہ سب سے بہترین ہے۔ کیونکہ اس میں نامکمل باب بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

"دی ٹرائل" عالمی ادب کا ایک منفرد شہکار ہے۔ اس ناول نے پورے عالمی ادب میں اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اور یہ ناول علامتی اظہار کا ایک ایسا ناول ہے جس میں زندگی کی تفسیر ایسے متنوع اور منفرد انداز میں کی گئی ہے اور انسانی تنہائی اور تقدیر کو ایک ایسے تخلیقی انداز میں سمویا گیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

"دی ٹرائل" اپنی مثال آپ ہے۔

مادام بوواری

عالمی ادب میں ، مادام بوواری ، کا جو مقام ہے اس کا ذکر تو تفصیل سے ہو گا ہی لیکن پاکستان کے حوالے سے اس عظیم ناول کا ذکر بھلے غیر سنجیدہ سہی۔ لیکن ایک خاص وجہ سے ناگزیر ہو چکا ہے۔ مادام بوواری ، کے فرانسیسی سے انگریزی میں جو تراجم ہوئے ہیں۔ ان میں ایلن رسل کا ترجمہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ انہیں کتنے لوگوں نے پڑھا اور پھر اردو میں محمد حسن عسکری نے مادام بوواری کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اُردو دان قارئین میں سے کتنوں نے پڑھا۔ اس کا مجھے صحیح علم نہیں لیکن اس ناول کے حوالے سے نہ سہی ، ایک فلم کے حوالے سے مادام بوواری کو پاکستان میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

چند برس پیشتر (۱۹۷۴ء - ۱۹۷۵ء) کی بات ہے جب فلوبیر کے ناول پر مبنی ایک فلم کی نمائش پاکستان میں ہوئی۔ اس میں ایسے مناظر تھے جنہوں نے ہمارے فلم بینوں کو گرما کر رکھ دیا اور یوں میڈم باوری ، میڈم بوواری کا اتنا شہرہ ہوا کہ شاید و باید۔ بعد میں ہمارے ہاں کے قبول عام سٹیج ڈرامے لکھنے والوں نے بھی ' میڈم باوری ' کو خوب شہرت بخشی اور ہر ایسی انگریزی فلم جسے عوام میں مقبول کرنا ٹھہرا ، اس کا نام میڈم باوری یا میڈم بوواری سے زیادہ بے باک جیسی سطریں لکھ کر فلم بینوں کی آتش شوق کو بھڑکانے کی گمراہ کن اور مذموم کوشش کی گئی۔ آج میڈم بوواری یا باوری ایک ایسا نام ہے جو خاص تلذز کے حوالے سے ہمارے ملک کے ان گنت لوگوں کی زبان پر ہے۔

جن دنوں یہ فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ میں نے انہی دنوں اس فلم کے حوالے سے ایک مضمون شائع کرایا تھا کہ یہ فلم نہ صرف فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک بڑی زیادتی ہے بلکہ یہ بیچارے فلوبیر کے ساتھ بھی ایک سنگین مذاق کیا گیا ہے کہ اگر فلوبیر زندہ ہوتا تو سر پیٹ لیتا کیونکہ فلوبیر

کے اس شاہکار پر مبنی فلم اس ناول سے بہت مختلف تھی اور اس میں ان کی روح موجود نہ تھی۔

بہرحال ایک غیر ملکی فلم ساز نے فلوبیر کے ساتھ جو مذاق کیا اس کی وجہ سے ہمارے ملک میں اس ناول یا ناول کی ہیروئن کا خوب چرچا رہا۔ وہ فحاشی کی علامت بن گئی۔ آج بوواری یا مدام باوری (یہ نام پاکستانیوں نے وضع کیا) کے مصنف کا نام ان لوگوں سے پوچھا جائے جو اس کردار کے نام سے واقف ہیں تو وہ بھی فلوبیر کا نام نہ بتا سکیں گے۔

مادام بوواری، محض فلوبیر کا ہی نہیں بلکہ پورے عالمی ادب کا بے مثل اور عظیم کارنامہ ہے فلوبیر نے ادب کی تخلیق میں لفظ کو جو اہمیت دی اس کی مثال عالمی ادب میں خال خال ہی ملتی ہے۔ اور پھر جس طرح کی زندگی خود فلوبیر نے بسر کی وہ بھی اپنی مثال آپ تھی۔

گستاو فلوبیر ۱۲ دسمبر ۱۸۲۱ء کو رُواں فرانس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سرجن تھا۔ ۱۸۴۰ء تک فلوبیر نے رُواں ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پیرس چلا گیا۔ پیرس میں اس نے جا کر لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا۔ اسے قانون کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہ رہی ادبی حلقوں میں اس کا آنا جانا شروع ہوا۔ وکٹر ہیوگو، کولیٹ جیسی عظیم ادبی شخصیتوں سے اس کا تعارف ہوا اور ادبی شخصیتوں سے تعلقات اور دوستی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ پیرس میں فلوبیر کا قیام چند برس تک رہا۔ اس کی والدہ اکیلی رہ گئی تو وہ رُواں واپس چلا گیا۔ جہاں اس نے ساری زندگی گزار دی۔ اگرچہ وہ وقتاً فوقتاً پیرس کا چکر لگا آیا کرتا تھا۔

فلوبیر نے ۱۸۴۷ء اور پھر ۱۸۴۹ء میں کچھ بیرونی ممالک کی بھی سیاحت کی۔ اس سیاحت کے دوران میں ہی اس نے مادام بوواری، پر کام شروع کیا۔ اس سے پہلے فلوبیر دو کتابیں SENTI : TAMPTATION OF ST. ANTIONE اور MENTLE EDUCATION لکھ چکا تھا۔

لیکن دونوں کتابیں مسودوں کی صورت میں پڑی تھیں اور مادام بوواری کے لکھنے کا عمل چار برس ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء میں مکمل ہوا۔ اکتوبر ۱۸۵۶ء میں یہ ایک جریدے میں قسط وار شائع ہونے لگی اپنی اولین قسط وار اشاعت کے ساتھ ہی مادام بوواری کے بارے میں ایک ایسی بحث کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے اور بحث کا مرکز و محور ہے۔ ناول لکھنے کا آرٹ .....!

فرانسیسی حکومت نے اس ناول پہ فحاشی کا الزام لگایا۔ فلوبیر اور اس کے پبلشر کو عدالت

کا سامنا کرنا پڑا لیکن عدالت نے اس ناول کو فحاشی سے مبرّا قرار دے دیا۔ اس کے بعد یہ ناول کتابی صورت میں پہلی بار ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔ فلوبیئر نے اس ناول کا انتساب اس وکیل ماری اُن توآں ژیوں سینیار کے نام کیا جس نے اس کتاب کا مقدمہ لڑا تھا۔ مادام بوواری کے بعد فلوبیر ایک عرصے تک اس طوفان کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا جو اس کی اشاعت کی وجہ سے بپا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پہلے دو ناولوں کے مسودوں کو ایک طرف رکھ کر ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا جس کا نام "سلامبو" ہے۔ یہ ناول فلوبیئر کی تصانیف میں موضوع کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کرائے کے سپاہیوں کی اس بغاوت پر ہے جو کارتھیج کے خلاف کی گئی ۱۸۶۲ء میں یہ ناول شائع ہوا اردو میں اس کا ترجمہ مرحوم عنایت اللہ دہلوی کر چکے ہیں اس زمانے کے نقادوں نے اس ناول کی خوب مذمت کی لیکن بعد کی نسلوں نے اس ناول کی ادبی اہمیت کو فراخدلی سے تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد فلوبیئر نے پہلے مسودے کو نئے سرے سے لکھا۔ SEN-TIMENTLE EDUCATION۔ اس کا نام ہے جو سات برسوں میں لکھا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کی اشاعت ہوئی لیکن نقادوں نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ حالانکہ یہ ناول دنیائے ادب کے اہم ترین ناولوں میں سے ایک ہے اور اب اس کی معنویت حسن اور فن کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔

فرانس اور جرمنی کے درمیان جو جنگ فلوبیئر کی زندگی میں اس ناول کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ اس پر فلوبیئر کو بڑی پریشانی ہوئی۔ فلوبیئر کا دعوےٰ تھا کہ اگر جرمنی اور فرانس کے تاجدار اس کے اس ناول سینٹی مینٹل ایجوکیشن کو پڑھ لیتے تو یہ جنگ کبھی نہ چھڑتی۔ فلوبیئر کی صحت اب گرنے لگی تھی۔ اس کے بعض دوست اس سے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے کنارہ کش ہو گئے کچھ مر کھپ گئے اس کی والدہ کا انتقال ۱۸۷۲ء میں ہوا عمر کے آخری برسوں میں وہ ترگنیف زولا، ڈاڈے گانگور جیسے عظیم لکھنے والوں کا رفیق اور دوست تھا۔

گسٹر نے موپساں پر جو ناول لکھا ہے اس میں فلوبیئر کی زندگی کے آخری ایام اور موت کا نقشہ بڑے مؤثر اور تفصیلی انداز سے کیا ہے کیونکہ موپساں فلوبیئر کو استاد کا درجہ دیتا تھا اور اس کے فلوبیئر سے بہت گہرے تعلقات تھے وہ ایک تنہا شخص تھا جو کبھی کبھار پیرس چلا جاتا۔ دوستوں سے ملتا تو تنہائی کچھ اور بڑھ جاتی۔

۱۸۷۴ء میں فلوبیئر کا ناول "ٹمپٹیشن آف سینٹ انتونی" شائع ہوا جس پر اس نے برسوں محنت کی

تھی فلوبیئر ایک ایسا لکھنے والا تھا جس کی خود ہی اپنے کام سے تسلی بہت مشکل سے ہوتی تھی وہ اپنے ناولوں کو بار بار لکھتا تھا۔

ان عظیم ادبی کارناموں کے باوجود اس کے دور میں اسے وہ مقام نصیب نہ ہوا جس کا وہ حقدار تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب اس کی تین کہانیوں کا مجموعہ THREE TALES کے نام سے شائع ہوا تو بالآخر اسے مختصر افسانے کے عظیم معماروں اور خالقوں میں تسلیم کر لیا گیا۔

اس کا آخری تخلیقی کارنامہ جس پر اس نے کئی برس محنت کی نامکمل رہا یہ اس کا ناول BOUVARD AND PECUCHET ہے۔ میں ذاتی طور پر اسے مادام بوواری اور سینٹیمنٹل ایجوکیشن سے بڑا ناول سمجھتا ہوں اگرچہ فلوبیئر کو موت نے مہلت نہ دی کہ وہ اسے مکمل کر سکے لیکن انسانی علم کی بے بضاعتی پر جو طنز اس نے اس ناول میں کیا ہے جو بصیرت اس ناول کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے اس کی بنا پر یہ نہ صرف غیر تکمیلی صورت ہی میں فلوبیئر کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے بلکہ عالمی ادب کا بھی عمومی انسانی حماقت کے موضوع پر یہ ناول دنیائے ادب کا ایک انوکھا اور منفرد شاہکار ہے اپنی غیر مکمل حالت میں یہ ناول اتنا بڑا کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے اگر یہ مکمل ہو پاتا تو شاید آج دنیا کی سو عظیم کتابوں میں مادام بوواری کی جگہ اس کا ذکر کیا جاتا یہ نامکمل ناول فلوبیئر کی موت کے بعد شائع ہوا جے۔ کرپل شمیر کا مدون اور ترجمہ کردہ ورشن سب سے عمدہ اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

۸ مئی ۱۸۸۰ء کو آج سے ایک سو چار برس پہلے فلوبیئر کا انتقال ہوا اسے رواں میں اس کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں رواں میوزیم میں اس کے بت کی نقاب کشائی کی گئی۔

فلوبیئر فکشن کی دنیا میں ایک نیا انداز لے کر وارد ہوا وہ مکمل حقیقت کو ایسے مکمل اور موزوں ترین الفاظ میں پیش کرنے کا قائل تھا کہ جس سے اس کے صحیح معنوں کا ابلاغ ہو سکے اس کا اسلوب بالکل بے مثل ہے۔ اس نے اس اسلوب کو اپنانے کے لیے برسوں محنت کی تھی وہ ایک ایک لفظ کے باطن میں جھانکتا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے ناول پر جتنے اثرات فلوبیئر کے ہیں اور کسی لکھنے والے کے نہیں اگر فلوبیئر نہ ہوتا تو ممکن ہے ہم موپساں کی کہانیاں ضرور پڑھ لیتے لیکن اس اسلوب میں موپساں کی کہانیاں کبھی پڑھنے کو نہ ملتیں جو فلوبیئر نے اسے سکھایا تھا۔

مادام بوواری کی اشاعت سے فرانس میں REALISTIC ناول کا آغاز ہوتا ہے اگرچہ فلوبیئر ہمیشہ

اس سے انکار کرتا رہا کہ اس کا کسی بھی ادبی تحریک سے کوئی تعلق ہے وہ تخلیق کے عمل کے سلسلے میں سب سے منقطع ہو جانے کا قائل تھا۔ اس نے جو اسلوب ایجاد کیا وہ اس کی برسوں کی انتھک محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اس کی نثر کے حسن کی تعریف ناممکن ہے ایذرا پاؤنڈ نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب کوئی شخص حقیقی معنی میں اچھی شاعری اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ فلوبیئر کی نثر سے واقف نہ ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ اس نے مادام بوواری نہ پڑھی ہو۔"

مادام بوواری کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں ہمارے ادب میں محمد حسن عسکری فلوبیئر کے پرجوش مداح تھے اُردو ادب میں فلوبیئر کو متعارف کرانے کا سہرا عسکری صاحب کے سر بندھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عسکری صاحب نے "مادام بوواری" کا اُردو ترجمہ کر کے جہاں ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا وہاں اُردو ادب کا دامن بھی مالا مال کر دیا۔ کیونکہ اردو کے کسی ادیب یا مترجم کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ "مادام بوواری" کا اُردو ترجمہ کر سکتا تھا۔

مادام بوواری۔ ایما۔ اس کا مرکزی کردار ایک قصباتی ڈاکٹر شارل کی بیوی جو بوریت کے ہاتھوں مری جا رہی ہے اپنی بلوغت اور جوانی کے دنوں میں اس نے تاریخی رومانس پڑھے ہیں جنہوں نے اس پہ گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس کے دل میں امنگوں کا ایک طوفان بپا ہے خواہشوں کی دنیا آباد ہے لیکن دنیا کی حقیقت کچھ اور ہے جب یہ خواب اور المیے حقیقت سے ٹکراتے ہیں تو چکنا چور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس ناول میں بورژا سوسائٹی کی فلوبیئر نے شدید مذمت کی ہے جو اس کا ہمیشہ سے پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

ایما۔ مادام بوواری عالمی ادب کا زندہ اور یادگار کردار ہے۔ یہ محض ایک عورت کی "بدکاریوں" کی داستان نہیں بلکہ یہ انسان کے باطن سے بھی پردہ اٹھاتی ہے سوسائٹی کے مکروہ چہرے کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ رومانی محبت کے خوابوں کی تکمیل کے لیے بھٹکنے والوں کا ایسا انجام کم ہی دنیائے ادب میں ملتا ہے جیسا کہ فلوبیئر نے مادام بوواری میں دکھایا ہے۔

ہر دور میں جو ایک منافقت پائی جاتی ہے یہ ناول اس زہر کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اس ناول کے کردار اومے کو ذرا ایک نظر دیکھیے اومے کے حوالے سے ہی اس ناول کا اختتام ہوتا ہے یہ وہ شخص ہے جسے ایک تمغے بھی نوازا گیا ہے۔ کیونکہ حکام اس کا احترام کرتے اور رائے عامہ اس کی محافظ ہے۔ بس اتنے مختصر سے جملے میں ہی ایک پوری سائٹی کی حالت کا نقشہ کھینچ جاتا ہے کہ اس سوسائٹی میں۔

میں منافقت کس حد تک سرایت کر چکی ہے۔

ایما۔ مادام بوواری زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے۔ یہ زہر جو اس نے خود کھایا اس کی معنویت پر غور کرنا اس ناول کو پوری طرح سمجھنا ہے اور ایما۔ مادام بوواری کے انجام نے ہی اس ناول کو اس معنویت سے ہمکنار کیا ہے جس کی وجہ سے یہ ناول دنیا کے عظیم شاہکاروں میں شامل کیا جاتا ہے کیونکہ مادام بوواری کی المناک موت ایک سوسائٹی اور معاشرے کو زندہ کرتی ہے۔

گورکی

ماں

گورکی محض ایک لکھنے والا ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک ادب میں ایک خاص فکر کا بھی نمائندہ ہے۔
ادب میں ایک اصطلاح "اشتراکی حقیقت نگاری" بھی ہے۔ گورکی اس کا بانی ہی نہیں بلکہ سرخیل بھی تھا۔ اور اس نے ادب میں اشتراکی حقیقت نگاری کو فروغ دیا اور اپنے دور اور آنے والے دور کے ادیبوں اور لکھنے والوں کو ہمہ گیر سطح پر متاثر کیا۔

ہمارے ہاں اُردو زبان میں جن روسی ادیبوں اور لکھنے والوں کو بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں گورکی سرفہرست ہے۔ گورکی کا بیشتر کام اُردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے بہت پہلے منٹو نے اس کی کہانیوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ اس کے بعد گورکی کے شاہکار "میرا بچپن" اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اُردو میں منتقل کیا۔ آج بہت سے لکھنے اور پڑھنے والوں کو یہ بھول بھی چکا ہو گا کہ مرحوم محمد حسن عسکری نے بھی گورکی کو ترجمہ کیا تھا۔ "میں ادیب کیوں بنا" کا ترجمہ عسکری صاحب نے ہی شائع کروایا تھا۔

ہمارے اُردو کے لکھنے والوں اور مترجموں کے علاوہ گورکی کی بیشتر تصانیف کا ترجمہ روسی ادب کے بدیشی زبانوں کے سرکاری ناشر ماسکو شائع کر چکے ہیں۔ گورکی ہمارے ہاں اور دنیا بھر میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔

گورکی نے اپنا بچپن اور جوانی جس نکبت افلاس، دربدری اور آوارگی میں بسر کیے اس کا سارا احوال اس کی کتابوں میں پوری سچائی اور صداقت سے کے ساتھ ملتا ہے۔ اس زندگی نے اسے تجربات سے مالا مال کر دیا۔ ایسی آوارہ گردی اور افلاس کی زندگی بسر کرنے کے حوالے سے وہ

روس کے عوام کی حقیقی حالت سے آگاہ ہوا۔ گورکی کا شمار ان چند بڑے روسی ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے روس کا چپہ چپہ دیکھا تھا جس نے روس کی سرزمین کو پوری طرح دیکھا تھا وہ ایسے ایسے علاقوں میں بھی اپنی خانہ بدوشی کے زمانے میں گیا جہاں کوئی روسی ادیب نہ جاسکا تھا۔

اسی گورکی کا شاہکار "ماں" ہے..... !

گورکی نے جب لکھنا شروع کیا تو شعر بھی لکھے اور رومانی اسلوب کی کہانیاں بھی۔ اس نے اپنی تخلیقی زندگی کے پہلے دور میں روس کے حوالے سے نیم تاریخی اور لوک کہانیوں کو بھی اپنی تخلیقات کے مواد میں شامل کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ زندگی کی حقیقتوں کے قریب ہو کر لکھنے لگا اور پھر اس نے اس حقیقت نگاری کو رائج کیا جسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔

گورکی کے اپنے دور کے سبھی اہم روسی لکھنے والوں سے تعلقات تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ بے حد متاثر ہوا لیکن بعض کو اس نے بے حد سراہا لیکن اپنی تخلیقی زندگی کے پختہ دور میں اس نے اشتراکی حقیقت نگاری کے جس اسلوب کو اپنایا وہ اس کا اپنا ہے اس پر کسی کی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔

گورکی کے "بچپن" "جوانی اور میری تعلیم گاہیں اور شاہراہ حیات" کے عنوانات سے شائع ہونے والی خود نوشت کتابوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے اور متاثر کرنے والی کتابوں میں سے ہیں۔ اردو زبان میں ایسے ادیبوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں جنہوں نے گورکی کی ان کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کے ہاں گورکی کا خاص رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے یہ لکھنے والے اگر گورکی نہ ہوتا تو شاید اس انداز میں نہ لکھتے اور نہ ہی اتنے اہم سمجھے جاتے۔ !

گورکی نے ہر صنف میں لکھا، مضامین، کہانیاں، ناول، شاعری، ڈرامے اور سیاسی تحریریں اس کے ڈراموں میں LOWER DEPTHS کو عالمی شہرت حاصل ہے یہ ڈرامہ جب سے لکھا گیا ہے تب سے اب تک ان گنت بار دنیا کی مختلف النوع زبانوں میں ترجمہ ہو کر کھیلا جا چکا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ہی ڈرامہ نگاروں نے اس ڈرامے سے استفادہ کر کے ڈرامے لکھے ہیں۔

سید احتشام حسین نے گورکی کے حوالے سے جو لکھا ہے وہ گورکی کی شخصیت کی صحیح تصویر ہے۔ سید احتشام حسین مرحوم نے لکھا تھا۔

"گورکی انقلاب روس کا وہ نقیب، سپاہی، داعی اور مفکر تھا جسے انسانی زندگی کی بھاری کے احساس درد نے شاعر، ادیب اور مبلغ انسانیت بنا دیا۔ اس نے جو کچھ لکھا اس میں خلوص اور دردمندی کے دوش بدوش انسان کی عظمت کا غیر متزلزل یقین موجود ہے اس کا ہر لفظ انسانی عظمت کے عقیدے کی تفسیر ہے۔"

گورکی نے جس دور کے روس میں آنکھ کھولی وہ دور زار شاہی دور تھا جس میں عوام غریب مزدور اور کسان اپنی نکبت اور بربادی کے آخری کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ زار شاہی استبداد اور آمریت کی بھیانک شکل اختیار کر چکی تھی لیکن یہ وہی دور ہے جب انقلاب روس کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اور اب اس کی فصل کاٹی جانے والی تھی۔ گورکی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف اس دور کو بدلتے دیکھا بلکہ اس دور کو بدلنے میں اس کی تمام تر خلاقانہ صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب سے پہلے اور پھر انقلاب کے بعد۔ گورکی کی عظیم خدمات کو سراہا گیا اور لینن نے اسے خراج تحسین پیش کیا۔ اور انقلاب روس کے بعد اس کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ گورکی کو جو قدر و منزلت انقلاب کے زمانے اور بعد میں حاصل ہوئی وہ بے مثل ہے وہ روس کا عظیم سپوت اور قومی ہیرو بن چکا ہے۔ ۱

گورکی کا ناول "ماں" انقلاب سے پہلے کے روس کے اس دور کی عکاسی کرتا ہے جب انقلاب آزادی، مساوات اور انسانی حقوق کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی۔ اس دور کو گورکی نے "ماں" میں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس دور میں نچلے طبقے کے افراد کن حالات سے گذر رہے تھے۔ ان کی زندگیاں کتنی پرصعوبت، اذیت ناک اور ناقابل برداشت ہو چکی تھیں اور اسی دور میں وہ انقلاب، انصاف اور مساوات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

"ماں" کا ایک ایک لفظ اس دور کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک بوڑھی ہے۔ پاغل۔ انقلابی کی ماں۔ ایک سیدھی سادی عورت جس کی زندگی غربت اور ظلم و

تشدد کے شب درروز میں سے گذرتے ہوئے بسر ہوگئی ہے۔ جو انقلاب کے فلسفے سے ناآشنا ہے۔ جو ایک ماں ہے۔۔۔۔ ماں۔۔۔۔ لیکن زندگی نے ایسے تجربات سے ہمکنار کیا ہے جو محض فلسفہ طرازی کرنے والوں کے تجربات کا حصہ نہیں بن سکتے۔ وہ ایک عورت ہے جس نے غربت دیکھی ہے۔ سدا دکھ سہے ہیں۔ سماج کے ہاتھوں، خاوند کے ہاتھوں، غربت کی وجہ سے لیکن وہ زندگی سے محبت کرتی ہے اسے اپنا بیٹا پیارا ہے اگر وہ اپنے بیٹے پاؤل کی انقلابی جدوجہد میں شریک ہوگئی ہے۔ تو جہاں اس کا سبب اس کی ممتا ہے وہاں اس کا وہ سچا شعور بھی ہے۔ جو اسے اس کی اپنی زندگی کے تجربات سے حاصل ہوا ہے،۔

اس ناول کا ہیرو پاؤل ایک نیا ہیرو ہے۔ نیا انسان ہے جو پہلی بار کسی ناول میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ وہ پُرعزم ہے۔ اپنے عقیدے اور جدوجہد کے لیے مرمٹنے والا، وہ اپنی امنگوں اور محبتوں کو بھی اپنے عقیدے اور جدوجہد کی کامیابی کے لیے نظرانداز کردینے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ نئے سماج، نئے انقلاب کا ہیرو ہے۔ ایک ایسا نمائندہ۔ جو آنے والی نسلوں کی راہنمائی کرتا ہوا ملتا ہے۔ پاؤل کا انقلابی عزم اور اس کا انقلابی عقیدہ اسے جاہ و جلال بخشتے ہیں۔ وہ محنت کش طبقے کی عظمتوں کا امین ہے جو دنیا بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہے،۔

اتنے عظیم اور مرعوب کردینے والے کردار کے سامنے اس کی ماں۔ گورکی کے ناول "ماں" کا مرکزی کردار۔ ایک بوڑھی عورت ہے۔ زمانے کے دکھوں کی ماری ہوئی۔ جس نے زندگی کی شکل دکھوں اور بے انصافیوں کی صورت میں ہی دیکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ ماں ہے اس کی ساری طاقت اس کی ممتا میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ نرم خو ہے۔ بہت سی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیتیں نہیں رکھتی۔ لیکن وہ انقلاب کی جدوجہد میں جس انداز سے شامل ہوتی ہے اور پھر جس استقلال اور عزم کا اظہار کرتی ہے۔ اسے دیکھتے اور پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پاؤل سے بھی زیادہ قوی ہے اور جب وہ مررہی ہے زارشاہی کے سپاہی اسے مار رہے ہیں اور وہ اشتہار اور پمفلٹ بانٹ رہی ہے اور لوگوں کو پکار رہی ہے اور ناول

اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی عظمت اس کے استقلال اس کے انقلابی عزم اس کی بے پایاں محبت، بیکراں ممتا کا نقش ہمارے دلوں پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے۔

اس کردار، بوڑھی کمزور عورت اس ماں کے حوالے سے گورکی ایک ایسا کردار پیش کرتا ہے جو سراپا ممتا ہے، جو محبت ہے، جو مرتی ہے تو صرف روس کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے۔ کہ ساری دنیا محبت انصاف اور خوش حالی کی آماجگاہ بن جائے۔

"ماں" میں گورکی نے اس دور کے روس کی ایسی مکمل اور سچی تصویریں پیش کی ہیں کہ ہمیں روس کا وہ پورا عہد اس ناول میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ گھروں میں مزدوروں کی جو حالت ہے اور فیکٹریوں میں ان کا جو حشر ہو رہا تھا اس کی سچی تصویریں ہمیں "ماں" میں ملتی ہیں۔ گورکی کی اشتراکی حقیقت نگاری محض فوٹوگرافی نہیں ہے بلکہ اس دور کے انسانوں کے تمام احساسات اور عمل اور ردّعمل کو ہم ان صفحات میں دیکھ سکتے ہیں۔

ماں کی ایک اور ادبی حیثیت بھی ہے

ادب میں مقصدیت پر یقین رکھنے والے اس سلسلے میں ایک بات پر متفق ہیں کہ گورکی ادب میں مقصدیت کا سب سے بڑا حامی اور مفکر تھا اور ادب میں مقصدیت کی سب سے باکمال تخلیق ماں ہے۔ گورکی کا ناول "ماں" جہاں ادب میں مقصدیت کی سب سے اہم نمائندہ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے یہ روس کے ایک خاص عہد کی سب سے سچی اور مکمل تصویر بن گیا ہے۔ ایک عہد کی سب سے سچی انسانی دستاویز۔!!

فرام ارتھ ٹو دی مون

ر ا

ورن کی یہ کتاب "زمین سے چاند تک" ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ ایک صدی پہلے شائع ہونے والی اس کتاب کو ایک حیران کن کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک صدی پہلے انسان چاند پر پہنچنے کا تصور خوابوں کے علاوہ نہ کرسکتا تھا۔ لیکن ژول ورن نے ۱۸۷۵ء میں جو تخیلاتی ناول لکھا جسے ہم سائنس فکشن کا نام دیتے ہیں وہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے ایک صدی بعد ایک حقیقت ثابت ہوا۔

ژول ورن کا شمار دنیا کے بڑے لکھنے والوں میں ہوتا ہے آج جبکہ دنیا بھر میں سائنس فکشن بیحد مقبول ہے اور بلاشبہ ان گنت کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ژول ورن سائنس فکشن کے میدان میں یکتا و منفرد دکھائی دیتا ہے اور اس کا اگر کوئی حریف نظر آتا ہے تو وہ ہے۔ ایچ جی ویلز۔ لیکن جتنا مقبول آج بھی ژول ورن ہے اتنا نہ ایچ جی ویلز ہے نہ کوئی آج کا سائنس فکشن لکھنے والا مصنف

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری بھی ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لیے بھی کہ ۱۹۷۶ء میں یونیسکو نے ایک رپورٹ کتاب شماریات کے عنوان سے شائع کی ہے۔ اس جائزے اور تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ژول ورن دنیا کے ان مقبول عام مصنفوں میں سے ایک ہے۔ جن کی کتابوں کے تراجم دوسری زبانوں میں سب سے زیادہ ہوئے ہیں۔ پہلے نمبر پر لینن ہے جس کی تصانیف کے ۱۹۷۶ء تک ۲۴۸ زبانوں میں تراجم ہوئے۔ دوسرے نمبر پر اگاتھا کرسٹی جس کے ناولوں کے ۱۹۷۶ء تک ۱۵۹ زبانوں میں تراجم ہوئے۔ تیسرا نمبر ژول ورن کا ہے۔ جس کی تصانیف کے تراجم ۱۹۷۶ء تک ۱۵۶ زبانوں میں ہوئے اور ان میں سب سے زیادہ جس کتاب کے تراجم ہوئے وہ کتاب "فرام دی ارتھ ٹو دی مون" ہے۔

ژول ورن کی قوت متخیلہ بے مثل تھی۔ اس میں پیش گوئی کی جو صلاحیت تھی۔ اس نے اسے دنیائے

ادب میں ایک خاص مقام عطا کیا ہے۔ دنیا میں جب پہلی بار انسان چاند پر گیا تو خلا میں انہیں بے وزنی کا تجربہ ہوا۔ ورن سائنسدان نہیں تھا لیکن اس نے ۱۸۷۵ء میں اس خلائی بے وزنی کا ذکر اپنے ناول میں کر دیا تھا جس کا تجربہ جدید خلا نوردوں کو ہوا۔

ژول ورن ۸ر فروری ۱۸۲۸ء کو نانتس کی بندرگاہ برٹین (فرانس) میں پیدا ہوا۔ ورن نے گیارہ برس کی عمر میں پہلی بار ۱۸۳۹ء میں بحری سفر اختیار کیا۔ ہوا یہ کہ وہ گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے اپنی عم زاد سے بڑی محبت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اس بنت عم زاد کیرولین کے لیے وہ مونگے کا ہار لائے گا تو وہ بھی اس سے محبت کرنے لگے گی۔ لیکن ورن کا فرار بہت عارضی ثابت ہوا محض ایک دن پر مشتمل۔ اس کے والد نے اسے ڈھونڈ نکالا اور گھر لے آیا۔ ورن نے قانون کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۴۸ء میں وہ حصول تعلیم کے لیے پیرس چلا گیا اور ۱۸۴۹ء میں اس نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی۔ ادب کے ساتھ اس کا ابتدائی لگاؤ شوقیہ تھا اور اس نے ڈرامے لکھنے شروع کیے اور اس کا ایک ڈرامہ سٹیج بھی ہوا جسے تماشائیوں نے بے حد پسند کیا۔ اور ورن نے پھر سے قانون میں دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا۔ اس زمانے میں اسے سائنس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پہلے اس نے جغرافیہ کا مطالعہ کیا پھر اپنے ایک عزیز کی اعانت سے ریاضی پڑھی اور اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ طبیعات میں ایک معمولی سی غلطی تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اس کے ناول "زمین سے چاند تک" کا ریاضی دان جے ٹی میٹس انتہائی درست حساب لگاتا ہے جس کی تصدیق آنے والی صدی میں ہوئی۔

"زمین سے چاند تک" ناول میں خلا باز چاند سے ایک گاڑی میں واپسی کا سفر کرتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت ایک صدی بعد امریکی خلا باز اپالو ۔۸ بحرالکاہل میں ورن کے ناول میں بیان کیے ہوئے مقام سے صرف ۲ ۱/۲ میل کے فاصلے پر اترتا ہے۔ یہاں تخیل اور حقیقت ایک صدی بعد ایک ہو جاتے ہیں اپالو ۸ کے کمانڈر فرینک بورمین نے ورن کے پڑپوتے کے نام خلائی سفر سے واپسی کے بعد ایک خط لکھا جس میں ژول ورن کے تخیل کی بے حد داد دی اور لکھا:

"ورن خلائی عہد کے اولین نقیبوں میں سے تھا۔ ہمارا خلائی جہاز بار بیکن (ناول کے کردار) کی طرح فلوریڈا سے خلا میں روانہ ہوا۔ اس جہاز کا وزن اور بلندی بھی وہی تھی جو ورن نے صدی پہلے اپنے ناول

میں اپنے تخیلی جہاز کا بتایا تھا۔ کیا ورن اس پُراسرار سچائی اور پیش گوئی کے امکان پر زندہ ہونے کی صورت میں حیران ہوتا۔ شاید نہیں کیونکہ ورن ہی تھا جس نے ایک بار کہا تھا " امریکیوں کے لیے چاند ٹیکساس سے زیادہ دور نہیں۔ "

ورن کا تخیل اتنا حقیقی اور سائنسی تھا کہ اس کی کتابوں سے کئی ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ورن کی اس کتاب " زمین سے چاند تک " میں لیزر شعاعوں کا تصور بھی ملتا ہے۔ جو اگرچہ قدرے مبہم ہے۔

ورن نے سائنسی کہانیاں لکھنے کا پختہ ارادہ کر کے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس کی ابتدائی کتابوں کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم وہ ناکام بھی نہیں رہا۔ ۱۸۵۷ء میں ورن نے ایک نوعمر بیوہ سے شادی کر لی۔ وہ پُرسکون زندگی گزارتا رہا۔ چند ایک مواقع اسے سیر و سیاحت کے بھی ملے جن کے تجربات پر اس نے اپنی بعض کتابوں کی بنیادیں استوار کیں۔ دراصل وہ ایک کرسی نشیں سیاح " تھا۔ جس کی قوت متخیلہ بے حد تیز اور بے پناہ وسیع تھی۔ اس تخیل میں آنے والی سائنسی زندگی کی سچائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

قطب شمالی کی مہم کے بارے میں ورن نے جو ناول اپنے تخیل کی مدد سے لکھا تھا۔ آنے والے دور میں جب حقیقی طور پر قطب شمالی کی تلاش کی گئی تو حیرت انگیز مماثلتیں سامنے آئیں۔ قطب شمالی کی مہم والے ناول میں ورن کا ہیرو کپتان ہاپڑ اس فارورڈ نامی جہاز پر سفر کرتا ہے۔ جہاز فارورڈ شمالی عرض بلد ۸۳°۳۵' تک سفر کرنے کے بعد برف میں دھنس جاتا ہے۔ اس کے بعد شمال میں برف کبھی نہیں پگھلتی اور وہاں گرمی بھی نہیں پڑتی اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوئی مہم جو کبھی نہیں گیا یہ سب کچھ ورن اپنے تخیل کی مدد سے لکھ رہا تھا۔ لیکن جب اس کتاب کی اشاعت کے چالیس برس بعد امریکی مہم جو پیئری قطب شمالی کی مہم پر روانہ ہوا تو ان سب تخیلاتی جزئیات کی حقیقی طور پر تصدیق ہو گئی۔

ورن نے اپنی کتابوں میں بعض ایسے کردار تخلیق کیے جنہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی ہے اس نے اپنے ناول ۲۰ ہزار لیگ سمندر کی گہرائی TWENTY THOUSAND LEAG. UES UNDER THE SEA میں کپتان نیمو کا کردار تخلیق کیا جو دنیا کے چند بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے کرداروں میں سے ایک ہے۔ اس کردار میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ منتقم مزاج ہے لیکن ورن نے اسے علم اور بہادری کی علامت بنا دیا ہے۔

ورن کی بے پناہ فطانت کا غیر معمولی اظہار سائنسی عقلیت پسندی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اسے انسان اور انسانیت پر بھی بہت گہرا اعتماد اور یقین تھا وہ سائنس کی افادیت کا مبلغ ہے ۔ سائنس کے ذریعے جارحیت اور انسانی تباہی کا شدید مخالف ہے ۔ ورن نے اپنی کتابوں میں مستقبل کی بہت سی ایجادات کی پیش بینی برسوں پہلے کر دی اور وہ سمجھتا تھا کہ سائنس، انسان کی ترقی کے لیے ہے ۔ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں خوشحالی کا باعث بنے گی ۔ انسانوں کے لیے سہولتیں فراہم کرے گی ۔

ورن کے مشہور ناولوں میں اس کے یہ ناول بہت اہم ہیں ۔" بیس ہزار لیگ سمندر کے نیچے" جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا ۔ دنیا کے گرد اسی دنوں میں سفر (اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز) جو ۱۸۷۰ء میں ہی شائع ہوا ۔" پُراسرار جزیرہ " جس کا سن اشاعت ۱۸۷۵ء رہے اور پھر اس کا سب سے اہم ناول " فرام دی ارتھ ٹو دی مون " جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوتا ہے ۔

" زمین سے چاند تک " ناول میں اپنے تخیل کے بل بوتے پر ورن نے جو کچھ لکھا وہ آنے والے دور میں سائنسی اعتبار سے بہت حد تک درست ثابت ہوا ۔ جس کی چند مثالیں میں پیش کر چکا ہوں چند مزید باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ ورن کے ناول کی قمری ہوائی ۔ فلوریڈا میں اس مقام سے چھوڑی گئی تھی جو موجودہ کیپ کینیڈی سے زیادہ دور نہیں ، جہاں سے دنیا کے پہلے خلاباز خلا کی تسخیر کے لیے روانہ ہوئے ۔ اس کے علاوہ ورن کے ناول کا انسان بردار راکٹ سمندر میں ٹھیک اسی طرح واپس آکر گرتا ہے جیسے ایک سو برس بعد اپالو ۸ کی واپسی حقیقی طور پر ہوئی تھی ۔

حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر ورن نے دوسرے پیشین گو، سائنس فکشن لکھنے والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح اور درست پیشین گوئیاں کیں ۔ اور اس کی غلطیاں نہ صرف کم بلکہ کم تر ہی ہیں ۔

ژول ورن کی کتابوں کو کتنی زبانوں میں کتنی بار شائع کیا گیا ۔ اس کا کچھ اندازہ نہیں ہے ۔ ان ناولوں میں مہم جوئی، خواب جیسے خیالی منصوبے ، صحیح مشاہدات ایسے عناصر ہیں جنہوں نے ان کتابوں کو ہر عمر کے انسانوں کے لیے دلچسپی کا مرکز بنا دیا ۔ اس کی کئی کتابوں کو بچوں کے لیے بھی بار بار لکھا اور پیش کیا گیا ویسے جوان اور بوڑھے ۔ ہر عمر کا عالمی قاری اس کا ڈور میں مداح رہا ہے ۔

اس کے ان گنت پرستاروں میں ایک ٹالسٹائی بھی تھا جو ورن کی کہانیاں نہ صرف خود شوق سے پڑھتا تھا بلکہ اپنے بچوں اور پوتوں کو بھی سنایا کرتا تھا ۔ ٹالسٹائی کے پاس " دنیا کے گرد ۸۰ دن میں "

ایک ایسا نسخہ تھا جو مصور نہیں تھا۔ ٹالسٹائی کو یہ ناول اتنا پسند تھا کہ وہ اس کے حاشیوں پر اس کے مناظر کی خود ڈرائنگ کرتا رہتا تھا۔

ژول ورن کے ان ناولوں اور کہانیوں کو متعدد بار امریکہ اور یورپ میں فلمایا جا چکا ہے جس سے اس کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ ہر دور میں اس کی کہانیوں اور ناولوں کو ٹی وی کے لیے فلمایا گیا۔ دنیا بھر کے بچے اور بڑے ان کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

اردو میں ایک زمانے میں اس کی کچھ کہانیاں نصاب میں شامل رہیں۔ برصغیر میں اس کی کئی کتابوں کو متعدد لوگوں نے اردو میں منتقل کیا۔ مختلف انداز سے اس کی کہانیوں اور ناولوں کو اخذ کیا گیا۔ "دنیا کے گرد اسّی دن میں" میں کتابی صورت میں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے۔ ورن کو اس کی کہانیوں اور فلموں کے حوالے سے ہمارے ہاں جانا پہچانا جاتا ہے۔ لیکن اس کی کتاب کا کوئی ڈھنگ سے ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ جو متعدد ترجمے شائع ہوئے وہ ترجمے کے اعتبار سے بھی زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اور طباعت و پیش کش کے اعتبار سے بھی ناقص تھے۔ تاہم وہ اردو داں طبقے کے لیے اجنبی نہیں ہے۔

ژول ورن جو خلائی عہد کا نقیب تھا جو زبردست قوتِ متخیلہ کا مالک تھا۔ جس نے آنے والے دور کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ جس نے "زمین سے چاند تک" لکھ کر ثابت کیا کہ اس کے کرداروں کی طرح ہی آنے والے دور کے خلانورد سفر کریں گے۔ اور ایسے ہی حالات اور واقعات اور مقامات سے گزریں گے۔ جیسے اس نے اپنے ناول میں بیان کر دیے ہیں۔ یہ ژول ورن ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء کو اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوا تھا۔

برادرز کرمازوف

"برادرز کرامازوف" دوستوئیفسکی کا آخری ناول ہے۔ اس کے بے مثل ناولوں میں یہ ناول اس کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ناول اس کی موت سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا۔ لیکن اپنی اس موت سے پہلے بھی دوستوئیفسکی ایک بار موت کا مزہ چکھ چکا تھا۔ اور تجربہ اتنا اذیت ناک اور دور رس نتائج کا حامل تھا کہ اس کے اثرات دوستوئیفسکی کے شہکار ناولوں پر واضح طور سے دکھائی دیتے ہیں۔

دوستوئیفسکی ــ جس کا پورا نام فیودور مائیخلووچ دوستوئیفسکی تھا۔ اس نے ایک ایسی کربناک زندگی بسر کی۔ جس نے اسے اس تجربے اور بصیرت سے مالا مال کر دیا جو اس کے ناولوں کا خاص عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج جب ہم دوستوئیفسکی کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر بعض ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جو چونکا دینے والے ہیں۔

ــ دوستوئیفسکی پر کسی لکھنے والے کے اثرات نہیں ملتے۔ ابتدائی ناولوں میں اگر وہ کسی حد تک بالزاک جارج سینڈ وغیرہ سے متاثر نظر آتا ہے۔ تو بھی اس کا اپنا انداز اتنا منفرد ہے کہ جو دوسروں کے اثرات پر حاوی ہے بعد میں اس نے جو شہکار لکھے۔ ان پر صرف اور صرف دوستوئیفسکی کی اپنی منفرد چھاپ لگی ہوئی ہے اور دوستوئیفسکی کے فن کے بارے میں بڑے بڑے نقادوں نے لکھا ہے کہ وہ ناقابل تقلید ہے۔ جس نے اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی وہ مارا گیا، ناکام رہا۔

ــ آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے باوجود یہ بات تمام تخلیقی پیمانوں اور فنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر بلا جھجک کہی جا سکتی ہے۔ کہ دوستوئیفسکی آج کا لکھنے والا ہے۔ جدید ترین مصنف!

☆ ۔ انقلاب روس کے بعد کچھ عرصے تک یوں لگا کہ دوستوئفیسکی کا زوال شروع ہوگیا ہے (خاص طور پر روس میں)، لیکن یہ ہنگامی وقت گزرنے کے بعد جدید روس میں بھی اس کو ازسرِنو دریافت کیا گیا ہے۔ اور اس کی تصانیف کو پورے اہتمام سے روسی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں میں شائع کیا جا رہا ہے......

☆ ۔ دوستوئفیسکی کو پڑھنا ایک عظیم تجربہ ہے۔ بقول محمد حسن عسکری مرحوم، جو لوگ اپنے آپ اور اپنے باطن کے جہنم کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ دوستوئفیسکی کو کبھی ڈھنگ سے پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

دوستوئفیسکی ۱۱ر نومبر ۱۸۲۱ء میں ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک ڈاکٹر تھے۔ لیکن گھریلو حالات خوشحال نہ تھے۔ بچپن ہی میں دوستوئفیسکی کو غربت کا منہ دیکھنا پڑا۔ پیٹربرگ کے فوجی سکول کے انجینئرنگ کے شعبے میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی۔ پھر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ چند برسوں کے بعد دوستوئفیسکی نے فوج سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا سارا وقت تصنیف و تخلیق کے لیے وقف کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پہلا ناول "بے چارے لوگ" ۱۸۴۶ء کے نام سے شائع ہوا۔ دوستوئفیسکی اس زمانے میں ایک خاص سیاسی گروپ کی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیتا تھا۔ اس سیاسی جماعت کے ارکان کو حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس میں دوستوئفیسکی بھی شامل تھا۔ یہ ۲۳ر اپریل ۱۸۴۹ء کا واقعہ ہے۔ دوستوئفیسکی کو سزائے موت سنائی گئی۔ جس پر عمل کرنے کے لیے اسے لے جایا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے گلے میں پھندا ڈالا جاتا۔ اس کی سزائے موت کی تبدیلی کا حکم آگیا۔ یہ تجربہ تھا۔ جس نے دوستوئفیسکی کے اعصاب اور روح پر ساری عمر اپنا تاثر قائم رکھا۔ بہرحال وہ عالمی ادب کو اپنے عظیم ناولوں سے مالا مال کرنے کے لیے بچ گیا۔ اور اسے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں قید و بند کی صعوبتوں سے نجات کے بعد دوستوئفیسکی پھر اپنی تخلیقی دنیا میں واپس آگیا۔ اسے اسی زمانے میں مرگی کا مرض لاحق ہوا تھا۔ دوستوئفیسکی کے فن میں اب وہ باطنی و نفسیاتی گہرائی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کی مثال پوری دنیا کا ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے ناولٹ "چچا کے خواب" سے اس کے دوسرے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ طویل مختصر کہانی یا ناولٹ ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔

دوستوئفیسکی اب کائنات اور اس کے مظہر انسان کی روح کو اور روح کی اذیتوں اور نفسیاتی

کش مکش کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں اس کی تخلیق "دی ہاؤس آف ڈیڈ" شائع ہوتی ہے ۱۸۶۲ء میں "ذلتوں کے مارے لوگ" ان ناولوں میں وہ کھل کر بورژوازی طبقے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ DOGMATIST نہیں تھا بلکہ ایک سچا فنکار، روسی عوام اور کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کے ساتھ اس کی ہمدردی بہت نمایاں اور واضح ہے۔ وہ روس اور فرانس میں وسیع پیمانے پر پڑھا جانے لگا تھا۔ اس کے باوجود اس کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اسے بہت لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے سر پر قرضے کا انبار تھا۔ بعض اوقات ایسے بھی ہوا کہ اسے خاص وقت کی شرط پوری کرتے ہوئے دن رات کسی ناول پر کام کرنا پڑا۔ قرض وصول کرنے والوں سے جان بچانے کے لیے وہ ۱۸۶۷ء میں جرمنی چلا گیا۔ یہاں اس نے بیڈن نامی شہر میں قیام کیا۔ اور دولت مند بننے کے لیے اس نے دن رات جوا کھیلا۔ اس زمانے کے تجربات کو اس نے اپنے ناول "جواری" میں پیش کیا۔ جس کا اردو ترجمہ سید قاسم محمود کر چکے ہیں۔

"جواری" جس نے بھی پڑھا ہوگا۔ وہ منظر کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جس میں جواری نوٹوں سے بھری بوری لیے چل رہا ہے اور بھوکا ہے۔ بازار بند ہیں۔ وہ کئی دنوں سے بھوکا ہے۔ لیکن اب دولت ہونے کے باوجود بھی وہ بھوکا ہے۔ اور پھر وہ رات کو بے ہوش ہونے سے پہلے روپے کمرے میں عجیب کیفیت میں بکھیر دیتا ہے۔ چار برسوں میں دوستوئفیسکی نے الز کھے ہیجان کے تحت اتنا کچھ لکھا کہ وہ روس واپس آنے کے قابل ہو سکا۔ اب وہ قرضے اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ تھوڑی بہت آسودگی بھی حاصل ہو گئی۔ جب دوستوئفیسکی ۸ جنوری ۱۸۸۱ء میں فوت ہوا تو اس وقت وہ ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔

تصانیف اور "برادرز کرمازوف"

دوستوئفیسکی کے فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا ناول "بے چارے لوگ" شائع ہوا تو اس عہد کے عظیم روسی نقاد بیلنسکی نے اسے "عظیم ادیب" کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ روسی نقادوں نے بدلتے ہوئے تقاضوں اور حالات کے تحت، بالخصوص انقلاب روس کے بعد کے کچھ برسوں میں اس سلسلے میں کچھ نظر ثانی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے یہ خطاب چھینا جا چکا۔ بلکہ ہر دور میں دوستوئفیسکی

کی معنویت میں اضافہ ہوتا رہا اور بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے تمام ادوار میں بھی اس کی عظمت میں اضافہ ہی ہوگا

دوستوئفیسکی نے تخلیق کی دنیا میں اپنے لیے منفرد راہ نکالی ۔ اس نے انسان کے باطن اور روح میں گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ جھانکا ہے ۔ وہ ہمیں انسانی نفسیات اور روحانی کش مکش کی سب سے سچی تصویر دکھاتا ہے ۔ انسان میں جو نفسیاتی ہیجان پایا جاتا ہے ۔ جذبات کی نفسیات کے بیان میں دوستوئفیسکی کا کوئی ہمسر اور مثیل نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات اور اپنے باطن کی حقیقتوں سے خوف کھانے والے لوگ اس کی پوری طرح پڑھ اور سمجھ نہیں سکتے ۔

دوستوئفیسکی کے خاص اور شہکار ناولوں میں ایک تو "کرائم اینڈ پنشمنٹ" ہے ۔ جس کو دنیا کی ہر زبان میں منتقل کیا جاچکا ہے ۔ اس پر فلمیں بنی ہیں ۔ ڈرامائی تشکیل کی گئی ہے ۔ ایسے ہی ایک ڈرامائی ورشن کا اردو ترجمہ کمال احمد رضوی کر چکے ہیں ۔ یہ ناول ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا ۔ "جواری" ۱۸۶۷ء میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور پھر ۶۹ ۔ ۱۸۶۸ء میں "ایڈیٹ" ممتاز مفتی "ایڈیٹ" دوستوئفیسکی کا شاہکار قرار دیتے ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ دوستوئفیسکی سے متاثر ہوئے ۔ افسوس کہ اردو میں ابھی تک اس کا ترجمہ نہیں ہوسکا ۔ POSESSED کا سن اشاعت ۱۸۷۱ء ہے ، اور آخری ناول " برادرز کرمازوف " جسے دنیا کے ہر نقاد نے عظیم ترین اور دنیا کے بڑے ناولوں میں شمار کیا ہے ۔

یہ بھی مقام افسوس ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوسکا ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دوستوئفیسکی کو اردو میں منتقل کرنا بطور خاص مشکل کام ہے لیکن کسی کو ہمت تو کرنی چاہیے تھی ۔ !! جے ۔ سی پوئیز (POWEYS) نے دوستوئفیسکی پر ایک کتاب لکھی ہے ۔ جس میں اس نے دوستوئفیسکی کے ناولوں اور خاص طور پر " برادرز کرمازوف " کا ذکر کرتے ہوئے ایک بہت پتے کی بات کہی ہے ۔ پوئیز نے لکھا ہے کہ دوستوئفیسکی ہمیں " برادرز کرمازوف " میں بتاتا ہے کہ WAYS OF MAN کیا ہیں اور WAYS OF GOD کیا ہے ۔

سی پی سنو نے " REALISTS " کے عنوان سے دنیا کے آٹھ عظیم ترین ناول نگاروں پر ایک کتاب مرتب کی تھی ۔ جس میں اس نے دوستوئفیسکی اور ٹالسٹائی کو سر فہرست رکھا ہے ۔ اپنی اس

کتاب میں سی پی سنو نے اپنی اس اُلجھن کا بھی اظہار کیا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا ناول نگار کون ہے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ دوستوئفیسکی سب سے بڑا ناول نگار ہے یا ٹالسٹائی۔ یا تو یہ دونوں دنیا کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں یا پھر ان دونوں میں سے کوئی ایک۔ سی پی سنو کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔ اور وہ لکھتا ہے جوانی میں اسے "برادرز کرمازوف" دنیا کا سب سے بڑا ناول لگا۔ جب وہ زیادہ پختہ عمر کا ہوا تو ٹالسٹائی کا "جنگ اور امن"۔ پھر وہ آخر میں لکھتا ہے جو اسی کے الفاظ میں پڑھیے:۔

I AM NO SURE OF NOW ADAYS, I BELIEVE THAT THE PROFOUND INSIGHTS OF THE "BROTHERS KARAMAZOV" WILL REMAIN WITH ME AS LONG AS I HAVE LIFE LEFT."

یہ بہت دلچسپ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائی کو دوستوئفیسکی سرے سے ناپسند تھا۔ اس کا ذکر میکسم گورکی نے اپنے اس مضمون میں بطور خاص کیا ہے جو اس نے ٹالسٹائی کی موت پر لکھا تھا۔ خود میکسم گورکی کی نظر میں دوستوئفیسکی کی کیا قدر و قیمت تھی۔ اس کو گورکی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"دوستوئفیسکی کے کمال فن کو سب تسلیم کرتے ہیں تصویر کشی میں اس کے فن کے سامنے کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ غالباً شیکسپیئر ہے۔"

دوستوئفیسکی کے بارے میں ٹالسٹائی کی ناپسندیدگی کے حوالے سے تھامس مان نے جو لکھا ہے وہ بے حد اہم ہے تھامس مان نے لکھا ہے کہ مرژکووسکی نے صحیح تجزیہ کیا تھا کہ ٹالسٹائی ایک ایسا صاحب نظر ہے جو FLESH کو دیکھتا ہے۔ جبکہ دوستوئفیسکی ایک ایسا صاحب نظر ہے جو روح کو دیکھتا ہے ٹالسٹائی دوستوئفیسکی کی گہری نفسیاتی بصیرت کو "بیماری" سمجھنے کی وجہ سے کبھی دوستوئفیسکی کو پوری طرح ہضم نہ کر سکا حالانکہ اسی دوستوئفیسکی نے ٹالسٹائی کے ناول "اینا کرینینا" کا ایک دلچسپ اور شاندار تجزیہ تحریر کیا تھا جو ٹالسٹائی کو کم ہی پسند آیا تھا۔ ٹالسٹائی کو دوستوئفیسکی کی بصیرت اور عظمت کا احساس اس وقت ہوا جب دوستوئفیسکی کا انتقال ہوا۔ اس سے پہلے ٹالسٹائی کہتا تھا کہ دوستوئفیسکی ہمیں جس دنیا میں لے جاتا ہے وہ مریض اور بیمار ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ خود دوستوئفیسکی بیمار اور مریض ہے لیکن پھر تھامس مان کے ہی الفاظ ہیں . . .

WHEN THE AUTHOR OF "BROTHERS KARAMAZOV" DIED TOLSTOY SUDDENLY IMAGINED THAT HAD BEEN HIS 'COLOSEST, DEARST FRIEND."

دنیائے ادب میں " برادرز کرمازوف " ایک ایسی تخلیق ہے جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ اس میں دوستوئفیسکی نے ایک نئی تثلیث تخلیق کی ہے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہے کہ میں عامیانہ انداز میں اس ناول کے پلاٹ یا کہانی کا خاکہ پیش نہیں کرسکتا۔ پھر اس کی ایک بدترین مثال میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ ہالی وڈ والوں نے اس ناول پر جو فلم بنائی تھی (جس میں یول برنیر نے میٹا کا کردار ادا کیا تھا) اسے دیکھ کر مجھے اتنا دکھ ہوا تھا کہ جسے میں آج تک بھول نہیں کرسکا۔
اس فلم میں " برادرز کرمازوف " کی بے حد اوپری سطح کو بھی پوری طرح سمجھا نہ گیا تھا اور فلم بنا دی گئی تھی۔
" برادرز کرمازوف " تو کچھ پڑھنے ہی سے پلے پڑتا۔ اور اس کی عظمتوں کا احساس ہوسکتا ہے میٹا ایلوشا اور آئیوان، تینوں بھائی اور ان کا باپ فیوڈر کرمازوف، پھر مرگی کا مریض سمرڈیکوف۔ جو ملازم بھی سمجھا جاتا ہے اور فیوڈور کی ناجائز اولاد بھی پھر اس ناول کے دونوں بڑے نسوانی کردار گرشینکا اور کیٹیا۔
اور پھر ایلوشا۔ جو پادری ہے، مذہبی انسان ہے۔
میٹا جو خالص جبلت ہے.... فطری انسان اور آئیوان جو محتاط ہے۔ تحریک دینے والی قوت اور ان سب کا سرچشمہ۔ ان کا باپ۔ فیوڈور کرمازوف اور پھر انسان کی نفسیات، اس کی روحانی کش مکش اس کے جذباتی ہیجانات، جب انسان ایسی کیفیت میں ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کر اور کہہ رہا ہے اور پھر دوستوئفیسکی کا خاص فکری نظام..... شر اور خیر جو ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں کیے جاسکتے.... انسانی زندگی، انسانی ذہن، انسانی روح اور جذبات کا دہکتا ہوا جہنم اور پھر اس کا بیان کرنے والا۔ دوستوئفیسکی ۔ یکتا اور بے مثل دوستوئفیسکی ۔ !!

ڈیوڈ کاپر فیلڈ

۷ فروری ۱۸۱۲ء کو پیدا ہونے والے چارلس ڈکنز کا نام آج ساری دنیا میں ایک 'گھریلو نام'
کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ناول سارے عالم میں پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے ناولوں کے
تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں۔ اس کے ناولوں پر ڈرامے لکھے گئے اور انہیں سٹیج کیا گیا
اس کے ناولوں پر بھی فلمیں بنتی رہتی ہیں۔ ٹی وی کے لیے اس کے ڈراموں کو ٹیلی پلے
کی شکل دی گئی۔ وہ دنیا کے چند بڑے اور مقبول ترین لکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ رابرٹ
مورسے نے اسے شیکسپیئر اور ڈانٹے کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ
ڈانٹے اور شیکسپیئر کی طرح "DICKENS IS EVERYTHING FOR EVERY
ONE HE HAS SOME THING FOR EVERY BODY" ڈکنز کے ہاں یہ جو خوبی پائی جاتی
ہے کہ اس کے ناولوں میں اس کے قاری کو اپنے مطلب اور دلچسپی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور
مل جاتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کے حوالے سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا سب
سے بڑا تخلیقی ناول کونسا ہے۔ پسند اپنی اپنی کے معیار کی تو بات ہی تو ادب میں نہیں چلتی۔
یہاں تو ان تمام عناصر کو دیکھنا پڑتا ہے جن کی بدولت کوئی بڑی تخلیق قرار پاتی ہے۔ اور پھر
اس میں ایسے جراثیم کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے جو اسے ابد تک زندہ رکھنے کی صلاحیت رکھتے
ہوں۔ ڈکنز کے ناولوں میں "پک وک پیپرز" تو دنیا کی پر لطف اور مزاحیہ کتابوں میں شمار
کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ناول کا کوئی پلاٹ نہیں۔ کوئی مرکزی تصور نہیں۔ گریٹ ایکسپیکٹیشنز
"اولیور ٹوئسٹ" "ٹیل آف دی ٹو سیٹیز" وغیرہ ایسے ناول ہیں جن کی مقبولیت یکساں ہے اور جو ڈکنز

کو زندہ رکھنے میں کبھی ناکام نہ رہیں گی۔ لیکن اصل میں جو ناول واقعی ڈکنز کا فن پارہ اور عظیم کارنامہ ہے وہ "ڈیوڈ کو پر فیلڈ" ہے۔ یہ وہ ناول ہے جو اپنی اشاعت کے بعد سے اب تک کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس میں اتنی سکت اور جان ہے کہ یہ عظیم ناولوں کی صف میں ہمیشہ کھڑا رہے گا۔ اور اس سے کسی طرح اس کا یہ منفرد اور ممتاز مقام نہ چھینا جا سکے گا نہ کوئی اس کی جگہ ہی حاصل کر سکے گا۔

ڈیوڈ کو پر فیلڈ۔ ڈکنز کے دوسرے دلچسپ اور بڑے ناولوں کے مقابلے میں یہ ناول اس لیے خاص اہمیت کا ناول ہے کہ یہ ناول دراصل ڈکنز کی اپنی زندگی کا قصہ ہے یہ ایک خود سوانحی۔ یعنی آٹو بائیوگرافیکل ناول ہے۔

چارلس ڈکنز، ۷ فروری ۱۸۱۲ء کو پورٹ سی انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نیوی پے آفس میں ایک نچلے درجے کا کلرک تھا۔ لیکن وہ ایک خوش باش آدمی تھا۔ اپنی اور اپنے گھرانے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے اکثر ادھار لینا پڑتا تھا۔ چارلس ڈکنز کا بچپن تنگدستی میں بسر ہوا وہ بارہ برس کا تھا جب اس کی زندگی میں وہ واقعہ رونما ہوا جس نے اس کی زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس کے والد کو قرض کی ادائیگی نہ کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ڈکنز سے سکول چھوٹ گیا اور اسے ملازمت کرنی پڑی۔ اس کا کنبہ لندن منتقل ہو گیا۔ جہاں ڈکنز کی زندگی کی طویل جد و جہد کا آغاز ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈکنز کو کبھی پوری طرح تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن وہ بلا کا پڑھاکو تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اپنے والد کی اس ذلت پر اسے اتنا دکھ ہوا کہ وہ اس موضوع پر ساری عمر گفتگو کرنے سے کتراتا رہا۔

پندرہ برس کی عمر میں وہ ایک قانون کی فرم میں آفس بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا یہاں اس کے مشاہدے کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوا اس نے وہاں زیادہ عرصہ ملازمت نہ کی کہ یہ کام اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس نے شارٹ ہینڈ سیکھی اور ایک اخبار "مارننگ کرانیکل" میں رپورٹر بھرتی ہو گیا۔ ۲۰ برس کی عمر میں وہ برطانیہ کا سب سے بڑا پارلیمانی رپورٹر بن چکا تھا۔ لندن کو دیکھنے کا اسے بہتر موقع ملا تھا۔ اسے ۱۸۳۲ء میں چھوٹے

چھوٹے خاکے اور کہانیاں لکھنی شروع کیں یہ کہانیاں "منتھلی میگزین" اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔

جب اس کی پہلی کہانی پریس میں چھپ رہی تھی تو وہ رات بھر پریس کے باہر بیٹھا رہا۔ اپنی پہلی کہانی کو چھپا ہوا دیکھ کر وہ رونے لگا تھا۔ جب ڈکنز کو احساس ہوا کہ اس میں لکھنے کی بھرپور صلاحیت ہے تو اس نے لکھنے پر زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔

۱۸۳۶ء میں قسمت نے اسے ایک عجیب موقع فراہم کیا۔ اس وقت ڈکنز کی عمر ۲۴ برس تھی۔ جب ایک پبلشر نے اسے کارٹونوں کے سیریل کے ساتھ سرخیاں لکھنے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا۔ ابھی یہ سیریل شروع ہوا ہی تھا کارٹونسٹ رابرٹ سیمور نے خودکشی کر لی۔ اب ڈکنز نے خود مزاحیہ سلسلہ لکھنا شروع کیا۔ اپریل ۱۸۳۶ء میں پک وک پیپرز" کی قسط شائع ہونے لگی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس شمارے میں ڈکنز کے "پک وک پیپرز کی قسط شائع ہوتی تھی۔ وہ شمارہ چالیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہو جاتا تھا۔ نومبر ۱۸۳۷ء میں اس کی آخری قسط چھپی۔ بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ "پک وک پیپرز" کی کامیابی نے ڈکنز کو نئی راہ سجھائی۔ اس نے رپورٹر کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور اپنے آپ کو لکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ اسی زمانے میں جب "پک وک پیپرز" کتابی صورت میں شائع ہونے والی تھی۔ ڈکنز نے کیتھرائن ہوگارتھ سے شادی کر لی جس سے اس کے کئی بچے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ شادی کامیاب نہ رہی۔ ڈکنز کی بیوی کو اس کے تخلیقی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی زندگی کے آخری برس اس طرح گزرے کہ ڈکنز اور اس کی بیوی علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے تھے۔ اور ڈکنز کے گھر کا انتظام و انصرام اس کی سالی نے سنبھال رکھا تھا۔

بہرحال ڈکنز نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس نے دن رات لکھنا شروع کیا۔ اولیور ٹوسٹ" پک وک پیپرز" کے بعد شائع ہونا شروع

ہوا۔ اس کے بعد "نکولس نکل بائی" اور پھر اس کے ناول تادمِ مرگ شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۳۹ء میں "نکولس نکل بائی" شائع ہوا تو اس کا پہلا ایڈیشن پچاس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوا۔ ڈکنز کی شہرت انگریزی زبان جاننے والی دنیا میں تیزی سے پھیل گئی۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے اپنا جریدہ "HOUSE HOLD WORDS" جاری کیا۔

ڈکنز بہت بڑا اداکار تھا۔ اس نے اپنی مقبولیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے ناولوں کے جذباتی ٹکڑے سینکڑوں سامعین کے سامنے باقاعدہ اداکاری کرتے ہوئے پڑھا کرتا۔ ہر کردار کے لیے مختلف لہجہ بدلتا۔ خود روتا اور دوسروں کو رلاتا۔ اس نے ایک پر الم زندگی بسر کی تھی۔ لڑکپن اور جوانی جدوجہد میں گزاری۔ شادی راس نہ آئی۔ جب کامیابی نے قدم چومے تو بھی وہ عالمگیر مقبولیت کے باوجود ایک دکھی انسان تھا۔ ۵۸ برس کی عمر میں وہ ۱۸۷۰ء میں فوت ہوگیا۔

ڈکنز کا فن

ڈکنز کو اپنے زمانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانے میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کا ترجمان بن گیا تھا۔ وہ اپنے عہد کا نقاد بھی تھا اور رہنما بھی۔ وہ سماجی برائیوں کے خلاف آواز اٹھاتا تھا۔ کم سن بچوں پر ظلم و ستم کم سن بچوں کی ملازمت، قرضے کی ادائیگی نہ کرنے پر سزائے قید، پاگل خانوں اور ذہنی امراض میں مبتلا لوگوں کی حالتِ زار، غربت، قانون فوجداری کے نقائص اور سب سے بڑھ کر اس دور میں بچوں کی حالتِ زار۔ یہ ایسے موضوعات تھے جو اس زمانے کے مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آج بھی عالمگیر تاثیر کے حامل ہیں۔ ڈکنز کے ناولوں کی جڑیں اٹھارہویں صدی کے انگلستان کے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چونکہ تیسری دنیا کے مسائل آج بیسویں صدی میں بھی وہی ہیں۔ اس لیے اس کے ناولوں کی اپیل میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔

اس کے باوجود ڈکنز بہت بڑا "ENTERT AINER" بھی تھا۔ والٹر ایلن نے

تو اسے فکشن کی دنیا کا سب سے بڑا انٹرٹینر" قرار دیا ہے۔ اس کی کوئی کتاب پڑھ لیجیے اس میں مزاح کا ایک ایسا قوی اور جاندار عنصر شامل ہوگا جو اپنے قارئین کو بے انتہا محظوظ کرتا ہے

ڈکنز ایک بڑے مصلح کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے سماجی اور معاشرتی اصلاح کا علمبردار تھا اور اس میں یقیناً اسے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے ناولوں کی دنیا جہاں پریوں کی کہانیوں کی دنیا ہے۔ وہاں دہشت ناک خوابوں کی بھی دنیا ہے اس کے بیشتر ناولوں میں کہانی۔ بچے بیان کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی نگاہ سے ہمیں یہ دنیا دکھاتا ہے۔ اس طرح اس دنیا کی بدصورتیاں بچوں کی معصومیت سے ملوث ہوکر کہیں زیادہ خوفناک لیکن موثر صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ ڈکنز کے ناولوں کے کردار ایسے ہیں کہ وہ ناول کے واقعات پر حاوی ہوجاتے ہیں۔ ہم اس کے ناولوں کا پلاٹ بھول سکتے ہیں۔ لیکن اس کے کرداروں کو اپنے حافظے سے باہر نہیں نکال سکتے۔

ڈکنز کے بیشتر ناول کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے اخبارات اور جرائد میں قسط وار شائع ہوئے تھے۔!

ڈیوڈ کوپر فیلڈ

ڈکنز کا یہ ناول اگرچہ پوری طرح خودسوانحی ناول تو نہیں ہے لیکن یہ ناول ڈکنز کی جذباتی زندگی کے ارتقا کی تاریخ ضرور بنتا ہے۔ یہ ناول بیس ماہانہ قسطوں میں مئی ۱۸۴۹ء سے نومبر ۱۸۵۰ء تک شائع ہوا۔ جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو ڈکنز نے اس کے دیباچے میں لکھا:۔

"اپنی تمام کتابوں میں سے میری یہ کتاب بہترین ہے۔ جس طرح والدین سب بچوں سے محبت کرنے کے باوجود ایک بچے سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنی تخلیقی اولاد میں سے جو اولاد مجھے سب سے عزیز ہے۔ اس کا نام ہے۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ۔

یہ ناول جو ڈکنز کو سب سے زیادہ پسند تھا اور جو واقعی اس کا شہکار ہے۔ اسے اس

کے پڑھنے والوں نے ابتدائی زمانے میں اس کے دوسرے ناولوں سے کم پسند کیا۔ عام طور پر وہ شمارہ جس میں ڈکنز کا ناول قسط وار شائع ہوتا تھا۔ وہ بتیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوتا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کوپر فیلڈ شائع ہونا شروع ہوا تو اس کی اشاعت پچیس ہزار رہ گئی۔

اس کی وجہ کیا تھی؟ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ ناول میلو ڈرامائی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ادب کی تاریخ میں REALISM کی اصطلاح ۱۸۵۵ء سے پہلے استعمال میں نہ آئی تھی۔ مشہور نقاد جی۔ ایم لیوس نے اسے پہلی بار ۱۸۵۵ء میں استعمال کیا اور جی۔ ایچ لیوس کے خیال میں ڈکنز کے ناول اس اصطلاح پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ناول کی عظمت آشکار ہونے لگی۔ اور بیسویں صدی میں اس ناول کو خاص مقام حاصل ہوا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا میں ڈکنز کا جو ناول سب سے زیادہ پڑھا اور سراہا جاتا ہے۔ وہ ناول "ڈیوڈ کوپر فیلڈ" ہے۔ بیسویں صدی کے اہم ترین نقاد رچرڈ آلڈ انگٹن نے اس عظیم حقیقت پسندانہ ناول قرار دیا ہے۔ ارنسٹ اے بیکر نے "ہسٹری آف دی انگلش" ناول میں ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے بارے میں لکھا ہے:۔

"اس ناول میں ایک سچے حقیقت پسند ناول نگار کی حیثیت سے ڈکنز کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے کردار اتنے ہی پائیدار ہیں۔ جتنی کہ وہ زمین جس پر وہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔"

۶۴ ابواب پر مشتمل "ڈیوڈ کوپر فیلڈ" کا خلاصہ بیان کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ تاہم اس کی کچھ جھلکیاں دکھائی جا سکتی ہیں۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ اپنے والد کی وفات کے چھ ماہ بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے موقع پر اس کی خالہ بیسی موجود ہے۔ جو گمراہ خیالات اور مضبوط قوتِ ارادی کی مالک خاتون ہے۔ اسے اس بات سے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کے برعکس لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ڈیوڈ کی ابتدائی زندگی اپنی والدہ کلارا کے ساتھ گزرتی ہے جو نرم خو لیکن کمزور اور علیل عورت

ہے۔ پیگوٹی۔ آیا بھی ہے اور ادنیٰ ملازم بھی۔ جب ڈیوڈ کوپر فیلڈ کی والدہ مسٹر مرڈسٹون کے ساتھ شادی کر لیتی ہے تو ڈیوڈ کو پیگوٹی کے ساتھ تفریح کے لیے اس کے عزیزوں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ پیگوٹی کا بھائی مچھیرا ہے۔ وہ اپنے دو یتیم عزیزوں ہام اور ایملی کی کفالت کرتا ہے۔ یہاں ڈیوڈ سادہ دل غریب لوگوں سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔

جب وہ گھر واپس آتا ہے تو اسے یہ تلخ تجربہ ہوتا ہے کہ اس کا سوتیلا باپ اور اس کی بہن بہت ظالم ہیں۔ ڈیوڈ پر ظلم کرتے ہیں۔ مسٹر مرڈسٹون ایک بار ڈیوڈ کو بری طرح پیٹتا ہے۔ ڈیوڈ اس کے ہاتھ پر کاٹ لیتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے لنڈن کے قریب ایک سکول میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ سکول کی حالت خراب ہے۔ اور استاد مسٹر کریکل دوسروں کو اذیت دے کر مسرت حاصل کرنے والا شخص ہے۔ یہاں بدترین ماحول میں ڈیوڈ کوپر فیلڈ کو سٹیر فورتھ اور ٹریڈلز کی دوستی نصیب ہوتی ہے۔

جب اس کی ماں مر جاتی ہے تو ڈیوڈ کا سوتیلا باپ اسے سکول سے اٹھا کر لنڈن کی ایک فیکٹری میں ملازم کرا دیتا ہے۔ یہاں دس برس کا ڈیوڈ ظلم و ستم اور بھوک کا نشانہ بنتا ہے۔ اگر اسے کوئی تسلی دیتا ہے تو وہ خوش باش مسٹر مکاوبر ہے جس کے ہاں ڈیوڈ رہتا ہے لیکن جب مکاوبر کو بھی لنڈن چھوڑنا پڑ جاتا ہے تو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ فیکٹری سے بھاگ نکلتا ہے۔ پیدل ڈوور پہنچتا ہے۔ جہاں اس کی واحد رشتے دار بیسٹی رہتی ہے۔ یہاں بھی اسے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے مسٹر ویکفیلڈ کے ہاں پناہ ملتی ہے۔ جو خالہ بیسٹی کا وکیل ہے۔ جس کی بن ماں کی بچی ایگنس سے وہ محبت کرنے لگتا ہے۔

اب وہ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ سترہ برس کی عمر ہو چکی ہے۔ جب ڈیوڈ کو اپنے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا ہے۔ وہ وکیل بننے کا خواہاں ہے۔ تلاشِ روزگار میں اس کا اپنے پرانے دوستوں سے سامنا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی بے ایمانیوں اور منافقتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایگنس سے اسے جو محبت تھی وہ اس کی گہرائی سے پوری طرح آشنا نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے مالک سپن لو کی بیٹی ڈورا سے محبت کرنے لگتا ہے۔ سپن لو کو یہ شادی پسند نہیں۔ وہ شدید مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد ڈیوڈ ڈورا سے شادی کر لیتا ہے۔ قانونی فرم جس میں وہ کام کر رہا ہے

اس پر ایک بدطینت اور بے ایمان آدمی قابض ہو جاتا ہے۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ یہ ملازمت چھوڑ کر لندن چلا جاتا ہے اور وہاں شارٹ ہینڈ سیکھ کر ایک اخبار کا رپورٹر بن جاتا ہے۔ ۲۱ برس کی عمر میں وہ ڈورا سے شادی کرتا ہے۔ اور اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ دوسرے شغل کا بھی آغاز کرتا ہے۔ وہ کہانیاں لکھنے لگتا ہے۔ ڈورا ایک بُری خانہ دار عورت ہے۔ وہ گھر کے کام کاج سے ہی جی نہیں چراتی۔ بلکہ اسے اپنے شوہر کی تخلیقی سرگرمیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی گھریلو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ جس کا ڈراپ سین ڈورا کی موت سے ہوتا ہے۔

زندگی میں ڈیوڈ کو کئی المناک واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب مرجاتے ہیں۔ وہ ان المناک واقعات کو بھلانے کے لیے سیر و تفریح پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ معقول ترین مصنف بن چکا ہوتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کو دراصل سچی محبت اگنیز سے تھی۔ وہ ساری عمر دراصل اگنیز سے ہی محبت کرتا رہا تھا۔ جب وہ تین برس کے بعد لندن پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اگنیز شادی کرنے والی ہے۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ اس سے ملتا ہے۔ اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اگنیز اسے بتاتی ہے کہ وہ تو خود اس سے محبت کرتی ہے۔ یوں ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ میں پوری کہانی ڈیوڈ کوپر فیلڈ خود سناتا ہے۔ یہ کہانی وہ اس وقت سنا رہا ہے۔ جب وہ ایک بالغ اور پختہ عمر کا کامیاب مصنف بن چکا ہے۔ وہ اگنیز سے شادی کر کے کئی بچوں کا باپ بن چکا ہے۔

ایڈگر جانسن نے اس ناول کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ وہ بے حد رقیع اور صحیح ہے ایڈگر جانسن لکھتا ہے کہ فکشن میں ڈیوڈ کوپر فیلڈ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ بچپن کی جتنی سچی اور حقیقی تصویر اس ناول میں پیش کی گئی ہے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ ڈکنز کے بہت بعد میں آنے والے جیمز جوائس نے۔ اے پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ینگ مین

(A PORTRAIT OF TH ARTIST ASA YOUNG MAN)

میں بچپن کی محرومیوں اور تلخیوں کی عکاسی کی ہے۔ لیکن بچپن کی مسرتوں، عقیدتوں اور شفقتوں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ مارک ٹوین کے دونوں ناولوں "ٹام سوائر" اور "ہیکل بری فن" کی عظمتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دونوں شاہکار بھی۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔"

دی نیٹو سن

آج عالمی ادب میں امریکہ میں لکھے جانے والے "نیگرو ادب" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ امریکہ کے حبشی ڈرامہ نگاروں، شاعروں، کہانی کاروں اور ناول نگاروں نے عالمی ادب میں اپنے لیے بلند مقام اور رتبہ حاصل کیا ہے۔ امریکہ میں حبشی لکھنے والوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ غلامی کے ابتدائی دور میں حبشی لکھنے والوں کی تخلیقات سامنے آتی رہیں لیکن بیسویں صدی میں امریکی حبشی ادب کو جو نمائندگی عالمی ادب میں ملی اور حبشیوں کی زندگی اور نفسیات کو تخلیقی پیراہن عطا ہوا تو اس کا سرخیل رچرڈ رائٹ ہے۔ آج کے حبشی ادب پر سب سے زیادہ اثر رچرڈ رائٹ کا ہے۔ یہ رچرڈ رائٹ ہی تھا جس نے امریکی حبشیوں کی مغائرت، غم و غصہ، تشدد، فرسٹریشن کو پہلی بار تخلیقی سطح پر فکشن کے ذریعے بیان کیا۔ اس کے بعد آنے والوں نے اس سے یا تو رہنمائی حاصل کی یا پھر اس سے اثر لے کر اس سے کچھ انحراف کیا۔ بہرحال رچرڈ رائٹ ہی پہلا نیگرو لکھنے والا تھا جس نے امریکی نیگرو ادب کے خدوخال نمایاں کیے۔

رچرڈ رائٹ نے جو کچھ لکھا اور اس کے حوالے سے امریکی نیگرو ادب کی جس طاقتور روایت نے جنم لیا اسے خود رچرڈ رائٹ کی زندگی کے مطالعے کے بغیر پوری معنویت کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا۔

رچرڈ رائٹ ۱۹۰۸ء میں مسسپی میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن عام نیگرو بچوں کی طرح "بنجر" تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور فن کا جو سفر طے کیا۔ اس میں شکاگو، نیویارک اور پیرس

اہم منزلیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ رچرڈ رائٹ نے اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت اور اپنے فن کے ذریعے اپنے اردگرد کے متعصب سفید فام ماحول کو شکست دینے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کی۔

رچرڈ رائٹ کو اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار اور اپنی شخصی مشکلات پر قابو پانے کے لیے جو کچھ کرنا پڑا۔ اس کے لیے اس کے عہد جوانی کا مطالعہ بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہونے والے رچرڈ رائٹ کو ابتدائی عمر میں مسیسپی سے ممفس جانا پڑا۔ اس کے والدین نے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔ غربت اور حالات کی وجہ سے رائٹ اور اس کے بھائی کو یتیم خانے میں پناہ لینی پڑی۔ کیونکہ اس کی والدہ کو فالج ہو گیا تھا۔ اس دور میں رائٹ تنہائی کا شکار رہا۔ انسانوں پر اس کا اعتماد اُٹھ گیا غربت اور اپنے خاندان کے حالات کا اثر ساری عمر ان پر رہا۔ وہ ایک بے چین روح بن گیا۔ وہ ہر کام میں بے چینی اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ جس کے اثرات ہمیں اس کی تصانیف پر بھی بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں۔

بعد میں رائٹ کی ماں نے رچرڈ اور اس کے بھائی کو یتیم خانے سے اٹھوا کر رشتے داروں کے ہاں بھیجا۔ تاکہ وہاں وہ قدرے سکون سے زندگی گزار سکیں۔ کئی گھرانوں میں بدسلوکی کا مزہ چکھتے ہوئے رائٹ کو اپنی نانی اور خالہ کے ہاں پناہ ملی۔ جو مذہبی خواتین تھیں اور انہوں نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد کو رچرڈ رائٹ پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ نوجوانی میں ہی رچرڈ رائٹ نے بغاوت اور انحراف کا مظاہرہ کیا اور ساری عمر وہ مروجہ عقائد اور رجعت پسندانہ نظریات کا باغی رہا۔

جوانی میں ہی رچرڈ رائٹ کو شدت سے یہ شعور حاصل ہو گیا کہ امریکہ۔ کا اصلی حکمران وہ ہے جس کے ہاتھ میں معیشت کی باگ ڈور ہے۔ سفید فام مالک اور تاجر اس نے ایسے کئی سفید فاموں کے ہاں مختلف ملازمتیں اختیار کیں۔ لیکن وہ اپنے حبشی اور کالے رنگ کا ہونے کی وجہ سے ان کی برتری کو کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کئی بار اپنے سفید فام مالکوں کے سامنے اپنے رنج اور غصے کا اظہار کیا۔

'بلیک بوائے' کے نام سے رچرڈ رائٹ نے جو اپنی خود نوشت لکھی ہے اس میں اس نے زندگی کے ابتدائی سترہ برسوں کے حالات بڑی تفصیل اور سچائی سے قلم بند کیے ہیں۔ اس میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سفید فام جنوب کے امریکیوں کی اطاعت قبول کرنے سے بغاوت کر دی تھی۔ غصے اور تشدد کا رجحان اس کے اندر لڑکپن ہی میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ساری عمر اس کا رویہ غصیلا اور جارحانہ رہا۔ اسی زمانے میں اسے مطالعے کا چسکا پڑا۔ لیکن وہ ناول خرید نہیں سکتا تھا۔ لائبریری سے کتابیں لینے کے لیے وہ ایک سفید فام امریکی مصنف ایچ۔ ایل مینکین کا سفارشی خط لے کر گیا۔ ایچ۔ ایل مینکین امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم اور برے سلوک کا بہت بڑا ناقد تھا۔ اور رائٹ اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس زمانے میں رائٹ نے مینکین کے بعد دوسرے اہم سماجی شعور رکھنے والے سفید فام ناول نگاروں کا مطالعہ کیا۔ جن میں تھیوڈور ڈریزر اور سینکلر لویس بطور خاص قابل ذکر ہیں اور اسی زمانے میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے جنوبی امریکہ کو چھوڑ کر شمالی امریکہ میں چلے جانا چاہیے۔ جہاں حبشیوں کے خلاف تعصب نسبتاً کم تھا۔ رائٹ باوقار زندگی بسر کرنے کا خواہاں تھا۔

۱۹۲۷ء میں رائٹ شکاگو پہنچا لیکن اسے دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں بھی حبشیوں کے ساتھ جائز اور انسانی سلوک روا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کا امریکی جمہوریت پر اعتقاد متزلزل ہو گیا اور اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کی۔ اپنے ابتدائی دور کے مضامین میں وہ ہمیں یہ تلقین کرتا ہوا ملتا ہے کہ تمام حبشی لکھنے والوں کو مارکسی نقطۂ نظر کو اپنانا چاہیے۔ اسی زمانے میں اس نے آزاد خیال جرائد کے لیے مضامین، نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ جنہوں نے جدید امریکی نیگرو ادب کی بنیادیں استوار کیں لیکن رچرڈ رائٹ سیاست اور سیاسی نظریات و عقائد پر فن کو قربان کرنے کا قائل نہ تھا۔ وہ ادب اور پروپیگنڈے کے فرق کو بھی سمجھتا تھا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت چھوڑ دی۔ اس کا تفصیلی احوال رائٹ نے ایک مضمون میں بیان کیا ہے۔ جو مشہور زمانہ کتاب GODS THAT

FAILED میں شامل ہے۔ اس زمانے میں جب رائٹ فیڈرل نیگرو تھیٹر کا ڈائریکٹر اور فیڈرل رائٹرز پراجیکٹ کا رکن تھا تو اس نے ہمیشہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے تھوپے جانے والے مشوروں کی مخالفت کی۔ تاہم اپنی عمر کے آخری دور تک اسے مارکسزم کے بنیادی اصولوں سے ہمدردی رہی۔

رچرڈ رائٹ کی پہلی کتاب اس کی کہانیوں کا مجموعہ "انکل ٹامز چلڈرن" ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کہانیاں جہاں حبشیوں کی زندگی اور ان کے مصائب کی سچی عکاس ہیں۔ وہاں بعض روایات سے انحراف بھی کرتی ہیں۔ ہیریٹ بیچر سٹوو کا ناول "انکل ٹامز کیبن" کا مزاج کچھ اور تھا۔ حبشیوں سے دلی ہمدردی رکھنے والی بیچر سٹوو کا یہ ناول بہت اہم اور تاریخ ساز ثابت ہوا تھا۔ (اس سلسلہ مضامین کی دو کتابوں میں اس ناول پر مضمون شائع ہو چکا ہے) لیکن اس ناول کا بنیادی مقصد حبشیوں کے لیے رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ اس میں کردار بھی خاصے ٹھہرے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ رائٹ نے اس رویے سے شدید انحراف کیا۔ وہ حبشیوں کے لیے رحم نہیں بلکہ ان کے حقوق کا طلب گار تھا۔

رائٹ ایک ایماندار لکھنے والا تھا۔ اس نے اپنی کہانیوں پر فخر کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ تو یہ کہتا تھا کہ یہ کہانیاں حبشیوں کی حقیقی زندگی کی بھرپور جھلک ہی پیش نہیں کر سکی ہیں اس نے کہا "اب میں ایسا ناول لکھوں گا جو اتنا سخت اور گہرا ہوگا کہ سفید فام قارئین کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

اس نے اپنے اس ارادے کو ۱۹۴۰ء میں شائع ہونے والے ناول "نیٹو سن" میں پورا کیا۔ "نیٹو سن" صرف رچرڈ رائٹ کا ہی بڑا تخلیقی فن پارہ نہیں ہے بلکہ اس سے ہی جدید اور معاصر نیگرو لٹریچر کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس ناول میں رچرڈ رائٹ نے پہلی بار شہر میں بسنے والے امریکی حبشیوں کی معاشی اور سماجی کسمپرسی اور مسائل کو تخلیق کا جامہ پہنایا۔ یہ ایک احتجاجی ناول ہے۔ جب تک امریکہ میں حبشیوں کو برابری کی سطح پر نہیں لایا جاتا۔ جب تک ان کی معاشی اور عمرانی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ تب

تک یہ ناول ہر دور کی نمائندگی کرتا رہے گا۔ اور جب حالات بدل گئے تو بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بلکہ ایک عظیم ادبی دستاویز کی حیثیت سے اس کا مقام اور بھی بلند ہو جائے گا۔

بعض نقادوں نے اس کے اسلوب، ان کی کردار نگاری اور فنی ساخت پر بہت سے اعتراض کیے ہیں لیکن یہ ایک ایسا ناول ہے جو نیچرلسٹک ناولوں کی ذیل میں آتا ہے۔ اس میں جو زندگی اپنی صحیح صورت میں دکھائی گئی ہے۔ وہ اسی ناول کا اصل حسن اور جوہر ہے۔

"نیٹو سن" میں رچرڈ رائٹ ہمیں بتاتا ہے کہ سفید رنگ کی برتری میں مبتلا معاشرہ میں ایک حبشی کو کن مظالم کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر اپنے آپ کو اس معاشرے کے ہاتھوں مصلوب کرانا پڑتا ہے۔ اس ناول میں جو جارحیت ہے۔ شدت ہے۔ سچائی ہے اگر اسے بہتر اور محتاط قسم کے مشینی اور غیر جذباتی اسلوب میں لکھا جاتا تو اس کی توانائی اور قوتِ تاثیر کو بہت دھچکا لگتا اور جو ردِ عمل رچرڈ رائٹ اس حوالے سے اپنے پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی کمزور پڑ جاتا۔

"نیٹو سن" کی فنی اور تخلیقی قدر و قیمت کا اندازہ بھی اس کے مطالعے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت سے پہلے کبھی وہ انکشافات نہ ہوئے تھے جو اس ناول میں حبشیوں کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی حبشیوں کی کچلی اور مسلی ہوئی خواہشوں اور جذبوں کو اتنی شدت سے بیان نہ کیا گیا تھا۔ اس ناول کی اشاعت پر ویسا ہی ردِ عمل ہوا جس کی رچرڈ رائٹ کو توقع تھی۔ امریکہ کے نیگرو ادب کو ایک قافلہ سالار ہی نہیں ملا تھا۔ نئے ادب کی بنیاد ہی استوار نہیں ہوئی تھی بلکہ اس ناول کے پڑھنے والے سفید فام امریکیوں نے بھی اس کی تاثیر اور قوت کو محسوس بھی کیا اور اپنی ندامت کا اظہار بھی۔ پہلی بار پوری شدت سے اس ناول کے حوالے سے سفید فام امریکیوں کو شدت سے احساس ہوا بگر تھامس۔ جو اس ناول کا حبشی ہیرو ہے وہ بھی امریکہ کا ایک حصہ ہے اور اس ملک کے اصلی بیٹوں میں سے ایک ہے۔

اس ناول کی اشاعت نے نہ صرف رچرڈ رائٹ کو بطور ناول نگار ایک مستحکم حیثیت بخشی بلکہ اس سے امریکہ میں حبشی ادب کے سوتے بھی پھوٹ پڑے۔ دوستوئیفسکی نے گوگول کے "شہکار" اوورکوٹ" کے حوالے سے کہا تھا کہ روس کے ادب کو "اوورکوٹ" نے جنم دیا ہے۔ اسی طرح پورے وثوق سے رچرڈ رائٹ کے اس ناول "نیٹو سن" کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ جدید امریکی نیگرو لٹریچر کا سرچشمہ رائٹ کا ناول "نیٹو سن" ہے "نیٹو سن" کے بعد ۱۹۴۵ء میں "بلیک بوائے" شائع ہوئی جو رائٹ کی ابتدائی عمر کے سترہ برسوں پر مشتمل اس کی خود نوشت ہے۔ اس کے بعد اس کی بے چین طبیعت اسے عیسائیت اور کمیونزم دونوں سے منحرف کر کے وجودیت کے فلسفے تک لے گئی۔

۱۹۵۳ء میں اس کا ناول "دی آؤٹ سائیڈر" شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی رائٹ نے سفید فام یورپی معاشرے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کا ہیرو بھی ایک حبشی ہے۔ جو امریکہ کے متوسط طبقے کی تمام اقدار کو یکسر مسترد کرتا ہوا ملتا ہے۔

امریکہ کی نسل پرستی۔ رنگ میں امتیاز اور انتہا تک پہنچی ہوئی مادہ پرستی نے رائٹ کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ کو چھوڑ دے۔ اس نے کچھ عرصہ انگلستان میں قیام کیا۔ پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء۔ اپنی وفات تک وہ پیرس میں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس کے ناول "لانگ ڈریم" اور کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اس نے عمرانی مسائل کے تجزیے بھی کیے۔ اور کتابیں لکھیں جن میں سفید فام و سفر" (۱۹۵۷ء) بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے افریقی قوم پرستی کی تحریکوں میں بھی گہری دلچسپی لی۔ افریقہ میں اپنی جڑوں کی تلاش کا بھی شوق رہا۔ لیکن وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی مغربیت نے اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل کر رکھی ہیں۔ وہ ساری عمر ایک ROOTLESS انسان رہا۔

وہ ایک تحریک بن کر جیا۔ اس نے نئے لکھنے والے حبشی مصنفوں کی رہنمائی کی۔ رالف ایلیسن جیسے عظیم ناول نگار کو اس نے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ وہ حبشی ادب کا امام تھا۔ اور مجموعی طور پر اس نے امریکی ادب میں گراں بہا اضافے کیے۔

نیٹوسن اس کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے۔ جس نے امریکی نیگرو ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ اس نے اس ناول کے حوالے سے اور اپنی دوسری تصانیف کے ذریعے انتہائی تخلیقی دیانت داری کے ساتھ ان لوگوں کی زندگیوں، نفسیات، معاشی اور سماجی حالات کو پیش کیا۔ جنہیں ان کے اپنے وطن میں اپنے ملک میں ہی اجنبی اور غیر ہی سمجھا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کے تمام انسانی حقوق کو بھی سلب کیا جا چکا ہے۔

رچرڈ رائٹ کے ناول "نیٹوسن" کے حوالے سے اسے یہ خراج تحسین بجا طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس نے انسانی تجربات کے ان منطقوں کو دریافت کیا جو اس سے پہلے کبھی دریافت نہ کیے گئے تھے۔ "نیٹوسن" کا مصنف رچرڈ رائٹ وہ مصنف ہے جس نے اپنے ہم رنگ لوگوں کے جذبات، رجحانات اور مصائب سے پوری دنیا کو تخلیقی سطح پر متعارف کرایا۔

رچرڈ رائٹ ایک ایسا مصنف ہے جس نے اپنے پڑھنے والوں کو ان لوگوں سے ملوایا جو گمنام تھے۔ جنہیں امریکی سماج نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر اس نے امریکہ کے نیگرو ادب میں ایک مستقل اور سچی روایت کا اضافہ کیا اور وہ روایت ہے۔ نیگرو لٹریچر میں احتجاج کی روایت اس نے جس نئی جہت کی نشاندہی اپنے ناول "نیٹوسن" میں کی اس سے بعد کے آنے والے نیگرو مصنفوں نے استفادہ کیا اور امریکی حبشیوں کے صحیح اور سچے نفسیاتی رجحانات اور رویّوں کو ادب میں جگہ ملی۔

رچرڈ رائٹ نے ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے جو جدوجہد کی وہ امریکہ کے حبشیوں کی ثقافت کا ایک اہم اور نمایاں ترین جزو ہے۔ اگر حبشی۔ امریکی استعارہ بنتے ہیں تو پھر یہ رچرڈ رائٹ ہی تھا جس نے سب سے پہلے اپنے ناول "نیٹوسن" میں اس استعارے کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ کا فمین نے اسے امریکی ادب کی سرزمین ادب کا ایک نادر قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ

ہر شخص کے اندر ایک جیکل ہے اور ایک ہائیڈ۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک وجود میں بستے ہوئے گتھم گتھا، متضاد لیکن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے۔ خیر اور شر، مجبور و مختار، ازلی اور ابدی کشمکش باطن اور ظاہر کی۔

یہ وہ موضوع ہے جسے رابرٹ لوئی سٹیونسن نے اپنایا۔ اور جو ناول لکھا۔ منفرد لازوال اور یکتا ٹھہرا۔ رابرٹ لوئی سٹیونسن کی دیگر تصانیف پہ ایک نگاہ ڈالیں اور پھر ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ پڑھیں تو گہرا تعجب ہوتا ہے۔ سٹیونسن کو ایڈونچر، رومان اور فطرت سے محبت تھی۔ اس کی سب کتابوں پہ اس کا محبوب اور پسندیدہ موضوع ہی چھایا ہوا اور غالب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ ناول خود اس کی اپنی تصانیف میں بالکل علیحدہ، جداگانہ اور اکیلا کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

ویسے بھی عالمی ادب میں یہ ایک یکتا ناول ہے۔

رابرٹ لوئی سٹیونسن پر اصل میں لکھنے کا حق تو محمد خالد اختر کو جاتا ہے کہ اردو زبان میں لکھنے والوں (اور شاید پڑھنے والوں) میں بھی شاید ہی کوئی دوسرا ایسا ہو جو محمد خالد اختر کی طرح رابرٹ لوئی سٹیونسن کا مداح ہو۔ عالمی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں تو ایک فرض پورا کرنے کے لیے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔!

رابرٹ لوئی سٹیونسن سے محبت کرنے والوں کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی اور کبھی کمی محسوس نہ کی جائے گی۔ پھر وہ ہر نسل کے جوانوں اور بوڑھوں کا پسندیدہ مصنف ہے!

سٹیونسن ۱۳ر نومبر ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کا والد لائٹ ہاؤسوں کا معمار اور انجنیئر تھا۔ اس کے باپ نے سٹیونسن کو بھی انہی بنیادوں پر تعلیم دلوائی کہ وہ اسی کا پیشہ اختیار کر سکے۔ ۱۸۶۷ء میں سٹیونسن ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ لیکن تین سالوں کے بعد اس نے یک دم قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۸۷۵ء میں وہ قانون کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک شدید مرض میں بھی مبتلا رہا۔ یہ مرض پھیپھڑوں کا درد تھا۔ جس سے وہ ساری عمر نجات حاصل نہ کر سکا۔

سٹیونسن ایک سچا لکھنے والا تھا۔ تخلیقِ ادب کے لیے اس نے اپنے قانونی پیشے کو جلد ہی ترک کر دیا۔ اس کی ابتدائی تصانیف میں "اندرونِ ملک ایک بحری سفر" (۱۸۷۸ء) اور پھر "ٹریولز وِد اے ڈونکی" (۱۸۷۹ء) سفرنامے تھے۔ سٹیونسن کو سیر و سیاحت سے گہری دل چسپی تھی۔ یہ دونوں سفرنامے اس کی اس سیاحت کی یادگار ہیں۔ جو اس نے پیدل اور ایک چھوٹی، عام کشتی میں فرانس میں کیے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں اس کے مضامین کا مجموعہ VIRGIN BUS PUCERIS AUE کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سٹیونسن کے ۱۵ مضامین شامل ہیں جو بے حد دلچسپ اور سدابہار ہیں۔ اس برس اس نے 'نئی الف لیلیٰ' بھی لکھی۔ جس کی کہانیاں دہشت ناک واقعات اور لرزا دینے والے قتل کی داستانوں پر مشتمل ہیں۔

سٹیونسن کو اپنی جس کتاب پر سب سے پہلے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی وہ ہے، "ٹریژر آئی لینڈ" (TREASURE ISLAND) یہ وہ کتاب ہے جو مقبول ترین رومان سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصے تک، ہمارے ہاں بھی نصاب میں شامل رہا۔ بحری قزاقوں اور مہم جوؤں پر مشتمل اس ناول کے کردار زبان زدِ عام ہیں۔ اس ناول کا ہر زبان میں ترجمہ ہوا۔ فلمیں بنیں۔ اس کو ڈرامے اور ٹی وی ڈرامے کا بھی روپ دیا گیا۔ بچوں اور بڑوں میں یہ رومان یکساں مقبول ہے۔ ۱۸۸۵ء میں "پرنس اوٹو" شائع ہوا۔ یہ بھی اس کا ایک شاہکار رومان ہے۔ اس کی بھی کئی بار ڈرامائی تشکیل ہو چکی ہے۔ ۱۸۸۶ء میں اس کا ایک اور مقبول اور شاہکار رومان "کڈنیپڈ" کے نام سے شائع ہوا۔ بلیک ایرو

(۱۸۸۸ء) اور "ماسٹر آف بلینٹرے" (۱۸۸۹ء) پہلے ناولوں کے مقابلے میں نسبتاً کم مقبول ہوئے۔ لیکن بعد میں ان ناولوں کو بھی کئی بار فلمایا گیا۔

رابرٹ لوئی سٹیونسن۔ افسانہ نگار، مضمون نگار، ناول نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ ایک ایسا شاعر جسے انگریزی زبان اور عالمی ادب کی تاریخ میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۸۵ء میں شائع ہونے والا اس کا شعری مجموعہ "اے چائلڈ گارڈن آف ورس" آج بھی دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۲ء میں بھی اس کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔

سٹیونسن کے ناولوں کی فہرست اچھی خاصی ہے۔ کچھ تصانیف اس نے اپنے سوتیلے بیٹے لائیڈ اوسبورن کے اشتراک سے بھی لکھیں۔ کچھ رومان نامکمل رہے اس کی ایک بہت اہم اور عظیم تصنیف WEIR OF HEAMISTON اس کی موت کے بعد ہی نامکمل صورت میں شائع ہوئی۔ ایک تصنیف "سینٹ آئیوینز" کو بعد میں اے ٹی کیولر کوچ نے مکمل کر کے شائع کیا۔

سٹیونسن ساری عمر علیل رہا لیکن وہ ناقابل شکست عزم اور تخلیقی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ بہت عالی حوصلہ اور خوش گفتار انسان تھا۔ اس کو ہر شخص چاہتا تھا۔ اس کے دور کے ہر بڑے لکھنے والے کے دل میں سٹیونسن کے لیے پیار اور احترام تھا اس کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا محبت کرنے والا انسان تھا۔ جس کے احباب کا دائرہ وسیع تھا۔ وہ صحت کی تلاش میں سفر کرتا رہتا۔

۱۸۷۶ء میں اس کی پہلی ملاقات فینسی اوسبورن سے پیرس میں ہوئی تھی۔ اور سٹیونسن کو اس شادی شدہ خاتون سے عشق ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں جب سٹیونسن کو خبر ملی کہ فینی اوسبورن امریکہ میں علیل ہے۔ تو اپنی بگڑتی صحت، نامساعد حالات اور کم ذرائع کے باوجود وہ ترک وطن کرنے والوں کے معمولی بحری جہاز پر سفر کرتا ہوا سان فرانسسکو پہنچا۔ وہاں فینی سے ملا۔ طویل غیر آرام دہ بحری سفر نے اس کی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ کچھ عرصہ وہ آرام کرتا رہا اور ۱۹ مئی ۱۸۸۰ء کو اس نے فینی

اوسبورن سے شادی کرلی۔ جو طلاق لے چکی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ انگلستان چلے آئے۔ دونوں میاں بیوی مسلسل حالت سفر میں رہتے۔ مقصد یہ تھا کہ ایسی جگہ کی تلاش ہو سکے جو سٹیونسن کی صحت کے لیے مفید اور سازگار ہو۔ وہ سوئٹزرلینڈ، ریویرا، سکاٹس ہائی لینڈز اور نیویارک تک گئے۔ نیویارک میں سٹیونسن نے جس مکان میں قیام تھا اب اسے یادگار کی صورت دی جا چکی ہے۔ پھر سٹیونسن ایک طویل بحری سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اور بالآخر ۱۸۹۰ء میں سموا میں جا پہنچا۔ اس جزیرے میں اس نے اپنا گھر تعمیر کیا۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری برس تصنیف و تخلیق میں بسر کیے۔ سٹیونسن نے بھرپور زندگی گزاری۔ سیر و سیاحت، محبت و عشق بے پناہ لکھا۔ جزیرے کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور معتبر اور موثر شخصیت بن گیا۔ سموا جزیرے کے مقامی لوگ اسے THSITALA کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے۔ "داستان گو"

۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو سٹیونسن کا سموا جزیرے میں انتقال ہوا۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے ایک پہاڑ کی چوٹی پہ دفن کیا گیا جو اس کے گھر کے عقب میں واقع تھا۔

ٹریژر آئی لینڈ، کڈنیپڈ، ماسٹر آف بلینٹرے جیسے رومان لکھنے والا سٹیونسن کئی کہانیوں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔ اس کی کہانی "مارکھیم" کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ اسے فلمایا بھی گیا ہے۔ یہ کہانی اس کی دوسری کہانیوں سے مختلف اور جداگانہ ہے۔ بالکل اس طرح ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ اس کا ناول۔ ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ کا سن اشاعت ۱۸۸۶ء ہے۔ تب سے اب تک یہ ناول انگریزی زبان میں کئی بار اور کتنی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح اب تک یہ دنیا کی کتنی زبانوں میں کتنی بار ترجمہ ہوا۔ اس کا بھی کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ کئی بار اس ناول کو فلمایا گیا۔ سٹیج کیا گیا۔ اور ٹی وی ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا۔

اُردو میں اس ناول کی متعدد بار تلخیص شائع ہو چکی ہے۔ پورا ناول ترجمہ کرنے کا سہرا ڈاکٹر محمد حسن کے سر بندھتا ہے۔

اس ناول کے واقعات اور کرداروں پر مبنی کئی دوسرے ناول لکھے گئے۔ فلم والوں نے اسے متعدد بار مختلف انداز میں ADOPT کیا۔

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کا شمار دنیا کے معنی خیز اور مقبول ترین کرداروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ نام علامتیں اور استعارے بن چکے۔ ان میں معنی کا جہان پوشیدہ ہے۔

یہ ناول جو ہولناک ناولوں کی سی فضا رکھتا ہے، انسانی تقدیر اور انسانی نفسیات کا معنی خیز آئینہ ہے۔ جس میں ہر انسان اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔ حرص و ہوس اور شر کا غلبہ جوان ان کو مطیع کر لیتا ہے۔ اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے اصل اور خیر کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا شر اس کو بے بس کر دیتا ہے اس طرح غالب آجاتا ہے کہ انسان ہر کوشش کے باوجود اپنے اصل تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ ایک ایسی اندرونی اور باطنی جنگ کا آغاز ہوتا ہے جس کا نتیجہ موت ہے۔ شر کی موت

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ۔ ایک ہیں۔ ایک وجود، ایک شخص میں پلنے والے خیر و شر۔

اس ناول کا نقادوں نے ہزار پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ نفسیات والوں نے اس کو اپنے مخصوص انداز سے سراہا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی نفس کی ایک سچی اور تکلیف دہ تفسیر پیش کرتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس ناول کا مطالعہ اگر خالص اور وسیع تر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی کیا جائے تو اس کے معنوں کے کچھ اور پہلو اور وسعتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ صوفیانہ نقطۂ نظر سے بھی اس کا مطالعہ معانی کے جہان کے نئے دروازے کھولتا ہے۔

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ، دو مختلف چہروں دو مختلف جذبوں، دو مختلف انسانی اور حیوانی رویّوں، شر اور خیر کے ساتھ مل کر ایک انسان کا روپ دھارتے ہیں۔ جو انسان ہم سب میں کسی نہ کسی حد تک، کسی نہ کسی انداز میں موجود ہے کہیں جیکل غالب ہے، کہیں ہائیڈ۔ لیکن دونوں ہمارے اندر موجود ہیں۔ اس بصیرت نے ہی اس ناول کو لازوال کر دیا ہے۔

ڈاکٹر جیکل ایک سائنس دان اور عالم ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے میں مصروف ہے جس

کے بارے میں اس کے ہم عصر اور دوست اسے منع کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر جیکل اس سے باز نہیں آتا۔ اور پھر جب وہ تجربے سے گزرتا ہے تو اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ محلول پیتے ہی وہ مسٹر ہائیڈ بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس تجربے کے ساتھ ہی اس کے اندر کا جو شر اور شیطان ہے وہ غالب آ جاتا ہے۔ اس کی اصل شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ بدشکل اور بد ہیئت بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جیکل کی صورت میں وجیہہ اور جاذب نظر ہے۔ جیکل کی صورت میں وہ نرم دل، عالم اور خیر کا نمائندہ ہے۔ لیکن ہائیڈ کی صورت میں وہ ہوس پرست ظالم اور متشدد انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ ہائیڈ وہ شر ہے جو ہر انسان کے اندر چھپا ہوا ہے۔ جس کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بعض اوقات ارادی اور غیر ارادی طور پر اسے ایسی تحریک ملتی ہے کہ وہ خیر پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کش مکش کو جو خیر اور شر کے درمیان ہوتی ہے سٹیونسن نے ایک بڑے انسانی رزمیے اور المیے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کو لکھنے کی تحریک بھی سٹیونسن کی عجیب انداز میں ہوئی۔ اس نے ایک خواب دیکھا۔ جس سے اس نے اس ناول کا موضوع لیا۔ جو آج دنیا کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔

ڈیفو

رابنسن کروسو

آج سے پونے تین سو برس پہلے ۱۷۱۹ء میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام رابن سن کروسو اور جس کا مصنف ڈینیل ڈیفو تھا۔ اپنی اشاعت کے زمانے سے آج تک یہ کتاب پوری دنیا میں مقبول رہی ہے۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور زبانوں میں یہ کتاب کتنی بار اور کتنی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ تاہم ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پچھلے پونے تین سو برس سے یہ کتاب مسلسل ساری دنیا میں پڑھی جا رہی ہے اور یہ کتاب اتنی دلچسپ اتنی جاندار اور اتنی اہم ہے کہ آنے والے ہر دور میں اس کتاب کو پڑھا جائے گا۔

"رابن سن کروسو" بچوں اور بڑوں سب کے لیے یکساں دل چسپی کی حامل کتاب ہے اسے ہر نسل کے بچوں اور بڑوں نے ساری دنیا میں پڑھا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کتاب کو بنیاد بنا کر بہت سے لکھنے والوں نے "رابن سن کروسو" کے نئے معرکے اور کارنامے کتابی شکل میں شائع کرائے۔ "رابن سن کروسو" ایک ایسا کردار ہے جو ساری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ جب سے دنیا میں فلم سازی کا آغاز ہوا ہے۔ "رابن سن کروسو" پر متعدد بار فلمیں بن چکی ہیں اسے دنیا بھر کے اہم ٹی وی سٹیشنوں نے اپنے اپنے انداز میں ماخوذ کیا اور اس پر ٹی وی فلمیں بنائیں۔ "رابن سن کروسو" کے برے بھلے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ بہت سے ملکوں میں ایک عرصے سے یہ کتاب انگریزی کے تعلیمی نصاب میں شامل رہی اور غیر زبانوں میں نصابی ضرورتوں کے تحت اسے شائع اور مقامی زبانوں میں

ترجمہ کیا گیا ہے۔

"رابن سن کروسو" ایک ایسا ناول ہے جسے کتاب، فلم اور ٹی وی کے حوالے سے پاکستان کے بچے، لڑکے اور بڑے نسل ہا نسل سے واقف ہیں۔ لیکن اس کے مصنف ڈینیل ڈیفو کے بارے میں قارئین کی معلومات بہت کم، ادھوری اور نامکمل ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تخلیق نے شہرت اور مقبولیت کے میدان میں خالق کو پیچھے چھوڑ دیا۔

ڈینیل ڈیفو ایک بڑا لکھنے والا تھا جس کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ لیکن اس کی تمام تر عالمی شہرت "رابن سن کروسو" کی وجہ سے ہے۔

ڈیفو کے سن پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قیاس اغلب ہے کہ وہ ۱۶۶۰ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیمز پیشے کے اعتبار سے قصاب تھا۔ جب ڈینیل پختہ عمر کو پہنچا تو اس نے اپنے خاندانی نام فو کے ساتھ ڈی کا اضافہ کر دیا یوں وہ ڈینیل ڈیفو کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ اس کا باپ جیمز تھا تو قصاب لیکن آدمی غضب کا تھا۔ دینی نظریات کے اعتبار سے وہ ایک منحرف تھا۔ اس وقت جو مذہبی عقائد سرکاری اور دینی سطح پر مستحکم تھے۔ وہ ان کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور ان سے انحراف کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کے باپ نے اپنے بیٹے ڈینیل کو ایک ایسے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جو اس کے اپنے نظریات کے مطابق تھا۔ یہاں نیوئنگٹن گرین میں ڈینیل ۱۹ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔

وہ مصنف بننے کا خواہاں تھا اور جب وہ ۲۵ برس کا ہوا تو اس نے ایک پمفلٹ شائع کیا جو پادریوں کے خلاف تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور پمفلٹ لکھا جو ترکوں کے خلاف تھا۔ اس دور میں یورپ والے ترکوں سے بے حد خائف رہتے تھے۔ ترکوں نے بہادری شجاعت اور فتوحات کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے تھے کہ یورپ کے روشن دماغ لوگ بھی مذہبی تعصب اور ترکوں کی فتوحات کی وجہ سے ان کے خلاف لکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک لمبی مدت تک ترکوں کے خلاف لکھنا یورپ کے لکھنے والوں کے لیے ایک "مجبوری" یا فیشن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

ڈینیئل ڈیفو نے اپنے دور کی سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا وہ کئی ایسی سازشوں میں ملوث رہا جو اس دور کے انگلستان کے حکمران کے خلاف تھیں۔ کئی بار وہ سزا اور عقوبت سے بال بال بچا کئی بار اسے جان بچانے کے لیے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

" برٹش سیکرٹ سروس کی ایک اجمالی تاریخ کے نام سے رچرڈ ڈیکن نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں بڑے بڑے انکشافات کیے ہیں کہ کیسے کیسے عالی مرتبت لوگ برطانوی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ ان میں ایک ڈینیل ڈیفو بھی تھا جس نے اپنی جان بچانے کے لیے برطانوی سیکرٹ سروس کے لیے جاسوسی کرنا قبول کر لیا تھا۔

ڈیفو شاعر بھی تھا۔ اپنے عہد کے حالات پر اس نے ایک طنزیہ نظم ۱۷۰۱ء میں لکھی تھی جسے بڑا شہرہ حاصل ہوا تھا۔ اس نظم کو لوگوں نے خود شائع کر کے گلیوں اور بازاروں میں گا گا کر بیچا۔ ۱۷۰۲ء میں اس نے اپنے عقائد کے بارے میں جو پمفلٹ شائع کیا اس کی بنیاد پر ڈینیئل ڈیفو کو گرفتار کر لیا گیا اس پر مقدمہ چلا۔ سزا اور جرمانہ ہوا اور زندان میں ڈال دیا گیا۔ وہ سمجھتا رہا کہ اس کے پمفلٹ کو غلط معنی دیے گئے ہیں اور اسے جو سزا دی گئی ہے وہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈینیئل نے ایک جریدے کا آغاز کیا جس کا نام "ریویو" تھا۔

" ریویو" کو وہ نو برس تک شائع کرتا رہا۔ ۱۷۰۶ء میں لارڈ گوڈولفن کے ایما پر اسے کمیشن میں شامل کر لیا گیا جو سکاٹ لینڈ اور انگلستان کے درمیان مفاہمت اور مذاکرات کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ رچرڈ ڈیکن نے لکھا ہے کہ اصل میں اسے بطور جاسوس کمیشن میں شامل کیا گیا تھا اور ڈینیئل ڈیفو نے اتنی قیمتی اور اہم معلومات حاصل کیں کہ حکومت نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اس کے لیے تاحیات پنشن مقرر کر دی۔

ان خدمات کی حکومت کے نزدیک اصل حقیقت کیا تھی۔ اس کا ثبوت ایک اور واقعہ سے ملتا ہے۔ ڈیفو کو جیکوبین پارٹی سے شدید نفرت اور اختلافات تھے۔ اس نے اس کے خلاف ایک پمفلٹ لکھ مارا جس کے نتیجے میں اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اسے جرمانہ ہوا، سزا دی گئی اور نیوگیٹ جیل میں ڈالا گیا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس پمفلٹ کی پاداش میں اسے گرفتار کر کے سزا نہ دی جاتی تو ڈیفو ساری عمر سیاسی سرگرمیوں میں ہی ملوث رہتا اور علمی ادبی کاموں پر سنجیدگی سے توجہ نہ دیتا اس بار وہ نیوگیٹ جیل میں اپنے بارے میں بہت کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ سیاسی سرگرمیوں میں اس کے لیے سوائے قید و بند کی صعوبتوں اور رسوائیوں کے علاوہ کچھ نہیں رکھا۔ خدا نے اس کو زرخیز ذہن دیا ہے اور بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس لیے اسے علمی ادبی کاموں پر اپنی ساری توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ سیاسی سرگرمیوں اور مذہبی مناقشات کی وجہ سے اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔

رہائی کے بعد ڈینیئل ڈیفو نے اپنے آپ کو علمی، ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا اور اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ۱۷۱۹ء میں ہوا جب اس کا ناول "رابن سن کروسو" شائع ہوا۔ اسے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ فقید المثال ہے۔

"رابن سن کروسو" کے بعد بھی اس نے کئی اہم فن پارے تخلیق کیے۔ ۱۷۲۲ء میں اس کی اہم ترین تصنیف "جرنل آف پلیگ" شائع ہوئی جسے کلاسیک کا درجہ حاصل ہے اس کے بعد بھی اس کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ کو تحریر و تصنیف کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ لکھتا رہا۔ اس نے ناول لکھے۔ سوانح عمریاں تحریر کیں۔ اقتصادیات پر کتابیں لکھیں۔

ڈینیئل ڈیفو نے ۱۶۸۴ء میں شادی کی تھی اس کی کئی اولادیں تھیں ۱۷۳۱ء میں لندن میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے بہت سے موضوعات پر لکھا۔ اقتصادیات، مذہبیات جادو ٹونہ، سوانح عمریاں، ناول جرنل اور طنزیہ شاعری ... لیکن اسے جو ابدی شہرت حاصل ہوئی وہ اس کا مہماتی ناول "رابن سن کروسو" ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ اس کتاب کو ہمارے ہاں مدتوں سے پڑھا جا رہا ہے اور عرصے تک یہ انگریزی کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے لیکن اس کا کوئی بھرپور اور مستند ترجمہ آج تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔ نصابی ضرورتوں کے تحت اس کے کئی بھدے اور برے ترجمے نصابی ناشر شائع کر چکے ہیں۔ کئی بار اس کی تلخیص بھی مختلف

جرائد میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک ترجمہ اے حمید نے بھی کیا ہے لیکن افسوس کہ اے حمید جیسے صاحب طرز لکھنے والے نے بھی اس ناول کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔

"رابن سن کروسو" دنیائے ادب کا معروف اور مقبول ترین ناول ہے۔ جب اسے ڈیفو نے لکھا تھا تو اس سے پہلے بھی اس کہانی اور کردار کا سراغ موجود تھا۔ کیونکہ یہ ایک زندہ اور حقیقی کردار پر مبنی ناول ہے اسی لئے جب ڈینیل ڈیفو نے اسے اپنے تخلیقی اسلوب میں لکھا تو کئی ناشروں نے اسے اس لیے شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ کہانی تو پہلے سے شائع ہو چکی ہے۔

دنیائے ادب میں یہ واقعہ یکتا یا انوکھا نہیں ہے۔ وارث شاہ کی ہیر سے پہلے دامودر کی ہیر پنجابی شاعری میں موجود تھی۔ اسی طرح یونانی اساطیر اور دیومالا کے حوالے سے انگریزی ادب میں کئی شاہکار تصنیف ہوئے۔ شیکسپیر کے کئی ڈرامے ان کہانیوں اور کرداروں پر مشتمل ہیں جو پہلے سے لوگوں کو معلوم تھے۔ "رومیو جولیٹ" ہو یا "ہیملٹ"، ان کی کہانیاں اسی دور کے لوگوں کو معلوم اور یاد تھیں۔ لیکن شیکسپیر نے ان کو فن پارہ بنا دیا۔ یہی تخلیقی کارنامہ ڈینیل ڈیفو کا تھا کہ اس نے ایک جانے پہچانے قصے کو ایسے [illegible] میں تحریر کیا کہ وہ لافانی ہو گیا۔

ناشروں کے انکار کے بعد جب یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تو اسے ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ خود اسے شائع کرنے سے انکار کرنے والے ناشر ہاتھ ملتے رہ گئے کہ اگر وہ اسے شائع کرتے تو کتنی دولت اور شہرت حاصل کرتے۔

"رابن سن کروسو" کا قصہ ایک اصل کردار پر مبنی ہے۔ ایک صاحب الیگزنڈر شیلکرک تھے جو ایک نجی بحری جہاز پر بطور استاد ملازم تھے۔ ہوا یوں کہ کسی بات پر شیلکرک کی جہاز کے کپتان سے ٹھن گئی۔ کپتان بھی ایک سر پھرا اور منتقم مزاج انسان تھا۔ اس نے شیلکرک کو ایک ویران علاقے کے ساحل پر جہاز سے اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساحلی علاقہ امریکہ کے جنوب مغرب میں واقع تھا اور یہ واقعہ ۱۷۰۴ء میں پیش آیا۔ شیلکرک اب اس ویران جزیرے میں زندگی گزارنے کے لیے مجبور تھا۔ اس نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے وہ سب

کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا۔ جزیرے میں وہ اکیلا اور تنہا تھا۔ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد اس نے اپنی دنیا بسائی اور بنانی شروع کردی وہ کئی برس وہاں تنہا رہنے پر مجبور ہوا کیونکہ وہ ایک دور افتادہ جزیرہ تھا جہاں سے بحری جہاز شاذ و نادر ہی گزرتے تھے۔ بہر حال کئی برسوں کے بعد ایک جہاز وہاں سے گزرا اور شیلکرک کو سوار کرکے واپس شہری آبادی میں لے آیا۔

شیلکرک کا قصہ اس زمانے میں بہت مشہور ہوا اور اس کو اس دور کے مختلف چھوٹے اور عام لکھنے والوں نے مختلف انداز میں لکھ کر گویا ڈینیل ڈیفو کے لیے ایک بڑا فن پارہ تخلیق کرنے کی راہ ہموار کردی ۱۷۱۹ء میں "رابن سن کروسو" شائع ہوا اس کے بعد اس کی اپنی مقبولیت میں جہاں اضافہ ہوتا رہا وہاں کئی دوسرے لکھنے والوں نے بھی "رابن سن کروسو" کے کردار کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے نئے نئے کارنامے اور ایڈونچر لکھنے اور شائع کرنے شروع کردیے۔ اور یہ سلسلہ اب پونے تین سو برس گزر جانے کے بعد بھی جاری ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کردار اور یہ کتاب کتنی زرخیز اور فیض رساں ہے۔

"رابن سن کروسو" ایک سیدھا سادا انسانی کارنامہ ہے۔ یہ ایک مہماتی کہانی ہے جو بلاشبہ بہت عظیم الشان ہے دنیا کے ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آج کے قاری کے لیے بھی اس میں وہی دل چسپی ہے جو ۱۷۱۹ء کے قاری کے لیے تھی آج کا جدید نقاد اس میں اپنے حساب سے مین میخ نکال سکتا ہے۔ بہت سے اعتراضات کرسکتا ہے لیکن اس تنقیص اور اور اعتراضات کے باوجود اس کی ادبی حیثیت اور دل چسپی سے انکار نہیں کرسکتا۔ نہ ہی اسے کسی طور جھٹلا سکتا ہے۔ اس ناول میں الیوژن (Illusion) اور حقیقت کا ایک ایسا امتزاج ہے جو بہت کم کتابوں میں ملتا ہے۔ ڈینیل ڈیفو نے جزئیات کو بنیاد بنا کر ناول میں ڈرامائی تاثر پیدا کیا ہے۔

۶۶

میلول

موبی ڈک

ماہم نے میلول کے ناول "موبی ڈک" کا دنیا کے دس بڑے ناولوں میں شمار کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ قارئین جنہوں نے اس ناول کا مطالعہ نہیں کیا وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس ناول کا شمار دنیا کے دس ناولوں میں ایک بڑا ناول نگار کر رہا ہے۔ اس کا دنیائے ادب اور بالخصوص ناول کی صنف میں کیا درجہ ہوگا۔ ناول کی صنف جب سے معرض وجود میں آئی ہے۔ تب سے اب تک دنیا کی چھوٹی / بڑی مختلف زبانوں میں کتنے ناول لکھے گئے ہیں اس کا شمار کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔ نہ ہی کسی انسان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دنیا بھر میں لکھے جانے والے تمام ناولوں کو پڑھا ہوگا۔ لیکن یہ بات خاصے تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے ناول لکھے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر مختلف ادوار میں ساری دنیا میں اپنی اصل یا دوسری زبان میں ضرور پڑھے گئے ہیں۔

"موبی ڈک" کا قصہ بھی عجیب ہے۔ اس کا سن اشاعت ۱۸۵۱ء ہے۔ جب یہ ناول شائع ہوا تو اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ میلول امریکہ کے ان لکھنے والوں میں سے ہے جنہوں نے خالص امریکی تخلیقی ادب کے خد و خال تراشے اور اس کی صورت گری میں نمایاں ترین حصہ لیا۔ والٹ وہٹمین، ہاتھورن، ایڈگر ایلن پو، ہتھورو جیسے عظیم لکھنے والوں نے امریکی ادب کی صورت گری کی اور اس کی بنیادیں رکھیں۔ مخصوص حلقوں میں موبی ڈک کا کچھ ذکر ہوا اور اس حوالے سے تھوڑی شہرت میلول کو بھی ملی۔ لیکن میلول کے اپنے زمانے میں اس کی جس کتاب کو قدرے دل چسپی سے پڑھا گیا وہ اس کا ناول بلی بڈ BILLY BUD

ہے۔ لیکن تھوڑی سی مدت تک اس کے کام کا چرچا ہوا پھر خود میلول گمنامی کی گود میں سو گیا۔
امریکی ادب کے بعض ناقدوں نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۶ء سے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک بالکل گمنام تھا۔ اس کی کوئی کتاب نہ چھپتی تھی۔ لوگ اور نقاد اسے بالکل فراموش کر چکے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہرمن میلول کو از سر نو دریافت کیا گیا۔ اس بار دراصل میلول اور 'موبی ڈک' کو حیات نو ملی۔ جسے اس کی لافانی زندگی اور شہرت کا آغاز کہا جا سکتا ہے تب سے اب تک 'موبی ڈک' اور میلول زندہ جاوید ہو گئے ہیں دنیا کی مختلف زبانوں میں موبی ڈک اور بلی بڈ کے تراجم ہوئے ان پر فلمیں بنیں۔ فلم کا اچھا ذوق رکھنے والوں نے پاکستان میں بھی امریکی فلم 'موبی ڈک' دیکھی ہوگی جس میں گریگری پیک نے کپتان آہب کا کردار ادا کیا تھا۔
پشکن نے ایک نظم میں لکھا تھا کہ ایک دن کوئی نیک دل راہب آئے گا جو اس کی نظموں کے گرد آلود صفحوں سے گرد جھاڑے گا۔ اور اس کی آنکھوں کے آنسو اس کی نظموں کے الفاظ کو ہمیشہ کے لیے منور اور روشن کر دیں گے۔ کچھ ایسا ہی میلول اور اس کے عظیم ناول 'موبی ڈک' کے ساتھ ہوا کہ مدتوں اس کا کوئی ذکر نہ کرتا تھا۔ لیکن اب یہ دنیا کے ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ ساری دنیا میلول اور موبی ڈک کے نام سے آشنا ہے اور موبی ڈک اور اس کے مصنف کے بارے میں دنیا کی ہر زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور رہتی دنیا تک لوگ میلول کے عظیم فن پارے موبی ڈک کو پڑھتے رہیں گے۔

ہرمن میلول یکم اگست ۱۸۱۹ء کو نیویارک میں پیدا ہوا۔ ہرمن میلول کی دادی کے بارے میں ایک روایت پائی جاتی ہے کہ وہ آیور وینڈل ہومز کی نظموں کی ہیروئن تھی۔ میلول کا باپ اچھا خاصا تاجر اور کاروباری آدمی تھا۔ جس کا میلول کے لڑکپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ میلول نے چھے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ وہ ایک جہاز میں کیبن بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ میلول کو سمندر اور سمندری زندگی سے عشق تھا۔ یوں اس کی طویل سمندری زندگی کا آغاز ہوا اور پہلی بار انگلستان گیا۔ وہ چھبیس برس کی عمر کا تھا کہ جب اس نے

ایک ایسے جہاز میں ملازمت اختیار کرلی جو وہیل مچھلی کے شکار کے لیے نکلا تھا۔ اس جہاز پر وہ ڈیڑھ برس تک رہا اور فرار ہوگیا کیونکہ جہاز کا کپتان بہت ظالم تھا۔ جہاز سے فرار ہوکر میلول ایک جزیرے میں جانکلا جہاں آدم خور قبائلی رہتے تھے۔ انھوں نے میلول کو چار ماہ تک اپنے ساتھ رکھا اور اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ آسٹریلیا کا ایک وہیل مچھلی پکڑنے والا جہاز اس علاقے میں آنکلا تو میلول کو وہاں سے رہائی نصیب ہوئی۔ میلول اس بحری جہاز میں کام کرتا رہا اور دو برس کے طویل بحری سفر کے بعد پھر نیویارک زندہ سلامت واپس پہنچ گیا۔ یہ میلول کی آخری بحری ملازمت تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ ۱۸۶۰ء میں سمندر کے راستے ایک جہاز پر دنیا کی سیر کے لیے نکلا لیکن تب اس کی حیثیت ایک مسافر کی تھی۔

میلول نے بحری زندگی کا طویل مشاہدہ کیا تھا بلکہ وہ خود اس کو بسر کرچکا تھا۔ اس نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ وہ ملاحوں اور جہاز کے ایک ایک فرد اور ان کی نفسیات سے واقف تھا۔ سمندر سے اس کی گہری دوستی رہی تھی۔ اپنی ملازمتوں کے دوران میں وہ یادداشتیں مرتب کرتا رہا تھا جنہوں نے اس کے تخلیقی کام کی تکمیل میں بہت مدد دی۔ میلول نے اس آخری بحری ملازمت کے بعد نیویارک کسٹم ہاؤس میں ملازمت اختیار کرلی اور اپنے آپ کو تحریر و تصنیف کے لیے وقف کردیا۔

میلول کی پہلی کتاب کا نام خاصا طویل ہے جو اس زمانے کا عام رواج تھا۔ آج کل اسے اس مختصر نام TYPEE سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب اس کی اپنی سرگزشت ہے۔ اس کتاب میں اس نے ان چار ماہ کا احوال بیان کیا ہے جو اس نے آدم خور قبائلیوں کی قید میں گزارے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی اور اسے خاصا پسند کیا گیا۔ اگلے برس اس کی دوسری کتاب "نریٹیو آف ایڈ و نچر ان دی ساؤتھ سی" NARRITIOE OF ADUE NATURE IN THE SOUTH SEA شائع ہوئی۔ اس برس اس نے میساچوسٹس کے ایک جج کی بیٹی سے شادی کی۔

ہرمن میلول اپنے زمانے کے اعتبار سے اسلوب و موضوع میں ایک انقلابی بھی تھا اور ایک راست فکر رکھنے والا مصنف بھی۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی جو کتاب شائع ہوئی وہ خاص اہمیت

کی حامل ہے اس کا نام وائٹ جیکٹ ہے۔ اس کتاب میں اس نے بطورِ خاص یہ احتجاج کیا کہ ملّاحوں کو کسی غلطی یا جرم کی سزا میں کوڑے مارنا شدید قابلِ نفرت حرکت اور ظلم ہے اس کے اس احتجاج کا خاطر خواہ اثر ہوا اور حکومت کی طرف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ بحریہ سے کسی فرد کو اب کوڑے نہ مارے جائیں۔ کوڑے مارنے کی سزا منسوخ کر دی گئی۔ موبی ڈک کا سن اشاعت ۱۸۵۱ء ہے۔
اس کے بعد بھی میلول نے کئی کتابیں لکھیں لیکن ان کو خاص شہرت حاصل نہ ہوئی۔ نہ ہی ان کی کوئی خاص ادبی اہمیت رہی تھی۔ بلی بڈ۔ بہرحال اس کا ایک اور شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ میلول شاعر بھی تھا۔ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی اس کی زندگی میں شائع ہوا۔ اپنی زندگی کے آخری برس اس نے علالت میں بسر کیے۔ اس کا انتقال ۲۸ ستمبر ۱۸۹۱ء کو نیویارک میں ہوا۔

موبی ڈک، میلول کا ہی شاہکار نہیں بلکہ دنیائے ادب کا عظیم فن پارہ ہے۔ ۱۸۵۱ء میں اس کی اشاعت پر اس زمانے کے بڑے بڑے لکھنے والوں نے اسے سراہا۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے سمندر اور سمندر سے متعلق افراد کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں بہت کم لکھنے والے ایسے ہیں جو سمندر کو اتنا جانتے اور سمجھتے ہوں جتنا کہ میلول سمندر کو جانتا تھا سمندر اسی کے ہاں ایک علامت اور ایک حقیقت دونوں حیثیتوں سے سامنے آتا ہے۔
جان میسفیلڈ نے موبی ڈک کے بارے میں کہا تھا۔
"موبی ڈک" ایک ایسا ناول ہے جو سمندر کے تمام راز اور اسرار بے نقاب کر دیتا ہے۔"
نیتھنل ہاتھورن اس ناول سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس نے میلول کو ایک شاندار اور تعریفی خط لکھا۔ رابرٹ لوئی سٹیونسن اس ناول کا مداح تھا اور اس نے بھی خراج تحسین پیش کیا۔ بیری نے اعتراف کیا کہ اس کا کردار کپتان ہک۔ میلول کی دین ہے۔
اس عظیم فن پارے کو جیسے مدتوں کے لیے نظر انداز یا فراموش کر دیا گیا بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس کو RE - DISCOVER کیا گیا۔ آر۔ ایم۔ ولیور، جان فری مین اور لوئی ممفورڈ نے اس کی سوانح عمریاں اسی دور میں لکھیں۔ اس کے شاہکار موبی ڈک

پر فلم بنی۔ پھر ملی بڈ کو فلمایا گیا اور ۱۹۲۴ء میں اس کی تمام تحریروں کو یکجا کر کے مکمل صورت میں شائع کیا گیا۔

موبی ڈک، کتنا بڑا تخلیقی کام ہے اس کا اندازہ اس کی اس صلاحیت سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نظر انداز کیے جانے کے باوجود زندہ ہو کر سامنے آیا اور اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ میں ذاتی طور پر میلول کو اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اردو میں اسے مرحوم محمد حسن عسکری نے ترجمہ کیا۔۔۔!!

موبی ڈک کس لیے عظیم تخلیق ہے!

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہرمن میلول کو اس موضوع پر پوری دسترس حاصل ہے جس پر وہ ایک ناول لکھ رہا ہے۔ سمندر، بحری جہاز، اس کی دنیا اور پھر انسان کی نفسیات پوری جزئیات کے ساتھ اس ناول میں ملتی ہیں۔ مجھے اس کا ایک ایڈیشن بھی دیکھنے کا اتفاق ہے جس میں اصل ناول کے آغاز سے پہلے بیسیوں صفحات پر وہ حوالے درج کیے گئے تھے۔ جو موبی ڈک یعنی وہیل مچھلی کے بارے میں قدیم ترین عہد سے لے کر میلول کے اپنے عہد پر محیط تھے۔ جہاں کہیں وہیل مچھلی کا ذکر ہوا۔ اس کا حوالہ اس میں موجود تھا۔

موبی ڈک کی دوسری اہم صفت۔ وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا ناول ہے جو سمندر کے تمام اسرار اور راز ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ جہاں یہ ناول مختلف النوع انسانوں کے مزاج، ظاہر اور باطن کا مرقع ہے وہاں انسان ازل سے فطرت کے خلاف، اسے تسخیر کرنے کے لیے جو جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ ناول اس کا عظیم ترین اظہار ہے۔ یہ انسانی انتقام کی بھی داستان ہے۔ جو دراصل فطرت کے قوی اور ظالم مظاہر کو مسخر کرنے کا ایک استعارہ بنتا ہے۔!

میں ہمنگوے کا بڑا مداح ہوں لیکن اس کا ناول "اولڈ مین اینڈ دی سی" OLD MAN AND THE SEA اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود موبی ڈک کے مقابلے میں ایک چھوٹا ناول ہے۔ محمد حسن عسکری نے تو اس کا ذکر یہ کہہ کر ختم کر دیا تھا کہ اس میں سے "لوبے یونیسکو کی آمیز

لیکن مجھے اس ناول کے حوالے سے جو کچھ پڑھنے کا موقع ملا اس کے اندر بطور خاص "موبی ڈک" کے حوالے سے میں نے "بوڑھا اور سمندر" کو موبی ڈک کے مقابلے میں بہت چھوٹا فن پارہ سمجھتا ہوں۔ یہ ذکر اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ جس زمانے میں یہ ناول شائع ہوا اور اسے مقبولیت حاصل ہوئی اس کے کچھ عرصے بعد "لائف" میں ایک باتصویر فیچر شائع ہوا اس میں بتایا گیا تھا کہ ہیمنگوے کے اس ناول کا بوڑھا۔ زندہ ہے اور ہیمنگوے نے اس کی کہانی اس سے سن کر لکھ ڈالی تھی۔ خیر یہ تو ایک اور بات ہوئی۔ اس کی وجہ سے ہیمنگوے کے اس ناول میں جو سمندر پیش کیا گیا ہے اور تمام وسعت اور بیان کی جزئیات کے باوجود موبی ڈک کے سمندر کے سامنے ایک ندی دکھائی دیتا ہے۔

موبی ڈک میں ایک طرف وسیع و عریض لامحدود، بیکراں سمندر ہے دوسری طرف اس سمندر میں آزاد پھرنے والی وہیل مچھلی۔ موبی ڈک ہے اور ان کے مقابلے میں کپتان آہاب ہے۔ ایک آدمی ...!

یہ آدمی کپتان آہاب — بے پایاں عزم و ہمت کا مالک ہے۔ انتقام نے اسے جنون بنا دیا ہے۔ سمندر کے ایک سفر میں ایک وہیل مچھلی نے مقابلے میں اس کی ٹانگ چبا ڈالی اب وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ زندہ اور کھڑا ہے اس ٹانگ میں بھی وہیل مچھلی کے بعض اجزا شامل ہیں وہ اس وہیل مچھلی موبی ڈک سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے زندہ ہے۔ یہی اس کا مقصدِ حیات ہے۔ یہ کپتان آہاب ایک عظیم ہیرو ہے۔ اس کی تراش خراش، اس کا بے پایاں عزم، اس کا جنون اس کی شخصیت اور پھر سمندر اور موبی ڈک کے ساتھ اس کی جنگ اور اس جنگ میں اس کی ہلاکت۔ اسے عظیم یونانی المیے کا ہیرو بنا دیتے ہیں۔

وہ ایسا دیوتا ہے جو آدمی ہے۔!!

اس ناول کا راوی اسماعیل ہے۔ وہ بے کار ہے۔ وہ ہمیں اس دور کے امریکہ کی سیر کراتا ہے۔ دیہی اور عوامی زندگی کے مناظر پیش کرتا ہے۔ وہ ہمیں ملاحوں کے حالات، عادات اور نفسیات سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ ہمیں پوری تفصیل سے بتاتا ہے کہ جہاز جس پر وہ ملازم

ہوا کیسے روانہ ہوا اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو اس جہاز میں سوار ہر شخص مر چکا ہے۔ سوائے اس کے۔ جو یہ رزمیہ سنانے کے لیے زندہ بچ گیا ہے۔

میلول کے اس عظیم اور لافانی ناول کے بعض ٹکڑوں کو پیش کر رہا ہوں۔ ترجمہ محمد حسن عسکری مرحوم کا ہے کہ میرے خیال میں اردو میں اس ناول کا ترجمہ ان سے بہتر نہ کوئی کر سکتا تھا اور نہ ہی کر پائے گا۔

"موبی ڈک" سے کچھ اقتباسات

٭۔ ہاں یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ پانی اور غور و فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

٭۔ ذرا یہ تو بتائیے کہ غلام کون نہیں ہوتا۔ بڈھے کپتان مجھ پر کتنا ہی حکم چلائیں اور میری کتنی ہی ٹھکائی کریں لیکن مجھے یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ سب ٹھیک ہی تو ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ آدمی پر ہی گذرتی ہے۔ جسمانی طریقے سے مابعد الطبیعیاتی طریقے سے سہی ساری کائنات میں جدھر دیکھو یہی ٹھکائی چل رہی ہے۔

٭۔ جہاں تک امیر آدمی کا تعلق ہے تو منجمد آبوں کے برفانی محل میں شہنشاہوں کی طرح رہتا ہے۔ شراب خوری کے خلاف اس نے ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ جس کا وہ صدر ہے چنانچہ وہ یتیموں کے شیر گرم آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں پیتا۔

٭۔ قہقہہ بڑے غضب کی چیز ہے اور بعید سے نادر و کمیاب۔ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جو بھی پر دوسرے کھل کھلا کے ہنس پڑیں تو یقین مانیے وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔

٭۔ عقیدہ گیدڑ کی طرح قبروں پر پلتا ہے اور بڑے سے بڑے شکوک و شبہات سے بھی نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔

٭۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں جس چیز کو میرا سایہ کہا جاتا ہے۔ وہی میرا اصلی وجود ہے میرا خیال ہے کہ ہم لوگ روحانی حقیقتوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح مچھلیاں پانی کے اندر سورج کو دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ پانی کی موٹی سی چادر ہوا کی طرح ہلکی ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ میرا جسم میرے اعلیٰ تر وجود کی نپٹ ہے۔

٭۔ دنیا ایک جہاز ہے جو سمندر میں چل رہا ہے اور جس کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا۔

٭۔ شاید سچا فلسفی وہی ہے جسے معلوم نہ ہو کہ میں فلسفیانہ قسم کی زندگی بسر کرتا ہوں جب میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلسفی کہتا ہے تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ اس بڑھیا کی طرح جس کا معدہ کمزور تھا۔ اس شخص کی بھی ہاضمے کی مشین ٹوٹ گئی ہوگی۔

٭۔ آنکھیں بند کیے بغیر آدمی کو اپنی حالت کا احساس ٹھیک طرح نہیں ہوتا ہمارے اندر جو حصہ میں کا ہے اسے تو روشنی مرغوب ہے لیکن ہمارے اصل جوہر کے لیے تاریکی وہی چیز ہے جو مچھلی کے لیے پانی۔

٭۔ جب تک آدمی مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی اور قتل یا ذلیل نہ کرے مجھے کسی کے مذہب پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

٭۔ انسان ایک تصور کی حیثیت سے ایک بلند اور تابناک چیز ہے۔

٭۔ انسان کا اصلی وقار آپ کو اس بازو میں نظر آئے گا جو پھاوڑا چلاتا ہے یا ہتھوڑا اُٹھاتا ہے وہ جمہوری وقار جس کا منبع خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ جمہوریت کا مرکز اور محیط وہی قادر مطلق ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور یہی چیز ہماری مساوات کی ضامن ہے اور اسے علویت بخشتی ہے لہٰذا اگر میں حقیر جہازیوں، مرتدوں اور جلاوطنوں میں تاریک اور پراسرار لیکن نہایت بلند صفات دکھاؤں۔ ان کی زندگی میں المیہ کا سا جلال اور حسن پیدا کردوں۔ اگر ان میں سے کوئی انتہائی مغزدہ بلکہ انتہائی ذلیل شخص بعض اوقات روحانی بلندیوں پر جا پہنچے اگر میں کسی خلاصی کے بازو کو آسمانی نور میں نہلا دوں۔ اگر میں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اندوہناک تاریکی میں ایک قوس وقزح روشن کردوں تو اسے مساوات کی روح جس نے میرے سارے ہم جنسوں کو انسانیت کی ایک ہی خلعت بخشی ہے۔ تمام نقادوں کے مقابلے میں میری گواہ رہیو۔ اے جمہوریت پسند تو میرا گواہ رہیو۔

٭۔ دنیا میں جتنے آلات ہیں ان میں انسان سب سے جلدی خراب ہوتا ہے۔

٭ ۔ اس عجیب و غریب ملغوبے یعنی زندگی میں انوکھے مواقعے ایسے بھی آتے ہیں کہ جب آدمی کو یہ ساری کائنات ایک بہت بڑا مذاق معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ اس کی ظرافت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس مذاق کا نشانہ خود میں ہوں ۔

٭ ۔ ہم جن پُر اسرار چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں باوجود قربت کبھی نہ کبھی یہ اتفاق کے دل میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس دنیا کے گرد تعاقب کرتے ہوئے ہم یا تو کسی ویران ، کسی بھول بھلیوں میں جا پہنچتے ہیں یا راستے میں ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں ۔

٭ ۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ بڑی باقاعدگی سے بے قاعدگی برتی جائے ۔

٭ ۔ جو لوگ دنیا سے کہتے ہیں کہ ہماری گتھی سلجھا دو۔ ان کے لیے تکلیف تو بہت ہے اور فائدہ کم ۔ یہ خود اپنی گتھی تو سلجھا نہیں سکتی ۔

٭ ۔ اکثر سننے میں آیا ہے کہ موضوع چاہے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو لیکن جب یہ پھیلنا شروع ہوتا ہے تو بعض میں اس کے ساتھ ساتھ بلندی اور وسعت آتی چلی جاتی ہے اگر موضوع بڑا ہو تو وہ ہر چیز کو بڑا کر کے رکھ دے ۔ ہم بھی پھیل کر اتنے ہی بڑے ہو جاتے ہیں جتنا ہمارا موضوع عظیم کتاب لکھنے کے لیے موضوع بھی عظیم ہی چننا چاہیے ۔ چھچھڑی کے متعلق کوئی عظیم اور دیرپا کتاب نہیں لکھی جا سکتی چاہے بہت سے لوگوں نے اس کی کوشش کی ہو ۔

٭ ۔ دنیا کی بڑی سے بڑی خوشیوں کے اندر ایک طرح کا بے معنی چھوٹا پن موجود رہتا ہے ۔ لیکن تمام گہرے غموں کی تہہ میں ایک پُر اسرار معنویت ملتی ہے ۔ بلکہ بعض آدمیوں میں تو فرشتوں کی سی شان ہوتی ہے ۔ چنانچہ دکھوں کی نشانیاں دیکھ کر صرف یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے ۔ انسانی مصائب کے شجرہ نسب کا مطالعہ کرتے کرتے ہم آخر کار دیوتاؤں کے شجرہ نسب پر جا پہنچتے ہیں ۔ لہٰذا ہنستے کھلکھلاتے سورج اور نغمہ ریز چاند کے سامنے کھڑے ہو کر بھی ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ دیوتا تک خوش نہیں رہتے ۔ انسان کی پیدائش کے وقت سے جو دکھ ، اور غمناک داغ موجود ہے ۔ وہ داغ لگانے والوں کے غم کی نشانی ہے ۔

٭ ـ انسان کے اندر جو واقعی حیرت انگیز اور ہیبت ناک عناصر ہیں وہ آج تک الفاظ یا کتابوں میں بیان نہیں ہوئے۔ موت جب قریب آتی ہے تو سب لوگ برابر ہو جاتے ہیں۔ اور سب کے اوپر وہی ایک راز منکشف ہوتا ہے جس کا حال کوئی ۔ مُردوں کی دنیا کا مصنّف ہی بتائے تو بتائے۔ !

٭ مہذب آدمی بیمار پڑے تو اُسے اچھے ہونے میں چھ مہینے لگتے ہیں۔ جنگلی بیمار ہو تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔

٭ ـ میں تجھے پوجتا ہوں اور تجھ سے لڑتا بھی ہوں۔

٭ ـ جتنی چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں وہ سب بے جسم ہوتی ہیں۔

٭ ـ میری سب سے زیادہ عظمت میرے سب سے بڑے غم کے اندر پنہاں ہے۔

گلیورز ٹریولز

دنیا میں آج کوئی ایسا تعلیم یافتہ لڑکا یا مرد ہوگا جو کسی نہ کسی "گلیورز" اور "للی پٹین" سے واقف نہ ہو آج یہ نام دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور ان کو علامتوں اور استعاروں کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے (اگرچہ ڈاکٹر جانسن نے سوئفٹ پر یہ پھبتی کسی تھی کہ سوئفٹ استعارے سے خوف کھاتا ہے۔)

گلیورز ٹریولز ایک ایسی طنزیہ اور مزاحیہ کتاب ہے جو ہر ملک میں پچھلی ڈھائی صدیوں سے پڑھی جا رہی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اسے فلم اور ٹی وی کے لیے بار بار فلمایا گیا ہے۔ اسے کارٹونوں اور السٹریشنوں کی صورت میں ساری دنیا میں بار بار شائع کیا گیا ہے اور وہ ممالک جہاں کسی کتاب کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی "گلیورز ٹریولز" کو دلچسپی سے پڑھا اور اپنایا گیا۔ سیاست کی دنیا میں صدیوں سے اس کے کرداروں کے حوالے سے سیاسی اصطلاحات وضع ہوئیں جو آج بھی ساری دنیا میں رائج ہیں۔ ان کو سن کر اگر سوئفٹ کی اس بے مثل کتاب کی طرف دھیان نہ بھی جائے تو ان اصطلاحوں کا پورا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے اور سننے پڑھنے والا حظ اٹھاتا ہے۔

وہ شخص جس نے یہ عظیم ترین کتاب تخلیق کی وہ خود بھی ایک انوکھا شخص تھا، بہت نک چڑھا، بہت منہ پھٹ اور دوسروں کی اہانت کر کے دلی خوشی محسوس کرنے والا۔ فرنیڈ کولمین نے سوئفٹ کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ کیونکہ کولمین نے سوئفٹ کی بے مثل طنز کا سرچشمہ اس کی اپنی ذات کو قرار دیا ہے اور ان محرومیوں اور تشنہ کامیوں کو اس کا سبب

قرار دیا ہے جس سے سوئفٹ ساری عمر دوچار رہا۔

سوئفٹ کا المیہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف انسان کو حقیر سمجھتا تھا بلکہ اس کی تذلیل کر کے بھی خوش ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عظمتوں کے باوجود انگریزی ادب کا سب سے بدتر اور ناپسندیدہ لکھنے والا سمجھا گیا لیکن یہ ردِعمل اس کے ذاتی رجحانات اور رویوں کی پیداوار تھا جہاں تک "گلیورز ٹریولز" کا تعلق ہے اس کتاب کو صدیوں سے انسان نے چاہا اور دل میں بسایا ہے۔

وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جو اپنی فیاضی، نرم دلی اور خوش خلقی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا لیکن جو نا تھی، سوئفٹ پر اپنے خاندان کی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی۔ سوئفٹ ۳۰ نومبر ۱۶۶۷ء کو ڈبلن (آئرلینڈ) میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین آئرش نہیں بلکہ انگریز تھے۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کا باپ مر چکا تھا۔ بچپن سے ہی اس نے ناداری اور غربت کا بھیانک اور خوفناک چہرہ دیکھا پھر اس کے رشتہ داروں نے بھی اس خاندان کے ساتھ جو سلوک کیا اس نے بچپن میں سوئفٹ کی زندگی میں تلخی اور کڑواہٹ بھر دی۔ پہلے وہ کاسکنی سکول میں پڑھا پھر ڈبلن کے ٹرینیٹی کالج میں حصول علم کے لیے داخل ہوا۔ وہ کم آمیز طالب علم تھا وہ خود بہت سست اور لاتعلق واقع ہوا تھا اس کی والدہ نے کوشش کی اور یوں سوئفٹ کو سر ولیم ٹمپل کے ہاں سیکرٹری قسم کی ایک ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران وہ پادری بننے کے لیے دینی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۲۷ برس کی عمر میں وہ پادری بن گیا لیکن یہ کام اس نے دو برس تک کیا اور اسے چھوڑ کر پھر سر ولیم کے ہاں ملازمت کرنے چلا آیا۔ ۱۶۹۸ء تک اس نے یہیں وقت گزارا جب سر ولیم ٹمپل کا انتقال ہوا تو پھر ملازمت خود بخود ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے آئرلینڈ کے مختلف گرجوں میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۷۱۳ء سے اپنی موت تک وہ لارڈ برکلے کی سفارش سے ڈبلن میں سینٹ پیٹرک گرجے میں ڈین کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس گرجے کے ساتھ اس کی وابستگی کی وجہ سے اس گرجے کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ سوئفٹ کی کئی نظمیں اور نثری تحریریں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں اس کی ایک تحریر "دی ٹیل آف اے ٹب" ایسی تھی۔ جس نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی اور لوگ اسے ایک

طنز نگار کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج بھی بعض نقاد اس کی اس تخلیق کو اس کا شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔

سوئفٹ کو اپنی زندگی میں سیاست سے بڑی دل چسپی رہی۔ اس دل چسپی کا بین ثبوت اس کے شاہکار گلیورز ٹریولز سے بھی ملتا ہے۔ اس نے ٹوری پارٹی سے ناطہ جوڑا اور مخالف ووگ پارٹی کے خلاف طنز و مزاح کے تیر برسانے شروع کر دیے اس کی یہ سیاسی اور ہنگامی طنزیہ تحریریں اس دور میں تو بہت مقبول ہوئیں لیکن آج ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی کے طالب علم بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جب ملکہ این کا انتقال ہوا اور ٹوری پارٹی کا زور ٹوٹا تو پھر سوئفٹ کی سیاسی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ لیکن اب اس نے آئرش کاز میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور انگریز ہونے کے باوجود آئرلینڈ کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو گیا۔ اس نے اپنے تیز و ترش قلم سے پھر طنزیہ سیاسی تحریریں لکھنی شروع کر دیں۔

"WOODS COPPER COINAGE" کی ترکیب اسی زمانے میں سوئفٹ نے ایک مضمون میں وضع کی تھی۔ جسے آج عالمگیر شہرت حاصل ہے اپنی اُن سرگرمیوں اور تحریروں کی وجہ سے وہ ایک ہیرو کی حیثیت سے خاصا مقبول رہا۔

سوئفٹ نے ساری عمر شادی نہیں کی لیکن اس کے دو معاشقوں کا سراغ ملتا ہے۔ سٹیلا اور وینسا۔ دونوں خواتین باری باری اس کی زندگی میں آئیں۔ اس نے ان سے محبت کی لیکن وہ دراصل بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ دونوں خواتین اس کے سلوک سے نالاں ہوئیں اور اس کی زندگی سے نکل گئیں۔ وہ ان کے ساتھ بھی بڑی حقارت اور تذلیل سے پیش آتا تھا۔

سوئفٹ ایک نفسیاتی مریض تھا اور بعد میں خود اپنے لیے ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ بن گیا وہ دنیا سے شدید نفرت کرتا تھا۔ انسان اور دنیا کا ذکر حقارت اور تلخی کے بغیر اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ وہ دماغی طور پر بیمار تھا۔ یہی مرض پاگل پن کا سبب بنا۔ اس کی زندگی میں ایک ہی خوشی آئی اور وہ تھی "گلیورز ٹریولز" کی اشاعت اور اس کی مقبولیت، جو نا تھن سوئفٹ

دنیا کے بے مثل طنز نگار اور عالمی ادب کے ایک بے مثل شاہکار کے خالق کا انتقال مرض دیوانگی میں ۱۹ اکتوبر ۱۷۴۵ء کو ڈبلن میں ہوا۔ جہاں وہ کئی برسوں سے دیوانگی کے علاج کی وجہ سے ڈاکٹروں کی نگرانی میں تھا۔

گلیورز ٹریولز

دنیا میں جو مزاح اور طنز نگار ہوئے ہیں ان کے بارے میں جب لکھا جاتا ہے تو مزاح اور طنز دونوں صفات کو یکجا کر دیا جاتا ہے ایسے لکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں جنہیں خالص طنز نگار کہا جا سکتا ہو۔ سوئفٹ کا شمار ایسے ہی معدودے چند لکھنے والوں میں ہوتا ہے اگرچہ والٹیئر کو اس کی تخلیقات ناپسند تھیں تاہم سوئفٹ کا شمار عالمی ادب کے چند بڑے بڑے طنز نگاروں میں ہوتا ہے اور انگریزی زبان میں تو اس کا کوئی ثانی مشکل سے ہی ملتا ہے۔

اس کا اسلوب بے حد رمزیہ اور سادہ تھا اس کا قلم "تیزی سے بھاگتا اور قہقہے نہیں لگاتا تھا" بلکہ اس کا قلم زہر اگلتا تھا۔ طنز کا زہر۔ وہ طنز پیدا کرنے کے لیے پھکڑپن سے کام نہ لیتا۔ نہ ہی اس کی تلخی سستے جذبات کی پیدا وار تھی۔

عالمی ادب کا یہ شاہکار "گلیورز ٹریولز" جس کی بدولت سوئفٹ کو لازوال شہرت ملی ہے ۱۷۲۶ء میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے لیے سوئفٹ خود لندن گیا۔

"گلیورز ٹریولز" دنیا کے ادب کا عجیب اور منفرد شاہکار ہے۔ اس عظیم طنزیہ شاہکار کو ہر عمر کے انسانوں نے پڑھا اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ ایک سادہ دلچسپ اور دل میں اُتر جانے والی کہانی کی وجہ سے اسے چھوٹے بچوں نے بھی پڑھا پھر سکول کے طالب علموں نے بھی اور عالم و فاضل حضرات نے بھی اسے پسند کیا اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والوں کی کسوٹی پر بھی یہ شاہکار معیاری اور عظیم ثابت ہوا۔ "گلیورز ٹریولز" نہ صرف بچوں، لڑکوں بلکہ بڑوں کا بھی پسندیدہ شہکار رہے۔ عالمی ادب میں چند ہی ایسے کردار تخلیق ہوئے ہیں جنہیں لازوال زندگی ملی ہے۔ ایسے کرداروں میں سوئفٹ کا کردار گلیورز بہت نمایاں ہے۔

گیرالڈ سمتھ نے "گلیورز ٹریولز" کی کومنٹری لکھی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ دراصل اس طنزیہ شاہکار کے حوالے سے سوئفٹ نے اپنے عہد کی سیاسی صورت حال پر طنز کی ہے اس میں بادشاہ جارج اول اس کے دربار اور نیوٹن پر جو طنز کی گئی ہے وہ بہت کاری اور مؤثر ہے لیکن "گلیورز ٹریولز" کا اس پہلو سے مطالعہ مخصوص افراد کے لیے ہے۔ اس کی عالمی اور آفاقی اپیل کی وجوہات سے کتاب کی وہ صفحات ہیں جو ہر انسان کے لیے کشش رکھتی ہیں دانش و عقل اور جہالت میں جو تضاد ہے وہ اس کتاب میں بہت نمایاں ہے۔ جانوروں اور انسانوں کی دنیا کا تضاد اور پھر انسان کے اندر جو خامیاں کمزور اور بدیاں ہیں ان کو اس کتاب میں انتہائی نقطے تک پیش کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے سر والٹر سکاٹ نے "گلیورز ٹریولز" کے بارے میں رائے دی تھی "SEVERE, UNJUST AND DEGRADING" لیکن اسے کیا کہیئے کے یہ منفرد اسلوب کا شاہکار ہے۔ اس میں رمزو کنایے کا استعمال اتنا حسین اور موثر ہے کہ بہت کم عالمی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس میں قوت متخیلہ اتنی خوب صورت، بھرپور اور وسیع ہے کہ پڑھنے والا اس دنیا میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

"گلیورز ٹریولز" سوئفٹ کا ہی نہیں عالمی ادب کا شاہکار ہے۔

کونٹ آف مانٹی کرسٹو

ایڈمنڈ ڈینٹز۔ غلام قادر فصیح اور موتیوں کا جزیرہ۔

ان تین ناموں سے ایک لڑی بنتی ہے۔ ایک نام یاد آئے تو اس کے ساتھ دوسرے دو نام بھی فی الفور یاد آجاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ زمانہ جو اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ انسان زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور ماضی کے نشان زیادہ تر مٹاتا چلا جاتا ہے یا وہ امتدادِ زمانہ سے خود مٹتے چلے جاتے ہیں لیکن بعض یادیں، بعض کیفیات، بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان کا حافظہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔

ایڈمنڈ ڈینٹز، موتیوں کا جزیرہ اور غلام قادر فصیح میری روح میں رچے بسے ہیں۔

عمرِ عزیز کی پانچویں دہائی میں داخل ہونے کے ساتھ جب میں اپنی عمر کی دوسری دہائی کے ابتدائی برسوں کو یاد کرتا ہوں تو مجھے یہ تینوں نام یاد آجاتے ہیں۔

ایڈمنڈ ڈینٹز۔ الیگزنڈر ڈوما کے مشہورِ عالم ناول "کونٹ آف مانٹی کرسٹو" کا ہیرو ہے۔ جب میں اپنی عمر کی دوسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں تھا تو میں نے ایک ناول پڑھا۔ موتیوں کا جزیرہ، یہ ایک ضخیم ترجمہ تھا۔ بلاشبہ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل۔ اس کے مترجم غلام قادر فصیح کا نام میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہی ڈوما کے اس شہکار کے مترجم تھے۔ اس کئی سو صفحات پر مشتمل ناول کو میں نے لڑکپن میں پڑھا اور یہ میرے دل پر نقش ہو گیا۔

مجھے یاد ہے کہ موتیوں کا جزیرہ پڑھنے کے بہت برس بعد جیسا پہلی بار مجھے الیگزنڈر ڈوما

کا یہ ناول انگریزی میں دکھائی دیا تو ہمیں کسی ندیدے اور بھوکے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ یہ ضخیم ناول میں نے دو دنوں میں پڑھ ڈالا اور غلام قادر نصیح نے اس کا جو ترجمہ کیا تھا۔ اب بھی اس کا ذائقہ میں محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس وہ ترجمہ نہیں۔ اگر اب میں اسے پڑھوں تو یقیناً اس کے ترجمے کے معیار پر کچھ بات کر سکتا ہوں انگریزی میں اسے میں نے کئی بار پڑھا اور کئی مترجموں کے ترجمے نظر سے گزرے ہیں۔

"کونٹ آف مانٹی کرسٹو" کا شمار دنیا کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس میں انسانی فطرت اور زندگی کی تفسیر ایسے انداز میں بیان کی گئی ہے کہ جس نے اسے ایک بار پڑھا وہ اس کے کرداروں کے سحر اور تاثر سے کبھی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا۔ پاکستان میں اس ناول پر مبنی دو مختلف فلمیں دیکھ چکا ہوں اسے بی بی سی ٹی وی نے تمثیل کی صورت میں پیش کیا۔

اپنی اشاعت کے سال سے اب تک یہ ناول دنیا میں پڑھا جاتا رہا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ ایک زمانے میں اس کا ایک حصہ ڈرامے کی صورت میں ہمارے انگریزی نصاب میں بھی شامل رہا۔

الیگزینڈر ڈوما کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا ایک دوسرا ناول "تھری مسکیٹیرز" (THREE MUSKETEERS) بھی ان ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہیں ہر دور میں پڑھا گیا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں "کونٹ آف مانٹی کرسٹو" اور "تھری مسکیٹیرز" میں ڈوما کا اسلوب عمدہ ہے۔ انسانی فطرت کے ساتھ اس کی شناسائی اتنی گہری ہے کہ بہت سے ناقابل یقین عناصر کو اس نے حقیقت کا روپ بخش دیا ہے۔

الیگزینڈر ڈوما ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد فرینچ ری پبلک میں ایک جرنیل تھا۔ ڈوما کا دادا ایک مارکوئیس اور دادی ایک حبشن تھی۔ ڈوما کے گھنے بال اور موٹے ہونٹ اس کے آبا ؤ اجداد کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کی فطرت میں جو انتہا پسندی اور اشتعال تھا اس سے بھی اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا سراغ ملتا تھا۔

۲۴ر جولائی ۱۸۰۲ء کو ویلرز کوٹرز میں پیدا ہونے والے الیگزینڈر ڈوما کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہوگیا وہ باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہ کرسکا۔ ۲۰ برس کی عمر میں اس نے پیرس کا رُخ اس حالت میں کیا کہ اس کا کل اثاثہ بیس فرانک تھے۔ پیرس میں اسے طالع آزمائی میں کامیابی حاصل ہوئی اور اسے ملازمت مل گئی۔

۱۸۲۶ء میں وہ ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آیا اس کی پہلی تصنیف کا نام ناولا (NOUVELEE) تھا۔ ۱۸۲۹ء میں اس نے ہنری سوئم کے نام سے ایک تاریخی کھیل لکھا۔ اس کھیل نے اس کی شہرت کو بام عروج تک پہنچادیا۔ اس اعتبار سے اس کھیل کی حیران کن اور سنسنی خیز کامیابی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس دور میں جو ڈرامے کھیلے جاتے تھے وہ رومانی ہوتے تھے۔ رومانویت کا گہرا اثر اس دور کے فرانسیسی سٹیج پر تھا۔ اپنی اس بے مثل کامیابی کے زمانے میں بھی ڈوما ڈیوک آرلینز کا ہی ملازم تھا جس نے اس کی کامیابی سے خوش ہوکر اس کی معمولی ملازمت کو ترقی دے کر اپنا لائبریرین مقرر کردیا۔

ڈوما بڑا سیانا آدمی تھا۔ اس نے اپنی اس مقبولیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عمائدین بارسوخ اور اکابرین سے تعلقات قائم کیے۔ اور اس سے مالی فوائد حاصل کیے۔

۱۸۴۶ء میں ڈوما نے ڈیوک ڈی مونسٹپیئر کے ساتھ سپین اور افریقہ کا سفر کیا۔ اس سیاحت کے زمانے میں اس نے خوب خرچ کیا۔ واپس آیا تو مالی حالت خراب ہوچکی تھی۔ اسے عیش وعشرت اور ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے کی عادت ہوچکی تھی۔ اسلئے اپنے معیار زیست کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے پیرس میں اپنا تھیٹر قائم کیا۔

وہ طالع آزما تھا۔ اس نے سیاسی شعبے میں بھی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن ناکام رہا۔ فرانس کے لوگ اسے بطور سیاسی رہنما تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ البتہ بطور مصنف اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے اخراجات اس کی آمدنی کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے مالی پریشانیوں میں پھنس کر وہ بلجیم چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گیری بالڈی کا مداح بن چکا تھا جو اس وقت

تک مسلسل فتح کر چکا تھا۔ گیری بالڈی کی امداد کے لیے اس نے فرانسیسی عوام سے عطیات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

وہ کاہل اور سست الوجود ہو چکا تھا۔ دنیائے ادب میں وہ پہلا بڑا لکھنے والا ہے جس نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ اور اس کے زمانے سے وہ اصطلاح رائج ہوئی جسے GHOST WRITER کہتے ہیں۔ ڈوما نادار حاجت مند اور غریب مصنفوں کی خدمات حاصل کر کے ان کو اپنے ناولوں اور تخلیقات کا خاکہ تفصیل سے بتا دیتا۔ اس کے بعد یہ لوگ لکھنے کا کام کرتے لیکن ان مسودوں پر نظر ثانی وہ خود کرتا اور ان میں سسپنس اور ڈرامہ بھی خود ہی پیدا کرتا۔ اگرچہ اس نے ضرورت مند لکھنے والوں کا استحصال کیا لیکن اس سے ڈوما کی مخصوص صلاحیتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ اپنے ہر ناول کا خالق خود تھا اور اسے خود ہی آخری اور حتمی شکل دیتا تھا۔

کہانی بیان کرنے میں اسے جو صلاحیت حاصل تھی وہ بہت کم لکھنے والوں کو ودیعت ہوئی ہے۔

ڈوما جس طرح اپنے ناولوں میں کسی خاص آئیڈیل کو سامنے رکھتا ہوا نہیں ملتا اسی طرح اس نے اپنی زندگی بھی گزاری۔ اس پر بہت الزامات عائد ہوئے لیکن اس نے اپنی زندگی کا چلن نہ بدلا۔ اپنے دور کی حسیناؤں سے اس کے تعلقات کی داستانیں رسوائیاں بھی بنتی ہیں اور تذلیل آمیز قصے بھی۔ لیکن ڈوما کو اس سے کچھ غرض نہ رہی۔ وہ اپنے انداز میں زندگی بسر کرتا رہا۔

ڈوما کے قارئین کو اس کا احساس ہوگا کہ وہ اپنے ناولوں میں خوب صورت مکالموں سے کتنا کام لیتا تھا۔ اس کے ہاں مناظر کی تفصیل پر زور نہیں ملتا، بلکہ وہ یہ کام بھی مکالموں سے نکالتا ہے۔

اس کا پہلا تاریخی ناول "ازابیل ڈی بیوائر" تھا۔ اسی ناول نے اسے تحریک بخشی کہ وہ فرانس کی پوری تاریخ کو ناولوں میں قلم بند کرے اس کا یہ منصوبہ "کرانیکل آف فرانس" کی صورت میں سامنے آیا۔ جسے بعض نقاد اس کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اس

کا یہ عظیم و ضخیم کام سولہ ناولوں پر مشتمل ہے۔

وہ ساری عمر مقروض رہا لیکن اپنی زندگی کی طرز نہ بدل سکا۔ اس کے خلاف مقدمے دائر کئے گئے۔ لیکن وہ اپنی طرز حیات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکا۔ اس نے اپنے لیے ایک محل نما حویلی تعمیر کرائی جہاں وہ زندگی کے دھندوں اور مشاغل سے آزاد ہو کر اپنی عمر کے آخری برس بسر کرنے کا خواہاں تھا لیکن اس کا یہ خواب پورا نہ ہوا۔ آخری عمر میں وہ ایک بیمار اور نادار بوڑھا تھا۔ اس کا بیٹا جو خود ایک ممتاز مصنف اور مشہور ڈرامے CAMILLE کا خالق تھا۔ وہ اپنے نامور لیکن نادار باپ کو زندگی کے آخری ایام میں DIUPPE لے گیا جہاں ۵ دسمبر ۱۸۷۰ء کو الیگزینڈر ڈوما کا انتقال ہوا۔

ڈوما اگر غیر معتدل زندگی نہ گذارتا تو اس کا انجام مختلف ہوتا۔ اسی طرح وہ اگر غیر معتدل لکھنے والا نہ ہوتا تو اس پر لگائے گئے الزامات سے اس کا دامن پاک ہوتا۔ اس کے باوجود وہ دنیا کے بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے مصنفوں میں سے ایک ہے۔ اس کے دو ناولوں "کونٹ آف مانٹی کرسٹو" اور "تھری مسکیٹیرز" میں ایسی تاثیر ہے کہ آنے والے ہر دور کا قاری بھی ان میں دلچسپی لے گا۔

کونٹ آف مانٹی کرسٹو

ایک بڑا اور ضخیم ناول ہے۔

اس کا ہیرو ایک خوب صورت نوجوان ہے جو ملاح ہے اس کا نام ایڈمنڈ ڈینٹز ہے اس کا باپ بوڑھا اور بیمار ہے۔ اس کی ایک محبوبہ ہے جسے وہ جی جان سے چاہتا ہے۔ ایک بحری سفر کے دوران میں اس جہاز کا کپتان مر جاتا ہے جس پر ایڈمنڈ ڈینٹز میٹ کے عہدے پر فائز ہے۔ مرتے ہوئے کپتان کی خواہش پوری کرتے ہوئے وہ اس کا ایک خفیہ پیغام ایک شخص کو پہنچاتا ہے جس کی خبر اس کے حاسدوں کو ہو جاتی ہے۔

فرانس کی تاریخ کا یہ وہ دور ہے جب نپولین اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کے حلیفوں اور ساتھیوں کو ملک دشمن سمجھا جاتا ہے۔ ایڈمنڈ ڈینٹز واپس ساحل پر آتا

ہے تو جہاز راں کمپنی کا مالک جو اسے بہت چاہتا ہے اسے جہاز کا کپتان بنا دیتا ہے ایڈمنڈ ڈینٹیز کو اپنے بوڑھے باپ سے بے حد محبت ہے۔ وہ ایک نیک شعار فرزند ہے وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے حاسد اس کے خلاف ایک سازش کا جال بنتے ہیں اور نپولین کا حامی اور باغی ہونے کا الزام لگا کر عین اس روز گرفتار کروا دیتے ہیں جس روز اس کی شادی ہونے والی تھی۔

ایڈمنڈ ڈینٹیز کو زندان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ مجسٹریٹ جو اسے سزا دیتا ہے۔ وہ اسی انقلابی اور حکومت کو مطلوب باغی کا باپ ہے۔ جس کے پاس ایڈمنڈ ڈینٹیز اپنے کپتان کا پیغام لے کر گیا تھا۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ اس کا راز فاش نہ ہو۔ حکومت کو معلوم نہ ہو کہ اس کا باپ حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہے وہ سارا ملبہ ایڈمنڈ ڈینٹیز پر ڈال دیتا ہے جو زندان میں پڑا سڑ رہا ہے۔

یہاں ایڈمنڈ ڈینٹیز کی ملاقات ایک بوڑھے عالم سے ہوتی ہے جو جیل سے فرار ہونے کے لیے برسوں سے سرنگ کھود رہا ہے لیکن یہ سرنگ ایڈمنڈ ڈینٹیز کی کوٹھڑی میں نکلتی ہے۔ یہ عالم ایڈمنڈ ڈینٹیز کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ وہ اسے علم سے بہرہ ور کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ انسان کا دنیا میں کیا مقام ہے اور انسانی جذبات میں انتقام کا جذبہ قوی ترین جذبہ ہے۔

جب اس بوڑھے کی موت واقع ہوتی ہے تو وہ ایڈمنڈ ڈینٹیز کو مانٹی کرسٹو کے عظیم خزانے کا راز بتا چکا ہے۔ ایڈمنڈ ڈینٹیز بوڑھے کی لاش کو کوٹھڑی میں رکھ کر خود اس کی جگہ "مردہ" بن جاتا ہے۔ جیل کے حکام اس کو لاش سمجھ کر جزیرے سے باہر سمندر میں میں پھینک دیتے ہیں۔ اب وہ آزاد ہے۔ وہ مانٹی کرسٹو کے جزیرے میں پہنچتا ہے اور وہاں وہ خزانہ تلاش کر کے اس جزیرے کو خرید کر کونٹ آف مانٹی کرسٹو بن جاتا ہے۔

اس کی دولت اس کے اثر و رسوخ اس کی ذہانت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ حیران کن شخص ہے۔ بوڑھے عالم نے اسے علم اور دولت کا بے بہا خزانہ بخشا تھا اب وہ اس منافق اعلیٰ سوسائٹی سے انتقام لیتا ہے جو "مہذب" کہلاتی ہے لیکن اسے کوڑھ

ہو چکا ہے اور اپنے کوڑھ کو اس نے ریشمی اور قیمتی لباس میں چھپا رکھا ہے۔

وہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو مظلوم ہیں۔ ان کے لیے اس کی دولت حاضر ہے جنہوں نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک کیا تھا۔ جب وہ برس ہا برس جیل میں سڑ رہا تھا تو اس کا باپ کسمپرسی کے عالم میں مر گیا۔ اس کی محبوبہ نے شادی کر لی تھی۔ اس کے حاسد اور دشمن اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو چکے تھے لیکن وہ ان سب سے ٹکر لینے کا حوصلہ اور وسائل رکھتا ہے۔ اس کی دولت، اس کی پر اسرار شخصیت، اس کی بے پناہ ذہانت مجسمۂ انتقام بن جاتی ہے۔

وہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ وہ سازش کے جال بنتا ہے اور اپنے دشمن کو ایسے انجام سے روشناس کرتا ہے جس کا وہ کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا جاہ و جلال اس کا کردار اور اس کا اندازِ زیست دوسروں کے لیے مرعوب کن ہے، اس کے چہرے میں ایک ایسی کشش ہے جو بیک وقت گھناؤنی اور ہولناک بھی ہے اور خوب صورت بھی وہ سراپا رحم ہے اور سراپا انتقام و عذاب بھی۔

اس کے کردار کے عمل اور رویے کے حوالے سے ڈوما ہمیں ایک ایسے معاشرے اور اس کے افراد سے ملاتا ہے جو منافق ہے۔ ریاکار ہے۔ جو ظاہر سے بڑا خوشنما اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا باطن بے حد غلیظ اور مکروہ ہے انسانی نفسیات کو ڈوما نے بے شمار کرداروں کے حوالے سے پیش کیا ہے جہاں معاشرے کے راندۂ درگاہ اور دھتکارے ہوئے انسان انسانیت کے جوہر سے متصف دکھائی دیتے ہیں اور جو لوگ معاشرے کے سربراہ اور عمائدین ہیں وہ گھٹیا اور انسانیت سے عاری ....

کونٹ آف مانٹی کرسٹو۔ ایک عظیم ناول اور عظیم کردار ہے۔ وہ روایات کا امین ہے۔ مشرق و مغرب کی روایات کو اس نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

وہ اپنی سابقہ محبوبہ جو اسے پہچان نہیں سکی اس کے ہاں دعوت میں جاتا ہے جو دعوت صرف اسی کے اعزاز میں دی گئی ہے کیونکہ کونٹ آف مانٹی کرسٹو نے اس کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔

لیکن اس دعوت کا مہمانِ خصوصی ۔ کونٹ آف مانٹی کرسٹو ۔ اس دعوت میں کوئی چیز نہیں چکھتا۔

یہ روایت مشرق کی ہے کہ دشمن کے گھر کا اناج چکھنا بھی گناہ ہے ۔

ایڈمنڈ ڈینٹیز ۔ کونٹ آف مانٹی کرسٹو ۔ مشرق کے لوگوں پر اعتماد کرتا ہے اس کا سب سے قریبی معتمد اور راز دار اس کا ایک مشرقی ملازم ہے ۔ خود کونٹ آف مانٹی کرسٹو جس نے ایک ترک شہزادی کو بیٹی بنا لیا ہے ۔ مشرق کا ایک لازوال کردار بن گیا ہے۔

ہمیشہ زندہ رہنے والا ، ہمیشہ پڑھا جانے والا ، ہمیشہ پسند کیا جانے والا ۔

الیگزنڈر ڈوما نے اس ناول کے حوالے سے ہمیں ایسے معاشروں کی سچی تصویر دکھائی ہے جہاں معاشی ناہمواریاں ہیں ۔ جہاں سیاسی استحصال ہوتا ہے ۔ جہاں صرف دولت کی پوجا ہوتی ہے ۔

••

ہیومن کامیڈی

چھوٹے بڑے لکھنے والوں کے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک دعویٰ ملتا ہے۔ شاعرانہ اور حقیقی دعووں کا کوئی حساب لگانے بیٹھے تو پاگل ہو جائے لیکن بالزاک نے جتنا بڑا دعوے کیا۔ اس کی مثال دنیائے ادب میں نہیں ملتی اور پھر اپنے دعوے کے لیے جو ثبوت پیش کیا اس جیسا ثبوت بھی دنیائے ادب کم ہی پیش کر سکتی ہے۔

بالزاک کا دعوے تھا کہ وہ سماج کا جنرل سیکرٹری ہے۔

وہ لکھنے کے فن کو مقدس سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ لکھنے بیٹھتا تو پادریوں کی کالی عبا پہن لیتا تھا۔ اس نے ایک عجیب زندگی گذاری۔ قرض کے تلے پستا رہا۔ جیتا رہا اور لکھتا رہا۔

کارل مارکس اور اینگلز اور لینن جیسے اس کے ایک طرف مداح تھے تو دوسری طرف اس نے بارلیئر، آندرے مورروا اور اپنے بعد آنے والے دنیا کے ہر بڑے لکھنے والے سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اب بھی دنیا میں ایسے ناقدوں کی کمی نہیں جو اسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کرتے ہیں۔

اس کے ناولوں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ اس کے فن پر ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فرانس کے بڑے لکھنے والوں میں سے بالزاک کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو زبان میں اس کے دو بڑے شہکار منتقل ہو چکے ہیں۔ "بڈھا گوریو" اور "یوجین گرانڈے" کا ترجمہ "سرد ویران اندھیرا گھر" دونوں کی مترجم سیدہ نسیم ہمدانی ہیں۔ اس کی بے مثل کہانیوں Droll stories. کی ایک اپنی ہی لذت اور ذائقہ ہے اور کچھ کہانیاں بھی اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کرشن چندر اس کے مداح تھے۔ اور اسے ٹالسٹائی سے بڑا ناول نگار مانتے تھے۔ دوسری طرف محمد حسن عسکری اس کی تعریف میں مدتوں

رطب اللسان رہے۔

بالزاک دنیائے ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ ناول نگاروں میں بہت کم ایسے ناول نگار ہوئے ہیں جنھوں نے تعداد میں اتنے زیادہ اور اتنے بڑے ناول لکھے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں اس کی وفات کو پوری ایک صدی ہو چکی تھی۔ ایک صدی سے زائد عرصے میں دنیا میں ناول کے فن نے بڑی ترقی کی۔ اس میں بڑے بڑے اہم تجربے ہوئے۔ تکنیک میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کے باوجود بالزاک کا نام اسی طرح جگمگا رہا ہے۔ ایک صدی نے اس کے کام کی معنویت اور اہمیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اسے دھندلایا نہیں ہے۔ وہ اتنا طاقتور، زندہ رہنے والا مصنف ہے کہ اسے زمانہ بھلا نہیں سکتا۔

بالزاک کی اپنی زندگی ایک عظیم انسانی رزمیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہیرو ہے جو ہار ماننا جانتا ہی نہیں۔ مصائب اور آلام اس کو گھیرے میں لیے رکھتے ہیں۔ اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن وہ کسی پریشانی سے ہراساں نہیں ہوتا۔ وہ تخلیق کے منصب سے آنکھیں نہیں چراتا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی ناکامی اور پریشانی اس کے تخلیقی سوتوں کو خشک کرنے میں ناکام رہی۔ وہ اپنے کام میں تخلیق کرنے میں ہمہ تن مصروف رہا۔ فرانس میں ایک گاؤں تورس ہے جہاں وہ ۲۰ مئی ۱۷۹۹ء کو پیدا ہوا وہ اپنے چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ یعنی پہلوٹھی کا بیٹا۔ اس کے والدین درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ باپ قصبے میں ایک درمیانے درجے کے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ بالزاک جب لا پیرڈے کے مدرسے پیرس میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا تو یکسر حالات نے پلٹا کھایا۔ اس کے والد کی ملازمت چھن گئی۔ گھر کے حالات بھی اس سے بُری طرح متاثر ہوئے۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو گیا۔ مستقبل کے اس عظیم مصنف اور ناول نگار کو اپنے گھریلو حالات کے تحت ایک نوٹری کی آفس میں بطور کلرک ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ لیکن بالزاک کو دفتری معمولات اور فرائض سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آندرے موروا نے لکھا ہے کہ بالزاک کی بہن اُسے Intiution of Renown. کا مالک سمجھتی تھی۔ اس لیے بالزاک نے جلد ہی یہ ملازمت ترک کر دی اور ایک لکھنے والے کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے کے لیے تحریر و تصنیف کو اپنایا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتا اور لکھتا رہتا۔

۱۸۲۶ء میں حالات کو بہتر بنانے کے لیے اس نے ایک طابع باربیر کے ساتھ شراکت کر لی اور خود

رہی اپنی کتابوں کا ناشر بن گیا۔ لیکن اس کی یہ کاوش بھی ناکام رہی۔ اس کام میں اسے شدید خسارہ رہا اور قرضہ کم ہونے کی بجائے اس پر قرضے کا مزید انبار کھڑا ہو گیا۔

اس کے باوجود اس نے مایوسیوں اور مصائب سے اپنے فن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ پہلے جیسے انہماک سے ہی تخلیق کرتا رہا۔ اور پہلی جیسی محنت اور لگن سے لکھتا رہا۔ بالآخر ۱۸۲۹ء میں اس کا ناول .Lachouans شائع ہوا۔ جس سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ ناول ایک تاریخی ناول ہے۔ اس ناول کی اشاعت اور مقبولیت سے بالزاک نے اپنے اصل نام سے لکھنا شروع کیا اور اپنے پہلے سارے کام کو خود ہی مسترد کر دیا۔ اس ناول کی اشاعت سے پہلے اگر وہ غیر معمولی محنت اور لگن سے لکھتا تھا تو اس کی اشاعت کے بعد اس نے پہلے سے زیادہ دقت نظری، تخلیقی سچائی اور انہماک سے لکھنا شروع کیا۔

اتنی بھرپور مصروفیت اور محنت کے باوجود اس نے کسی نہ کسی طرح محبت کرنے کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیا۔ اس محبت نے بھی اس کے مصائب میں اضافہ ہی کیا۔ کیونکہ اس کی محبوبہ ایک شادی شدہ پولش خاتون مادام ایویلینا ہنیسکا تھی۔

جیسی حیران کن، رزمیائی زندگی بالزاک نے گزاری۔ ویسی اس کی محبت تھی ایویلینا سے اس کی محبت اس کے لیے ایک روگ ثابت ہوئی۔ اس کے عشق میں اس نے کسی دوسری عورت کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ مصروفیت، تخلیق کی لگن نے اسے پہلے کبھی اتنی فرصت ہی نہ تھی لیکن جب عشق ہوا تو ایسی خاتون سے جو شادی شدہ، صاحب جائداد اور سوسائٹی میں بڑا نام رکھتی تھی۔ ۱۸۴۲ء میں بالزاک کی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایویلینا کا شوہر قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ اب وہ اس سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن بالزاک چاہنے کے باوجود بھی اپنی محبوبہ سے جلد ہی شادی نہ کر سکا

جس سے شادی کرنے کی آرزو میں اس کی عمر بیت گئی تھی۔ بالزاک کو کئی بیماریوں اور مصیبتوں نے آن گھیرا۔ جس سے شادی التوا میں پڑتی چلی گئی۔ اور اپنی موت سے صرف چند ماہ پہلے بالزاک اس قابل ہو سکا کہ وہ اپنی محبوبہ سے شادی کر سکے۔ جب اس کی عمر ۵۰ برس ہو چکی تھی۔

ابتدا میں اس نے ایک فرضی نام سینٹ این۔ ایم۔ ڈی ویلگرے" سے جاسوسی ناول بھی لکھے۔ لیکن ان میں وہ ناکام رہا۔ تو تخلیقی ادب کی طرف آ گیا جو اس کا اصل میدان تھا۔ لیکن یہاں بھی آغاز بہت مایوس کن ہوا۔ بالزاک نے ناکامیوں سے گھبرانا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے انتھک محنت اور لگن سے لکھنے کا عمل

جاری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی ادب کی تاریخ میں شاید ہی کوئی محنت اور لگن کے معاملے میں بالزاک کا مثیل ہو۔ ناکامیوں نے اسے آلام و مصائب میں گرفتار کر دیا۔ غربت کے بھیڑیے نے گھر کی دہلیز پر ڈیرے ڈال دیے اور قرضے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری وہ تھک کر نڈھال ہو جاتا۔ لیکن لکھتا چلا جاتا۔ اپنے فن کے ساتھ وہ اتنا مخلص تھا کہ ایک مناسب موزوں اور برمحل لفظ کے انتخاب کے لیے گھنٹوں سر کھپاتا رہتا تھا۔

ایولیلینا سے اس کی محبت اور پھر اس سے ملاقات کے لیے دور دراز کے مقام تک آنے جانے کی وجہ سے ایک لمبے عرصے تک بالزاک کی تخلیقی پیداوار میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کی تخلیقی توانائی کے سوتے کبھی خشک نہ ہونے پائے۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے بالزاک پوری دل جمعی سے اپنا کام نہ کر سکا۔

بالزاک نے دوسری ان گنت تحریروں کے علاوہ ستر ناول لکھے۔ "دی ہیومن کامیڈی" ۵۵ ناولوں پر مشتمل ہے تمام ناول اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں، لیکن ایک خاص رشتے میں منسلک ہیں۔ اس کے ناولوں میں "دیہات کی زندگی کے مناظر" "شہر کی زندگی کے مناظر" "بدلھا گوریو" "یوجین گرانڈے" ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جو چار ناول لکھے۔ ان کا شمار عالمی شہکاروں میں ہوتا ہے اور ان چاروں کی شمولیت سے اس کا عظیم الشان کارنامہ "ہیومن کامیڈی" مرتب ہو کر تکمیل پاتا ہے۔

وہ چار ناول ہیں۔ "کزن بیٹی" "کزن پون" "عصری زندگی کے مناظر" اور "دیہاتی زندگی کے مناظر" بالزاک کا منصوبہ دنیا کے عظیم ترین ادبی منصوبوں میں سے ایک ہے۔ اس کی تقلید بعد میں زولا نے کی اور گالز وردی نے بھی کہ اپنی اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود ایک رشتے اور ایک خیال میں منسلک ناول لکھے اور ان کو یکجا کیا گیا۔ بالزاک کے سامنے انسانی فطرت تھی۔ وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ انسانی سماج کا سیکرٹری جنرل ہے۔ وہ انسانوں کی نفسیات کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ وہ انسانی کائنات کو ایک طربیے کی صورت میں دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔ اب یہ تو بالزاک کے پڑھنے والے ہی جانتے ہیں کہ اس نے یہ انسانی طربیہ کس المیے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور انسانی تماشا کتنا بڑا المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔

جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اور اس کی تائید بعض نامور لکھنے والوں نے بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ جتنے کردار تعداد میں بالزاک نے تخلیق کیے ہیں۔ اتنے کردار کسی دوسرے لکھنے والے نے تخلیق نہیں کیے

مجھے اس وقت نام یاد نہیں آ رہا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فرانس کے ایک محقق اور نقاد نے کئی جلدوں پر ایک کتاب مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ جس میں اس نے صرف بالزاک کے ناولوں کے تمام کرداروں کا شمار کیا ہے اور ان کے بارے میں وضاحتی اور تشریحی نوٹ لکھے ہیں۔

بعض نقادوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انسانی نفسیات سے جتنی واقفیت شیکسپیئر کو تھی دوسرے کسی لکھنے والے کو حاصل نہ ہو سکی۔ شیکسپیئر کے بعد جس شخص کا نام لیا جا سکتا ہے وہ بالزاک ہے۔ اس رائے پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا نہ اختلاف کر سکتا ہوں نہ اتفاق۔ کیونکہ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو شیکسپیئر بالزاک اور پھر انسانی نفسیات پر حاوی ہو اور میرا ایسا کوئی دعویٰ نہیں۔ شیکسپیئر کی ہر تحریر پڑھنے اور بالزاک کے سوا الیس ناولوں کا قاری ہونے کے باوجود میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بعض نقادوں نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ بالزاک کے ہاں کردار نگاری ایسے عروج پر پہنچی ہوتی ہے کہ جس کی مثال دنیائے ادب پیش نہیں کر سکتی۔ کردار نگاری کے ضمن میں اس کا کوئی ثانی نہیں لیکن اس کے بیشتر ناول اس چیز سے محروم ہیں۔ جسے حسن توازن کا نام دیا جاتا ہے یہ ایک ایسی رائے ہے جس پر میں کچھ کہہ سکتا ہوں "لا کامیڈی ہیومن" کے بعض ناولوں میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ یہ ناول حسن توازن سے محروم ہیں لیکن "لا کامیڈی ہیومن" کے بیشتر ناول ایسے ہیں جن پر حسن توازن کے فقدان کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اصل میں بالزاک کو اپنی زندگی میں اتنا کچھ لکھنا پڑا کہ تمام تر انہماک، لگن اور محنت کے باوجود وہ بعض ناولوں میں بعض خامیوں کو کبھی دور نہ کر سکا۔

ایک بات بہرحال ہے کہ شیکسپیئر کے سارے ڈراموں کے مجموعی کرداروں کی تعداد۔ بالزاک کے ناولوں کے کرداروں کی تعداد سے بہت کم ہے۔!

جیسے جیسے چہرے اور جیسے جیسے لوگ بالزاک کے ناولوں کی کائنات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے اور اتنے چہرے کسی بڑے لکھنے والے کے نگار خانہ تخلیق میں دکھائی نہیں دیتے۔!

بالزاک جس کا انتقال ۱۸ اگست ۱۸۵۰ء کو پیرس میں ہوا۔ اس کے بارے میں ٹین نے لکھا تھا۔

The greatest store house of documents that we have of human nature.

کامیڈی ہیومن کے دیباچے میں بالزاک نے ایک اور دعوےٰ کیا تھا کہ وہ زندگی کو پیش کر رہا ہے۔

اس کا دعوے صادق تھا جس انداز میں اس نے اس دعوے کو ثابت کیا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جس طرح علم الحیوانات کے ماہرین حیوانوں کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ میں انسانوں کی اسی طرح درجہ بندی کروں گا۔ انسانوں کی انواع کو سامنے لاؤں گا۔ اور ان کی انفرادیت کو ان کے پورے کردار کے ساتھ پیش کروں گا۔ یوں بالزاک نے کامیڈی ہیومن میں پوری انسانی زندگی کی ایک مدور شکل میں تصویر کھینچنے کی سعی کی جس میں وہ بے حد کامیاب ہوا۔ اس نے "کامیڈی ہیومن" کے ناولوں کے حوالے سے ہزاروں کردار تخلیق کیے۔ اپنے ناممکن کام کی تکمیل کے لیے ساری عمر جتا رہا۔ ادبی مورخ اور نقاد، متفقہ طور پر اس کے بارے میں رائے دیتے ہیں۔ اس نے جس منصوبے کی تکمیل کا دعوے کیا اور بیڑہ اٹھایا وہ اس میں کامیاب رہا۔

"کامیڈی ہیومن" میں شامل ناول محض ناول نہیں ہیں بلکہ یہ زندگی کا پینورامہ ہے۔ اس نے جس طرح سے سوچا تھا اسی طرح مکمل کیا۔

اور دنیائے ادب میں یہ بہت بڑا بے مثل کارنامہ ہے ...

اب میرے جیسے ادب کے طالب علم اور بالزاک کے پرجوش مداح کے لیے یہ بے حد مشکل ہے کہ وہ کامیڈی ہیومن میں سے کسی ایک ناول کو چھانٹ کر یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا شاہکار ہے۔ بالزاک کے شاہکار تعداد میں بہت زیادہ ہیں یہ تمام ناول ایک کشف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کے بارے ایسے انکشافات ملتے ہیں جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کی تخلیقات میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔

میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اس کے چند ناولوں کے بارے میں اشارہ کرتا چلوں۔ کیونکہ ان ناولوں میں انسانی کرداروں، ان کی نفسیات اور ان کی جو کائنات آباد ہے اسے کسی ایک مضمون میں پیش کرنا ناممکن ہے۔

تو پہلے کس ناول کا ذکر کروں؟

"کزن بیٹ" کا جسے ساری عمر دوسروں کی خدمت سے فرصت نہ ملی۔ وہ اپنے عزیزوں کے لیے کولہو کے بیل کی طرح تھی۔ دن رات کام کرتی رہتی۔ اور کوئی اس کا غمگسار نہ بنا۔ کسی نے اس کے دل میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اس کی امنگوں اور حسرتوں کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا یا پھر COUSIN PONS کا جو دنیا میں تنہا تھا جسے پناہ ملی تو اپنے جیسے ایک بوڑھے موسیقار کی دوستی میں۔ دوستی کا انسانی زندگی

میں جو مقام ہے اس پر یہ ناول آندرے موروا کی نگاہ میں سب سے بڑا اور موثر ناول اپنے رشتہ داروں اپنے عزیزوں کی کج خلقی سے نالاں اور رنجور پونز کے پاس نوادرات کا ذخیرہ ہے لیکن اس کا دل دوستی سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی دوست نہیں۔ اس کے امیر اور دولت مند رشتے دار اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے ہیں۔ اسے کھانا بھی کھلاتے ہیں تو اس میں بھی تحقیر اور اہانت کا عنصر شامل ہوتا ہے پھر اسے ایک اپنے جیسے عمر خوردہ بوڑھا ملتا ہے۔ یہ اس کا دوست ہے۔ ان دونوں کی زبان مختلف ہے۔ دوسرا موسیقار بوڑھا جرمن ہے لیکن ان کے دل دوستی کے رشتے میں بندھے ایک دوسرے سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ بوڑھے PONS کو زندگی دوستی کا دامن پھیلا کر پناہ دیتی ہے لیکن اسکی موت۔ یہ سب کچھ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے تو پھر مجھے The greal illusions. کا ذکر کرنا چاہیے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کا منفرد مشاہدہ اور مطالعہ، انسانوں کے وہ رویے جو کشف کی طرح پڑھنے والے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ شہرت کس طرح رسوائی بنتی ہے.... یا پھر میں Ass, skin کا ذکر کروں جس کا ہیرو زندگی کی خوشیوں کے لیے اپنی روح بیچ دیتا ہے اور اس کی زندگی کا دارو مدار گدھے کی کھال کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ہے اور جب اس نے معدوم ہوتا ہے تو اسے مرجاتا ہے۔ یہ نوجوان گوئٹے کے فاوسٹ سے بہت مختلف ہے۔ اس کا اپنا کردار ہے۔ اپنی نفسیات ہے اور پھر جس طرح وہ اپنے ہولناک انجام سے دوچار ہوتا ہے وہ دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے۔

کامیڈی بیوسن کے ناول Man and Harlot. کو کس طرح نظرانداز کیا جاسکتا ہے یہ شہر کی دنیا ہے۔ تھیٹروں اور اخباروں کی دنیا۔ جہاں تخلیقی لکھنے والا اخباروں کی سنسنی خیزی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جہاں ناول نگار اور شاعر۔ ایک نئی مخلوق میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اس صنعتی اور سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے۔ وہ "صحافی" بن جاتا ہے۔ ugene grandet. کے ذکر کے بغیر کامیڈی ہیوسن کے ناولوں کی اہمیت کس طرح اجاگر کی جاسکتی ہے۔

اس ناول میں بالزاک نے ایک کنجوس کا ایسا بے مثل کردار کیا ہے کہ جو انسانی فطرت کے ان ڈھکے چھپے گوشوں کو سامنے لاتا ہے جو پڑھنے والے کو تھرا دیتے ہیں۔ یہ ناول محبت کا نوحہ ہے اس لڑکی کا نوحہ ہے جو اس کنجوس کی بیٹی ہے اور اپنے دلوالیہ اور خودکشی کرنے والے چچا کے بیٹے کے عشق میں گرفتار ہے۔ کس کس انداز میں وہ ایثار کر کے اپنے محبوب کے لیے چھوٹی چھوٹی معمولی معمولی آسائشیں فراہم کرتی

ہے اور یہ کنجوس اپنی کنجوسی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ وہ کاغذ بچانے کے لیے اس اخبار پر اپنے نفع ونقصان کے اعداد و شمار لکھتا ہے جس میں اس کے بھائی کی موت کی خبر چھپی ہے۔ مرتے ہوئے آخری لمحوں میں پادری کے سینے پر لٹکتی ہوئی سونے کی صلیب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ ایسے مشاہدے اور اتنی حسین کردار نگاری کا نمونہ ہے جو صرف بالزاک کے ہی بس کی بات تھی۔

اور پھر اس ناول کا ایک کردار ملازمہ نالوں کون بھلا سکتا ہے .... اپنے آقا کے ساتھ اس کی جانوروں جیسی وفاداری محبت کی کونسی قسم ہے۔ کونسی ادا ہے؟

اور پھر کامیڈی ہیومن کے ناول "بڈھا گوریو" کا گریو شیکسپیر کے کنگ لیئر سے شانے سے شانہ ملائے ہوئے کھڑا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ لیکن اسے کہے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی تمام تر عظمتوں اور رفعتوں کے باوجود۔ باپ اور بیٹیوں کی محبت کے موضوع پر جتنا بڑا ناول "بڈھا گوریو" ہے اتنا بڑا ڈرامہ "کنگ لیئر" نہیں ہے۔

یہ بڈھا گوریو جو اپنی بیٹیوں پہ جان چھڑکتا ہے ایسا انسان ہے جو اپنی بیٹیوں کی خوشی اور شادمانی کے لیے ہر قربانی دے سکتا ہے آپ بھوکوں مر سکتا ہے لیکن ان کے لیے سب کچھ بیچتا چلا جا رہا ہے۔ وہ اس حد تک اپنی بیٹیوں پر فریفتہ ہے ان کی خوشیوں کا طلب گار ہے کہ وہ ان کے عاشقوں تک کو دعائیں دیتا اور ان کی خوشنودی کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن وہ دھتکارہ ہوا انسان ہے اس کی بے انتہا محبت کی کسی کو قدر نہیں وہ ایسی ہی بے چارگی کی موت مرتا ہے جیسی موت ایسے مرنا چاہیے۔ بے مہر معاشرے میں ایسے وفا شعار اور محبت کرنے والے لوگوں کا انجام اس سے مختلف کیا ہو سکتا ہے لیکن اس کے انجام سے اس ناول کا جوان ہیرو پیرس میں نت نئے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے آنے والا لوژین۔ نیا ولولہ حاصل کرتا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ بے مہر شہر کس طرح فتح کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں فتح کرنے کے لیے مہر اور محبت کی نہیں بلکہ سفاکی کی ضرورت ہے

بڈھا گوریو، میں وہ خطوط جو بہنیں اپنے بھائی لوژین کے نام لکھتی ہیں۔ وہ بھائی اور بہنوں کی محبت کے رشتے کی خوب صورت اور مؤثر ترین تفسیر بن جاتے ہیں۔

کامیڈی ہیومن کے بارے میں کیا کچھ لکھوں؟ کس کس ناول کا کس کس طرح ذکر کروں؟ ان پہ لکھنے کے لیے بڑا ذہن اور بڑا قلم اور ایک عمر چاہیے اور یہ سب کچھ مجھے میسر نہیں!!!

وار اینڈ پیس

کونٹینس گارنٹ کا انگریزی ترجمہ اور ایک دور افتادہ گاؤں موضع ڈنڈیاں ... انسانی زندگی کے بعض ایسے تجربات اور واقعات ہوتے ہیں جن کا ذائقہ انسان اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک محسوس کرتا ہے۔ عالمی ادب میں فکشن کا سب سے بڑا شاہکار ٹالسٹائی کے ناول "وار اینڈ پیس" کو مانا جاتا ہے اس کی شہرت سن سن کر کتنا اشتیاق تھا کہ اسے پڑھا جائے۔ اور پھر پہلی بار اس کا پورا اور مکمل ترجمہ ہاتھ آیا۔ جو کونٹینس جیسے استاد اور عظیم مترجم کا کیا ہوا تھا۔ اسے اتفاق کہیے کہ ٹالسٹائی کا شاہکار عالمی ادب کا عظیم فن پارہ "وار اینڈ پیس" مجھے ایک گاؤں میں پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ پرسکون خاموش اونگھتا ہوا گاؤں، موسم بہار کا ... اور ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس" میں سمجھتا ہوں کہ میں اس ماحول اور اس عظیم تخلیق کے حوالے سے جس تجربے سے روشناس ہوا وہ خدا کی بڑی دین تھی۔

اور خدا ٹالسٹائی پر بھی یقیناً بے حد مہربان تھا کہ اسے ایسی صلاحیتوں سے نوازا کہ جن کی بدولت وہ عالمی ادب کا سب سے بڑا اور منفرد شہکار "وار اینڈ پیس" لکھ سکا۔

"وار اینڈ پیس" میں ایسا سحر ایسا جادو اور ایسے معانی ہیں کہ آپ اسے کسی ماحول میں پڑھیں۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دنیا کا یہ عظیم شاہکار۔ ٹالسٹائی کا ہی نہیں، پورے عالمی ادب کا عظیم فن پارہ ہے۔ ٹالسٹائی نے جب اسے لکھنا شروع کیا تو شاید اسے خود علم نہ تھا کہ وہ کتنے عظیم شاہکار کو تخلیق کر رہا ہے۔ لیکن ہمیں ایک بات کا پتہ ضرور چلتا ہے اور اس کی راوی آنا ٹالسٹائی ہے۔ جس نے لکھا ہے کہ "وار اینڈ پیس" کے مسودے کو کم از کم پچاس بار REVISE کیا گیا۔ ٹالسٹائی ایک بار مسودہ کی نظر ثانی کرتا پھر اسے دوبارہ پڑھتا پھر تبدیلیاں اور اضافے ہوتے اور یہ سلسلہ مسلسل چلتا

رہا۔ بالآخر دنیائے ادب کا یہ شاہکار پہلی بار ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو کر اختتام کو پہنچا۔

تب سے اب تک دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کا سب سے خوب صورت اور اچھا ترجمہ کونٹینس گارنٹ کا ہے۔ وار اینڈ پیس کو ملخص صورت میں بھی کئی زبانوں میں ترجمہ اور شائع کیا گیا۔ کیونکہ اصل ناول بہت ضخیم ہے۔ اس ناول پر امریکہ اور روس میں فلمیں بن چکی ہیں۔ ٹی وی کے لیے اسے کیا گیا اور اس کی ڈرامائی تشکیل کی گئی کہتے ہیں اردو میں مخمور جالندھری نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو مکمل بھی ہوا لیکن آج تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس بڑے کام کا آغاز خود راقم الحروف نے بھی کیا۔ اردو کے ایک جریدے میں "وار اینڈ پیس" کا ترجمہ ہر ماہ شائع ہوتا رہا۔ بیس ایک قسطوں کے بعد میں خود یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا اور اصل اور پورے ناول کے ایک چوتھائی حصے کا ہی ترجمہ ہوا جو شائع ہو گیا۔ اس کے بعد غم روزگار نے فرصت نہ دی کہ ٹالسٹائی کے اس شاہکار ناول کو مکمل کر سکوں۔

ٹالسٹائی کی بعض کہانیاں البتہ اردو میں شائع ہوئی ہیں اس کے ناول "اینا کرینینا" کا ایک مکمل ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

کاؤنٹ لیو نکولائیوچ ٹالسٹائی بہت معزز اور دولت مند گھرانے کا فرد تھا۔ وہ جس محل میں پیدا ہوا اس کے کمروں کی تعداد چالیس تھی۔ اس کی جاگیر یسانیا پولیانا کا شہرہ آج ساری دنیا میں ہے۔ یہیں ۲۸ راگست ۱۸۲۸ء کو ٹالسٹائی نے جنم لیا۔ وہ ابھی شیر خوار تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا نو برس کا تھا کہ باپ بھی چل بسا۔ اس کی پرورش اس کے رشتہ داروں اور عزیزوں نے کی۔ ۱۸۴۲ء میں وہ کازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ٹالسٹائی کی عمر کا یہ وہ دور تھا جب اس نے وہی چلن اختیار کیا جو اس کے طبقے سے مخصوص تھا۔ اس نے جی بھر کے دل کے ارمان نکالے۔ زندگی کی سرمستیوں میں ڈوب گیا لیکن اس لہو و لعب میں پڑنے کے باوجود ٹالسٹائی نے ایسے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا جن میں وہ اپنی ذات کا اظہار کر سکتا تھا۔ ٹالسٹائی نے فوج میں کمیشن لیا اور اسی زمانے میں اس نے اپنی پہلی تخلیق کو جنم دیا۔ جو "کاسک" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کی پہلی کتاب "بچپن" تھی جو خود نوشت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد "لڑکپن" "پھر جوانی" شائع ہوئیں۔ سیواستاپول کی کہانیاں اس کے بعد شائع ہوئیں۔ ٹالسٹائی نے جنگ میں بھی حصہ لیا اور اس کے یہ تجربات بڑے فنکارانہ انداز میں اس کے شاہکار "وار اینڈ پیس" میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ٹالسٹائی نے دو بار غیر ملکی سیاحتیں بھی کیں کچھ عرصہ پیٹرزبرگ میں رہا اور پھر اس نے اپنی جاگیر کو ہی مستقل قیام گاہ بنالیا۔ وہ دہقانوں کی حالت زار سے بے حد متاثر ہوا۔ اس دور میں ٹالسٹائی نے ان منصوبوں پر عمل کرنے کا آغاز کیا جو کسانوں کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لیے تھے۔ اور اس کام کے لیے وہ ساری عمر کوشاں رہا۔ اس نے ایک مدرسہ گاؤں میں قائم کیا۔ جہاں وہ خود بھی پڑھایا کرتا تھا۔

اب تک ٹالسٹائی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ وہ ایک معتبر، مقدس اور عظیم انسان تسلیم کیا گیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ٹالسٹائی نے شادی کی۔ اور یوں ٹالسٹائی کی زندگی کا ایک دور ختم ہوا۔ اس شادی نے اس کی زندگی کو آنے والے برسوں میں اجیرن کر دیا۔ میاں بیوی کے مزاج میں بہت نمایاں فرق تھا۔ دونوں میں عموماً جھگڑا اور ناچاقی رہی۔ اس کی بیوی کو ٹالسٹائی کی عوام اور دہقان دوستی اور اس کے فلاحی منصوبوں سے چڑ تھی۔

ٹالسٹائی نے کسانوں کی حالتِ زار پر جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی سچائی، واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے عالمی ادب کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ اس دور میں اس نے جو مختصر کہانیاں لکھیں انھوں نے ٹالسٹائی کو دنیا کے عظیم مصنفوں میں لا کھڑا کیا، ساری دنیا میں اس کے مداحوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اور پھر اس کے دو عظیم فن پارے منظرِ عام پر آئے۔ "وار اینڈ پیس" اور "اینا کرینینا" "وار اینڈ پیس" کا سن اشاعت ۱۸۶۵ء - ۱۸۶۹ء ہے اور "اینا کرینینا" کا سن اشاعت ۱۸۷۵ء - ۱۸۷۷ء ہے ان دونوں ناولوں کی بدولت اسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کیا گیا۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آخری عمر میں جب ٹالسٹائی ایک بڑے مورالسٹ کی حیثیت سے نمایاں ہوا تو اس نے اپنے شہکار ناول "اینا کرینینا" کو خود ہی مسترد کر دیا۔

"وار اینڈ پیس" عالمی ادب کا بہت اہم فن پارہ ہے۔ اس ناول میں روس زندہ اور جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ نپولین کے حملے کے حوالے سے جنگ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور اس ناول میں تین سو سے زائد ایسے کردار ہیں جو دائمی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا کینوس اتنا وسیع اور بھرپور ہے۔ اور اس کو ایسے فنکارانہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ جس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا فن پارہ۔

پیش نہیں کرتا۔

ٹالسٹائی اپنی زندگی میں ایک بڑے بحران سے بھی گزرا۔ ۱۸۸۰ء کا سن اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنے افکار و نظریات اور اعمال میں یکسانیت پیدا کرنے میں انتہائی خلوص کا اظہار کیا تھا۔ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے باوجود باطنی اور ذہنی بحران اسے کئی بار خودکشی کرنے پر آمادہ کرتا رہا۔ بالآخر اسے تسکین خاص قسم کی مذہبیت اور اخلاقیت میں ملی۔ جس کا پرچار اس نے خود ہی شروع کر دیا۔ اس نے کہا خدا کی بادشاہت آپ کے اپنے دل میں بستی ہے۔ محبت خدا ہے اور زندگی کا مفہوم محبت پر یقین ہے۔ اپنی زندگی کے اس دور میں اس نے جو کتابیں لکھیں وہ اس کے عقائد میں رچی بسی ہیں۔ جس میں " اعترافات "، " میری زندگی " میرا عقیدہ کیا ہے۔ اپنے انہی عقائد اور نظریات کو اس نے ادب میں بھی پیش کیا۔ کئی کہانیوں کے علاوہ اس کے آخری دور کا ناول " ریزرکشن " اس کے عقائد و نظریات کا مظہر ہے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ٹالسٹائی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر عام کسانوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے۔ اس پر اس نے عمل کرنے کی کوشش بھی کی، ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا لیکن راستے میں ریل کے سفر کے دوران وہ شدید بیمار ہو گیا۔ افسوس ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو اس کا ایک ریلوے سٹیشن پر انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش اس کی جاگیر میں لائی گئی۔ وہیں اس کو دفنایا گیا۔ اور اس کی جاگیر کو اس کی یاد میں میوزیم بنا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں نے اس کی جاگیر اور میوزیم کو بہت نقصان پہنچایا لیکن جنگ عظیم کے بعد اس کی تعمیر نو ہوئی اور آج دنیا بھر کے لوگ اس کی قبر اور میوزیم کو دیکھنے جاتے ہیں۔

ٹالسٹائی عظیم مصنف ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی تھا۔ اس نے زندگی کو جس انداز میں برتا اور گزارا۔ اس کی مثال بھی قدرے کم ہی ملتی ہے۔ " وار اینڈ پیس " کے خالق کی حیثیت سے وہ لازوال ہو چکا ہے۔

روس میں جب انقلاب آیا تو دوسرے کئی مصنفوں کی طرح ٹالسٹائی کو بھی نئی انقلابی حکومت کے کارندوں اور انقلابیوں نے رجعت پسند قرار دیا اور اس وقت خود لینن ٹالسٹائی کے دفاع کے لیے نکلا۔ لینن نے ایک مضمون " ٹالسٹائی انقلاب روس کا ایک آئینہ تھا " کے عنوان سے لکھا۔ اور

ٹالسٹائی کے مخالفوں کو دندان شکن جواب دیا۔ لینن کا یہ اقدام عالمی ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لینن نے لکھا تھا:

"وہ عہد جب بورژوا انقلاب روس میں رونما ہو رہا تھا۔ ٹالسٹائی کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ وہ لاکھوں اور ان گنت کسانوں کے جذبات و خیالات کا ترجمان بنا۔ ٹالسٹائی پر کسی کا اثر نہیں لیکن اس کے خیالات و تصورات بحیثیت مجموعی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ٹالسٹائی کے ہاں جو تضاد ملتا ہے وہ اس معاشرے کا تضاد ہے۔ ٹالسٹائی ایک آئینہ ہے جس میں پورا معاشرہ اپنا عکس دکھاتا ہے اور انہی تضادات نے انقلاب میں ایک اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔"

آج ٹالسٹائی پر پورے روس کو فخر ہے ۱۹۷۸ء میں ٹالسٹائی کا ڈیڑھ سو سالہ یوم پیدائش پورے روس میں انتہائی جوش و عقیدت سے منایا گیا۔ ٹالسٹائی کس قسم کا انسان تھا وہ دوسروں پر کس طرح اثر انداز ہوتا تھا اس کا اندازہ گورکی کے اس مضمون کو پڑھ کر ہوتا ہے جو گورکی نے ٹالسٹائی کی موت پہ لکھا تھا۔ اس کے آخری جملے یوں ہیں جن میں گورکی نے ٹالسٹائی سے اپنی ملاقات کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

"میں خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں نے اپنے آپ کو اسے (ٹالسٹائی) کو غور سے دیکھتے اور کچھ خجالت کے ساتھ سوچتے ہوئے پایا۔ یہ آدمی خدا کی طرح ہے۔۔۔"

٭٭٭

اپنی زندگی میں ہی ٹالسٹائی نے ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ "وار اینڈ پیس" کو عالمی ادب کا فن پارہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور پھر دنیا بھر کے رہنما، ادیب، فلسفی اور دانشور اس کو عزت و احترام کی جگہ دے رہے تھے۔ اس کے ہاں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ نہ صرف روس سے بلکہ دوسرے ممالک کے پڑھنے لکھنے والے اس سے ملنے آتے تھے۔ اس دور کے ہر بڑے آدمی کی ٹالسٹائی سے خط و کتابت تھی۔ اس ساری عظمت اور مقبولیت کی کئی وجوہات تھیں۔ لیکن ان میں دو وجوہات بہت نمایاں ہیں ایک اس کی شخصیت اور افکار اور دوسرے اس کا ناول "وار اینڈ پیس"۔

"وار اینڈ پیس" اور ٹالسٹائی کے اثرات کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ تمارا موٹیلیا فا کا ایک مضمون بطور خاص اس حوالے سے پڑھنے کی چیز ہے۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ "ٹالسٹائی اینڈ دی لٹریچر آف ٹوینٹیتھ سینچری رائٹرز آؤٹ سائیڈ رشیا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں تمارا موٹیلیا فا نے بیسویں صدی کے ان بڑے ادیبوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ٹالسٹائی کے اثرات قبول کیے اور جنھوں نے "وار اینڈ پیس" سے بہت کچھ سیکھا۔

"وار اینڈ پیس" جو کرداروں، اپنے تناظر، موضوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے دنیا کا بڑا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل قلم حضرات نے لکھا ہے لیکن اس کے حوالے سے ایک کام بے حد اہم ہے اور وہ ہے وار فارا انگور نفا کا۔ اپنی کتاب میں وار فارا نے بتایا ہے کہ "وار اینڈ پیس" کے کردار کہاں سے آئے۔ اس کے پیش لفظ کے چند جملے یہاں پیش کرتا ہوں۔

"ٹالسٹائی نے اپنے ناول "وار اینڈ پیس" کے لیے جن کرداروں کو تخلیق کیا۔ وہ فرضی نہیں ہیں کرداروں کی اکثریت حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ بہت سے کرداروں کے لیے مواد ٹالسٹائی نے اپنے آباؤ اجداد کی زندگیوں سے حاصل کیا۔ اور بہت سے کرداروں کو اس نے اپنے معاصر اور جاننے والے لوگوں کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا۔"

نتاشا کا کردار۔ جو "وار اینڈ پیس" کی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر وار فارا نے بہت تحقیق کی ہے اور جس خاتون کو ماڈل بنا کر ٹالسٹائی نے نتاشا کا لازوال کردار تخلیق کیا۔ اس کے بارے میں بہت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

***

"وار اینڈ پیس" انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسی تخلیق ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی سے بھی عظیم تر ہے۔ "وار اینڈ پیس" لفظوں کا ایک سمندر ہے ایک ایک لفظ گہرائی اور گیرائی کا حامل اور ہر انسانی مقدر، جذبات، نفسیات کا آئینہ، اس کا ایک ایک کردار انسانی اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے تھامس مان نے لکھا تھا کہ ٹالسٹائی ایسا لکھنے والا تھا جو کشف کا حامل تھا اور پڑھنے والے پر اسرار کا انکشاف کرتا تھا۔ "وار اینڈ پیس" دنیائے ادب کا سب سے اہم کشف اور انکشاف ہے۔

ڈان کیخوٹے

عظیم مصور ڈالی نے "ڈان کیخوٹے" کو پینٹ کیا ہے۔ ایک ایسی تصویر تخلیق کی ہے جو آنکھوں کے سامنے اپنے پورے باطن کے ساتھ اس ڈان کیخوٹے کو لے آتی ہے جس کو میگوئیل ڈی سروانٹیز نے تخلیق کیا تھا....

ڈان کیخوٹے دبلا پتلا، کم رو، پچکے ہوئے جبڑوں والا آدمی۔ بد رنگ موزوں چمک دمک سے محروم زرہ بکتر اور خود پہنے ہاتھ میں لمبا نیزہ لیے اپنے گھوڑے روز سینٹ پر سوار.... جو گھوڑا کاہے کو ہے، اتنا دبلا پتلا مریل ہے کہ جیسے گھوڑے کا ڈھانچہ ہو.... صدیوں سے وہ اس حالت میں اپنے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے اس کے پیچھے اس کا نائب سانچو پانزا ہے۔ پھولے ہوئے پیٹ والا سانچو پانزا.... یہ جوڑا۔ دنیا کا عجیب الخلقت اور مقبول ترین جوڑا ہے جو صدیوں سے انسانوں کو متاثر کرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک.... اور ہمیشہ یہ جوڑا ہمیں متاثر کرتا رہے گا۔ــ

سروانٹیز کا ڈان کیخوٹے اتنا ہی مقبول اتنا ہی اہم ہے جتنے دنیا کے کچھ دوسرے کردار۔ یولیسز، سندباد، علی بابا۔ گلیور.... رابن سن کروسو اور پک وک پیپرز کے مسٹر پک وک...

سروانٹیز کا ڈان کیخوٹے" دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی کوئی زبان نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ان کرداروں اور اس کتاب نے دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ ہمارے زمانے (۱۹۸۳ء) میں مشہور ناول نگار اور لولیتا کے خالق نابوکوف کے ان لیکچروں کا مجموعہ شائع ہوا ہے جو اس نے ڈان کیخوٹے پر دیے تھے۔ ان لیکچروں میں جہاں نابوکوف نے پرانے

عہد کے مصنفوں اور تحریروں پر سروانٹیز کے "ڈان کیخوٹے" کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہاں موجودہ عہد کے لکھنے والوں جان اپڈائیک، اساڈل، بیلو اور خود اپنی تحریروں میں ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو ڈان کیخوٹے کی عطا ہیں۔

ڈان کیخوٹے اور سانچو پانزا۔ دونوں جانے پہچانے نام اور کردار بن چکے ہیں۔ انھیں جس انداز میں سروانٹیز نے پیش کیا تھا وہ اسی طرح زندہ ہیں کہ انہوں نے زمانے کے اثرات قبول کرنے اور بوڑھا ہونے سے انکار کر دیا وہ امتداد زمانہ سے دھندلائے بھی نہیں۔ ان کے چہرے موثر ہیں۔ ایک ایک نقش واضح اور صاف ہے۔ نابوکوف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ۔

"وہ انسانی خیالات کے جنگل اور کرک کی دنیا میں گذشتہ ساڑھے تین سو برسوں سے اپنے گھوڑے پر سوار سفر کرتا چلا آرہا ہے۔ اب ہم اس کا مزید مذاق نہیں اڑا سکتے۔ وہ ایک لیجنڈ ہے۔ اس کا حسن اس کا جذبہ ترحم ہے۔ اس کا پرچم خوب صورتی ہے۔ وہ ہر اس چیز کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو نرم، تنہا خالص، بے نفسی اور شجاعت کہلاتی ہے۔ یہاں پیروڈی پیراگون بن گئی ہے۔"

سروانٹیز کے ڈان کیخوٹے کو دنیا کا پہلا جدید اور باقاعدہ ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عالمی نقادوں کی یہ متفقہ رائے نہیں ہے تاہم بہت سے نقاد اور عظیم لکھنے والوں نے "ڈان کیخوٹے" کو دنیا کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ نابوکوف نے اپنے لیکچرز میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں۔ تاہم اس کا ایک جملہ خاصا معنی خیز ہے نابوکوف ڈان کیخوٹے کے بارے میں کہتا ہے ؛

اس ناول ڈان کیخوٹے میں کئی نقائص اور خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن ڈان کیخوٹے آدمی مستحکم اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

—٭٭٭—

اس ہمیشہ زندہ رہنے والے ناول کا اردو میں رتن ناتھ سرشار نے ترجمہ کیا ہے جو بہت عرصہ پہلے نولکشور نے "خدائی فوجدار" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس ترجمے کے بارے میں مرحوم محمد حسن عسکری نے جو رائے دی ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ سرشار نے اس کا ترجمہ اپنے انداز میں کیا اور اسے کچھ کا کچھ بنا دیا جس کا اپنا ذائقہ اور حسن ہے اس میں سروانٹیز بہر حال موجود ہے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرتا تو یقیناً سرشار سے بہتر ہوتا۔ لیکن سرشار نے اسے

جو رنگ دیا ہے وہ کبھی اسے نہ دے سکتا۔

"سروانٹیز اور - ڈان کیخوٹے"

اپنی وفات سے چار دن پہلے سروانٹیز نے اپنے آخری بیٹے کا انتساب اپنے مربی کونڈے ڈی سیموس کے نام لکھا۔ اس نے لکھا۔

"الوداع زندگی کی شیریں ساعتو، الوداع میرے مسرور ساتھیو اور دوستو، کیونکہ میں نے محسوس کر لیا ہے کہ میں مر رہا ہوں۔ اب میرے دل میں ایک ہی خواہش ہے کہ میں آپ سب کو دوسری زندگی میں دیکھ سکوں ....."

وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میرے دکھ بڑھ رہے ہیں۔ امیدیں دم توڑ رہی ہیں۔

۲۳ر اپریل ۱۶۱۶ء کو ہفتے کے دن سروانٹیز کا انتقال ہوا۔ ولیم شیکسپیئر اور سروانٹیز کا یوم وفات ایک ہے۔ شیکسپیئر نے بھی یادگار کردار ڈراموں کے حوالے سے تخلیق کیے۔ لازوال ڈان کیخوٹے کا خالق بھی۔ اس اعتبار سے شیکسپیئر کا ہم پلہ ہے کہ اس نے بھی ایسا کردار تخلیق کیا جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن ان دونوں کی زندگیاں مختلف انداز میں گذریں۔

۲۳ر اپریل ۱۶۱۶ء کو سٹرا ٹفورڈ میں انتقال کرنے والا شیکسپیئر بڑے سکون اور آسودگی کے عالم میں اس دنیا سے اٹھا وہ خوش حال تھا۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اس نے زندگی کا بیشتر حصہ آسودگی سے بسر کیا تھا۔

۲۳ر اپریل ۱۶۱۶ء کو میڈرڈ میں انتقال کرنے والا سروانٹیز دوسروں کی فیاضی پر زندہ رہا۔ غربت کے خلاف ایک طویل جنگ لڑتے ہوئے وہ مرا تو بھی دوسروں کی نیک دلی اور فیاضی کا محتاج تھا۔

***

سروانٹیز ۹ر اکتوبر ۱۵۴۷ء کو پیدا ہوا۔ سلمانکا اور میڈرڈ میں تعلیم حاصل کی۔ بعض نقادوں نے رائے دی ہے کہ وہ اپنی تخلیق "ڈان کیخوٹے" کے مقابلے میں بہت "چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی تخلیق اس سے عظیم تر ہے وہ ایک روایتی ہسپانوی تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے کٹر کیتھولک۔

موروں اور بدعتی عیسائیوں کے خلاف سپین میں جو رسوائے زمانہ تعزیری محکمہ قائم ہوا وہ اس کا بھی معترف اور موید تھا۔

یہ حدود جو بعض نقادوں نے قائم کر دی ہیں۔ ان کی اس عظیم الشان قوتِ متخیلہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے سامنے کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ جنہوں نے ڈان کیخوٹے کو جنم دیا اور لازوال بنا دیا۔

ڈان کیخوٹے کو انسانی حماقتوں کی بائیبل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سپین کے دور انحطاط پر ایک طنز نہیں ہے بلکہ اس میں وہ آفاقیت ہے جس نے اسے ہر ملک کے ہر دور کے انسان کو متاثر کیا ہے۔ روایتی عہد شجاعت پر مبنی رومانس پڑھ کر ڈان کیخوٹے ہی جنم نہیں لیتا بلکہ خود سروانٹیز نے ایسے روایتی رومان خاصی تعداد میں پڑھے اور وہ ان کی تعریف پر آمادہ ہوا۔ لیکن اس میں جو عالمی اور آفاقی احساس اور صداقت ہے اس نے اسے لازوال بنا دیا۔ ڈان کیخوٹے اور سانچو پارنزا جا رہے ہیں۔ ایسے میں ڈان کیخوٹے ایک گیت گا رہا ہے۔

"میں جنگ پر اس لیے جا رہا ہوں کہ کچھ پیسے ہاتھ لگ جائیں اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں زیادہ شعور کا ثبوت دیتا۔"

کیا یہ دیوانگی نہیں۔ انسانی تاریخ میں لڑی جانے والی ہر جنگ کی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتی ہیں۔ کیا یہ ایک آفاقی سچائی نہیں ہے؟ کیا یہ ایک ایسی طنز نہیں ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ایسی کتنی ہی انسانی سچائیاں اور انسانی حماقتیں ہیں جنہوں نے ڈان کیخوٹے کو ہر دور کے لیے قابل قبول اور بامعنی بنا دیا ہے۔

سروانٹیز نے جس قدیم روایت شجاعت کو طنز کا ہدف بنایا ہے۔ اس کے معنی ہمہ گیر ہیں۔ ڈان کیخوٹے کے گہرے اور باطنی معانی سے پوری طرح متعارف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سروانٹیز کی زندگی کو بھی سامنے رکھا جائے خود سروانٹیز نے ایک ایسی زندگی بسر کی جو ایک شجاع KNIGHT کی مثالی زندگی تھی۔ اگرچہ اس کے معنی کچھ مختلف بنتے ہیں۔

سروانٹیز پیشہ ور سپاہی تھا۔ اگر قسمت اور حالات اس کے لیے ناسازگار نہ بن جاتے اور غربت کو دور کرنے کے لیے اسے جدوجہد کرنی نہ پڑتی تو شاید وہ کبھی مصنف نہ بن پاتا اس نے لکھنا صرف اس لیے شروع کیا کہ کسی طرح وہ اس دھندے سے روپیہ کما کر اپنی

غربت کو دور کر سکے۔ ڈان کیخوٹے میں ڈان کیخوٹے ایک جگہ لکھتا ہے۔

The Lance has Never Blunted the Pen, "Not the Lance."

والٹر سٹارکی نے اس ایک جملے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس ایک جملے میں سپین کی پوری تاریخ سما گئی ہے کیونکہ سپین ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی تاریخ کے ابتدائی دور سے اب تک ایسے مصنف پیدا ہوتے ہیں جو شاندار سپاہی بھی تھے۔۔۔۔

ڈان کیخوٹے کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے سے پہلے بھی سروانٹیز ایک بڑی شخصیت اور بہادر سپاہی تھا۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا شاہکار اور انسانی سچائیوں اور حماقتوں سے لبریز کتاب لکھنے سے پہلے اس نے اپنی عمر کا ایک طویل دور زندگی کے تجربات سے سبق حاصل کرنے میں بسر کیا تھا۔

چارلس ڈکنز، شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی طرح اس کے والدین بھی بے حد نادار اور غریب تھے۔ بھوک کا بھیڑیا ہمیشہ اس گھر کے دروازے بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا باپ روڈریگو ایک عطائی حکیم اور بہرہ بھی تھا۔ اس غربت اور ناداری نے سروانٹیز کے دل کو دوسرے انسانوں کے دکھ درد محسوس کرنے کا تجربہ عطا کیا۔ غربت و افلاس نے ہی سروانٹیز کو کنبے اور خاندان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ زندگی کے ناسازگار ترین لمحوں میں سروانٹیز کی ماں اور اس کی بہنوں نے جس حوصلے اور ایثار کا مظاہرہ کیا، سروانٹیز ساری عمر اس سے متاثر رہا۔ اس کی کوئی کتاب دیکھ لیجیے، اس میں غریبی اور ناداری کا موضوع کسی نہ کسی صورت میں اظہار پاتا ہے۔ 'ڈان کیخوٹے' میں وہ اس کا اظہار ایک ایسے انداز میں کرتا ہے جس کی مثال دنیا کے ادب میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اپنے مشہور عالم کردار سانچو پانزا کا تعارف کراتے ہوئے سروانٹیز ہمیں جس کرب سے آشنا کرتا ہے اور طنز کا جو وار کرتا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ سانچو پانزا۔ ایک ایماندار آدمی ہے۔ اگر ایسا القاب ایک ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہو جو غریب ہو۔'

شا کی طرح سروانٹیز افلاس اور ناداری کو جرم تو قرار نہیں دیتا لیکن ڈکنز کی طرح وہ ساری عمر اس احساس ناداری میں مبتلا رہا۔ اس سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔

جوان ہونے پر وہ فوجی مہموں میں شریک ہوا۔ ۱۵۷۱ء میں اس نے لیپانٹو کی جنگ میں حصہ لیا۔ شجاعت کے کارنامے انجام دیے اور زخمی بھی ہوا۔ ۱۵۷۵ء میں جب وہ کئی معرکوں کے بعد وطن واپس آ رہا تھا تو اس کے بحری جہاز پر حملہ ہوا وہ اور اس کے بھائی کو دشمنوں نے قیدی بنا لیا۔ انہیں الجزائر پہنچا دیا گیا کہ یا تو انہیں فروخت کر کے غلام بنا دیا جائے یا یرغمال کی رقم وصول کر کے واپس وطن بھجوا دیا جائے۔

سروانٹیز پانچ برس تک دشمنوں کی قید میں رہا۔ اس نے چار دفعہ فرار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۵۸۰ء میں سروانٹیز سپین واپس پہنچا۔ یرغمال کی رقم ادا کر کے اسے رہا کرایا گیا تھا اپنے گھر پہنچ کر اسے شدت سے احساس ہوا کہ گھر کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ اس کی ماں اور بہنوں نے اس کی رہائی کے لیے رقم جمع کرنے کے لیے دن رات محنت کی تھی۔ کتنے ہی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ جو اب قرض کی واپسی کا شدت سے تقاضا کرنے لگے۔ سروانٹیز کی شجاعت اور صعوبتوں کا اسے کوئی صلہ نہ ملا۔ کوئی مستقل ملازمت اسے نہ مل سکی۔ اس نے تصنیف و تحریر کے ذریعے پیسے کمانے کی کوشش کی۔ ۱۵۸۴ء میں اس کا ایک رومانس GALATEA چھپایا گیا لیکن اس سے اسے کچھ آمدنی نہ ہو سکی۔ وہ ایک کامیاب اور مقبول ڈرامہ نگار بن کر اپنی غربت دور کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ امیدیں بھی ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ سپین کے تھیٹر میں یہ دور لوپ ڈی ویگا جیسے ڈرامہ نگار کا تھا جو جوان تھا اور بڑی کامیابی سے اس فن میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ۱۶۱۳ء میں سروانٹیز نے اپنی کتاب " جرنی ٹو پارناسس " کے مسودے کے آخر میں لکھا تھا۔

When a poet is poor half of his Genuine Fruits and Fancies Miscarry. by reason of his Anxious cares to win the Daily Bread.

۱۵۸۴ء میں تولیدو کے قریب واقع ایک گاؤں کی ایک انیس سالہ لڑکی سے اس نے شادی کی۔ لیکن سروانٹیز کے حالات ایسے تھے کہ وہ اپنا کوئی گھر نہ بنا سکتا تھا۔ نہ ہی اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں عظیم ہسپانوی آرمیڈا تیاری کے مراحل سے گزر رہا تھا سروانٹیز بھی اس کی تیاری کے لیے مالی وسائل کے سلسلے میں سرکاری ملازم تھا۔ لیکن کبھی مستقل

اور بروقت تنخواہ نہ ملتی تھی۔ عرصے تک اس کی بیوی اپنے بھائیوں کے پاس رہی اور سروانٹیز سپین میں گھومتا رہا۔ آرمیڈا کی تیاری کے لیے رقم اور اشیا جمع کرنے والے عملے کا رکن بن کر بھوک اور فاقوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ۱۵۹۷ء اور ۱۶۰۲ء میں اسے دوبارہ جیل میں جانا پڑا۔

جرم۔ غربت!

۱۶۰۵ء میں ڈان کیخوٹے کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ جلد ہی ڈان کیخوٹے اور اس کے نائب سانچو پانزا کو پورے ملک میں شہرت حاصل ہوگئی اور اس کے فوری بعد یورپ میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ ابدی اور عالمگیر شہرت کا آغاز ہوا۔

پہلے حصے کی اشاعت، اس کی ملک گیر کامیابی کے باوجود سروانٹیز کی غربت دور نہ ہو سکی۔ اس نے اس کا انتساب اپنے مربی کاؤنٹ آف لیموس کے نام سے کیا۔ اور اس سے اپیل کی کہ وہ اس سے فیاضانہ سلوک کرے۔ کیونکہ وہ بیمار بھی ہے اور اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ اپنی غربت، بیماری اور ناسازگار حالات کی وجہ وہ دو برس تک اپنے کامیاب اور مقبول ناول کے دوسرے اور آخری حصے کو مکمل نہ کر سکا۔ ڈان کیخوٹے کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دوسرے مصنف آویلینیڈا نے اس کا دوسرا حصہ مکمل کر کے شائع کرا دیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے سروانٹیز کو کتنا بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔ بہرحال اس صدمے کو اس نے برداشت کیا اور "ڈان کیخوٹے" کو مکمل کر کے شائع کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

سروانٹیز نے "ڈان کیخوٹے" کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا۔

EXEMPLARY TALES (جس میں بارہ ناولٹ شامل ہیں) اس کا ایک خاصا وقیع کام ہے لیکن اس کی یہ کتاب اور یہ تحریر ڈان کیخوٹے کی شہرت کے نیچے دب چکی ہے۔

"ڈان کیخوٹے" اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ دنیائے ادب کا ایک لازوال شاہکار۔

مجھے اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک یا ندامت محسوس نہیں ہو رہی کہ میں اس مضمون کے اختتام پر "ڈان کیخوٹے" کی تلخیص پیش نہیں کر رہا۔ اصل میں میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کی تلخیص کا اہل نہیں یہ پوری کتاب ترجمہ ہونی چاہیے یا ایسے انداز میں اس کی تلخیص ہونی چاہیے جیسی والٹر سکاٹ کی نے کی ہے جو تلخیص ہونے کے باوجود ۶۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈان کیخوٹے ، پہ مضمون لکھنے کی تیاری کرتے وقت میں نے اسی کے کئی حصوں پر نشان لگائے کہ میں اس کے ان ٹکڑوں کا ترجمہ پیش کردوں گا لیکن بعد میں میرے لیے ان ٹکڑوں میں سے بھی کسی ٹکڑے کا انتخاب کرنا بے حد مشکل ہوگیا ۔

ڈان کیخوٹے کا ہوا چکیوں (WIND MILLS) پر حملہ دنیائے ادب میں ایک استعارہ اور عظیم علامت بن کر پوری دنیا میں مقبول ہوچکا ہے ۔ اسے ضرب المثل کی حیثیت بھی حاصل ہے ۔ اسی ٹکڑے کا تھوڑا حصہ ترجمہ کر رہا ہوں ۔ اس سے زیادہ کی نہ مجھ میں اہلیت ہے نہ یہاں گنجائش موجود ہے ۔

"پھر انہوں نے تیس یا چالیس ہوا چکیوں کو دیکھا جو سطح زمین پر ابھری کھڑی تھیں جونہی ڈان کیخوٹے کی نگاہ ان ہوا چکیوں پر پڑی ۔ وہ اپنے نائب سے مخاطب ہوکر بولا ۔

"قسمت ہماری آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے ہماری رہنمائی کر رہی ہے ۔ ہم نے جو چاہا تھا اس سے بھی بڑھ کر ہمیں مل رہا ہے کیا تم وہاں اوپر دیکھ رہے ہو میرے دوست سانچو پانزا ، تیس بلکہ اس سے بھی زیادہ دیو قامت عظیم الجثہ دشمن ۔ میں ان سے جنگ لڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور انہیں قتل کرنا چاہتا ہوں ۔ ان سے ملنے والے مال و دولت سے ہم دولت مند ہو جائیں گے ۔ ہاں یہ ایک مقدس جنگ ہوگی ان جیسے مغرور دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا خدا کی مرضی کے عین مطابق ہے اور اس سے وہ ہم پہ مہربان ہوگا ۔"

"کیسے دیو قامت لوگ ؟" سانچو پانزا نے حیرت سے پوچھا ۔

"وہ سامنے کھڑے دیو قامت لوگ ، جنہیں تم دیکھ رہے ہو ۔" اس کے آقا نے جواب دیا ۔ "وہی جن کے پاس لمبے لمبے ہتھیار ہیں ۔ ان میں سے بعض ہتھیار تو ناقابل بیان حد تک طویل ہیں ۔"

"جناب والا ، احتیاط سے کام لو ۔" سانچو نے جواب دیا ۔ "وہ جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں ۔ وہ دیو قامت انسان نہیں بلکہ ہوا سے چلنے والی چکیاں ہیں اور جنہیں تم ہتھیار سمجھ رہے ہو وہ ان کے پر ہیں یہی وہ پر ہیں جو ہوا سے گھومتے ہیں تو چکی کے پتھر کو بھی گھما دیتے ہیں ۔"

"صاف ظاہر ہے ۔" ڈان کیخوٹے نے جواب دیا ۔ "کہ تم مہم جوئی ۔ اور شجاعانہ کارناموں کا کوئی تجربہ

نہیں رکھتے۔ وہ دیو قامت لگ رہے ہیں اور اگر تم ان سے خوف زدہ ہو تو ایک طرف جاکر بیٹھ جاؤ اور میرے لیے دعا کرو کہ میں ایک ایسے معرکے میں لڑنے کے لیے جا رہا ہوں جو بے حد خوفناک ہے اور میرے مقابلے میں ان کی تعداد و قوت بہت زیادہ ہے۔

اپنے نائب و خادم سانچو پانزا کی چیخ و پکار سے بے خبر بڑبڑاتے ہوئے ڈان کیہوٹے نے اپنے گھوڑے روزی کو مہمیز لگائی۔ سانچو پانزا چیختا رہ گیا کہ آقا آپ دیو قامت دشمنوں پر نہیں بلکہ ہوا چکیوں پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ ڈان کیہوٹے اتنا مگن اور منہمک تھا کہ اس نے سانچو کی ایک نہ سنی۔ وہ ہوا چکیوں کو پورے خلوص سے طویل القامت جسیم دشمن سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ اب وہ ان ہوا چکیوں کے بہت قریب پہنچ چکا تھا وہ اپنے گھوڑے پر سوار اسے دوڑاتا ادھر بڑھتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"بزدلو! بھاگنا نہیں۔ دیکھو صرف اکیلا شجاع ہی تم سے لڑنے کے لیے آرہا ہے۔ اسی لمحے ہوا چلنے لگی اور ہوا چکیوں کے بڑے بڑے پر گردش میں آگئے۔ جب ڈان کیہوٹے نے یہ حالت دیکھی تو وہ پھر چیخا۔

"اگرچہ تمہارے بازو اور ہتھیار تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن تمہیں اس شجاع کی قوت کا اندازہ نہیں جو تمہیں مزہ چکھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔"

اسی طرح چیختے ہوئے اس نے اپنے چہرے کو خود کے پیچھے چھپا لیا۔ اپنے نیزے کو آگے بڑھاتا ہوا روزی نیت کو مہمیز لگائی اور راستے میں آنے والی پہلی ہوا چکی پر حملہ کر دیا۔ اس نے نیزہ ہوا چکی کے پر پر دے مارا لیکن ہوا اتنی تیز، ظالم اور قوی تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہوا نے اسے اس کے گھوڑے کو اپنے شکنجے میں کس کر پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔ ڈان کیہوٹے چیخ کر رہ گیا۔

سانچو پانزا کا گدھا جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا وہ اسے بھگاتا ہوا اپنے آقا کی مدد کے لیے پہنچا اس نے دیکھا کہ اس کا بہادر اور شجاع آقا حرکت تک کرنے سے معذور ہے۔

"خدا ہماری مدد کرے۔" سانچو بولا۔ "جناب کیا میں نے آپ سے عرض نہ کیا تھا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر ذرا ہوشمندی سے توجہ دیں۔ وہ تو ہوا چکیاں تھیں اور کوئی شخص اس وقت ان سے دھوکا نہیں کھا سکتا جب تک خود اس کے اپنے دماغ میں ہوا چکیاں بھری نہ ہوں۔"

"سانچو زیادہ تیزی نہ دکھاؤ۔" ڈان کیہوٹے نے کہا۔ "کیونکہ جنگ میں اشیا تیزی سے تبدیل

بھی ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ جادوگر ذلیستان جس نے تیرے گھر اور میری کتابوں کو ہتھیا لیا تھا۔ اسی نے ان دیو قامت دشمنوں کو ہوا چکیوں میں تبدیل کر دیا۔ تاکہ میں فتح کی شان و شوکت سے بہرہ مند نہ ہو سکوں۔ ہاں وہ میرا ایسا ہی دشمن ہے لیکن تم دیکھ لینا آخر میں اس کی ساری برائی اور شیطنت میری تلوار کے سامنے دھری کی دھری رہ جائے گی۔

خدا کے راہ نیارے ہیں۔ سانچو پانزا۔ نے اپنے آقا کو زخمی حالت میں زمین سے اٹھنے میں مدد دیتے اور گھوڑے پر سوار کراتے ہوئے کہا۔

یولیسز

ناول کی صنف میں جو ایک بڑا انقلاب آیا۔ ہم جسے 'جدید ناول' کہتے ہیں اس جدید ناول کے معماروں میں ہنری جیمز (بالخصوص اس کا ناول "دی ایمبیسڈرز") مارسل پروست "ری ممبرینس آف تھنگز پاسٹ" اور جیمز جوائس ہیں۔ یہ تینوں ناول نگار جو ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ان کے ہاں بعض ایسی مشترک خصوصیات اور اقدار ملتی ہیں جن کی بدولت ہمارے دور کے عالمی ادب میں ناول کی جدید صورت گری ہوئی۔

جدید اور قدیم یا روایتی ناول میں بنیادی فرق کیا ہے۔ یہ ایک اور الجھا دینے والی بحث ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ روایتی اور قدیم ناول زندگی کی خارجی حقیقتوں کی عکاسی کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔ یہ حقیقت "روزمرہ" کی حقیقت جیسی ہوتی تھی۔ جبکہ نیا اور جدید ناول انسان کے باطنی اور نفسی تجربے کا اظہار بنتا ہے اور ناول نگار داخلی اور ذاتی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے قاری کو اپنی ذات کے اندر کے سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ عام قاری جو اس سفر کی صعوبتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ جدید ناول سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتا۔

جیمز جوائس کا پڑھنا ایک دقت طلب تجربہ بنتا ہے۔ یقینی امر ہے کہ ہر قاری اس تجربے سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

جیمز جوائس ۲ فروری ۱۸۸۲ء ڈبلن (آئرلینڈ) میں پیدا ہوا۔ جوائس کی ماں نے چودہ بچوں کی ماں بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کا والد ایک ٹیکس کلکٹر تھا۔ خاندان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ مختلف ادوار میں جوائس نے جیسوئٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ

مطالعہ کا رسیا تھا۔ ابسن اس کا پسندیدہ ڈرامہ نگار تھا۔ ۱۹۰۰ء میں ہی اس نے ابسن کے ڈراموں پر ایک مضمون لکھ اور چھپوا کر اپنے ساتھی طالب علموں کو حیران کر دیا تھا۔

اس نے ڈبلن یونیورسٹی کالج سے گریجوایشن کی اس کے بعد اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے ملک سے باہر بسر کیا اس نے بوہیمین انداز کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ پیرس چلا گیا تھا جہاں گزر بسر کے لیے وہ آئرلینڈ کے جریدوں میں کتابوں پر تبصرے چھپواتا رہا۔ جب اس کے والد نے اسے اطلاع دی کہ اس کی والدہ مرنے والی ہے تو جوائس ڈبلن پہنچا۔ اس کی والدہ کا انتقال ۱۳ اگست ۱۹۰۳ء کو ہوا۔

جون ۱۹۰۴ء کو اس کی ملاقات نورا بارنیکل سے ہوئی۔ جوائس اس سے محبت کرنے لگا۔
جوائس اپنے کیتھولک عقیدے سے برگشتہ ہو چکا تھا اور نورا کے ساتھ بغیر شادی کیے زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ ایسا آئرلینڈ میں ممکن نہ تھا۔ اس لیے یہ جوڑا پہلے زیورچ گیا جہاں جوائس کچھ عرصہ ایک سکول میں پڑھاتا رہا۔ یہاں سے وہ پولا (یوگوسلاویہ) گیا یہاں بھی وہ انگریزی پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد وہ ٹریسٹے چلا گیا۔ یہاں ۱۹۰۵ء میں وہ ایک بیٹے اور ۱۹۰۹ء میں ایک بیٹی کا باپ بنا اس دوران میں جوائس روم میں ایک بینک میں کچھ عرصے کے لیے کلرکی بھی کرتا رہا۔ اس زمانے میں اس کی نظموں کا مختصر سا مجموعہ "چیمبر میوزک" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈبلنرز" کوئی ناشر شائع کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بصد دشواریوں اور دقتوں کے بعد کہانیوں کا مجموعہ "ڈبلنرز" ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔

جوائس کی عمر کا بیشتر حصہ ناداری اور تنگدستی میں بسر ہوا۔ دولت مند بننے کے لیے نت نئی سکیمیں بناتا لیکن ان میں اسے عملی طور پر کامیابی نہ ہوئی۔ بچپن سے ہی اس کی بینائی کمزور تھی اور بینائی کے سلسلے میں بھی وہ ساری عمر پریشان ہی رہا۔ بعض نقادوں نے اس کی کمزور بینائی کو اس کی داخلیت پسندی کا بڑا سبب بتایا ہے۔

۱۹۱۴ء میں کہانیوں کے مجموعے "ڈبلنرز" کے علاوہ اس کا ناول "اے پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ینگ مین" شائع ہوا۔ اس کی اشاعت میں ایزرا پاؤنڈ کا بڑا ہاتھ تھا۔
جوائس نے پہلی جنگ عظیم کا زمانہ جلاوطنی میں ہی گزارا اور جنگ کے معاملہ میں وہ خاموش

اور غیر جانبدار رہا۔ جنگ کے بعد جوائس کا زیادہ وقت "یولیسز" لکھنے میں گزرا۔ اس کا ایک مداح اسے کچھ مالی مدد فراہم کرتا رہا۔ جوائس جز وقتی طور پر انگریزی بھی پڑھاتا رہا۔ بالآخر اس کی سالگرہ کے دن ۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو "یولیسز" شائع ہوا۔ اس برس جوائس بچوں کے ہمراہ آئرلینڈ اپنے وطن پہنچا لیکن وہ زیادہ وہاں نہ رک سکا کیونکہ آئرلینڈ میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اور ساتھ ہی جوائس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ وہ پیرس چلا گیا۔ آنکھ کی تکلیف پھر ساری عمر کا روگ بن گئی۔ لیکن وہ اپنا ناول فنیگنز ویک لکھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھ کا کئی بار آپریشن ہوا۔ اس نے ۱۹۳۱ء میں انگلستان میں شہری حقوق حاصل کرنے کی نیت سے اپنے بچوں کی ماں نورا سے "روایتی نکاح" بھی پڑھوایا۔ "یولیسز" کی شہرت اور کامیابی نے جیمز جوائس کو قدرے خوش حالی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اس ناول پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ بھی چلا تھا جو ایک علیحدہ روداد ہے۔

جوائس کی ایک بیٹی ذہنی توازن سے محروم ہو گئی۔ زندگی کے آخری برس جوائس اپنی اس چہیتی بیٹی لوسیا کے علاج میں مصروف رہا۔ زیورچ میں اس کا علاج ہو رہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔

۱۳ر جنوری ۱۹۴۱ء کو جوائس کا انتقال زیورچ میں ہوا۔

***

"یولیسز" کا مطالعہ ایک مشکل کام ہے اور اس کو پوری طرح سمجھنا اس سے بھی مشکل تر ... جیمز جوائس کا آخری ناول "فنیگنز ویک" کے بارے میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اسے سمجھنے والوں کی تعداد گنتی کے لوگوں کی رہی ہے ..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "یولیسز" کو پڑھنا اور سمجھنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں .....

وہ لوگ جو دنیا کے اس عظیم ناول سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ "یولیسز" پڑھنے سے پہلے جوائس کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈبلنرز" پڑھیں۔ اس کے بعد اس کا ناول "اے پورٹریٹ"۔ جوائس کی ہر تصنیف کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ "QUASI AUTO BIOGRAPHICAL" ہے۔ "ڈبلنرز" اور "اے پورٹریٹ" پڑھنے والے کے لیے "یولیسز" آشنا اور آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسلوب جو "یولیسز" میں اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ اس کا تجربہ جوائس نے اپنی کہانیوں اور

پہلے ناول "اے پورٹریٹ" میں کیا تھا۔ پھر ان کہانیوں اور پہلے ناول کے کردار ہی ہیں جو "یولیسز" میں گھٹتے بڑھتے ملتے ہیں۔

"یولیسز" کی نثر اور اسلوب کے حوالے سے ایڈمنڈ ولسن نے جو مضمون جیمز جوائس کا "یولیسز" کے عنوان سے لکھا ہے بہت اہم ہے۔ ایڈمنڈ ولسن نے یولیسز کو فلابیر کے ناولوں کے بعد "ایک مکمل لکھا ہوا ناول" قرار دیا ہے۔ فلابیر کی نیچرلزم اور جوائس کی سمبلزم کے امتزاج سے جو اسلوب اور نثر اس ناول میں پڑھنے کو ملتی ہے وہ انگریزی ادب میں ایک یکتا اور منفرد چیز ہے۔ اسی حوالے سے مرحوم محمد حسن عسکری نے لکھا ہے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ جوائس کے طریقۂ کار اور تکنیک کو سمجھے اور اسے ذہن میں رکھے بغیر اس کی کتابوں سے لطف نہیں اٹھایا جا سکتا .... جو لوگ کل تک جوائس کے مخالف تھے وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے جا رہے ہیں کہ اس کا شمار یورپ کی تہذیب کے پیدا کیے ہوئے بڑے سے بڑے آدمیوں میں ہے۔"

(جھلکیاں محمد حسن عسکری صـ۲۰۴)

انگریزی ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے جوائس کے بارے میں بڑی سخت اور درشت آرا دی ہیں۔ مڈلٹن مری جیسے نقاد نے جوائس اور لارنس کا موازنہ کرتے ہوئے جوائس کو بنجر اور ڈی۔ ایچ لارنس کو زندگی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ای ایم فورسٹر جیسے ناول نگار اور نقاد نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ

"جوائس نے زندگی کو گندگی سے ڈھک دیا ہے۔"

ایسی سخت، درشت اور دو ٹوک تنقید و تنقیص کے باوجود "یولیسز" بیسویں صدی کا اور عالم ادب کا عظیم شہکار ہے۔

یولیسز کی عظمت اس کے اسلوب، تکنیک اور جوائس کے تصور حقیقت میں مضمر ہے۔ وہ انسان کو سب سے کم اور غیر آدرشی صورت میں پیش کرتا ہے اور انسان کو مکمل سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کے ہاں کردار نگاری جو صورت اختیار کرتی ہے اس کے بارے میں ایڈمنڈ ولسن لکھتا ہے:

"جوائس نے یہ فریضہ اپنے ذمے لیا تھا کہ ... کے کر ... ار جن ... مناظر آوازوں

میں حرکت کرتے ہیں ان کا مکمل حسن اور صحت کے ساتھ بیان کرے۔ اور پھر اس
الزکھے ذخیرۂ الفاظ کا صحیح استعمال اور دریافت اور ان کا آہنگ، جن کے حوالے
سے ہر کردار کے اس کے اپنے خیالات کا اظہار ہو سکے۔"

(پورٹریٹ جوائس - صہ ۱۵۱)

جوائس نے مشکل ترین کام کا فریضہ ادا کیا ہے۔ انسانوں کے شعور کے اندر اترنے کا۔ یہ بھی
ایڈمنڈ ولسن ہی کا کہنا ہے کہ ہم جوں جوں یولیسز پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس ناول کی نفسیاتی سچائی
کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ ایڈمنڈ ولسن نے یولیسز کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے۔

"جوائس بلاشبہ انسانی شعور کے ایک نئے دور کا عظیم شاعر ہے۔" صہ ۱۸۵

اور یولیسز کے حوالے سے جوائس ادب میں ایک انتہائی اور نئی خوب صورتی لیکر آیا ہے۔"

صہ ۲۱۸

ڈ ئیٹس جیسے شاعر نے اپنے دور کے لکھنے والوں میں سے جوائس کو عظیم نثر نگار قرار دیا تھا۔
مارچ ۱۹۱۸ء میں امریکہ کے رسالے EGOIST میں یولیسز قسط وار شائع ہونا شروع ہوا ایذرا
پونڈ کے عمل دخل سے نیویارک میں بھی یہ بیک وقت قسط وار شائع ہونے لگا۔ لیکن ایک برس
بعد اس کی قسط وار اشاعت روکنی پڑی۔ کیونکہ اس کو مخرب الاخلاق قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں کہیں
جا کر امریکہ میں قانونی طور پر یہ ناول شائع ہوا۔

یولیسز کی نثر میں جو عناصر شامل ہیں ان کی مختصراً یوں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ جدید شعریت
سمبلزم امیج اور ابہام اور پھر EPIPHANY۔

سٹوارٹ گلبرٹ نے جیمز جوائس پر اہم ترین کام کیا ہے۔ گلبرٹ سے جوائس نے خود کہا تھا
کہ اس کا ناول "یولیسز" ہومر کی عظیم رزمیے "اوڈیسی" کے مماثل ہوگا مقام عمل کے لیے ڈبلن پوری
جغرافیائی صداقت کے ساتھ اور اس کی صداقت کے ساتھ ساتھ ناول میں
زیریں سطح پر فنون کا بیان جیسے دینیات تاریخ وغیرہ اور پھر عہد وسطیٰ کی مماثلت کے مطابق
اس کی تجسیم اور اس کے اختصار ڈرامائی اور نغمگی سے بھرپور اظہار جو تجربے کی بھٹی سے نکلا ہوا
ہو اور مرکزی کرداروں کے ذہنی اور جسمانی تجربات کا اظہار ہو۔

"یولیسز" کا عمیق مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ ڈیڈلاس کی صبح پر اور دوسرا بلوم کی ڈبلن کی سرگشت پر اور تیسرا بلوم کا گھر اپنی بیوی کے پاس اور سٹیفن کی اپنے باپ کے پاس واپسی پر......

عمیق اور گہرے مطالعے سے ہی یولیسز کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ یہ اوڈیسی کے دیو مالائی عنصر کے بھی عین مماثل ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے اس حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ خصوصی مطالعہ کا حامل ہے۔

پروفیسر ٹنڈل نے "یولیسز" کی تفہیم پر جو کتاب لکھی ہے وہ اس ناول کے اعماق کی بھرپور نشاندہی کرتی ہے۔

ان خصوصیات کے علاوہ جس خوبی کی وجہ سے "یولیسز" نے اپنی اشاعت کے زمانے میں ادبی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ اس کے کرداروں کے ذہنی تجربوں کی پیش کش ہے۔ ذہنی تجربوں کو اس اسلوب میں بیان کیا گیا ہے جسے عرف عام میں "شعور کی رَو کہتے ہیں جس میں داخلی مکالمہ خاص کردار ادا کرتا ہے اس لیے جب ہم اس ناول کے کسی کردار کو پڑھتے اور محسوس کرتے ہیں تو ہم دنیا کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ دیکھ رہا ہے۔ سٹورات گلبرٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یولیسز" میں۔

Joyce does not give us the raw material of the mind but the illusions of the mind,s natural flow."

کیونکہ جوائس کوئی "نام نہاد نفسیات داں تو ہے نہیں کہ وہ حقیقی آدمیوں کے ذہنی اعمال کو دستاویزی صورت دے رہا ہو اور ہمیں یہ بتانا چاہتا ہو کہ "شعور" کیا ہوتا ہے۔ جوائس تو فنکار ہے جو فن کا ایک شہکار تخلیق کر رہا ہے۔ وہ اپنی تفصیلات اور جزئیات اس انداز سے انتخاب کرتا ہے کہ جس سے ایک خاص ڈرامائی لمحوں سے گذرنے والے خاص ذہن کی پوری کیفیت اور فضا کا اظہار ہو سکے۔ اس سلسلے میں اس کے پاس اظہار کا ذریعہ زبان ہے اور زبان کو جس انداز سے جوائس نے استعمال کیا ہے اس کی مثال پورے انگریزی ادب میں نہیں ملتی محمد حسن عسکری نے جیمز جوائس پر اپنے مضمون میں اس سلسلے میں چند مثالیں دی ہیں ان سے جوائس

کے اس کمال کو سمجھا جا سکتا ہے اور پھر میں یہ اعادہ کردوں گا کہ اس زبان کی وسعت، حسن اور معنویت کا پورا حظ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ "یولیسز" سے پہلے "ڈبلنرز" اور "اے پورٹریٹ" کو پڑھ لیا جائے۔ کیونکہ اس طرح "یولیسز" کا مطالعہ بہت آسان ہو جائے گا۔

اس ناول کے کردار سٹیفن، بلوم اور مولی کے حوالے سے ہم انسانی ذہن کی اس کائنات سے متعارف ہوتے ہیں۔ جو یولیسز کے مطالعے سے پہلے ہماری نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ پروفیسر ٹنڈال نے اس ناول کے کردار مسز بلوم کے حوالے سے عورت کے باطنی شعور کو سمجھنے کے سلسلے میں جوائس کو جو خراج پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ اس کردار کی سچائی اور بڑائی کا مظہر ہے۔

"یولیسز" کو پوری طرح سمجھنے کے لیے بعض حوالوں، علامتوں، اساطیر اور تخلیقی فن پاروں کے بارے میں بنیادی معلومات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اس عظیم فن پارے کی گہری اور پوری معنویت تک پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ "یولیسز" میں (بلکہ جوائس کی ہر تحریر میں) وقت کا جو تصور اور اہمیت ہے اس کو پڑھتے ہوئے ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

عالمی ادب اس منفرد اور شاہکار ناول "یولیسز" پہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس ناول کا پڑھنا اور سمجھنا ایک عظیم تجربہ ہے۔ اس حوالے سے جیمز جوائس کے ناول یولیسز کے بارے میں چند کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے ان میں سے چند کتابوں اور اہم مضامین کے نام دے رہا ہوں۔

"جیمز جوائس اینڈ دی میکنگ آف یولیسز" (فرینک بڈگن)، یولیسز "آرڈر اینڈ میتھ" (ٹی ایس ایلیٹ)، جیمز جوائس ز یولیسز (سٹورٹ گلبرٹ)، دی سٹرکچر آف دی ناول" ایڈون میور) لٹریری ایسیز (ایذرا پونڈ) ولیم ٹنڈال کا مضمون "جیمز جوائس ہزوے آف انٹرپریٹنگ دی موڈرن ورلڈ اینڈ مندرسن کا مضمون "جیمز جوائس۔ یولیسز۔"

اس مضمون میں میں نے دانستہ اس ناول کے کرداروں اور تکنیک کے حوالے سے کوئی اشارہ نہیں دیا کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ مضامین کے قاری۔ اس مضمون کے حوالے سے اپنے اندر یہ تحریک پیدا کریں کہ وہ خود اس عظیم ناول کا مطالعہ کر سکیں۔ جوائس نے ایک بار لکھا تھا۔ "میں اپنی روح کی بھٹی میں اپنی نسل کا ضمیر بنانے جا رہا ہوں۔" یولیسز" اس کی روح کی بھٹی سے نکلا ہوا فن پارہ ہے۔ !!

پوشکن

نظمیں

گوگول نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"پوشکن کے نام سے ہی فوراً روسی قومی شاعر کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ پوشکن ایک غیر معمولی مظہر اور غالباً روسی روح کا مظہر ہے۔ اس میں روسی مناظر قدرت، روسی جذبات روسی زبان اور روسی کریکٹر کی عکاسی ایسی پاکیزگی اور شفاف حسن کے ساتھ ملتی ہے۔ جیسے وہ شیشے کی اُبھری ہوئی سطح سے معکوس ہو رہی ہے..."

"پوشکن عظیم روسی عوامی شاعر، دل کش حسین اور دانش مندانہ کہانیوں کا بانی پہلے حقیقت پسند ناول یوگینی انوگین" اور ہمارے ڈرامے بورس گردونوف کا مصنف، ایسا شاعر جس کی شاعری کے حسن اور فکر و خیال کے اظہار کی طاقت کو ابھی تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ شاعر جو عظیم روسی ادب کا خالق تھا اور جانے وہ کونسا لمحہ تھا جب پوشکن نے اپنی نظم میں لکھا تھا۔

" اور۔ ایک دن ایک نیک دل راہب
ادھر آنکلے گا اور وہ امتداد زمانہ سے
پیلے پڑ جانے والے گرد آلود کاغذوں پر سے گرد
جھاڑ دے گا۔

اور اس کے آنسوؤں سے
ایک ایک گرد آلود لفظ جگمگا اُٹھے گا...."

زمانے نے پوشکن کے کسی حرف کو گرد آلود نہیں ہونے دیا۔ اس نے جو لکھا وہ موجود اور روشن

ہے وہ دنیا کے چند بڑے شاعروں میں شمار ہوتا ہے اور بلاشک وشبہہ وہ روسی ادب کا خالق ہے۔ روس کے قومی ادب کا خالق جس کے بغیر روسی ادب کا تصور بھی محال ہے۔

وہ ۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا والد دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے پوشکن کی والدہ ابراہام ہانیبال کی نواسی تھیں جو ایک حبشی شہزادہ تھا۔ پوشکن فطری جذبات رکھنے والا حریت پسند شاعر تھا۔ ظلم واستبداد کا دشمن، آزادی کا عاشق عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والا۔ روس کے زار نے پوشکن کی شاعری کے بارے میں بڑی ناراضی سے کہا تھا۔

"پوشکن نے نفرت انگیز شاعری سے روس کو پاٹ دیا ہے۔ پوشکن کو اس جرم میں سائبیریا جلا وطن کر دینا بہتر ہوگا۔"

یہ سزا تو اسے نہیں ملی لیکن اسے پیٹرزبرگ سے روس کے جنوبی علاقے میں جلا وطن کر دیا گیا ۱۸۲۰ء میں پوشکن کی پہلی تصنیف "رسلان اور لیودمیلا" مکمل کی جو ایک نظم ہے۔ اس نظم کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ژوکوفسکی جیسے بزرگ شاعر نے نظم سے متاثر ہو کر اپنی تصویر پوشکن کو بھیجی اور اس پر لکھا "شکست خوردہ استاد کی طرف سے فتح یاب شاگرد کو" اس کے بعد اس کی کئی نظمیں شائع ہوئیں جنھوں نے اسے شہرت سے ہمکنار کیا۔ ایک طویل نظم ... جو ۱۸۲۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ خاص نوعیت کی ڈرامائی نظم ہے۔ اس نظم کا ہیرو ... صرف اپنے لیے آزادی کا خواہاں ہے۔ یہ "پُرفخر انفرادیت" کے خلاف ایک ایسی نظم ہے جو شہر والوں کی غلامانہ ذہنیت کی مذمت بھی کرتی ہے

پوشکن اور زار شاہی کے درمیان ہمیشہ ٹھنی رہی۔ ۱۸۲۴ء میں اسے دور افتادہ صوبے پسکوف میں بھیج دیا گیا۔ یہ بھی ایک سزا تھی لیکن اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی وہ روسی عوام کے دل میں اپنا گھر بنا چکا تھا۔

پوشکن نے عوامی کہانیوں کو منظوم کیا روسی تھیٹر کو حیاتِ نو بخشی۔ "بوریس گودونوف" روسی ادب کا ہی نہیں عالمی ادب کا ایک شہکار المیہ ہے۔ اس لیے یہ اس نے مطلق العنانی کو مسترد کر دیا۔

۱۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو پیٹرزبرگ میں "دسمبر والوں" کی بغاوت ہوئی جو ناکام رہی۔ پوشکن

۱۸۲۶ء کے موسم خزاں میں پوشکن ماسکو لوٹا ۱۸۲۸ء میں اس نے رزمیہ نظم "پولتاوا" لکھی۔
۱۸۳۳ء میں اس کی شہکار منظم "تانبے کا شہسوار" شائع ہوئی۔

اس سے پہلے ۱۸۳۰ء میں پوشکن نے اپنا عظیم منظوم کارنامہ "ایوگینی ادنیگین" ختم کیا
اس منظوم ناول پر اس نے آٹھ برس لگائے تھے۔ (انگریزی میں اس کا سب سے اچھا ترجمہ
نابوکوف نے کیا ہے) ایوگینی ادنیگین اس کا سب سے اچھا ترجمہ نابوکوف نے کیا ہے) ایوگینی اد
اس کا رہ کارنامہ ہے جسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے عظیم روسی نقاد اور جمہوریت پسند ولسیار
بیلنسکی نے پوشکن کی اس تصنیف کو "روسی زندگی کا انسائیکلوپیڈیا کہا تھا۔
روس کے لوگ کس مزاج کے ہیں۔ روس کا اپنا مزاج اور لینڈ سکیپ کیا ہے۔ روسی کس طرح
سوچتے ہیں۔ ان کا تمدن کیا ہے۔ یہ منظوم ناول اس کا جواب ہے۔
اس منظوم ناول میں پیٹرزبرگ، ماسکو اور ان روسی صوبوں کی زندگی سامنے آتی ہے جن
کا اس منظوم ناول کے ہیرو ادنیگین نے سفر کیا تھا۔ ناول کے وسیع حقیقت پسند کینوس پر اس زمانہ
کے روس کے سماج کی سچی تصویریں سامنے آتی ہیں روس کی سرزمین اس منظوم ناول میں اپنے
لینڈ سکیپ کے ساتھ جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی سامنے آتی ہے۔
"ایوگینی ادنیگین" نے سفر کیا تھا۔

"ایوگینی ادنیگین" عالمی ادب کا شہکار ہے۔ یہ منظوم ناول دنیائے ادب میں ایک ایسا
مقام رکھتا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
۱۸۳۱ء میں پوشکن کی زندگی کا اہم واقعہ شادی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کی شادی
ماسکو کی ایک بہت حسین نازنین نتالیا گوںچاروا سے ہوئی۔
پوشکن کو روسی ادب کا باوا آدم کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ اس کی عظیم شاعری ہی نہیں
پوشکن نے روسی زبان کی نثر کو بھی ایسا حسن عطا کیا ہے جو پہلے خال خال ہی تھا۔ اس کی تحریروں
میں آزادی سے محبت، جمہوریت پسندی خاص عناصر ہیں اس کے علاوہ اس نے نثر کو سادگی
حسن بخشا۔ ایمائیت اور اختصار بندی نے اس کی نثر کو چار چاند لگا دیئے بیلکن کی کہانیاں اور
کی بیگم" اس کے نثری شاہکار ہیں۔

حکم کی بیگم اس کی وہ طویل مختصر کہانی یا ناولٹ ہے جس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے
ا کرشن چندر نے تو اسے اپنی ایک کہانی میں پوشکن کے حوالے کے بغیر برتا بھی ہے۔ نثر میں شہرت
حکم کی بیگم کو حاصل ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ شہرت "کپتان کی بیٹی" (۱۸۳۶ء) کی اشاعت
سے ہوئی۔

پوشکن کی شاعری میں جو عظیم اور ابدی مقام اس کے منظوم ناول "ایوگینی اونیگین کو حاصل
ہے۔ نثر میں وہی مقام کپتان کی بیٹی" کا ہے۔

اس کا آخری شہکار "دوبروسکی" ہے۔ ایک ناول جو پوشکن کی وفات کے بعد ۱۸۴۱ء میں شائع
ہوا۔ اس میں اس کی تمام تر ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ ہیں۔ روسی جاگیرداری نظام کے خلاف
یہ ناول جہاں ایک احتجاج کا درجہ رکھتا ہے وہاں حقیقت نگاری میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔
پوشکن کی زندگی کے آخری برس بہت کٹھن تھے۔ زار روس سے تعلقات بے حد خراب ہو چکے
تھے۔ درباری اس کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

پوشکن نے فرانسیسی نژاد دانتیس کے ساتھ ڈوئل لڑا جس میں اسے مہلک زخم لگا اور جوانی
میں ۲۹ جنوری ۱۸۳۷ء کو ختم ہو گیا۔ اس کی موت پر لرمنتوف نے جو نظم لکھی اس کی پاداش میں سزا
ملی۔ لرمنتوف کے عظیم ناول THE HERO OF OUR TIMES کا ترجمہ اردو ادب میں ہو چکا ہے۔

تیوتچیف نے پوشکن کے بارے میں ایک نظم میں کہا تھا۔

"پہلی محبت کی طرح تجھے
روس اپنے دل سے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

اور ایک زمانے میں پوشکن نے کہا تھا۔

روس کی وسعتوں میں چرچا میرا ہی ہوگا
اور نام میرا ہر اک کی زباں پہ ہوگا

آج پوشکن کا نام صدیوں سے ہر پڑھنے سننے والے کی زبان پر ہے وہ ایک خلاق ذہن
کا مالک تھا ایک ایسا لکھنے والا، ایک ایسا انسان جس نے ایک بڑے ملک اور بڑی زبان کے
قومی ادب کی بنیادیں رکھیں اور دنیا میں اپنے فن کی بدولت بقائے دوام کا تاج پہنا۔

پوشکن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کی عظیم تصانیف کے سامنے میں ایک متحیر بچّے کی طرح کھڑا اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

وہ کس اعتبار سے عظیم ہے؟ اس سوال کا جواب بے حد آسان ہے۔ اس کے بارے میں کچھ ذکر ہو بھی چکا۔ لیکن اس کی کونسی تصنیف عظیم ہے کونسی ایسی کتاب جو دنیا کی سو بڑی کتابوں میں شامل ہو سکتی ہے تو اس سوال کا جواب میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کی نظم "بنجارے" اس کا منظوم ناول "ایوگینی" اونیگین یا پھر اس کے نثری شاہکار "کپتان کی بیٹی" اور "حکم کی بیگم یا پھر اس کا ڈرامہ گُردونوف" انتخاب کو کرے سے کرلا کریں تو پھر شاعری میں "ایوگینی اونیگین اور نثر میں کپتان کی بیٹی"

وہ جتنا بڑا شاعر تھا۔ اتنا ہی بڑا نثر نگار تھا۔!

"ایوگینی اونیگن" کو اس کی شاعری، دنیا کی شاعری کا شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس منظوم ناول کی شاعری دنیا کی بہترین شاعری ہے۔ اس سے کچھ اقتباسات اور کچھ اس کی نظموں کے تراجم پیش خدمت ہیں۔!! تراجم۔ ظ۔ انصاری کے ہیں۔

میں نے چاہا تمہیں، تم سے محبت کی تھی
کیا خبر آج بھی دل میں دبی چنگاری
خیر اب آنچ میں کیوں اسکی جلاؤں تم کو
جی نہیں مانتا کچھ ٹھیس لگاؤں تم کو
دل دکھے جس سے وہی بات سناؤں تم کو
تھی محبت میں گلے کی نہ صلے کی پروا
بے زبانی سے، کبھی رشک سے دل ٹکڑے تھا
جس نزاکت سے لگن سے تمہیں چاہا میں نے
یوں ہی ہو جائے کوئی اور بھی۔ اللہ کرے

اب نیلے گنبد کے نیچے
پھیلے ہیں برف کے غالیچے
کیا شان دکھاتے ہیں دن میں، کیا دھوپ میں چم چم کرتے ہیں
اس اُجلے ستھرے منظر میں شفاف سا جنگل بکھرا ہے
پالے کی ہلکی چھینٹوں سے دادوار کا سبزہ نکھرا ہے
اور پتھر جیسے برف تلے دھارے بھی نرم گزرتے ہیں

کہرے میں روپہلی دھوپ لیے
دن آیا اُجلا روپ لیے

چولہے میں بھرے ہوں انگارے
اور چٹ چٹ اُڑتی چنگاری
بستر میں پڑے ہوں سوچ میں گم
تب لطف ہے موسم کا پیاری

پنچھی ہے آزاد چمن میں
کیسی فکر کہاں کا دھندا
اُڑنا پھرنا ہر آنگن میں
اس دُھن کو کیا کرنا ہے جو
تنکے چُن چُن چھپر بنائے
ہے وہ رین بسیرا اس کا
جس ٹہنی پر آنکھیں میچے
جس ٹہنی پر نیند آ جائے
جب سورج کی لال کٹوری
نکلے اور اُجالا چھلکے

پنچھی اپنے رب کا حکم سن کر مجھ سے ہلکے ہلکے چپکے اور بھجن خود گائے۔

جب رُت بدلے آئی گرمی

اور بہاروں کی سب نرمی

دھوپ میں جھلسے، پیاس سے پھڑکے

اور پھر جب دن ہوں پت جھڑ کے

بادل گرجیں، بجلی کڑکے

آدمی کتنے دکھ بھرتا ہے

سردی، گرمی، آندھی، پانی

سب کے ساتھ گزر کرتا ہے

لیکن پنچھی کیوں غم کھائے

پھر سے اچھی رُت آنے تک دور سمندر پار اُڑ جائے

کون رکھے اسے بندھن میں

پنچھی ہے آزاد چمن میں (بنجارے)

سرسوتی نہ جب تک اس کو دے صدا،

کوئی کہاں ہے تو ہماری بھینٹ لے کے آ

کوئی کہیں

جہاں کے چھوٹے موٹے کاروبار میں دبا ہوا

وہ بے دلی سے فکرِ روزگار میں دبا ہوا

پڑا رہے۔

ستار اس کا بے نوا رہے

نشے میں نیند کے مگن کوئی کی آتما رہے

جو مٹ چکے ہیں لذتوں کی راہ میں

جو گر گئے ہیں ہوش کی نگاہ میں

عجب نہیں کہ ان سے بھی ذلیل و خوار ہو کوی
مگر ذرا صدائے غیب آئے گی
شعور کو چھوئے گی ..... اور
شاعرانہ روح کو جگائے گی
کوی اُٹھے گا اپنے من کی آنکھیں کھولتا ہوا
عقاب کے مثال شہپر کو تولتا ہوا
زمانے بھر کی دل لگی،
چبھے گی بن کے اک سوئی
زبان آس پاس کی
لگے گی اس کو اجنبی
وہ جن کو پوجتا ہے جگ، بنائے اپنا دیوتا
یہ خود پسند سر کبھی، جھکے نہ جھک سکا
وہ آپ اپنی ذات میں ہی محشر خیال ہے
خود اپنے زمزموں سے مالا مال ہے
یہ روز کا چلن، یہ بے حسی اسے وبال ہے
مزاج کا نہ اس سے میل ہے نہ اس تنے تال ہے
وہ بے نیاز جا رہا ہے تیز گام .... اس طرف
جہاں کنارے ہو چکے ہیں بے مقام .... اس طرف
جہاں مچا ہے شور بن میں ڈھاک کے
جہاں لہر لہر ہے موج، بے لگام .... اس طرف

(شاعر)

بودلیئر

بدی کے پھول

پراسرار آدمی! ذرا تو بتا تو سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے۔

اپنے باپ سے، ماں، بہن سے، یا بھائی سے؟

میرا نہ تو کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ بہن نہ بھائی۔

اپنے دوستوں سے؟

یہ تو تم نے ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس کا میں آج تک مطلب نہیں سمجھا۔

اپنے ملک سے۔

مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ہے کس عرض بلد میں۔

خوب صورتی سے،

وہ لافانی دیوی، اس سے محبت کرنے کو تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔

دولت سے؟

مجھے اس سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں خدا سے۔

پھر تمہیں کس سے محبت ہے اے انوکھے اجنبی،

مجھے بادلوں سے محبت ہے، ان بادلوں سے جو گذر جاتے ہیں وہ دیکھو،

ان حیرت انگیز بادلوں سے!"

٭٭٭

یہ شارل بودلیئر کی ایک نظم ہے اس کا ترجمہ مرحوم محمد حسن عسکری نے کیا ہے۔ اس نظم کے بارے

میں عسکری صاحب نے جو تفصیلی رائے دی ہے۔ اس کے چند جملے آپ بھی پڑھ لیجیے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:-

"اپنی جمالیاتی قدر و قیمت کے علاوہ بودلیئر کی یہ نظم انیسویں اور بیسویں صدی یا صنعتی دور کی سماجی اور اخلاقی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور ویسی طرح ادب اور آرٹ کی تاریخ میں بھی ممکن ہے کہ یہ نظم اس دور کی ہر تحریک یا ہر فنکار پر حاوی نہ ہو لیکن بڑی حد تک اس میں پہلے زمانے کی روح بند ہے۔ اس عہد کے انسان کی ساری روحانی مایوسیاں مجبوریاں، معذوریاں اس کی ساری حسرتیں اور آرزوئیں اس نظم میں گونجتی ہیں۔ یہ نظم اس کی شکست کی آواز ہے بلکہ زندگی کے اس نظام کی بھی۔ ان منفی عناصر کے پہلو بہ پہلو اس نظم میں انسان یا کم سے کم فنکار کی روحانی کاوشوں اور موت کے خلاف اس کی جدوجہد کا نشان بھی ملتا ہے۔"

شارل بودلیئر کے ساتھ عالمی جدید شاعری کا آغاز ہوتا ہے وہ ایک ایسا فنکار اور شاعر ہے جس کی شاعری نے دنیا بھر کے ادب پر اثرات مرتب کیے ہیں بودلیئر اور اس کی نظموں کے مجموعے "بدی کے پھول" کے ساتھ جدید شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی نظموں کا یہ مجموعہ جو اپنی اصل زبان فرانسیسی میں LES FLEURS DU MAL کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہو چکا ہے۔ محمد حسن عسکری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے بھرپور انداز میں بودلیئر کو اُردو میں متعارف کرایا۔ اس کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بہت کچھ لکھا اور اس کی بعض نظموں کو اُردو قالب دیا۔ بعد میں لئیق بابری نے بودلیئر کو اُردو میں منتقل کیا۔ بودلیئر کی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا ترجمہ لئیق بابری نے کیا ہے اُردو میں شائع ہو چکا ہے۔

عسکری صاحب نے انسانی تاریخ میں رونما ہونے والے ۱۸۵۷ء کے برس کو دو اہم واقعات کی وجہ سے یادگار اور دور رس نتائج کا حامل قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے ۱۸۵۷ء کا برس اس لیے یادگار ہے کہ ۱۸۵۷ء میں برصغیر میں انگریزوں کے خلاف پہلی بڑی بغاوت ہوئی اور دوسرا واقعہ بودلیئر کی نظموں کے مجموعے "بدی کے پھول" کی اشاعت جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔

شارل پیری بودلیئر کی ولادت ۹ راپریل ۱۸۲۱ء کو پیرس میں ہوئی۔ اس وقت اس کی والدہ کی عمر اٹھائیس برس تھی اور وہ جوزف فرانکو، بودلیئر کی دوسری بیوی تھی۔ جس کی عمر اس وقت باسٹھ برس

تھی۔ بودلیئر کا باپ ایک عالم شخص تھا اور بڑے نواب کے بچوں کا معلم بھی تھا ۔ وہ مذہبی اعتقادات
رکھنے والا انسان تھا ۔ بودلیئر کو یہ مذہبیت ورثے میں ملی ۔

بودلیئر خوشگوار اور پرسکون ماحول میں پیدا ہوا ۔ اس کی زندگی کے ابتدائی برس بہت
پرمسرت تھے ۔ اس کے والدین اسے بے حد چاہتے تھے ۔ اس کے والد نے اسے لاطینی زبان
میں تعلیم دلائی باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے بہت قریب تھے ۔ بودلیئر کو ساری عمر اپنے
والد کی کمی محسوس ہوئی ۔ ساری عمر اس کے کمرے میں اس کے والد کا پورٹریٹ لٹکا رہا ۔

۱۸۲۷ء میں بودلیئر کے باپ کا انتقال ہوا ۔ اگلے برس ۱۸۲۸ء میں اس کی والدہ نے دوسری
شادی کر لی ۔ کرنل آپیک بودلیئر کا سوتیلا باپ بہت وجیہہ اور خوب صورت انسان تھا ۔ شاہی
خاندان کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے ۔ وہ اپنی مرضی کا آدمی تھا ۔ اپنے اعلیٰ فوجی حکام کی
کم ہی پرواہ کرتا تھا ۔ وہ قسطنطنیہ اور میڈرڈ میں سفیر بھی رہا ۔ پھر سیکنڈ ایمپائر کے زمانے میں
سینیٹر بن گیا ۔ بودلیئر کا مزاج اپنے سوتیلے باپ سے بے حد مختلف تھا اور بودلیئر کو اپنی ماں کی
اس شادی کا دکھ بھی بہت ہوا تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی والدہ نے اس کے والد کیساتھ
غداری کی ہے بودلیئر کے ایک سوانح نگار کریپے نے لکھا ہے کہ یہ ایسا زخم تھا جو کبھی مندمل نہ
ہو سکا ۔

بودلیئر نے لیون اور پیرس کے کالجوں میں تعلیم حاصل کی لیکن وہ پیدائشی شاعر تھا اس
کا مخصوص مزاج تھا اس کے سوتیلے والد کا خیال تھا کہ وہ بودلیئر کو کسی سفارت خانے میں سیکرٹری کے
عہدے پر فائز دیکھے ۔ لیکن بودلیئر کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا ۔ اس نے اپنی زندگی کو ادب
کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔

جس زمانے میں بودلیئر نے یہ فیصلہ کیا ۔ اس وقت ۱۸۳۸ء میں اس نے ایک مصرعہ تک نہ لکھا
اس لیے اس کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی گئی ۔ بودلیئر کے اندر کا فنکار اسے اکساتا تھا کہ وہ
روایتی زندگی بسر نہیں کرے گا ۔ اس زمانے میں بودلیئر نے دن رات پڑھنا شروع کیا ۔ اسی
زمانے میں اس نے بالزاک جیسے عظیم ناول نگار سے شناسائی پیدا کی اور یہی وہ دور تھا جب بودلیئر
کا لاطینی کوارٹرز میں کسبیوں کے ہاں آنا جانا شروع ہوا ۔ وہ زندگی کا ہر تجربہ کرنا چاہتا تھا ۔ ہر ذائقہ

چکھنا چاہتا تھا۔ جس سے اس کے خاندان کا پریشان ہونا لازمی تھا لیکن بودلیئر اپنی زندگی کو ایک تجربہ گاہ بنانے پر تلا ہوا تھا اور اس نے ایسا کر دکھایا۔

وہ ہندوستان کے بحری سفر پر نکل کھڑا ہوا بحری جہاز کا کپتان اس کے خاندان کا دوست تھا۔ موریس میں وہ جہاز سے اتر گیا۔ "کالی عورتوں" والی نظمیں اس عہد کی بازگشت ہیں۔

۱۸۴۲ء میں بودلیئر پیرس واپس آیا اس کے آداب و اطوار، لباس، شکل و شباہت میں ایک ایسا وقار اور شان تھی کہ جو اسے دیکھتا اور ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا۔

بینوویل نے اس کے بارے میں لکھا ہے :

"اس کی آنکھیں کسی مشرقی سلطان کی طرح پُراسرار تھیں۔ جن میں روشنی کی جوت دکھائی دیتی۔ اس کی جلد گلابی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ پرکشش خد و خال کا مالک تھا۔ اس کے گھنگھریالے گھنے کالے بالوں نے اس کی وجاہت کو چار چاند لگا دیے تھے۔"

بودلیئر اب اکیس برس کا ہو چکا تھا۔ خاندانی ورثے سے اسے خاصا کچھ ملا تھا۔ اس لیے وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزارنے لگا۔ اسی زمانے میں اس نے "بدی کے پھول" کی نظمیں لکھنا شروع کی تھیں۔

۱۸۴۲ء میں بودلیئر کی شناسائی اس دوغلی عورت سے ہوئی جس کا نام جینی ڈورل یا جینی سیمر تھا۔ اس خاتون کی اصل حقیقت پر اب تک اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ پیرس کے ایک تھیٹر میں اداکاری کیا کرتی تھی۔ بودلیئر کے لیے اس کی رفاقت نے اتنی اہمیت اختیار کرلی کہ وہ لکھا کرتا تھا یہ عورت "HIS ONLY DISTRACTION HIS ONLY PLEASURE HIS ONLY FRIEND" بن گئی تھی لیکن جسے وہ اپنا سب کچھ سمجھتا تھا وہ عورت ایک ہرجائی، ان پڑھ اور بلانوش تھی، لیکن بودلیئر کے لیے وہ ناگزیر بن چکی تھی "بدی کے پھول" کی بعض نظمیں جنہیں جینی سے منسوب کیا گیا ہے۔ اِن سے علم ہو جاتا ہے کہ بودلیئر کے لیے وہ کیا حیثیت رکھتی تھی۔ "بدی کے پھول" کی ان نظموں کے حروف سے جینی صاف جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس میں نظم جس کا نام WELEBALCON ہے خاص اہمیت

حاصل ہے۔

بودلیئر کو جنسی بیماری لاحق ہوئی لیکن جینی کے لیے اس نے جو نظمیں لکھیں ان میں بے پناہ ترغیب اور شدت موجود ہونے کے باوجود جنسی عمل کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ نہ ہی ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی جنسی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا۔

بودلیئر کے ایک فوٹو گرافر نادر (NADAR) نے تو بودلیئر کے بارے میں یہاں تک کہا ہے کہ "وہ مرا تو کنوارا تھا"

بہر حال صحیح قیاس یہ ہے کہ اگر جینی ڈیوول کے لیے بودلیئر اتنا جذباتی تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جینی ڈیوول اس کے جسمانی تقاضوں اور خامیوں کو پوری طرح جانتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب اس کی نظموں کا مجموعہ "بدی کے پھول" شائع ہوا تو اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ ایک تو یہ شاعری مروجہ شاعری سے بے حد مختلف تھی۔ پھر ان نظموں پر بداخلاقی کا الزام عائد کیا گیا لیکن یہی کتاب جسے "بداخلاقی" کے الزام میں ملوث کیا گیا آج دنیا کی عظیم ترین شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ فرانسیسی ادب میں ہی نہیں پوری دنیا میں نظموں کی اس کتاب کی جو اہمیت ہے وہ ادب کے قارئین پر واضح ہو چکی ہے۔

"بدی کے پھول" کا انتساب تھیوفل گاتیئر کے نام ہے۔ جس کا ناول "میڈموزیل ڈی ماپن" (MADEM DISELLE DE MAUPIN) عالمی ادب کا ایک شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔

۱۸۴۳ء کے موسم گرما میں بودلیئر کی گاتیئر سے ملاقات ہوئی جو انتہائی گہرے مراسم میں تبدیل ہو گئی۔

بالزاک، بودلیئر اور گاتیئر حشیش کے رسیا تھے۔!

*

"بدی کے پھول" ۲۵ر جون ۱۸۵۷ء کو شائع ہو کر بکنے کے لیے آئی۔ فلوبیئر جسے حال ہی میں اس کے ناول "مادام بوواری" کی وجہ سے مقدمے میں الجھایا گیا تھا۔ پہلا شخص تھا جس نے نظموں کے مجموعے کو سراہا اور اپنی تعریفی رائے سے بودلیئر کو مطلع کیا۔ ۱۶ر جولائی ۱۸۷۵ء کو حکام نے یہ کتاب ضبط کر لی۔ ۲۰ر اگست ۱۸۵۷ء کو بودلیئر کو ایک عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ جہاں اس پر عوامی اخلاق کو تباہ کرنے والی نظمیں لکھنے کا مجرم قرار دے کر تین سو فرانک جرمانہ کیا گیا۔

وکٹر ہیوگو نے اس جرمانے کے حوالے سے بودلیئر کو لکھا :

" موجودہ حکومت جو سب سے بڑا اعزاز دے سکتی ہے وہ اس نے تمہیں دے دیا ہے ۔ میرے شاعر دوست میں تمہارا ہاتھ تھامتا ہوں "

بعد میں جرمانے کی رقم گھٹا کر پچاس فرانک کردی گئی اس حوالے سے بودلیئر اور اس کی نظموں کے مجموعے " بدی کے پھول " کی خاصی شہرت ہوئی لیکن بودلیئر کے وقار کو ٹھیس لگی تھی " بدی کے پھول میں چھ نظموں کے بارے میں حکم صادر کیا گیا کہ جب تک ان کو مجموعہ سے نکالا نہیں جائے گا ۔ تب تک یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکے گا ۔ بودلیئر کو اس بات سے سمجھوتہ کرنا جب اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اس میں یہ چھ نظمیں موجود نہ تھیں لیکن بلجیم میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں یہ نظمیں شامل تھیں ۔

اب تک بودلیئر کے مالی وسائل ختم ہو چکے تھے وہ دو برس برسلز میں رہا ۔ اب نکبت اور افلاس کے دور کا آغاز ہو چکا تھا ۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو اس پر فالج کا حملہ ہوا جس کا اثر اس کے دماغ پر بھی ہوا ۔ چند ماہ تک وہ برسلز کے ایک کلینک میں زیر علاج رہا پھر اپنی رہائش گاہ پر آگیا ۔ لیکن ۲ جولائی ۱۸۶۶ء کو اسے پیرس کے ایک نرسنگ ہوم میں پہنچا دیا گیا ۔ اس کی حالت بگڑ چکی تھی وہ لوگ جنہوں نے اسے اکیس برس کی عمر میں دیکھ کر اسے ایک شہزادہ کہا تھا اب وہ اسے جوانی میں ایک بڈھا کھوسٹ سمجھ رہے تھے ۔ وہ گنجا ہو چکا تھا ۔ اس کا جسم سوکھنے لگا تھا ۳۱ اگست ۱۸۶۷ء کو اس کا انتقال ہو گیا ۔ میڈویل نے اس کی موت پر لکھا ۔

" بدی کے پھول " کی نظموں کا خالق محض ایک شاعر نہ تھا ۔ بلکہ وہ ایک سچا شاعر تھا ۔ اس رائے سے آنے والے دور کے کسی نقاد کو اختلاف پیدا نہیں ہوا ۔

☆

رُباعیات

۱۸۵۹ء سے اب تک مغرب میں جس مشرقی شاعر کو بہت زیادہ پڑھا گیا ہے اور اس کے کلام کو مصوّر کیا گیا اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا وہ فارسی کا شاعر، عمر خیام ہے۔ جس کی رباعیات ساری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔

۱۸۵۹ء میں رابرٹ فٹز جیرالڈ نے ان فارسی رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں شائع کرایا تھا۔ ۱۸۵۹ء سے پہلے بھی یورپ میں عمر خیام کو جانا پہچانا جاتا تھا الجبرے پر لکھی ہوئی اس کی ایک کتاب کو الجبرے کے استادوں اور طالب علموں نے ہمیشہ سراہا تھا۔ لیکن اسے جو شہرت اپنی رباعیات کی وجہ سے حاصل ہوئی اس شہرت نے عمر خیام کی دوسری اہم صلاحیتوں اور کارناموں کو خاصا دھندلا دیا۔ اب وہ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا پیغام دینے والا ایک شاعر سمجھا جاتا ہے اور اس میں بھی کچھ مبالغہ نہیں کہ مغرب والوں نے اس حق کی شاعری کی پوری روح کو نہیں سمجھا بلکہ اس کی ظاہری سطح سے ہی سے زیادہ متاثر ہوئے۔

عمر خیام، جیسا کہ اس کے نام کے ساتھ منسلک "خیام" سے ظاہر ہے۔ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جو خیمے بنانے میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ عمر خیام کا سنِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۷۰ء میں نیشاپور (خراسان) میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کو ایک لیجنڈ اور متھ کی سی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایک روایت ہے کہ عمر خیام نے امام الموفق کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے ہم مکتبوں میں حسن بن صباح اور نظام الملک جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تینوں گہرے دوست تھے۔ حسن بن صباح نے بعد میں اپنا ایک گروہ "حشیشین" کے نام سے ترتیب دیا۔ جس کی مکاریاں

کی داستان تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ نظام الملک نے ترقی کی اور وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچے۔
عمر خیام محض ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے علم نجوم و فلکیات، ریاضی اور الجبرا میں بڑا نام پیدا کیا یہ سہرا بھی عمر خیام کے سر بندھتا ہے کہ انہوں نے ایرانی کیلنڈر اور تقویم پر اس زمانے میں نظر ثانی کی ستاروں کے جدول تیار کیے۔ ریاضی پر کئی کتابیں ان کے قلم سے موجود ہیں۔
بعض مصنفوں نے عمر خیام کو بڑے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اصل میں ان کی رباعیات سے متاثر ہو کر یہ تصور کر لیا کہ عمر خیام بھی ایسے ہی شخص ہیں جیسا انسان ان کے ہاں ان کی رباعیات میں موجود پاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شعر کہنا۔ عمر خیام کا مقصد حیات نہ تھا۔ نہ ہی انہوں نے اس پر اپنی پوری صلاحیتوں کو ہی مرکوز کیا تھا تاہم وہ بڑے شاعر تھے۔ عالمی شعرا کی صف میں ایک ممتاز اور دوامی مقام رکھنے والے شاعر۔
عمر خیام کی زندگی پر بہت سا کام ہوا ہے ان میں سے چند کتابوں کا ذکر میں عمر خیام کے حوالے سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عمر خیام پہ ایک کتاب ۱۹۲۳ء میں رونیکلیڈ نے لکھی تھی۔ "عمر خیام اینڈ ہز ٹائمز" یہ کتاب بے حد گمراہ کن ہے۔ اس کتاب میں عمر خیام کو خاصے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب جو ہمارے ہاں بھی خاصی پڑھی گئی ہے وہ ہیرلڈ لیم کی کتاب عمر خیام ہے۔ ہیرلڈ لیم کو یہ گر آتا تھا کہ وہ تاریخ شخصیت اور داستانی انداز کے تال میل سے دلچسپ کتاب لکھ لیتا تھا۔ ہیرلڈ لیم کی کتاب بھی اس کے مخصوص دلچسپ داستانی انداز میں ہے۔ اس میں ہمیں جو عمر خیام ملتا ہے۔ وہ خاصا حقیقی نظر آتا ہے۔ ہیرلڈ لیم نے عمر خیام کے خدوخال کو صحیح انداز میں نمایاں کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔
اپنے محدود مطالعہ کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ عمر خیام پر جو سب سے اچھی اور مستند کتاب لکھی گئی ہے وہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مورخ اور محقق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور وہ عمر خیام پیش کیا ہے کہ جو وہ اصل میں تھا۔ انہوں نے عمر خیام کی ذات کے ساتھ منسوب کہانیوں اور داستانوں کو اپنی تحقیق سے پرکاہ کی حیثیت سے ختم کر دیا ہے۔ اور اس کتاب میں ہمیں وہ عمر خیام دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کا، بلکہ اپنے خصوصی کمالات کی وجہ سے دائمی عزت و فضیلت اور مرتبے کا حامل ہے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی یہ اہم تصنیف ایک

عرصے سے کمیاب ہو چکی ہے۔

عمر خیام کا سن وفات ۱۱۲۳ء ہے۔

ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کا شمار انگریزی زبان کے درمیانے درجے کے شاعروں میں ہوتا ہے اس کی اپنی شاعری میں اتنی جان اور توانائی نہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتی۔ لیکن فٹز جیرالڈ عمر خیام کے مترجم کی حیثیت سے لازوال حیثیت حاصل کر چکا ہے کہا جاتا ہے اور بہت حد تک صحیح بھی ہے کہ فٹز جیرالڈ کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل نہ تھا لیکن وہ خود ایک ایسا شاعر اور انسان تھا جسے پھولوں، رنگوں حسن و جمال سے بڑا لگاؤ تھا۔ جب وہ عمر خیام کے کلام سے متعارف ہوا تو اس کی شاعری اس کے جی کو لگی۔ فٹز جیرالڈ نے فارسی زبان کا مطالعہ ۱۸۵۳ء میں شروع کیا تھا اور ۱۸۵۶ء میں اس نے کچھ تراجم کیے۔ جن میں جامی کے کلام کا بھی ترجمہ تھا۔ ۱۸۵۹ء میں عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ کتاب بہت عامیانہ صورت میں شائع ہوئی اور عرصے تک گمنامی کی حالت میں پڑی رہی یہ ایک اتفاق تھا کہ فٹز جیرالڈ کے عمر خیام کی رباعیات کے ترجمے پر انگریزی شاعر روزیٹی کی نگاہ ایک پرانی کتابیں بیچنے والے کی دکان پر پڑ گئی۔ اس نے وہ کتاب خریدی اور پھر اس کو پڑھنے کے بعد فٹز جیرالڈ کے ترجمے کو سراہا۔ بعد میں انگریزی شاعر سون برن نے اس کی بے حد تعریف کی۔ اس پذیرائی سے متاثر ہو کر فٹز جیرالڈ نے ان شاعروں کے مشورے پر رباعیات عمر خیام پر نظر ثانی کی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۸ء میں شائع کروایا۔ اس کے بعد مغربی دنیا شاعر عمر خیام کے نام سے گونجنے لگی۔

وہ لوگ جو فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں ان کے علم میں ہے اور کئی بار اس کی نشاندہی بھی کی جا چکی ہے کہ فٹز جیرالڈ کا ترجمہ اصل کے عین مطابق نہیں۔ بلکہ فٹز جیرالڈ نے اس میں اپنی طرف سے بھی بہت سے گل بوٹے ٹانکے ہیں۔ بہر حال فٹز جیرالڈ کے اس ترجمے کے حوالے سے عمر خیام کو ساری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ یورپ کی دوسری کتنی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مشرقی زبانوں میں بھی رباعیات عمر خیام کا متعدد بار ترجمہ ہوا ہے اور یوں عمر خیام اپنی رباعیات کے حوالے سے دنیا بھر کا محبوب شاعر بن چکا ہے۔ عمر خیام کی رباعیات، مصوروں کی دلچسپی کا باعث بھی رہی ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے مصوروں نے اس کی رباعیات کو مصور کیا ہے۔ مغرب و مشرق میں اس کی رباعیات کے کتنے ہی مصور ایڈیشن مہنگے داموں بک چکے ہیں۔

مصوّر مشرق عبدالرحمان چغتائی نے بھی عمر خیام کو مصوّر کیا تھا اس کا یہ کام ابھی پوری طرح سامنے نہیں آسکا
برصغیر پاک و ہند میں اردو اور علاقائی زبانوں میں عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔
رم نے جو تراجم کیے وہ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم مرحوم نے بھی رباعیات
ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ افسوس یہ شائع نہ ہو سکا اور ان کی موت کے بعد معلوم نہیں کہ ان کے شاندار
رخوب صورت تراجم پر کیا گذری۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی عمر خیام کی بعض رباعیوں کا ترجمہ کیا تھا جن میں
سے ایک بے حد خوب صورت ترجمہ نذر قارئین ہے۔

اُٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں
سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی ہے
جو جام تھا پارہ پارہ ہے

فٹز جیرالڈ جس کے تراجم کی وجہ سے عمر خیام کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اسی کے تراجم کی مثال
کے لیے دو رباعیوں کا انگریزی ترجمہ حاضر ہے۔

"A BOOK OF UERSES UNDERNEATH THE BOUGH,
A JUG OF WINE, A LOAF OF BREAD AND THOU.
BESIDES ME SINGING IN THE WICDERNESS OH,
WILDERNESS WERE PARADISE ENOW."

دوسری رباعی انگریزی ترجمے میں یوں ہے۔

A GOURD OF RED WINE AND A SHEAF OF POEMS,
A BARE SUBSTANCE,
A HALF A LOAF NO MORE,
SUPPLIES US TWO ALONE IN THE FREE DESERT,
WHAT SULTAN WOULD WE ENVY ON HIS THRONE?

۱۹۹۶ء میں رباعیات عمر خیام کا ایک اردو ترجمہ شائع ہوا اس کے مترجم انگریزی زبان کے جدید

شاعر رابرٹ گریوز اور علی شاہ لزائی تھے۔ رابرٹ گریوز نے اس ترجمے کے حوالے سے دعوے کیا کہ انہیں علی شاہ لزائی کے ذریعے جو نسخہ رباعیاتِ عمر خیام کا ملا ہے وہ مستند ترین اور اصلی نسخہ ہے رابرٹ گریوز کو ایسے دعوے کرنے کی عادت رہی ہے۔ ایک زمانے میں گریوز نے دعوے کیا تھا کہ ہومر کی اوڈیسی کا خالق خود ہومر نہیں بلکہ اس کی بیٹی تھی۔ اس لیے ان کے اس دعوے پر زیادہ توجہ نہ دی گئی گریوز نے اپنے ترجمے میں فٹز جیرالڈ پر شدید تنقید کی کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے اصل سے دور گمراہ کن اور غیر مستند ہیں۔ بہر حال اتنے بڑے دعوؤں کے بعد گریوز نے علی شاہ لزائی کے ساتھ مل کر رباعیاتِ عمر خیام کا جو ترجمہ شائع کیا اسے پذیرائی نہ ملی۔ جبکہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کے ابتک نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

عمر خیام کی شاعری کے ڈانڈے بعض نقادوں نے ایپی قورس کے فلسفے سے جا ملائے ہیں۔ اسے نشاط پرستی، لذت اندوزی اور لطف و عیش کا پیامبر شاعر قرار دیا گیا ہے۔ عمر خیام کی رباعیات کی یہ تعبیر نہ صرف غلط ہے بلکہ عمر خیام کے ساتھ ایک بڑی زیادتی کے مترادف ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ظاہری سطح پر شراب و حسن، زندگی کی مسرتوں اور حاضر لمحے کی لطف اندوزی کا بھرپور احساس عمر خیام کی رباعیات میں ملتا ہے۔ لیکن صرف انہی عناصر سے ہی تو عمر خیام کی رباعیات تشکیل نہیں پائیں۔ ان رباعیوں میں فنا اور موت کا گہرا احساس ملتا ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج ہے۔ منافقت سے نفرت کا بھرپور شعری اظہار ملتا ہے۔ عمر خیام انسان کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ موت اور فنا کی سچی اور لرزا دینے والی تصویر بھی کھینچتا ہے۔ زندگی کی قدر و قیمت اور موت کی حقیقت بھی انہی رباعیات میں ملتی ہے پھر اس کے ہاں نشاط پرستی کا جو تصور ہے وہ خالص محبت اور بے ریا جذبات سے جنم لیتا ہے۔ اسی لیے عمر خیام کے ہاں منافقت کیخلاف مؤثر ترین احتجاج ہے۔

حیرت ہے کہ عمر خیام کے مفسر اور ناقدان رباعیوں میں جو متصوفانہ رمز و کنایہ اور تمثیل ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مشرق کی عظیم شاعری کی روایت کے حوالے سے عمر خیام کی شاعری پر تصوف کی گہری چھاپ ہے جو فنا کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی کی مسرتوں کا اظہار کرتی ہے اور ہمیں ایک ایسی دنیا میں ایسے انداز میں زندہ رہنا سکھاتی ہے جو دونوں ناپائیدار ہیں۔

لیوز آف گراس

اس نے ساری عمر شادی نہیں کی حالانکہ وہ جسم کا شاعر تھا۔ وہ خود کہتا ہے ؛

I AM THE POET OF THE BODY AND I AM THE POET OF THE SOUL. I AM THE POET OF THE WOMAN, THE SAME AS THE MAN.

وہ آوارہ گرد تھا۔ سیلانی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور چھوٹے چھوٹے لوگوں سے محبت کرنے والا۔ وہ آزادی اور جمہوریت سے عشق کرتا تھا۔ اور تھورو جیسے شخص نے اس سے ملاقات کرنے کے بعد اس کے بارے میں کہا تھا۔

POSSIBLY THE GREATEST DEMOCRAT EVER LIVED.

والٹ وہٹمین لانگ آئیلینڈ (نیویارک) میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ پیدائش ۳۱ مئی ۱۸۱۹ء ہے اس کا باپ ایک عام آدمی تھا۔ ایک ماہر بڑھئی۔ لیکن پیشہ وارانہ طور پر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ گھر کے حالات ایسے ہی تھے جیسے کم آمدنی والے کنبے کے ہوتے ہیں۔ والٹ وہٹمین اسی لیے کسی سکول میں زیادہ عرصہ تک باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ پانچ چھ برس تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں وہ ایک دفتر میں چپڑاسی لگ گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ طباعت کا کام بھی سیکھتا رہا لکھنے پڑھنے کا اسے شدید چسکا تھا۔ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود وہ گھنٹوں کتب خانوں اور لائبریریوں میں پڑھتا رہتا۔

اسے صحافت کا بھی شوق تھا۔ کیونکہ وہ مخصوص نظریات رکھتا تھا جن میں انسانی مساوات ،

غلامی کی مخالفت اور آزادی کی محبت سرِفہرست ہیں۔ وہ اخباروں، رسالوں کے لیے لکھنے لگا اور
پھر ایک ہفت روزہ "لونگ آئیلینڈرز" کو مرتب کرتا رہا۔ یہ ہفت روزہ زیادہ دن نہ چلا۔ ۱۸۴۶ء
میں وہ "بروکلین ایگل" کا ایڈیٹر بنا۔ اس میں اس نے امریکی معاشرے اور فنون کے بارے میں بنیادی
سوال اُٹھائے اور ان کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ وہ غلامی کا شدید مخالف تھا۔ جمہوریت اور
آزادی کا علمبردار، اس کے خیالات، اعلیٰ اور اونچے طبقے کے لوگوں کو پسند نہ تھے۔ جس کے نتیجے میں
اسے "بروکلین ایگل" کی ادارت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے ایک اور جریدے کریسنٹ کی
ادارت کی۔ مگر وہاں بھی ماحول کچھ بہتر نہ تھا۔

وہ آوارہ گرد اور سیلانی تھا۔ عام لوگوں میں گھُل مل جانے کا اسے خبط تھا۔ اس نے لمبی سیر کی
اور آوارہ گردی کا لطف اٹھایا۔ جنوبی امریکہ اور جنوب مغربی امریکی ریاستوں کے عوام کی زندگیوں کا
گہرا مشاہدہ کیا۔ وہ سیر و سیاحت اور عام انسانوں کا مشاہدہ کرتا ہوا کینیڈا تک گھوم آیا۔ ۱۸۵۰ء
میں وہ واپس آ کر بروکلین سے نکلنے والے ایک جریدے "دی فری مین" کا ایڈیٹر بن گیا۔ یہ پرچہ زیادہ
دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔ والٹ وہٹمین نے اس کے بعد معماری اور گھر بنانے اور بیچنے کا دھندہ کیا۔
اگر وہ اس طرف اپنی پوری توجہ صرف کرتا تو خاصی دولت کما سکتا تھا لیکن اُسے دولت سے اُنس نہ تھا
وہ تو عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ انہی کے دکھ درد اور مسرتوں کو محسوس کر کے اپنی
زندگی کو بامعنی اور باوقار بنانے کے لیے جد و جہد کر رہا تھا۔

پھر اسے نظمیں لکھنے کا خیال آیا۔ ایک ایسا شخص جس کی زندگی ان حالات میں گزر رہی ہو۔ اس
کا شاعر بن جانا یقیناً حیران کن بات لگتی ہے۔ کلفٹن فیڈ مین نے لکھا ہے کہ سست الوجود بے ڈھب
لباس پہننے والے، ملازموں، مزدوروں، دکانداروں، چھوٹے ملازموں، کوچوانوں کے دوست،
والٹ وہٹمین نے جہاں زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا، وہاں اپنے احساس جمالیات کی بھی تربیت کرتا رہا
تھا۔ اسی لیے اس کے لیے شاعر بننا مشکل نہ رہا۔

والٹ وہٹمین کی شاعری۔ دنیا کی بڑی شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی نظمیں اس کے
کے شدتِ جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ نئی فکری جہتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

گھاس کی پتیاں۔ امریکہ کی سچی تصویر ہے۔ وہ اپنی نظموں میں امریکہ کے باشندوں اور ان کی

نقاب کشائی کرتا ہے وہ اخلاقی، معاشرتی، سیاسی مسائل پر لکھتا ہے۔ حب الوطنی، انسان دوستی، جھوٹی پابندیوں کے خلاف جہاد کرتا ہے۔

اپنی نظموں میں اس نے مروجہ شاعری سے شدید انحراف کیا۔ وہ شعر میں وزن، بحر، قافیے کی پابندی کو پُرخلوص اور براہِ راست شعری اظہار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ اس نے ان سب پابندیوں کو توڑا۔ خیر باد کہہ دیا۔ رسمی عروض کو تج دیا۔ اس کی شاعری کو نثری شاعری کہا جا سکتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہ عظیم نثری شاعر تھا۔ اس نے گھاس کی پتیاں میں جو شعری اسلوب اختیار کیا اور جن خیالات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اس کی وجہ سے شدید مخالفت ہوئی۔ اس کی کتاب کو ضبط کیا گیا اور ایسا بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار والٹ وہٹمین کو اس لیے تعزیری کارروائی کا نشانہ بننا پڑا کہ اس کے پاس اس کی اپنی ہی نظموں کا مجموعہ "گھاس کی پتیاں" پایا گیا تھا۔ جن کا رکھنا جرم تھا۔

۱۸۵۵ء کا برس عالمی شاعری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس برس والٹ وہٹمین نے "گھاس کی پتیاں" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ کتاب صرف ۹۵ صفحات پر مشتمل تھی۔ اور محدود تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے انسانی جسم، انسانی اعمال اور فطرت کو یک جان کر دیا تھا۔ اس لیے ان نظموں کو غیر شاعرانہ اور مخرب اخلاق قرار دیا گیا۔ بہت کم لوگوں نے اسے سمجھا اور اسے سراہا۔ ایک مدت تک یہ نظموں کی کتاب گمنامی کا شکار رہی۔ ایمرسن پہلا بڑا اور اہم شخص ہے جس نے سنجیدہ قارئین کی توجہ نظموں کی اس کتاب کی طرف مبذول کرائی۔ لوگ اسے پڑھنے لگے اور پھر اس کے نئے ایڈیشن نئی نظموں کے اضافے کے ساتھ شائع ہونے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی ضخامت ۴۶۰ صفحات تک پہنچ چکی تھی۔ والٹ وہٹمین کی نظمیں اب امریکہ میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی سراہی جا رہی تھیں۔

۱۸۶۲ء میں والٹ وہٹمین فوج میں مرد نرس کی حیثیت سے ملازم ہوا اور وہ خانہ جنگی میں زخمی ہونے والے لوگوں کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ "نیلی آنکھوں" اور الجھی ہوئی ڈاڑھی والے شاعر کی صحت اب خراب ہو چکی تھی۔ اُسے شہری محکمے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

"گھاس کی پتیاں" کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں وہ نظمیں بھی شامل تھیں جو اس نے

جنگ کے حوالے سے لکھی تھیں۔ یہ ایڈیشن ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں ایک اور ایڈیشن نئی نظموں کے اضافے سے شائع ہوا۔ جس میں اس کی وہ مشہور نظم بھی شامل ہے جو اس نے ابراہام لنکن کے قتل پر لکھی۔ نظم کا نام ہے۔

WHEN LILCS LAST IN THE DOORYARD BLOOM.

والٹ وہیٹمین نے انسانوں کا جو مشاہدہ کیا اور آزادی سے جو عشق کیا۔ اس نے اسے جمہوریت کا عظیم ترین نقیب بنا دیا۔ اس کی شاعری امن اور آزادی کی شاعری ہے۔ جس میں سچی اور گہری آفاقیت پائی جاتی ہے۔ اپنی ان نظموں کی وجہ سے اسے ملازمت سے بھی نکال دیا گیا۔ بعد میں اسے واشنگٹن میں محکمہ خزانہ میں کلرک بنا دیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ کیمڈان منتقل ہو کر وہیں رہنے لگا۔ اس کی زندگی کے بقیہ ۱۸ برس غربت اور بیماری میں بسر ہوئے۔ لیکن والٹ وہیٹمین کی زندہ دلی برقرار رہی۔ وہ دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے لکھنے والے اس سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔

اپنی موت سے پہلے ہی والٹ وہیٹمین نے اپنی قبر کے لیے ہارے قبرستان کیمڈان میں ایک مزار تعمیر کرایا تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۲ء کو اس کا انتقال ہوا اور اسے اسی مزار میں دفن کر دیا گیا۔

والٹ وہیٹمین عوام، انسانیت، آزادی، امن اور سچائی کا شاعر ہے۔ وہ جھوٹی اخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کا قائل نہیں۔ وہ انہیں توڑتا ہے۔ ان کے خلاف پوری شدت سے آواز اٹھاتا ہے۔ والٹ وہیٹمین کی شاعری نے امریکی شاعری میں انقلاب برپا کیا۔ اسے زندگی کی اصلی، حقیقی ذہنی سچائیوں اور نظریات سے متعارف کرایا۔ اس نے پابند شاعری ترک کی۔ اس نے روایتی شعری اسلوب کو ترک کر کے اظہار کے لیے نئی راہیں تراشیں۔

اس کی نظموں میں عام انسان اپنی پوری جذباتی کیفیات اور آورش کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ بظاہر فطرت سے محبت کرتا ہے اس کی شاعری میں وہ الفاظ اور اشیاء کے نام بھی شامل ہیں جنہیں روایتی شاعر غیر شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔

"گھاس کی پتیاں" کی اشاعت عالمی ادب کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ گھاس کی پتیاں نے عالمی شاعری کو متاثر کیا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں والٹ وہیٹمین کی نظموں کا ترجمہ بار بار

مختلف ادوار میں نہ ہوا ہو۔ وہ ایک عالمی شہری اور آفاقی حیثیت کی شاعری کا خالق ہے وہ پوری انسانیت کا شاعر ہے۔ اس کی ایک نظم ہے :-

"THIS MOMENT YEARNING AND THOUGHT FUL."

پوری نظم یوں ہے :-

THIS MOMENT YEARNING AND THOUGHT FUL SITTING ALONE,

IT SEEMS TO ME THERE ARE OTHER MEN IN OTHER LANDS

YERNING AND THOUGHT FUL,

IT SEEMS TO ME I CAN LOOK OVER AND BE HELD THEM IN

GERMANY ITALY, FRANCE, SPAIN OR FAR, FAR AWAY IN CHINA

OR IN RUSSIA OR JAPAN,

TALKING OTHER DIALECTS AND IT SEEMSO TO ME IF I CO-

ULD KNOW THOSE MEN I SHOULD BECOME ATTACHED TO

THEM AS I DO TO MEN IN MY OWN LANDS,

O I KNOW WE SHOULD BE

BRETHREN AND LOVERS,

I KNOW I SHOULD BE HAPPY WITH THEM,

والٹ وہٹمین اپنی نظموں میں نئے شہروں کے خواب دیکھتا ہے۔ ایسے شہر جنہیں کرہ ارض کی فوجیں مل کر بھی تسخیر نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ جس شہر کا خواب دیکھتا ہے اس کو انسان دوستوں نے بسایا ہے جو ہر چیز سے زیادہ انسانی محبت سے عشق کرتے ہیں۔ یہی محبت ان کی توانائی بھی ہے اور رہبر بھی۔ اس شہر کے لوگوں کے اعمال میں، ہر حرکت میں، حتیٰ کہ ان کی نگاہوں اور لفظوں میں بھی یہی محبت اپنا اظہار کرتی ہے۔

والٹ وہٹمین صداؤں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں متنوع آوازیں سنائی دیتی ہیں : وہ موسم سرما کی آمد کی صدا سنتا ہے۔ وہ موگری کے دھماکوں سے محبت کرتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کی آواز،

سے اس کی نظمیں سجتی ہیں۔ کھلیانوں اور گھروں میں کی جانے والی سرگوشیاں اس کے ہاں ملتی ہیں اور ریل گاڑی کی چہکار بھی۔ اس کے اردگرد ہمیشہ موسیقی کا حلقہ بندھا رہتا ہے۔ اس کی مشہور نظم ہے۔

THAT MUSIC ALWAYS ROUND ME,

جس میں وہ کہتا ہے :-

I HEAR NOT THE VOLUMES OF SOUND MERELY,

I AM MOVED BY THE EXQUISITE MEANINGS,

I LISTEN TO THE DIFFERENT VOICES,

O WINDING IN AND OUT, STRIVING CONTENDING WITH FIERY VEHEMENCE,

TO EXCEL EACH OTHER IN EMOTION,

اردو میں "گھاس کی پتیاں" کی کچھ منتخب نظموں کا ترجمہ جناب قیوم نظر نے کیا ہے جو گھاس کی پتیاں کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ قیوم نظر اردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے ہاں نظم میں ہیئت کے بعض تجربے بھی ملتے ہیں لیکن والٹ وہٹمین کو ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک خاص انداز اپنایا ہے۔ جو قابل غور ہے۔

پروفیسر عبدالواحد نے اس ترجمے کے حرف آغاز میں اس مسئلے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ والٹ وہٹمین کے بارے میں یہ ذکر آچکا ہے کہ اس کی نظمیں عروضی اور روایتی پابندیوں سے آزاد اور انحراف کرتی ہیں۔ لیکن قیوم نظر نے اس کا ترجمہ مروجہ بحروں میں کیا ہے۔ بلکہ کتاب کے آخر میں نظموں کے پہلے مصرعوں کے ارکان بھی دیئے گئے ہیں۔

پروفیسر عبدالواحد لکھتے ہیں :-

"معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کے نزدیک اردو میں ایسا کلام مرتب کرنا جو بیک وقت غیر عروضی بھی ہو اور شعریت کا حامل بھی۔ محال ہے۔"

تاہم پروفیسر عبدالواحد اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان تراجم میں بحروں کی پوری سختی سے پابندی نہیں کی گئی۔ بعض جگہ ترجمہ بحر سے گر گیا ہے۔ یہاں شاعر کا اپنا ارادہ بھی دکھائی دیتا ہے اور قیوم نظر

نے بحر کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اس کے باوجود یہ کہنا ضروری ہے کہ والٹ وہٹمین کی نظموں کا ترجمہ غیر عروضی اسلوب میں ہونا ضروری ہے۔

آخر میں والٹ وہٹمین کی ایک نظم FOR YOU O DEMOCRACY کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ مترجم قیوم نظر ہیں۔

تیری خاطر جمہوریت

آ ادھر آ میں بنا دوں کا یہ جو رہے گا متحد
میں بنا دوں گا کہ تجھے اک نسل ایسی شان والی جس کی ہم سر
دیدۂ خورشید نے دیکھی نہ ہو
میں بنا دوں گا زمین کو بہترین اور پرکشش
ہمدموں کے پیار سے
ہمدموں کے عمر بھر کے پیار سے

*

دوست داری کے لگاؤں گا وہ پودے جن سے اٹھیں گے درخت
اتنے گھنے، امریکہ کے دریاؤں کے، اس کی بڑی جھیلوں کے
اور رنگیں میدانوں کے دامن پر جو ہیں پھیلے ہوئے
اور شہروں کو کروں گا یوں مبہم اک دوسرے کی گردنوں
میں ان کے بازو ہوں حمائل پیار سے
ہمدموں کے پیار سے
ہمدموں کے مہر و خصلت پیار سے۔

میری جانب سے یہ تیری نذر ہیں جمہوریت، یہ تیری خدمت ہے میری ناز نیں
تیری خاطر تیری خاطر گا رہا ہوں میں یہ گیت۔

(ترجمہ قیوم نظر)

اے سیزن اِن دی ہیل

جدید ادب میں بہت کم لوگ ایسے دکھائی دیتے ہیں جو راں بو کی طرح حیران کن محیر العقول اور پریشان کن ہوں۔ وہ بہت کم عمر جیا۔ محض ۳۷ برس اور ان ۳۷ برسوں میں اس نے ایک ایسی زندگی گزاری جو ناپاک بھی تھی، صعوبتوں سے بھری ہوئی بھی۔ اور مہم جویانہ تھی۔ اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں اس نے اتنی رسوائیاں اور بدنامیاں سمیٹیں کہ جن کو آج بھی لوگ نہیں بھلا سکتے اور پھر یک دم اس کی زندگی میں دولت مند بننے کا ایسا جنون اور طوفان پیدا ہوا کہ اس نے شعر و ادب کو چھوڑا اور طالع آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا لیکن وہ کبھی اتنا دولت مند نہ ہو سکا کہ زندگی کے کچھ برس ہی آسودگی اور بے فکری سے بسر کر سکتا۔ اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ جب وہ مر رہا تھا تو اسے علم نہیں تھا کہ اس کی شاعری کی بنا پر اسے فرانس کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو ترک کر کے اس سے کلیتاً لاتعلق ہو چکا تھا۔

آج اس کی شاعری اور اس کی زندگی دونوں کو ایک لیجنڈری حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ سرئیلزم والے اس کو اپنا دیوتا اور پیغمبر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرئیلسٹ تحریک پر سب سے زیادہ اثرات راں بو کے ہیں۔

راں بو ایک حیران کن انسان تھا۔ ایک ونڈر چائیلڈ..... !

پیرس سے کچھ فاصلے پر واقع ایک قصبے شارل ویل میں اس کی پیدائش ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔ اس کی ماں دیہاتی دہقان زادی تھی۔ مردانہ شکل اور صفات کی مالک اور باپ فوج

میں لیفٹیننٹ تھا۔ اس کے والدین کی متاہلانہ زندگی بہت ناخوش گوار تھی اور ایک زمانے میں وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو گیا۔ ۱۸۷۰ء میں باپ کی موت واقع ہوئی۔ راں بو پر اپنی ماں کا اثر بہت گہرا تھا۔ وہ اس کی سخت گیری کے ہاتھوں بہت تنگ تھا اور اس سے آزادی چاہتا تھا۔ راں بو کا ایک بڑا بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔

راں بو پیدائشی نابغہ تھا۔ سکول میں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں ہی اس نے اپنی بے پناہ تخلیقی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں اس نے لاطینی شاعری کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اور اسی برس اس کی پہلی نظم ایک ادبی جریدے میں شائع ہوئی۔ ابتدائی عمر میں ہی اس نے فرانس کے بڑے لکھنے والوں کی تصانیف کا مطالعہ کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں جن کتابوں کو ممنوعہ سمجھا جاتا تھا وہ ان کو بھی پڑھ چکا تھا۔ وہ بچپن سے ہی خودسر تھا۔ اپنے آپ کو گھٹن کا شکار سمجھتا تھا۔ وہ شدید ترین جذبات کا مالک تھا۔ اور آزادی چاہتا تھا۔ آزادی کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ سخت گیر ماں کے اثر اور حبس زدہ ماحول سے فرار ہو جائے۔ اور یہی راں بو نے کیا۔ وہ گھر سے ایسی حالت میں بھاگ نکلا کہ اس کے پاس ایک پائی تک نہ تھی۔ راستے سے واپس آنا پڑا۔ حالانکہ اس کی منزل پیرس تھی۔ جہاں پال ورلین شاعر سے اس کی خط و کتابت کا آغاز ہو چکا تھا۔ شارل ویل واپس آکر وہ پھر ٹکا نہیں۔ پھر بھاگ نکلا۔ یہ ۱۸۷۱ء کا قصہ ہے جب وہ پیرس پال ورلین کے پاس پہنچا۔

راں بو کی زندگی کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک پال ورلین کا ذکر نہ ہو۔ پال ورلین پیرس میں خود اپنی سسرال کے ہاں رہتا تھا۔ راں بو اس کے پاس اس حال میں پہنچا کہ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔ لباس دیہاتی اور غلیظ جسم بالوں میں جوئیں۔ پال ورلین کے سسرال والوں نے شدید نفرت کا اظہار کیا تو پال ورلین نے راں بو کے لیے ایک علیحدہ کمرہ کرائے پر لے لیا۔

یہاں سے بدنامیوں اور رسوائیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ دونوں شاعروں کے درمیان جن کی عمروں میں نمایاں فرق تھا۔ ایسے تعلقات کا آغاز ہوا جنہیں ناپاک کہا جا سکتا ہے۔

پال ورلین اور راں بو اس کی تردید کرتے ملتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے عوامل، ان کے خطوط سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ یہ تردید بے معنی اور غلط تھی۔

راں بو کی زندگی کا یہ دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ ہر دم نشے میں دھت ہر طرح کی منشیات کا استعمال، ہوٹلوں اور ادبی مجالس میں ہنگامے، پال ورلین کی بیوی تنگ آ گئی وہ طلاق لینے کی تیاریاں کرنے لگی۔ لیکن یہی وہ دور ہے جب راں بو نے نثری نظمیں لکھیں جو ILLUMI-NATION کے نام سے شائع ہوئیں۔

پیرس میں وہ بدنامی اور رسوائیوں کی انتہا تک پہنچ گئے۔ وہاں رہنا مشکل ہوا تو دونوں نے لندن کا رخ کیا۔ اس دوران میں راں بو لوٹ شارل ایل بھی جاتا رہا۔ لیکن پھر ورلین کے پاس پہنچ جاتا۔ مئی ۱۸۷۳ء میں ایسا واقعہ ہوا جس نے ان کے تعلقات کو ختم کر دیا۔ ورلین برسلز میں تھا۔ دن رات نشے میں دھت رہتا۔ سسرال والے اس کے تعاقب میں تھے ایک دن نشے میں پال ورلین نے راں بو پر پستول سے دو گولیاں چلا دیں۔ راں بو کی کلائی زخمی ہو گئی۔ ورلین کو دو برس کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا اور راں بو نے شارل ویل کا رخ لیا۔

شارل ویل میں اس زمانے میں راں بو نے وہ نظمیں لکھنی شروع کیں جو بعد میں UNE SAISONENENFER یعنی "جہنم کا ایک موسم" کے نام سے شائع ہوئیں۔

۱۸۷۴ء میں "جہنم کا ایک موسم" کی اشاعت ہوئی۔ اس دوران میں ورلین اسے بلاتا رہا لیکن راں بو اس سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ راں بو نے اپنے حصے کی صرف بارہ کاپیاں وصول کیں اور پھر اپنی اس کتاب کو بھی فراموش کر دیا۔

۱۹۱۴ء تک یہ کتاب پبلشر کے تغافل کا شکار اس کے تہہ خانے میں پڑی رہی اور ۱۹۱۴ء میں صحیح معنوں میں اسے منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔

ILLUMINATION اور "جہنم کا ایک موسم" کے حوالے سے اسی لیے نقاد بعض گھپلے کر جاتے ہیں کہ "جہنم کا موسم" اس کا آخری نظموں کا مجموعہ نہیں ILLUMINATION ہے۔ "جہنم کا ایک موسم" کے بعد راں بو کا تخلیقی دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ

برس کی عمر میں اس نے پہلی نظم لکھی۔ اور انیس برس کی عمر میں شاعری کو چھوڑ دیا۔

اس نے ایسا کیوں کیا ؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس پر بہت سے لوگوں نے اپنی رائے دی ہے۔ اس نے ہر چیز کو کیوں ترک کر دیا اور دور افریقہ میں حرآر جا نکلا۔

کامیو نے اس سلسلے میں کہا تھا۔ شاعری کی دنیا چھوڑ کر حرآر جا نکلنا لایعنیت ABS-URDITY الا تھی۔

کیٹس کی جوانمرگی کے حوالے سے ایک انگریز نقاد نے لکھا تھا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو وہ شیکسپیئر سے بڑا شاعر ہوتا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ اگر راں بو شاعری ترک نہ کرتا تو ۔۔۔ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں ”تو“ کا معاملہ نہیں چلتا۔ راں بو دس برس سے انیس برس کی عمر تک جیسی زندگی گزارتا رہا اس کا ردِ عمل تو سامنے آنا ہی تھا پھر اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے لیے جتنا ممکن تھا اس نے اتنا ہی لکھا۔ اس سے زیادہ وہ لکھ نہ سکتا تھا۔

راں بو کی زندگی کا نیا دور صرف ایک مقصد کے تحت شروع ہوتا ہے وہ ہے دولت کا حصول۔ جو لوگ راں بو کی شاعری کے سنجیدہ قاری ہیں۔ وہ اس مقصد کو اس کی شاعری کے موضوعات کی نفی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اور ان کی شاعری کا ردِ عمل بھی۔ ؟ اب وہ ایک طالع آزما مہم جو کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ سفر کی تیاری سے پہلے اس نے عربی، ڈچ، ہسپانوی اور کچھ دوسری زبانیں سیکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پاک اور عربی کی بعض دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

راں بو پہلے تو کرائے کے سپاہی کی حیثیت سے الیگزنڈر گیا۔ بیمار ہوا تو واپس شارل ویل چلا آیا۔ ۱۸۸۰ء میں وہ ہمیں قبرص میں ٹھیکیداری کرتا ہوا ملتا ہے۔ پھر وہ عدن چلا گیا وہاں ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۱ء میں وہ دشوار راہوں سے گزرتا ہوا ایبسینیا کے شہر حرار پہنچا۔ اسلحے کا کاروبار شروع کیا۔ اس میں خسارہ ہوا۔ حرآر سے واپس عدن آیا۔ لیکن دولت مند بننے کی آرزو نے اسے چین نہ لینے دیا۔ پھر حرآر پہنچا۔ جو رقم اس

نے جان مار کر جمع کی تھی، اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا رہا۔ صحت برباد ہو گئی۔ اس نے غلاموں کی تجارت کی۔ اس کی ایسی تصویریں بھی بنائی گئیں۔ جن میں اسے غلاموں پر کوڑے برساتے ہوئے دکھایا گیا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۱ء تک کئی بار اس کی ماں نے اسے واپس بلوایا۔ لیکن وہ تو دولت مند بن کر واپس جانے کا تہیہ کر چکا تھا اور دولت ہی اس کے نصیب میں نہ تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی عدم موجودگی میں فرانس میں اسے سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا رہا تھا۔ پھر اس کی جان لیوا بیماری کا آغاز ہوا۔ اس کا دایاں گھٹنا سخت ہوا۔ ورد ناقابل برداشت ہو گیا۔ واپسی کا سفر شروع کیا۔ اسے پالکی میں سوار ہونا پڑا۔ عدن آیا۔ لیکن کوئی آرام نہ آیا تو مارسیلز کا رخ کیا۔ جہاں اس کی وہ ٹانگ کاٹ دی گئی۔ تیمارداری کے لیے اس کی بہن اس کے پاس پہنچی۔ ٹانگ کٹنے کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہوا۔ ناسور سارے جسم میں پھیل رہا تھا۔ شارل ویل سے اسے دوبارہ مارسیلز لے جایا گیا۔ اس کی بہن اس کے ساتھ تھی۔ راستے ہی میں ۱۰ر نومبر ۱۸۹۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

راں بو شارل ویل میں مدفون ہے۔ اس کی قبر کے کتبے پر لکھا ہے: "اس کے لیے دعا کرو۔"

"جہنم کا ایک موسم" جدید عالمی شاعری کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی روح کا کرب پیش کرتی ہے۔ جو شدت جذبات سے مضطرب اور بے چین ہے۔ اس کا کرب اس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا۔

راں بو۔ ہیئت کا بڑا قائل تھا۔ وہ نظم کی ہیئت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا اس کے ایک نقاد نے لکھا ہے کہ جب وہ ہیئت کے معاملے میں نئے ہیئتی سانچے ڈھالنے میں ناکام رہا تو اس کی شاعری بھی ختم ہو گئی۔

راں بو پیدائشی نابغہ تھا۔ اور وہ بچپن سے ہی ایک خاص وژن کا مالک تھا۔ وہ شاعر کے لیے اپنی ذات کے علم کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ شاعر کو پرومیتھیوس کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ جس کی ذمے داری انسانیت پر ہے۔ شاعر۔ بھی اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ

وہ غیر مشہود کو مشہود بنا دے۔

"جہنم کا ایک موسم" تشکیک، گمراہی اور اعتقاد کے جھمیلوں میں پھنسے ہوئے آج کے انسان کی روداد کو پیش کرتی ہے۔ آج کے انسان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے راں بو سے بہتر بہت کم شاعر دکھائی دیتے ہیں اور "جہنم کا ایک موسم" اس کا شاہکار ہے۔

راں بو کی ابتدائی زندگی ایسی ہے جس میں وہ ایک PAGANWORLD کا متلاشی ہے۔ جہاں عیش و عشرت میں مصروف انسان اور دیوتا ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی شاعری اس کے عصر اور آج کے انسان کی جذباتی کشمکش اور کرب کو بیان کرتی ہے۔ گمراہی تشکیک اور بے یقینی کی دلدلوں میں دھنسا ہوا انسان رحمت خداوندی اور الطاف اور انصاف کا طلب گار دکھائی دیتا ہے۔

راں بو کا یہ شہکار "جہنم کا ایک موسم" عالمی ادب کا عظیم شہکار ہے۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ایک نثری نظم ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ راں بو اور "جہنم کا ایک موسم" پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔

اردو میں اس کتاب کا ترجمہ انیس ناگی نے براہ راست فرانسیسی سے کیا ہے۔ انیس ناگی ایک مترجم کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سینٹ جان پیرس کے بعد راں بو کا ترجمہ ان کے مرتبے میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

"جہنم کا ایک موسم" ایک اعتبار سے راں بو کی خود نوشت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

"جہنم کا ایک موسم" سے کچھ ٹکڑے

ایک شام حسن کو میں نے اپنے زانوؤں پر بٹھایا اور مجھے اس کا مزہ کڑوا لگا اور میں نے اس سے بدسلوکی کی۔

میں نے بہت کامرانی سے ہر انسانی اُمید کو اپنی روح سے نکال دیا ہے۔ تیرا الجھنی میرا خدا رہی ہے۔

میں نے اپنے آپ کو کیچڑ میں لتھیڑ دیا۔ میں نے اپنے آپ کو گناہ کی ہواؤں میں

خشک کیا۔ اور میں نے دیوانگی سے جی بھر کے دل لگی کی۔

ابھی تو میں بد دُعا کے زیرِ اثر ہوں اپنے وطن سے مجھے ڈر لگتا ہے۔

بچ نکلنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمیں ان راستوں پر پھر جانا ہے جو میری بدیا سے گرانبار ہیں۔

"ہاں، تمہاری روشنی کے لیے میری آنکھیں بند ہیں۔ میں ایک وحشی ہوں۔ ایک زنگی ہوں۔ لیکن مجھے بچایا جا سکتا ہے۔ سوداگرو، قصابو، کنجوسو، سوداگرو تم زنگی ہو۔ مجسٹریٹ تم بھی زنگی ہو۔ جنرل تم زنگی ہو۔ شہنشاہ۔ پرانی خارش تم زنگی ہو تم نے شیطان کی بھٹی کی غیر محلول شراب پی ہے۔ یہ لوگ سرطان اور بخار سے الہام لیتے ہیں۔ معذور اور عمر رسیدہ اتنے محترم ہیں کہ انہیں زندہ اُبال دینا چاہیئے۔ سب سے زیادہ عیاری یہ ہے کہ اس براعظم کو خیرباد کہا جائے۔ جہاں ویرانگی لعنتیوں کے لیے یرغمال مہیا کرتی ہے۔ میں ہام کی حقیقی سلطنت میں داخل ہوتا ہوں۔

کیا میں ابھی تک فطرت کو جانتا ہوں؟ کیا میں اپنے آپ سے آشنا ہوں؟ اب زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مردوں کو اپنے پیٹ میں دفن کرتا ہوں چیخیں ڈھول، رقص، رقص، رقص۔ میں اس لمحے کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں جب سفید فام ساحل پر اُترتے ہیں۔ میں عدم میں گر جاؤں گا۔

بھوک، پیاس اور چیخیں، رقص، رقص، رقص، رقص۔!

(ترجمہ ۔ انیس ناگی)

☆۔ خدا ہی میری قوت ہے اور میں خدا کی ہی تعریف کرتا ہوں۔

☆۔ ایک غیر بہروپ، میری معصومیت مجھے رُلا دے گی۔ زندگی ایک بہروپ ہے جس میں میں نے حصہ لینا ہے۔

☆۔ جہنم کا ماحول مناجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

☆۔ میرا خیال ہے، میں جہنم میں ہوں۔ مجھے اپنے غصے کے لیے ایک جہنم چاہیئے تھا۔ اپنی نخوت کے لیے ایک جہنم۔ اور ہم آغوشی کا جہنم۔ جہنموں کی ایک سنگت۔

(ترجمہ - انیس ناگی)

٭ - میں قدیم باطل اور جھوٹی محبتوں کا مذاق اُڑا سکتا ہوں اور ان جھوٹے جوڑوں کو نادم بھی کر سکتا ہوں۔ میں نے عورتوں کا جہنم دیکھا ہے اور مجھے یہ اجازت ہوگی کہ میں ایک جسم اور ایک روح میں صداقت قائم رکھ سکوں۔

٭ - بالآخر میں عفو کا طلب گار ہوں کہ میں نے جھوٹ سے اپنا پیٹ بھرا ہے۔

"جہنم کا ایک موسم" آج کے انسان کی ذہنی اور روحانی رُوداد ہے۔ راں بو کی شاعری اور اس کی شخصیت آج کے انسان کی صحیح صورت پیش کرتی ہے جو دولت کے لیے مذہب، شاعری، عقل وخرد، انسانی رشتے سب کچھ تج کر دیتا ہے۔!!

••

ایلجیز

بیسویں صدی کے فرد کے آشوب اور فہم ذات اور انسان کی تنہائی اور پھر اس کے حوالے سے مابعد الطبیعاتی مسائل کے بارے میں جس سطح پر رلکے نے سوال اٹھائے اور کرب کو برداشت کیا اس کی مثال پوری عالمی شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ وہ بنیادی سوال جو فلسفے سے تعلق رکھتے تھے ان کو احساسات کی سطح پر شاعری کے وسیلے سے، اپنے عہد کے انسان کی عالمگیر تنہائی کے تال میل سے رلکے نے ایسی شاعری کی جس نے اسے دنیا کے صف اول کے شاعروں میں لا کھڑا کیا جان پلنگ (PILLING) نے تو تفصیل سے اس کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ گوئٹے کے بعد۔ جرمن زبان نے رلکے جتنا بڑا شاعر پیدا ہی نہیں کیا۔ اور جب رلکے کی شاعری کے مختلف ادوار اس کی ذات اور اس کے تخلیقی مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے تو جان پلنگ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر جب ہم آج کی یورپی اور عالمی شاعری پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت کم شاعر ایسے ہیں جنہوں نے رلکے کی طرح جدید شاعروں کو متاثر کیا ہے۔

اپنی موت سے تین برس پہلے اس نے دس نوحوں پر مشتمل یہ عظیم شعری کتاب "ڈوئنو ایلجیز" شائع کی۔ یہ نوحے اس کی ذات کے آشوب اور اس تخلیقی جد وجہد کا آئینہ ہیں جس میں اس کے وہ مسائل شعری صداقتوں کے ساتھ ملتے ہیں جن کا تعلق خدا اور موت اور انسان کے باہمی رشتوں سے بنتا ہے۔

رلکے پراگ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک ریٹائرڈ آسٹرین فوجی تھا۔ اور

اس کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ بیٹی کو جنم دے۔ بیٹا پیدا ہوا تو اسے بہت مایوسی ہوئی۔ ایک عرصے تک اس کی ماں اسے لڑکی سمجھ کر لڑکیوں جیسا لباس اور برتاؤ کر کے اپنی اس مایوسی کا خلاء بھرتی رہی۔ رلکے بچپن سے ہی بے حد حساس تھا اور جب اسے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑی تو وہ بے حد تکلیف میں مبتلا رہا۔ ایک تو اس کی صحت اچھی نہ تھی دوسرے وہ فوجی تعلیم سے نفرت کرتا تھا۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ ملٹری سکول میں رہا۔ پھر اس نے کمرشل اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک رشتہ دار بیرسٹر کے ساتھ کچھ عرصہ کام کرتا رہا۔ ۱۸۹۴ء میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ۱۸۹۴ء – ۱۸۹۵ء میں وہ پراگ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ لیکن اس نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ قانون کی بجائے اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دے گا۔ وہ دوبارہ روس گیا اس کی سرزمین اور اس کے منظر نامے سے وہ بہت متاثر ہوا۔ روس یاترا کے زمانے میں ہی اس نے ٹالسٹائی سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے روسی تاریخ، ادب اور آرٹ کا مطالعہ کیا ۱۹۰۱ء میں اس نے ایک مجسمہ ساز عورت سے شادی کر لی۔ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں وہ پیرس میں عظیم مجسمہ ساز روڈن کا سیکرٹری رہا۔

رلکے بے چین طبیعت کا انسان تھا۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس نے سفر میں بسر کیا۔ ۱۹۱۵ء میں اسے وی آنا میں پھر فوجی سروس کے لیے طلب کیا گیا جہاں اس کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اسے کلرک تعینات کیا گیا۔ اور بالآخر میونخ جانے کی اجازت مل گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برس سوئٹزرلینڈ میں بسر کیے۔ اسے خون کے سرطان کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور ۱۹۲۶ء میں وہ ویلمونٹ میں انتقال کر گیا۔

اپنی شاعری کی ابتداء میں ہی رلکے بڑے بڑے سوالوں سے الجھنے لگا۔ اس نے ایک بار اپنے ایک دوست کے نام خط میں لکھا تھا،

"حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کو اپنی زندگی میں دراصل ایک ہی "آویزش" کا سامنا اور تجربہ کرنا پڑتا ہے جو بار بار مختلف بھیس اور چہرے بدل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔"

رلکے کی ساری عمر جس آویزش کا شکار اور نشانہ بنی رہی وہ تھی تجربے کا خام مواد اور اس کی تخلیقی ہیئت۔ اس نے ۱۹۰۳ء میں ایک خط میں لکھا تھا،

"میں نہیں چاہتا کہ زندگی اور آرٹ میں دوری رہے۔ انہیں کسی طرح کسی مقام پر ایک ہی معنی کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

رلکے کو ہمیشہ اپنی ذات کی تنہائی کا شدید اور کربناک احساس رہا۔ رلکے کو خطوط لکھنے کی "لت" تھی۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہیں ان سے اس کی ذات اس کے تخلیقی اور شعری مسائل اس کی تنہائی اور آشوب کا ایک ایسا منظر نامہ دیکھنے میں ملتا ہے جس سے ہر دور کا لکھنے والا بہت کچھ سیکھ اور حاصل کر سکتا ہے۔ بچپن میں وہ کیتھولک عقیدے کا مالک تھا جسے اس نے بعد میں یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس کی شاعری اور اس کی ذات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا سمجھنے لگا تھا۔ عقیدے سے انحراف اور نت نئے سوالوں نے اس کے دل کو اپنی آماج گاہ بنا کر اس کے اندر ایک ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے وہ ساری عمر اپنی شاعری اور تنہائی سے نبرد آزما مسائل سے پُر کرنے کی کوشش کرتا رہا اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو رلکے نے اپنی ذات اور شاعری کے حوالے سے انسانی ذات اور روح کے خلا کو ہی پُر کرنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ جس کی مثال کہیں کم ہی ملتی ہے۔

وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا ہر تجربہ اس کی ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا اور جس نے اپنی ذات کو مجتمع اور منظم کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اس کی ذات کے حوالے سے مارٹ لالیورڈس برگ کا ایک جملہ بہت اہم ہے جس نے رلکے کے حوالے سے لکھا تھا۔

He was an Artist and hated the approximate.

رلکے نے اپنے عقیدے کو ترک دیا تھا لیکن وہ ایک روحانی انسان تھا۔ ایک روح رکھنے والے سچے انسان کی طرح وہ روح کے مسائل کو سمجھنے میں ہمیشہ کوشاں رہا اور اس کا بھی داعی تھا کہ "انسانی زندگی کو لازمی طور پر بدلنا چاہیے" اور اس نے زندگی کا وہ شعور حاصل کر لیا تھا جس کی بدولت رلکے نے لکھا تھا۔

"ہم فتح کے بارے میں باتیں کرتے ہیں؛ تحمل ہی سب کچھ ہے۔"

اس نے رودٹن کی موت اور ایک شاعر دوست کی خودکشی پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ زندگی اور موت کے حوالے سے اس کے نادر احساسات اور شعری تجربات کا احاطہ کرتی ہیں۔

رلکے کی اس شعری تصنیف "نوحے" کی اشاعت سے پہلے اس کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ جو اس کے تجربات اور احساسات کے مظہر تھے ان شعری مجموعوں نے اس کی شاعرانہ حیثیت کو استحکام بخشا۔ ان شعری مجموعوں میں "دی بک آف آورز" "دی بک آف امیجز" "بنو پوئمز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رلکے کی بہت سی نظموں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں سے ایک ترجمہ جو پروفیسر احمد علی کا کیا ہوا ہے پیش خدمت ہے۔

اور پھر، اور
عشق کے منظر کیسے دیکھے اور پھر اور —
قبروں کے کتبے نوحے کرتے نام بہ نام
ڈر کے مارے سہمے، ساکت، غار، پہاڑ
جن میں روز شب مدغم ہو دیں آ کے آخر، اور پھر ہم تم
دونوں ٹہلیں جا کر کہنہ سال پیڑوں کے نیچے ڈالے ہاتھ میں ہاتھ
لیٹیں ہم تم پھولوں کی آغوش میں۔ اوپر
نکھرا ستھرا چرخ نیلی۔ اور پھر، اور —

سید ہادی حسن مرحوم کے بڑے تخلیقی کارناموں میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے براہ راست جرمن زبان سے رلکے کے نوحوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ تراجم "نیا دور" میں شائع ہوتے میرے علم کے مطابق سید ہادی حسن رلکے پر تفصیلی کام کے علاوہ "ڈیونو ایلجیز" کا ترجمہ بھی کتابی صورت میں شائع کرنے والے تھے مگر موت نے مہلت نہ دی۔

ڈیونو ایلجیز

اکتوبر ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک رلکے، ڈیونو میں اکیلا ہی رہا۔ ڈیونو ایڈریاٹک کوسٹ پر ایک قدیم قلعہ تھا جو رلکے کی دوست شہزادی میری کی ملکیت تھا۔ یہیں اس قلعے میں جنوری

اور فروری ۱۹۱۲ء میں اس نے دو نوحے لکھے جنہیں اس نے ڈیونو ایلجیز کا نام دیا۔ تیسرا نوحہ اس نے پیرس میں ۱۹۱۳ء میں مکمل کیا چوتھا نوحہ میونخ میں ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ بالآخر فروری ۱۹۲۲ء سوئٹزر لینڈ میں شاتو دی موزوٹ میں مکمل ہوا۔ یہ چھوٹا سا شاتو سیرے کے قریب واقع تھا۔ رلکے ۱۹۱۹ء میں سوئٹزرلینڈ پہنچا تھا اور یہاں اس کے ایک فیاض دوست نے اسے پناہ دی تھی۔ یہاں اس نے اپنے ان عظیم دس نوحوں کو ہی تخلیق نہیں کیا بلکہ اسی زمانے میں اس نے "پچپن سونٹس ٹو آرفیوس" بھی لکھے۔

ڈیونو ایلجیز گویا رلکے کی ساری عمر کے کرب، شعری متاع اور اس کے جوہر اور تنہائی کا حامل ہے۔ اس کے شعری نظام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس نادر شعری مجموعے میں اس کی فکر اپنی انتہا کو پہنچی۔ یہ نوحے اس کے روحانی کشف کا مظہر ہیں۔ اس خلا کو پُر کرتے ہیں جسے خود اس نے پیدا کیا اور پھر ساری عمر اسے بھرنے میں صرف کر دی۔

Then was it, Ohighest that you felt in me shame to know me. Your ath went over me so that your severe and all embrassing smile sed into me.

ان نوحوں میں رلکے کے طرز خاص Fragmentry Poeatry. کی جھلک بھی ملتی ہے اور اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے وہ قاری جو اعلیٰ ترین سطح کی نثری شاعری کا مطالعہ کرنے کے خواہاں ہیں انہیں بھی رلکے کی شاعری اور بالخصوص "نوحوں" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

رلکے کو ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا اور وہ اس سلسلے میں بڑے کرب کا شکار تھا کہ نظم میں وحدت کیسے پیدا ہو۔ نظم کی ہئیت اور معنی میں وحدت .... اس نے اپنے مسائل کو ان گنت خطوط میں بیان کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ "ڈیونو ایلجیز" میں وہ اس تخلیقی مسئلے سے پختگی اور کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہوا ملتا ہے۔ رلکے کہا کرتا تھا کہ شاعر.. ہر بڑا شاعر۔

شدید پُراسرار Assaults of his God. میں رہتا ہے۔ ان نوحوں کی تخلیق کے زمانے میں وہ اکثر اس شک وشبہ میں بھی گرفتار رہا کہ وہ کس حد تک کامیاب

ہوا ہے۔ اس زمانے میں اس نے بڑی صداقت کو بھی دریافت کر لیا تھا۔ جو اس کی ذات اور تخلیق کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

رلکے نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

"ایک شخص اکثر اپنی ذات کو پا لیتا ہے.... زبان کے خارجی تنوع اور زندگی کے باطن کے حوالے سے...."

زبان کو اس نے Speech Seea. کا نام بھی دیا ہے اور یہاں مجھے حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے یاد آتا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ بعض بیج چٹانوں پر گرتے ہیں اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ رلکے کے ہاں ان نوحوں میں Seeds of Speach. کا زیاں نہیں ملتا۔

"ڈیولنو ایلجیز" میں نمایاں تنوع ہے لیکن یہ ایک وحدت کا تاثر دیتے ہیں ان کا ایک بولتا ہوا اشتراک ہے جس نے "نوحوں" کی شاعری کی توانائی کو ہمیشہ تازہ رکھا ہے اور پھر ان نوحوں میں جو مابعد الطبیعاتی اور آفاقی مسائل ہیں انھوں نے نوحوں کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

"ڈیولنو ایلجیز" کی شاعری "توانائیوں کا رقص" ہے۔ ان نوحوں میں رلکے کے ہی الفاظ میں Exposure on the Mountains of the heart. کی کیفیت ہے کیونکہ رلکے کی "فریگمنٹری" شاعری کو یہ سہولت حاصل ہوئی کہ وہ زیادہ اور ہلکی ہوا میں سانس لے سکے۔ "نوحوں" کی شاعری اپنے پڑھنے والے کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کرے اور اس کے ساتھ ہی اس شاعری کا ابلاغ کرتے ہوئے شاعر کے کرب سے ہی حظ اٹھائے۔ رلکے کی اس انداز کی کئی مثالیں نوحوں سے دی جا سکتی ہیں۔ نویں نوحہ کا ایک ٹکڑا ہے۔

Are we perhaps here, Simply to say. House, Bridge, Fountain, Door Vessel, Fruit Tree, Window Tower, but to say and then understand m as the things Them selves never tought so intensity to be.

ان نوحوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ عہد نامہ عتیق کی کتاب "ایوب" یاد آتی ہے۔ ایوب بی کے نوحوں کا کوئی اثر رلکے کے نوحوں پر نہیں ہے لیکن ان کا تقابلی مطالعہ ایک عظیم تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان، خدا، موت، کائنات، مابعد الطبیعات کے حوالے سے فرد کی تنہائی، ذات کا آشوب رلکے کے نوحوں کے نمایاں عناصر ہیں۔ بعض نقادوں نے ان نوحوں میں رلکے کے اس تجسس کو نمایاں عنصر قرار دیا ہے۔ جس کے حوالے سے وہ "آئیڈیل انسان" کا تصور پیش کرتا ہے۔ یقیناً یہ عنصر اور تجسس نوحوں میں موجود ہے لیکن یہ نمایاں ترین نہیں ہے بلکہ انسان کا زوال . . . .

More then ever thing fall away, that we can live for what occupies ıeir place is deep without Image.

If they were to waken, the endlessly deep a symbol in us look ıey should points perhaps at — The catkins of the empty hazels, the anging one's or bring to wind the rain which falls in the spring on ıe dark earth and we to think happiness arising would then feel 'hat almost surprises us when what is happy falls.

رلکے نے انسانی زوال کو منشائے ربانی قرار دیا ہے۔ جس کا اظہار ان نوحوں میں ملتا ہے۔ ہر بڑے اور لازوال فن پارے کی طرح۔ ڈیوئنو ایلجیز کے بارے میں بھی کسی مضمون میں پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ رلکے کی عظیم شعری تخلیق اپنے قاری سے اعلیٰ اور نازک ذوق کا بھی مطالبہ کرتی ہے اور پھر ایسی شاعری جس کے خالق نے ساری عمر اس کربناک تخلیقی جدوجہد میں بسر کردی ہو کہ زندگی اور آرٹ ہم معنی ہو جائیں اپنے قاری سے اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے اور محسوسات انسانی میں جو کچھ بھی یہ شاعری منتقل کرتی اور اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

رلکے نے یہ ممکن کر دکھایا کہ آرٹ اور زندگی ہم معنی اور یک جان ہو سکتے ہیں اور اس عظیم شاعر کے حوالے سے "ڈیوئنو ایلجیز" کے بارے میں چند آخری باتیں۔

رلکے نے شاعری کو انسانی ضمیر سے گہرا اور قریبی تعلق رکھنے والی چیز قرار دیا تھا۔ "ڈیوئنو ایلجیز" میں ضمیر کے ساتھ روح اور روحانی مسائل بھی شامل کیجیے۔ رلکے کی شاعری کی تقلید اور نقل نہیں ہو سکتی لیکن اس کے گہرے اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جبکہ رلکے کے ان نوحوں کا پولش زبان میں ترجمہ ہوا۔ تو اس کے مترجم کو رلکے نے ایک خط میں لکھا تھا۔ اس خط میں ایک جگہ اس نے لکھا تھا۔

"زمین کے لیے اس کے سوا کوئی نعم البدل نہیں کہ وہ ہم میں اپنا آپ چھپالے۔ ہم صرف اور محض ہم ہیں ... کیونکہ یہ ہم ہی ہیں جو ظاہر اور چھپے ہوئے کو اپنے اندر چھپا اور پناہ دے سکتے ہیں اور جوں جوں ہم اس ظاہر اور غیر ظاہر کو اپنے اندر پناہ دیتے ہیں توں توں ہماری اپنی ظاہری اور باطنی نشوونما بھی ہوتی رہتی ہے ..." "ڈیونو ایلجیز" اسی ظاہر و غیر ظاہر کی شاعری ہے۔

مارسل پروست کی موت پر رلکے نے ایک خط میں مارسل پروست کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا ...

The perfect tact of his analysis, which pitches no particular th Play fully releases, the verything it seemed to cling to and still, v almost unsurpassable precision everywher admits and makes allowi for the ultimate mysteries

رلکے نے مارسل پروست کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ایک حرف خود اس پر اور "ڈیونو ایلجیز" پر صادق آتا ہے۔

ویسٹ لینڈ

ایلیٹ نے کئی حوالوں سے شہرت پائی۔ نقاد کی حیثیت سے ڈرامہ نگار، مدیر اور خاص انداز کی مذہبی فکر کے حوالے سے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے اور ان کا سارا کام اگر پڑھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ ان کے سب عظیم اور فکر انگیز کام۔ شاعری ہی کے گرد گھومتے تھے۔

"ویسٹ لینڈ" کی اشاعت سے پہلے ہی ایلیٹ خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے بعد میں انہوں نے بیسویں صدی کے چند گنے چنے بڑے شاعروں اور نقادوں کی فہرست میں اپنا شمار کروایا۔ ان کی شاعری نے بیسویں صدی کو متاثر کیا۔ ان کے تنقیدی افکار کی بھی سارے زمانے میں دھوم رہی ہے۔ وہ اچھے ڈرامہ نگار تھے۔ لیکن شاعر اور نقاد ایلیٹ کے سامنے ڈرامہ نگار ایلیٹ دبتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مدیر اور پبلشر کی حیثیت سے بھی ایلیٹ نے عالمی ادب میں اہم خدمات انجام دیں۔

ایلیٹ کا پورا نام تھامس سٹیرنز ایلیٹ۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کو سینٹ لوئی (امریکہ) میں پیدا ہوا۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۱۱ء میں وہ پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۱۱ء ۱۹۱۴ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھتے رہے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں ماربرگ یونیورسٹی جرمنی میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ آکسفورڈ چلے آئے۔ یہیں انہوں نے ۱۹۱۵ء میں شادی کی۔ ایک ہائی سکول میں استاد رہے۔ اسی زمانے میں ان کی ابتدائی

نظمیں شائع ہوئیں۔

۱۹۱۷ء میں ایلیٹ لائیڈز بنک کی فارن برانچ میں کلرک تھے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب
ب سانگ آف جے الفریڈ پروفورک اور دوسری نظمیں شائع ہوئیں۔ اور ایلیٹ ادبی حلقوں میں
بانے پہچانے جانے لگے۔ اس دوران ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں وہ EGOIST کے اسسٹنٹ
یڈیٹر بھی رہے اور پھر ان کی شعری تصانیف عالمی ادبی اُفق پر چھانے لگیں۔ اس دوران میں
ن کی اہم نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۲۷ء ایلیٹ کی زندگی کا اہم سال ہے۔
س برس انہوں نے اینگلو کیتھولک عقیدے کو اپنایا۔ اور انگلستان میں شہریت کے حقوق
اصل کیے۔ شعری مجموعوں کے علاوہ مضامین کا مجموعہ (۱۹۲۱ء) یوز آف پوئٹری اینڈ
ی یوز آف کریٹسزم (۱۹۳۳ء) میں شائع ہوئے۔ اسی دور میں ان کا ڈرامہ مرڈر ان کیتھڈرل
۱۹۳۷ء) سٹیج ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ایلیٹ کی بیوی کا انتقال ہوا اور ۱۹۴۸ء میں ایلیٹ کو
ب کا نوبل انعام دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے کئی ڈرامے سٹیج ہوئے اور نوٹس ٹوواڈز ڈ
ے ڈیفینیشن آف کلچر (۱۹۴۹ء) میں شائع ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں ایلیٹ نے دوسری شادی
ی۔ اور ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔!

ایلیٹ کا شمار بیسویں صدی کے چند بڑے دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے نظریات
ر افکار کو بعض حلقوں میں رجعت پسندانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ صداقت بھی ہے
ین اس کے باوجود نہ تو ایلیٹ کی عظمت سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ ہی عالمی ادب پر ان
ے اثرات کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ایلیٹ نے اپنے افکار و نظریات کا برملا اظہار
یا تھا۔ ایلیٹ نے لکھا تھا۔

"میرے عمومی زاویہ نگاہ کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ میں ادب میں کلاسیکیت
ست میں شہنشاہیت اور مذہب میں کیتھولک ازم پر ایمان رکھتا ہوں۔"

ایلیٹ کی بہت سی نظمیں، بیسویں صدی کی عظیم شاعری میں شمار کی جاتی ہیں
کے تنقیدی مضامین اور کتابوں کی بھی کم اہمیت نہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے
لکھا جاتا رہے گا۔ مگر ویسٹ لینڈ اس کا وہ تخلیقی کارنامہ ہے جو عالمی ادب کے گنے چنے

فن پاروں میں سے ایک ہے۔

"ویسٹ لینڈ" طویل نظم ہے جو ۱۹۲۲ء میں پہلی بار "کرائیٹرین" کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ "کرائیٹرین" کا پہلا شمارہ تھا اور اس کا مدیر خود ایلیٹ تھا۔ لیکن یہ عظیم فن پارہ اپنی اشاعت سے پہلے کانٹ چھانٹ، نظر ثانی اور ترمیم کے ایک طویل مرحلے سے گزرا تھا۔ اور اس کو آخری اور حتمی شکل ایذرا پونڈ نے دی تھی۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۱ء میں اس نظم کے دو ابتدائی ڈرافٹ چھپے ہیں جن کو ایلیٹ کی بیوہ نے مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے ان دو ڈرافٹ اور شائع ہونے والی نظم میں تضاد ہے۔ اور ان کا تقابلی موازنہ بے حد دلچسپ ہے اور بہت سے ناقدوں نے اس پر کام کیا ہے۔ جن میں برٹن رافل کا کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔

"ویسٹ لینڈ" کی اصلاح ترمیم اور کانٹ چھانٹ کا فریضہ ایذرا پونڈ نے انجام دیا تھا اور جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو اس کو "ایذرا پونڈ۔ وی بیٹر ورک مین" کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ ایلیٹ خواہاں تھا کہ اس کی جو اصلاح اور حاشیہ آرائی پونڈ نے کی ہے اسے بھی ساتھ ہی شائع کیا جائے۔ لیکن پونڈ نے اس کی مخالفت کی اور اپنے اسی خط میں لکھا۔ "اپنے لفظ 'اپریل' سے آخری لفظ 'شانتی' تک یہ نظم کسی تعطل اور انقطاع کے بغیر رواں دواں ہے اور ہم اسے انگریزی زبان کی طویل ترین نظم کہہ سکتے ہیں۔"

ایذرا پونڈ نے اس نظم کی تدوین، اصلاح، ترمیم اور کانٹ چھانٹ کے حوالے سے خود بھی ایک دلچسپ نظم لکھی تھی۔ جس میں اپنے اس عمل کو "سیزرین آپریشن" کا نام دیا تھا ایذرا پونڈ کی تدوین، ترمیم اور کانٹ چھانٹ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض نقادوں نے ایذرا پونڈ پر نظم کی "ارضی حیثیت" کو نقصان پہنچانے کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن ایلیٹ ہمیشہ پونڈ کا مداح رہا اور بہت زمانہ گزارنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں خود ایلیٹ نے اپنی نظم کے اس آپریشن کے حوالے سے ایذرا پونڈ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ایذرا پونڈ ایک شاندار اور بے مثل نقاد تھا۔ کیونکہ وہ کبھی آپ کو یہ

رُخ اختیار نہ کرنے دیتا تھا کہ آپ اپنی ہی نقالی کرنے لگیں۔"

ایلیٹ نے اپنی اس نظم کا نام پہلے HE DO THE POLICE IN DIFFERENT VOICES رکھا تھا جو چارلس ڈکنز کی ایک کتاب کے ایک کردار سے مستعار لیا گیا تھا۔ ایذرا پونڈ ہی نے نظم کا نام بدل کر ویسٹ لینڈ رکھا۔ "ویسٹ لینڈ" اپنی آخری شکل میں شائع ہونے سے پہلے ایک بکھری ہوئی نظم تھی۔ یہ پونڈ ہی تھا کہ جس نے اس کی شیرازہ بندی کر کے اسے ایک مکمل بامعنی وجود بخشا۔

۱۹۲۲ء میں یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت پر طرح طرح کی آرا کا اظہار ہوا۔ ایمی لاول جیسے شاعر نے اسے "APIECE OF TRIPE" کہا۔ مڈلٹن میری جیسے نقاد نے اسے فضولیات اور بے کار چیزوں کا انبار قرار دیا۔ ٹائمز کے تبصرہ نگار نے اسے ایک ایسی پیروڈی قرار دیا جو ہنرمندی کے فقدان اور بد ذوقی پر مبنی ہے۔ رچرڈ ایلمان نے لکھا۔ "لائیڈ بینک کے مشہور بینک کلرک نے پچاس برس کے بعد شاعری کی کرنسی کوئی قیمت عطا کی ہے۔" جیمز جوئس کو نظم کا اختتام خواتین کے لیے لکھی جانے والی شاعری جیسا محسوس ہوا۔

خود ایلیٹ نے ۱۹۲۳ء میں فورڈ میڈکس فورڈ کے نام ایک خط بھی لکھا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ "ویسٹ لینڈ" میں میرے خیال میں تیس بہت اچھے مصرعے ہیں۔" یہ ایلیٹ کا انکسار تھا۔!

ویسٹ لینڈ، آسان نظم نہیں ہے۔ لیکن یہ اتنی مشکل اور حوصلہ فرسا کر دینے والی نظم بھی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ تاہم بڑی شاعری کے کچھ اپنے مطالبات ہوتے ہیں۔ اور ویسٹ لینڈ کے بھی کچھ مطالبات ہیں۔ جن کے بغیر اس نظم کی پوری معنویت آشکار نہیں ہوتی۔ تلمیحات، علامتیں، تاریخی کردار اس نظم میں موجود ہیں جو اپنے پڑھنے والے سے پس منظر سے شناسائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس نظم میں خود نوشت کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اور اعترافات بھی جو بعد میں رابرٹ لوول، سلویا پلاتھ، این سیکسٹن وغیرہ کی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار پائے۔

ویسٹ لینڈ کے جدید شاعری پر اثرات بہت نمایاں اور گہرے ہیں اور پھر اب تک شاید ہی کوئی ایسی نظم لکھی گئی ہو جس میں موجودہ عہد کی شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہو۔ ہیلن وینڈلر نے تو ویسٹ لینڈ کو "ایک عظیم دستاویزی نظم" بھی قرار دیا ہے۔

ایلیٹ کی یہ نظم ویسٹ لینڈ ۴۳۴ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اور پانچ حصوں میں منقسم ہے جو ہیئت اور حجامت کے اعتبار سے مختلف اور غیر مساوی ہیں۔ اس کے پہلے حصے کا نام "مردوں کی تدفین" ہے اور پہلا مصرعہ APRIL IS THE CRUELLEST MONTH۔ ہے اور آخری مصرعہ "شانتی شانتی شانتی" ہے اور ویسٹ لینڈ کے پانچ حصے پانچ مختلف انداز کی حرکات کی طرح ہیں۔ نظم میں ہمیں کئی کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے جو ہمارے عہد کے شہر کی بے مقصد بیزار کن زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں ہی ایک خاتون کردار ہے جو "راتوں کو بہت پڑھتی ہے اور موسم سرما میں جنوب کے علاقوں میں چلی جاتی ہے"۔ یہ خاتون دولت مند ہے اور بے مقصد زندگی گزارتی ہے۔ اس کے حوالے سے ایلیٹ نے طبقہ امرا کی بے کار دولت مندی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں زندگی کو ایلیٹ نے شکستہ امیجز کا ڈھیر قرار دیا ہے۔ اور یہاں سمندر بھی بنجر اور خالی ہے۔

رابرٹ لینگ بام نے "ویسٹ لینڈ" کے حوالے سے لکھا ہے:

"ویسٹ لینڈ" ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں انسانوں کے درمیان ابلاغ و اظہار کا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔

"ویسٹ لینڈ" میں متعدد مقامات پر مکالماتی اظہار ہوتا ہے لیکن یہ مکالمہ، مخاطب کے بغیر جنم لیتا ہے۔ بولنے والا اپنے آپ سے اور آس پاس کی دنیا سے مکالمہ کر رہا ہے۔ انسانوں سے نہیں۔ انسانوں کے درمیان جو اصل تعلق اور رابطہ ہوتا ہے۔ وہ اس پوری نظم میں کہیں جڑتا ہوا نہیں ملتا۔ ہارگروسے نے "ویسٹ لینڈ" کے بارے میں بہتر رائے دی ہے۔ ہارگرو لکھتا ہے:

اس نظم میں شہری اور صحرائی علامتوں کے حوالے سے اس بیمار انسان کی زندگی کے پہلو اجاگر کیے گئے ہیں جو اس مہذب اور جدید جہنم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس نظم کے کئی حصے ایسے ہیں جواب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔
وہ لاش جسے تم نے پچھلے برس اپنے باغ میں کاشت کیا تھا، کیا وہ پھوٹنے
لگی ہے۔ کیا وہ اس برس کھل اُٹھے گی۔
شہر اس نظم میں UNREAL بنکر سامنے آتے ہیں اور آغاز ہی میں موت کی آواز
سنائی دیتی ہے۔ "اپریل ظالم ترین مہینہ ہے..."
ویسٹ لینڈ کا دوسرا حصہ "اے گیم آف چیس" ہے۔ اس میں جدید دور کا انسان ایسی
دنیا میں رہتا ہے جو ایلیٹ کے بقول
"اور یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں مردہ انسان اپنی ہڈیاں کھو
بیٹھتے ہیں۔"
جہاں انسان ہسٹریا میں مبتلا ہے۔ کچھ نہیں جانتا کہ کیا کرے۔
"ہم کیا کرتے رہیں گے ہمیشہ
دس بجے گرم پانی
اور اگر بارش ہو جائے تو چار بجے ایک بند کار۔
اور ہم شطرنج کا کھیل کھیلتے رہیں گے۔
پلکوں سے محروم آنکھوں پر بوجھ ڈالے"
دروازے پر دستک کا انتظار کرتے ہوئے۔
اور پھر اس کیفیت کا شدید ہذیانی اظہار جو اس طرح جنم لیتا ہے۔
"اور اب میں کیا کروں گا۔
اب میں کیا کروں گا؟"
تیسرے حصے کا عنوان آگ کا وعظ (فائر سرمن) ہے۔ جہاں
دریا کا خیمہ ٹوٹ چکا ہے۔
پتوں کی آخری انگلیاں
گیلے ساحل سے چمٹی ڈوب رہی ہیں

چوتھے حصے کا عنوان "ڈیتھ بائی واٹر" ہے۔
پانچویں اور آخری حصے کا عنوان "WHAT THE THUNDER SAID" ہے
اس آخری حصے میں پہلے سارے حصوں کے بکھرے ہوئے تار۔ گویا یکجا ہو جاتے ہیں
اس حصے میں کئی مذہبی حوالے بھی ملتے ہیں۔ جن کے حوالے سے بعض نقادوں نے "ویسٹ لینڈ" کو ایک مذہبی نظم ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

"وہ جو زندہ تھا ....
اب مر چکا ہے ...."

کا اشارہ حضرت مسیح کی طرف قرار دیا جاتا ہے۔ اور پھر موت میں زندگی اور زندگی میں موت کو ہی سمو دیا جاتا ہے۔

"ہم جو جیے جا رہے ہیں۔ اب مر رہے ہیں
تھوڑے سے تحمل کے ساتھ۔

یہاں "پانی" نجات دہندہ بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن "ویسٹ لینڈ" میں پانی بھی نہیں ہے اور رعد کی کڑک بانجھ ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود تنہائی ممکن نہیں ہو پاتی بلکہ....

کوئی ہے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتا ہے۔
میں نہیں جانتا وہ عورت ہے یا مرد۔
۔ لیکن وہ کون ہے جو تمہارے دوسری طرف چل رہا ہے ؟"

اس دنیا میں ٹاور گرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں پانی نہیں رہا۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ غیر حقیقی شہروں کی دنیا ہے۔ یروشلم، ایتھنز، سکندریہ، وی آنا، لندن سب غیر حقیقی شہر ہیں۔ اور ویسٹ لینڈ، شہری اور انسانی موربڈٹی (MORBIDITY) کا موثر اور سنگین ترین اظہار بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود آخری مصرعے میں یہیں شانتی شانتی کی صدا سنائی دیتی ہے ....

ویسٹ لینڈ کی معنویت، ہیئت، فنی پہلو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اس نظم کے حوالے سے ایلیٹ پر ویدانت اور تصوف کے اثرات کا بھی جائزہ لیا

گیا اسے رجعت پسند بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جنسی رویوں اور رجحانات کی اس نظم کے حوالے سے تشریح و تفسیر کی گئی ہے۔ بلا شبہ ویسٹ لینڈ ایک عظیم فن پارہ ہے۔ میں آخر میں ڈیوڈ وارڈ کی رائے نقل کروں گا جو اس نظم کا میرے خیال میں بہترین تجزیہ پیش کرتی ہے۔

"ایک سطح پر یہ نظم جذباتی گورکھ دھندوں کا اظہار ہے۔ اور اس میں مختلف النوع جذباتی اختلاط کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ ذاتی رہی ہیں جن کا اطلاق ہر کرہ پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظم میں جو غیر متوازن جذبات ہیں انھوں نے اسے قوت عطا کی ہے۔ ویسٹ لینڈ میں اس نفرت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنی ذات سے ہوتی ہے اور روح کو مسخ کر دیتی ہے۔ اور ہمارے دور میں انسان جتنا حیوان اور منافق بن کر سامنے آیا ہے۔ پہلے کبھی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے پہلے اپنی ناکامیوں اور خامیوں کا اتنا شعور بھی نہ رکھتا تھا یوں دیکھا جائے تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ویسٹ لینڈ کلاسیکی رتبے کی حامل ہے اس میں ایک خاص اور یقینی انداز کی شہری اور تہذیبی موربڈٹی کا اظہار ایسی قوت اور توانائی سے ہوا ہے کہ جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس موربڈٹی کا اظہار براہ راست، الفاظ میں عمل کے ذریعے ہوا ہے، محض اشاروں سے کام نہیں چلایا گیا ...... "

کینٹوز

اور دن بھی پوری طرح مکمل اور کافی نہیں ہیں۔
اور راتیں بھی ادھوری اور ناکافی ہیں۔
اور زندگی یوں ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے
جیسے کھیت میں رہنے والا چوہا۔
چلتا ہے تو گھاس تک کو حرکت نہیں ہوتی۔

زندگی کسی دور میں ایذرا پاؤنڈ کے لیے ناکافی اور غیر مطمئن صورت حال اختیار کر گئی تھی اور اس نے زندگی کے گزرنے اور حرکت کے عمل کو کھیت میں رہنے والے چوہے سے تشبیہ دی تھی جو اس طرح غیر محسوس طریقے سے حرکت کرتا ہے کہ گھاس تک اس کی حرکت سے ہلتا تک نہیں۔

لیکن جیسی زندگی ایذرا پاؤنڈ نے بسر کی اور جیسی شاعری اس نے کی، اس کو سامنے رکھیں تو انتہائی متحرک، فعال انسانی شخصیت سامنے آتی ہے۔ جس نے نہ صرف شاعری کو نئی جہتوں اور معنی سے روشناس کرایا بلکہ اپنے عہد کے کتنے ہی شاعر اور لکھنے والوں کی اس طرح سرپرستی اور رہنمائی کی کہ ان پر ایذرا پاؤنڈ کے اثرات بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے اور اس میں کچھ ایسا شک و شبہ بھی نہیں کہ ایذرا پاؤنڈ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا منظر نامہ بہت وسیع ہے۔ شاعری میں اس نے زبان و بیان ، ہیئت کے معنوی اور باطنی تجربے کیے۔ اس نے پہلی بار شاعری کی دنیا میں قدیم منطقوں کو دریافت کیا اور یوں شاعری کی کائنات کو وسعت دی۔ اس کے "کینٹوز" دنیا کی عظیم شاعری کا ایک اہم حصہ ہیں

جس میں تمام شعری تجربوں اور باطنی معنویت کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی زندگی کے اہم اعمال اور ردعمل کے علاوہ دنیا بھر کی قدیم و جدید شاعری کے اعلیٰ نمونوں کو منتقل و یکجا کیا گیا ہے۔

ایذرا پاؤنڈ نے بڑی فعال، متحرک اور تہلکہ خیز زندگی بسر کی۔ اس نے بعض ایسے فیصلے کیے اور ان پر اس جرأت مندی سے عمل کیا کہ وہ بہت سی حکومتوں اور لوگوں کی نگاہ میں معتوب ٹھہرا اور اس کی خوب رسوائی ہوئی۔

ایذرا پاؤنڈ کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے اور خود اس کی اپنی نثری اور شعری تخلیقات کے مطالعے سے میرا ایک تاثر یہ قائم ہوا کہ اگر وہ معتوب ٹھہرا اور اس نے بعض امور میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا تو اس کی بھی ٹھوس وجوہات تھیں۔

ایک تو یہ کہ وہ اقتصادیات کی بہت سوجھ بوجھ رکھتا تھا اور ابتدائی عمر میں ہی امریکی معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے وہ اس حقیقت کو پا چکا تھا کہ امریکی نظامِ معیشت دنیا کے انسانوں کے لیے ایک لعنت اور عذاب سے کم نہیں اس کا اظہار وہ برملا کرتا رہا اور دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اگر وہ نازیوں کا حامی بنا اور نازی حمایت میں تقریر نشر کرتا رہا تو اس کا بھی سبب تھا۔

اور دوسری اہم بات جو مجھے ایذرا پونڈ کے ہاں ملتی ہے وہ ہے موسیقی کے ساتھ اس کا ماہرانہ اور پُرخلوص لگاؤ۔ یوں تو اس کی شاعری میں ہی موسیقی کا عنصر اتنا نمایاں ہے کہ اسی سے موسیقی کے بارے میں اس کے پُرجوش طرزِ عمل کا ثبوت مل جاتا ہے لیکن اسے یہ بھی فکر رہا کہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں موسیقی پوری طرح پنپ نہیں سکتی اور امریکہ اس لیے کوئی بڑا موسیقار پیدا نہیں کر سکا۔

ایذرا پاؤنڈ جتنا اہم اور بڑا شاعر تھا اتنا ہی اہم نقاد اور مترجم ہے۔ اس نے ایک بڑے نقاد اور شاعر کی حیثیت میں بعض ایسے سوال بھی اٹھائے ہیں جن کا جواب نہیں دیا جا سکا۔ اس میں اہمیت تو سوال کی ہوتی ہے جواب کی نہیں اور ایذرا پاؤنڈ کو اس کا بھرپور شعور حاصل تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ ہمیں بعض ایسے سوال بھی اٹھانے چاہئیں جن کا جواب خود ہمیں معلوم نہ ہو۔

ایذرا پاؤنڈ کا سنِ ولادت ۱۸۸۵ء ہے وہ امریکہ کے ایک سرحدی گاؤں میں پیدا ہوا۔ چند برسوں کے بعد اس کا خاندان فلاڈلفیا منتقل ہوگیا۔ اس کا باپ ٹکسال میں ملازم تھا۔ مختلف شہروں کے

تعلیمی اداروں میں اس نے تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی اسے شاعری سے دل چسپی پیدا ہوئی جس کے اثرات اس کی ساری زندگی پر ملتے ہیں۔ ہسپانوی اور فرانسیسی شاعری کا بھی اس نے بھرپور مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں پاؤنڈ لندن آیا، جہاں ہیوم رومانی شاعری کے خلاف بھرپور صدا بلند کر رہا تھا۔ پاؤنڈ نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی جسے امیجسٹ شاعری کی تحریک کہا جاتا ہے۔ وہ ژیٹس جیسے بڑے شاعر کا سیکرٹری بھی رہا۔ ژیٹس نے بلیوں کے ساتھ پاؤنڈ کی محبت کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ ژیٹس کے اثرات بھی پاؤنڈ پر بہت واضح رہے، لیکن وہ بہت جلد اپنا انفرادی لہجہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

پاؤنڈ بہت جلد نئی شاعری اور نئے تنقیدی افکار کے حوالے سے معتبر اور رہنما شخصیت کا مقام حاصل کر بیٹھا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا قصہ عام ہے کہ پاؤنڈ نے کیسے ایلیٹ کے لیے چندہ جمع کیا کہ وہ بینک کی ملازمت سے آزاد ہو کر شاعری پر پوری توجہ دے سکے اور پھر اس نے ویسٹ لینڈ کو ترتیب دیا اور اس کی تصحیح کا فریضہ انجام دیا۔ ہیمنگوے نے اپنی کتاب "اے موو ایبل فیسٹ" میں پیرس میں زمانۂ قیام کے دوران میں پاؤنڈ کے حوالے سے کتنے ہی واقعات کا ذکر کیا ہے کہ پاؤنڈ نے کس طرح مختلف شاعروں کے لیے امداد کا انتظام کیا۔

ایذرا پاؤنڈ کی شاعری کا اہم ترین دور (۱۹۱۰ء) وہ ہے، جب اس نے مشرقی تہذیبوں اور مشرقی زبانوں کی شاعری میں گہری دل چسپی کا آغاز کیا۔ پرووانس کی شعری روایت، ہسپانوی اور اطالوی شاعری سے وہ پہلے ہی بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس نے فارسی شاعری کو بھی سمجھنے کی کوشش کی مگر جاپانی اور چینی شاعری میں اس نے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ اور ان زبانوں کی نمائندہ شاعری کے ترجمے کیے۔ اس نے موسیقی پر بہت کام کیا۔ دو اوپیرا بھی لکھے جن کا کمپوزر بھی خود تھا۔ آر مرے شیفر کی کتاب "ایذرا پاؤنڈ اینڈ میوزک" اس سلسلے میں بہت اہم ہے کہ موسیقی کے ساتھ ایذرا پاؤنڈ کو کتنی دلچسپی تھی۔ اور وہ خود کمپوزر ہونے کے علاوہ موسیقی کا بہت اہم نقاد بھی تھا۔

ایذرا پاؤنڈ نے کنفیوشس سے گہرے اثرات قبول کیے، اور اس کے تراجم کیے قدیم جاپانی نوہ (NOH) ڈراموں کے ترجمے کیے۔ اس کی نظموں کے کئی مجموعے اس کی زندگی میں شائع ہوئے۔ کینٹوز اس کا سب سے بڑا شعری تخلیقی کارنامہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ایذراپاؤنڈ ایک متنازعہ شخصیت بنکر نمایاں ہوا۔ معاشی نظریات کے حوالے سے امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں اس کے رویے کا مختصر ذکر ہو چکا ہے۔ امریکی نظام معیشت سے اسے جو نفرت تھی وہ فسطائیت کے ساتھ قربت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ امریکی یہودی سرمایہ داروں کے بارے میں اس کا رویہ کھلا ڈھلا تھا اور وہ ان سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے روم ریڈیو سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ امریکی نظام معیشت کا کٹر مخالف بن کر سامنے آیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں نکلا کہ جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اسے امریکہ لایا گیا۔ جہاں اس پر مقدمہ چلا۔ اُسے ذہنی اور دماغی مریض قرار دے کر دماغی ہسپتال پہنچا دیا گیا وہ کئی برس تک ہسپتال میں رہا اور ۱۹۵۸ء میں اسے رہا کیا گیا۔ اس زمانے میں بھی اس کے خلاف بہت پروپیگنڈا ہوا۔ اور اس کی رہائی کے لیے بھی جدوجہد جاری رہی۔ رہائی ملی تو اس نے امریکہ میں قیام کرنا پسند نہ کیا اور اٹلی کا رُخ کیا۔ اپنی زندگی کے آخری برس اس نے بہت خاموشی سے بسر کیے۔ اس کی خامشی کی بھی بہت شہرت ہوئی۔

ایذراپاؤنڈ کی نثری اور شعری تخلیقات کے مجموعوں کی خاصی معقول تعداد ہے۔ تراجم اس کے علاوہ ہیں۔ اس نے سفوکلیز کو بھی ترجمہ کیا۔ پرووانس شاعروں کو بھی، کنفیوشس، چین اور جاپان کے نمائندہ شاعروں کو بھی، ہندی شعراء بھی اس کے حوالے سے انگریزی میں منتقل ہوئے۔ اس کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں جوائس اور اس کے خطوط کا مجموعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ عالمی کلچر پر بھی اس کی کتاب بہت اہم ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے کے سلسلے میں اس کی کتاب اے بی سی آف لٹریچر، رہنما کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ جاپان کے کلاسیکی نوہ ڈراموں کا ذکر ہو چکا ہے اس کے ادبی مقالات بھی یکجا کر کے شائع ہو چکے ہیں۔

ایذراپاؤنڈ کی نظموں کے کئی مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔ منتخب نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ایذراپاؤنڈ کا سب سے اہم کام اس کے کینٹوز (CANTOS) سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کینٹوز اس کی انفرادیت، شاعری میں اس کی جدت کے مظاہر ہیں۔ کینٹوز۔ دراصل ایک بڑی رزمیہ نظم کی طرح ہے۔ جسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پاؤنڈ نے ان کینٹوز کی تکمیل میں اپنی زندگی

کا ایک طویل عرصہ صرف کیا ہے۔

کینٹوز کی شعری ہیئت، زبان اور اصول مختلف ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید عالمی شاعری پر جو اثرات ایذرا پاؤنڈ کے نظریات شاعری اور بالخصوص اس کے "کینٹوز" ہیں۔ ان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز نے شاعری کو نئی جہتوں اسالیب اور مطالب و معنی سے آشنا کیا۔ یہ کینٹوز یقیناً اعلیٰ ذوق کے لوگوں کے لیے ہیں۔ بڑی شاعری کے مطالبات بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ان کینٹوز میں جو حوالے آتے ہیں اس کو سمجھے بغیر اس عظیم شاعری کی پوری معنویت اور وسعت سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ "کینٹوز" میں وہ سب فلسفی، دانشور اور شاعر در آئے ہیں جن سے ایذرا پاؤنڈ کو خاص نسبت اور محبت تھی۔

ان کینٹوز میں اساطیری کرداروں کے حوالے نے بھی معنویت پیدا کی ہے۔ اس لیے جب تک پڑھنے والا اساطیری کرداروں کے بارے میں بنیادی معلومات نہ رکھتا ہو۔ کینٹوز کی بڑی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

"کینٹوز" کا دائرہ صدیوں اور زمانوں پر محیط ہے شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس کا ذکر یا اشارہ ان کینٹوز میں موجود نہ ہو۔ ایذرا پاؤنڈ کے اپنے سیاسی اور معاشی نظریات تک مختلف حوالوں سے ان کینٹوز میں ظہور کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ایذرا پاؤنڈ کی اپنی ذات اور تجربات بھی ان کینٹوز میں پوری طرح موجود ہیں۔ اس کی سوانح عمری مرتب کرنی ہو تو "کینٹوز" اس سلسلے میں بھی بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ان کینٹوز کا بنیادی موضوع انسانی تقدیر اور تدبیر ہے اور ان کے حوالے سے جو مسائل جنم لیتے ہیں اور جو سوال ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ کینٹوز میں پوری شعریت کے ساتھ اپنا ظہور کرتے ہیں۔

کینٹوز کا مطالعہ ایک عظیم تجربے کی حیثیت رکھتا ہے یہ ایسی شاعری ہے جسے ایک سانس یا ایک نشست میں پڑھا نہیں جا سکتا۔ یہ شاعری آہستہ آہستہ رُک رُک کر غور کر کے پڑھنے کا مطالبہ کرتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے اسرار کھلتے ہیں اور اس کی معنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ کینٹوز کی شاعری بیسویں صدی کا سب سے اہم شعری کارنامہ ہے اور اس کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے.....!!

جاوید نامہ

علامہ اقبال کی ہر تصنیف شعری حسن فکر انگیزی اور فلسفے کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے اس کا اندازہ اقبال کے ہر سنجیدہ قاری کو ہے لیکن شعری ہیئت میں علامہ اقبال کی سب سے اہم تصنیف "جاوید نامہ" ہے۔ فارسی زبان میں لکھی جانے والی یہ کتاب جہاں دنیائے شعر و فکر کی ایک روایت کی اہم ترین کڑی ہے وہاں اپنی جگہ اس کا ایک ایسا بلند اور انفرادی مقام ہے جو دنیا کی بہت کم کتابوں کو حاصل ہوا ہے۔

جاوید نامہ کا سن اشاعت ۱۹۳۲ ہے۔ یہ اقبال کے دور آخر کی یادگار تصنیف ہے۔ جب ان کا فن، ان کی فکر ارتقا کے کئی مدارج طے کر کے اپنی انتہائی پختگی اور بلندی کو پہنچ چکی تھی۔

جاوید نامہ کے حوالے سے میں علامہ اقبال کی زندگی کے حالات بیان نہیں کروں گا بلکہ اقبال کے عہد کے بارے میں چند اہم نکات کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔ بظاہر میرا یہ دعویٰ بہت سے لوگوں کے لیے مبالغہ آمیز ہو لیکن میں یہ دعوے بڑے یقین سے کر رہا ہوں کہ برصغیر پاک و ہند بلکہ پورے براعظم ایشیا، میں آج تک کوئی ایسا شاعر اور فلسفی پیدا نہیں ہوا جو اقبال جتنا پڑھا لکھا ہو۔ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو بے حد اہم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاں اقبال پر ڈھیروں کام ہوا ہے اور تشنگی محسوس کی جاتی رہے گی۔ علامہ اقبال کو مغرب و مشرق کے قدیم و جدید فلسفے اور فکر پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اقبال اپنی زندگی کے آخری سانس تک علم کے جویا رہے۔ ان کے خطوط میں سینکڑوں ایسے خطوط ہیں جن میں انھوں نے کتابوں کا ذکر کیا ہے اور کتابوں کی فرمائش، اقبال اپنی پوری زندگی میں پوری بنی [illegible] کے امین تھے۔ جتنا کچھ انھوں

نے پڑھا یہ صغیر پاک و ہند کے کسی شاعر نے نہیں پڑھا۔ قدیم و جدید فکر و فلسفے کے امتزاج سے اپنی شخصیت کو ایسی بلندیوں پر لے گئے کہ جہاں آج تک علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھی کوئی نہیں پہنچ سکا۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ اقبالؒ کو کیسا عہد ملا جس عہد میں اقبال نے آنکھ کھولی اور وہ پھر اس دنیا سے رخصت ہوئے اس عہد میں دنیا کی فکری اور سائنسی اعتبار سے نئی صورت گری کا عمل فروغ پا چکا تھا۔۔۔۔

قدیم فلسفیوں اور شاعروں کو چھوڑ دیجیے۔ جن سے اقبال پوری طرح آشنا تھے اور ان کے کام کے بارے میں اپنی متوازن رائے رکھتے تھے۔ ان کے اپنے عہد پر اک نگاہ ڈالیے اردو شاعری غالب تک پہنچ چکی تھی۔ اظہار و فکر کے نئے سانچے ڈھل چکے تھے۔ سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے بانگِ درا میں غالب کے حوالے سے اقبال کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ فکر انگیز نکتہ ہے۔ خود اقبال مغرب مشرق کے علوم اور فلسفے سے بہرہ ور تھے۔

اقبال نے پہلی جنگ عظیم کو دیکھا جمعیت اقوام کی مجلس کا قیام بھی دیکھا اور اس کی بے وقعتی اور بے اثری کو بھی بھانپا آج کی جدید دنیا جو کچھ ہے اور جن ذہنوں نے اسے ڈھالا ہے ان کے سب فلسفے اور افکار اقبال کی حیات میں نمایاں ہو چکے تھے۔ کارل مارکس جدلیات اور نئے نظام کا فلسفہ پیش کر چکا تھا۔ لینن روس میں انقلاب لا چکا تھا۔ راسکن کی بازگشت اور ردِ عمل اقبال کی نظموں میں ملتی ہے۔ فرائیڈ۔ نفسیات و جنس کے نظریات پیش کر چکا تھا۔ دو خطبات میں فرائیڈ اور نظریہ جنس کے حوالے سے علامہ اقبالؒ نے جو خراج تحسین پیش کیا وہ ریکارڈ پر ہے۔

آئین سٹائن کا نظریہ اضافیت پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نطشے ۱۹۰۰ء میں دنیا کو اپنے فلسفے کی متاع دے کر رخصت ہو چکا تھا۔ برگساں سے اقبال خود ملاقات کرتے ہیں۔

ادھر گراں خواب چینی بھی سنبھلنے لگے تھے اور افریقہ اور ایشیا کی اقوام غلامی کے خلاف احتجاج کرنے لگی تھیں۔ برصغیر میں آزادی کی جدوجہد عروج پر تھی اور خود اقبال مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں پیش کر چکے تھے۔ نازی ازم اور فاشزم

نے یورپ میں اپنے قدم جما لیے تھے اور اقبال نے مسولینی سے ملاقات کی تھی۔ اضطراب، تذبذب اور یقین کے اس عہد میں اقبال انسانی فکر کے تمام اہم کارناموں سے آشنا ہو چکے تھے۔ اور اقوام مشرق کو نوید آزادی دے رہے تھے اور دوسری جنگ عظیم چھڑنے کے امکانات بھی اقبال پر واضح تھے۔

اقبال کی فکری بصیرت کو کوئی دوسرا شاعر اور فلسفی نہیں پہنچ سکا، اس پختگی عمر اور فکر کے دور میں جاوید نامہ، منصہ شہود پر آتا ہے۔ جاوید نامہ عالمی ادب کا عظیم شعری اور فکری فن پارہ ہے۔ دنیا کی سب بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو میں کئی تراجم ہوئے ہیں جن میں رفیق خاور کا ترجمہ بہتر ہے۔ کئی مقامی زبانوں تک میں 'جاوید نامہ' کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

جاوید نامہ میں انسانی فکر اس بلندی تک پہنچ جاتی ہے کہ جہاں یزداں بہ شکار آمد اے ہمت مردانہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اقبال کے ہاں 'جاوید نامہ' کے حوالے سے آدمی اور بشر کو جو مقام دیا گیا ہے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

'جاوید نامہ' کا منبع، سرچشمہ اور بنیاد۔ معراج رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے معراج نبویؐ سے جو روایت بنتی ہے اس میں جاوید نامہ کا عظیم الشان مقام ہے۔

انسانی تاریخ میں یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی معراج تھا کہ جس نے نہ صرف مسلمان شاعروں اور فلسفیوں کو اس موضوع کو اپنانے کی تحریک عطا کی۔ بلکہ غیر مسلموں نے بھی واقعہ معراج نبویؐ سے فیض اٹھایا۔ اس سلسلے میں ایک حوالہ شیخ بایزید بسطامیؒ کا ہے جنہوں نے تیرہویں صدی ہجری میں اپنے مریدوں کو اپنے روحانی سفر کی روداد بیان کی۔ اس عربی روداد کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔

حسین بن منصور حلاج کی مشہور عالم کتاب "الطواسین" میں طاسین محمدیؐ" میں بھی

روایات معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر ملتا ہے۔ بو علی سینا نے بھی اپنے دو رسالوں رسالۃ الطیر اور رسالۃ الروح میں روح کے سفر عالم بالا کا ذکر کیا۔ ابو عامر شہید اندلسی نے رسالۃ التوابع والزوابع میں شعراء و ادبا کی روحوں کے سفر کا حال تخلیقی سطح پر کیا ہے۔

لیکن اس روایت میں جو اہم تصنیف ہے وہ ابو العلا المعرّی کی تصنیف "رسالۃ الغفران" ہے۔ (اقبال نے ابو العلا المعرّی پر جو نظم لکھی ہے وہ قابل توجہ ہے) شیخ عطا کی "منطق الطیر" کا حصہ ہفت وادی بھی اسی موضوع کو لیے ہوئے ہے۔

اس کے بعد شیخ اکبر ابن عربی کی "فتوحات مکیہ" اہم ترین تصنیف ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے حوالے سے ذرا آگے چل کر بات ہوئی ہے۔ اس سے پہلے "ارداویراف نامہ" کا ذکر ضروری ہے یہ تصنیف ایک زرتشتی عالم کی تصنیف ہے جو زبان پہلوی میں رقم ہوئی۔

اس کی شان نزول بہت دلچسپ ہے کہا جاتا ہے کہ یہ زرتشتی عالم عالم سرور میں تھا کسی نشے کی بدولت سیر افلاک کی اور جب وہ عالم ہوش میں آیا تو اس نے عالم سرور میں جو کچھ دیکھا تھا اسے بیان کر دیا۔۔ لیکن اس خواب میں اس نے جو کچھ دیکھا اس میں معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات بہت نمایاں ہیں۔ بعض محققین ایک عرصے تک اس غلط فہمی اور مغالطے کا شکار رہے کہ یہ کتاب معراج نبوی سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن اب یہ مغالطہ دور ہو چکا ہے۔

اس روایت میں جس کتاب نے عالمگیر شہرت حاصل کی وہ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے

ڈیوائن کامیڈی کے حوالے سے اقبال کے جاوید نامہ کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے اور واقعہ معراج نبوی صلعم اور اس کے بعد ابن عربی کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

"جاوید نامہ" فکر انسانی کی معراج ہے۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے لکھا تھا کہ فردوسی کا شاہنامہ مولانا رومی کی مثنوی، سعدی کی گلستان اور دیوانِ حافظ کے بعد "جاوید نامہ" فارسی شاعری میں بڑی اور اہم کتاب ہے۔ میں اسے روایت معراج نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے سیر افلاک کے موضوع پر لکھی جانے والی تصانیف میں سب سے اہم کتاب قرار دیتا ہوں۔

خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژاد نو) کے علاوہ جاوید نامہ دو ہزار کے لگ بھگ اشعار پر مشتمل ہے۔ زندہ رود جو اقبال خود ہیں۔ وہ مولانا رومی کی رہنمائی میں سفر افلاک کرتے ہیں۔ دانتے کا مقصو سفر ارواح وافلاک۔ اپنی محبوبہ کا دیدار تھا جو دیدار خداوندی پر ختم ہوا۔ دانتے نے ورجل کو اپنا رہنما بنایا تھا۔ لیکن اقبال۔ پیر رومی کو رہنما بناتے ہیں اور ان کا مقصد عالم ارواح کی سیر ہے۔ درمیانی وسیلہ۔ جیسے بیاتریچے دانتے کے ہاں ہے۔ یہاں نہیں بنایا گیا۔

" جاوید نامہ " کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے اور اختتام " خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژاد نو) پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہید آسمانی، روز ازل زمین کی آسمان پر طعنہ زنی ہے۔ پھر نغمہ ملائک ہے۔ اس کے بعد زمینی تمہید ہے جس میں پیر رومی کی روح ظاہر ہوتی ہے۔ زروان۔ زمان و مکاں کی روح مسافر کو عالم بالا کی سیر کراتی ہے۔ اس کے بعد زمزمۂ انجم ہے۔

فلک قمر میں بندو رشی وشوامتر (جہان دوست) سے ملاقات ہوتی ہے۔ جلوۂ سروش کے بعد وادی سیر عمیدہ کی سیر ہوتی ہے جسے ملائکہ وادی طواسین کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد طاسین گوتم ہے جہاں رقاصہ تائب ہوتی ہے طاسین زرتشت میں اہرمن کی بدولت زرتشت کی آزمائش بیان ہوتی ہے۔ طاسین مسیح میں ٹالسٹائی کا خواب ہے۔ اور طاسین محمدؐ اور خانہ کعبہ میں روح ابوجہل کا نوحہ۔

فلک عطارد میں زندہ رود۔ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح کی زیارت کرتا ہے۔ فلک عطارد میں دین و وطن، اشتراکیت اور ملوکیت، مشرق و مغرب، عالم قرآنی محکمات، خلافت آدم، حکومت الٰہی، زمین خدا کی ملکیت ہے حکمت خیر کثیر ہے پر اظہار خیال کے علاوہ روسی قوم کے نام جمال الدین افغانی کا پیغام ہے اور زندہ رود کی غزل،

فلک زہرہ میں خدایان قدیم کی انجمن نغمۂ بعل دریائے زہرہ میں غوطہ زن فرعون اور کچنر کی روحوں سے ملاقات کے علاوہ درویش سوڈانی کا اظہار ہوتا ہے۔

فلک مریخ میں اہل مریخ، پھر مریخی انجم شناس کی رصدگاہ سے آمد، شہر مرغدین کی سیر اور دوشیزہ مریخ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ جس نے رسالت کا دعوے کیا تھا

فلک مشتری میں، حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی مضطرب روحوں سے ملاقات

اور مکالمہ ہے جو گردش پیہم میں دلدادہ ہیں اور جنت میں قیام ان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے ۔ فلک مشتری میں زندہ رود، ان ارواح سے اپنے مسائل بیان کرتا ہے اور یہیں خواجۂ اہل فراق (ابلیس) کی آمد ہوتی ہے جو نالہ کرتا ہے ابلیس کے بارے میں اقبال کا جو تصور ہے وہ یہاں بہت نمایاں ہوتا ہے

فلکِ زحل میں وہ ذلیل روحیں بستی ہیں جنہوں نے ملک وملت سے غداری کی ۔ اور دوزخ بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ یہاں جعفر وصادق ہیں جو غداری کی وجہ سے ۔
"ننگِ آدم ، ننگِ دیں ، ننگِ وطن ، ننگِ زمیں" ہیں ۔

فلکِ زحل میں ۔ قلزمِ خونیں ہے اور یہیں ہندوستان کی روح نمودار ہوتی ہے ۔ اور نالہ وشیون کرتی ہے اور اس خونی سمندر کے ایک کشتی نشیں کی فریاد بھی شامل ہے ۔

اس کے بعد کا حصہ "آں سوئے افلاک" کے عنوان سے ہے ۔ جہاں نطشے کے مقام کا بیان ہے ۔ جنت الفردوس شرف النساء کا دیوان ، سید علی ہمدانی ، ملا طاہر غنی کشمیری بھرتری ہری سے ملاقات ہے سلاطین مشرق کے ایرانوں کی نقل وحرکت کا بیان ہے ۔ ناصر خسرو علوی کی روح کا ظہور ہے جو غزل مستانہ سنا کر رخصت ہو جاتی ہے ۔ سلطان ٹیپو شہید کا پیغام ہے اور اس کے حوالے سے شہادت کی حقیقت کا بیان ، پھر وہ لمحہ ہے ۔ جب زندہ رود کو فردوس سے روانہ ہونا ہے ۔ اور حوران بہشتی اس سے غزل سنانے کا تقاضا کرتی ہیں ۔ اور زندہ رود غزل سناتا ہے آخری حصہ "حضور" ہے ۔

خطاب بہ جاوید ، جاوید نامہ سے مربوط نہ ہونے کے باوجود ربط معنوی رکھتا ہے اقبال جاوید (اپنے پسر) کو وسیلہ بنا کر نژاد نو سے مخاطب ہوتے ہیں ۔

ایں سخن آراستن بے حاصل است
بر نیاید آنچہ در قعرِ دل است

اس حصے میں اقبال نے اپنے کلام کی اہمیت اور اپنی ساری کاوش کی تاثیر بیان کرتے ہوئے ہر زمانے کی نئی نسل کو تلقین کی ہے کہ ان افکار کو سمجھا اور اپنایا جائے ۔

جاوید نامہ ۔ ہر دور کی کتاب ہے ۔ ہر بڑی کتاب کی طرح جو انسانی فکر وخیال اور احساس جمالیات کو ہمیشہ ہر دور میں سیراب کرتی رہتی ہیں ۔ اقبال ماضی سے سرمایہ اندوز ہوتے ہوئے

حال کی حقیقتوں کی نشاندہی اور سیرابی کرتے ہوئے مستقبل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو جاوید نامہ بنی نوع انسان کے ماضی حال اور مستقبل کے مقدر کی نشاندہی کرتا ہے۔

جاوید نامہ کے فکری پہلوؤں اور اقبال کے نظریات کا احاطہ کرنے کے لیے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ بطور خاص، جاوید نامہ، کو سمجھنے کے لیے جہاں انسانی فکر کی رسائی کا شاعر کی فکر کے ساتھ تطابق رکھنا بیحد ضروری ہے۔ وہاں ان شخصیات اور مقامات کا شعور بھی ناگزیر ہے جن کا ذکر جاوید نامہ میں ہوا ہے۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی عظیم تصنیف ہے جس کے معنی کا جہان بہت گہرا، بسیط اور وسیع ہے۔ یہ کتاب اپنے قاری سے مطالبہ کرتی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ اور اس کے معنی کی تہہ میں اُترنے کے لیے مسلسل غور و فکر سے کام لیا جائے۔

"جاوید نامہ کے حوالے سے انسان کا جو تصور اُبھرتا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں انسان کا جو تصور ہمیں جاوید نامہ سے پہلے ملتا ہے وہ جاوید نامہ میں اپنی انتہائی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے کہ آدمِ خاکی کی رسائی عالمِ افلاک تک ہے۔ وہ تقلید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرے تو بلندیوں اور عظمتوں کی انتہاؤں کو چھو اور پا سکتا ہے۔

جاوید نامہ صرف ہمارے قومی شاعر اقبال اور زبان فارسی کا ہی عظیم فن پارہ نہیں بلکہ فکر و خیال، فلسفہ اور عشقِ رسول صلعم کے حوالے سے بھی ایک منفرد اور ہمیشہ زندہ رہنے والا تخلیقی کارنامہ ہے۔ اور اپنی منفرد شعریت اور روایت کے حوالے سے جاوید نامہ عالمی ادب کا عظیم لازوال فن پارہ ہے۔

فیری ٹیلز

جل پری کے مجسمے کا کسی نے سر توڑ کر چرا لیا، تو صرف ڈنمارک بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی جس نے پوری دنیا کے بچّوں کو اُداس کر دیا۔ کئی بچے تو خبر پڑھنے کے بعد بے ساختہ آنسو بہانے لگے تھے۔ اس جل پری کی کہانی نے برسہا برس سے کئی نسلوں کو متاثر کیا تھا اور کہانی کے اس کردار کو ایک مجسمہ ساز نے مجسمے میں ڈھال دیا۔ اور اسے ساحل سمندر پر نصب کر دیا تھا تب سے دنیا کے ان گنت لوگ روز آ اس جل پری کے مجسمے کو دیکھنے کے لیے وہاں پہنچتے تھے۔ وہ اسے محبت اور عقیدت سے دیکھتے اور انہیں جل پری کی وہ کہانی یاد آ جاتی جو نہیں ان کے کسی دادا، دادی یا نانا نانی یا باپ یا امی نے سنائی تھی۔ اور پھر انہوں نے اس کہانی کو خود کئی بار پڑھا تھا۔ اور اپنے بچّوں کو سنایا اور پڑھایا تھا۔

ہینس کرسچین اینڈرسن کی کہانیاں دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسی زبان نہیں جس میں ان کہانیوں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی ماں یا نانی ہوگی جس نے اپنے بچوں کو اینڈرسن کی کوئی کہانی نہ سنائی ہو۔ یہ کہانیاں پوری انسانیت کا ورثہ بن چکی ہیں۔ مقامی طور پر ان کہانیوں میں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ بہت سے بڑے جب کہانی سناتے ہیں تو انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ جو کہانی سنا رہے ہیں۔ یہ دور دیس کے رہنے والے ایک غیر ملکی ہینس کرسچین اینڈرسن نے لکھی تھی۔

اینڈرسن خود اپنی فیری ٹیلز FAIRY TALES کی طرح ایک کہانی ہے۔ وہ

اپنی عمر کے آخری دور سے پہلے تک یہی سمجھتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کے ناولوں اس کے افسانوں اور شاعری کی وجہ سے عالمگیر اور ابدی شہرت حاصل ہو۔ لیکن اسے جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کہانیوں کی بدولت ملی۔ جو اس نے صرف پیسے کمانے کے لیے بچّوں کے لیے لکھی تھیں۔

اینڈرسن ایک ایسا انسان تھا جو محبت سے مدّتوں تک محروم رہا اور جب اسے محبت ملی تو اتنی ملی کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی کہانیوں کے کردار زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ انسانی تہذیبوں میں رچ بس چکے ہیں۔ حالانکہ یہ تہذیبیں بہت مختلف ہیں ان کے عناصر ترکیبی میں بہت کم مماثلت پائی جاتی ہے لیکن اینڈرسن کی کہانیوں نے دنیا کی ہر نسل اور ہر ملک کے بچّوں کو ایک وحدت اور اکائی میں پرو دیا۔ ہے۔

یہی کارنامہ اسے زندہ جاوید کر گیا ہے امر اور لازوال!

ہینس کرسچین اینڈرسن ۲ اپریل ۱۸۰۵ء کو فیونن آئی لینڈ کے قصبے اوڈینسے ڈنمارک میں پیدا ہوا۔ وہ اپنی پیدائش کے وقت ہی ایک بدصورت بچّہ تھا۔ بدصورتی اور کج صورتی نے ساری عمر اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور اسے طرح طرح کی محرومیوں میں مبتلا کر دیا۔ وہ ایک موچی کا بیٹا تھا اور گھر کے حالات تسلی بخش نہ تھے۔ اینڈرسن کا بچپن ناداری اور غربت میں بسر ہوا اور پھر تقدیر نے اپنا وار کیا۔ ابھی اینڈرسن لڑکپن میں ہی تھا کہ اس کا والد مر گیا۔ گھر کے حالات ایسے تھے کہ اینڈرسن کو لڑکپن ہی میں ایک فیکٹری میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اپنی بدصورتی، اپنی محرومیوں اور غربت کی وجہ سے وہ لوگوں سے گھل مل نہیں سکتا تھا۔ اس کے مزاج میں اشتعال بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی عملی زندگی کی راہ میں کئی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ جن کا بہت حد تک وہ خود ذمے دار نہ تھا۔ بلکہ اس کی بدصورتی اور خارجی ماحول تھا۔

اپنی بدصورتی اور کم آمیزی کے باوجود اس نے اپنے کچھ مدّاح پیدا کر لیے۔ اس کی آواز بہت خوب صورت اور شیریں تھی۔ وہ جب گاتا تھا تو لوگ اس کا گیت سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ یوں اس کی آواز کے سحر نے اسے پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا۔

اینڈرسن نے فیصلہ کیا کہ اپنی اسی شیریں آواز سے اُسے فائدہ اُٹھا کر عملی زندگی میں نام اور مقام پیدا کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے تحت اس نے کوپن ہیگن کا رُخ کیا۔ تھیئٹر والوں نے اس کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ جس سے اینڈرسن کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس نے گلوکاری کے علاوہ اداکاری کے شعبے میں بھی آنے کی کوشش کی لیکن اس کی صورت، اس کے اطوار، اس کی ناتجربہ کاری اس کی راہ کی رکاوٹ بن گئے اور یہاں بھی اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اس عرصے تک اینڈرسن کچھ نظمیں لکھ کر لوگوں کی توجہ اپنی شاعری کی طرف مبذول کرا چکا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے سرپرست اور ہمدرد تھے وہ اینڈرسن کے مستقبل کے بارے میں خاصے سنجیدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جس میں اینڈرسن کی مدد کے لیے استدعا کی گئی تھی۔ بادشاہ نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے اینڈرسن کو سرکاری خرچ پر ایک سکول میں داخلہ دلوا دیا۔ اور اس کے لیے یہ نصاب متعین کیا گیا کہ وہ اپنا مطالعہ جاری رکھتے ہوئے اپنی تصنیفی صلاحیتوں کی تکمیل کرے۔

اینڈرسن جسے آج دنیا بھر کے بچوں کا محبوب ترین مصنف تسلیم کیا جاتا ہے، ادبی دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے وارد ہوا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۸۳۰ء میں شائع ہوا جب اس کی عمر پچیس برس تھی۔ ۱۸۳۱ء میں اس کا دوسرا مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اب وہ ادبی حلقوں میں خاصا جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ بادشاہ بھی اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی کا معترف تھا۔ ۱۸۳۳ء میں بادشاہ نے اس کی سیر و سیاحت کے لیے خصوصی اعانت کی۔ اینڈرسن کو بادشاہ نے سفر کے اخراجات کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا اور یوں اینڈرسن جرمنی، سوئٹزرلینڈ، روم اور نیپلز کی سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس سیاحت سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس کے مشاہدے اور تجربے میں اضافہ ہوا۔ اس نے واپس آ کر ایک سفرنامہ بھی لکھا۔ اب وہ شاعری کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کرنے لگا تھا۔ جب ۱۸۳۷ء میں اس کا ناول ONLY A FIDDLER

شائع ہوا تو اس کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب اینڈرسن نے بچّوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو خود زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ اینڈرسن تو بطور ایک ناول نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ابدی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ آج اس کی حیثیت کو دنیا نظر انداز کر چکی ہے۔ کسی سے بھی اینڈرسن کے بارے میں بات کیجیے۔ وہ اس کی کئی بچّوں کی کہانیاں زبانی سنا دے گا۔ لیکن اس کی شاعری اور ناول نگاری کا حوالہ دیا جائے تو نوّے فیصد قارئین اس سے لاعلم اور بے خبر نکلیں گے۔ بہرحال اینڈرسن ابتداً میں بچوں کی کہانیاں محض اس لیے لکھتا تھا کہ وہ جلدی چھپ جاتی تھیں اور ان کا معاوضہ جلدی مل جاتا تھا۔ وہ اسے محنت طلب کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ مغز کھپائے بغیر وہ ایک کہانی لکھ کر معقول معاوضہ حاصل کر لیتا ہے۔

اینڈرسن کی بچّوں کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا اور اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ۱۸۳۶ء اور تیسرا مجموعہ ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ اب بتدریج ان کہانیوں کی شہرت بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۵ء میں بچّوں کی کہانیوں کے جو دو مجموعے شائع ہوئے ان کی وجہ سے اینڈرسن کی شہرت پورے یورپ میں پھیل گئی۔ اب وہ ایک ملکی سطح کا لکھنے والا نہ رہا تھا بلکہ اس کی شہرت آہستہ آہستہ ساری دنیا میں پھیلنے لگی تھی۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ اُسے بیرونی دنیا میں ایک جینئس اور عظیم لکھنے والا تسلیم کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے اپنے ملک ڈنمارک میں اس کو ابھی تک اس کا اصل مقام حاصل نہ ہوا تھا۔ اور تو اور۔ خود اینڈرسن اس حد تک ذاتی محرومیوں کے دباؤ تلے دبا ہوا تھا کہ خود وہ بھی اپنی اہمیت اور مرتبے سے آگاہ نہ تھا۔ وہ تو اس اُمید میں جی رہا تھا کہ اسے ڈنمارک کا عظیم شاعر اور ناول نگار تسلیم کر لیا جائے گا۔ جبکہ ساری دنیا میں اس کی بچّوں کی کہانیوں نے اس کی شہرت اور مقام کو مستحکم کر دیا تھا۔

۱۸۴۷ء میں وہ انگلستان گیا۔ جہاں اسے کچھ احساس ہوا کہ بچّوں کی کہانیوں کی وجہ سے وہ بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران اس کی ملاقات ڈارون

سے ہوئی ۔ جو اس کی بچّوں کی کہانیوں کا بہت بڑا مداح تھا ۔ ڈارون نے اسے انگلستان کی خوب سیر کرائی ۔

اینڈرسن اب بھی اپنی بچّوں کی کہانیوں کو اپنی دوسری تصانیف پر فوقیت دینے کے لیے آمادہ نہ تھا ۔ بچّوں کی کہانیوں کو نظرانداز کر کے اس نے ایک رومانس لکھا، سپین کا سفر نامہ تحریر کیا اور پھر اپنی زندگی کی کہانی ، جس میں وہ بڑا متکبر اور جھنجھلایا ہوا اشتعال پسند انسان دکھائی دیتا ہے ۔ اس کی اُمید کے مطابق ان کتابوں کو پذیرائی نہ ہو سکی ۔ بلکہ اب ہر طرف سے بچّوں کی کہانیوں کے مطالبے ہو رہے تھے ۔ لوگوں کے تقاضوں ، فرمائشوں اور مطالبوں پر اس نے ۱۸۴۷ء میں بچّوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کرایا جو بے حد مقبول ہوا اس مقبولیت کے پیشِ نظر اینڈرسن کو اگلے سال پھر ایک مجموعہ چھپوانا پڑا ۔ بچّوں کی کہانیوں کے عظیم خالق کی حیثیت سے اب وہ دنیا بھر میں جانا پہچانا اور سراہا جانے لگا تھا ۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کہانیوں کے تراجم ہوئے تھے ۔ اس مقبولیت کی وجہ سے اینڈرسن نے اپنی موت سے تین برس پہلے ۱۸۷۲ء تک بچّوں کی کہانیوں کے متعدد نئے مجموعے شائع کیے ۔

اب وہ دنیا کا ایک بڑا لکھنے والا تھا ۔ بچّوں کا محبوب ترین مصنّف ۔ اس کی کہانیاں تب سے لے کر اب تک فلموں اور ڈراموں اور کارٹونوں اور تصویروں کی صورت میں اتنی بار اتنے ملکوں میں پیش کی جا چکی ہیں کہ ان کی گنتی بھی محال ہے ۔

بھلا دنیا کا کونسا قاری ہے جسے ٹین کا سپاہی ۔ بادشاہ سلامت کا نیا لباس کو پڑھا سنا نہ ہو ۔ ان کی کہانیوں کے حوالے سے سنگ تراشوں نے مجسمے بنائے اور یوں اس کی شہرت پھیلتی چلی گئی ۔ حتیٰ کہ اپنے ملک میں بھی اسے وہی مقام اور مرتبہ حاصل ہو گیا جس کا وہ حقدار تھا ۔ لیکن یہ سب کچھ اس کی بچّوں کی کہانیوں کی بدولت ممکن ہو سکا ۔

اس نے ساری زندگی تنہا بسر کی ۔ وہ ایک بدصورت انسان تھا ۔ بڑے بڑے ہاتھ اور پاؤں ۔ لمبی بدوضع ناک ۔ بھدّے اور بدصورت خد و خال ۔ چلتا تو مضحکہ خیز دکھائی دیتا ۔ جس حالت میں بھی دکھائی دیتا بدصورت نظر آتا ۔ بچّے تک اس کے پاس آنے سے کتراتے تھے ۔

اپنی زندگی کے آخری دَور میں اینڈرسن خود ایک بچّہ بن کر رہ گیا ۔ وہ اپنے آپ کو

وجیہہ اور خوب صورت انسان سمجھنے لگا تھا۔ اپنے بارے میں اس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حسین سمجھنے لگا تھا۔ شاید یہ اس کے باطن کا حسن تھا، جس نے اس پر اس طرح غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

۱۸۷۲ء کے موسم بہار میں وہ بستر سے اس طرح گرا کہ اسے شدید چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد وہ اپنی موت کے دن تک علیل اور بیمار رہا۔ بالآخر ۴ اگست ۱۸۷۵ء کو اس کا انتقال کوپن ہیگن میں ہوا۔

اینڈرسن کی مقبول ترین کہانیوں میں ایک کہانی "بادشاہ سلامت کا نیا لباس" ہے۔ اس سادہ لیکن پرکشش کہانی کا تجزیہ کیا جائے تو آج کے دور میں اس کی معنویت نئے انداز سے اجاگر ہوتی ہے۔

چالاک جولاہے ہیں جنہوں نے بادشاہ کو فریب دے کر دولت ہتھیالی ہے۔ وہ بادشاہ سلامت کے لیے ایسا کپڑا تیار کر رہے ہیں جیسا کپڑا نہ کسی نے سنا نہ دیکھا نہ پہنا سارے ملک میں اس لباس کا چرچا ہو رہا ہے۔ ساری رعایا میں شدید اشتیاق پایا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کا نیا لباس دیکھا جائے۔ اور پھر ایک دن وہ جولاہے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لباس تیار ہے۔ بادشاہ خود اس لباس کو پہننے اور دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ جولاہوں نے بادشاہ سے کہا، حضور والا! یہ انوکھا لباس ہے۔ یہ ہر اس شخص کو نظر نہیں آئے گا جو حرام کی اولاد ہے۔ وہ چالاک جولاہے بادشاہ کا پہلا لباس اتار کر "نیا لباس" پہنانے لگتے ہیں۔ جو بادشاہ کو بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن بادشاہ کیسے کہے کہ وہ لباس اسے دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ اپنے آپ کو حرامی کیسے کہلوا سکتا ہے۔

یہ خبر — اس لباس کی اس انوکھی خصوصیت کا چرچا ملک بھر میں ہو چکا ہے۔

یوں بادشاہ سلامت اس 'نئے لباس' میں ملبوس اک صورت میں باہر نکلتے ہیں۔ جہاں ان کی رعایا ان کا نیا شاہی لباس دیکھنے کے لیے گلیوں، بازاروں میں جمع ہے۔ یہ جلوس شاہانہ تمکنت سے رواں دواں ہے۔ لیکن مضحکہ خیز اور نمایاں ہے۔ بادشاہ سلامت ہر شخص کو ننگے دکھائی دے رہے ہیں۔ لوگ حیرت زدہ اور پریشان ہیں۔ لیکن کسی

کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہو رہی۔ ایسے میں ایک بچّہ بے اختیار بول اُٹھتا ہے "بادشاہ ننگا ہے" اور پھر سب کو زبان مل جاتی ہے۔

کسی بھی شعبۂ حیات کے حوالے سے انسانی منافقت فریب اور جبر اور سچ کی معصومیت کو سمجھنے کے لیے اس کہانی سے بہتر مثال نہیں دی جا سکتی۔

۹۴

چیخوف

چھوٹی بڑی کہانیاں

اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ چیخوف دنیا کے چند اہم اور بڑے خلاق انسانوں میں سے ایک تھا لیکن چیخوف کی تحریروں اور تخلیقات کے حوالے سے اس کی کہانیوں کو عظیم کتابوں میں شامل کرنا بعض پڑھنے والوں اور ناقدروں کے لیے اس لیے قابل اعتراض ٹھہر سکتا ہے کہ چیخوف کو وہ بطور ایک بڑے اور یکتا ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی جانتے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جدید روسی ڈرامے میں دنیا میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا۔ جس کے حوالے سے کوئی اس کا مد مقابل ٹھہرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

چیخوف بھی ان بڑے لکھنے والوں میں سے ایک ہے جن کی تخلیقات کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ "ناقابل تقلید" ہیں۔ چیخوف کے اثرات تو عالمی ادب پر دکھائی دیتے ہیں لیکن کوئی اس کا ہمسر اور مثیل نہیں ملتا۔

عالمی ڈرامے میں چیخوف کا مقام بے حد اونچا ہے۔ اس نے ڈرامے کو کم از کم "تھیٹریکل" اور زیادہ سے زیادہ حقیقی بنانے کی کوشش کی۔ اسے روزمرہ زندگی کی تخلیقی اور سچی تصویر بنانے کا عزم کیا اور اس میں بے مثل کامیابی حاصل کی۔ اس کے ڈراموں میں آج بھی اتنی قوت ہے کہ اس کے ون ایکٹ فارس پڑھ کر ہی آدمی بے اختیار ہنسنے لگتا ہے جیسے "پرپوزل" "جوبلی" اور ریچھ اور پھر اس کے عظیم شاہکار "تھری سسٹرز" اور "چیری آرچرڈ" جن میں سے چیری آرچرڈ کو جو اس کی زندگی کا آخری فن پارہ ہے۔ بلا جھجک دنیا کے چند بڑے ڈراموں میں شمار کرتا ہوں۔

چیخوف اور عالمی ادب کو جتنا تھوڑا بہت میں نے پڑھا ہے۔ اس کے حوالے سے میں

سمجھتا ہوں کہ ڈرامے میں یکتا مقام رکھنے کے باوجود ۔ چیخوف کہانی کار کے اعتبار سے کہیں زیادہ بڑا ہے اور اس کو کہانی کار کی حیثیت سے جو عالمی شہرت حاصل ہے اور کہانی کی صنف میں جو اس کا مقام بنتا ہے ۔ اس کے حوالے سے اس کی کہانیوں کے مجموعے " چھوٹی بڑی کہانیاں " کو میں دنیا کی عظیم کتابوں میں شامل کرنے پر مجبور ہوں لیکن یہ وضاحت پھر ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا کے چند بڑے ڈرامانگاروں اور چند بڑے ڈراموں کا انتخاب کیا جائے گا تو اس میں چیخوف اور اس کا کھیل " چیری آرچرڈ " ضرور شامل ہوں گے ان کے بغیر بڑے ڈراموں کا کوئی مجموعہ مکمل نہیں سمجھا جا سکتا ۔

چیخوف نے صرف چوالیس برس کی عمر پائی ۔ ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء اس کا یوم پیدائش ہے اور یکم اور دو جولائی ۱۹۰۴ء کی درمیانی رات یوم وفات ۔ چیخوف کا دادا ایک غلام (SERF) تھا اصلاحات کے بعد آزاد ہوا تھا ۔ اس کی والدہ ایک بڑے تاجر کی بیٹی تھی اور باپ بھی کاروبار کرتا تھا لیکن اس میں ناکام رہا تھا ۔ چیخوف نے ناداری اور غربت کو دیکھا ۔ وہ اپنے باپ کے کاروبار میں لڑکپن ہی سے ہاتھ بٹانے لگا تھا ۔ اور اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر آنے والوں کی حرکات کو ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا ۔ چیخوف کا بڑا بھائی الیکسانڈر ایک عرصے تک اس پر اثر انداز رہا ۔ چیخوف نے ابتدائی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن جو چیز اس کے بھائی کو پسند نہ آتی ۔ وہ اسے ضائع کر دیتا تھا

چیخوف نے لکھنے کا آغاز اس ضرورت کے تحت کیا کہ اس طرح کچھ آمدنی ہو جائے اور گھریلو اخراجات کی شدت میں کمی اس کا بچپن اور لڑکپن سمندری بندرگاہ ٹگانروگ میں بیتا ۔ یہیں وہ پیدا ہوا تھا ۔ اس کا والد جب ماسکو چلا گیا تو بھی چیخوف اپنے داد کے پاس رہا جو اس علاقے میں ایک جائیداد کا مینیجر بن چکا تھا ۔ یہ علاقہ اس کی کہانیوں میں اپنی بھرپور جھلک دکھاتا ہے اور اس کی شاہکار اور دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں سے ایک " ایسٹیپ " میں منعکس ہوا ہے ۔

چیخوف بہت محنتی اور اچھا طالب علم تھا وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے ماسکو پہنچا اور ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لیا اس سے پہلے وہ کئی چھوٹے بڑے ڈرامے لکھ چکا تھا لیکن کہانی لکھنے کا باقاعدہ آغاز اس زمانے میں ہوا جب وہ ماسکو یونیورسٹی میں میڈیکل کا طالب علم تھا ۔ اس کی پہلی کہانی

ماسکو سے شائع ہونے والے ایک جریدے میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد پھر کہانیوں کا تانتا بندھ گیا اور وہ ڈرامے لکھنے لگا ۱۸۸۴ء میں اس نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور کچھ عرصہ تک وہ اس پیشے سے وابستہ رہا۔ لیکن پھر اسے ترک کر دیا۔

۱۸۸۷ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا اس مجموعے کی اشاعت نے اسے روس کے صف اول کے لکھنے والوں میں لا کھڑا کیا وہ سب سے منفرد اور مختلف تھا۔ اس کی کہانیوں کا انداز ہی ایسا تھا کہ دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کا اچھا ذوق ہے۔ چیخوف کی کہانی کو ہزاروں کہانیوں میں پہچان لیتا ہے کیونکہ ان کہانیوں کی مہک ہی جداگانہ ہے۔

۱۸۸۹ء میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔ پہلے مجموعے کو آج اس کی "ابتدائی کہانیوں" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے چیخوف کو پوری دنیا میں متعارف کرا دیا اور کہانی کار کی حیثیت سے اسے وہ شہرت حاصل ہوئی جو ہر عہد میں بڑھی ہے اور اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

یہ وہ دوسرا مجموعہ ہی ہے۔ جس کی کہانیوں پر چیخوف کا مخصوص اور بے مثل رنگ چڑھا ہے۔ وہ چیخوف جو اپنی ابتدائی کہانیوں میں بڑا پُر مزاح اور طناز بھی ہے اپنی آخری دور کی کہانیوں اور ڈراموں میں زندگی کے حزن کو اپنی کہانیوں اور ڈراموں کی خصوصی پہچان بناتا ہے۔ چھوٹی بڑی کہانیوں میں یہ حزن جو انسانی زندگی کے بارے میں اس کے ان تمام چھوٹے بڑے افسانوں پر چھایا ہوا ہے۔ جن کے بغیر عالمی افسانے کا کوئی مجموعہ اور انتخاب مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چیخوف بہت مہذب، بہت شرمیلا، بہت نیک خو اور شریف انسان تھا وہ اپنی تخلیقات سے کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا۔ چیخوف کے فن کی خصوصیت خود احتسابی کا عمل ہے۔

چیخوف کی عمر کے آخری برس شدید علالت میں گزرے۔ کھانسی کے شدید دورے پڑتے۔ وہ ماسکو میں قیام نہ کر سکتا کہ ماسکو کا موسم اس کی صحت کے لیے سازگار نہ تھا جنوبی روس میں وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں چلا گیا۔ ایک جھونپڑے میں بسیرا کیا۔ یہاں وہ دیہاتیوں اور کسانوں کا علاج بھی کرتا رہا۔ تپ دق کا مرض اسے چاٹتا رہا تھا۔ اسی زمانے میں

اسے سٹیج کی اداکارہ اولگا سے عشق ہوا جس سے اس نے شادی کی آخری عمر میں اس نے جدید روسی تھیٹر کی بنیاد رکھی "انکل وانیا" "تھری سسٹرز" اور چیری آرچرڈ اس کا آخری ڈرامہ اسی علالت کے زمانے میں لکھے گئے۔ اس کا انتقال برڈین ویلیر میں ہوا اور اس کا جسد خاکی ماسکو لاکر دفن کر دیا گیا ۔

کہانی کار چیخوف پر کچھ باتیں کرنے سے پہلے ڈرامہ نگار چیخوف کے بارے میں ایک دو باتیں جدید روسی تھیٹر کے بانی سٹینلسوکی نے اس کے کھیل "تھری سسٹرز" کے پہلے شو کے بعد ناظرین کے سامنے جو تقریر کی تھی اس کا یہ حصہ چیخوف کے اس مقام کو ظاہر کرتا ہے جو اسے روسی تھیٹر میں حاصل ہے سٹینلسوکی نے کہا تھا

"ہمارا تھیٹر آپ کی ذہانت اور عظیم تخلیقات کا مقروض اور شکر گزار ہے۔ آپ کے نرم دل کے ہم پر احسان ہیں۔ آپ کی روح نے جدید روسی تھیٹر کو زندگی دی ہے اور آپ کو یہ پورا استحقاق حاصل ہے کہ آپ یہ کہہ سکیں کہ جدید روسی تھیٹر میری دین ہے۔

ڈرامے کے بارے میں چیخوف کا کیا نظریہ تھا۔ وہ اسی کے الفاظ میں — اس کے ایک خط سے جو اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ سٹیج پر لوگ ویسے ہی دکھائی دیں جیسے وہ روزمرہ کی زندگی میں ہنستے کھاتے اور روتے ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کو عام آدمیوں کے بہت قریب اور مماثل ہونا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چیخوف کے ڈراموں میں اہم واقعات مکالموں میں بیان ہو جاتے ہیں۔ ڈرامائی کشمکش اندرونی سطح پر ظاہر اور مرتب ہوتی ہے۔ یوجین اونیل نے ایک بار کہا تھا۔ چیخوف کی نقل کون کرسکتا ہے۔ اس کے لیے آدمی میں چیخوف کی طرح باطن میں انسانی دکھ کو چھپانے اور سہج سہج سے بیان کرنے کا گُر بھی آنا چاہیئے۔"

یہی دھیما پن، یہی گہرا حزن، یہی زندگی کی قربت ہے جو ہمیں چیخوف کی کہانیوں میں ملتی ہے وہ کسی طرح کی "پتے بازی" نہیں کرتا۔ بیشتر افسانہ نگاروں میں جو ایک طرح کا خاص کہانی بنانے میں جعلی پن ہوتا ہے۔ وہ چیخوف کے ہاں نہیں ملتا۔ اس کے ہاں انسان ایسی ہی صورت میں دکھائی دیتا ہے جیسا کہ وہ ہے یا اسے ہونا چاہیئے۔

چیخوف کی کہانیوں کا ایک ایسا طلسم ہے جو کور ذوق کو متاثر نہیں کر سکتا۔ گورکی جتنا بڑا لکھنے والا ہو جس انداز کی کہانیاں اسنے لکھی ہیں (دو ایک کہانیوں کو چھوڑ کر) ان کہانیوں کو پسند کرنے والے یقینی طور پر چیخوف سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیونکہ روس کی بے پناہ وسعت حزن اداسی اور انسانوں کی اصلی صورتیں ظاہر اور باطن چیخوف کی کہانیوں میں نمودار ہوتے ہیں

پھر چیخوف پوری انسانیت کا درد محسوس کرتا ہے۔

اور ہمیں بھی محسوس کراتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں " فیصلے " نہیں حتمی انداز کسی صورت میں نہیں ملتا کیونکہ یہ فن کا تقاضا ہے نہ۔ زندگی کا۔ اس کے باوجود یہ کہانیاں زندگی اور انسان کے بارے میں جس بصیرت اور علم کی دولت سے مالا مال کرتی ہیں۔ وہ بہت کم افسانہ نگاروں کی دین ہے۔

چیخوف کی کس کس کہانی کا ذکر کیا جائے۔ " دشمن " کا وارڈ نمبر ۶، کا ایک غیر دلچسپ کہانی " کا " لوپخ " کا کتے والی میم "، " سٹیپ " کا " دلہن " کا پاسپھر " سکول مسٹرلیس " کا جس کے بارے میں مرحوم محمد حسن عسکری نے لکھا تھا۔

ان تمام نظموں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سے جو آج تک میں نے پڑھے ہیں۔ صرف ایک چیز کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنی شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں چیخوف کا افسانہ " سکول مسٹرلیس " ہے۔ (جزیرے صفحہ ۲۴۹)

چیخوف کی کہانیوں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں اردو میں بھی اس کی بہت سی کہانیوں کو بار بار اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کی بعض کہانیاں پہلی دفعہ روس میں ہی دریافت ہوئی تھیں۔ جنہیں انگریزی اور دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اردو میں اس کی ان نو دریافت کہانیوں کا ترجمہ کرنے کا اعزاز راقم کو حاصل ہے۔ چیخوف کے چھوٹے ون ایکٹ ڈراموں کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ اس کا شہکاروں میں سے " تھری سسٹرز " کا اُردو ترجمہ محمد سلیم الرحمان نے کیا ہے۔

چیخوف کی افسانے اور ڈرامے کی صنف میں عطایے بہا ہے۔ چیخوف بہت بڑا کہانی کار اور بہت بڑا ڈرامہ نگار ہی نہیں بہت بڑا اور عمدہ انسان بھی تھا۔ اس نے ڈرامے اور کہانی کے فن کو بہت سے آزاد کیا۔ ایلسویٹا فین (ELISVETA FEN) اس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا۔ "HE WAS AFTERALL THE LESS DOGMATIC OF WRITERS AND ONE OF THE MOST HUMAN OF MEN"

منتخب کہانیاں

اگر اس پر بنک میں غبن کا الزام نہ لگتا تو ممکن ہے کہ آج دنیا او ہنری نام کے کسی لکھنے والے کو نہ جانتی اور اگر وہ کہانیاں لکھتا بھی تو اپنے اصلی نام ولیم سڈنی پورٹر کے نام سے لکھتا۔

نئی دنیا امریکہ میں ناول۔ ادب اور شاعری میں بعض بڑے نام اور بڑے کام ابتدائی دور میں ہی سامنے آگئے تھے لیکن افسانے کی دنیا میں بہت دیر کے بعد بڑا نام سامنے آتا ہے۔ اور وہ او۔ ہنری ہے۔ جب او۔ ہنری ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا تو ایڈگر ایلن پو کی موت کو بارہ برس ہو چکے تھے۔ اور پو کے حوالے سے امریکی کہانی نے بہت حد تک اپنے خدوخال نمایاں کر لیے تھے۔ ہاتھورن وغیرہ نے کہانیوں کے لیے جو فضا تیار کی تھی اور جس قسم کی کہانیاں لکھی تھیں پو کی کہانیاں ان سے بہت مختلف تھیں، جرم و سزا اور پھر پُراسرار فضا پیدا کرنے میں پو نے کہانی کو ایک جہت فراہم کر دی تھی۔ اس کی کہانی "فال آف دی ہاؤس آف اشر" نے امریکہ اور انگریزی زبان میں ایک تہلکہ بپا کر دیا تھا۔ اور بعض نقادوں نے اسے جدید کہانی کا بانی بھی قرار دے دیا۔ اس کی کہانیوں کے دوسری زبان میں بھی تراجم ہوئے۔ اردو میں مرحوم ابن انشا نے اس کی کہانیوں کا بہتر انداز میں ترجمہ کیا۔ "چہ دلاور است دزدے" اور "عطر فروش حسینہ کے قتل کا معمہ" دو چھوٹے مجموعے ہیں، جن میں ابن انشا نے ایڈگر ایلن پو کی کچھ چھوٹی بڑی کہانیوں کا ترجمہ کر کے شائع کرایا تھا۔ تاہم۔ کہانی کی صنف میں ایڈگر ایلن پو کی بہت بڑی کنٹری بیوشن کے

باوجود میں سمجھتا ہوں کہ وہ کہانی کار کی نسبت سے شاعر بہت بڑا تھا اس کی نظم RAVEN کو آج بھی بڑی شاعری کا ایک فن پارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

امریکی ادب میں کہانی کی صنف میں جس لکھنے والے نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی اور عالمگیر سطح پر کہانی لکھنے والوں میں بڑا فنکار تسلیم کیا گیا وہ او۔ ہنری ہے اس کی کہانیوں کے متعدد مجموعے اس کی زندگی اور اس کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں رچرڈ اوبرکیمن نے اس کی کہانیوں کے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیوں کا انتخاب کیا۔ ان کو THE BEST OF O. HENRY کے نام سے ایک طویل دیباچے کے ساتھ شائع کیا اور کہانی کی صنف میں او ہنری کا جائزہ اور صحیح مقام متعین کیا۔

او ہنری کی بہترین کہانیاں بڑے شہروں کے چھوٹے لوگوں کی زندگیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بعض فرانسیسی اور آئرش لکھنے والوں نے پیرس اور ڈبلن کو اپنی تصانیف میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ جیمز جوائس نے تو اپنی کہانیوں کے مجموعے کا نام ہی "ڈی ڈبلنرز" رکھا تھا۔ اسی طرح او ہنری نے نیویارک کو اپنی کہانیوں میں زندہ کیا۔ اور یہ کہانیاں دنیا کے بڑے شہروں کے انہی لوگوں کی نمائندگی کرتی ہیں جو بڑے شہروں کی مصروف، بے التفات افراتفری اور کس مپرسی کا شکار ہوتے ہیں۔ (یہاں مجھے منٹو یاد آ رہا ہے جس نے بمبئی کو بطور خاص اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ ریاض شاہد اور حمید شیخ جن کے ناولوں میں لاہور شہر جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا ملتا ہے۔)

ولیم سڈنی پورٹر (او۔ ہنری کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والا) ۱۱ ستمبر ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوا۔ پندرہ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے انکل کے ڈرگ سٹور میں کلرک ہو گیا۔ اس کی صحت اچھی نہ تھی اس لیے وہ اپنے ایک دوست کے ریخ چلا گیا جہاں اس نے دو برس گزار دیے۔ وہ امریکہ کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رہا تھا۔ وہاں اس نے زندگی کا جس طرح مشاہدہ کیا اس پر مبنی اس کی ایک کتاب CABB- AGES AND KINGS کے نام سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۸۷ء میں او ہنری نے مختلف طرح کی تحریریں اخباروں اور رسالوں کو بھجوانی شروع

کردی تھیں وہ زیادہ تر مزاحیہ چیزیں لکھا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ السٹریشن بھی کرتا رہا۔ یوں اس کی ان ابتدائی نگارشوں کی وجہ سے اس کا نام لوگوں میں جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ تب وہ اپنے اصلی نام ہی سے لکھ رہا تھا۔ ایک زمانے میں وہ ہوسٹن سے شائع ہونے والے پوسٹ کے لیے روزانہ کالم بھی لکھا کرتا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں اس نے آسٹن کے ایک بینک میں ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۸۹۶ء میں اس پر ایک معمولی سی رقم کو خرد برد اور غبن کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس پر جو الزام لگایا گیا اس کی صداقت کا کبھی تسلی بخش ثبوت نہ مل سکا۔ لیکن اس کی پاداش میں اسے پانچ برس کی سزا دی گئی جب مقدمہ چل رہا تھا تو اس وقت اسے کئی جریدوں نے کہانیاں لکھنے کی پیش کش کی تھی اسی زمانے میں ولیم سڈنی پورٹر نے اپنا اصلی نام ترک کر دیا۔ قلمی نام او ہنری اختیار کیا اور کہانیاں لکھنے لگا۔ اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ اور او ہنری نے تین سال اور تین مہینے جیل میں گزارے۔ اس واقعہ کا او ہنری کی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے اپنی ذات اور پہچان کو اپنا نام بدل کر چھپا دیا اور دنیا کے ایک بڑے کہانی کار کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں اس کا ظہور ہوا۔ اس واقعہ نے اسے تنہا کر دیا تھا۔ وہ ہر شخص سے بے تکلف نہ ہو پاتا تھا۔ ملنے جلنے میں بہت اجتناب برتتا لیکن عام انسانوں کی زندگیوں میں بہت گہری اور سچی دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ ہر بڑے فنکار کی طرح بہت حساس تھا۔ اس واقعہ نے اس کے جذبات کو بہت مجروح کیا تھا۔ لیکن اپنی کم آمیزی کی تلافی اس نے نیویارک شہر کے عام آدمیوں میں گہری دلچسپی لے کر کی جو اس کی کہانیوں کے کردار بنے۔ وہ گھنٹوں نیویارک کے گلی کوچوں میں گھوما کرتا اور نیویارک کو "چھوٹے راستوں والا بغداد" کہا کرتا تھا۔

اس نے اپنی زندہ اور لازوال کہانیوں کے لیے مواد نیویارک جیسے ہنگامہ پرور شہر کے عام باسیوں کی زندگیوں سے حاصل کیا۔ اس طرح شہر کے عام آدمیوں کے حوالے او ہنری کہانیوں بڑے شہر میں رہنے والے عام آدمیوں کی زندگیوں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

اس نے جیل سے آزاد ہونے کے بعد اپنی ساری زندگی نیویارک میں گزار دی۔ اس نے اپنے آپ کو کہانی لکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ وہ نیویارک ورلڈ کے لیے ہر ہفتے ایک کہانی لکھتا تھا۔ جس کا معاوضہ اسے ایک سو ڈالر ملتا تھا۔

اس کی کہانیوں کا مجموعہ "دی فور ملین" ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اردو میں ابن انشاء مرحوم نے ہی اس کا ترجمہ "لاکھوں کا شہر" کے نام سے کیا تھا۔ اس مجموعے کے بعد او ہنری کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں "دی ٹرمڈ لیمپ" "دی وائس آف دی سٹی" "روڈز آف ڈیسٹنی" "دی لاڈ مین" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کی موت کے بعد بھی اس کی کہانیوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں "گفٹ آف دی وائز مین" "سکس اینڈ سیونز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

او ہنری نے اپنی زندگی میں سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں کے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ ان کی متعدد کہانیوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے لیے بھی ان کہانیوں کو ڈرامائی شکل دی گئی ہے او ہنری ایک زندہ رہنے والا کہانی کار ہے۔ اس کے ہاں ایک ایسی سادگی ملتی ہے جو کہانی کے انجام پر بے حد حیران کن بن جاتی ہے۔ لیکن بیشتر صورتوں میں اس کی کہانیوں کا انجام کہانی کے واقعات و کردار کے تانے بانے کے عین مطابق اور منطقی ہوتا ہے تاہم اس کی بعض کہانیوں کا انجام خاصا مضحکہ خیز بھی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے تھیلے میں سے بلی نکالی گئی ہے۔

او ہنری کی بعض عالمگیر شہرت یافتہ اور لازوال کہانیوں کے بغیر عالمی ادب کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی ایسی ہی لازوال کہانیوں میں اس کی ایک کہانی "آخری پتہ" ہے۔ جس کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک فنکار کی کہانی ہے جو ایک بیمار، مایوس عورت کی جان بچانے کے لیے ایک مصنوعی پتہ پینٹ کرتا ہے۔ کیونکہ عورت کا یہ وہم یقین کی حدوں میں داخل ہو چکا ہے کہ اس کی کھڑکی سے نظر آنے والے درخت کا آخری پتہ جس دن گرا۔ وہ اس دن خود مر جائے گی۔ فن کار خود مر جاتا ہے لیکن فن کا شہکار پتہ تخلیق کر کے اس کہانی کی عورت کو زندگی بخش دیتا ہے۔

اس کی بڑی کہانیوں میں "تحفہ" ایک لازوال کہانی ہے۔ یہ دو چاہنے والوں کی کہانی ہے۔ جو کرسمس پر ایک دوسرے کو تحفہ دینا چاہتے ہیں لیکن پیسہ نہیں ہے لیکن وہ محبت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایسا تحفہ لاتے ہیں جو دونوں کی محبت اور ایثار کا بے پایاں اظہار بنتا ہے۔

او ہنری کی بڑی کہانیوں میں سے ایک وہ کہانی ہے جو دو دوستوں کی کہانی ہے جو لمبے عرصے کے بعد ملتے ہیں تو ایک مجرم بن چکا ہے اور دوسرا اس کی گرفتاری پر مامور ہے۔ پھر ان کہانیوں میں او ہنری نے بڑے شہروں میں رہائش کے مسئلے کو چھیڑا ہے اور "سزا" جیسی لازوال کہانی لکھی ہے۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو بے گھر ہے ہر موسم سرما میں چوری کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ یوں اسے چھت میسر آ جاتی ہے لیکن ایک موسم سرما میں پکڑا نہیں جاتا اور جب موسم بدل رہا ہوتا ہے تو ایسے جرم میں پکڑ لیا جاتا ہے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔

او ہنری کی کہانیوں کے کردار بڑے شہروں کی مخلوق ہے۔ بے گھر، محروم لوگ دکانوں پر کام کرنے والی لڑکیاں، اچکے، کلرک، معمولی پیشوں سے وابستہ لوگ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی خوشیوں کی راہ میں بڑا شہر حائل ہوتا یا جو رکاوٹ بنتا ہے۔

او ہنری کی کئی کہانیاں یقیناً ایسی ہیں جو صحافیانہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ اس کا باعث اس کی زود نویسی بھی تھی لیکن اس کی وہ کہانیاں جنہوں نے اسے زندہ جاوید اور لافانی بنایا ہے ان کہانیوں کے حوالے سے بعض نقادوں نے کہا ہے کہ "او ہنری میں ٹیلنٹ (TALENT) نہیں تھا وہ جینس (GENIUS) تھا" اس کی کہانیوں کی سادگی اور اسلوب ایک ایسا سحر ہے جو پڑھنے والے پر ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔

او ہنری کو اس کی زندگی کے آخری برسوں میں وہ شہرت حاصل ہوئی جس کا وہ عرصے سے مستحق تھا۔ آخری برسوں میں اس کی کہانیوں کے مجموعے بہت مقبول ہوئے اور یوں اس کو خوش حالی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ او ہنری نے اپنی زندگی

میں ہی اپنے مقام کو پا لیا تھا۔

۱۹۰۷ء میں او ہنری نے اپنے بچپن کی دوست سارہ کوملین سے دوسری شادی کی وہ ۵ رجون ۱۹۱۰ء کو اپنے محبوب شہر نیویارک میں فوت ہوا۔

او ہنری نے افسانے میں نئی روح پھونکی اس کے اثرات نہ صرف امریکی افسانے پر بلکہ عالمی کہانی پر بھی بہت گہرے اور انمٹ ہیں اس کے فن پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہے، امریکہ میں او ہنری ایوارڈ، ہر سال بہترین کہانی لکھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔!!

کہانیاں

اُستاد نے کہا تھا (اور استاد بھی کون گستاؤ فلوبیر) بس وہ کچھ لکھو جو تمہارے مشاہدے میں آتا ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے سادہ، موزوں اور برمحل الفاظ تیار کرو کہ جو تصویر لفظوں کی بناؤ وہ اُجلی، نمایاں اور پرکشش ہو۔"

اور پھر موپساں پر ایک لمحہ آیا کہ جب اس نے تکمیل فن کے سب مراحل طے کرتے ہوئے بڑے فخر سے اعلان کیا۔

"میں نے کوئی چیز اختراع اور ایجاد نہیں کی۔ بس وہی کچھ لکھا ہے جو دیکھا ہے۔ جو مجھ پہ بیتا ہے۔"

موپساں کی زندگی پہ ایک بہت خوب صورت اور سچا ناول لکھا گیا ہے۔ یہ کٹلر کا ناول ہے جو CONDMEND TO DESIRE کے نام سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالمی افسانے کے اس عظیم معمار موپساں کے فن اور اس کی شخصیت کو سمجھنا مقصود ہو تو کٹلر کا یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے۔

موپساں جن کی کہانیاں ساری دنیا میں ایک عرصے سے پڑھی جا رہی ہیں۔ جن کا شمار دنیا کے چند بڑے فن کار کہانی کاروں میں ہوتا ہے، جن کی کہانیوں کے تراجم دنیا کی تقریباً سب زبانوں میں متعدد بار ہو چکے ہیں۔ وہ بہت کم جیا۔ وہ تینتالیس برس کا تھا کہ جب دنیا کو اپنے شاہکار ناول اور افسانے دے کر خود راہیٔ مُلکِ عدم ہوا۔

ہنری رینے گائی ڈی موپساں نارمنڈی (فرانس) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس

علاقے کے دہقانوں کو بعد میں اس نے اپنی کہانیوں میں زندہ جاوید کر دیا۔ اس کی تاریخ پیدائش ۵ راگست ۱۸۵۰ء ہے۔ اس کا باپ پیرس میں شاک بروکر تھا اور اس کی ماں کو علم و ادب سے شغف تھا اور فلوبیر جیسے عظیم لکھنے والے کے ساتھ اس کے ذاتی اور گہرے مراسم تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے موپساں بحریہ کے دفتر میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوگیا۔ وہ ہزاروں دوسرے کلرکوں کی طرح تھا۔ اور اس کے علاوہ کوئی ممتاز حیثیت نہ رکھتا تھا کہ وہ بیحد توانا، وجیہہ اور مضبوط آدمی تھا۔ اسے کشتی رانی کا بھی بڑا شوق تھا۔

اس کے ادبی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے اسے فلوبیر کی سرپرستی میں دے دیا۔ جہاں موپساں کی ملاقات اس دور کے فرانس کے عظیم لکھنے والوں سے ہوئی۔ جن میں زولا بھی شامل ہے۔ اس نے جو پہلی چیز لکھی، وہ ایک ڈرامہ تھا۔ جسے فلوبیر کے ہاں اس کے دوستوں کے سامنے نجی نشست میں کھیلا گیا۔ فلوبیر لکھنے کے معاملے میں بہت دقت پسند اور محتاط تھا اس نے سات برس تک موپساں کی تربیت کی۔ موپساں جو لکھتا وہ اس پر کڑی تنقید کرتا۔ بہرحال ۱۸۸۰ء میں موپساں کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ جو اس کا پہلا اور آخری مجموعہ ہے۔ موپساں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شاعری میں خاص مقام حاصل نہیں کر سکتا اور اس نے افسانے لکھنے کو ترجیح دی۔ ۱۸۸۰ء میں ہی افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ جس میں زولا سمیت کئی دوسرے لکھنے والوں کے افسانے شامل تھے۔ زولا نے ایک ادبی حلقے کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اس مجموعے میں موپساں کی کہانی BOULE DE SUIF شامل تھی۔ جس نے موپساں کی عظیم صلاحیتوں کا موثر ثبوت پیش کر دیا۔ اس کے بعد موپساں کی جو کہانیاں شائع ہوئیں انہوں نے اس کی عظمت کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کر دیا۔

ملازمت موپساں کے لیے بیزار کن تھی۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ پھر وہ لذت پرستی میں پڑ گیا۔ لیکن اپنے فن کے ساتھ ہمیشہ مخلص رہا۔ اس کی ذاتی زندگی غیر معمولی کہی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی جوانی اور اپنی طاقت کو دونوں ہاتھوں سے لذت پرستی کی نذر کر دیا فلوبیر کی تمام نصیحتیں بھی اس پر کارگر نہ ہو سکیں۔ اعصابی اور ذہنی مرض اسے اپنی والدہ سے ورثے میں ملی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں وہ شدید بیمار ہوا۔ لیکن اس بیماری کے نتیجے میں اس کے

جسم کے سارے بال جھڑ گئے۔

موپساں کی تخلیقی زندگی بے حد مختصر تھی یعنی ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک۔ محض دس برس ان دس برسوں میں موپساں نے لگ بھگ تین سو افسانے، چھ ناول اور دو تین سفرنامے لکھے ایڈمنڈ میرز نے انگریزی میں اور شارل نیوفز نے اس کا جو انتخاب فرانسیسی میں شائع کیا ہے وہ اس کے شاہکار افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نقادوں نے اس کے ساٹھ افسانوں کو اس کا شاہکار قرار دیا ہے۔

اپنی آخری عمر میں وہ موپساں جس نے بڑی بے باک، غیر معتدل اور ابنارمل زندگی گذاری تھی۔ مذہب میں گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ دماغی امراض کے ہسپتال میں بھی رہا۔ اور ۶؍ جولائی ۱۸۹۳ء کو وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو برس بہت تکلیف دہ اور کرب ناک تھے۔

موپساں نے چونکہ ملازمت چھوڑ دی تھی، زندہ رہنے کے لیے اس نے تحریر و تصنیف کو ہی اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اس لیے اپنی مختصر تخلیقی زندگی میں اسے بہت زیادہ لکھنا پڑا۔ اس لیے اس کی بہت سی تحریریں کمزور بھی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک مضمون میں بجا لکھا ہے کہ مجھے اردو کا چیخوف نہ کہا جائے اور منٹو کو اردو کا موپساں نہ سمجھا جائے۔ لیکن چند ایسی مشترک اقدار منٹو اور موپساں میں ملتی ہیں (اور منٹو نے موپساں کی کئی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔) جن کا ذکر ضروری ہے۔

موپساں اور منٹو نے لگ بھگ ایک جتنی عمر پائی۔

موپساں اور منٹو نے تحریر و تصنیف کو ہی ذریعۂ معاش قرار دیا۔

موپساں اور منٹو نے غیر معتدل زندگی گذاری۔

دونوں بہت سچے، بہت بے باک اور جرأت مند لکھنے والے تھے۔

منٹو کی طرح موپساں کی کمزور ترین کہانی پر بھی موپساں کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے

موپساں اور منٹو نے کفایت لفظی کے فن پر عبور حاصل کیا تھا۔
منٹو کی کئی کہانیوں پر مقدمے چلے۔ اسے مخرب اخلاق اور فحش سمجھا گیا۔ موپساں پر بھی ایسے ہی الزام لگائے گئے۔ اس کے ناول UNE VIE (۱۸۸۳ء) پر پابندی لگائی گئی۔ جس نے اُس کی شہرت میں اضافہ کیا۔
ہاپکنز نے موپساں کے فن پر جو رائے دی ہے وہ منٹو پر بھی سو فیصدی صادق آتی ہے۔ ہاپکنز نے موپساں کے بارے میں لکھا تھا:۔

"HE WAS NEVER A LOOSE WRITER, - BUT HE WAS AFTER A HURRIED ONE."

موپساں نے فلوبیر کی تربیت اور اپنی محنت سے یہ سیکھ لیا تھا کہ لفظ کا صحیح استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ اور اس کی کہانیوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ کہانی اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔
موپساں کی کہانیوں کے اُردو میں عرصے سے تراجم ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس کی بعض کہانیاں کئی بار مختلف مترجموں نے ترجمہ کی ہیں۔ اس کے شاہکار ناول UNE VIE کا ترجمہ سید قاسم محمود 'ایک دل' کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں موپساں کی کہانیوں کا ایک انتخاب اور ترجمہ ستار طاہر نے موپساں کی بہترین کہانیاں کے عنوان سے شائع کرایا ہے۔ جس میں موپساں کی آٹھ شاہکار کہانیاں شامل ہیں۔
موپساں کا درجہ بطور ناول نگار بھی عالمی ادب میں بہت بلند ہے۔ اور اس کے دو ناول UNE VIE اور BELAMI بہت اہم ناول سمجھے جاتے ہیں لیکن اسے جو رتبہ مقام اور شہرت اس کی کہانیوں کی وجہ سے حاصل ہوا وہ بطور ناول نگار نہیں مل سکا۔
موپساں کی کہانیوں کے موضوعات میں جنس کا گرم موضوع بھی شامل ہے لیکن اس کی بیشتر کہانیاں انسان کا گہرا باطنی مشاہدہ اور مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ موپساں انسانی فطرت کو ایک خاص اور منفرد انداز میں بیان کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ فن میں ریاکاری کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے اس کی کہانیوں پر بعض نقادوں نے اور پڑھنے والوں نے شدید ردِعمل کا اظہار بھی کیا ہے۔

موپساں نے ہر موضوع پر ہر انداز میں کہانی لکھنے کی کوشش کی۔ اس کی کہانی "چھتری" کو دیکھیے جس میں مادام اوریلے کی بخیلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ یک رُخا کردار نہیں بنتی۔ بلکہ بعض مقامات پر وہ عام انسانی احساسات کا بھی اظہار کرتی ہے 'گداگر' کا مرکزی کردار تو گداگر ہی ہے۔ لیکن اس کردار کو مختلف انسانی کردار اور رویے اُبھارتے ہیں اور اسی سے اس کہانی میں ایک ایسی معنویت پیدا ہوئی ہے جس نے اس کہانی کو دنیا کی چند بڑی کہانیوں میں شامل کر دیا ہے۔

'ایلجن آف آرٹ' میں جو سفاکی اور طنز ہے وہ ایسے ہی معاشروں میں جنم لیتی ہے۔ جہاں جسم بھی ترقی کی منزل تک پہنچانے میں سیڑھی کا کام دیتے ہیں اور ایسی کہانی موپساں جیسا افسانہ نگار ہی لکھ سکتا ہے۔ 'رسی کا ایک ٹکڑا' ایک فرد اور ایک پورے معاشرے کی کہانی ہے۔ جہاں ایک بار انسان پر غلط الزام کا دھبہ لگ جائے تو وہ ساری عمر اس دھبے کو دھو نہیں سکتا۔ یہ الزام اس کے لیے جان لیوا بن جاتا ہے۔ موپساں کی یہ کہانی عالمی افسانے میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور پھر "نیکلس" یہ وہ کہانی ہے جس کے بغیر عالمی افسانے کا انتخاب بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ چند گھنٹوں کی مسرتوں کی سزا انسانوں کو ساری عمر بھگتنی پڑتی ہے اور پھر اس سزا کی بنیاد بھی کتنی ناپائیدار اور جھوٹی ہوتی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی کہانی ہے جو بار بار دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ پھر 'طوطا' جیسی گہری نفسیاتی واہمے کی کہانی، "جعلی زیورات" جس میں مرد ایک عجیب طرح کا سمجھوتہ بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ یہ کہانی انسانی نفسیات کا ایک سچا اور عمیق مطالعہ ہے اور پھر اس کی کہانی "انتقام" انسان اور حیوان کے رشتے کی ایک انوکھی تفسیر.....

موپساں کی کس کس کہانی کا تذکرہ کیا جائے۔!

موپساں انسان کی جبلتوں کو سمجھتا ہے۔ ان کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ انسان کی جبلت کے سامنے اس کا اپنا وجود پگھل کر رہ جاتا ہے۔ "مارو کا" کہانی میں انسان اور فطرت ایک ہو جاتے ہیں۔ اور 'ماسک' کا بوڑھا بھی تو ایک زندہ کردار اور زندہ حقیقت ہے جو چہرے پر جوانی کا نقاب اوڑھے جوانی کے دنوں کو واپس لانے کے لیے کوشاں ہے لیکن

موپساں انسان کی تحقیر نہیں کرتا۔ وہ گھٹیا سے گھٹیا جذبوں اور کم تر سے کم تر درجے کے انسانوں سے بھی تحقیر کا انداز اختیار نہیں کرتا۔ وہ بے رحم ہے کہ سب کچھ بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے۔ لیکن وہ انسان سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ نیک اور نام نہاد شریف لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے ایک طوائف کی زندگی ہی بے معنی اور حقیر لگتی ہے۔ یوں موپساں اس طوائف کو انسانیت کی ارفع ترین بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔

موپساں کے ہاں انسان کا جو تصور ملتا ہے وہ فطری انسان کا تصور ہے۔ موپساں کے ہاں بے باکی تو مل جاتی ہے لیکن اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ ہمیں اس میں بے احتیاطی نہیں ملتی۔ اس لیے کہ اس نے انسان کا مطالعہ اور مشاہدہ لاپروائی سے نہیں کیا۔ وہ صرف مشاہدے کے بل پر ہی نہیں بلکہ اپنے گوناگوں اور متنوع غیر معمولی جبلی تجربوں کی بنا پر بھی بڑا کہانی کار بن کر سامنے آتا ہے۔ اب اس میں کیا شک ہے کہ اس کے مشاہدوں مطالعوں اور تجربوں میں اس کا روحانی تجربہ اور کرب بھی تو گھل مل گیا تھا۔

عالمی افسانوں کے معماروں میں چند ایسے نام ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جن سے دنیا ہمیشہ متاثر ہوتی رہے گی۔ ان میں ایک نام موپساں کا ہے اور ایک نام چیخوف کا بھی ہے اور روس کے چیخوف نے فرانس کے موپساں کے بارے میں لکھا تھا۔

"موپساں کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے ایک ایک صفحے کی قدر و قیمت روئے زمین کی ساری دولت سے زیادہ ہے اس کی ہر سطر میں ایک نیا افق کھلتا ہے۔ نرم و نازک روحانی محسوسات کے دوش بدوش شدید طوفانی سنسنی خیز جذبات نازک ریشوں کا جال۔"

والڈن

دنیا میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد خاصی کم ہے کہ جنہوں نے جس انداز سے لکھا ہو جس فلسفے یا طرزِ زیست کا پرچار کیا ہو، خود اپنی زندگی بھی اسی کے مطابق ڈھالی اور بسر کی ہو۔ تھورو انہی معدودے چند بڑے لکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ جس نے اپنے نظریات اور اپنی عملی زندگی کو یک جان کر دیا.....

تھورو کی تصانیف میں 'والڈن' سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے اور یہ کتاب جہاں اس کی اپنی زندگی کی داستان ہے۔ وہاں اس کے فلسفے اور فکر کی بھی سچی تصویر ہے۔ والڈ کوکس (Cox) نے لکھا ہے کہ یوں تو 'والڈن' یا تھورو کی دوسری تصانیف بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن اگر پڑھنے والا اس کی زندگی کی داستان سے بھی واقف ہو تو پھر اس کی تحریروں کے معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ اور اثر پذیری میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ والڈن کے ساتھ تھورو کی زندگی کے واقعات اور اندازِ فکر کا بہت گہرا تعلق ہے۔ والڈن۔ پہلی بار ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے تھورو ایسے تجربات کر چکا تھا جنہوں نے اس کتاب کو جنم دیا۔ اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ وہ ایک نظریۂ حیات وضع کر چکا تھا اور اس پر عمل کر رہا تھا۔ 'والڈن' دراصل اس کی فکر طرزِ زیست کا ہی اظہار نہیں۔ بلکہ اس کی زندگی کا بھی ایک جزو لاینفک ہے۔

تھورو۔ مفکر، شاعر اور نیچرلسٹ تھا۔ اس نے فرد کی آزادی کو بہت اہمیت دی ہے آج کا امریکی معاشرہ فرد کو جو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے پیچھے تھورو کی فکر کارفرما ہے۔

تھورو کا فلسفہ کیا ہے اسے اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے ۔

ایک فرد کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کرے ۔ جس طرح زندگی کے اصول اس سے تقاضا کرتے ہیں ۔

والڈن ۔ فرد کی زندگی کے اہم ترین تجربے کا ایک لازوال ریکارڈ ہے ۔ فرد کی آزادی کا وہ اظہار ہے جس کی بدولت تھورو دنیا کے عظیم مصنفین اور مفکروں میں کھڑا دکھائی دیتا ہے اور اس کی کتاب دنیا کی گنتی کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک تسلیم کی جاتی ہے ۔

تھورو عجیب و غریب انسان تھا ۔ آزاد ، یکتا ، اپنے عمل میں منفرد ، وہ ۱۲ جولائی ۱۸۱۷ کو کنکارڈ (میس چوسٹس) میں پیدا ہوا اور اپنی بیشتر زندگی اس نے یہیں گزار دی ۔ وہ کہا کرتا تھا ۔ فطرت کے ایک طالب علم کو جو کچھ چاہیئے وہ سب کچھ یہاں میسر ہے ۔

اس کا باپ اس قصبے میں سیسے کی پنسلیں بنانے کا کام کرتا تھا ۔ تھورو نے بھی ایک عرصے تک اس کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا ۔ اس زمانے میں اس کی اس اعتبار سے بڑی شہرت تھی کہ وہ پنسلوں کے ڈھیر میں سے ایک ہی وقت میں ہاتھ ڈال کر اتنی ہی پنسلیں نکال لیا کرتا تھا جتنی کہ کسی گاہک کی ضرورت ہوتی تھیں ۔ بعد میں اس کا یہ تجربہ اس طرح بھی کام آیا کہ وہ تالاب یا جوہڑ میں وہیں ہاتھ ڈالتا جہاں مچھلی ہوتی ۔

کنکارڈ کا یہ قصبہ جہاں ہنری ڈیوڈ تھورو پیدا ہوا ، اس اعتبار سے بڑی شہرت رکھتا ہے کہ اسی قصبے میں امریکی ادب کے بعض اہم ترین لکھنے والے پیدا ہوئے ایمرسن ، ہاتھورن ، لوئزا مے الکاٹ ، ان سب کی جائے پیدائش یہی قصبہ ہے ۔

تھورو نے ہارورڈ میں تعلیم حاصل کی اور ساری عمر کلاسیکی ادب کا پُرجوش طالب علم رہا اس نے کبھی اس بات کا دعوےٰ نہیں کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہارورڈ جیسی درسگاہ کا پڑھا ہوا ہے ۔ وہ علم کا جویا تھا اور ساری عمر علم ہی حاصل کرتا رہا ۔ اس نے ایک مختصر عرصے

تک اپنے بھائی کی شراکت میں ایک سکول میں درس بھی دیا۔ لیکن جلد ہی یہ پیشہ چھوڑ دیا وہ مردِ آزاد تھا اور کسی طرح کی پابندیاں قبول کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنے آبائی قصبے اور سٹیٹن آئی لینڈ میں ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا لیکن پھر اس سے بھی اس کا جی بھر گیا اس نے اپنی زندگی اپنے وسائل سے بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چھوٹے موٹے کام کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔ اس نے اپنی زندگی کے حوالے سے ثابت کیا کہ انسان کم سے کم وسائل میں کم سے کم کام کر کے انتہائی سادگی کے ساتھ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہوئے، پُرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کسی دھوم دھڑکے، شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کے اظہار کے بغیر بھی انسان ایک سچی روحانی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

وہ کھیتوں، باغوں، جنگلوں میں گھومتا رہتا۔ درختوں، پودوں، کیڑے مکوڑوں کو دیکھتا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرتا۔ وہ جنگل کی زندگی کا اتنا عادی ہو گیا اور جنگل اور اس کی مخلوق کو بھی اس سے اتنا انس پیدا ہوا کہ ایمرسن جیسا بتاتا ہے کہ جنگل کے سانپ محبت اور بے تکلفی کے ساتھ اس کے جسم کے کسی حصے کے ساتھ لپٹ جاتے تھے۔ جنگل اور جنگل کی مخلوق نے اپنا ساتھی سمجھتے ہوئے اسے جنگل کے "حقوقِ شہریت" دے دیئے تھے۔

ایک زمانے میں ایک مختصر سا عرصہ تھورو، ایمرسن کے گھر بھی رہا۔ اپنے قیام کے اس زمانے میں اس نے ایمرسن کے باغ کی نگہداشت سنبھال لی۔ وہ پودوں اور درختوں سے ہمکلام ہوتا۔ اس نے ایمرسن کے گھر کی چھت مرمت کر دی۔ اس کے لیے نایاب پودے تلاش کیے۔ باڑ کی مرمت کی اور پھر ان مشاغل کے ساتھ ساتھ فلسفے پر لمبی بحث کیا کرتا تھا

جولائی ۱۸۴۵ء سے ستمبر ۱۸۴۷ء تک تھورو نے جس انداز میں زندگی بسر کی اس کی دین اس کی یہ عظیم کتاب 'والڈن' ہے۔ اس نے جس طرزِ حیات کا پرچار کیا تھا۔ اب اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اس نے والڈن جوہڑ (POND) کے کنارے خود ایک جھونپڑا تعمیر کیا جو کنکارڈ کے قصبے کے بیرونی حصے میں واقع تھا۔ یہاں وہ اس دوران میں اکیلا زندگی بسر کرتا رہا اسے اپنی ضرورتوں کے لیے، جتنی رقم کی ضرورت ہوتی وہ اِدھر اُدھر کے کام کر کے حاصل کر لیتا۔ وہ محنت اور دستکاری کرتا تھا وہ لمبی سیر کرتا۔ ایک ایک پتے اور ایک ایک کیڑے کو

دیکھتا جن کی تفصیل وہ اپنی ڈائری میں قلم بند کر لیتا۔ اس کے انہی تجربات کا بھرپور اظہار "والڈن" میں ہوا ہے۔ اس نے کسی پرندے یا جانور کو ہلاک کیا نہ شکار۔ وہ سبزی پر زندگی گزارتا رہا۔ لمبی سیر اور فطرت کے مظاہر کے مشاہدے کے بعد جو وقت بچتا اسے وہ مطالعے اور غور و فکر میں بسر کرتا۔ اس زمانے میں وہ انسانی رفاقت سے نفرت کرنے لگا تھا۔ لیکن جب اس کا یہ "مراقبہ" مکمل ہوا تو وہ انسانوں کی دنیا میں آگیا۔ والڈن میں اس نے جو عرصہ گزارا اس کے حوالے سے تھورو پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ انسان سے نفرت کرتا تھا۔ وہ نرم اور انسانی جذبات سے تہی اور محروم تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

وہ انسانوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے کنکارڈ میں ایک ہال کرائے پر لیا اور وہاں غلامی کے خلاف تقریریں کرتا۔ وہ امریکہ میں غلامی کے خلاف موثر ترین آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ میکسیکو کے ساتھ جو لڑائی ہو رہی تھی اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا

تھورو کا یہ کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے کہا کہ وہ ایک ایسی حکومت کو ہرگز ٹیکس ادا نہ کرے گا۔ جس نے غلامی کی اجازت دے رکھی ہو۔ اس کو اس احتجاج اور ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں اسے سزا ہوئی۔ جیل بھجوا دیا گیا۔ اس نے ہنسی خوشی یہ سزا قبول کر لی لیکن اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

•

تھورو نے نہ صرف حکومت کو ٹیکس ادا نہ کیا جیل چلا گیا بلکہ اس نے اپنے فلسفہ کو اپنے مشہور زمانہ مضمون میں بھی بیان کیا۔ اس مضمون کا نام ON THE DUTY OF CIVIL DISOBEDIENCE ہے۔

اس کا یہ مضمون بے حد اہم ہے۔ اس کے اثرات پوری دنیا پہ بہت گہرے ہیں۔ "والڈن" اس کی کتاب کو ایک تخلیقی کام کہا جاتا ہے۔ لیکن اس مضمون کو ایک دلائل سے پر بحث اور مناظرہ قسم کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ امریکی نقاد چارلس آر اینڈرسن نے لکھا ہے:-

CIVIL DISOBEDIENCE IS NOT LITERATURE BUT

POLEMICS - اس مضمون میں وہ ریاست پر تنقید کرتا ہے۔ وہ ریاست کے سیاسی مقاصد کو زیر بحث لاتا اور درس دیتا ہے کہ جب ریاست کے مقاصد ضرر انگیز ہوں تو پھر یہ آزاد انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے احکام کی نافرمانی کرے۔ اس مضمون میں تھورو نے دلائل سے کام لیا ہے۔ اس مضمون کا یہ جملہ فرد کی مرضی اور منشا کا دستور بن گیا ہے۔ تھورو لکھتا ہے۔

"THE ONLY OBLIGATION WHICH I HAVE A RIGHT TO ASSUME IS TO DO AT ANY TIME WHAT I THINK RIGHT."

تھورو کی تحریروں میں اس کا یہ مضمون سب سے زیادہ اثر انگیز ثابت ہوا۔ عدم تعاون کے فلسفے کا سہرا بعض لوگ گاندھی کے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس فلسفے کا موجد اور بانی تھورو ہے۔ اس نے نہ صرف یہ فلسفہ پیش کیا بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ اس کا یہ مضمون فرد کی جدوجہد کی تاریخ کی اہم ترین دستاویز ہے۔ گاندھی نے اس سے اثر قبول کیا اور اس کی تقلید کی۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی استبداد اور تسلط کے خلاف لوگوں نے اسے اپنایا اور بہت سی زیر زمین تحریکوں نے اسے حرز جان بنا کر رکھا۔

تھورو نے اپنی باقی زندگی اپنے نظریات اور افکار کے عین مطابق بڑی سادگی سے بسر کی۔ وہ کنکارڈ میں ہی ۶ مئی ۱۸۶۲ء کو فوت ہوا۔

اس کا شاہکار "والڈن" دنیا کی منفرد اور یکتا تصنیف ہے۔ اس کے اپنے افکار و اعمال کی آپ بیتی یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جسے آدمی ایک بار پڑھ کر بھی اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کا مطالعہ بذاتِ خود ایک بہت اہم تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا تخلیقی انداز بیان، مادے پر گہرا طنز، فطرت سے عشق، وہ عناصر ہیں۔ جنہوں نے اسے ایک سدا بہار کتاب کی حیثیت بخشی ہے۔ یہ ایک لازوال کتاب ہے۔ ہر دور میں اس کی معنویت برقرار رہے گی۔

"والڈن" انسان کو فطرت اور سادگی کی طرف لوٹنے کا پیغام دیتی ہے۔ تھورو اس کتاب کے حوالے سے بتاتا ہے کہ، صحیح معنوں میں فطرت سے ہم آہنگ ہو کر، زندگی بسر کرنا،

کتنا خوشگوار اور سادہ کام ہے اس نے جس انداز میں زندگی کی ضروریات کو کم کیا آج کے دور میں یقیناً "تکلیف دہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہوں گی لیکن یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں، ہر طرح کے حالات میں کس طرح پرسکون اور سادہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی کو گہرے مفہوم سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہی اس کا فلسفہ ہے۔ یہی فرد کی آزادی وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ضرورتوں کو کم کر کے کس طرح انسان اپنی زندگی کی ۹۹ فیصدی بوجھل ذمہ داریوں سے نجات کر کے آزادی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

بعض نقادوں نے اسے رومانیت، بھی قرار دیا ہے لیکن یہ عاجزانہ سی رائے ہے کہ والڈن میں پیش کیا جائے والا فلسفہ حیات رومانویت کی کی چھاپ سے آزاد ہے یہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کے انداز کی کتاب نہیں۔ نہ ہی یہ فرینکلن کی کتاب، کس طرح دولت مند بنا جا سکتا ہے، کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب تخلیقی ہے اور ایک طرز زیست پیش کرتی ہے جو انسانی تجربے کی دین ہے۔ والڈن۔ رومان نہیں ہے بلکہ REALISM ہے

والڈن کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ تھورو کے اس شاہکار کا ترجمہ حبیب اشعر مرحوم نے کیا تھا۔ والڈن کی تخلیقی اور ادبی خوبیوں کے حوالے سے میں چارلس آر اینڈرسن کی رائے درج کروں گا۔

" والڈن کو آپ بڑی آسانی سے ایک نظم سمجھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں اگرچہ اسے نثر کے روپ میں لکھا گیا ہے۔"

فرد کی آزادی اور اس کا حصول، فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بھرپور سادہ زندگی بسر کرنے کا فلسفہ اس کتاب کا موضوع اور روح ہے۔

نوسٹرا ڈامس

۹۸

پیشن گوئیاں

انسان کا عجز یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات اور عوامل میں جکڑا ہوا یہ نہیں جانتا کہ اگلے لمحے یا مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ انسان کے اندر ہمیشہ یہ تجسس رہا ہے کہ آنے والے زمانے یا ایام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکے۔ انسان کی اس طلب اور اس کے اس تجسس نے اسے ازل سے تاریک وادیوں میں بھٹکایا ہے۔ اس نے دیوی دیوتا تخلیق کیے۔ کاہنوں اور راہبوں کو اپنی تقدیر شناسی کے لیے روحانیت کے شاندار اور بلند مسندوں پر فائز کیا اور طرح طرح کے علوم کی بنیادیں رکھیں۔ دست شناسی، لکیروں کو پڑھنے اور تقدیر کو جاننے کا علم، ستاروں کی گردش سے اپنے مقدر اور مستقبل کو وابستہ کیا۔ اعداد اور ان کے معنی اور اثرات کو اپنی تقدیروں اور زندگیوں پر حاوی کر دیا۔ اس سے توہم پرستی، تعویذ اور گنڈے کا کاروبار عروج پر پہنچا۔ گمراہیوں کے نت نئے راستے کھل گئے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اس حوالے سے بعض اہم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ غیب کا علم جاننے کی تمنا شاید ہی کوئی انسان ہو، جس کے دل میں اپنے مخصوص حالات کے تحت، پیدا نہ ہوئی ہو۔

آئے دن اخباروں میں دنیا کے بعض منجموں ستارہ شناسوں کی پیش گوئیاں شائع ہوتی ہیں۔ دست شناسی، علم نجوم، ستاروں اور اعداد کے حوالے سے دنیا میں ہر برس کتنی ہی کتابیں شائع ہوتی ہیں جو انسانوں کی عارضی تسکین کا جواز فراہم کرتی ہیں اور پھر بھلا دی جاتی ہیں لیکن ایک کتاب ایسی ہے جو دنیا کی عجیب و غریب کتاب ہے جو پچھلی صدیوں سے مسلسل عام انسانوں کے مطالعے میں بھی رہی ہے اور محققین نے بھی کئی بار تجزیے کیے ہیں۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کے حوالے سے جو کچھ اب تک

مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے اس کو یکجا کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو اب تک اتنی بار پڑھا گیا اور اتنی بار اس کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔

یہ کتاب دنیا کی سو عظیم کتابوں میں سے ایک ہے لیکن اپنی جگہ سب سے منفرد اور الگ تھلگ ہے، اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب میں جو کشش ہے وہ عالمگیر نوعیت کی حامل ہے۔

یہ کتاب نوسٹراڈامس کی تصنیف ہے۔ اس کا نام "صدیاں" ہے۔ اس کتاب میں صدیوں کے آنے والے واقعات کے بارے میں غیب بینی کا اظہار کرتے ہوئے پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب اپنے اسلوب کے لحاظ سے بھی بے حد منفرد ہے۔ نوسٹراڈامس نے اس کتاب کو رباعی سے ملتی جلتی صنف "چو مصرعوں" کی نظم میں لکھا ہے۔ یہ پیش گوئیاں منظوم ہیں اور شاعری کے ذریعے پیش کی جانے والی ان پیش گوئیوں کے اسرار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے یہ پیش گوئیاں صدیوں سے عام انسانوں اور محققوں اور عالموں کے مطالعے میں رہی ہیں اور ان پر سر درد رہیں اس موضوع کے ماہرین نے اظہار خیال کیا ہے ان کی معنویت پر بہت سر کھپایا گیا ہے اور پھر ایسے نتائج برآمد ہوئے ہیں جو بہت حیران کن اور ناقابل یقین ثابت ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے کو دیکھا ہے اور اس حوالے سے کچھ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہٹلر کے حکم پر نازی پروپیگنڈہ وزیر گوئبلز نے نوسٹراڈامس کے حوالے سے بھی ساری دنیا پر ہٹلر کی عظمت اور برتری کا سکہ جمانے کی کوشش کی تھی۔ "سینچریز" میں یقیناً بعض بعض ایسی پیش گوئیاں شامل ہیں جن کا تعلق ہٹلر کی آمد سے تھا۔ اس کی فتوحات کے بارے میں نوسٹراڈامس نے صدیوں پہلے پیش گوئیاں کر دی تھیں۔ یہ پیش گوئیاں ہٹلر کے زمانے میں خوب اچھالی گئی تھیں۔ ان کی عالمگیر پیمانے پر تشہیر کی گئی تھی۔

نوسٹراڈامس ایک ایسا شخص ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان تھا جو وقت کے اس پار دیکھ سکتا تھا اور اس کی کتاب "سینچریز" ایسی کتاب ہے جو آنے والی صدیوں کے بارے میں پیش گوئیاں کرتی ہے اور پچھلے چند سو برسوں میں نوسٹراڈامس کی اس کتاب میں جو پیش گوئیاں شامل تھیں وہ بہت حد تک سچی ثابت ہو چکی ہیں۔ اس حوالے سے اس عجیب و غریب کتاب پر محققوں سائنسدانوں، ستارہ شناسوں، طبیعیات کے عالموں، مورخوں اور روحانیت کے علم سے دلچسپی

لینے والوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ باقی رہا عام آدمی تو وہ اس کتاب کو صدیوں سے پڑھتا چلا آرہا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے اور انسان میں مستقبل کا حال جاننے کے لیے تجسس کا جذبہ موجود ہے اس کتاب کا مطالعہ ہوتا رہے گا۔

نوسٹراڈامس کی موت کو چار سو برس سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور اس عرصے میں اس کی پیش گوئیاں حیران کن حد تک صحیح اور سچی ثابت ہو چکی ہیں ۔!

نوسٹراڈامس فرانس کے صوبے پروونس کے ایک قصبے میں ۱۴ ردسمبر ۱۵۰۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کے آبا و اجداد نے ریاضی اور طب کے علوم میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اور اس دور کے کئی بادشاہوں اور نوابوں کے دربار سے وابستہ رہے تھے۔ محققین اور مورخین نے اس ضمن میں چند ایسے نتائج بھی پیش کیے ہیں جو بطور خاص ہماری دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔

نوسٹراڈامس خود ایک یگانۂ روزگار طبیب تھا۔ اس نے اپنے دادا سے اس سلسلے میں خاص طور پر فیض حاصل کیا تھا اور اس کا دادا بطور خاص طبِ اسلامی سے متاثر تھا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس نے مسلمانوں کی طب سے استفادہ کیا تھا اور کئی قلمی نسخے ورثے میں نوسٹرا ڈامس کو اپنے دادا سے ملے تھے۔ اپنے زمانے میں نوسٹراڈامس نے جو بے مثل شہرت حاصل کی وہ ایک طبیب کی حیثیت سے تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے عہد کے بڑے بڑے نوابوں اور پھر شاہِ فرانس تک کا مقرب ٹھہرا اور کئی اعزاز اور عہدے اس کو نصیب ہوئے۔ اس زمانے میں یورپ میں پلیگ کو ایسا وبائی مرض سمجھا جاتا تھا جو قہرِ خداوندی تھا اور اس کا کوئی علاج نہ تھا اسے لاعلاج سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نوسٹراڈامس نے وبا میں گھرے قصبوں میں لوگوں کا علاج کیا۔ پلیگ کا مقابلہ کیا اور اس نے ایسا نام پایا جو اپنے دور میں یکتا سمجھا گیا۔ پلیگ کے مرض کا علاج اس زمانے کے فرانس میں صرف اسے معلوم تھا اور اس نے یہ طریقِ علاج اپنے دادا کے حوالے سے اسلامی طب سے حاصل کیا تھا۔

نوسٹراڈامس نے طب کے حوالے سے جو نام کمایا وہ اسلامی طب کا مرہونِ منت تھا لیکن آج وہ اپنی عجیب و منفرد تصنیف "سینچریز" کے حوالے سے ساری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ "سینچریز" جو رباعی سے ملتی جلتی شعری صنف QUATRAINS پر مشتمل ہے۔

مائیکل ڈی نوسٹراڈامس نے طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور جن درسگاہوں میں اس نے تعلیم حاصل کی ان کے اساتذہ کی نگاہوں میں اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اہم مقام حاصل کیا۔
وہ ابتدائی عمر میں ہی ایک جینئس کا تاثر دینے لگا تھا۔ لیکن ساری عمر نوسٹراڈامس نے کبھی اپنی فضیلت کا ڈھنڈورہ نہ پیٹا۔ وہ بے حد منکسر المزاج اور بردبار انسان تھا اس نے طالب علمی کے زمانے میں طب کا ہی مطالعہ نہیں کیا بلکہ ادبیات ریاضی اور فلسفے کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ مذہب سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی اور مذہب کے بارے میں اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس نے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی بسر کی۔ پلیگ کی وباؤں پر قابو پاکر اس نے پیشہ ور حریف بھی پیدا کیے۔ وہ بھی تھے جو اس پر جادو کا الزام لگاتے تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی بے مثل کامیابی سے حسد کرتے تھے۔ ایسے لوگوں نے نوسٹراڈامس کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن نوسٹراڈامس ایسی تمام مخالفتوں سے بے نیاز اپنے انداز کی مطمئن زندگی بسر کرتا رہا۔ اور پھر وہ فرانس کے شاہ کا مقرب خاص اور طبیب بن گیا، جس سے اس کی توقیر اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

وہ ۱۵۶۶ء میں فوت ہوا۔ اس نے ۶۲ برس ۶ ماہ اور ۱۷ دن کی عمر پائی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی تدفین کے لیے خود ہی سیلون کے گرجے میں جگہ کا انتخاب کر کے اپنا مقبرہ تیار کروایا تھا۔ اس کی قبر پر لاطینی زبان میں ایک کتبہ لکھا ہوا ہے جس کی عبارت یوں ہے۔

یہاں ہمہ صفت انسان مائیکل نوسٹراڈامس کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اس نے ستاروں کے زیر اثر آنے والے زمانے کے بارے میں مستقبل کی پیش گوئیاں کیں اور وہ فانی ہونے کے باوجود واحد ایسا انسان تھا جو اس کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ سیلون میں ۱۵۶۶ء میں فوت ہوا، خدا اس کی روح کو آسودہ رکھے۔ اس کی زوجہ این پونسارٹ اس کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

..—※—..

نوسٹراڈامس۔ وہ انسان جو زمانوں کے پار دیکھ سکتا تھا۔ جسے ایسی نگاہ ملی تھی جو مستقبل میں صدیوں بعد آنے والے اہم واقعات کو دیکھ سکتی تھی۔ کون تھا؟ کیا وہ کوئی پیغمبر تھا، روحانی بصیرت اور بشارت کا علم رکھنے والا؟

اس سوال پر بہت بحث ہوئی ہے اور اس حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ آخر وہ کیا تھا؟ کون سی طاقت یا بصیرت اس کے پاس تھی کہ وہ آنے زمانوں کے بارے میں پیش گوئیاں کر سکتا تھا۔ !

وہ صدیوں بعد آنے والے واقعات، جنگوں شخصیات کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے۔ ہٹلر نپولین پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم، ہوائی جہازوں کی ایجاد، انسان کا چاند پر اترنا اور ایسے ان گنت تاریخی واقعات کو، جو اس کی زندگی اور موت کے صدیوں بعد رونما ہوئے، ان کا علم اسے صدیوں پہلے کس طرح ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام سوالات جو نوسٹرڈامس اور اس کی عجیب تصنیف "سینچریز" کے حوالے سے سامنے آتے ہیں ان کا جواب سائنس کے پاس موجود نہیں ہے لیکن نوسٹراڈامس نہ پیغمبر تھا نہ ہی کوئی مذہبی مقدس انسان۔ نہ ہی اس کا ایسا دعوے تھا.... پھر اس سے پہلے اور بعد میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے مختلف پیش گوئیاں کیں جو کچھ درست نکلیں۔ کچھ غلط۔ لیکن صدیاں گزرنے کے بعد "سینچریز" کی پہلی اشاعت ۱۵۵۵ء سے اب تک اس کتاب میں چو مصرعوں کی صورت میں گئی پیش گوئیاں ہمیشہ سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ !

"سینچریز" کی حیثیت محض منظوم پیشگوئیوں پر مشتمل ایک کتاب ہی کی نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ تاریخ اور تاریخ کے تسلسل کے حوالے سے بھی بے حد دل چسپ ہے۔ آج اس کو پڑھیں تو پچھلی صدیوں کی تاریخ بھی ان میں ملتی ہے اور آنے والے دور کے بارے میں تاریخی واقعات کی پیشگی اطلاع بھی۔ اس اعتبار سے بھی "سینچریز" دنیا کی ایک اہم کتاب ہے جو دنیا کی سب کتابوں سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔

ژاں ایمی ڈی شیوو دگنی نے "سینچریز" کی جو تفسیر لکھی ہے اس کے مطالعہ سے اس کتاب کی کئی جہتوں کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

نوسٹراڈامس کی کتاب "سینچریز" کے حوالے سے کتنے ہی ماہرین اور محققین نے اس سلسلے میں سر کھپایا ہے کہ یہ جانا جا سکے کہ وہ کونسی طاقتیں، تحریکات اور پُراسرار اسباب تھے جنھوں نے نوسٹراڈامس کو یہ صلاحیت بخشی کہ وہ پیش گوئیاں کر سکے۔ لیکن صدیوں سے کوئی ماہر، عالم اور محقق اس کے صحیح جواب تک نہیں پہنچ سکا۔

آج بیسویں صدی کے اختتام پر انسان نے جتنی محیر العقول ایجادات کی ہیں، ان سب کا ذکر

کسی نہ کسی اشارے کے ذریعے نوسٹراڈامس کی "سینچریز" میں ملتا ہے۔ آخر وہ کونسی طاقت تھی جس نے نوسٹراڈامس کو یہ سب کچھ صدیوں پہلے بتا دیا تھا۔

نوسٹراڈامس کی زندگی کا مطالعہ کریں تو کسی نہج سے بھی وہ غیر معمولی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ وہ غیر معمولی اور ناقابل یقین صلاحیتوں کا تو مالک تھا لیکن بطور ایک انسان اور شخص کے وہ انتہائی متوازن اور نارمل انسان تھا۔ یقیناً وہ اپنے دور میں فرانس کا سب سے بڑا معالج اور طبیب تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے بڑی شہرت پائی لیکن وہ عام انداز کی متوازن زندگی بسر کرتا تھا اور اس میں پیغمبروں، نجومیوں، مذہبی اور مقدس آدمیوں جیسی کوئی خاص چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔

اس نے اپنی رصدگاہ قائم کی تھی۔ وہ ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ محض ستاروں کے علم سے ہی تو ظہور میں نہیں آیا۔ اس کو جو غیر معمولی صلاحیت ودیعت ہوئی تھی اس کے بارے میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عطیہ خداوندی تھی اور نوسٹراڈامس نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔ اس کے زمانے میں بعض لوگوں نے اس پر کافر اور جادوگر ہونے کا الزام لگایا تھا نوسٹراڈامس نے ہنری دوم کے نام جو خط لکھا تھا وہ اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس میں اس نے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ وہ آسٹرالوجی کے ذریعے سے سب "راز" معلوم کرتا ہے لیکن یہ بات ہو چکی ہے کہ محض آسٹرالوجی اور دوسرے علوم ہی اس کی پیش گوئیوں کے سلسلے میں اس کے معاون نہ تھے۔ بلکہ وہ خاص صلاحیت اہم کردار ادا کر رہی تھی جو ودیعت خداوندی تھی۔

نوسٹراڈامس اپنی پیش گوئیوں کی اشاعت سے گھبراتا تھا کیونکہ مذہبی اداروں کی مخالفت کا خوف حقیقی تھا۔ اس نے ابتداء میں اپنے قریبی دوستوں کو وہ منظوم پیش گوئیاں سنائیں اور جب وہ اصرار کرنے لگے تو ان کی اشاعت پر رضامند ہو گیا۔ اس نے ان پیش گوئیوں کی زبان میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ "تاکہ لوگ ان کے اسرار و معنی کو فوراً نہ پا جائیں بلکہ اس پر غور کریں نوسٹراڈامس نے خود لکھا ہے کہ ان پیش گوئیوں کا ایک مقصد یہی ہے کہ آنے والے دور کا انسان، آنے والی صدیوں میں رونما ہونے والے واقعات سے پیشگی طور پر واقف ہونے کے بعد احتیاطی تدابیر اختیار کر سکے۔ اور اپنی زندگی کے چلن کو بدل سکے۔

بہرحال ۱۵۵۵ء میں "سینچریز" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کی اشاعت فرانس کے شہر لیون میں ہوئی۔ پہلے ایڈیشن میں چار سو چوالیس منظوم پیش گوئیاں شامل کی گئی تھیں۔ اپنی اشاعت کے

فوراً بعد ہی "سینچریز" کو بے مثل مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان پیش گوئیوں نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ نوسٹرا ڈامس سے وضاحتیں طلب کی جانے لگیں۔ اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ لیکن نوسٹرا ڈامس اپنی روایتی بردباری سے کام لیتا رہا۔

آسٹرالوجی، علم ستارہ شناسی سے واقف لوگوں اور تاریخ کا علم رکھنے والوں کے لیے ان پیشگوئیوں کا صحیح ادراک کرنا زیادہ آسان ہے۔ یہ منظوم پیش گوئیاں بالکل واضح بھی ہیں اور مشکل بھی۔ الفاظ کے اندر جا کر جھانکنا پڑتا ہے۔ کچھ حساب کتاب کی ضرورت بھی ان کے سمجھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ "سینچریز" کی منظوم پیش گوئیوں کی متعدد تفسیریں متعدد ادوار میں لکھی گئی ہیں اور آنے والے زمانے کے حوالے سے بھی ان پر مستقل بنیادوں پر بعض ماہرین کام کرتے چلے آرہے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں ان پیشگوئیوں کے حوالے سے اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نوسٹرا ڈامس کی "سینچریز" میں بیسویں صدی کے بارے میں جو باب ہے۔ وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہی اس کتاب کا آخری باب ہے۔ اس صدی کو نوسٹرا ڈامس DEADLINE کا نام دیتا ہے۔

اس حصے کی منظوم پیش گوئیوں میں بیسویں صدی میں رونما ہونے والے خوفناک واقعات کے بارے میں نوسٹرا ڈامس باقاعدہ مہینے سال اور سن تک کی خبر دیتا ہے۔ وہ اس صدی کے حوالے سے پانچسو برس پہلے ہمیں ستاروں کی صحیح گردش تک کا علم دیتا ہے کہ کس سن اور تاریخ کو ستاروں کی گردش کا عمل کیا ہوگا اور کب اور کونسا واقعہ رونما ہوگا۔ اور یہ حیرت انگیز بات ہے کہ پانچ صدیوں کے بعد ویسا ہی کچھ رونما ہوا۔ اور ستاروں کی ویسی ہی گردش پائی گئی۔ جیسا نوسٹرا ڈامس نے اپنی کتاب میں لکھا اور پیشن گوئی کی تھی۔

ان پیش گوئیوں میں ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم اور اس کے مابعد اثرات کا ذکر موجود ہے نوسٹرا ڈامس پانچصد برس پہلے لیگ آف نیشنز کے بارے میں ہمیں اطلاع دے چکا ہے۔ سپین کا انقلاب روس کا انقلاب، دوسری جنگ عظیم، روس اور امریکہ یورپ کا روسیوں سے اتحاد، ہٹلر کا ظہور، عروج، فتوحات، مسولینی، نازی ازم اور فاشزم کا عروج، دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں، فرانس کا سقوط اور شکست، بیسویں صدی کی ایجادات، ایٹمی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، تباہیاں، سیلاب اور

بیسویں صدی کی سیاسی تبدیلیاں، ان سب کے بارے میں نوسٹرا ڈامس نے چار سو برس پہلے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ حرف بہ حرف نہ سہی نوناوے فیصد صحیح اور سچی ثابت ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ نوسٹرا ڈامس بیسویں صدی کے حوالے سے اپنی پیش گوئیوں میں ہمیں بتاتا ہے کہ بیسویں صدی میں یورپ اور مغربی دنیا اپنی تمام تر مادی ترقیوں کے باوجود تباہی سے دوچار ہوگا۔ اور ہمیں یہ نوید دیتا ہے کہ مشرق کو بیسویں صدی میں اہمیت حاصل ہوگی اور مشرق کو عروج ملے گا۔ لی میکان نے ان میں سے بعض پیش گوئیوں کی تفسیر اور وضاحت کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۱ء تک نوسٹرا ڈامس کی کتنی پیش گوئیاں صحیح نکلیں اور بعض ایسی پیش گوئیوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو ۱۹۸۱ء میں نوسٹرا ڈامس کے حساب کے مطابق پوری اُتریں۔

نوسٹرا ڈامس کی پیش گوئیاں پوری دنیا کے بارے میں ہیں۔ وہ ہمیں دنیا کی تباہی کے بارے میں بتاتا ہے جو سن اس کی پیش گوئیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ وہ ۱۹۹۹ء ہے ...

نوسٹرا ڈامس کی یہ کتاب "سینچریز" دنیا کی عجیب و غریب کتاب ہے۔ چار مصرعوں میں بیان کی گئیں کئی سو پیش گوئیاں پوری ہو چکی ہیں جو چار سو برس کے زمانے پر محیط ہیں۔

چار سو برس کی عالمی تاریخ کے اہم واقعات اور شخصیات کے بارے میں نوسٹرا ڈامس نے چار سو برس پہلے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ سچ نکلی ہیں۔ اس کی کتاب کا آخری باب بیسویں صدی سے متعلق پیش گوئیوں پر مشتمل ہے جسے وہ تباہی کی صدی قرار دیتا ہے یا پھر دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نوسٹرا ڈامس کی غیر معمولی صلاحیت ۔ جو صدیوں اور زمانوں کے پار تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ بیسویں صدی سے آگے نہیں دیکھ سکی۔

"سینچریز" کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے۔ اس کتاب پر ہزاروں کتابیں اور تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ نوسٹرا ڈامس کے بارے میں کتابیں مختلف زبانوں میں ملتی ہیں۔ نوسٹرا ڈامس اور اس کی پیش گوئیوں پر مشتمل کتاب "سینچریز" سدا بہار کتاب ہے۔ جس نے پوری دنیا کو چونکا دیا ہے!

سٹڈی اِن سائیکلوجی آف دی سیکس

ہیولاک ایلس۔ فرائڈ سے مختلف انسان ہی نہیں تھا بلکہ اس نے جو کام کیا وہ بھی فرائڈ کے کام سے مختلف ہے۔ ہیولاک ایلس بے غرض انسان تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک جو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے دنیاوی آسائشوں اور آسودگیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس نے جس کام کی تکمیل کا بیڑہ اُٹھایا تھا اسے مکمل کرنے میں اُسے تقریباً اپنی ساری عمر نکبت اور ناداری کا سامنا کرنا پڑا اور جب کہ اس کے لیے خوش حالی اور آسودگی کے تمام مواقع موجود تھے۔ ہیولاک ایلس نے اپنے کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

اس کی عظیم تصنیف "سٹڈی ان دی سائیکلوجی آف سیکس" اپنے موضوع پر ایک ایسا کام ہے جو مستند اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے اس کام کی وجہ سے ہیولاک ایلس کو "ڈارون آف سیکس" بھی کہا جاتا ہے۔

ہیولاک ایلس ۲ فروری ۱۸۵۹ء کو سرے (انگلستان) پیدا ہوا۔ اس کا والد سمندری جہاز کا کپتان تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم لندن میں حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر تھی جب اسے خرابی صحت کی وجہ سے اس کے والد کے پاس آسٹریلیا بھجوا دیا۔ جہاں وہ چار برس تک مدرس کی حیثیت سے پڑھاتا رہا وہ غیر مؤثر شخصیت کا جھینپو اور شرمیلا انسان تھا۔ لندن واپس آ کر بائیس برس کی عمر میں ہیولاک ایلس نے سینٹ تھامس ہسپتال میں طب کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ پریکٹس کرتا رہا۔ اس نے جو علاقہ چنا تھا۔ وہ لندن کے نادار لوگوں کا علاقہ تھا لیکن اس کی اصل دلچسپی تحقیق و تصنیف میں تھی۔ اس لیے اس نے ڈاکٹری کی پریکٹس جلد ہی ترک کر دی۔ جب وہ تیس برس کا ہوا

تو اس کی پہلی کتاب شائع ہوئی جس کا نام "دی نیو سپرٹ" تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد اسے جنس کے موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر اس نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ یہ وہ موضوع تھا جو اس زمانے میں ممنوعہ قرار دیا جا چکا تھا انسانی جنس کے بارے میں ہیولاک ایلس نے مواد جمع کرنا شروع کر دیا اور تحقیق کا آغاز ہوا۔

اس عظیم الشان علمی کارنامے "سٹڈیز ان سائیکلوجی آف سیکس کی پہلی جلد۔ SEXUAL INVERSION۔ کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تو تہلکہ بپا ہو گیا۔ حکومت وقت نے اسے "فحش" قرار دیا۔ ایک علمی اور سائنسی نوعیت کے کام کو فحش اور مخرب اخلاق قرار دینا بظاہر بڑا عجیب لگتا ہے لیکن اس دور میں انگلستان کا معاشرہ ابھی فراخدل اور سائنٹیفک نہ ہوا تھا۔ اس شدید دھچکے کے باوجود ہیولاک ایلس نے اپنے کام کو جاری رکھا اور اپنے عظیم الشان تحقیقی اور علمی کام کی دیگر جلدیں اور حصے شائع کرتا چلا گیا اس کے ہم عصر اور ہم جو آج اس کے عظیم الشان کارنامے کو سراہتے نہیں تھکتے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنے اس علمی اور ادبی کام کو ثانوی حیثیت دیتا اور ڈاکٹری کی پریکٹس کو جاری رکھتا تو ناداری اور مفلسی کی زندگی بسر کرنے سے بچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے لیے ساری عمر کی تنگی اور ناداری کو قبول کر لیا۔ لیکن اپنے مقصد اور عظیم علمی اور تحقیقی کام کو ثانوی حیثیت نہ دی۔

ہیولاک ایلس کی عمر ۷۴ برس تھی جب اس کی کتاب "ڈانس آف لائف" شائع ہوئی یہ کتاب تجارتی اعتبار سے کامیاب ہوئی اور زندگی میں پہلی بار اس نے خوش حالی اور آسودگی کا ذائقہ چکھا۔

ہیولاک ایلس ۸ جولائی ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس کی عمر اس وقت اسی برس تھی۔ ہیولاک ایلس عورتوں کے حقوق کا زبردست حامی تھا۔ وہ ہم جنسیت میں مبتلا افراد کا بھی دفاع کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ان کو مریض سمجھتا تھا۔ جنس کے موضوع پر گفتگو مذاکرات اور مکالمے کے سلسلے میں ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس موضوع پر اولیں کام کرنے والے تھے۔ اس نے اپنا یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جنسی مسائل کے بارے میں جو شخص بھی مشورے کے لیے اس سے رجوع کرتا وہ اسے اپنے ماہرانہ مشورہ دیتا اور کسی قسم کی فیس نہ لیتا۔ ہیولاک ایلس کو یہ بات کبھی سمجھ میں نہ آسکی کہ فرائڈ اپنے مریضوں سے فیس کیوں وصول کرتا ہے۔؟

ہیولاک دھیمے مزاج کا انسان دوست شخص تھا۔ جس کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا جا

سکتا ہے کہ اس کے ایک وجود میں صوفی اور سائنسدان یک جا ہو گئے تھے۔ مارگریٹ، سینگر جس نے برتھ کنٹرول کے حامی کی حیثیت عالمی شہرت حاصل کی۔ اس نے ہیولاک ایلس کی شخصیت کو بڑے خوب صورت اجمالی انداز میں پیش کیا ہے۔

"وہ ایک طویل القامت فرشتے کی طرح تھا، نیلی آنکھیں پرکشش چہرہ اور ایک منفرد سفید لمبی داڑھی کا مالک۔"

٭

ہیولاک ایلس نے اپنی زندگی کا یادگار، اہم اور ہمیشہ زندہ رہنے والا علمی اور تحقیقی کام سٹڈیز ان سائیکلوجی آف سیکس، سات جلدوں میں مکمل کیا۔ یہ سات جلدیں ۱۸۹۷ء سے ۱۹۲۸ء تک شائع ہوئیں۔ گویا یہ عظیم کارنامہ ۳۱ برس کی محنت شاقہ کے بعد اپنی تکمیل کو پہنچا۔ چونکہ یہ ایک بڑا کام تھا اور ضخیم بھی۔ اس لیے عام قاری کی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہیولاک ایلس نے اپنے اس ضخیم کام کا خلاصہ بھی خود ہی سائیکلوجی آف سیکس" کے نام سے شائع کرایا۔ کتابی صورت میں اس عظیم اور کام کی تلخیص ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اور تب سے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دراصل کتاب جو سات حصوں پر مشتمل ہے۔ وہ سات جلدوں اور ایک جلد میں بھی بار بار شائع ہوتی رہتی ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ہیولاک ایلس ایک محقق اور سائنس دان تھا جو ساری عمر جنس انسانی کے حوالے سے سائنسی صداقت کی تلاش میں رہا مطالعہ جنس کے حوالے سے وہ اس موضوع پہ کام کرنے والوں میں اولین بانی کی حیثیت رکھتا ہے اور سند کی حیثیت بھی اور اسی حوالے سے اسکی عظیم الشان تصنیف سٹڈیز ان سائیکلوجی آف سیکس کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے اور اس کا شمار دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔

اس کتاب کا اندازہ اس کے موضوعات اور دائرہ تحقیق کی وسعت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہیولاک ایلس پہلے جنس کی بیالوجی۔۔ اس کے حیاتیاتی پہلو کو سامنے لاتا ہے کہ جنس کی طبیعاتی

بنیادیں کونسی ہیں جنس کی نیچر کیا ہے ، پھر وہ ایر وجنیٹک زونز کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے باہمی میل ملاقات دکورٹ شپ) کی حیاتیاتی حیثیت کیا ہے۔ ترجیحاتی وصال اور ملاپ کے مسئلہ جنس

کی حیاتیاتی حیثیت کیا ہے۔ ترجیحاتی وصال اور ملاپ کا مسئلہ جنس کے انتخابات کے عوامل یعنی لمس ، شامہ ، سماعت اور بصریات ....

اس کے علاوہ وہ عنفوان شباب میں جنس کے مظاہر کو سامنے لاتا ہے۔ ان میں جنسی EROTISM کا پہلا ظہور ، جاگتے خواب ، شہوانی خواب ، خود لذتی نرگسیت اور جنسی تعلیم جیسے موضوعات پر اپنی تحقیق و فکر کا حاصل بیان کرتا ہے۔ جنسی انحراف و تجاوز اور جنسی محبت کی علامتوں کے حوالے سے وہ جنسی نمائش پسندی ، فیٹشزم ، سادیت اور مساکیت اور جنسی انحراف و تجاوز کے حوالے سے سماجی رویوں پر بحث کرتا ہے۔

'ہم جنسیت' کے موضوع پر ہیولاک ایلس کی تحقیقات کو اس موضوع پر بطور خاص سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اسے جنسی INVERSION یعنی جنسی عمل معکوس سمجھتا ہے۔ اس عمل معکوس کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب کی تہہ تک پہنچتا ہے اور پھر سب سے اہم مسئلہ جو اس سلسلے میں اٹھاتا ہے کہ ہم جنسیت میں مبتلا لوگوں کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔

"سٹڈیز ان سائیکولوجی آف سیکس" میں ہیولاک ایلس نے بہت اہم نازک اور متنازعہ کام کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ نفسیاتِ جنس کے حوالے سے اس نے پوری کوشش کی کہ اس کے مطالعہ میں کوئی خامی نہ رہے یقیناً اس کے اس عظیم الشان کارنامے کے بعد آنے والے ادوار میں اب تک اس کے کام کو بنیاد اور رہنما بنا کر اس موضوع پر بہت بڑی عمارت تعمیر کی گئی ہے اور ہیولاک ایلس نے اس موضوع پر کام کے امکانات کو جس انداز میں مرتب اور ظاہر کیا۔ اس سے بہت استفادہ کیا جاتا رہے گا۔

اس عظیم الشان کام میں اس نے شادی کے ادارے اور رسم اور اس کے جنسی پہلو کی نفسیات پر اہم نتائج سے بھرپور کام کیا ہے وہ شادی کے ادارے کا جنسی حوالے سے بہت قائل ہے اور اس کی افادیت کو نمایاں کرتا ہے پھر شادی میں جو تسکین اور آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ اس پر تفصیل

گفتگو کرتا ہے۔ ایسی شادی جو اولاد سے محروم اور بے اثر ہو، اس کے بارے میں بھی وہ اپنے خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ اسی ضمن میں وہ جنسی سرد مہری اور جنسی ناتمامی اور محرومی کو بھی زیر بحث لا کر جنسی معروضات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اور اس کی تخلیق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نفسیات جنس کے مطالعے میں ہیولاک ایلیس محبت کو بے حد اہم سمجھتا ہے۔ محبت کے فن (ART OF LOVE) کے حوالے سے پہلے تو وہ یہ مسئلہ پیش کرتا ہے کہ محبت کے رشتے میں جنسی پہچان کا کتنا واسطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ پھر وہ اس سوال سے عہدہ برا ہوتا ہے کہ محبت کرنا ایک آرٹ اور فن کیوں ہے اپنے اس مہتم بالشان علمی اور تحقیقی کارنامے کے آخر میں وہ جنسی پہچان و تحریک کے تہلکہ خیز پہلو اور اس کی نوعیت پر خاتمہ کلام کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے جنس کے ارتقائی پہلو SUBLIMATI- ON کو نمایاں کرتا ہے ....

ہیولاک ایلیس اپنی مہتم بالشان ہمیشہ زندہ رہنے والی تصنیف میں لکھتا ہے۔

"ہماری پوری زندگی جیسا کہ میں اکثر مواقع پر اس طرف اشارہ کرتا رہا ہوں، ایک آرٹ ہے۔ میرے اس بیان کو ان لوگوں نے ہی مسترد کیا ہے جو آرٹ کو جمالیاتی جنسیات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک دوسرا اور جداگانہ موضوع ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ بناتے ہیں وہ سب آرٹ ہے اور آرٹ کو ان کے دوسرے تمام اعمال سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ زندگی ایک آرٹ ہے، ایک صداقت ہے۔ محض صداقت اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہاں بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی ایک بڑا آرٹ ہے۔

اپنی عظیم الشان اور ہمیشہ زندگی رہنے والی تصنیف "سٹڈیز ان سائیکولوجی آف سیکس" کے حوالے ہیولاک ایلیس ہمیں یہ راہ دکھاتے ہیں کہ اگر زندگی بسر کرنا۔ ایک بڑا آرٹ بن جائے تو اسے اچھا اور خوب صورت آرٹ کس طرح بنایا جا سکتا ہے . . .

شاخِ زرّیں

علم الانسان میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن کا وہ مقام اور علمی رتبہ ہو جو سر جیمز فریزر کی عہد آفریں تصنیف ہے "شاخ زریں" کا ہے۔

ایک نقطہ پھیلتے پھیلتے کس طرح دریا بنتا ہے یہ کتاب اس پھیلاؤ اور عمل کی بھی ایک ایسی مثال ہے جو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

"شاخ زریں" کا موضوع جادو اور مذہب کے باہمی روابط کا مطالعہ ہے یہ ایک موضوع ہے جس پر اب تک بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن اس موضوع کو جس علمی اور فکری انداز میں سب سے پہلے سر جیمز فریزر نے کھنگالا تحقیق کی اور اس پر کام کرتے ہی چلے گئے۔ اس کی وجہ سے اس اہم انسانی موضوع پر اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

یہ بھی اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو ہے کہ ابتدا میں جو موضوع دو جلدوں میں سما گیا تھا۔ وہ پھیلتا ہوا بارہ جلدوں تک پہنچ گیا۔

علم الانسانیات میں سر جیمز فریزر کی اس عہد آفریں تصنیف سے پہلے علماء کا یہ رویہ بہت نمایاں اور غالب تھا کہ انسانی عقائد اور رسوم کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ سر جیمز فریزر نے اس رویے کو اپنانے کے بجائے یہ مطالعہ کیا کہ انسانی رسوم، جادو اور مذہبی عقائد کے باہمی روابط کیا ہیں ان میں کون سی مشابہات ہیں اس طرح سے فریزر نے یہ دریافت کرنے کی سعی کی کہ مذہب کے بارے میں انسانی فکر کا ارتقاء کس طرح ہوا

سر جیمز فریزر یکم جنوری ۱۸۵۴ء گلاسگو میں پیدا ہوئے ان کے والد ایک بڑی تجارتی کمپنی

ہیں حصے دار تھے فریزر کے والدین مذہبی لوگ تھے اور گھریلو ماحول مذہبی تھا۔ عبادات پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ فریزر کے تعلیمی دور کا آغاز ہوا تو انھوں نے لاطینی اور یونانی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اس دور میں ہی انہیں کلاسیکی ادب سے وہ دلچسپی پیدا ہوئی جو تمام عمر برقرار رہی اگرچہ والدین کی یہ خواہش تھی کہ وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی خاندانی تجارتی کمپنی میں کام کریں لیکن فریزر کے علمی انہماک کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے گلاسگو یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا گیا یہاں سے میٹرک کے بعد وہ ٹرینٹی کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں فریزر کو مشرقی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ بعد میں والد کی خواہش پوری کرنے کے لیے فریزر نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا تاہم فریزر نے ساری عمر وکالت نہیں کی

علم الانسان میں فریزر کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ ٹائیلر کی کتابوں نے ان کو بطور خاص متاثر کیا اور پھر ان سے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے لیے TABOO کے موضوع پر مضامین لکھوائے گئے۔ فریزر کے یہ مضامین ۱۸۸۸ء میں انسائیکلوپیڈیا کے نویں ایڈیشن میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین تھے جو فریزر کی اس عہدآفریں کتاب "شاخ زریں" کی بنیاد بنے۔ فریزر نے لکھا ہے۔

"اس مضمون کے لیے میں نے جو تحقیقی کام کیا وہ دراصل اس منضبط کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا میں نے بطور خاص ان قوموں کے رسم و رواج کا مطالعہ کیا جو پسماندہ ہیں اور جنہیں وحشی سمجھا جاتا ہے۔"

۱۸۹۶ء میں فریزر نے شادی کی اور فروری ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سر جیمز فریزر کی تصانیف میں یونان پر بھی ایک کتاب شامل ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہت کی ابتدائی تاریخ، لازوال زندگی اور مُردوں کی پوجا، عہدنامہ عتیق میں عام لوگوں کے عقائد اور روایتیں، مظاہر پرستش، آگ کے ماخذ سے متعلقہ دیومالا وغیرہ ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے عنوانات سے ہی ان کے موضوعات اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے تاہم ان کی عہدآفریں تصنیف "شاخ زریں" ہے جس کا پورا نام "شاخ زریں" جادو اور مذہب کا مطالعہ" ہے

یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں پہلی بار دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک بارہ جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت کی مختصر تفصیل یوں ہے۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں، دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء میں تین جلدوں میں اور پھر تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک

بارہ جلدوں میں شائع ہوا اور اس پر ہی ختم نہیں ہوئی۔ فریزر نے عام قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تلخیص خود ہی کی جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

سر جیمز فریزر کی اس کتاب کو اپنے موضوع کے اعتبار سے بنیادی حیثیت حاصل ہے اور یہ دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے جن کے اثرات انسانی فکر پر بہت گہرے ہیں اور اس سے انسان کے عقائد اور مذہب میں جو مشابہت ہے اس کے حوالے سے دور رس نتائج سامنے آتے ہیں۔

اس کتاب میں واقعات کا جو سلسلہ اور تحقیق سامنے آتی ہے اس سے انسانی فکر و عمل کے مراحل پر روشنی پڑتی ہے۔ فریزر کے نزدیک انسانی فکر نے درجہ بدرجہ ترقی کی۔ اس ترقی کے بنیادی مدارج سحر اور جادو ہیں۔ سحر سے مذہب اور مذہب سے سائنس تک یہ مدارج تبدیل ہوتے چلے گئے ہیں فریزر نے اس فکر و عمل کو رزمیہ نظم کا نام دیا ہے۔ فریزر لکھتا ہے۔

واقعات کا دور جو شاخ زریں میں بیان ہوا ہے ایک پیچیدہ خاکے میں اندھیرے اور اجالے کے گھٹتے بڑھتے کھیل ہیں۔ اس طویل ارتقاء کو سامنے لاتا ہے جس سے انسانی فکر درجہ بدرجہ سحر سے مذہب اور مذہب سے سائنس میں تبدیل ہوتے ایک حد تک یہ انسانیت کی ایک رزمیہ نظم ہے اس انسانیت کی جس نے سحر سے ابتدا کرتے ہوئے اپنی پختہ عمر میں سائنس پر قابو پالیا ہے اور یہی سائنس شاید اس کے لیے موت کا سبب ہے کیونکہ جس عفریت نے آج انسانی فکر کو جنم دیا ہے وہ انسانیت کو موت کی دھمکی بھی دیتا ہے حالانکہ انسانیت کا دار و مدار ابھی ترقی اور آسودگی کے لیے اسی فکر پر ہے۔"

سر جیمز فریزر کی اس کتاب کا جو دو جلدوں میں ملخص ایڈیشن شائع ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور مترجم سید فاکر اعجاز ہیں: شاخ زریں، کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے اثرات جدید ادب اور جدید نفسیات پر بھی بہت گہرے ہیں۔ دیومالا اور اساطیر کے حوالے سے جو کام ژونگ نے اپنی تصنیف میں کیا۔ اس کتاب کے حوالے سے ژونگ کے نظریات کا مطالعہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور پھر ادب کے حوالے سے بھی فریزر کی کتاب ایک بہت بڑا حوالہ بنتی ہے

"شاخ زریں" دیومالا اور مذہبی رسوم کا ایک ایسا مطالعہ ہے جس نے علم الانسان، قدیم لسانی تاریخ یورپ اور ایشیا کے عوام کے عقائد، قصے، کہانیوں اور روایات اور رواجوں سے پورا استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ عناصر جو فریزر کی اس کتاب کے موضوع کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

"شاخ زریں" میں انسانی فکر کی جڑاوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد جس طرح انسانی فکر نے ترقی کی ہے اس کا تحقیقی اور فکری جائزہ لیا گیا ہے اس کتاب کا موضوع تو گزشتہ زمانے ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن دراصل اس کا پھیلاؤ حال اور ماضی تک کا احاطہ کرتا ہے۔

فریزر کا یہ کام اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے نتائج نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا ہے وہ لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے یا اس کا مطالعہ کریں گے وہ اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس علمی کام کے حوالے سے یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اسے جس زبان میں لکھا گیا ہے وہ اعلیٰ درجے کی نثر ہے۔

"شاخ زریں" اس اعتبار سے ہی اہم نہیں کہ اس کا موضوع اہم ہے اور اس موضوع پر فریزر نے اپنی عمر کے پچاس برس صرف کیے بلکہ اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی نثر علمی اور ادبی ہے اور ادب میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے

فریزر نے اس کتاب کے حوالے سے جن نظریات اور نتائج تک رسائی حاصل کی ہے اس کے اعتبار سے اس کو وہی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جو ڈارون اور فرائیڈ کے نظریات اور تصانیف کو حاصل ہے۔ اور فریزر نے جو نتائج اخذ کیے وہ ہماری تہذیب کا ایک اہم اور ناگزیر حصہ بن چکے ہیں

اس کتاب کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے انسان جو صدیوں سے فوق الفطرت کے خوف میں جکڑا ہوا تھا اور اس خوف سے آزادی کے لیے جو کشمکش صدیوں سے انسانی اجتماعی ذہن میں ہو رہی تھی یہ کتاب اس خوف سے نجات دلاتی ہے۔

انسان بہت ترقی کر چکا ہے اس کی ترقی بے مثل ہے لیکن آج بھی وہ سحر اور توہمات کے اثرات سے آزاد نہیں ہوا اور اس کی بھرپور جھلکیاں انسان کے مذہبی عقائد میں ملتی ہیں۔ فریزر نے اپنی اس عہد آفریں کتاب میں سحر اور مذہب کا جو مطالعہ پیش کیا ہے وہ ہماری فکر پر اثر انداز ہوتا ہے

اس کتاب میں وہ سحر اور مذہب پر بحث کرتا ہے اور اس کی تمام جزئیات پر توجہ دیتا ہے پھر بادشاہ اور مقدس بادشاہ کا فرق بیان کرتا ہے۔ سحر پرستی کے عقیدے کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے ڈانڈے جدید یورپ میں سحر پرستی تک ملاتا ہے انسانی روح کے بارے میں اس کا مطالعہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ پھر وہ تحریم (TABOO) پر بحث کرتا ہے جس میں اشخاص اور اشیاء کی تحریم بطور

خاص دعوتِ فکر دیتے ہیں اپنے موضوع کو فریزر کہیں بھی تشنہ نہیں چھوڑتا۔ اس نے الفاظ کی تحریم کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف ادب بلکہ نفسیات کے حوالے سے بھی بہت اہم ہے اور پھر وہ جو مطالعہ قدیم انسان کے حوالے سے کرتا ہے اس میں اس کا نقطۂ نگاہ بہت اہم ہے فریزر قدیم دور کے انسانوں کو وحشی نہیں سمجھتا بلکہ اس کا مطالعہ اسے اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ قدیم دور کے وحشی انسان کے جدید انسان پر بہت سے احسانات ہیں وہ قدیم دور کے انسان کی گمراہیوں اور لغزشوں کو ان خطاؤں کا نام دیتا ہے جو تلاش حق کی راہ میں سرزد ہوتی ہیں۔

"شاخ زریں" ایک عظیم علمی کام ہے۔ اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا۔